نقوشِ اردو

شرح

مرقعِ ادب

برائے انٹرمیڈیٹ

پروفیسر انور محمود خالد
پروفیسر احسن زبیدی

پروفیسر ریاض مجید

ین بک ڈپو اردو بازار لاہور
کتاب مرکز بھوانہ بازار فیصل آباد

نقوش اُردو

نقوشِ اُردو

شرح

مُرقّعِ ادب

(اُردو لازمی)

گیارھویں، بارھویں جماعتوں کے لئے

از

پروفیسر انور محمود خالد
پروفیسر انور محمود خالد
پروفیسر سید احسن زیدی
پروفیسر سید احسن زیدی
پروفیسر ریاض مجید
پروفیسر ریاض مجید

امین بک ڈپو
اُردو بازار۔ لاہور
قیمت: 45 روپے

کتاب مرکز
بھوانہ بازار۔ فیصل آباد
فون: ۲۸۳۹۸

نصاب اُردو (لازمی) برائے انٹرمیڈیٹ کلاسز

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن، لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، گوجرانوالہ، ملتان، بہاولپور اور میرپور (آزاد کشمیر) کے امتحان ۱۹۸۷ء اور مابعد کے لئے۔

بورڈ آف انٹرمیڈیٹ اینڈ سیکنڈری ایجوکیشن

پرچہ الف

۱۔ تشریحِ مطالب (نثر)	۲۵ نمبر
۲۔ سبق کی تلخیص (نثر)	۱۵ نمبر
۳۔ مطالبِ اسباق پر سوالات	۱۰ نمبر
۴۔ نظم کا مرکزی خیال / تلخیص	۱۵ نمبر
۵۔ تشریحِ مطالب (نظم)	۲۵ نمبر
۶۔ اصنافِ نظم و نثر کا تعارف (مضمون۔ ناول۔ افسانہ۔ خاکہ۔ ڈراما۔ نظم۔ آزاد نظم۔ مرثیہ)	۱۰ نمبر
	۱۰۰ نمبر

مطبع :۔ آداب پرنٹنگ پریس لاہور۔

فہرست

حصۂ نثر

نذیر احمد ماما عظمت

☆ طنزیہ و مزاحیہ منظومات

حصۂ غزلیات

پیش لفظ

نصابی کتابوں کی شرحوں، خلاصوں، کلیدوں اور راہنما کتابوں کو عموماً اچھی نظر سے نہیں دیکھا جاتا۔ اساتذہ اور ماہرینِ تعلیم کی رائے میں ان کی موجودگی تعلیم وتعلّم کے لئے سخت نقصان دہ ہے۔ ایک لحاظ سے ان کا یہ تأثّر درست ہے، کیونکہ عام طور پر شرحیں اور خلاصے روا روی میں لکھے اور لکھوائے جاتے ہیں اور ان کا مقصد محض پیسہ کمانا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اگر

تذکرہ کرنے کے بعد اس کا موجودہ سبق سے تعلق واضح کیا گیا ہے، اور ہر سبق کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ "خلاصہ" میں کوئی ضروری نکتہ یا اہم خیال نظر انداز نہیں کیا گیا اور نظم کے "مرکزی خیال" میں تفصیل کی بجائے اختصار سے کام لیا گیا ہے۔ غزل کے ہر شعر کی تشریح کرتے وقت اس کے مخصوص علائم و رموز کا بطورِ خاص خیال رکھا گیا ہے۔

۳۔ عبارتوں کے سیاق و سباق کے ضمن میں زیرِ بحث عبارت سے پہلے اور بعد کے حصے کا خلاصہ درج کیا گیا ہے، تاکہ متعلقہ عبارت کا محلِ وقوع متعین ہو سکے یہی سیاق و سباق کا اصل مقصود اور جواز ہے۔

۴۔ ممکنہ فرضی سوالات بنا کر اُن کے جوابات دینے کی بجائے تعارف، پس منظر اور سبق کا خلاصہ اتنا مجمل دیا گیا ہے کہ انہیں ایک ساتھ پڑھنے والا طالب علم ہر نوع کے امتحانی سوالوں کا جواب دینے پر قادر ہو گا۔

۵۔ نظموں اور غزلوں کی تشریح میں تفہیم اور ترجمانی پر زور دیا گیا ہے تاکہ نظم کے ہر بند اور غزل کے ہر شعر کے مختلف پہلوؤں کی فکری اور فنی وضاحت ہو سکے اور طلبا و طالبات کا شعری ذوق نکھر سکے۔

۶۔ پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کی مرتبہ "مرقعِ ادب" کے متن میں جتنی غلطیاں موجود ہیں، ان کی متعلقہ مقامات پر نشان دہی کر دی گئی ہے اور متن کی صحت کے لئے اصل مآخذ سے رجوع کر کے صحیح الفاظ کے معانی درج کئے گئے ہیں۔

امید ہے، ہماری اس کاوش کو طلبا و طالبات اور اساتذہ میں یکساں پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

مُؤلّفِین

شرح
حصّۂ نثر

— از —

پروفیسر انور محمود خالد

نذیر احمد (۱۸۳۶ء - ۱۹۱۲ء)

ماما عظمت

تعارف اور پس منظر

"ماما عظمت" ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے ناول "مراۃ العروس" کا ایک حصہ ہے۔ "مراۃ العروس" کو اکبری اور اصغری کا قصہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ دونوں بہنیں ہیں اور ایک ہی گھر میں بیاہی گئی ہیں۔ اکبری پھوہڑ عورت ہے اور اصغری سلیقہ مند خاتون ہے۔ ان کے سسرال میں "ماما عظمت" نام کی ایک بوڑھی عورت ملازمہ ہے۔ موجودہ کہانی اسی ملازمہ کی بے ایمانیوں کے بارے میں ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱ ہنرمند: کام کی ماہر۔ باسلیقہ: مہذب، تمیز دار۔ سسرال: خاوند یا بیوی کا کنبہ۔ اعتدال: میانہ روی، نہ کمی نہ زیادتی۔ سلیقہ شعاری: ہنرمندی، اچھے طور طریقے۔ نند: خاوند کی بہن۔ بھگارنا: بھوننا۔ دخیل: دخل دینے والا، قابض۔ ماما: ملازمہ۔ اُتارُو: متوجہ ہونا، پیچھے پڑنا، تُل جانا۔ گرفت: پکڑ، قابو۔ موقوف: برخاست، نوکری سے برطرف۔ بنیا: ہندوؤں کی ایک ذات، آٹا، دال بیچنے والا دکاندار، اُدھار یا قرض دینے والا۔ بزاز: کپڑا بیچنے والا۔ کنجڑا: سبزی بیچنے والا۔ اُچاپت: دکان سے ماہانہ یا ہفتہ وار سودے کا اُدھار لین دین۔ تقاضا: مانگنا۔ سرزوری: بے حیائی، قصور پر شرمندگی کی بجائے سرکشی۔ مکرنا: قول سے پھرنا، بے ایمانی۔ امتیاز: تمیز، پہچان، شناخت، فرق۔ تکلف: ٹھاٹھ، آرائش۔ تکلیف اٹھا کر کوئی کام کرنا۔

ص ۲ کارخانہ: کام کاج، کاروبار، حساب۔ آڑھت: لین دین، بکوائی، تلوائی، دلالی۔ کھلے خزانے: بلا جھجک، صاف صاف۔ نیلام: بولی دے کر بیچنا۔ اینٹ سے اینٹ بجانا: برباد کرنا۔ روک ٹوک: پوچھ گچھ، باز پرس کرنا۔ تدبیر: سوچ بچار، کوشش، منصوبہ۔ محمد کامل: اصغری کا شوہر۔ مختارِ کل: تمام اختیارات کی مالک۔ ناحق: خواہ مخواہ، بلا وجہ۔ جھک جھک: تکرار، جھگڑا، بک بک۔ موقوف: بند کرنا، ختم کر دینا۔ چاٹ لگنا: چسکا پڑنا، عادت ہونا، شوق لگنا۔ منہ بنانا: ناراض ہونا۔ منہ کا مزا خراب ہونا۔ پھوار: چھوٹی چھوٹی بوندیں۔ کڑاہی: پکوڑے، پکوان پوڑیاں۔ تمیز دار بہو: مراد ہے چھوٹی بہو۔ اصغری جو بڑی سلیقہ مند عورت ہے۔ تذکرہ: ذکر۔

ستیاناس: خراب، بیڑا غرق کرنا، تباہی و بربادی۔ چاؤ: ارمان، شوق، ناز۔ پکوان: تلی ہوئی چیز جیسے پوڑیاں وغیرہ۔

ص ۳ | دستور: روش، معمول، قاعدہ، عادت، رسم و رواج۔ بگاڑ: لڑائی، جھگڑا، تعلقات میں خرابی۔ فطرت کھل پڑنا: اصلیت ظاہر ہونا۔ منہ پر مہر لگانا: چپ ہو جانا۔ دفتر شکایت: شکایتوں کا پلندہ۔ کم التفاتی: توجہ کم ہونا، دھیان یا رغبت نہ ہونا، مہربانی میں کمی واقع ہونا۔ کھٹکا: فکر، خوف۔ مکدر: ناخوش، غمگین، گدلا، میلا۔ ماجرا: قصہ، واقعہ۔ قرب: نزدیکی۔ بے مروت: بے لحاظ۔ لالہ ہزاری مل: مہاجن کا نام، سود پر رقم قرض دینے والا۔

ص ۴ | اَڈ بَدا کر: ضد اور شرارت سے، خواہ مخواہ۔ سودا سلف: کھانے پینے کی چیزیں، بازار کا سامان۔ بیوہار: حساب کتاب، لین دین۔ رقعہ: خط۔ چٹھی: خط، کاغذ کا ٹکڑا جس پر کچھ تحریر ہو۔ دل تنگ ہونا: کنجوس ہونا۔

ص ۵ | مؤا: مرا ہوا، نامراد، کم بخت۔ جان ہار: جان دینے والا، جان پر کھیلنے والا، مؤا۔ بے باق: حساب چکانا، پورا قرض واپس لوٹانا۔ سر ہونا: پیچھے پڑنا۔ فضیحت کرنا: ذلیل کرنا۔ سویرے: مراد ہے جلد۔ مہاجن: سود پر رقم ادھار دینے والا۔ ساجھی: حصے دار۔ نالش: مقدمہ۔ تردد: فکر، اندیشہ، سوچ بچار۔ اثاثہ: سامان، سرمایہ، جوڑا ہوا اسباب، کل پونجی۔ بالفعل: اس وقت، فی الحال، موجودہ حالت میں۔ گروی: رہن، کسی چیز کو ضمانت کے طور پر دے کر ساہوکار سے نقدی لینا۔

ص ۶ | بلا سے: کوئی پروا نہیں۔ کہنے کا منہ نہیں: کہنے کی ہمت نہیں۔ لاٹ صاحب: ملک کے صوبے کا حاکم اعلیٰ، گورنر۔ کوچہ: گلی۔ بدرویں: گھر کا گندہ پانی باہر نکلنے کی موریاں۔ کواڑ: دروازے کا پٹ۔ ناوقت: بے وقت، اچانک۔ وشتار: اشتہار کے ساتھ حرف مہمل (جس کے الگ سے کوئی معانی نہ ہوں لیکن وہ کسی بامعنی لفظ کے ساتھ آئے)۔ رنڈیا: بیوہ، وہ عورت جس کا شوہر مر گیا ہو۔

ص ۷ | بوا: بہن، عورتوں کا آپس میں کلمۂ خطاب۔ توڑا: گلے، کلائیوں یا پیروں میں پہننے کا زیور۔ مغموم: غمگین۔ سبیل: رستہ، وسیلہ، تدبیر، طریقہ۔

ص ۸ | پیادہ: شاہی ہرکارہ، چپراسی۔ مذکور: ذکر۔ دل جمعی: دلی اطمینان، بے فکری، کھٹکا: فکر، اندیشہ، خوف، شب برات: ماہ شعبان کی پندرھویں رات، مسلمانوں کا تہوار، اس رات میں عمر کا حساب اور تقسیم رزق کا کام ہوتا ہے۔ اس رات کو متبرک مانا جاتا ہے اور خوشی کے اظہار کے لئے آتش بازی چھوڑی جاتی ہے، اور خاص پکوان پکائے جاتے ہیں۔ آب دیدہ: آنکھوں میں آنسو آنا۔

ص ۹ | سمدھن : دولہا یا دلہن کی مائیں آپس میں ایک دوسرے کی سمدھن کہلاتی ہیں۔ سُسرا: خاوند یا بیوی کا باپ۔ انشاء اللہ: اگر اللہ نے چاہا۔

ص ۱۰ | قسط بندی: کل رقم کو مقررہ قاعدے کے مطابق تھوڑا تھوڑا کرکے ادا کرنا۔ علی الحساب: چلتے ہوئے حساب میں پیشگی طور پر کچھ رقم ادا کرنا۔ بغیر کسی حساب میں لگائے ہوئے اس سمجھوتے پر کہ حساب کرتے وقت، حساب میں شامل کر لیا جائے گا۔ دھندا: کاروبار، کام کاج، مصروفیت، پیشہ۔ چُھٹکل حساب: متفرق، الگ الگ۔ اِکّا دُکّا۔ چھوٹا حساب

ص ۱۱ | سرکار: جناب، شرفاء اور امراء کا گھر۔ اُچاپت: دکان سے ماہانہ یا ہفتہ وار سودے کا اُدھار لین دین۔ مولود شریف: وہ مجلس جس میں پیغمبر اسلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کے حالات سنائے جائیں۔ نمک حرام: بے ایمان۔

ص ۱۲ | چُھٹکل: متفرق حساب۔ چھوٹا چھوٹا، الگ الگ۔ غیرت مند: خوددار۔ شرم والا ہونا۔

ص ۱۳ | فضیحت: ذِلت و رسوائی۔ لٹھا: ایک سفید سُوتی کپڑا، نین سکھ: ایک قسم کا کپڑا۔ درلیس: ایک قسم کی چھینٹ جو ململ پر ہو اسے درلیش بھی کہتے ہیں۔ اَودا قند: ایک قسم کا کپڑا۔

ص ۱۴ | خطا: بھول، غلطی۔ کوڑی: ایک قسم کا چھوٹا سا سنکھ جو ادنیٰ سکے کا کام دیتا ہے، اور جسے جوا کھیلنے میں بھی استعمال کرتے ہیں۔ نقدی کی قلیل مقدار، دمڑی۔ پائی جیسے سکّے کے برابر۔ چُوکنا: بھولنا، خطا کرنا، نشانے پر نہ بیٹھنا۔ پہنچیاں: وہ زیور جو کلائی میں پہنا جاتا ہے۔ جوشن: بازو پر باندھنے کا ایک زیور۔ اَٹکل: اندازے سے، قیاس سے۔

ص ۱۵ | لاگت: قیمت۔ حُجّت: تکرار، بحث، جھگڑا۔ آنکنا: اندازے سے دام لگانا، تخمینہ کرنا، اندازہ لگانا۔ واجبی: ایسی رقم جس کا ادا کرنا ضروری ہو، لازمی ادا کرنے کے قابل۔

ص ۱۶ | رہنے کا ٹھیکرا: معمولی رہائشی مکان۔ بھلا مانس: شریف آدمی۔ گُن: کرتوت، لچھن، عادت۔

ص ۱۷ | کوتوالی: بڑا تھانہ۔ کوتکوں: کوتک کی جمع، کرتوت، فعل، لچھن، بُری حرکت، سَو دن چور کے تو ایک دن شاہ کا: قصوروار بالآخر پکڑا جاتا ہے۔ تقدیر: قسمت۔ خدا خدا کر کے: بڑی مشکل سے، بہت دشواری کے بعد۔

سبق کا خلاصہ

ماما عظمت، اصغری کے سسرال میں پچیس برس سے ملازم تھی۔ وہ بہت مکّار، چالاک اور بے ایمان عورت تھی۔ کئی دفعہ گھر سے نکالی گئی لیکن پھر ملازم رکھ لی گئی، کیوں کہ اسی کے ذریعے اصغری کے سسرال والے بنئے، بزاز، سنار، قصائی اور سبزی فروش سے اُدھار سامان

منگواتے تھے، گھر والوں کو اس کی بد دیانتی کا علم تھا۔ لیکن سب بے بس تھے۔ کھانے پینے کا سامان اور کپڑا وغیرہ اسی کی معرفت اُدھار آتا تھا جس سے اس گھرانے کا ٹھاٹھ باٹھ قائم تھا۔ اصغری نے شروع شروع میں اس سے پوچھ گچھ کی مگر اس پر وہ اصغری کی دشمن بن گئی اور مختلف طریقوں سے اصغری کو اس کے شوہر محمد کامل اور ساس کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرنے لگی۔ گھر کے معاملات میں ماما عظمت کا ضرورت سے زیادہ عمل دخل دیکھ کر اصغری نے کھانے پکانے کے معاملات میں دخل دینا بند کر دیا، جس سے گھر والے خاصے بدمزہ ہوئے۔

ایک دن موسم برسات میں اصغری کے شوہر کا پکوان کھانے کو جی چاہا اس نے ماما عظمت کے ذریعے اپنی بیوی کو بلایا جو کوٹھے پر رہتی تھی۔ ماما عظمت اُوپر گئی لیکن اصغری کو بتائے بغیر نیچے اُتر آئی اور آ کر محمد کامل کو بتایا کہ تمہاری بیوی سر درد کی شکایت کر رہی ہے اس لئے وہ تمہاری فرمائش پوری نہیں کر سکتی۔ بعد میں ماما عظمت خود ہی گھی، شکر اور بیسن وغیرہ لے آئی اور خاصا بدمزہ پکوان تیار کر کے محمد کامل کو کھلایا۔ کچھ دیر بعد جب وہ کوٹھے پر گیا تو اپنی بیوی کو تندرست اور سینے پرونے میں مشغول دیکھ کر اُسے بہت رنج ہوا لیکن اس نے بیوی سے کوئی شکایت نہیں کی۔ اصغری کی ساس بھی ماما عظمت کی لگائی بجھائی سے خفا نظر آنے لگی۔

کچھ دن بعد ماما عظمت نے ایک اور نازیبا حرکت کی۔ ماہ رمضان آنے والا تھا۔ اصغری کی ساس نے عید کے اخراجات، برتن قلعی کرانے اور گھر میں سفیدی کرانے کے لئے لالہ ہزاری مل سے پچاس روپے قرض منگوانے چاہے مگر ماما عظمت نے ٹال مٹول سے کام لینا شروع کیا اور جھوٹ موٹ بتایا کہ وہ پہلے اپنا پچھلا قرض مانگتا ہے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ اصغری عید کرنے کے لئے اپنے میکے جائے گی اور اس کا شوہر بھی لازماً اس کے ساتھ جائے گا۔ لہٰذا عید کی تیاری کی کوئی خاص ضرورت نہیں۔ حالانکہ یہ سب جھوٹ تھا اور ساس کو بہو سے بدظن کرنے کی ایک کوشش تھی۔

پھر ایک دن ماما عظمت نے آکر بتایا کہ لالہ ہزاری مل دوبارہ اپنے ادھار کا تقاضا کر رہا ہے اور رقم ادا نہ کرنے کی وجہ سے اس کی بے عزتی کرتا ہے کیونکہ وہی اس سے سامان لاکر اصغری کے سسرال والوں کو دیتی ہے۔ ماما عظمت نے اصغری کی ساس سے یہ بھی کہا کہ اگر ہزاری مل کا قرض واپس نہ کیا گیا تو وہ مقدمہ کر دے گا۔ ساس کی تشویش دیکھ کر ماما عظمت نے چپکے سے مشورہ دیا کہ مقدمہ بازی کی ذلت سے بچنے کے لئے بہتر ہے کہ اپنی بہو اصغری کے کپڑے گروی رکھ کر رقم حاصل کی جائے جس سے ہزاری مل کا حساب بے باق کیا جائے۔ بعد میں جب اصغری کے سسر لاہور سے رقم بھیجیں گے تو کپڑے چھڑوا لئے جائیں گے۔ لیکن اصغری کی ساس نے اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ دیکھ کر ماما عظمت نے ایک اور چال چلی۔ انہیں دنوں شہر میں لاٹ صاحب

کی آمد کے سلسلے میں اشتہارات لگے کہ تمام شہری اپنی اپنی گلیاں اور کوچے صاف کریں وگرنہ جرمانہ ہوگا۔ ماما عظمت نے ایک ایسا ہی اشتہار محلے کے پھاٹک سے اتارا اور لا کر محمد کامل (اصغری کے شوہر) کے گھر کے دروازے پر چسپاں کر دیا اور اصغری کی ساس کو آ کر ڈرایا کہ ہزاری مل نے اپنی رقم واپس لینے کے لئے مقدمہ کر دیا ہے اور یہ اشتہار اسی سلسلے کا ہے۔ جب اصغری کو پتہ چلا تو اس نے اپنی ساس کو تسلی دی کہ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں، رقم کا جلد بندوبست ہو جائے گا۔ پھر اس نے اپنی نند محمودہ کو بھیجا کہ دروازے پر لگا ہوا اشتہار اکھاڑ لائے، جب وہ کاغذ پڑھا گیا تو ساری صورت حال واضح ہو گئی اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ ساری شرارت ماما عظمت کی ہے۔

شب برات کے بعد اصغری اپنے باپ سے ملنے گئی اور ایک دن اور ایک رات رہ کر رمضان شروع ہونے سے پہلے پہلے لوٹ آئی۔ اسی اثناء میں اصغری کا سسر محمد فاضل بھی لاہور سے آ گیا تھا۔ اصغری جو شادی کے بعد اپنے سسر کے سامنے نہیں آئی تھی اب ساس کے کہنے پر محمد فاضل سے ملی۔ اصغری کی سلیقہ مندی اور اطاعت گزاری دیکھ کر سسر نے گھر کا سارا انتظام اس کے سپرد کرنے کا اعلان کیا۔

چند روز گزرنے کے بعد محمد فاضل نے ماما عظمت کو بلایا اور کہا کہ جس جس دوکاندار کا جتنا حساب کتاب ہے اسے بلا کر صاف کیا جائے۔ ماما عظمت نے پہلے تو ٹال مٹول سے کام لیا اور یہ تجویز پیش کی کہ تھوڑی بہت رقم بنئے، بزاز، قصائی، سبزی فروش اور حلوائی کو بھیج دی جائے۔ اور حساب چلتا رہے، لیکن اصغری کی مداخلت پر طے پایا کہ ہر ایک کو گھر بلا کر اس کا حساب طلب کیا جائے اور اس کے مطابق ادائیگی کی جائے۔ چنانچہ باری باری حلوائی، قصائی، بنئے اور سبزی فروش کو بلایا گیا۔ حلوائی سب سے پہلے آیا اور اسی کے حساب کتاب میں گڑبڑ نکلی۔ اُس نے تیس روپے بتائے جس میں سے صرف چھ سات روپے کا سودا گھر میں آیا تھا باقی رقم ماما عظمت نے اپنے گھر کی چیزیں خریدنے میں صرف کی اور محمد کامل کے حساب میں لکھوا دی۔ یہی حال سبزی فروش، قصائی اور بنئے کا ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح ماما عظمت ان سے اس گھر کے نام پر سودا سلف لاتی تھی اور محلے کے دوسرے گھروں میں بیچ آتی تھی۔ شام تک ان سب کا حساب کتاب صاف ہوا اور ماما عظمت کی بے ایمانیاں ایک ایک کر کے سامنے آئیں۔ اگلے روز بزاز کو بلایا گیا لیکن اسی شام ماما عظمت اس کے پاس گئی اور منت سماجت کر کے اسے کہا کہ وہ اس کے خریدے ہوئے کپڑے کا حساب محمد فاضل کو نہ بتائے، اس ادھار کے بدلے میں ماما عظمت نے اپنی چار چوڑیاں پیش کیں۔

بزاز سے رخصت ہو کر ماما عظمت ہزاری مل کے پاس پہنچی اور اُسے بھی شیشے میں اتارنا چاہا لیکن اس کے پاؤں پڑنے کے باوجود ہزاری مل نے ماما عظمت کا اعتبار نہیں کیا۔ اصغری کے سسرال والوں نے لالہ ہزاری مل کو سو روپے واپس کئے تھے جو ماما عظمت نے اپنے پاس رکھ لئے اور بعد ازاں خرچ کر ڈالے۔ اس رقم کے بدلے میں ماما عظمت نے لالہ جی کو اپنی بیٹی کا زیور پیش کیا لیکن وہ اتنا نہیں تھا کہ اس سے ادھار کی رقم پوری ہوتی، دوسرے روز جب بزاز اور ہزاری مل محمد فاضل کے سامنے پیش ہوئے تو انہوں نے ماما عظمت کا بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ دیکھ کر محمد فاضل نے جو رقم اپنی طرف نکلتی تھی، اس کی جزوی ادائیگی کی اور باقی رقم چند دن بعد ادا کرنے کا وعدہ کیا۔ ماما عظمت کے ذمے جو رقم نکلی، اس کی ادائیگی کے لئے اس کی جائیداد گروی رکھی گئی۔ اصغری کے سسرال والوں نے ماما عظمت کے کرتوت دیکھ کر اُسے گھر سے نکال باہر کیا اور یوں انہیں اس عذاب سے نجات ملی۔

اھم سوال

سوال: ڈپٹی نذیر احمد کا کردار "ماما عظمت" اپنی تمام ترکمزوریوں کے باوجود پرُکشش اور دلچسپ ہے۔ بحث کیجئے۔

جواب:۔ ڈپٹی نذیر احمد نے اپنے ناولوں میں جو کردار پیش کئے ہیں، ان میں وہ کردار زیادہ دلچسپ ہیں جو انہیں ناپسند ہیں۔ مثلاً ظاہر دار بیگ، کلیم، ابن الوقت اور اکبری وغیرہ۔ ماما عظمت کا کردار بھی اسی صف میں شامل ہے۔ وہ اصغری کے سسرال میں پچیس سال سے ملازم ہے۔ اپنی بے ایمانی، ہیرا پھیری اور چوری کے باعث بار بار نوکری سے نکالی جاتی ہے لیکن اپنی چالاکی، چرب زبانی اور دکانداروں کے ساتھ لین دین کی ماہر ہونے کی وجہ سے پھر ملازم رکھ لی جاتی ہے۔

اصغری کے گھر میں بہو بن کر آنے سے پہلے وہ گھر کے سارے معاملات پر حاوی تھی۔ بنئے، بزاز، سنار، قصائی، حلوائی اور سبزی فروش سب کے ساتھ ادھار چلتا تھا اور یہ ادھار ماما عظمت کے ذریعے ملتا تھا، وہی گھر کا سودا سلف لاتی تھی اور وہی بنئے یا مہاجن سے سود پر رقم قرض لاکر دیتی تھی۔ اُسی کی معرفت اُدھار کی واپسی ہوتی تھی۔ یوں پورا گھر گویا اس کی مٹھی میں تھا۔

ماما عظمت ملازمت کرتے کرتے بوڑھی ہو گئی لیکن اس کی چوری اور ہیرا پھیری کی عادت نہ گئی۔ وہ نہ صرف چوری کرتی بلکہ سینہ زوری کا بھی مظاہرہ کرتی مولوی نذیر احمد لکھتے ہیں" کہ چوری اور سرزوری ماما عظمت کی تقدیر میں لکھی تھی۔ جتا کر لیتی اور بتا کر چراتی۔ دکھا کر نکالتی اور لکھا کر مکر جاتی۔ گھر میں آمدنی کم اور عادتیں بگڑی ہوئیں۔ کھانے میں امتیاز، کپڑے میں تکلف، سب کارخانہ قرض پر تھا اور قرض کی آڑھت ماما عظمت کے دم سے تھی۔ کھُلے

خزانے کہتی تھی کہ میرا نکلنا آسان بات نہیں۔ گھر نیلام کرا کر نکلوں گی۔ اینٹ سے اینٹ بجا کر جاؤں گی"۔

ماما عظمت ہر اُس شخص کی دشمن ہے، جو اس کی بے ایمانی کے راستے میں رکاوٹ بنتا ہے۔ اصغری نے جب دیکھا کہ وہ گھر کو لوٹ رہی ہے تو اُس نے حساب کتاب کی جانچ پڑتال شروع کی اور ماما عظمت کو روکنا ٹوکنا چاہا مگر وہ اتنی ڈھیٹ، چالاک اور بے ایمان ہے کہ بجائے اپنی اصلاح کرنے کے وہ اُلٹا اصغری کی دشمن بن گئی اور مختلف حیلوں بہانوں سے اُس کو شوہر اور ساس کی نظروں سے گرانے کی کوشش کرنے لگی۔ اُس نے پے در پے ایسے اقدامات کئے، جن سے میاں بیوی اور ساس بہو کے تعلقات میں بگاڑ کا امکان پیدا ہوا لیکن اصغری نے بڑی عقل مندی سے اُس کے ہتھکنڈوں کا مقابلہ کیا، اس کی سب کوششوں کو ناکام بنا دیا اور اُسے گھر سے نکلوا کر دم لیا۔

ماما عظمت کی عیاری، چالاکی اور ہیرا پھیری کے کئی واقعات کہانی میں بیان کئے گئے ہیں۔ مثلاً محمد کامل، برسات کے موسم میں ایک دن کڑاہی کی خواہش کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ اس کی بیوی پکوان تیار کرے۔ لیکن ماما عظمت نے کمال چالاکی سے اصغری کو بتائے بغیر، محمد کامل کو جا بتایا کہ وہ سر درد کی شکایت کر رہی ہے اور پکوان تیار نہیں کر سکتی، حالانکہ تھوڑی دیر بعد محمد کامل خود جا کر دیکھتا ہے کہ وہ تندرست ہے اور آرام سے بیٹھی اپنا پائجامہ سی رہی ہے۔ محمد کامل نے مُنہ سے تو کچھ نہ کہا لیکن بیوی سے بدظن ہو گیا۔ اسی طرح رمضان کی آمد کے موقع پر اصغری کی ساس کو رقم کی ضرورت پڑی تو اس نے ماما عظمت سے کہا کہ وہ لالہ ہزاری مل سے پچاس روپے قرض لادے، اس پر ماما عظمت نے قرض لانے سے گریز کیا اور اصغری کی ساس کو مشورہ دیا کہ وہ بہو کا زیور گروی رکھ کر نہ صرف عید کا خرچ نکالے بلکہ لالہ ہزاری مل کا قرض بھی واپس کرے، اس کے ساتھ ہی اصغری کی ساس کو یہ پٹی بھی پڑھائی کہ عید منانے کے لئے اصغری تو اپنے والدین کے گھر چلی جائے گی اور محمد کامل بھی اس کے ساتھ ہی جائے گا۔ لٰہذا برتن قلعی کرانے اور گھر میں سفیدی کرانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ یوں اس نے اصغری کی ساس کو یہ احساس دلانے کی کوشش کی کہ اس کی بہو تہوار کے موقع پر بھی اپنے سسرال میں رہنا پسند نہیں کرتی۔

ماما عظمت کی چرب زبانی اور چالاکی کا اندازہ اس وقت خاص طور پر ہوتا ہے جب وہ لالہ ہزاری مل، حلوائی، سبزی فروش اور بزاز سے گفتگو کرتی ہے اور پردوں پر پانی نہیں پڑنے دیتی۔ جب اصغری کی ساس نے ماما عظمت کو بازار بھیجا اور وہ دیر سے واپس لوٹی تو بولی:

"موئے ہزاری مل کے جھگڑے میں اتنی دیر ہو گئی۔ وہ جان ہار ہر روز مجھ کو آتے جاتے ٹوکا کرتا ہے آج میری جان جل گئی اور میں نے کہا: کیا تو نے مجھ سے روز کی چھیڑ خانی مقرر کی ہے کیوں مرا جاتا ہے؟

ذرا صبر کر، خرچ آنے دے تو تیرا اگلا پچھلا حساب کتاب بے باق ہو جائے گا۔ وہ مؤا تو میرے سر ہو گیا اور بھرے بازار میں لگا محمد فاضل کو فضیحت کرنے"۔

وہ اصغری کے سسرال والوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھا کر انہیں پریشان کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ لالہ ہزاری مل کا قرض واپس لوٹانے میں تاخیر ہو جاتی ہے تو ماما عظمت گھر والوں کو تنگ کرنے کے لئے محلے کے پھاٹک سے وہ اشتہار اکھاڑ لاتی ہے جو لاٹ صاحب کی آمد پر گلی محلے میں صفائی رکھنے کی تلقین کے لئے لگایا گیا تھا۔ مگر وہ اصغری کی ساس کو ڈرانے کے لئے کہتی ہے کہ یہ اشتہار ان پر نالش کا ہے اور لالہ ہزاری مل نے خود لگوایا ہے۔ اصغری جب اپنی نند محمودہ کو وہ اشتہار لانے کو کہتی ہے تو اسے پڑھنے کے بعد ساری حقیقت کھلتی ہے کہ ماما عظمت نے کیا چکر چلایا ہے۔

بالآخر اصغری کے خسر محمد فاضل کی لاہور سے آمد پر ماما عظمت کی قلعی کھل جاتی ہے جب ادھار دینے والے تمام دکانداروں کو ایک ایک کر کے بلایا جاتا ہے اور ان سے حساب کتاب طلب کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ماما عظمت کتنی ہیرا پھیری اور بے ایمانی سے کام لیتی رہی ہے۔ وہ ذاتی سودا سلف بھی محمد کامل کے حساب میں لکھوا دیتی ہے اور کبھی ان کے حساب میں سامان خرید کر ہمسایوں کے گھر میں بیچ آتی ہے اور پیسے خود رکھ لیتی ہے۔ ہزاری مل کو جو سو روپے واپس کئے جاتے ہیں وہ بھی ماما عظمت خود اپنے پاس رکھ لیتی ہے لیکن گھر والوں کو کانوں کان خبر نہیں ہونے دیتی۔ حلوائی سے دس سیر شکر اور چار سیر بالو شاہی لاتی ہے لیکن اہل خانہ کو اس کا کچھ پتہ نہیں۔ گھر میں سبزی ترکاری ایک سیر لائی جاتی ہے لیکن سبزی فروش سے تین سیر خریدتی ہے۔ قصائی اور بنئے کا حساب ہوا تو اس میں بھی ہزاروں فریب نکلے اور ثابت ہوا کہ ماما عظمت اپنی مالکہ کے سودے میں اپنی بیٹی خیراتن اور اپنے دو تین ہمسایوں کے گھر پورے کرتی ہے۔ بزاز سے اسی طرح مالکہ کے حساب میں کپڑا خریدتی ہے اور اپنے گھر لے جاتی ہے۔ غرض ہر طرح اس نے لوٹ مچا رکھی ہے۔

ان تمام کمزوریوں کے باوجود ماما عظمت کا کردار بڑا مزے دار ہے۔ وہ چالاک، چور اور بے ایمان سہی لیکن اسے اپنی مالکہ (محمد کامل کی والدہ اور اصغری کی ساس) سے ایک طرح کا انس بھی ہے۔ وہ لالہ ہزاری مل سے کہتی ہے کہ "میں جو نے گئی ہوں ہزاروں میں کہہ دوں، لاکھوں میں کہہ دوں اور ہماری بیوی بھی بے چاری کبھی تکرار نہیں کرتیں!! اس انس کا سبب یہ ہے کہ وہ ماما عظمت پر آنکھیں بند کر کے بھروسہ کرتی ہے۔ اس کے مقابلے میں ماما عظمت اصغری کے بارے میں یہ رائے ظاہر کرتی ہے کہ "بیٹی تو امیر گھر کی ہیں پر دل کی بڑی تنگ ہیں"۔ گویا اصغری

کی کفایت شعاری کو وہ کنجوسی قرار دیتی ہے۔ اسی لئے وہ اس کی دشمن بن گئی ہے۔ اصغری اور ماما عظمت کی یہ کشمکش اس وقت ختم ہوتی ہے جب ماما عظمت کو نوکری سے نکال دیا جاتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد نے ماما عظمت کے کردار میں حقیقت نگاری کا کمال دکھایا ہے وہ جیسی بھی ہے، اپنی انفرادی حیثیت کی مالک ہے اور جس طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کی بڑی صحیح نمائندگی کرتی ہے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال :- درج ذیل عبارت کی تشریح کیجئے۔ حوالۂ متن اور سیاق وسباق بھی لکھئے :-

یہ عورت پچیس برس سے اس گھر میں تھی اور ہمیشہ لوٹنے پر اتارو۔ ایک دن کی بات ہو تو چھپ چھپا جائے۔ آئے دن اس پر شبہ ہوتا رہتا تھا مگر تھی چالاک۔ گرفت میں نہیں آتی تھی۔ کئی مرتبہ نکالی گئی۔ جب موقوف ہوئی۔ بنئے، بزاز، سنار، قصائی، کنجڑے، جن جن سے اس کی معرفت اُچاپت قرض اُٹھتی تھی، تقاضے کو آموجود ہوئے۔ اس ڈر کے مارے پھر بلائی جاتی تھی۔ یوں چوری اور سرزوری ماما عظمت کی تقدیر میں لکھی تھی۔ جتا کر لیتی اور بتا کر چراتی۔ دکھا کر نکالتی اور رکھا کر مکر جاتی

جواب : حوالہ متن | یہ عبارت کہانی "ماما عظمت" میں سے لی گئی ہے، اس کے مصنّف نذیر احمد ہیں۔

سیاق وسباق | اسی عبارت سے کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں اصغری کے سسرال میں ملازم ایک بوڑھی عورت ماما عظمت کا تعارف کرایا گیا ہے۔ مذکورہ بالا عبارت کے بعد ماما عظمت کی مکاری، فریب کاری اور بے ایمانی کے کئی واقعات بیان کئے گئے ہیں نو بیاہتا اصغری کو اس کے خاوند محمد کامل اور ساس کی نظروں سے گرانے کے لئے ماما عظمت نے جس جس طرح کی حرکتیں کیں اور جس طرح جھوٹی باتیں گھڑ کر اصغری کے نام منسوب کیں، ان سب کا تذکرہ آگے کیا گیا ہے۔ سبق کے آخر میں اصغری کے خسر کے سامنے ماما عظمت کی مکاری اور بد دیانتی کا بھانڈا پھوٹ جاتا ہے۔

تشریح | ماما عظمت گزشتہ پچیس سال سے اصغری کے سسرال میں ملازم تھی، اور گھر والوں کو لوٹنے کے لئے ہمیشہ تیار رہتی تھی۔ حساب کتاب میں اعلانیہ گڑبڑ کرتی تھی۔ اگر یہ ایک آدھ دفعہ کا واقعہ ہوتا تو شاید گھر والے اسے نظر انداز کر دیتے لیکن وہ ہر دفعہ ہیر پھیر کی کوشش کرتی تھی۔ جب کبھی اس پر بد دیانتی کا شبہ ہوتا، وہ چالاکی سے ایسی باتیں کرتی کہ پکڑی نہیں جاتی تھی۔ اپنی بے ایمانیوں کی وجہ سے اُسے کئی دفعہ نوکری سے جواب ملا لیکن اُسے جب بھی نکالا جاتا، محلے کے سب دکاندار

یعنی بنیا، کپڑا فروش، سنار، گوشت بیچنے والا اور سبزی بیچنے والا، اپنا اپنا ادھار لینے کیلئے آجاتے۔ کیونکہ ماما عظمت کے ذریعے اُن دُکانداروں سے گھر والے ادھار پر سودا سلف منگواتے تھے۔ ماما عظمت کے بغیر گھر کا انتظام چونکہ نہیں چلتا تھا، اس لئے دکانداروں کے ڈر سے پھر اُسے ملازم رکھ لیا جاتا۔ اس طرح وہ کھلم کھلا چوری بھی کرتی تھی اور اپنے مالکوں سے سرکشی کا مظاہرہ بھی کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے بے ایمانی اور بے حیائی اس کی قسمت میں لکھی جاچکی ہے۔ وہ جو چیز لینا چاہتی، دھونس جما کر لیتی اور جو کچھ چوری کرنا ہوتا، دھڑلے کے ساتھ لے جاتی۔ اپنی ذاتی ضرورت کی تمام اشیاء گھر یا دکان سے لے جاتی اور کسی سے ڈرتی نہیں تھی۔ اگر کبھی حساب اپنے کھاتے میں لکھوانا پڑجاتا تو بعد میں قول سے پھر جاتی اور صاف کہہ دیتی کہ میں تو یہ چیز لے ہی نہیں گئی تھی۔

خواجہ حسن نظامی (۱۸۷۳ء - ۱۹۵۵ء)

بنتِ بہادر شاہ

تعارف اور پس منظر

کہانی "بنت بہادر شاہ" خواجہ حسن نظامی کی کتاب "غدر کے افسانے" میں سے لی گئی ہے۔ ۱۸۵۷ء کی ناکام جنگ آزادی، جسے انگریزوں نے غدر (یعنی افراتفری یا بغاوت) کا نام دیا، کے بعد آخری مغل بادشاہ، ابوظفر بہادر شاہ کو گرفتار کر کے رنگون بھیج دیا گیا اور اس کی اولاد میں سے کچھ کو قتل کر دیا گیا اور باقی ماندہ دردر کی ٹھوکر کھانے کے لئے زندہ رہ گئی۔ خواجہ حسن نظامی نے مغل شہزادے، شہزادیوں اور شاہی خاندان کے دوسرے لوگوں کی تباہی و بربادی کی کہانیاں خود ان کی زبان سے سُنیں۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کے یہ المناک واقعات خواجہ حسن نظامی نے بارہ کتابوں میں تحریر کئے ہیں اور انہیں کتابوں میں سے ایک میں "بنت بہادر شاہ" بھی شامل ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۸ | بے چاری: غریب، بدنصیب عورت۔ درویشنی: فقیرنی، غریب عورت۔ بپتا: مصیبت۔ بارہا: کئی بار، اکثر۔ نظام الدین اولیاء محبوب الٰہی: دِلّی کے مشہور صوفی بزرگ۔ بیان کردہ: بتائے ہوئے۔ کہرام: رونا پیٹنا، ماتم کرنا۔ حسرت برسنا: رنج و غم کی کیفیت طاری ہونا۔ اُجلے اُجلے: صاف شفاف۔

ص ۱۹ | بلکنا: بچّے کا رونا اور تڑپنا۔ انّا: دودھ پلانے والی عورت۔ یاس و ہراس: ناامیدی اور خوف۔ عالم: حالت۔ حضرت ظلِ سبحانی: خدا کا سایہ، مراد ہے بہادر شاہ ظفر۔ خواجہ سرا: ہیجڑا غلام جو گھر میں آزادی سے آجا سکے۔ سنّاٹے کا عالم: وحشت ناک کیفیت۔ حکمِ سلطانی: بادشاہ بہادر شاہ ظفر کا حکم۔ مُصلّا: نماز پڑھنے کی جگہ، وہ کپڑا جس پر نماز پڑھی جاتی ہے۔ مُجرا بجالانا: ادب کے ساتھ سلام کرنا۔ پر: لیکن۔ اندیشہ: خوف۔ دستِ مبارک: مبارک ہاتھ۔ رعشہ: کپکپی، کانپنا۔ ایک بیماری کا نام جس میں ہاتھ پیر تھرتھرانے لگتے ہیں۔ بارگاہِ الٰہی: خدا کا دربار۔ بے وارث: جن کا کوئی سرپرست یا حامی و مددگار نہ ہو۔ یار و مددگار: دوست یا امدادی۔ تیمور: امیر تیمور، مشہور ترک بادشاہ جو مغل بادشاہوں کا جدِّ امجد تھا۔ بے کس: بے سہارا۔ آبرو: عزّت۔ پروردگار: پالنے والا خدا۔ اعمال: عمل کی جمع، کام۔ رسوا: ذلیل ❊

ص ۲۰ | جواہرات: جوہر کی جمع الجمع۔ قیمتی پتھر مثلاً لعل، یاقوت، ہیرا وغیرہ۔ سمدھن: دولہا یا دلہن کی مائیں آپس میں سمدھن کہلاتی ہیں۔ رتھ: ایک قسم کی دیسی بر جی نما گاڑی جس کے چار پہیے ہوتے تھے۔ صبح صادق: وہ روشنی جو رات ختم ہونے پر ظاہر ہوتی ہے۔ فجر: صبح۔ دل بھر آنا: غمگین ہونے سے آنکھوں میں آنسو آجانا۔ رتھ بان: (گاڑی) چلانے والا۔ چھاچھ: وہ سفید پانی جو دہی کو بلو کر مکھن نکالنے کے بعد باقی رہ جاتا ہے، لسّی۔ بریانی: بھنے ہوئے گوشت کا پلاؤ۔ متنجن: ایک قسم کا میٹھا پلاؤ جس میں ترشی بھی ہوتی ہے۔ گرد و نواح: آس پاس کا علاقہ۔ چڑیل: ڈائن، بھتنی، میلی کچیلی عورت، بدصورت عورت۔ سڑی بسی: بدبودار۔ لہنگا: گھگرا۔ ہندو عورتوں کا پاجامہ۔ دم گھٹنا: سانس رکنا۔ جی گھبرانا۔

ص ۲۱ | مراسم: تعلقات، برتاؤ۔ بے مروّتی: بے لحاظی، بدسلوکی۔ کانوں پر ہاتھ رکھنا: صاف انکار کرنا۔ بے سرو سامانی: غربت۔ نگاہیں پھیرنا: بے مروّت ہو جانا، بے وفائی کرنا۔ لاچار: مجبور ہو کر۔ خاطر کرنا: تواضع کرنا، مہمان نوازی کرنا۔

ص ۲۲ | رسالدار: ایک فوجی رسالہ (دستہ) کا افسر۔ ناگہانی: اچانک۔ برہنہ سر: ننگے سر۔ حواس باختہ: گھبرایا ہوا، اوسان خطا ہونا۔ دِقّت: مشکل۔ خونم خون: لہو لہان۔ غشی: بے ہوشی۔ گدائی: فقیری، غربت۔ حضرت ظلِ سبحانی: خدا کا سایہ، مراد ہے ابوظفر بہادر شاہ۔ آخری مغل بادشاہِ ہند۔ طوق: پٹہ یا لوہے کا گلوبند یا حلقہ جو مجرموں کے گلے میں ڈالا جاتا ہے۔

ص ۲۳ | موا: مردہ، عورتوں کا کوسنا یا گالی۔ فرنگی: انگریز۔ مورت: تصویر۔ بُوا: بہن، عورتوں کا آپس میں کلمۂ خطاب۔ بنیا: ہندوؤں کی ایک ذات، آٹا دال بیچنے والا دکاندار۔ بقال: سبزی بیچنے والا۔ پرچون فروش بنیا۔ ناؤ: کشتی۔ چھپّر: وہ سائبان جو پھوس سے بنایا گیا ہو، پھوس کی چھت۔ بچھونا: بستر۔ خاطر داری: مہمان نوازی۔ تکان: تھکن۔ بے کلی: بے چینی۔

ص ۲۴ | بے غل وغش: بغیر شور مچائے، خاموش۔ جڑاؤ: جس میں ہیرے جواہرات جڑے ہوئے ہوں۔ تا بہ کے: کب تک؟ حیلہ: تدبیر، سوچ، بہانہ، بندوبست۔ خوش نویس: کاتب، خوشخط لکھنے والا۔ درود شریف: وہ دعا جو رسولِ مقبولؐ کا نام آتے ہی طلبِ رحمت کے طور پر پڑھی جائے۔ اللّٰھم صلّی علیٰ محمد وعلیٰ آلِ محمد۔ خطِ ریحان: خطِ گلزار: وہ خط جس کے ذریعے حروف کے پیٹ میں پھول اور بیلیں بناتے ہیں۔ ہدیہ کرنا: بیچنا۔ کمتی بڑھتی: کم یا زیادہ۔ چڑھاؤ: سیلاب۔ حضور نظام: حیدرآباد دکن کی ریاست کا حاکم یا والی۔ عتاب: غضب، غصّہ۔

ص ۲۵ | اسی اثناء میں : اسی وقت، اسی دوران میں۔ پیر : مذہبی رہنما، مرشد۔ میانا: پالکی۔ مسندِ زرنگار : وہ تخت یا گدی جس پر سنہرا کام کیا گیا ہو، اور جو امراء کے بیٹھنے کے کام آئے۔ لونڈی : باندی خریدی ہوئی خدمتگار عورت۔ مگس رانی : مکھیاں اڑانا، پنکھا جھلنا۔ ثابوت : ثابت و سالم۔ بوریہ : ٹاٹ ۔ پیام : پیغام۔ باغ باغ ہونا : خوش ہونا۔ القصہ : خلاصۂ کلام۔

ص ۲۶ | عدن : حدودِ یمن میں ایک شہر جہاں کے موتی مشہور ہیں۔ پنتھ : فرقہ ملت۔ زخموں پر نمک چھڑکنا : مزید تکلیف پہنچانا۔ گرو : پیر، مرشد۔ چیلا : مرید۔ پاپی : گنہگار۔ درشن : دیدار، زیارت، نظارہ۔ رام جی : ہندوؤں کا مذہبی پیشوا راجہ رام چندر، جسے وہ اوتار مانتے ہیں۔ ٹھکانہ : انتظام۔ بندوبست۔ زم زم : بیت اللہ (مکہ) کے پاس ایک کنواں جو حضرت اسماعیلؑ کے ایڑیاں رگڑنے سے نمودار ہوا۔ داروغہ : محافظ، نگران۔ بے حجابانہ : بغیر پردے کے، بغیر روک ٹوک کے، صاف صاف۔ حضورِ سلطان : مراد ہے سلطنتِ عثمانیہ (ترکی) کا بادشاہ۔

ص ۲۷ | بغداد شریف : عراق کا دارالحکومت۔ نجف اشرف : عراق کا ایک شہر جہاں حضرت علیؓ دفن ہیں۔ کربلائے معلّٰی : عراق کا وہ مقام جہاں حضرت امام حسین شہید ہوئے۔ سرکار : حکومت۔ باوا : باپ۔ دم مارنے کی مجال نہیں : خاموشی اور صبر کے سوا چارہ نہیں۔

سبق کا خلاصہ

کلثوم زمانی بیگم، دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابوظفر بہادر شاہ کی لاڈلی بیٹی تھی۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کی زبان سے خود وہ واقعات سنے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی (غدر) میں بہادر شاہ ظفر کی ناکامی کے بعد انہیں اور ان کے عزیز و اقارب کو پیش آئے کلثوم زمانی بیگم بتاتی ہیں کہ جب ان کے والد ابوظفر بہادر شاہ کی بادشاہت ختم ہوئی تو انہوں نے رات کے وقت انہیں (کلثوم زمانی بیگم کو) بلایا اور فرمایا کہ وہ اپنے خاوند مرزا ضیاء الدین اور بچی زینب کو لیکر کہیں چلی جائے تاکہ ان کی جان بچ جائے۔ چنانچہ رات کے پچھلے پہر دو مرد اور تین عورتوں پر مشتمل یہ قافلہ دلّی کے شاہی قلعے سے باہر نکلا۔ مردوں میں کلثوم زمانی بیگم کا خاوند مرزا ضیاء الدین اور بادشاہ کے بہنوئی مرزا عمر سلطان تھے اور عورتوں میں خود کلثوم زمانی بیگم کے علاوہ بادشاہ سلامت کی بیگم نواب نور محل اور حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن تھیں۔ رتھ میں سوار ہو کر یہ قافلہ کورالی گاؤں میں پہنچا اور وہاں اپنے رتھ بان کے مکان پر قیام کیا جس نے ان کی باجرے کی روٹی اور چھاچھ سے تواضع کی۔ اگلے دن آس پاس

کے جاٹ اور گوجر جمع ہو کر انہیں لوٹنے کے لئے چڑھ آئے۔ ان کی چڑیلوں جیسی سینکڑوں عورتیں بھی ان کے ہمراہ تھیں جنہوں نے شاہی خاندان کی عورتوں کے زیورات اور کپڑے اتار لیے۔ اس گاؤں کے ایک زمیندار بستی نامی نے اس موقع پر اُن کی مدد کی۔ اس نے نہ صرف پیاسی زینب کو پانی پلایا بلکہ اپنی بیل گاڑی تیار کر کے انہیں اجاڑہ ضلع میرٹھ میں شاہی حکیم میر فیض علی کے گھر پہنچایا لیکن میر فیض علی نے بے مروّتی سے کام لیا اور انہیں پاس رکھنے سے انکار کر دیا۔

اس بے بسی کے عالم میں جب ایک طرف انگریزی فوج ان کے پیچھے لگی ہوئی تھی اور دوسری طرف واقف کار لوگ انہیں پناہ دینے سے گریز کر رہے تھے، ایک دفعہ پھر بستی زمیندار ان کے کام آیا۔ اس نے کلثوم زمانی بیگم کو اپنی بہن کہا تھا اس لئے اپنا قول نبھانے کے لئے انہیں اجاڑے سے حیدر آباد پہنچایا۔ تیسرے روز یہ قافلہ ایک ندی کے کنارے پہنچا جہاں کوئل کے نواب کی فوج پڑی تھی۔ یہ معلوم ہونے پر کہ یہ لوگ شاہی خاندان کے ہیں، انہوں نے نہ صرف ان کی خاطر تواضع کی بلکہ انہیں ہاتھی پر سوار کر کے ندی کے پار اتارا۔ اتنے میں انگریزی فوج آگئی جو نواب کی فوج سے لڑنے لگی۔

کلثوم زمانی بیگم کے خاوند اور مرزا عمر سلطان نے نواب کی فوج کے شانہ بشانہ لڑنا چاہا لیکن فوج کے رسالدار نے انہیں اس ارادے سے باز رکھا اور نصیحت کی کہ وہ عورتوں کو لے کر جلدی سے کہیں نکل جائیں۔ اس پر یہ لوگ ایک قریبی کھیت میں گھس گئے مگر اچانک ایک گولی آئی جس سے آگ بھڑک اُٹھی۔ بڑی مشکل سے انہیں کھیت سے نکلنا نصیب ہؤا۔ نواب نور محل کھیت سے نکلتے ہی بے ہوش ہو گئیں۔ انہوں نے خواب میں اپنے شوہر بہادر شاہ ظفر کو طوق و زنجیر پہنے ہوئے قید کی حالت میں دیکھا۔ ہوش میں آنے پر دونوں مردوں نے انہیں تسلّی دی کہ انگریز، بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے ساتھ بدسلوکی نہیں کریں گے۔ ندی پار کرنے کے بعد وہ مسلمان راجپوتوں کے ایک گاؤں میں پہنچے۔ گاؤں کے نمبردار نے ان کے لئے گھاس پھوس کے کھونے کا ایک چھپّر کے اندر بندوبست کیا۔ تکلیف دہ رات وہاں گذارنے کے بعد وہ حیدر آباد پہنچے اور سیتارام بیٹھ میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ جبل پور میں کلثوم زمانی بیگم کے شوہر نے ایک بچی کھچی جڑاؤ انگوٹھی فروخت کی تھی جس سے کچھ دیر کے لئے گذر اوقات ہونے لگی۔ جب رقم ختم ہوگئی تو کلثوم زمانی بیگم کے شوہر نے، جو بڑے اچھے خوش نویس تھے، درود شریف، خط ریحان میں لکھ کر بیچنا شروع کیا۔

اسی اثناء میں افواہ پھیلی کہ نواب لشکر جنگ سے انگریز خفا ہو گئے ہیں۔ اس نواب نے مغل شہزادوں کو پناہ دی تھی۔ یہ دیکھ کر ان بیچاروں کے اوسان خطا ہو گئے اور وہ کئی روز تک گھر سے باہر نہیں نکلے۔ جب بھوکے مرنے لگے تو مجبور ہو کر مرزا ضیاء الدین نے نواب کے لڑکے کو قرآن پڑھانے کی حامی بھرلی۔ اس کے عوض انہیں بارہ روپے ماہوار ملنے لگے۔ لیکن نواب صاحب کا ان سے برتاؤ

اچھا نہیں تھا۔ اس لئے وہ سخت پریشان رہتے۔ اسی دوران میں میاں نظام الدین کو ان شہزادوں اور شہزادیوں کی کسمپرسی کی خبر ملی۔ میاں صاحب حضرت کالے میاں چشتی نظامی فخری کے بیٹے تھے جنہیں بادشاہ دہلی اور نظام دکن اپنا پیر مانتے تھے۔ میاں نظام الدین رات کے وقت خود تشریف لائے اور دیر تک ان کے حالات دریافت کرتے رہے۔ اگلے روز انہوں نے ان کے خرچ کا بندوبست کر دیا اور کہا کہ وہ حج کے لئے تیار ہو جائیں۔ اب حج کی تیاری ہونے لگی۔ حیدر آباد سے روانہ ہو کر وہ پہلے بمبئی پہنچے، جہاں بستی زمیندار کو انعام و اکرام دیکر رخصت کیا اور پھر جہاز میں سوار ہوئے۔

مکے پہنچ کر خدا نے ان کے ٹھہرنے کا اچھا انتظام کر دیا۔ عبدالقادر، جو کلثوم زمانی بیگم کا غلام تھا آزاد ہو کر مکے پہنچ چکا تھا اور ترقی کرتے کرتے زمزم کا داروغہ ہو گیا تھا۔ اُسے جب اُن کے آنے کی خبر ملی تو بھاگا ہوا آیا اور اُن کے رہنے سہنے کا عمدہ بندوبست کیا۔ چند روز بعد سلطان ترکی کا نائب جو مکے میں رہتا تھا۔ آیا اور انہیں بتایا کہ وہ ان کی آمد کی اطلاع اپنے سلطان کو دے رہا ہے اس نے ایک معقول رقم ان کے گذارے کے لئے مقرر کر دی۔ یہ لوگ نو برس تک مکّہ میں مقیم رہے۔ اس کے بعد ایک سال بغداد میں اور ایک سال نجف اور کربلا میں گذارا۔ پھر وہ دِلّی آ گئے یہاں انگریزی حکومت نے ان پر ترس کھا کر دس روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال | مندرجہ ذیل پیراگراف کی تشریح کیجئے۔ حوالہ متن اور سیاق و سباق بھی لکھئے :۔

میاں رات کے وقت میانے میں سوار ہو کر ہمارے پاس تشریف لائے اور ہم کو دیکھ کر بہت روئے۔ ایک زمانہ تھا جب وہ قلعے میں تشریف لاتے تھے تو مسندِ زرنگار پر بٹھائے جاتے۔ بادشاہ بیگم اپنے ہاتھ سے لونڈیوں کی طرح مگس رانی کرتی تھیں۔ آج وہ گھر میں آئے تو ثابوت بوریہ بھی نہ تھا جس پر وہ آرام سے بیٹھ جاتے۔ پچھلا زمانہ آنکھوں میں پھرنے لگا۔ خدا کی شان۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا میاں دیر تک حالات دریافت کرتے رہے۔ اس کے بعد تشریف لے گئے۔ صبح کو پیام آیا کہ ہم نے خرچ کا انتظام کروا دیا ہے اب تم حج کا ارادہ کر لو۔ یہ سُن کر جی باغ باغ ہو گیا اور مکہ معظمہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

جواب | **حوالۂ متن** | یہ پیراگراف خواجہ حسن نظامی کی کہانی "بنت بہادر شاہ" سے لیا گیا ہے جو مصنّف کی کتاب "غدر کے افسانے" میں شامل ہے۔

سیاق و سباق | تشریح طلب عبارت سے پہلے دہلی کے آخری مغل بادشاہ ابو ظفر بہادر شاہ کی بیٹی کلثوم زمانی بیگم اپنی زبانی وہ المناک واقعات بیان کرتی ہیں جو سلطنت کے ختم ہونے کے بعد اُن کے گھرانے کو پیش آئے۔ انگریزوں نے جب تختِ دہلی پر قبضہ کیا اور بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو رنگون

جلا وطن کر دیا تو بادشاہ کی ہدایت کے مطابق کلثوم زمانی بیگم اپنے شوہر مرزا ضیاء الدین، بیٹی زینت زمانی بیگم، بیگم نواب نور محل، حافظ سلطان بادشاہ کی سمدھن اور مرزا عمر سلطان کے ہمراہ جان بچا کر شاہی قلعے سے نکلی اور پہلے کورالی گاؤں گئی اور وہاں سے لُٹ لُٹا کر اجاڑہ ضلع میرٹھ پہنچی۔ وہاں بھی پناہ نہ ملی تو پھر حیدر آباد دکن کا رُخ کیا۔ کورالی گاؤں کے زمیندار بستی نے اس قافلے کے لئے سواری کا بندوبست کیا۔ بہت سی مصیبتیں سہنے کے بعد بالآخر یہ لوگ حیدر آباد دکن پہنچ گئے۔ گزر اوقات کے لئے پہلے ایک جڑاؤ انگوٹھی فروخت کی اور بعد ازاں خطِ ریحان میں درود شریف لکھ کر ہدیہ کرنے لگے۔ جب انگریزوں کا غضب ان کے سرپرست نواب لشکر جنگ پر نازل ہوا تو اس کنبے نے گھر سے نکلنا بند کر دیا۔ مبادہ وہ گرفتار ہو جائے اس موقع پر میاں نظام الدین کو ان کی مصیبت کی اطلاع ملی وہ حضرت کالے میاں چشتی نظامی کے صاحبزادے تھے اور بادشاہ سلامت ان کی بے حد عزت کرتے تھے۔ وہ اور نظام دکن انہیں اپنا پیر و مرشد تصور کرتے تھے۔

تشریح طلب پیرے کے بعد بتایا گیا ہے کہ میاں نظام الدین نے نہ صرف ان شہزادے، شہزادیوں کے گزر بسر کا انتظام کیا بلکہ انہیں حج پر جانے کے لئے آمادہ کیا اور سفر کے لئے رقم بھی مہیا کر دی۔ یوں اس گھرانے کی پریشانیاں ختم ہوئیں۔ یہ لوگ نو برس مکہ میں، ایک سال بغداد میں اور ایک سال نجف اور کربلا میں رہے بالآخر وہ دہلی واپس لوٹ آئے جہاں انگریزی سرکار نے ان کی دس روپیہ ماہوار پنشن مقرر کر دی۔

تشریح | میاں نظام الدین جو بادشاہ دہلی بہادر شاہ ظفر اور نظامِ حیدر آباد دکن کے پیر و مرشد حضرت کالے میاں چشتی نظامی فخری کے صاحبزادے تھے، مصیبت زدہ مغل شہزادے اور شہزادیوں کی حیدر آباد دکن میں آمد کی خبر سُن کر رات کے وقت ان کے گھر تشریف لائے۔ شہزادی کلثوم زمانی بیگم بتاتی ہیں کہ میاں صاحب پالکی میں سوار ہو کر آئے اور ہماری خستہ حالی دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ان کی نظروں میں وہ وقت پھر گیا جب ہماری سلطنت قائم تھی اور وہ شاہی قلعہ میں تشریف لایا کرتے تھے اور ایک ایسے تخت پر بٹھائے جاتے تھے جس پر سنہری بیل بوٹے کاڑھے گئے تھے اور جو صرف امراء کے لئے وقف تھا۔ بادشاہ دہلی کا پیر ہونے کی وجہ سے احترام کے طور پر، خود بادشاہ بیگم اپنے ہاتھ سے انہیں پنکھا جھلتی تھیں اور باندیوں کی بجائے آپ یہ خدمت انجام دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتی

تھیں۔ مگر ہماری موجودہ حالت یہ تھی کہ انہیں آرام سے بٹھانے کے لئے ثابت وسالم ایک بوریہ بھی گھر میں نہیں تھا۔ انہوں نے جب ہماری یہ حالت دیکھی اور اس کا مقابلہ ہمارے ماضی کی شان وشوکت کے ساتھ کیا تو انہیں بے حد رنج ہؤا۔ اللہ کی شان ہے کہ پہلے ہم کیا تھے اور اب ہماری کیا حالت ہو گئی تھی۔ میاں نظام الدین کافی دیر تک ہماری دلجوئی کے لئے ہمارے پاس بیٹھے رہے اور ہم پر بیتنے والے سارے حالات معلوم کرتے رہے اس کے بعد وہ اپنے گھر چلے گئے اور صبح کے وقت انہوں نے پیغام بھیجا کہ تمہارے لئے خرچ کا بندوبست کر دیا گیا ہے۔ بس اب تم لوگ حج پر جانے کی تیاری کر لو۔ جب ہم نے یہ خبر سُنی تو ہم سب بے حد خوش ہوئے۔ اب ہمارا گھرانہ مکّہ معظمہ جانے کے لئے تیاریاں کرنے لگا ؛

غلام عبّاس (۱۹۰۹ء-۱۹۸۲ء)

گوندنی والا تکیہ

تعارف اور پس منظر

"گوندنی والا تکیہ"، غلام عباس کا ایک ناولٹ ہے، جس کا پہلا باب نصاب میں شامل کیا گیا ہے مصنّف نے اس کا پس منظر بیان کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "گوندنی والے تکئے کا خیال مدّت ہوئی، مجھے لاہور میں سوجھا تھا، جہاں ایسے تکئے بہ کثرت ہیں یا ہوا کرتے تھے۔ یہ تکئے غریب غرباء اور ناخواندہ لوگوں کے لئے وہی کام دیتے تھے جو امراء اور پڑھے لکھے طبقوں کے لئے شہروں کے کلب گھر، مقصد دونوں کا تفریح بہم پہنچانا ہوتا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ ایک بہت سستی قسم کی تفریح ہوتی تھی اور دوسری، بہت مہنگی قسم کی تفریح۔" مصنف کو اپنے لاہور کے قیام کے دوران کبھی کبھار مختلف قسم کے تکیوں میں جانے کا اتفاق ہوتا رہتا تھا۔ اس کا محرک کبھی پنجابی کا کوئی مشاعرہ ہوتا تھا، کبھی دو نامی گرامی گویّوں کے استادی گانوں کا مقابلہ اور کبھی قوالی کی کوئی محفل۔ "گوندنی والا تکیہ" پہلے پہل ۱۹۵۳ء میں رسالہ "ماہِ نو" کراچی میں بارہ قسطوں میں چھپا اور پھر کتابی شکل میں ۱۹۸۲ء میں لاہور سے شائع ہوا۔

"گوندنی والا تکیہ کی کہانی سلطان کی زبانی بیان کی گئی ہے جو بیس برس بعد اپنے گاؤں لوٹتا ہے۔ کہانی کے دیگر کرداروں میں مَولو، مہتاب بی بی، نگینہ سائیں، استاد خدا بخش فلک شمس الدین پٹواری، چودھری رحمت علی اور خورشید بیگم زیادہ اہم ہیں، کیونکہ ناولٹ کی کہانی انہیں کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ "گوندنی والا تکیہ" کی پوری کہانی کا خلاصہ یہ ہے (جو ناولٹ میں تو موجود ہے لیکن موجودہ نصاب میں اس کا صرف ایک حصّہ دیا گیا ہے):

سلطان اور مَولو، دو نوجوان دوست ایک ہی قصبے میں رہتے تھے۔ سلطان کے ماں باپ فوت ہو چکے تھے اور اس کا سرپرست اس کا چچا چودھری رحمت علی تھا۔ مڈل پاس کرنے کے بعد سوائے ناول اور سفرنامے پڑھنے کے، اُسے اور کوئی کام نہیں تھا۔ مَولو، ایک غریب کسان کا بیٹا تھا جو کھیتی باڑی میں اپنے باپ کا ہاتھ بٹاتا تھا۔ اسی گاؤں میں استاد خدا بخش فلکؔ کی بیٹی مہتاب بی بی بھی رہتی تھی۔ جو اپنے باپ کے قصبے سے باہر چلے جانے کی وجہ سے پٹواری شمس الدین کے گھر میں پرورش پا رہی تھی۔ پٹواری

چاہتا تھا کہ مہتاب کی شادی اپنے لنگڑے بھتیجے کے ساتھ کر دے، کیونکہ اس کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔
مولو، نے مہتاب کو گاؤں کے کنوئیں پر پانی بھرتے دیکھا تو اُس کی محبت میں گرفتار ہو گیا۔ لیکن مہتاب سلطان کو چاہتی تھی، اگرچہ اس نے زبان سے کبھی اس کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اُستاد خدا بخش فلک کا قصہ یہ ہے کہ وہ لڑکپن میں گھر سے بھاگ گیا تھا۔ شہر جا کر کوئی اور کام نہ ملا تو شاعر بن گیا۔ وہ پنجابی نظمیں لکھ کر شائع کرتا اور خود ہی انہیں بیچتا تھا۔ جب اس کا باپ فوت ہو گیا تو وہ گاؤں واپس آ کر اپنی ماں کے پاس رہنے لگا۔ جس نے ایک لڑکی سے اس کی شادی کر دی۔ کچھ عرصہ بعد اس کے گھر مہتاب پیدا ہوئی۔ تین چار برس بعد اس کی بیوی سیڑھیوں سے گر کر ہلاک ہو گئی، اس اثناء میں اس کی ماں بھی فوت ہو چکی تھی۔ اس لئے اُس نے گاؤں کے پٹواری شمس الدین سے التجا کی کہ وہ اس کی کمسن بچی کی پرورش کا ذمہ لے۔ اس نے یہ وعدہ کیا کہ وہ لاہور شہر جا کر بچی کا خرچہ وغیرہ بھیجتا رہے گا۔ مگر وہ زمانہ معاشی بدحالی کا تھا اور خدا بخش کا ہاتھ بہت تنگ رہتا تھا، اس لئے وہ پٹواری کو کچھ نہ بھیج سکا تاہم بچی، پٹواری کے گھر میں پلتی رہی اور آہستہ آہستہ جوان ہو گئی۔ اسی دوران خدا بخش روزی کمانے کے لئے سنیاسی دوا فروش بن گیا۔ کچھ آمدنی اسے دوائیاں بیچنے سے ہوتی اور کچھ مشاعروں میں شرکت سے۔ یوں اس کی گذر بسر ہونے لگی۔

ایک دن اچانک خبر ملی کہ استاد خدا بخش فلک، شہر کی ایک عورت خورشید بیگم کے ہمراہ گاؤں آیا ہے۔ عورت کو اس نے ایک ٹھیکیدار کی بیوہ بتایا اور اس کی آمد کا مقصد یہ ظاہر کیا کہ وہ اپنے چھوٹے بھائی کا رشتہ مہتاب سے طے کرنے کے لئے اُسے دیکھنے آئی ہے۔ حقیقت میں خدا بخش اس عورت سے خود شادی کرنا چاہتا تھا۔ یہ دیکھ کر شمس الدین پٹواری آڑے آیا کیونکہ وہ خود مہتاب کو اپنے لنگڑے بھتیجے سے بیاہنا چاہتا تھا۔

مولو کو جب معلوم ہوا کہ مہتاب کی مرضی کے خلاف اس کی شادی کی بات ہو رہی ہے، تو اس نے سلطان کو مشورہ دیا کہ وہ خود مہتاب سے شادی کر لے۔ سلطان جانتا تھا کہ مولو مہتاب کو اپنی دلہن بنانا چاہتا ہے لیکن غربت کی وجہ سے اپنی خواہش کا اظہار نہیں کرتا۔ چنانچہ سلطان نے نگینہ سائیں کو، جو گوندنی والے تکیئے کا متولی تھا، اعتماد میں لیا اور اسے پانچ سو روپے یہ کہہ کر دیئے کہ اس کے مرحوم والد چودھری حشمت علی نے یہ رقم کسی نیک کام میں خرچ کرنے کے لئے اُسے دی تھی اور یہ کہ نگینہ سائیں اس رقم سے گاؤں میں زمین کا ایک ٹکڑا مولو اور اس کے باپ چراغ کو، مہتاب بی بی کے جہیز کے طور پر لے دے اور پھر مولو سے مہتاب کی شادی کروا دے۔

اُدھر استاد خدا بخش فلک نے پٹواری شمس الدین سے اپنی بیٹی واپس لینے کے لئے ایک اور چال چلی۔ اُس نے گاؤں میں ایک زبردست مشاعرے کے انعقاد کا اعلان کیا اور مختلف شہروں سے اپنے واقف پنجابی شاعروں کو اس میں شرکت کی دعوت دی۔ اُس نے اپنے شاگردوں قائم دین قصائی، فضل دین فضلو عرف خستہ کبابی اور چھبے خاں پہلوان کو خاص طور پر بلایا تاکہ اگر پٹواری اُس کی بیٹی کو واپس کرنے میں لیت و لعل سے

کام لے تو اس سے اچھی طرح نبٹا جا سکے۔ چنانچہ مشاعرہ ہؤا اور اتنا کامیاب ہؤا کہ استاد خدا بخش فلک کی قصبے میں دھاک بیٹھ گئی۔

ادھر ٹھیکیدارنی سے نجات حاصل کرنے کے لئے سلطان اور مَولو دونوں خورشید بیگم کے پاس آئے جو گاؤں کی ایک سرائے میں ٹھہری ہوئی تھی اور اسے بتایا کہ استاد خدا بخش اور پٹواری شمس الدین دونوں مہتاب کی وجہ سے ایک دوسرے کی جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ استاد نے شہر سے اپنے خاص شاگرد بلائے ہوئے ہیں، جن کے پاس چھُریاں اور چاقو موجود ہیں۔ پٹواری نے بھی اپنی حمایت کے لئے چھٹے ہوئے بدمعاش جمع کر لئے ہیں اور مشاعرے کے بعد خون خرابے کا اندیشہ ہے استاد فلک نے خورشید بیگم کی طرف ان دونوں کو اس لئے بھیجا ہے کہ وہ اسے حفاظت سے سرائے سے نکال کر سٹیشن پر پہنچا دیں اور اُسے لاہور جانے والی گاڑی پر بٹھا دیں۔ بعد میں استاد فلک بھی لاہور پہنچ جائے گا۔ خورشید بیگم ان کے کہنے میں آ گئی اور چپکے سے ان کے ساتھ چل دی۔ سلطان اور مَولو اُسے گاڑی پر بٹھا کر واپس گاؤں لوٹ آئے۔

جب استاد فلک مشاعرہ ختم ہونے کے بعد سرائے میں آیا تو خورشید کو غائب پایا۔ نگینہ سائیں جسے سارے واقعے کا علم تھا، استاد فلک سے ملا اور اسے مشورہ دیا کہ وہ مَولو سے مہتاب کی شادی کر دے کیونکہ خورشید بازاری عورت تھی جو اُسے دھوکہ دے کر بھاگ گئی ہے۔ اگر اس نے خورشید کے بھائی سے اپنی بیٹی کی شادی کی تو اچھا نہ ہوگا۔ استاد فلک مان گیا

اگلے روز نگینہ سائیں نے قصبے میں پنچایت اور گاؤں کے لوگوں پر ساری صورت حال واضح کر کے تجویز پیش کی کہ مہتاب بی بی کی شادی نوجوان مَولو سے کر دی جائے۔ اس پر پٹواری شمس الدین نے احتجاج کیا اور اپنا حق جتانا چاہا لیکن اُسے یہ کہہ کر خاموش کر دیا گیا کہ اگر وہ چاہے تو مہتاب کی پرورش پر اُٹھنے والا خرچ واپس لے سکتا ہے۔ اسی موقع پر سائیں نگینہ نے سلطان کے دیئے ہوئے پانچ سو روپے سے مَولو اور مہتاب کے لئے زمین کا ٹکڑا خریدنے اور لڑکی کو جہیز میں دینے کا اعلان بھی کیا اس نے یہ واضح کیا کہ یہ رقم چوہدری حشمت علی مرحوم نے مرنے سے پہلے اُسے نیکی کے کسی کام میں خرچ کرنے کے لئے دی تھی۔ استاد فلک نے بھری پنچایت میں اس فیصلے سے اتفاق کیا اور یوں مَولو کی مہتاب سے شادی طے ہو گئی۔

اُسی رات سلطان نے گاؤں چھوڑ دیا اور کسی کو بغیر اطلاع دیئے گھر سے سیر و سیاحت کے لئے غائب ہو گیا۔ جب مہتاب کو یہ معلوم ہؤا تو غم کے مارے اُس کا کھانا پینا چھوٹ گیا۔ پہلے اُسے تیز بخار رہنے لگا اور پھر ایک دن وہ اچانک چل بسی۔ مَولو کو مہتاب کی سہیلی زینب کے ذریعے معلوم ہو چکا تھا کہ مہتاب مَولو کی بجائے سلطان کو چاہتی تھی۔ سلطان نے مَولو کے لئے قربانی دی لیکن

یہ قربانی اس کے کسی کام نہ آئی۔ سلطان چونکہ مہتاب کے دلی جذبات سے بے خبر تھا اس لئے بیس سال بعد اصل صورت حال جان کر بے حد غمگین ہوا۔ مولو نے ہی اسے بتایا کہ اس کے غائب ہونے کے پانچ چھ برس کے اندر اندر اس کی جان پہچان کے تمام لوگ فوت ہو گئے تھے اور گوندنی والا تکیہ اُجڑ گیا۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۲۸ | خدا خدا کر کے: بڑی مشکل سے۔ طولانی: لمبا۔ جمگھٹ: ہجوم۔ خطۂ زمین: زمین کا ٹکڑا۔ آبائی: باپ دادا کا۔ تکان: تھکن، سستی۔ بے خوابی: نیند نہ آنا۔ حُبِ وطن: وطن کی محبت۔ سوز و گداز: رنج آمیز حالت، جلنے اور پگھلنے کی کیفیت۔ عرفانی: روحانی۔ خدا کو پہچاننے والی۔ اجنبیت: بیگانگی، غیریت، نامانوس۔ منزلِ مقصود: وہ جگہ جہاں پہنچنے کا ارادہ ہو۔ دل برداشتہ: دل اُچاٹ ہو جانا، بیزار ہونا، طبیعت کا ہٹ جانا۔

ص ۲۹ | اُمنگیں: ولولے، شوق۔ آزادی کی دُھن: آزادی حاصل کرنے کی لگن یا شوق۔ منہ اٹھا کر چلنا: بے پروا ہو کر چلنا۔ راستے کو دیکھے بغیر چلنا۔ سیاحت: سیر اور سفر۔ معاش: روزی کمانا۔ خاک چھنوانا: آوارہ گردی کروانا۔ ثروت: مال کی کثرت، دولت۔ محال: بہت مشکل، تقریباً ناممکن۔ نیک بخت: اچھے نصیبوں والی، مراد ہے عورت۔ پاؤں میں بیڑیاں ڈالنا: پابند ہو جانا، بیوی یا بال بچوں میں پھنس جانا۔ دیارِ غیر: اجنبی ملک۔ امور: امر کی جمع، مراد ہے کام۔ ناگزیر: لازمی، ضروری۔ جنم بھوم: پیدا ہونے کی جگہ، جائے پیدائش۔ وُرثا: وارث کی جمع، مرنے والے کے قریبی عزیز جو جائیداد اور مال و دولت میں حصہ پاتے ہیں۔ عدم موجودگی: غیر حاضری۔ تکمیل: پورا ہونا، انجام دینا۔ لہٰذا: اس لئے۔ برس: سال اجاڑ: ویران۔ چہل پہل: رونق۔ اِکّہ: ٹانگہ۔

ص ۳۰ | کوچوان: ٹانگہ چلانے والا۔ نسبتاً: دوسروں کے مقابلے میں۔ چھپرے: چھپڑ کے بنے۔ گرد و پیش: آس پاس۔ پختہ: پکّی۔ گھروندے: مٹی کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے گھر۔ خال خال: کوئی کوئی، اِکا دُکا۔ پارک: باغ، گھرا ہوا مقام جس میں سبزہ اور درخت ہوں۔ مگن: مست، خوش۔ بیگانگی: اجنبیت، غیر ہونا، پرایا ہونا۔ بھولی بسری یاد: پرانی یاد جو بھول گئی ہو۔ نکڑ: کونا، موڑ وہ جگہ جہاں ایک راہ ختم ہو کر دوسری شروع ہو۔ وگرنہ: ورنہ۔ سرائے: مسافروں کے ٹھہرنے کی جگہ، مسافر خانہ۔

ص ۳۱ | مینجر: انتظام کرنے والا۔ تپاک: گرم جوشی، آؤ بھگت۔ بلا تکلف: بغیر جھجک کے۔ حتی الامکان: جہاں تک ممکن ہوا۔ ادھیڑ عمر: درمیانی عمر کا، نہ نوجوان نہ بوڑھا۔ چاق و چوبند: چست و چالاک۔ چرب زبان: چالاک، چکنی چپڑی باتیں کرنے والا۔ قصباتی پن: گنوار پن۔ ان پڑھ اور غیر مہذب

ہونے کا احساس۔ قدیمی باشندہ: پرانا رہنے والا۔ کشادہ: کھلا، چوڑا۔ نواڑی پلنگ: وہ پلنگ جو سوت کے چوڑے فیتے سے بُنا جائے۔ وضع: بناوٹ، ساخت۔ شکل وصورت۔ علاوہ ازیں: اس کے علاوہ۔ دیسی ساخت: اپنے ملک کا بنا ہوا۔ قطعات: اچھے کاتبوں کے قلم سے لکھے ہوئے اشعار جو فریم کر کے زینت کے لئے لگائے جاتے ہیں۔ چوکھٹا: فریم۔ معمّر: بوڑھا۔ پروپرائٹر: مالک۔ منقش: بیل بوٹے والی جس پر نقش ونگار بنے ہوئے ہوں۔ راکھ دانی: انگریزی میں ایش ٹرے، سگریٹ کی راکھ جھاڑنے کیلئے بنائی گئی چیز۔ حتی المقدور: جہاں تک بس میں ہو، ہمت کے مطابق، جس حد تک ممکن ہو۔ اکتفا کرنا: کافی سمجھنا۔ دراز ہونا: لیٹ جانا۔ آنکھ لگنا: سو جانا۔

ص ۳۲ | طبیعت بحال ہونا: مزاج درست ہونا۔ طبیعت بھرنا: دل اُکتا جانا۔

کشاں کشاں: زبردستی کھینچ کر لاتے ہوئے۔ دِقت: مشکل پیش آنا۔ بالآخر: آخرکار، بعد میں۔ حویلی: بڑا اور پختہ مکان۔ نال گڑنا: بچے کی آنول زمین میں دبانا، کسی جگہ سے تعلق ہونا۔ مراد، جائے پیدائش۔ جدِ امجد: بزرگ دادا جان۔ اقربا: رشتے دار۔ سکونت: رہائش۔ شکست وریخت: ٹوٹ، پھوٹ۔ آثار: نشانیاں۔ ہویدا: ظاہر۔ بے توجہی: لاپروائی۔ ریٹھا: سیاہی مائل چھوٹا سا سخت گول قسم کا پھل جو اونی کپڑے دھونے کے کام آتا ہے غریب بچے کانچ کی گولیوں کی بجائے ان سے کھیلتے ہیں۔

ص ۳۳ | شفقت: مہربانی۔ پل بھر: ذرا سی دیر کے لئے۔ بیگانگی: اجنبیت۔ طلسم: جادو۔ یک لخت: اچانک۔ مُسلّط: طاری، سر پر سوار، وہ جو کسی پر غالب کر دیا جائے۔ دل بھر آنا: غمگین ہونے سے آنکھوں میں آنسو آ جانا۔ طواف کرنا: کسی چیز کے گرد پھرنا۔ تکیہ: فقیر کے رہنے کی جگہ۔ گوندنی: ایک درخت جس پر سنہرے رنگ کا گچھوں والا گول لیسدار پھل لگتا ہے۔ پیڑ: درخت۔ سائیں: فقیر، درویش، مالک، قبر کا مجاور۔ کان اینٹھنا: سزا کے طور پر کان کھینچنا۔ قاعدہ: طریقہ۔ ٹھیکہ: مقررہ میعاد کے لئے کسی چیز کے استعمال کا حق حاصل کرنا یا ذمے داری لینا۔

ص ۳۴ | ہر پھر کر: پھر پھرا کے، مجبور ہو کر، بار بار۔ چار دیواری: گھر کا احاطہ۔ آثار: نشانیاں، علامات۔ بخارچہ: وہ چمنی جو چھت میں دھواں نکلنے کے لئے بناتے ہیں۔ معمّر: بوڑھا۔ سر سے پیر تک: مکمل طور پر، پورے وجود پر۔ بجا فرمانا: درست کہنا۔

ص ۳۵ | ناگوار خاطر: دل کو بُرا لگنا۔ آگاہ: واقف۔ ممنون: احسان مند، شکر گزار۔ متولی: کسی وقف ملکیت کا انتظام کرنے والا۔ جائداد یا جگہ کا نگران۔ نگینہ سائیں: بچپن برس کا ایک فقیر جو گوندنی والے تکیے میں رہتا تھا۔ چرس کے دم لگنا: چرس پینا۔ چرس ایک قسم کی نشے والی چیز ہے۔ جیسے تمباکو کی طرح پیتے ہیں۔ بھنگ: ایک نشہ آور بوٹی جو گھوٹ کر پی جاتی ہے۔ اوباشی: بدمعاشی۔ بازاری عورتیں: بدمعاش عورتیں۔ کھلم کھلا: بغیر روک ٹوک کے۔ مسمار: گرانا

مستان شاہ : ایک بزرگ جن کے مزار پر ہر سال عرس ہوتا تھا۔ مجاور : درگاہ یا متبرک مقام کا خادم۔ معلّم : استاد۔ دنگ رہ جانا : حیران رہ جانا۔ خلوصِ دل : نیک نیتی۔

ص ۳۶ | گوشہ : کونہ۔ بوسیدہ : پھٹی پرانی۔ سرہانے : سر کی طرف۔ فاتحہ پڑھنا : مردے کی روح کے لئے سورۂ فاتحہ (الحمد شریف) کی آیات پڑھنا۔ افسردگی : اداسی، رنج۔ قلق : غم۔ حق بجانب : سچائی اور حق پر ہونا۔ غربا : غریب کی جمع۔ مونس : دوست، الفت رکھنے والا۔ علی الصبح : صبح سویرے۔ بھیروں : ایک راگ۔ اللہ ہو : وہ اللہ۔ اللہ جلِ شان اللہ : جلالت والی شان والا اللہ۔ الاپ : نغمہ، آواز کا اتار چڑھاؤ، تان، سُر۔ حال : جذب وکیف۔ قال : وعظ ونصیحت۔ حال و قال : مستی و بے خودی کی حالت اور بیانِ عشقِ خداوندی وغیرہ۔ قوالی گانا۔ مشاعرہ : شاعروں کا جمع ہو کر شعر پڑھنا۔ پالیاں : پرندوں کی لڑائی کے مقامات۔ گویّے : گانے والے۔ چہکارنا : خوش ہو کر گانا، چہچہانا۔ نومشق : اناڑی۔ ستار : ایک مشہور باجا۔ گت بجانا : ستار کی لَے چھیڑنا۔ چوپڑ : چوسر کی بساط جو چار کونوں والی ہوتی ہے اور جس پر گوٹیں رکھ کر کھیلی جاتی ہیں۔ ہیر : وارث شاہ کی لکھی ہوئی طویل پنجابی نظم جس میں پنجاب کے مشہور رومانی جوڑے ہیر اور رانجھا کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ دم بخود : محو حیران، خاموش۔ کانچ : شیشہ۔ ریٹھا : گولی نما سیاہ پھل جس سے بچے کھیلتے ہیں۔ پچیت : چانٹا، چپیڑ۔ بلند بالا : اونچے قد کا۔ لمبا تڑنگا۔ مالا : موتیوں کا ہار۔

ص ۳۷ | کملی : کمبل۔ نیم برہنہ : آدھا ننگا۔ دیوانہ : پاگل۔ فرزانہ : عقل مند۔ کہہ و مہ : چھوٹا بڑا، ادنیٰ و اعلیٰ۔ مستعد : تیار، آمادہ۔ خنکی : ٹھنڈک۔ نیم تاریکی : کچھ کچھ اندھیرا۔ اکڑوں : زمین پر اس طرح بیٹھنا کہ جسم کا سارا بوجھ پاؤں پر رہے۔ بعنوان : عنوان یا نام والا۔

سبق کا خلاصہ

یہ کہانی سلطان کی زبان سے بیان ہوئی ہے جو پندرہ سال کی عمر میں سیر و سیاحت کے شوق اور معاش کی تلاش میں، اپنا گاؤں چھوڑ کر سمندر پار ایک غیر ملک میں بس گیا تھا۔ بیس برس بعد بعض کاروباری امور کے سلسلے میں وہ وطن واپس آیا تو اپنی جائے پیدائش کو ایک نظر دیکھنے کے لئے اپنے قصبے میں آیا۔ گاؤں آنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ اس میں اس کی کچھ آبائی جائیداد بھی تھی جس کی فروخت کے لئے اس کا آنا ضروری تھا۔

سلطان کہتا ہے کہ ریل کا لمبا سفر طے کر کے جب وہ اپنے قصبہ کے چھوٹے سے اسٹیشن پر اُترا تو تھکن، سردی اور بے خوابی کی وجہ سے اُسے وہ روحانی خوشی نصیب نہ ہوئی جو عموماً وطن پہنچ کر لوگوں کو

ہؤا کرتی ہے۔ بلکہ اس کی بجائے قدرے غیریت کا احساس ہؤا۔ در اصل ابھی وہ بچّہ ہی تھا کہ اس کے والد کا انتقال ہوگیا۔ پندرہ سال کی عمر میں اس کی والدہ فوت ہوئی۔ اس کا نہ کوئی بھائی تھا اور نہ بہن، اس لئے ایک رات اچانک وہ گاؤں چھوڑ کر پرائے دیس چلا گیا جہاں کچھ عرصہ کی کوشش کے بعد اس کا کاروبار جم گیا اور وہیں اس نے شادی بھی کرلی۔ اس طرح وہ اجنبی ملک میں ہمیشہ کیلئے بس گیا۔

بیس برس کے بعد اب وہ اپنے کچھ کاروباری امور نبٹانے اور اپنی آبائی جائیداد فروخت کرنے کے لئے وطن واپس لوٹا تو اپنا گاؤں دیکھنے چلا آیا۔ وہ یہ دیکھ کر حیران ہؤا کہ اگرچہ سٹیشن میں کوئی خاص تبدیلی نہیں ہوئی تھی لیکن قصبہ بہت پھیل گیا تھا۔ سٹیشن پر ٹانگوں اور ٹیکسیوں کے الگ الگ اڈے بن گئے تھے اور قصبے میں کئی ہوٹل کھل گئے تھے، جا بجا پختہ اینٹوں کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں اور ایک پارک میں لوگ دھوپ میں دل بہلا رہے تھے۔ سلطان اس ہوٹل میں آ کر ٹھہرا جہاں اس کے وکیل نے اسے ٹھہرنے کی ہدایت کی تھی۔ فروخت کی جانے والی جائیداد کے دوسرے وارث اس کے چچیرے بھائی اور بہنیں تھیں، جنہیں اگلے روز پہنچنا تھا۔ اس لئے وہ اب اپنے آبائی قصبے کو جی بھر کر دیکھ سکتا تھا۔

ہوٹل کے مینجر نے جو درمیانی عمر کا چست و چالاک آدمی تھا اسے ممکنہ حد تک مطمئن کرنے کی کوشش کی۔ سلطان نے اپنا سامان رکھنے کے بعد تھوڑی دیر آرام کیا اور پچھلے پہر قصبے میں گھومنے پھرنے کے لئے نکل آیا۔ نئی آبادی کی بجائے اُس کا رُخ اس علاقے کی طرف تھا جہاں اس نے اپنا بچپن گذارا تھا۔ گو نئے بازار اور سڑکیں بن جانے کی وجہ سے اسے راستہ معلوم کرنے میں دِقّت ہوئی لیکن آخر کار وہ اس حویلی کے سامنے جا کھڑا ہؤا جہاں وہ پیدا ہؤا تھا۔ یہ اور اس کے ساتھ والی حویلی دونوں اس کے دادا نے تعمیر کرائی تھیں اور اب ان کی فروخت کا مسئلہ درپیش تھا۔ کیوں کہ اس کے عزیز و اقارب بھی اس قصبے کو چھوڑ کر شہروں میں بس گئے تھے اور اس درمیانی عرصہ میں یہ حویلیاں کرائے پر دے دی گئی تھیں۔

سلطان نے دیکھا کہ اس جگہ کوئی نمایاں تبدیلی نہیں ہوئی تھی۔ اُسے یاد آیا کہ حویلی سے کچھ دور ایک کھلا میدان ہؤا کرتا تھا جہاں بچے کھیلا کرتے تھے اور یہیں "گوندنی والا تکیہ" بھی ہوا کرتا تھا کیونکہ اس جگہ گوندنی کے آٹھ دس درخت تھے۔ لڑکے ان درختوں کی چھاؤں میں کھیلتے اور جب پھل پکنے کا موسم آتا تو پیڑوں پر چڑھ کر گوندنی توڑا کرتے۔ تکیے کا مجاور، سائیں نگینہ، انہیں گوندنی توڑنے سے منع نہیں کرتا تھا۔ لیکن اگر کوئی لڑکا کسی درخت کی شاخ توڑتا تو پھر وہ بے حد ناراض ہوتا اور آئندہ اس لڑکے کو درخت پر چڑھنے نہ دیتا۔

سلطان جب اس جگہ پہنچا تو یہ دیکھ کر بہت حیران ہؤا کہ وہاں نہ میدان تھا اور نہ تکیہ

البتہ آس پاس پختہ مکان بن گئے تھے اور جس جگہ تکیہ ہؤا کرتا تھا وہاں چار دیواری کھینچ کر مدرسہ بنا دیا گیا تھا۔ ایک بوڑھے آدمی سے پوچھنے پر سلطان کو پتہ چلا کہ پندرہ سولہ برس پہلے سائیں نگینہ کا انتقال ہوگیا تھا جس کے مرنے کے بعد یہ جگہ بدمعاشی کا اڈہ بن گئی، اس لئے محلہ والوں نے تکیہ گرا کر ایک مدرسہ قائم کر دیا۔ البتہ مستان شاہ بزرگ کا مزار اور گوندنی کا ایک درخت برقرار رہنے دیا گیا۔ سلطان جب احاطے کے اندر داخل ہؤا تو اسے ایک کونے میں گوندنی کے درخت کے نیچے مستان شاہ کی قبر نظر آئی جس پر سبز رنگ کی پھٹی پرانی چادر پڑی تھی۔ اُسے وہ زمانہ یاد آگیا جب یہ تکیہ آباد تھا اور صبح سویرے گوئیے بھیروں راگ گاتے، قوالی کی محفلیں لگاتے، پنجابی کے مشاعرے ہوتے، بٹیروں کی لڑائیاں ہوتیں، موسیقی کے مقابلے ہوتے، چوسر کھیلی جاتی، ہیر پڑھی جاتی، بچے کھیلتے اور لڑتے جھگڑتے تھے۔

پھر سلطان کو نگینہ سائیں یاد آیا جو اس تکیے کا مجاور ہؤا کرتا تھا۔ لمبے قد والا سائیں، گلے میں رنگ برنگے منکوں کی مالا ڈالے، سردی گرمی میں اپنی پرانی کملی اوڑھے کبھی عالمِ ہوش میں اور کبھی عالمِ بے خودی میں، ہر بڑے چھوٹے کی خدمت میں مصروف پایا جاتا۔ گوندنی کے پھل کے کئی ٹھیکیدار آتے اور اُسے ہر سال معقول رقم کی پیشکش کرتے لیکن وہ ان کی پیشکش ٹھکرا دیا کرتا اور کہا کرتا تھا کہ اس پھل پر بچوں کا حق ہے۔

شام ہونے پر کمرے میں ٹھنڈک ہوگئی تھی لیکن سلطان بلب جلائے بغیر کمبل اوڑھ کر آرام کرسی پر بیٹھا رہا اور تصور میں وہ زمانہ دیکھنے لگا جب گوندنی والا یہ تکیہ بڑا پُر رونق ہؤا کرتا تھا۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی بحوالۂ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

وہ علی الصبح تکیے سے بھیروں کے میٹھے سُروں میں اللہ ہو جل شان اللہ کی الاپ کا بلند ہونا، وہ حال و قال کی محفلیں، وہ پنجابی کے مشاعرے، وہ بٹیروں کی پالیاں، وہ گویّوں کے مقابلے، وہ گوندنی کی شاخوں میں لٹکے ہوئے تیتروں کا "سبحان تیری قدرت" پکارنا، کسی پیڑ کی چھاؤں میں کوئی نومشق ستار پر گت بجا رہا ہے۔ کہیں چوپڑ کھیلی جا رہی۔ کہیں ہیر پڑھی جا رہی ہے۔ اور سننے والے دم بخود بیٹھے ہیں۔ پاس ہی بچے کانچ اور ریٹھے کی گولیوں سے کھیل رہے ہیں۔ کبھی کبھی ان کے لڑنے، جھگڑنے اور شور مچانے پر بڑوں میں سے کوئی اُٹھتا ہے اور دو ایک کے چپت لگا جاتا ہے۔ ذرا بچے پھر کھیلنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

جواب **حوالہ متن** یہ عبارت غلام عباس کے ناولٹ "گوندنی والا تکیہ" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنف نے کہانی کے واحد متکلم (میں) جس کا ناولٹ میں نام

سلطان ہے، کے بیس برس بعد غیر ملک سے، اپنے گاؤں آنے کا ذکر کیا ہے جو گاؤں میں غیر معمولی تبدیلی کے آثار دیکھتا ہے۔ گاؤں جو کافی پھیل گیا ہے اور یہاں نئی نئی عمارتیں بن گئی ہیں۔ نئی آبادی دیکھنے کے بعد وہ اپنی آبائی حویلی دیکھنے جاتا ہے جس کے آس پاس کوئی قابل ذکر تبدیلی نہیں ہوئی البتہ حویلی کے قریب جو میدان اور "گوندنی والا تکیہ" پہلے موجود تھا، وہ اب غائب ہو چکا ہے۔ وہاں اونچی اونچی پختہ عمارتیں کھڑی ہیں اور تکیے کی جگہ ایک مدرسہ بن گیا ہے۔ پرانی نشانی کے طور پر صرف مستان شاہ کا مزار اور گوندنی کا ایک پیڑ رہ گیا ہے۔ کہانی بیان کرنے والے (میں) کو وہ زمانہ یاد آتا ہے جب گوندنی والا تکیہ آباد تھا اور یہاں دن رات چہل پہل رہا کرتی تھی۔

اس عبارت کے بعد گوندنی والے تکیے کے مجاور نگینہ سائیں کا ذکر ہے، جس کی بدولت اس تکیے میں رونق تھی۔ سائیں لمبے قد کا پچاس پچپن برس کی عمر کا آدمی ہے اور ہر وقت گلے میں رنگ برنگ منکوں کی مالا پہنے رہتا ہے۔ سردی ہو یا گرمی، ایک پرانی کملی اس کے نیم برہنہ جسم کو ڈھانپے رکھتی ہے، وہ ہر حالت میں امیر و غریب کی خدمت پر کمر بستہ رہتا ہے۔ آخری پیرے میں پھر سلطان (میں) کا ذکر ہے جو ہوٹل کے کمرے میں شام کے وقت بغیر بلب جلائے، کمبل اوڑھ کر، آرام کرسی پر اکڑوں بیٹھ جاتا ہے اور گوندنی والے تکیے کا پھر تصور کرنے لگتا ہے، جو اپنی تمام تر رونقوں کے ساتھ اس کی نظروں میں پھرنے لگتا ہے۔

تشریح گوندنی والے تکیے میں صبح سویرے گویّے چلے آتے اور ریاض شروع کر دیتے۔ وہ راگ بھیروں کی شیریں تانوں میں "اللہ ہو، اللہ جل شان اللہ" کا نغمہ گاتے تھے اور یوں صبح کے وقت خدا کی حمد بیان کرتے۔ کبھی کبھی معرفت و عرفان کی محفلیں منعقد ہوتیں جن میں زبان سے خدا کا ذکر کیا جاتا اور جسے سُن کر حاضرین پر بے خودی کی حالت طاری ہو جاتی، کبھی قوالی ہوتی اور کبھی پنجابی زبان کے شعراء جمع ہو کر اپنی اپنی نظمیں پڑھتے۔ کہیں بٹیر باز اپنے اپنے بٹیر لڑا رہے ہوتے اور کہیں گانے بجانے کا مقابلہ ہو رہا ہوتا۔ کہیں تیتر گوندنی کے درخت کی شاخوں سے لٹک کر چہچہاتے اور "سبحان تیری قدرت" کا وِرد کرتے۔ کبھی کسی درخت کے سائے میں بیٹھ کر کوئی اناڑی موسیقار اپنے ساز ستار پر کسی گیت کی لے چھیڑتا۔ کہیں وارث شاہ کی لکھی ہوئی مشہور نظم "ہیر" پڑھی جاتی تھی، جس میں پنجاب کے رومانی کرداروں ہیر اور رانجھا کی داستانِ عشق بیان کی گئی ہے۔ سننے والے اس نظم کو محویت، حیرت اور خاموشی کے ساتھ سُنتے۔ کہیں چوسر کی بساط بچھا کر اور گوٹیں رکھ کر لوگ کھیل رہے ہوتے اور ان کے پاس چھوٹے چھوٹے بچے کانچ کی گولیوں اور ریٹھوں سے کھیل رہے ہوتے۔ کھیلتے کھیلتے جب بچے آپس میں لڑائی جھگڑا یا شور و غل کرنے لگتے تو پاس بیٹھے ہوئے بڑوں میں سے کوئی اُٹھ کر ایک دو کو ہلکا سا چانٹا رسید کرتا اور غل مچاتے بچے اپنا جھگڑا بھول کر پھر کھیلنے لگتے۔

احمد ندیم قاسمی (ولادت ۱۹۱۶ء)

سفارش

تعارف اور پس منظر

موجودہ افسانہ "سفارش" احمد ندیم قاسمی کے افسانوی مجموعہ "کپاس کے پھول" میں سے لیا گیا ہے۔ انھوں نے یہ افسانہ ۱۹۶۳ء میں لکھا تھا۔ احمد ندیم قاسمی ادب میں مقصدیت کے قائل ہیں۔ ان کے افسانے زندگی کے سیاسی، معاشرتی، معاشی، مذہبی، اخلاقی اور طبقاتی مسائل پر روشنی ڈالتے ہیں۔ وہ افسانوں میں اپنے عہد کی معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہیں اور پاکستان میں روز بروز بڑھتے ہوئے اخلاقی زوال پر اپنے فنی ردِ عمل کا اظہار کرتے ہیں۔

"سفارش" میں ایک طرف انھوں نے معاشرے کے دو طبقوں کی سوچ کا فرق واضح کیا ہے اور دوسری طرف ہمارے ہسپتالوں کی المناک صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ فیکا کوچوان، اپنے باپ صدیقے کی آنکھوں کا معائنہ کرانا چاہتا ہے جو کسی نیم حکیم کی دوائی ڈالنے سے بے نور ہو گئی ہیں۔ وہ اپنے ایک ساتھی کوچوان کی مدد سے باپ کو میو ہسپتال میں داخل کرانے میں تو کامیاب ہو جاتا ہے لیکن اب اسے آنکھوں کے ڈاکٹر سے معائنہ کرانے کے لئے کسی سفارش کی ضرورت ہے۔ اپنے محلے کے ایک بابو صاحب، جن سے اس کی علیک سلیک ہے (اور جن کی زبان سے یہ کہانی بیان کی گئی ہے) وہ التجا کرتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ ہسپتال چل کر کسی ڈاکٹر سے کہہ دیں کہ وہ مریض کو توجہ سے دیکھ لیں۔ بابو صاحب کی اپنی گوناگوں مصروفیات ہیں، اس لئے کبھی تو وہ ٹالنے کے لئے اُسے اپنا کارڈ دیتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالجبار کو دے کر مریض کو دکھلائے اور کبھی ٹیلیفون کے ذریعے ڈاکٹر صاحب سے رابطہ قائم کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ بابو صاحب اپنے ذاتی کاموں میں اتنے پھنسے ہوئے ہیں کہ چاہنے کے باوجود خود جا کر ڈاکٹر سے ایک بار بھی نہیں مل سکتے۔ اُدھر فیکے کو غربت کی وجہ سے ہسپتال میں کوئی نہیں پوچھتا اور اس کا باپ صدیقہ برآمدے میں پڑا رہتا ہے۔ بابو صاحب فیکے کو بار بار تسلی دیتے ہیں کہ وہ فکر نہ کرے وہ ضرور ڈاکٹر عبدالجبار سے مل کر اس کے باپ کی سفارش کریں گے لیکن رابطہ پھر بھی نہیں کر پاتے۔ بہر حال دو اڑھائی ہفتے گزرنے کے بعد بابو صاحب کو فیکے کی زبانی پتہ چلتا ہے کہ آخر کار اس کے باپ کی آنکھوں کا اپریشن ہو گیا ہے اور دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ وہ بابو صاحب کا شکریہ ادا کرنے آیا ہے کیونکہ اس کے خیال میں بابو صاحب

کی سفارش سے اس کی مشکل آسان ہوئی ہے۔ بابو صاحب یہ جانتے ہوئے بھی کہ انہوں نے فیکے کے لئے عملاً کچھ نہیں کیا، یہ شکریہ قبول کر لیتے ہیں۔

احمد ندیم قاسمی نے اس افسانے میں جہاں غریب طبقے کی بے بسی، کسمپرسی، افلاس، مظلومیت اور معصومیت کا تذکرہ کیا ہے وہیں متوسط طبقے کی بے حسی، بے دردی اور منافقت کو بھی ظاہر کیا ہے۔ غریب طبقہ نہ صرف اپنے بنیادی حقوق سے محروم ہے بلکہ زندگی میں مشکل پیش آنے پر قدم قدم پر دوسروں کا محتاج ہے۔ متوسط طبقے کی سنگدلی دیکھئے کہ وہ غریبوں کو تو جھوٹی تسلیوں پر ٹرخاتا ہے اور وقت پر کام نہ آنے کے باوجود ان سے شکر گزاری کی توقع رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ افسانہ نگار نے فنی چابک دستی سے کام لے کر ہمارے ہسپتالوں کی حالت زار کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ جہاں غریب مریضوں کا کوئی پرسانِ حال نہیں البتہ سفارش ہو تو ہر کام فوراً ہو جاتا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۳۸ | کوچوان : ٹانگہ چلانے والا۔ ٹانگہ جوڑنا : ٹانگہ کسنا۔ شیو بنوانا : داڑھی منڈوانا۔

ص ۳۹ | آنکھ چلی گئی : آنکھ بے کار ہو گئی۔ دکھائی دینا بند ہو گیا۔ بھولپن : معصومیت۔ چھینٹا پڑنا : مراد ہے، چھا جانا۔ لفظی معنی بارش ہونا۔ لالی : سُرخی۔ قیامت : سب مخلوق کے مرنے کا دن اور پھر مُردوں کے زندہ ہو کر کھڑے ہونے کا دن۔ روزِ حشر۔ لقمان حکیم : ایک مشہور عقلمند حکیم کا نام جو دانا بھی تھا اور وہم کے علاوہ ہر مرض کا علاج جانتا تھا۔ حکمت : دانائی اور علمِ طب، علاج معالجہ۔ آنکھ لگنا : نیند آنا۔ گڈا : پُتلا، بُت۔ ممنونیت : احسان مندی، شکر گزاری۔ نمی : گیلا پن مراد آنسو۔ پوست کے ڈوڈے : خشخاش کے ڈوڈے یا نخول۔

ص ۴۰ | جتن : تدبیر۔ بندوبست۔ پِٹّس پڑنا : ماتم، کہرام، رونا پیٹنا۔ برانڈے : برآمدہ، وہ جگہ یا راستہ جو سائبان کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ صاحب لوگ : بڑا آدمی، پڑھا لکھا معزّز انسان۔ ہاتھ باندھنا : التجا کرنا۔ صدر دروازہ : عمارت کے سامنے کا بڑا دروازہ۔ زنّن : تیزی سے گزرنے کی آواز۔

ص ۴۱ | ڈیوٹی : فرضِ منصبی۔ تشویش : فکر مندی، پریشانی، گھبراہٹ۔ چھپّر : وہ سائبان جس پر پھوس ڈالا جائے۔ کونا کھدرا : وراخ، گوشہ، کنارا۔ بینائی : آنکھ کا نور، دکھائی دینے کی صلاحیت۔ بھورا : ٹکڑا۔ چنگاری : آگ کا شرارہ۔

ص ۴۲ | فٹافٹ : فوراً۔ وارڈ : ہسپتال میں مریضوں کی نگہداشت کا شعبہ۔ رمق : تھوڑی سی جان، بہت کم، ذرّہ بھر۔ حساس : بہت محسوس کرنے والا۔

ص ۴۳ | ندامت: شرمندگی۔ ممنونیت: شکر گزاری۔ لپک کر: جلدی سے دوڑ کر۔

ص ۴۴ | زار زار رونا: بہت آنسو بہانا۔ اتنا رونا کہ آنسوؤں کا تار بندھ جائے۔

ہلدی ہونا: رنگ زرد پڑ جانا۔

ص ۴۵ | احمق: بیوقوف۔ تیور بدلنا: بے مروّت ہونا۔ نظروں کا انداز بدلنا۔ اعتراف: مان لینا، تسلیم کرنا۔ زار زار رونا: بہت آنسو بہانا۔ آواز بھرا جانا: گلہ بیٹھ جانا، آواز بھاری ہونا۔ منہ سے الفاظ کا صاف نہ نکلنا۔ گتھم گتھا: لڑائی میں ایک دوسرے سے لپٹ جانا۔ بینائی: نظر، دیکھنے کی صلاحیت۔

سبق کا خلاصہ

فیکے کوچوان نے آج ٹانگہ نہیں کسا تھا۔ بابو صاحب کے دریافت کرنے پر اس نے بتایا کہ اس کے باپ صدیقے نے مصری شاہ میں کسی حکیم سے آنکھ کی سُرخی دور کرنے کے لئے سرمہ خریدا تھا جو ڈالنے کے بعد سُرخی تو کیا دُور ہونا تھی اُلٹا دونوں آنکھیں خراب ہوگئیں اور شدید دُکھنے لگیں۔ کسی کے کہنے پر پوست کے ڈوڈے کو پانی میں اُبال کر اُن سے آنکھوں کو دھویا گیا، پھر پالک کا ساگ اُبال کر باندھا گیا۔ لیکن اس علاج سے آنکھیں بالکل بے نور ہوگئیں۔ اس پر فیکے نے آنکھوں کے کسی ڈاکٹر سے اپنے باپ کی آنکھوں کا معائنہ کروانے کے لئے دو تین ہسپتالوں کے چکر لگائے لیکن کہیں بھی جگہ نہ ملی۔ بالآخر فیکے کے ایک واقف کار کوچوان کے سالے کی مدد سے جو میو ہسپتال میں چوکیدار تھا، بڑی مشکل سے اس کے باپ کو ہسپتال کے برآمدے میں جگہ ملی۔ تاہم باوجود اس کے کہ اس کے باپ کو آنکھوں کی شدید تکلیف تھی، ڈاکٹر تو کجا، کوئی نرس بھی دیکھنے نہ آئی۔ اب فیکا چاہتا تھا کہ بابو صاحب اس کے ساتھ میو ہسپتال چل کر کسی واقف ڈاکٹر سے کہیں کہ وہ فیکے کے باپ کی آنکھوں کا جلدی معائنہ کرے اور اگر اپریشن کی ضرورت ہو، تو وُہ بھی کرے۔ بابو صاحب نے بتایا کہ ہسپتال میں ان کے ایک دوست ڈاکٹر عبدالجبار صاحب ہیں، فیکا بابو صاحب کا حوالہ دے کر ان سے مل لے۔ امید ہے کہ اس کا کام بن جائے گا۔ اگر نہ ہوا تو وہ کل ضرور اس کے ہمراہ چلیں گے کیونکہ آج انہیں کوئی ضروری کام ہے۔

بابو صاحب نے ٹانگہ کرائے پر لیا اور جونہی وہ ہسپتال کے صدر دروازے پر پہنچے تو فیکے کو چوکیدار سے ڈاکٹر عبدالجبار کا پتہ پوچھتے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر عبدالجبار کا سکوٹر، ٹانگے کے پاس سے گزرا۔ بابو صاحب نے انہیں پکارنا چاہا لیکن وہ تیزی سے آگے نکل گئے۔ اگلے روز فیکا پھر بابو صاحب کے پاس آیا اور انہیں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب نہیں ملے۔ اس نے درخواست کی

کہ بابو صاحب اس کے ہمراہ ہسپتال چلیں۔ بابو صاحب کو آج بھی کوئی کام تھا اس لئے انہوں نے فیکے کو اپنا کارڈ دے کر کہا کہ وہ ڈاکٹر عبدالجبار کو کارڈ دکھا کر مل لے۔ وہ یقیناً اس کی مدد کریں گے۔ اگر فیکے کا باپ وارڈ میں داخل ہو گیا تو وہ ضرور ڈاکٹر صاحب سے مل کر انہیں توجہ سے علاج کرنے کے لئے کہیں گے۔ شام کو فیکے نے آکر بتایا کہ ڈاکٹر جبار صاحب اپنے کمرے میں موجود تھے لیکن اسے غریب جان کر کسی نے اندر نہیں گھسنے دیا۔ چپڑاسی کہتا تھا کہ اپنی باری سے آؤ لیکن فیکے بیچارے کی باری نہیں آئی، بابو صاحب نے وعدہ کر لیا کہ دوسرے روز وہ اس کے ساتھ ضرور جائیں گے، لیکن اگلے دن انہیں کسی کام سے شیخوپورہ جانا پڑا، اس لئے فیکے کے ساتھ نہ جا سکے۔ تین دن اور گزر گئے فیکا نہ آیا۔ ایک اور کوچوان سے معلوم ہوا کہ فیکے کے باپ کو وارڈ میں جگہ مل گئی ہے تھوڑی دیر بعد فیکا بھی آگیا۔ بابو صاحب نے اس سے پوچھا کہ کیا جبار صاحب نے کام کر دیا تھا؟ فیکے نے بتایا کہ وہ مل ہی نہیں سکے۔ بابو صاحب نے جھوٹ بولا کہ انہوں نے ڈاکٹر صاحب کو فون کر دیا تھا۔ اس پر فیکا بے حد ممنون ہوا۔ اگلے روز فیکے نے آکر بتایا کہ بابو صاحب کی مہربانی سے اس کے باپ کو میو ہسپتال میں داخلہ تو مل گیا تھا لیکن اب انہوں نے اسے کوٹ لکھپت کے ہسپتال میں بھیج دیا ہے جہاں اسے اور اس کی والدہ کو آنے جانے کی بڑی دقّت ہے۔ بابو صاحب نے پھر مدد کا وعدہ کیا اور کہا کہ وہ ابھی جبار صاحب کو فون کریں گے فون تو انہوں نے کیا لیکن جبار صاحب پھر نہیں ملے۔ پانچ چھ روز کے بعد فیکا بابو صاحب سے پھر ملا اور ان کی مدد کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بتایا کہ اس کے باپ کا اپریشن ہو گیا ہے اور جمعہ کو اس کی پٹی کھل رہی ہے۔ جمعہ کی شام کو فیکا آیا اور بابو صاحب کو روتے ہوئے بتایا کہ پٹی کھلنے کے بعد پتہ چلا کہ ایک آنکھ تو ضائع ہو گئی تھی اب دوسری آنکھ پر بھی اثر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے کہا ہے کہ پہلے اپریشن کا زخم مندمل ہونے کے بعد دوسرا اپریشن ہوگا اور دوسری آنکھ کا بھی ہوگا۔ بابو صاحب نے پھر تسلی دی اور اسے ساتھ لے جا کر ایک دکان سے ڈاکٹر عبدالجبار کو فون کیا، مگر اس بار بھی وہ نہ مل سکے۔ بابو صاحب نے وعدہ کیا کہ وہ کل جا کر ڈاکٹر جبار سے ضرور ملیں گے۔ لیکن وہ اگلے روز بھی ہسپتال نہ جا سکے۔ دو اڑھائی ہفتوں کے بعد فیکا پھر بابو صاحب کے پاس آیا اور خوشی کے آنسوؤں کے درمیان انہیں بتایا کہ اس کے باپ کا اپریشن کامیاب رہا ہے اور اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو گئی ہیں۔ وہ بابو صاحب کے احسانات کا شکریہ ادا کرنے آیا تھا۔ اس نے بابو صاحب سے کہا کہ انہوں نے فیکے کی مدد کر کے اسے ہمیشہ کے لئے خرید لیا ہے۔ بابو صاحب نے یہ جتائے بغیر کہ وہ اس کیلئے حقیقت میں کچھ بھی نہیں کر سکے، اس کا شکریہ قبول کرتے ہوئے بڑے انکسار سے کہا کہ "کوئی بات نہیں فیکے، کوئی بات نہیں۔"

اہم عبارت کی تشریح

سوال نیچے درج کردہ پیرے کے متن کا حوالہ دیجئے اور سیاق و سباق سمیت اس کی وضاحت کیجئے۔

لال لال تو وہ ہر وقت رہتی تھی اور اس میں سے پانی بہتا رہتا تھا۔ آپ تو جانتے ہیں۔ آپ تو بابا کے ساتھ کئی بار تانگے پر بیٹھے ہیں۔ تو بابو جی، کل کیا ہؤا کہ مصری شاہ میں سے گزرا تو ایک حکیم سرمہ بیچ رہا تھا۔ بابا یہ سرمہ لے آیا اور ہمیں بتایا کہ اس سے آنکھ کی لالی جاتی رہے گی۔ حکیم نے خدا رسول کی قسم کھا کے کہا ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ نہ جائے تو قیامت کے دن مجھے گردن سے پکڑنا۔ میں نے بھی کہہ دیا کہ حکیم خدا رسول کو بیچ میں ڈال رہا ہے۔ تو ذرا سا لگالے۔ اماں نے بھی یہی صلاح دی۔ اس نے "لقمان حکیم، حکمت کا بادشاہ" پڑھا اور آنکھ میں سلائی پھیر لی! بس پھر کیا تھا؟ بابو جی، قسم کھا کر کہتا ہوں۔ جب سے اب تک آنکھ لگی ہو!

جواب **حوالۂ متن** یہ پیراگراف احمد ندیم قاسمی کے افسانہ "سفارش" میں سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق اس پیرے سے پہلے بتایا گیا ہے کہ محلے کے بابو صاحب کو کام پر جانے کے لئے تانگہ درکار تھا۔ انہوں نے فیکے کوچوان کو دیکھا تو پوچھا کہ اس نے آج تانگہ کیوں نہیں کسا۔ فیکے نے جواب دیا کہ اس کے باپ صدیقے کی ایک آنکھ ضائع ہو گئی ہے اور وہ ہسپتال میں آنکھوں کے ڈاکٹر سے اپنے باپ کی آنکھ کا معائنہ کرانا چاہتا ہے۔ بابو کے یہ پوچھنے پر کہ یہ آنکھ خراب کیسے ہوئی فیکے نے وہ جواب دیا جو اس عبارت میں درج کیا گیا ہے۔

اس پیراگراف کے بعد بابو صاحب نے فیکے کی مدد کا وعدہ کر لیا۔ پہلے تو وہ اسے مشورہ دیتے ہیں کہ میو ہسپتال میں ان کا ایک ڈاکٹر واقف ہے جس کا نام عبدالجبار ہے، وہ بابو صاحب کا حوالہ دے کر ان سے مل سکتا ہے۔ اگر وہ نہ مل سکے تو وہ خود فیکے کے ساتھ ہسپتال جائیں گے۔ فیکے کا باپ ہسپتال میں داخل تو ہو جاتا ہے لیکن اس کی آنکھوں کا جلد معائنہ نہیں ہوتا، چنانچہ فیکا بار بار بابو صاحب سے ملتا ہے اور انہیں سفارش کے لئے کہتا ہے۔ بابو صاحب ہر بار مدد کرنے کا وعدہ کر لیتے ہیں لیکن نہ تو خود اس کے ساتھ جاتے ہیں اور نہ فون پر ان کا ڈاکٹر عبدالجبار سے رابطہ ہوتا ہے۔ کئی ہفتوں کے بعد آخر فیکے کے باپ کی آنکھوں کا اپریشن ہوتا ہے اور اس کی دونوں آنکھیں ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ فیکا سمجھتا ہے کہ یہ اپریشن بابو صاحب کی سفارش پر ہؤا ہے، چنانچہ وہ ان کا شکریہ ادا کرنے کیلئے آتا ہے، اور بابو صاحب بظاہر بڑے مخلصانہ انکسار کے ساتھ اس کا شکریہ قبول کر لیتے ہیں۔

تشریح فیکا اپنے باپ صدیقے کی آنکھ کے خراب ہونے کی وجہ بیان کرتے ہوئے بابو صاحب کو بتاتا ہے کہ وہ کسی بیماری کی وجہ سے سُرخ ہو گئی تھی اور اس میں سے ہر وقت پانی رستا رہتا تھا۔ فیکا بابو صاحب کو یاد دلاتا ہے کہ انہوں نے بھی اس کے باپ کی وہ سُرخ آنکھ دیکھی ہوگی کیوں کہ وہ کئی بار اس کے ساتھ تانگے پر بیٹھ کر اپنے کام پر گئے ہیں۔ فیکا بتاتا ہے کہ گزشتہ روز اس کا باپ محلہ مصری شاہ سے گزر رہا تھا تو اس نے کسی نیم حکیم کو سرمہ بیچتے ہوئے دیکھا۔ حکیم نے اللہ اور اس کے رسول کی قسم کھا کر فیکے کے باپ کو یقین دلایا کہ اس کا سرمہ استعمال کرنے کے بعد آنکھ کی سُرخی دور ہو جائے گی۔ چنانچہ فیکے کا باپ اس پر اعتبار کر کے سرمہ لے آیا۔ حکیم نے خدا اور رسول کی قسم کھا کر سرمہ بیچا تھا۔ اور یہ بھی اقرار کیا تھا کہ اگر آنکھ کو آرام نہ آئے تو بے شک حشر کے روز خدا کے سامنے اس کو گردن سے پکڑ لینا، اس لئے فیکے نے بھی یہی کہا اور اس کی ماں نے بھی یہی مشورہ دیا کہ بابا کو وہ سرمہ ضرور استعمال کرنا چاہیئے۔ ان کی بات بابا نے مان لی اور حکیم لقمان، جو دانائی اور علم طب کے لحاظ سے دنیا بھر میں مشہور ہیں، ان کا نام لے کر آنکھ میں اس سرمے کی ایک سلائی پھیر لی۔ فیکے نے قسم کھا کر بتایا کہ سرمہ لگانے کے بعد سے اب تک درد کی وجہ سے اس کا باپ سو نہیں سکا۔

انتظار حسین (ولادت ۔ ۱۹۲۲ء)

فراموش

تعارف اور پس منظر

"فراموش" ـــــ اپنے اصطلاحی معنوں میں، یو۔ پی (بھارت) کے علاقے میں کھیلا جانے والا ایک کھیل ہے جو ایک فرد، دوسرے فرد کے ساتھ یہ شرط لگا کر کھیلتا ہے کہ اگر وہ اُسے کوئی چیز دھوکے سے دے کر کہے گا کہ "فراموش!" ـــــ تو اُسے وہ چیز پہلے فرد کو شرط میں مقرر کردہ تعداد کے مطابق دینا پڑے گی۔ اس کھیل میں عموماً دوگاڑا پھل یا سبزی وغیرہ دی جاتی ہے۔ یہ پھل یا سبزی، رومال یا سرپوش سے ڈھانپ کر دی جاتی ہے۔ اگر لینے والا شخص، وہ لینے سے پہلے ہی کہہ دے کہ "یاد ہے" تو پھر اُسے کچھ نہیں دینا پڑتا۔ موجودہ افسانہ "فراموش" میں صفحہ ۴۸ اور ۴۹ پر اس کھیل کا حوالہ آیا ہے۔ تاہم آگے چل کر، کہانی بیان کرنے والے کردار سمیت اس لفظ ("فراموش") کا افسانے کے مختلف کرداروں کی نفسی زندگی کے ساتھ ایک پُراسرار تعلق نظر آتا ہے۔

افسانہ "فراموش" انتظار حسین کے افسانوی مجموعہ "کچھوے" میں سے لیا گیا ہے۔ یہ ایک علامتی افسانہ ہے۔ انتظار حسین اپنے افسانوں میں ان معاشرتی اقدار اور روایات کو اپنا موضوع بناتے ہیں جو تیزی سے زوال پذیر ہو رہی ہیں۔ وقت آگے بڑھ رہا ہے اور پرانی قدروں کو اپنی رو میں بہائے لئے جا رہا ہے۔ ماضی حال میں اور حال، مستقبل میں ڈھل رہا ہے۔ نئی قدریں نئے معاشرتی تقاضوں کی پیداوار ہیں اور وہ پرانی قدروں کی جگہ لے رہی ہیں۔ ہمیں اپنا ماضی کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو اُسے بہرحال مستقبل کے لئے جگہ خالی کرنی پڑتی ہے۔

انتظار حسین کے افسانہ "فراموش" میں یہی تیزی سے گزرتا ہوا وقت کہانی کا موضوع ہے۔ کہانی کا تانا بانا بُننے کے لئے ایک مخصوص فضا تیار کی گئی ہے۔ ایک خاص مقام کا انتخاب کیا گیا ہے اور چند کرداروں کو چُنا گیا ہے۔ سڑک سے ہٹ کر اونچے سفید کھمبے، سیمنٹ کا بنا ہوا اُجلا چبوترہ، حوض کا شفاف پانی، ایک نازک سی انڈے کی مانند سفید کوٹھی، ہرے بھرے درخت، چنگی، رہٹ، ٹیوب ویل، مشن سکول کی سُرخ عمارت، اینٹوں کا بھٹہ، ریل کی پٹڑی اور اس کا سفید کٹہرا۔

ـــ سب مل جل کر ایک نرم، اُجلی، سکون بخش فضا کو جنم دیتے ہیں۔ کوٹھی میں زندگی کی علامتیں ایک انجنیئر صاحب، اُن کا لے پالک بیٹا اور ایک نوجوان ملازم ہیں، جب کہ کوٹھی کے باہر کہانی بیان کرنے والے کردار کے علاوہ چند کالے کلوٹے ننگ دھڑنگ بچے، جو حبس کے موسم میں حوض میں نہانے کے لئے چھلانگیں لگاتے ہیں، فضا پر محیط گہرے سناٹے کو توڑنے کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔ یا پھر وہ مالی جو خاموشی سے کوٹھی کے باہر پودوں کی خراش تراش کرتا نظر آتا ہے اور جس کی زبانی کوٹھی کے پرانے یا نئے مکینوں کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں۔

لفظ "فراموش"، کہانی کا کلیدی لفظ ہے، جو پہلے پہل، کہانی بیان کرنے والے کردار (میں) کو اُس کالی سڑک پر لکھا ہُوا نظر آتا ہے جو سفید کوٹھی کے سامنے سے گزرتی ہے۔ چند دن کے بعد یہ لفظ راستے کی دھول میں گم ہو جاتا ہے۔ البتہ اب یہ کوٹھی کی بیرونی دیوار پر دکھائی دیتا ہے جو بار بار مٹایا جاتا ہے لیکن پھر نمودار ہو جاتا ہے۔ اس لفظ کے لکھے اور مٹائے جانے کا کوٹھی اور اس کے مکینوں (انجنیئر صاحب اور ان کے لے پالک بیٹے) کی زندگی سے گہرا تعلق ہے، کیونکہ بوڑھے انجنیئر صاحب اس لفظ کو پسند نہیں کرتے۔ اس لئے جونہی ان کی نظر اس پر پڑتی ہے، وہ فوراً اسے صاف کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ ان کے حکم تعمیل ہوتی ہے لیکن اگلے روز پھر یہ لفظ وہیں موجود ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انجنیئر صاحب اپنی ڈھلتی ہوئی عمر کے آگے بند باندھنے اور اپنے مستقبل کو بھولنے کی ناکام کوشش کر رہے ہیں حالانکہ وہ خود، ان کی کوٹھی اور دیگر کردار سب وقت کے سیلاب میں تنکوں کی مانند بہہ رہے ہیں۔ سفید کوٹھی لوؤں، آندھیوں اور بارشوں کی زد میں ہے۔ انجنیئر صاحب بڑھاپے کی زد میں ہیں اور ان کا لے پالک بیٹا موت کی زد میں ہے۔ ہر چیز اپنے انجام کی طرف تیزی سے سرگرم سفر ہے، لڑکے کا گیند بلے سے کھیلنا اور زرد رو کوٹھی پر سفید قلعی سے لیپا پوتی کرنا، اس ناگزیر انجام کو ٹالنے کے عارضی وقفے ہیں۔ اِسی لئے لڑکا لُو لگنے سے مر جاتا ہے، بوڑھے انجنیئر صاحب پنشن لے کر کوٹھی خالی کر دیتے ہیں اور ان کی جگہ نئے انجنیئر صاحب اس کوٹھی کو آباد کرنے کے لئے آجاتے ہیں، جن کے اہل وعیال اور عزیز و اقارب کے وجود سے کوٹھی کی رونقیں بحال ہو جاتی ہیں۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۳۶ دودھیا: سفید، اُجلا: سفید۔ صاف، متوازن: متناسب، برابر، موزوں۔ مقفّل: بند، جس پر تالہ لگا ہو۔ پرے: دُور۔ سُبک: نازک، ہلکی پھلکی، کچّا: مراد ہے کچّا راستہ۔ نیم: ایک نہایت کڑوے درخت کا نام۔ چُنگی: شہری محصول جو باہر سے مال آنے

لگایا جاتا ہے۔ چوکی: پڑاؤ، پہرے کی جگہ۔ گکڑیاں: ایک قسم کی ترکاری۔

ص ۴۷ | ہرے: سبز۔ رُوں رُوں: رہٹ کے چلنے کی آواز۔ رہٹ: کنوئیں سے پانی نکالنے کا چرخہ۔ بے کیف: بے مزہ، ٹیوب ویل: لوہے کی نال کے ذریعے زمین سے پانی نکالنے کا انتظام۔ مشن سکول: عیسائی پادریوں کا بنایا ہوُا مدرسہ۔ بھٹّا: چونا یا اینٹیں پکانے کی بھٹّی۔ ایکا ایکی: اچانک۔ کٹہرا: جنگلا، لکڑی یا لوہے کی سلاخوں کا احاطہ۔ امبیا: چھوٹا سا آم۔ معیّن: مقررہ، قائم کی ہوئی۔ کُلّی کرنا: مُنہ میں پانی بھرنا۔ اَٹے ہوئے: لتھڑے ہوئے، بھرے ہوئے۔ فرحت: خوشی۔ آسودگی: اطمینان۔ آرام، چین۔ عالم: حالت۔ حبس: ہوا رکنے کی کیفیت۔ ننگ دھڑنگ: بغیر لباس کے۔ کِلکاریاں: شور مچانا، چیخنا۔

ص ۴۸ | گدّے کھانا: ٹپّے کھانا۔ زمین پر گر کر اُچھلنا۔ ٹھٹکنا: حیرت یا خوف سے رُک جانا۔ یک سوئی: انہماک، پوری توجہ۔ آویزاں: لٹکی ہوئی۔ خط: لکیر۔ خم: جھکاؤ۔ اُوپر تلے: اوپر نیچے۔ فراموش: بھولا ہوُا، یاد سے اُترا ہوُا۔ وسوسے: وہم، شبہات۔ کرشمہ: انوکھی بات۔ دوگاڑا: جڑواں، دوہرا۔ کھٹ سے: فوراً

ص ۴۹ | تکلّف: اہتمام، ٹھاٹ۔ سرپوش: ڈھکنا۔ تقریب: اجتماع کا باعث۔ بڑھیا: عمدہ۔ لذیذ: ذائقے والی۔ نذر کرنا: پیش کرنا۔ قیدِ بے زنجیر: بیڑیاں اور ہتھکڑیاں ڈالے بغیر قید کرنا۔ آدھ مٹی: کچھ مٹی ہوئی اور کچھ موجود۔ کھُلنا: واضح ہونا۔ موقوف: منحصر۔ آمدورفت: آنا جانا۔ برائے نام: نہ ہونے کے برابر۔ چھ حرفی: مراد ہے، فراموش جس میں چھ حروف ہیں۔ اَٹ جانا: بھر جانا۔ وِرد: ہر روز کا کام، وظیفہ۔ گرہ: گانٹھ، بندھن۔ کرید: تلاش، چھان بین۔ کچّا کچّا خط: اناڑی پن سے لکھا ہوُا۔ نٹ کھٹ: شرارتی، شوخ۔ چسکا: مزہ، چاٹ، عادت، لت، ذوق و شوق۔

ص ۵۰ | پیٹھ: جسم کا پچھلا حصّہ، پُشت۔ شب خوابی: رات کو پہن کر سونے کے کپڑے۔ ادھیڑ عمری: درمیانی عمر، نہ جوانی اور نہ بڑھاپا۔ باوصف: باوجود۔ چغلی کھانا: غمّازی کرنا، بھید ظاہر کرنا۔ نہوڑائے: نیچا کیے ہوئے۔ خطا: غلطی۔ محصول: لگان، خراج، ٹیکس، چُنگی۔ اہل کار: کارندہ، کچہری کا منشی، پیش کار۔ عشرہ: دس دن۔ وِرد: ہر روز کا کام۔ وظیفہ، بار بار دہرانا۔ نقش ہونا: کھودا جانا، دل پر جمنا، لکھا جانا۔ تکرار: بار بار کہنا یا کرنا۔ نگاہ چوک جانا: دکھائی دینا بھول جانا، نظر نہ آنا۔ ماتھا ٹھنکنا: کسی اندیشہ ناک امر کے وقوع پذیر ہونے سے پہلے اُس کے آثار نظر آجانا۔ ماجرا: قصّہ، واقعہ، واردات۔

ص ۵۱ | گمان: وہم، خیال، قیاس، شک و شبہ۔ گتھی: اُلجھن در اُلجھن، پیچ در

پیچ معاملہ، دھاگے اُلجھے ہوئے۔ حبس: ہوا بند ہونے کی کیفیت۔ اندھیاری: آندھی۔ منڈیر: چھت کا کنارا۔ لُو: گرم ہوا۔ مینہ کی جھڑی: لگا تار بارش۔ مونہا منہ: کناروں تک۔ خستہ: بدحال۔ چھجا: چھت کا آگے بڑھا ہوا وُہ حصّہ جو بارش سے حفاظت یا دھوپ سے بچاؤ کے لئے ہوتا ہے۔ کپاس: چھوٹی چھوٹی پتیوں والی ایک بیل۔ کائی: بند پانی پر جمی ہوئی سبز تہ۔ کواڑ: دروازے کا پٹ۔ پھپھوندی: نمی کی وجہ سے کسی چیز پر کائی کی طرح جمی ہوئی سفید تہ لگنا۔ بوسیدگی: پرانا پن۔ دھندلانا: مدھم پڑنا۔ خموں کی: جھکی ہوئی چیزیں، قوسیں۔

ص ۵۲ | پُتلی پتھرا رہی ہو: آنکھ کی پُتلی مردہ ہو گئی۔ رابطہ: تعلق۔ سنگِ میل: میل کا نشان ظاہر کرنے والا پتھر، فاصلے کی علامت۔ نوعیت: وضع، ڈھنگ۔ خالصتاً: حقیقی طور پر۔ نجی: ذاتی۔ وضع داری: رکھ رکھاؤ، سلیقہ مندی، مہذب پن۔ گھِر کے آنا: اُمڈنا۔

ٹوٹ کے پانی برسنا: بہت بارش ہونا۔ دَم بھر: تھوڑی دیر کے لئے۔ آن کی آن میں: فوراً۔ مطلع صاف ہونا: آسمان پر بادل نہ ہونا۔ سلونی: سیاہ رنگ کی۔ کھکھلوں: کھوکھلی یا خالی جگہوں۔ مونہا منہ: کناروں تک۔ کڑی: شہتیر۔ چھجا: چھت کا آگے بڑھا ہوا حصّہ۔ ڈھئی: گری ہوئی۔ ملبا: گری ہوئی اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر۔

ص ۵۳ | معدوم: مٹ جانا۔ گمٹی: چھوٹا گنبد، گول سی مروڑی۔ بَل: پیچ۔ کوچی: برش، سفیدی کرنے کا مُونج کا برُش۔ حرفِ غلط: وہ حرف جو غلط ہونے کی وجہ سے مٹا دیا جائے۔ جوں کی توں: ویسے کی ویسی۔ اَدھ پُتی: کچھ حصے پر قلعی پھرنا اور کچھ پر نہ پھرنا۔ اہتمام: خصوصی بندوبست۔ سلیقہ: تہذیب کے ساتھ، موزوں طریقے سے۔ دھماچوکڑی: اچھل کود، ہنگامہ۔ نسوانی: زنانہ۔ اچنبھا: حیرت۔

ص ۵۴ | مہین: باریک۔ رسیلی: رس بھری، میٹھی۔ درشت: سخت، کھردری۔ گنگ: خاموش۔ کایا: رُوپ، بھیس، اصلیت۔ چولا: قالب، جسم۔ چولا بدلنا: ایک قالب سے دوسرے قالب میں جانا۔ راج: مستری، معمار، مکان بنانے والا۔ نادانستہ: انجانے میں۔ بغیر سوچے سمجھے۔ دھک سے رہ جانا: حیران رہ جانا۔ پُتی ہوئی: بھری ہوئی۔ شوشہ: وہ چھوٹی سی علامت جو ہائے ہوز (ہ) کے نیچے بناتے ہیں (جیسے ہر کا شوشہ) یا وہ دندانہ جو بعض حرفوں کے سرے پر ہوتا ہے (جیسے شین کا شوشہ، میم کا شوشہ)۔ حرف کا سرا۔ جالا پورنا: جالا بُن دینا۔ روش: باغ کی پٹڑی۔ دورویہ: دونوں طرف قطاروں میں، دو رُخا، دوطرفہ۔ پھننگ: درخت کی چوٹی۔ پُراسرار: بھیدوں سے بھرا ہوُا، عجیب و غریب۔ جھجک: ہچکچاہٹ، شرمانا۔

ص ۵۵ | پنشن: وہ رقم جو ملازم کو ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد ملتی ہے۔ دَر دَر کرنا:

اوزار کے چلنے کی آواز۔ چل بے چل ہونا: دماغ کا کام نہ کرنا، بے موقع بات کرنا۔ ننیئں: نہیں۔ لے پالک: کسی سے لے کر پالا ہوا بچہ۔ لاڈ: پیار۔ میل ملاقاتی: ملنے کیلئے آنے والا۔ واں: وہاں۔ بکھیڑا: جھگڑا، جنجال۔ مگن: مست۔ طریوں: طرح۔ بڑبڑاتا: مُنہ میں باتیں کرنا، چُپکے چپکے بُرا بھلا کہنا۔ اُچٹ: اچاٹ ہونا۔ اُکتا جانا۔

ص ۵۶ ایسے ویسے: کبھی کبھار۔ چل بے چل: دیوانہ پن، دماغ چل جانا۔ بے موقع اور بے جگہ بات کرنا۔ روشں: باغ کے درمیان چلنے کیلئے رستہ۔ اِکا دُکا: کوئی کوئی۔ دو رویہ: دو رُخی۔ بے ثمر: بغیر پھلوں کے۔ ٹیڑھ: خم، جھکاؤ۔

سبق کا خلاصہ

سڑک سے ہٹ کر ایک نازک سی سفید کوٹھی تھی۔ یہ کوٹھی عام آبادی سے قدرے پَرے تھی۔ ارد گرد کا ماحول دیہاتی قسم کا تھا۔ جُھگی، رہٹ، ٹیوب ویل، مشن سکول، بھٹہ اور ریل کی پٹڑی کے کنارے پر سفید کٹہرا، سب مل جُل کر ایک سکون آور فرحت بخش فضا پیدا کرتے تھے۔ عام طور پر یہاں خاموشی رہتی تھی لیکن کبھی کبھی کوٹھی میں سے ربڑ کی ایک سفید گیند باہر آتی اور اس کے پیچھے پیچھے ایک نوجوان نوکر دوڑتا آتا جو گیند واپس لے جاتا۔ اس سے اندازہ ہوتا کہ کوٹھی آباد ہے در اصل اس کوٹھی میں صرف ایک بوڑھے انجینئر صاحب اور ان کا لے پالک بیٹا دونوں رہتے تھے۔ ایک دن کیا ہوا کہ کوٹھی کے سامنے والی کالی سڑک پر سفید چاک سے بڑے بڑے حرفوں میں ایک لفظ "فراموش" لکھا ہوا نظر آیا۔ چند دن کے بعد آہستہ آہستہ اس لفظ پر گرد کی تہ جمتی گئی اور پھر یہ حرف بالکل مٹ گیا۔ ایک دن یہی لفظ پھر کوٹھی کی سفید دیوار پر لکھا دیکھا گیا۔ شاید وہ لفظ کوٹھی میں رہنے والے کسی بچے نے لکھا تھا۔ انجینئر صاحب نے باہر نکل کر دیکھا تو وہ لفظ مٹانے کا حکم دیا۔ دوسرے تیسرے دن وہ لفظ پھر وہیں لکھا پایا گیا جسے حسب سابق صاف کر دیا گیا۔ اسی طرح وہ لفظ بار بار لکھا جاتا اور بار بار مٹایا جاتا رہا۔ یوں پندرہ دن مزید گزر گئے۔ اب ایک دن جو دیکھا گیا تو لفظ "فراموش" پھر وہیں موجود تھا۔ اس لفظ کا لکھا اور مٹایا جانا گویا معمول بن چکا تھا لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ اس بار یہ لفظ مٹنے سے بچا ہوا تھا۔ شاید انجینئر صاحب یا ان کے ملازم کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی یا وہ اسے مٹانا بھول گئے تھے۔ اگلے روز بھی یہ لفظ یوں ہی برقرار تھا۔ لگتا تھا جیسے انجینئر صاحب لمبے دورے پر نکل گئے ہیں یا ان کا تبادلہ ہو گیا ہے یا وہ بیمار پڑ گئے ہیں۔

پھر برسات کا موسم آ گیا۔ پہلے آندھیوں نے زور باندھا۔ بعد میں بارشیں شروع ہو گئیں۔ ایک دن صبح سویرے دیکھا گیا کہ انجینئر صاحب کی کوٹھی، جو لُو اور مسلسل آندھیوں کی وجہ سے زرد پڑ چکی تھی،

بارش سے دُھل کر انڈے کی طرف سفید ہو گئی۔ اس کی دیوار پر کالے کوئلے سے لکھا ہُوا لفظ "فراموش" پھر روشن نظر آنے لگا۔ بارشیں ایک دفعہ شروع ہوئیں تو انہوں نے رُکنے کا نام نہ لیا۔ پانی نے مکانوں کے خستہ چھجوں کی لکڑی سیاہ کر دی اور کواڑوں پر پھپھوندی جما دی۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی اگرچہ زیادہ پرانی نہیں ہوئی تھی اور نہ اس پر خستگی اور بوسیدگی کے آثار نظر آتے تھے، لیکن نہ جانے کیوں لفظ "فراموش" اب دھندلا پڑتا جا رہا تھا۔ ڈر تھا کہ کہیں یہ بالکل ہی مٹ نہ جائے۔

برسات کا موسم گزرا تو گری ہوئی چھتوں، جھکی ہوئی کڑیوں اور چُونا اُترتی دیواروں کی مرمت شروع ہو گئی۔ انجنیئر صاحب کی کوٹھی میں بھی سفیدی کرنے کے لئے چُونے کی بوری، ڈول، کوچیاں اور سیڑھی آ گئی۔ اگلے روز کوٹھی پر قلعی ہو رہی تھی۔ پہلے اندرونی حصے کو پوتا گیا اور پھر بیرونی دیواروں کی باری آئی۔ تاہم یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی کہ باہر کی دیوار پر اہتمام سے سفیدی کرنے کے باوجود لفظ "فراموش" اپنی جگہ پر قائم تھا اور اس پر چونے کی ایک بوند بھی نہیں پڑی تھی۔

کچھ دن اور گزرے۔ اب جو دیکھا گیا تو انجنیئر صاحب کی کوٹھی کے برآمدے میں تین چار بچے شور و غل مچا رہے تھے اور اندر سے ایک مرد اور عورت کی آوازیں آتی سنائی دیں۔ یوں لگتا تھا گویا اس کوٹھی کی کایا پلٹ گئی ہے۔ کہاں تو ہر وقت سنّاٹا چھایا رہتا تھا اور کہاں اب احاطے، برآمدوں، بند دروازوں اور کمروں میں رونق، چہل پہل اور گہما گہمی کے آثار دکھائی دینے لگے۔ بچوّں، عورتوں اور مردوں کی آوازیں گونجنے لگیں۔ کوٹھی پر تازہ تازہ پھری سفیدی کی نشانی قلعی کے وہ اَدھ بھرے ڈول تھے جو راج مزدور کام کرتے کرتے چھوڑ گئے تھے۔ اب جو بیرُونی دیوار کو غور سے دیکھا گیا تو کوئلے سے لکھے ہوئے "فراموش" لفظ کے سارے حروف سفیدی میں غائب ہو چکے تھے۔ باہر کام کرتے ہوئے مالی سے دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ اس دوران میں کوٹھی کے مکین بدل گئے تھے۔ پرانے انجنیئر کی جگہ نئے انجنیئر صاحب اور ان کے بال بچے آ گئے تھے۔ پرانے نام کی تختی کی جگہ نئے نام کی تختی لگ گئی تھی۔ پرانے انجنیئر صاحب نے قبل از وقت ریٹائر ہو کر پنشن لے لی تھی اور یہ کوٹھی چھوڑ گئے تھے۔ قبل از وقت ریٹائرمنٹ کی وجہ یہ تھی کہ ان کا نے پالک بیٹا، جس سے وہ از حد پیار کرتے تھے، اچانک لُو لگنے سے فوت ہو گیا۔ انجنیئر صاحب پہلے بھی لوگوں سے کم ہی ملتے ملاتے تھے۔ اب ان کا دل ہر چیز سے اچاٹ ہو گیا۔ وہ اکیلے رہ گئے تھے، اس لئے ہر وقت کھوئے کھوئے سے رہنے لگے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ہر وقت اُسی بیٹے کے خیالوں میں ڈوبے رہتے۔ اس کی ایک ایک چیز خصوصاً گیند اور بلّے کو سنبھال کر رکھا ہُوا تھا۔ بس اسی کو دیکھتے رہتے۔ پھر انہوں نے یہ کوٹھی بھی خالی کر دی۔ در پنشن لے کر کہیں چلے گئے۔ کہاں؟ اس کا کچھ پتہ نہیں۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال • درج ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجیے۔

دوسرے دن جب میں نے اپنا وِرد شروع کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ وُہ لفظ اُسی مقام پر اُسی خط میں پھر لکھا ہُوا ہے، مگر حیرانی کی اب کون سی بات رہ گئی تھی۔ بلکہ اب تو اُس لفظ کے مٹنے اور نقش ہونے کی تکرار بھی اپنے وِرد کا جزو بن چکی تھی۔ ہاں حیرانی اس بات پر ہوئی کہ آج انجنیئر صاحب اور انجنیئر صاحب کے ملازم دونوں کی نگاہ چوک گئی مگر حد ہو گئی کہ دوسرے دن بھی وہ لفظ اسی خط میں اسی مقام پر اسی طرح لکھا ہُوا تھا۔ اب ماتھا ٹھنکا کہ الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟ سو سو طرح کا شک پڑا کہ انجنیئر صاحب کیا لمبے دورے پر نکل گئے؟ کہیں تبادلہ تو نہیں ہو گیا؟ کیا خبر ہے کہ بیمار پڑے ہوں؟ گمانوں کی ڈوری لمبی ہوتی گئی مگر گتھی، گتھی ہوتی رہی۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت افسانہ "فراموش" میں سے لی گئی ہے اس کے مصنّف انتظار حسین ہیں۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنّف (یا کہانی بیان کرنے والا کردار) بتاتا ہے کہ عام آبادی سے پرے، سڑک سے کچھ ہٹ کر ایک سفید نازک سی کوٹھی تھی جس میں ایک بوڑھے انجنیئر صاحب اور اُن کا "لے پالک بیٹا" رہتے تھے۔ کوٹھی پر عام طور پر خاموشی چھائی رہتی تھی البتہ زندگی کی علامت صرف وہ سفید گیند تھی جو لڑکے کے کھیلتے ہوئے کبھی کبھار کوٹھی سے باہر آتی تھی اور جسے لینے کے لئے ایک نوجوان نوکر اس کے پیچھے دوڑتا ہُوا آتا۔ ایک دن مصنف (یا کہانی بیان کرنے والے کردار) کو کالی سڑک پر بڑے بڑے حرفوں میں لفظ "فراموش" لکھا ہُوا نظر آیا جو چند دن گزرنے کے بعد راستے کی گرد میں چھپ گیا۔ پھر ایک دن یہی لفظ کوٹھی کی بیرونی سفید دیوار پر لکھا ہُوا پایا گیا جو شاید کوٹھی میں رہنے والے کسی بچّے نے لکھا تھا۔ جونہی انجنیئر صاحب کی اس پر نظر پڑی۔ انہوں نے اسے مٹانے کا حکم دیا۔ دوسرے تیسرے روز یہ لفظ پھر وہیں موجود تھا جسے حسبِ سابق صاف کروا دیا گیا۔ یوں بار بار وہ لفظ لکھا اور مٹایا جاتا رہا۔

اس عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ مسلسل لوؤں اور آندھیوں کی وجہ سے کوٹھی کا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور وہ لفظ "فراموش" بھی دھندلا ہو گیا تھا۔ پھر برسات کا موسم آیا تو بارش نے کوٹھی کو دھو دیا اور وہ سفید انڈے کی طرح نکل آئی۔ کوٹھی کے باہر کی دیوار بھی دُھل دھلا

کرنکھر آئی اور اس پر کوئلے سے لکھا ہوا لفظ "فراموش" بھی چمک اٹھا۔ برسات کا موسم گزرنے کے بعد کوٹھی کے اندر بھی قلعی کروائی گئی اور بیرونی دیوار پر بھی سفیدی پھیری۔ تمام داغ دھبے صاف ہو گئے لیکن کوئلے سے لکھا ہوا لفظ "فراموش" سفیدی پھرنے کے باوجود اپنی جگہ پر موجود تھا۔ اس کے بعد یوں ہوا کہ انجنیئر صاحب کا، بے پالک لڑکا لُو لگنے سے اچانک فوت ہو گیا۔ انجنیئر صاحب کا دل نوکری سے اچاٹ ہو گیا۔ انہوں نے پنشن لے لی اور یہ کوٹھی چھوڑ دی۔ ان کی جگہ نئے انجنیئر صاحب اور ان کے بال بچے آ گئے۔ خاموشی کا خول ٹوٹ گیا اور کوٹھی میں رونق چہل پہل اور گہما گہمی کے آثار نظر آنے لگے۔ کوٹھی پر نئے سرے سے سفیدی ہوئی اور باہر پرانے نام کی بجائے نئے نام کی تختی لگ گئی۔ اب جو دیکھا گیا تو کوٹھی کی بیرونی دیوار پر لفظ "فراموش" ہمیشہ کے لئے مٹ چکا تھا۔

تشریح مصنف (یا کہانی بیان کرنے والا کردار) بتاتا ہے۔ دوسرے دن جب میں معمول کے مطابق پھر سیر کے لئے اس سڑک پر سفید کوٹھی کے قریب سے گزرا تو کیا دیکھتا ہوں کہ لفظ "فراموش" کوٹھی کی بیرونی دیوار پر اُسی رسم الخط میں لکھا ہوا موجود ہے۔ تاہم مجھے کوئی حیرانی نہ ہوئی کیونکہ اب میں اس لفظ کے بار بار لکھے جانے اور پھر مٹائے جانے کو دیکھنے کا عادی ہو گیا تھا۔ تاہم اس دفعہ حیرانی کی بات یہ تھی کہ یہ لفظ فوراً مٹایا نہیں گیا۔ شاید انجنیئر صاحب اور ان کے ملازم کی نظر اس پر نہیں پڑی تھی یا اگر پڑی تھی تو وہ اسے صاف کرانا بھول گئے تھے۔ مزید حیرانی اس پر ہوئی کہ اگلے روز بھی یہ لفظ "فراموش" اسی رسم الخط میں کوٹھی کی اُسی بیرونی دیوار پر موجود تھا۔ اب میری تشویش بڑھی کہ اے خدا یہ قصہ کیا ہے؟ کئی طرح کے وہم و گمان دل میں آئے کہ شاید انجنیئر صاحب ڈیوٹی کے سلسلے میں لمبے دورے پر نکل گئے ہوں یا ممکن ہے ان کا تبادلہ ہو گیا ہو۔ یہ بھی امکان ہے کہ وہ بیمار ہو گئے ہوں اور باہر نہ نکل سکتے ہوں۔ بہر حال اصل حقیقت کیا تھی؟ اس کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا۔ بس قیاس آرائیاں تھیں جن کی لمبی ڈور سلجھنے میں نہیں آتی تھی یعنی سوائے اندازے لگانے کے اور کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا جس سے یہ اُلجھن رفع ہو سکتی۔

امتیاز علی تاج (۱۹۰۰ء - ۱۹۷۰ء)

آرام وسکون

تعارف اور پس منظر

"آرام وسکون" سید امتیاز علی تاج کا ایک مختصر ریڈیائی ڈراما ہے جسے ایکانکی ڈراما (ONE ACTPLAY) بھی کہا جا سکتا ہے۔ اس طنزیہ ڈرامے کا مرکزی خیال یہ ہے کہ انسان جس سکون کی تلاش میں اپنے گھر آتا ہے، وہ اسے گھر میں بھی نصیب نہیں ہوتا۔

اس ڈرامے میں نمایاں کردار اشفاق صاحب، بیگم اشفاق، ڈاکٹر صاحب اور ملازم للّو کے ہیں اور دیگر کردار مثلاً سقہ، ننھا بچہ، جھاڑو دینے والا ملازم، ہمسائے کا ہارمونیم بجانے والا صاحبزادہ اور دروازے پر صدا دینے والا فقیر، تھوڑی دیر کیلئے ڈرامے میں داخل ہوتے ہیں اور میاں اشفاق کا سکون غارت کر کے چلے جاتے ہیں۔ ڈرامے میں مرکزی کردار اشفاق کی بیوی کا ہے، جو بظاہر تو اپنے میاں کے آرام اور سُکھ کا خیال رکھنے کے لئے بڑی مخلصانہ دوڑ دھوپ کرتی ہے لیکن مسلسل بولنے اور چیخنے چلاّنے کی عادت کی وجہ سے اپنے خاوند کے لئے مستقل پریشانی کا باعث بنتی ہے۔

ڈرامے کا ہیرو ایک ملازم اشفاق ہے، جو بڑا محنتی ہے اور صبح دس بجے سے شام سات بجے تک دفتر میں کام کرتا ہے۔ مسلسل محنت سے وہ بیمار پڑ جاتا ہے اور ڈاکٹر اُسے مشورہ دیتا ہے کہ اسے دوا کی کوئی ضرورت نہیں البتہ وہ گھر پر چپ چاپ آرام کرے کیونکہ خاموشی اُس کے تھکے ہوئے اعصاب کو سکون بخشے گی۔ ڈاکٹر کی تجویز پر اشفاق دفتر سے چھٹی لے کر گھر میں پڑ رہتا ہے اور چاہتا ہے کہ پورا دن آرام سے بستر پر لیٹ کر گزارے لیکن یہ آرام اس کی قسمت میں نہیں ہے، اس آرام میں سب سے زیادہ خلل ڈالنے والی اُس کی اپنی بیوی ہے جو کبھی اپنے شوہر کی کراہنے کی آواز سُن کر اس کا بدن دابنے کی پیشکش کرتی ہے، کبھی گھنٹی گم ہونے پر احتجاج کرتی ہے کبھی سقّے کے دیر سے آنے اور دروازے کی کنڈی زور سے کھٹکھٹانے پر بڑبڑاتی ہے کبھی ملازم للّو کی کام چوری پر ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے، کبھی شوہر سے پرہیزی غذا تیار کرنے سے پہلے اس کی پسند کی چیز پوچھتی ہے اور اس سے باقاعدہ بحث وتکرار کرتی ہے، کبھی اپنے بچے کو کھلونا گاڑی چلانے سے منع کرتی ہے۔ جس کی کھڑکھڑاہٹ سے اس کے میاں پریشان ہو رہے ہیں کبھی مہتر کو میاں کا کمرہ صاف کرنے کے لئے بھیجتی ہے جو گرد اڑاتا ہے

تو میاں ڈانٹ ڈپٹ کرکے اُسے کمرے سے بھگا دیتے ہیں۔ کبھی خاوند سے اس بات پر جھگڑتی ہے کہ اگر اس کی سہیلی کا فون آیا تھا تو اسے بلایا کیوں نہیں گیا۔ کبھی ہمسائے کے بیٹے کو ہارمونیم بجانے سے منع کرنے کے لئے خط لکھنے بیٹھ جاتی ہے۔ کبھی بچّے کے گر پڑنے اور خون نکل آنے پر رونے سے اُسے دُور سے چپ کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ کبھی فقیر کے دروازے پر صدا لگانے اور میاں کے زچ پڑنے پر معذرت کرتی ہے اور کبھی ریٹھے کوٹنے سے روک کر فقیر کو رخصت کرنے کی تلقین کرتی ہے تاکہ اس کے میاں کے آرام و سکون میں خلل واقع نہ ہو۔ لیکن اس کی یہ سب کوششیں اس لحاظ سے بیکار ثابت ہوتی ہیں کہ ان سے میاں کی بے سکونی میں کمی ہونے کی بجائے اضافہ ہو جاتا ہے اور تنگ آکر اس کے میاں اپنی ٹوپی اور شیروانی لے کر دوبارہ اس دفتر کا رُخ کرتے ہیں جہاں مسلسل کام کرنے کی وجہ سے وہ بیمار ہوئے تھے۔

سید امتیاز علی تاج نے مختلف کرداروں کے برمحل اور برجستہ مکالموں کی مدد سے اس طنزیہ کہانی کا تانا بانا بڑی عمدگی سے بُنا ہے اور ڈرامائی ٹیکنیک کو نہایت کامیابی سے برتا ہے۔ ڈرامے کے کردار جس طبقے سے تعلق رکھتے ہیں ان کے چھوٹے بڑے مسائل کو انہوں نے بڑی خوبصورتی سے ایک مختصر ڈرامے میں سمو دیا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۵۷ | تردُّد : فکر، اندیشہ، تذبذب، پریشانی۔ انشاءاللہ : اگر خدا نے چاہا۔
نصیب دشمناں : دشمنوں کو نصیب ہو، مراد ہے خدا نہ کرے۔ (یہ دعائیہ کلمہ ہے)
خاک اثر نہیں ہوتا : ذرا بھی اثر نہیں ہوتا۔

ص ۵۸ | بے طرح : بُری طرح سے، نہایت۔ بے حد۔ تاکید : زور دینا، بار بار کہنا۔
مطلق : بالکل، قطعی (نفی کی تاکید کے لئے بالکل کی جگہ استعمال ہوتا ہے)

ص ۵۹ | اعصاب : عصبہ کی جمع، مراد ہے، رگ، پٹھے۔ مضر : نقصان دہ۔ تقویت : قوّت، طاقت، زور، تسکین، سہارا، تسلّی۔ پَر نہ مارنا : پَروں سے آواز پیدا نہ کرنا، مراد ہے قریب نہ پھٹکنا۔ آداب : ادب کی جمع، مراد ہے سلام کرنا۔ رخصت کی اجازت مانگنا۔ چپکا پڑا رہنا : خاموش لیٹے رہنا۔ کراہنا : دردناک آواز نکالنا، تکلیف سے آہیں بھرنا، ہائے ہائے کرنا۔ بدن ٹوٹنا : تھکن محسوس ہونا۔ بخار کی آمد ہونا۔ جوڑوں میں درد سا محسوس ہونا۔

ص ۶۰ | اللہ مارا : موا، (عورتوں کا کوسنا)۔ نامراد : بدبخت، بے نصیب، ناکام۔ کواڑ : دروازے کا پٹ۔ سقّہ : ماشکی، پانی بھرنے والا۔ بہرے : جنہیں کانوں سے سنائی نہ دے۔ کان پر جوں نہ رینگنا : ذرا بھر اثر نہ ہونا۔ بخشو اُسے : اس کی جان چھوڑو، اس کا قصور معاف کرو۔

طرح دینا: چشم پوشی کرنا، روگردانی کرنا، ٹالنا۔ سر پر سوار ہونا: مسلّط ہو جانا۔

ص ۶۱ ٹھکانے پر: اپنی اصل جگہ پر۔ ناحق: خواہ مخواہ، بلاوجہ۔ دَم اُلجھنا: دِل گھبرانا، سانس کا سینے میں رُکنا۔ ریٹھے: ایک قسم کا پھل جو اُونی کپڑے دھونے کے کام آتا ہے۔ گودام: ذخیرے کا مقام، سٹور۔ سر کھجانے کی فرصت نہ ہونا: بے حد مصروف ہونا۔

ص ۶۲ کواڑ: دروازے کا پٹ۔ مالٹڈ ملک (MALTED MILK): وہ دودھ جس میں جَو یا کسی اور اناج کا دلیہ پکایا گیا ہو۔ بیماروں کی ہلکی غذا۔ نارنگی: سنگترہ۔ ساگودانہ: ایک قسم کا سفید دانہ جو اکثر دودھ میں کھیر کی طرح پکا کر کھلاتے ہیں۔ یخنی: اُبلے ہوئے گوشت کا پانی جو مریضوں کو دیا جاتا ہے۔ مقوّی: قوّت بخش۔ پٹ پٹ: بچہ گاڑی چلنے کی آواز۔ کھٹ پھٹ: کھڑ کھڑاہٹ، متواتر ٹاپ پڑنے کی آواز، دو سخت چیزوں کے ٹکرانے کی آواز۔

ص ۶۳ چولھے میں جھونکنا: جلا دینا۔ دبوا لینا: کسی کو دابنے کے لئے کہنا۔ بے ڈھنگا: ناموزوں۔ زِچ ہونا: عاجز آ جانا، تنگ ہونا، بے بس ہونا۔

ص ۶۴ لاحول ولا قوۃ: خدا کے سوا کسی میں کچھ طاقت و زور نہیں۔ معاذ اللہ: ایسا نہیں ہو سکتا (اظہارِ نفرت و بے زاری کے لئے بولتے ہیں)۔ علیل: بیمار۔ بدتہذیب: تہذیب اور سلیقہ نہ رکھنے والا۔ گستاخ: بے ادب، شوخ، چالاک۔

ص ۶۵ اُلجھن: گھبراہٹ، تشویش، کش مکش۔ ہارمونیم: ایک قسم کا انگریزی باجا۔ نغمہ سرائی: گیت گانا۔ نعمت: لذیذ چیز۔ چڑ جانا: بُرا ماننا، ناراض ہونا۔ بے سُرے: بُری آواز میں گائے ہوئے۔ یک لخت: اچانک۔

ص ۶۶ یک نہ شُد دو شُد: ایک نہ ہوئی، دو ہو گئیں، ایک مصیبت یا شرارت کے ساتھ دوسری مصیبت یا شرارت کے موقع پر بولتے ہیں۔ بوکھلا دینا: بدحواس کرنا۔ دفتر لکھنا: کاغذات کا مجموعہ لکھنا، بڑا بھاری خط لکھنا۔ طومار لکھ مارنا۔ راہِ مولا: اللہ کی راہ میں، جس کا ثواب خدا دے گا۔ ہاون دستہ: دوائی کوٹنے کا برتن اور اس کی موسلی، کھرل اور لوہے کا ڈنڈا۔ دھمک: دھماکے دار آواز، وہ صدمہ جو سخت آواز سے دل و دماغ کو پہنچے۔

ص ۶۷ شیروانی: اچکن سے ملتا جلتا لباس۔ پرانے زمانے میں بٹنوں والا انگرکھا۔

سبق کا خلاصہ

ایک اوسط درجے کا گھر ہے جس میں اشفاق، بیگم اشفاق اور ان کا بچہ رہتے ہیں، ان کے علاوہ ایک ملازم للّو ہے۔ ایک دن دفتری کام کی زیادتی کی وجہ سے اشفاق صاحب بیمار پڑ

جاتے ہیں تو ان کی بیوی گھر پر ڈاکٹر کو بلاتی ہے جو میاں کا معائنہ کرنے کے بعد تسلّی دیتا ہے کہ فکر کرنے کی کوئی بات نہیں، صرف تھکن کی وجہ سے انہیں بخار ہو گیا ہے اور انہیں دوا سے زیادہ آرام و سکون کی ضرورت ہے۔ اگر انہوں نے کاروبار کی پریشانیاں بھلا کر ایک ہی دن گھر پر آرام سے گزارا تو ان کی طبیعت بحال ہو جائے گی۔ بیوی کہتی ہے کہ اس نے اپنے شوہر کو بارہا زیادہ کام کرنے سے منع کیا لیکن ان پر کوئی اثر نہ ہؤا۔ وہ ہمیشہ صبح دس بجے دفتر جا کر شام کے سات بجے واپس لوٹتے ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ اگر ہر روز تھوڑا تھوڑا وقت آرام و سکون کے لئے نہ نکالا جائے تو پھر بیمار پڑ کر صحت کے لئے زیادہ وقت نکالنا پڑتا ہے، لہٰذا ان کے لئے بہتر یہی ہے کہ وہ اب گھر پر آرام کریں اور دن بھر خاموشی سے لیٹے رہیں۔ انہیں دوا کی بالکل ضرورت نہیں، البتہ ان کے آرام و سکون کا خیال رکھنا ضروری ہے اور جو غذا تجویز کی گئی ہے، وہی دینی چاہیئے۔ ڈاکٹر یہ بھی ہدایت کرتا ہے کہ مریض کے کمرے میں شور و غل بالکل نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ انسانی پٹھوں پر نہایت نقصان دہ اثرات ڈالتا ہے، جبکہ خاموشی، اعصاب کو سکون عطا کرتی ہے۔ بیوی وعدہ کرتی ہے کہ اس ہدایت پر پوری طرح عمل کیا جائے گا اور کوئی میاں کے کمرے کے قریب نہیں پھٹکے گا۔

لیکن ڈاکٹر کے جاتے ہی بیوی سب کچھ بھلا کر اپنے میاں کی خیریت دریافت کرنے کے لئے آ کر پوچھتی ہے کہ کیا وہ سو گئے ہیں؟ اس پر میاں جواب دیتے ہیں کہ نہیں، بس خاموشی سے لیٹا ہؤا تھا۔ میاں کے کراہنے پر وہ پوچھتی ہے کہ اگر ان کا بدن ٹوٹ رہا ہو تو وہ داب دے لیکن میاں کہتے ہیں کہ وہ چلی جائے اور انہیں سکون سے سونے دے۔ یہ سن کر بیوی جانے لگتی ہے لیکن جانے سے پہلے کہتی ہے کہ اگر اس کی غیر حاضری میں میاں کو کسی چیز کی ضرورت پڑے تو وہ گھنٹی بجا کر اسے بلا سکتے ہیں۔ جب وہ میز پر نظر ڈالتی ہے تو گھنٹی وہاں سے غائب ہوتی ہے۔ اس پر بیوی کوسنے لگتی ہے کہ نہ جانے کون بدبخت گھر کی چیزوں کو اِدھر اُدھر کرتا رہتا ہے؟

اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوتی ہے۔ بیوی ملازم للّو سے کہتی ہے کہ وہ باہر جا کر دریافت کرے کہ کون آیا ہے اور کیا کام ہے؟ پتہ چلتا ہے کہ سقہ پانی دینے آیا ہے۔ بیوی کوستی ہے کہ اس وقت میاں کو آرام کی ضرورت ہے اور وہ کتنے زور سے کنڈی کھٹکھٹا رہا ہے۔ شاید اس کے خیال میں گھر کے سب افراد بہرے ہیں۔ وہ اونچی اونچی آواز میں بڑبڑاتی ہے کہ کیا یہ وقت پانی لانے کا ہے؟ اب تو اچھی خاصی دوپہر ہونے والی ہے۔ اگر اس نے اپنی روش نہ بدلی تو وہ اسے نوکری سے الگ کر دے گی۔ میاں تنگ آ کر کہتے ہیں کہ اب سقّے کا قصور معاف کر دیا جائے اور انہیں آرام کرنے دیا جائے۔ اتنے میں بیوی کی نظر میز پر پڑتی ہے تو گھنٹی وہاں

موجود ہوتی ہے۔ وہ پھر چیختی ہے کہ گھنٹی یہاں کیسے آگئی ہے جب کہ پہلے وہ یہاں سے غائب تھی۔ اس پر میاں جواب دیتے ہیں کہ انہوں نے رات کو خود اُسے میز سے اُٹھا کر انگیٹھی پر رکھ دیا تھا کیونکہ ان کا لاڈلا بیٹا بار بار بجا کر انہیں پریشان کر رہا تھا۔ اتنے میں بیوی کو یاد آتا ہے کہ اس نے اپنے ملازم للّو کو گودام سے ریٹھے لاکر کوٹنے کے لئے کہا تھا اور وہ ابھی تک واپس نہیں لوٹا۔ وہ چیخ چیخ کر للّو کو پکارنے لگتی ہے۔ للّو آتا ہے تو اُسے ڈانٹتی ہے کہ اسے صبح سے ریٹھے ہی نہیں مل پائے۔ اس پر للّو عذر پیش کرتا ہے کہ اسے صبح سے یہ کام کرنے کی مہلت ہی نہیں ملی کیونکہ ادھر وہ گودام کا رُخ کرتا ہے اور اُدھر اُسے کسی اور کام سے بلا لیا جاتا ہے۔ بیوی دوبارہ للّو کو ریٹھے لانے کے لئے بھیج دیتی ہے اور خاوند کے سرہانے گھنٹی رکھ کر جانے لگتی ہے۔ لیکن پھر یہ خیال آتا ہے کہ ڈاکٹر نے مریض کے کھانے کے لئے جو چیزیں لکھی ہیں۔ اُن کے بارے میں تو اس نے اپنے میاں سے پوچھا ہی نہیں۔ وہ میز کے نیچے پڑے ہوئے ڈاکٹری نسخے کو اونچی آواز میں پڑھنے لگتی ہے جس پر لکھا ہے: مالٹڈ ملک (دودھ میں پکا ہوا جَو کا دلیہ) نارنگی کا رس، ساگو دانے کی کھیر، یخنی وغیرہ۔ وہ شوہر سے پوچھتی ہے کہ اس کے لئے ان میں سے کیا تیار کرایا جائے۔ میاں سخت بے زاری کے عالم میں کہتے ہیں کہ وہ جو جی چاہے، پکالے۔ بیوی کہتی ہے کہ میرے جی چاہنے کا کیا سوال ہے، کھانا تو انہوں نے ہے۔ اس پر میاں کہتے ہیں کہ وہ ساگو دانہ بنا دے۔ یہ سُن کر بیوی کہتی ہے کہ کیوں نہ وہ تھوڑی سی یخنی ہی پی لیں، جس سے انہیں تقویت ملے گی۔ میاں اس سے اتفاق کرتے ہیں تو بیوی کو خیال آتا ہے کہ اس کام میں تو دیر لگے گی کیونکہ چوزہ بازار سے منگوانا پڑے گا۔ اور وہ للّو لانے جائے گا تو حسبِ عادت دیر سے لوٹے گا۔ اتنے میں صحن میں ان کا بچہ کھلونا گاڑی سے کھیلنے لگتا ہے جس کی کھڑکھڑاہٹ میاں کے سکون میں خلل ڈالنے لگتی ہے۔ بیوی وضاحت کرتی ہے کہ ننھا عید کے روز میلے سے یہ کھلونا گاڑی خرید کر لایا تھا اور اب ہر وقت اسے چلاتا رہتا ہے۔ وہ بچے کو ڈانٹ ڈپٹ کرتی ہے کہ گاڑی کی کھڑکھڑاہٹ سے اپنے باپ کے سکون کو غارت نہ کرے۔ جب بچہ باز نہیں آتا تو ماں اس سے گاڑی چھین لیتی ہے جس پر بچہ رونے لگتا ہے۔ ماں اسے چپ کرانے کے لئے پھر ڈانٹتی ہے اور جب وہ پھر بھی چپ نہیں ہوتا تو اسے کھینچ کر پرے لے جاتی ہے۔ میاں سوچتے ہیں کہ شاید اب انہیں آرام نصیب ہو جائے گا، لیکن ان کی قسمت میں آرام کہاں؟ اتنے میں کمرے میں آکر ملازم جھاڑو دینے لگتا ہے جس کی گرد میاں کو پریشان کرنے لگتی ہے۔ میاں اسے ڈانٹ کر کمرے سے نکال دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگتی ہے۔ میاں پہلے اسے نہیں اُٹھاتے اور پکارتے ہیں کہ کوئی آکر ٹیلی فون سُن لے، لیکن جب کوئی نہیں آتا تو وہ خود مجبور ہو کر ٹیلی فون اُٹھا لیتے ہیں۔ اِدھر سے کوئی خاتون گفتگو کر رہی ہیں جو اشفاق صاحب (میاں) سے کہتی ہیں کہ وہ ذرا

اپنی بیگم صاحبہ کو بلادیں۔ میاں کہتے ہیں کہ ان کی بیوی اس وقت کام میں مصروف ہے اور کمرے میں نہیں ہے وہ اپنے بارے میں بتاتے ہیں کہ وہ خود بیمار ہونے کی وجہ سے کمرے سے باہر نہیں جا سکتے۔ اشفاق صاحب کے اس روکھے جواب پر وہ خاتون انہیں طنزاً کہتی ہے کہ کیا ان کا گلہ خراب ہے جو وہ اپنی بیگم صاحبہ کو آواز دے کر بلا نہیں سکتے۔ اس پر وہ غصے میں اسے بدتہذیب اور گستاخ کہتے ہوئے ٹیلی فون بند کر دیتے ہیں۔

جب ان کی بیوی آکر پوچھتی ہے کہ وہ بستر سے کیوں اٹھے ہیں اور کیا انہوں نے اسے بلایا ہے؟ تو وہ اپنی بیوی کو بتاتے ہیں کہ انہوں نے اسے کئی آوازیں دی تھیں لیکن اُس نے ان کی ایک نہیں سُنی۔ اس پر بیوی بتاتی ہے کہ وہ للّو کو ریٹھے نکال کر دینے کے لئے گودام میں چلی گئی تھی۔ میاں بتاتے ہیں کہ اُس کی سہیلی کا فون آیا تھا۔ بیوی کے یہ پوچھنے پر کہ کس سہیلی کا فون تھا، میاں رکھائی سے جواب دیتے ہیں کہ مجھے کیا پتہ کہ کس کا تھا؟ میں نے کہہ دیا تھا کہ وہ دوبارہ فون کرلے۔ اس پر بیوی بڑبڑانے لگتی ہے کہ نہ جانے وہ کون تھی اور فون پر کیا کہنا چاہتی تھی۔ انہوں نے خواہ مخواہ بیٹھے بٹھائے الجھن میں ڈال دیا۔ میاں اُسے تسلی دیتے ہیں کہ اس خاتون کو کوئی ضروری کام نہیں تھا۔ وگرنہ وہ پیغام دے دیتی۔

اسی اثناء میں پڑوس سے ہارمونیم کے بجنے کی آواز آنے لگتی ہے۔ میاں پریشان ہو کر بیوی سے کہتے ہیں کہ وہ ہمسائے کے صاحبزادے کو گانے بجانے سے منع کرے، کیونکہ سر درد سے پھٹا جارہا ہے۔ بیوی عذر کرتی ہے کہ وہ بھلا اُسے کیسے روک دے؟ میاں کہتے ہیں کہ ان کے گھر خط لکھ کر کہو کہ میرے میاں بیمار ہیں اور ڈاکٹر نے کہا ہے کہ انہیں آرام و سکون کی ضرورت ہے ابھی گانے کا شور جاری تھا کہ اتنے میں باہر سے بچّے کے رونے کی آواز آتی ہے۔ بیوی وہیں سے بیٹھے بیٹھے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا؟ اس پر بچّہ زور سے رو کر جواب دیتا ہے کہ گرنے سے خون نکل آیا ہے۔ بیوی کہتی ہے کہ وہ چُپ ہو جائے وہ ابھی ہمسائی کے نام خط لکھ رہی ہے میاں کراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ پہلی مصیبت ہی کم نہ تھی اب یہ دوسری بھی شروع ہو گئی۔ بیوی خفا ہو کر کہتی ہے کہ وہ تو ذرا ذرا سی بات پر گھر والوں کو بدحواس کر دیتے ہیں۔ اب وہ خط لکھتے لکھتے بچّے کو چپ کیسے کرا سکتی ہے؟ وہ بچّے کو زور سے ڈانٹتے ہوئے کہتی ہے کہ نامراد چپ ہو جا۔ اگر خون نکل آیا تو کون سی قیامت آگئی ہے؟ مجھے خط کی چند سطریں لکھ لینے دو۔ ادھر میاں کا کراہنا، بچّے کا رونا اور ہارمونیم کا بجنا سب جاری ہیں۔ میاں زچ ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا بیگم صاحبہ کا خط ابھی ختم نہیں ہوا۔ اس پر بیوی جواب دیتی ہے کہ بس ختم ہونے ہی والا ہے۔

اتنے میں فقیر کی آواز سُنائی دیتی ہے جو مکان کے باہر کھڑا ہو کر خیرات مانگ رہا ہے

اور مسلسل پکار رہا ہے۔ میاں کراہتے ہوئے کہتے ہیں کہ بس اس کی کسر رہ گئی تھی۔ خدا کے واسطے اسے رخصت کیا جائے۔ بیوی للّو کو پکارنے لگتی ہے کہ وہ فقیر کو جانے کے لئے کہے۔ مگر للّو ہاون دستے سے ریٹھے کوٹ رہا ہے۔ ریٹھے کوٹنے کی دھمک، ہمسائے کے صاحبزادے کا بے سُرا گانا اور بچّے کے رونے کی آواز، مل جُل کر میاں کا غصہ بڑھا دیتے ہیں۔ وہ بیوی سے اپنی ٹوپی اور شیروانی طلب کرتے ہیں۔ بیوی کے یہ پوچھنے کہ وہ اس بیماری کی حالت میں کہاں جارہے ہیں؟ وہ خفا ہو کر جواب دیتے ہیں کہ آرام و سکون کی تلاش میں وہ دفتر جارہے ہیں کیونکہ جب تک وہ گھر میں رہیں گے، انہیں آرام و سکون نصیب نہیں ہوگا۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال بحوالۂ متن، مع سیاق و سباق، درج ذیل عبارت کی تشریح مطلوب ہے:

سقّہ! گھر میں بہرے بستے ہیں؟ کم بخت، اس زور سے کُنڈی کھٹکھٹاتا ہے؟ اللہ ماروں کو اتنا خیال بھی تو نہیں آتا کہ گھر میں کوئی بیمار پڑا ہے۔ ڈاکٹر نے تاکید کر رکھی ہے کہ شور و غل نہ ہونے پائے اور اس سے کہو، یہ کیا وقت ہے، پانی لانے کا۔ اچھی خاصی دوپہر ہونے کو آگئی ہے۔ کل سے اتنی دیر میں آیا تو نوکری سے الگ کر دوں گی۔ میں نامراد کو بیسیوں مرتبہ کہلا چکی ہوں کہ صبح سویرے ہو جایا کرے، کان پر جوں ہی نہیں رینگتی۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت امتیاز علی تاج کے ڈرامہ "آرام و سکون" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے بتایا گیا ہے کہ میاں اشفاق دفتری کام کی زیادتی کی وجہ سے بیمار پڑ گئے ہیں اور انہیں ڈاکٹر نے گھر پر آرام کرنے کی تلقین کی ہے۔ اشفاق صاحب دفتر سے چھٹی لے کر گھر پر پڑے رہتے ہیں کہ شاید اسی طرح انہیں آرام و سکون نصیب ہو سکے لیکن ڈاکٹر کی ہدایت کے باوجود ان کی بیگم شور و غل مچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتی۔ خود خاموش رہنے کی بجائے وہ مسلسل بولتی رہتی ہے۔ کبھی پوچھتی ہے کہ اگر بدن دکھ رہا ہو تو وہ اسے دبا دے؟ کبھی میز کی گھنٹی کی تلاش میں چیخ و پکار کرنے لگتی ہے اور چیزوں کو اُلٹنے پلٹنے کا الزام اپنے ملازم للّو پر رکھ دیتی ہے۔ اتنے میں باہر سے کنڈی کھڑکنے کی آواز آتی ہے۔ بیوی کے پوچھنے پر للّو بتاتا ہے کہ سقّہ آیا ہے اور پانی لایا ہے۔

اس عبارت کے بعد بتایا گیا ہے کہ بیوی کبھی تو ملازم للّو کو کام نہ کرنے پر ڈانٹتی ہے۔

کبھی پرہیزی غذا تیار کرنے کے لئے میاں کی پسند دریافت کرنے چلی آتی ہے۔ کبھی ان کا بچّہ کھلونا گاڑی سے کھیلنے لگتا ہے جس کی کھڑکھڑاہٹ سے میاں کا دل گھبراتا ہے۔ کبھی ملازم کمرے میں جھاڑو دینے لگتا ہے اور اُڑتی ہوئی دھول سے میاں پریشان ہو جاتے ہیں۔ کبھی بیوی کی کوئی سہیلی ٹیلی فون کر کے انہیں بیگم صاحبہ کو بلانے کی فرمائش کرتی ہے۔ کبھی ہمسائے کا صاحبزادہ ہارمونیم بجا کر اُن کے آرام میں خلل ڈالتا ہے۔ کبھی بچّہ گِر کر رونے لگتا ہے کیونکہ اس کے خون نکل آیا ہے۔ کبھی کوئی فقیر دروازے پر کھڑا ہو کر خیرات مانگنے کے لئے مسلسل صدا لگاتا ہے۔ کبھی ملازم ہاون دستے کی مدد سے ریٹھے کوٹنے لگتا ہے اور اس کی مسلسل دھمک میاں کے سکون کو غارت کر دیتی ہے۔ میاں یہ سوچ کر کہ انہیں گھر میں تو آرام مِل نہیں سکتا، اپنی ٹوپی اور شیروانی اٹھا کر دفتر کا رُخ کرتے ہیں کہ شاید جس آرام کی انہیں تلاش ہے وہ دفتر میں مِل جائے۔

تشریح ملازم للّو سے یہ معلوم ہونے پر کہ باہر دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے والا سقّہ ہے جو پانی دینے آیا ہے، اشفاق صاحب کی بیوی چلّانے لگتی ہے کہ کیا ماشکی آیا ہے؟ جو اتنے زور سے دروازے کا پٹ توڑ رہا ہے؟ بدبخت اتنے زور سے کنڈی اس لئے کھٹکھٹاتا ہے کہ شاید اس کے خیال میں اس گھر کے سبھی افراد سن نہیں سکتے۔ بیوی سقّے سمیت سب تنگ کرنے والوں کو کوستی ہے کہ انہیں ذرا خیال نہیں آتا کہ اس وقت گھر میں کوئی مریض موجود ہے جس کے لئے ڈاکٹر نے زور دے کر کہہ رکھا ہے کہ اس کے آس پاس شور و غُل نہیں ہونا چاہیئے۔ پھر بیوی سقّے پر خفا ہونے لگتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ پانی لانے کا کون سا وقت ہے۔ اب تو دوپہر ہونے والی ہے حالاں کہ پانی صبح سویرے آنا چاہیئے۔ وہ دھمکی دیتی ہے کہ اگر کل بھی سقّہ اسی طرح دیر سے آیا تو وہ اُسے کھڑے کھڑے نوکری سے نکال دے گی۔ وہ کہتی ہے کہ اُسے کتنی مرتبہ کہا جا چکا ہے کہ وہ پانی ہمیشہ صبح کے وقت لایا کرے لیکن کم بخت پر ذرا برابر اثر نہیں ہوتا۔

میرزا اسداللہ خاں غالبؔ (۱۷۹۷ء - ۱۸۶۹ء)

مکاتیب

تعارف اور پسِ منظر

اس سبق میں مرزا غالبؔ کے چار خطوط شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے دو خطوط نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کے نام ہیں، تیسرا خط میر مہدی مجروحؔ کے نام اور چوتھا خط منشی ہرگوپال تفتہؔ کے نام ہے۔

نواب علاؤالدین احمد خاں علائی (وفات ۱۸۸۴ء)

نواب امین الدین احمد خاں رئیس لوہارو (وفات ۱۸۶۹ء) کے بڑے صاحبزادے اور وارثِ ریاست تھے جنہیں مرزا غالبؔ نے اپنا خلیفۂ ثانی بنایا تھا۔ وہ عربی اور فارسی کے بہت بڑے عالم اور خوش ذوق شاعر تھے۔ خود نواب امین الدین احمد خاں سے غالبؔ کا قریبی تعلق پچاس برس سے زیادہ کا تھا اور ان کے بزرگوں سے تعلقات ساٹھ برس سے بھی زیادہ مدت کے تھے۔ نواب امین الدین احمد خاں، ان کے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں اور بیٹے نواب علاؤالدین احمد خاں علائی سے غالبؔ کو بہت محبت تھی۔ نواب امین الدین احمد خاں کے والد نواب احمد بخش خاں (وفات ۱۸۲۷ء) تھے۔ نواب احمد بخش خاں کے ایک بھائی نواب الٰہی بخش خاں معروف تھے، جن کی بیٹی امراؤ بیگم سے مرزا غالبؔ کی شادی ہوئی تھی۔

نواب امین الدین احمد خاں کے چھوٹے بھائی نواب ضیاء الدین احمد خاں (وفات ۱۸۸۵ء) تھے۔ انہیں ریاست کا منصب تو حاصل نہیں تھا البتہ حصے کی رقم ملتی تھی، وہ فارسی اور اردو دونوں زبانوں میں شعر کہتے تھے۔ اردو میں ان کا تخلص نیرؔ اور فارسی میں رخشاںؔ تھا۔ نواب ضیاء الدین احمد خاں کے دو صاحبزادے تھے۔ ان میں سے ایک نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ (وفات ۱۸۶۹ء) کا ذکر خط نمبر ۲ میں آیا ہے۔ ثاقبؔ بھی اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح عالم فاضل شخص تھے۔ مرزا غالبؔ کی اہلیہ امراؤ بیگم کی ایک بہن آبادی بیگم تھی جس کی شادی نواب غلام حسین خاں مسرور سے ہوئی۔ نواب زین العابدین خاں عارفؔ انہیں کے بیٹے تھے۔ غالبؔ کی چونکہ ساری اولاد بچپن میں فوت ہوگئی تھی، اس لئے انہوں نے پہلے عارفؔ کو اپنا بیٹا بنا لیا اور عارفؔ کے نوجوانی میں انتقال کر جانے پر اس کے دونوں بیٹوں

باقر علی خاں اور حسین علی خاں کو بیٹوں کی طرح پالا۔ اس طرح مرزا غالب کے اس خاندان کے چھوٹے بڑے سب افراد سے قریبی نجی تعلقات بھی تھے اور پشت ہا پشت علمی و ادبی مراسم بھی تھے۔ جہاں اس خاندان کے وضع دار اصحاب مرزا غالب کی روپے پیسے سے مدد کرتے رہتے تھے، وہاں مرزا غالبؔ بھی ان کے دکھ سکھ میں برابر شریک رہتے تھے۔ یوں غالب اور خاندانِ لوہارو، ایک دوسرے کے ساتھ تعلق داری اور احسان مندی کے دوہرے رشتے میں بندھے ہوئے تھے۔

میر مہدی مجروحؔ

میر حسین فگار کے بیٹے تھے۔ وہ ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۳ء میں فوت ہوئے۔ غالبؔ کے عزیز ترین شاگردوں میں سے تھے، اسی لئے ان سے ہنسی مذاق چلتا رہتا تھا۔ ان کا دیوان "مظہر معانی" کے نام سے مرتب ہوا۔ ترتیب و اشاعت کا کام ان کے دوست میر افضل علی عرف میرنؔ صاحب نے کیا۔ میر سرفراز حسین، جن کا خط نمبر ۳ میں حوالہ آیا ہے، میر مہدی مجروحؔ کے بھائی تھے۔ میر افضل علی کو غالبؔ، میرنؔ صاحب کہا کرتے تھے کیونکہ لکھنؤ میں مجتہد العصر کے بھائی کا نام "میرن" تھا، چنانچہ مرزا غالبؔ نے جب میر سرفراز حسین کو مزاحاً "مجتہد العصر" کہا تو میر افضل علی کے لئے "میرن" زیادہ مناسب نام معلوم ہوا۔ ان کا ذکر بھی خط نمبر ۳ میں موجود ہے۔ میر سرفراز حسین نوکری پیشہ تھے اور میرن صاحب مرثیہ خواں تھے۔ چنانچہ مرزا غالبؔ نے ان دونوں کو روزگار فراہم کرنے کے لئے والئ رام پور نواب یوسف علی خاں سے سفارش کی تھی لیکن کام نہ بنا۔ یہ دونوں مرزا غالبؔ سے اتنی عقیدت رکھتے تھے جتنی کسی مرید کو اپنے مرشد سے ہوتی ہے۔ خط نمبر ۳ میں ان کے علاوہ حکیم میر اشرف علی، میر نصیر الدین اور کلیان کا ذکر بھی آیا ہے۔ حکیم میر اشرف علی اپنے زمانے کے نامور طبیب تھے اور غالبؔ کے دوست تھے۔ میر نصیر الدین بھی غالبؔ کے دوست تھے اور انہیں غالبؔ مزاحاً "چراغِ دہلی" لکھتے تھے (حضرت شیخ نصیر الدین چراغِ دہلی کے نام کی مناسبت سے)۔ کلیان، غالبؔ کے ایک ملازم کا نام تھا۔

منشی ہرگوپال تفتہؔ

سکندر آباد ضلع بلند شہر کے رہنے والے تھے۔ ان کے والد کا نام موتی لال تھا اور قوم کائستھ تھی۔ ۱۷۹۹ء میں پیدا ہوئے۔ گویا غالبؔ سے دو برس چھوٹے تھے۔ انہوں نے ۱۸۷۹ء میں وفات پائی۔ وہ غالبؔ کے شاگرد تھے اور انہوں نے ہی تفتہؔ تخلص تجویز کیا تھا۔ غالبؔ سے بڑے بے تکلف تھے۔ چنانچہ اردو میں غالبؔ کے سب سے زیادہ خطوط انہیں کے نام ہیں۔ ابتداء میں ملازمت کی اور بعد ازاں آزاد زندگی گزاری۔ وہ خاصے خوشحال تھے چنانچہ اپنے خرچ سے اپنی کتابیں چھپواتے رہے۔ شاعری میں چار دیوان ان کی یادگار ہیں۔ مرزا غالبؔ انہیں محبت سے میرزا تفتہؔ کہتے تھے۔ موجودہ نصابی کتاب میں شامل خط نمبر ۴،

انہیں کے نام ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۶۸ مکاتیب: مکتوب کی جمع۔ مراد ہے خطوط۔ ثمرِ نورس: تازہ میوہ۔ نیا پھل۔ یہاں مراد نواب علاؤالدین علائی۔ نہال: لگایا ہؤا پودا۔ درخت۔ یہاں مراد نواب امین الدین خاں والئی ریاست لوہارو۔ نشوونما: بڑھنا، بڑا ہونا، اُگنا، پرورش پانا، پھلنا پھولنا۔ ہوا خواہ: خیر خواہ بہتری چاہنے والا۔ سایہ نشین: چھاؤں میں بیٹھنے والا۔ اوس: اس۔ عزیز: پیارا، دل پسند۔ دید وادید: ملاقات۔ صورتیں: تدبیریں، تجویزیں، مواقع۔ لوہارو: ایک ریاست کا نام جو دہلی کے قریب واقع ہے۔ معذور: ناچار، اپاہج۔ قابل معافی۔ عذر: بہانہ، دلیل۔ زنہار: ہرگز (نفی یا اثبات کی تاکید کے لئے) مسموع: سننے کے قابل۔ قبول کیا گیا۔ ماجرا: قصّہ۔ عالم: دُنیا، جہان۔ عالمِ ارواح: روحوں کا جہان، اس دنیا سے پہلے کا جہان جہاں تمام روحیں علم باری تعالیٰ میں تھیں یا وہ جہان جہاں روحیں، مرنے کے بعد پہنچتی ہیں۔ عالمِ آب و گل: پانی اور مٹی کا بنا ہؤا جہان۔ مراد ہے یہ دنیا جہاں ہم زندہ ہیں۔ حاکم: حکومت کرنے والا، آقا، مالک۔ وارث: مرنے والے کا ترکہ پانے والا۔

ص ۶۹ لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ } ترجمہ: آج کے دن بادشاہت کس کی ہے؟ اُس خدائے واحد کی جو سب سے زبردست اور طاقت در ہے۔ (سورۃ مومن، آیت نمبر ۱۶)

قاعدۂ عام: عمومی دستور، عام اصول۔ روبکاری: مقدمے کی پیشی، مقدمے کی کارروائی۔ حوالات: قیامِ حراست و نگرانی، وہ مکان جس میں مجرم تفتیشِ مقدمہ تک نظربند رکھے جاتے ہیں۔ رجب: ہجری سال کا ساتواں مہینہ۔ حکم دوامِ حبس صادر ہونا: عمر قید کا حکم سنایا جانا۔ دوام: ہمیشہ کے لئے۔ حبس: قید۔ حکم صادر ہونا: حکم دیا جانا۔ بیڑی: لوہے کی وہ زنجیر جو مجرم کے پاؤں میں ڈالتے ہیں۔ مجازاً دنیوی تعلقات، بیوی بچے وغیرہ۔ یہاں بیوی مراد ہے۔ زنداں: قید خانہ، جیل۔ فکرِ نظم و نثر: شاعری اور نثر نگاری کرنا۔ مشقت: محنت، مزدوری، تکلیف۔ بلادِ شرقیہ: بلاد، بلد کی جمع مراد ہے شہر یا ملک۔ شرقیہ: مشرقی۔ پایانِ کار: آخر کار۔ محبس: قید خانہ۔ گریز پا: بھاگنے والا۔ ہتھکڑیاں: وہ زنجیر جو مجرم کے ہاتھ میں ڈالی جاتی ہے، یہاں دونوں بچے حسین علی خاں اور

باقر علی خاں مراد ہیں۔ فگار: زخمی۔ زخم دار: زخمی، زخم رکھنے والے۔ مشقّتِ مقرّری: وہ محنت جو قیدی کو جیل میں لازماً کرنی پڑتی ہے۔ یک قلم: بالکل، تمام، سراسر۔ بے حیا: بے غیرت۔ زاویۂ زندان: قید خانے کے کونے میں۔ عہد: قول و قرار، وعدہ، خود پر پابندی عائد کرنا۔ صادر: نافذ، جاری ہونا۔

ص ۷۰ | ضعیف: کمزور۔ احتمال: گمان۔ شک وشبہ۔ ذی الحجہ: حج والا مہینہ، چاند کے حساب سے بارھواں مہینہ۔ بہر تقدیر: جس طرح قسمت چاہے، جو بھی قسمت میں ہو۔ بعدِ نجات: رہائی پانے کے بعد۔

فرّخ آں روز کہ از خانۂ زندان بروم
سوئے شہر خود، ازیں وادیٔ ویراں بروم

ترجمہ: مبارک ہوگا وہ دن جب مَیں اس قید خانہ سے نکلوں گا اور اس ویران وادی (مراد ہے دُنیا) سے نکل کر اپنے اصلی گھر (مراد ہے عقبیٰ) کی طرف جاؤں گا۔

نیا مہمان: علاؤ الدین علائی کا نیا پیدا ہونے والا بچّہ۔ دراز: لمبی۔ سعید ہے یا سعیدہ ہے؟: وہ نیک بخت لڑکا ہے یا لڑکی۔ ثاقب: شہاب الدین احمد خاں ثاقب جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیّر (برادرِ خورد نواب امین الدین احمد خاں) کے صاحبزادے تھے۔ عزیز: پیارا مراد ہے لڑکا۔ عزیزہ: پیاری، مراد ہے لڑکی۔ احتمال: گمان، شک وشبہ۔ رفع: دُور۔ تختہ: کاغذ کا تاؤ (کاغذ کا پورا ورق) سراسر: پورا۔ لطیفہ: ظریفانہ بات یا حکایت۔ بذلہ سنجی: خوش طبعی، ہنسی مذاق، چٹکلے بازی۔ شوخ چشمی: بے باکی، دل لگی، شرارت۔ فحوائے عبارت: عبارت کے لحاظ سے۔ تحریر کے ڈھنگ سے، طرزِ تحریر سے۔ جگر خون ہونا: ہمت ٹوٹ جانا۔ سخن گذار: فصیح البیان، خوش کلام، زبان آور: فصیح البیان۔ عیّار: چالاک۔ طرّار: تیز، زبان دراز، چالاک، شوخ۔ عاجز: ناتواں، مجبور، بے بس۔ درماندہ: عاجز، مجبور بے کس۔ از کار رفتہ: بیکار، نکمّا، جو کام کرنے کے قابل نہ رہا ہو۔ ساغرِ اوّل و دُرد: شراب کا پہلا ہی پیالہ اور اس میں بھی تلچھٹ (مٹکے کی تہ میں بچی کھچی میلی کچیلی شراب)۔ روش: طریقہ، شیوہ۔ فصاحت و بلاغت: خوش بیانی۔ داد نہ پانا: کلام یا کمال کی تعریف نہ ہونا۔ انصاف نہ ہونا۔

ص ۷۱ | معرض: نمائش گاہ۔ ظاہر ہونے کی جگہ۔ اس دنیا میں، یہاں مراد ہے اُن شکایت کے سلسلے میں۔ ہم طالع: ہم قسمت، ایک جیسے مقدر والا۔ ہم درد: جو درد تمہیں ہے، وہی مجھے بھی ہے۔ یک فنہ: کسی ایک فن (مثلاً شاعری) کا ماہر۔ بہ اندازۂ بایست: جیسی ملنی چاہیئے تھی۔ قلندری: آزادی (دنیوی امور سے) درویشی، قلندر اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے وجود اور دنیا سے بے خبر ہو کر ہمہ تن خدا کی طرف متوجہ ہو۔ آزادگی: آزادی، رہائی (رسوم و رواج سے)

ایثار : اپنی ضرورت پر دوسرے کی ضرورت کو ترجیح دینا۔ کرم : عنایت، بخشش، مہربانی، سخاوت۔ دواعی : داعیہ کی جمع، ارادے، آرزوئیں۔ خالق : پیدا کرنے والا، خدا۔ بقدر ہزار ایک : ہزار میں ایک۔ ظہور میں آنا : ظاہر ہونا۔ شطرنجی : موٹا سوتی فرش، دری۔ پیادہ پا : پیدل۔ شیراز : ایران کا ایک مشہور شہر جہاں حافظ اور سعدی جیسے شعراء پیدا ہوئے۔ نجف : عراق کا ایک شہر جہاں حضرت علیؓ دفن ہیں۔ دستگاہ : قدرت۔ مہارت، مقدور۔ عالم : دنیا، جہان۔ میزبان : مہمانوں کی خدمت کرنے والا، صاحب خانہ جس کے پاس کوئی مہمان آیا ہو۔ مقہور : جس پر قہر و غضب نازل کیا گیا ہو۔ خلق : خدا کی مخلوق، بندے۔ مردود : رد کیا گیا، نظر انداز کیا گیا، نالائق، لعنتی۔ ناتواں : کمزور، ضعیف۔ فقیر : غریب۔ نکبت : غربت۔ بدحالی۔ نظیر : مثال، مانند۔ بہم پہنچانا : حاصل کرنا، دستیاب ہونا۔ واقعۂ کربلا : شہادت کا وہ المناک واقعہ جو ۱۰ محرم ۶۱ھ بمطابق ستمبر ۶۸۱ء کو عراق کے موجودہ شہر کربلا کے مقام پر امام حسینؓ اور ان کے ۷۲ ساتھیوں کو پیش آیا، جنہوں نے راہِ حق میں جانیں دے دیں لیکن یزید کی اطاعت قبول نہیں کی۔ واللہ : خدا کی قسم۔ بعینہٖ : بالکل ہو بہو۔ مسلم بن عقیل : حضرت امام حسینؓ کے چچیرے بھائی جنہیں آپؓ نے کوفہ کے سیاسی حالات دریافت کرنے کے لئے مکہ سے کوفہ بھیجا تھا۔ کیونکہ کوفیوں نے امام حسینؓ کو ہزاروں خطوط لکھ کر درخواست کی تھی کہ وہ تشریف لائیں تاکہ ان کی بیعت کر کے انہیں خلیفہ تسلیم کیا جائے۔ مسلم بن عقیل کے کوفہ پہنچنے پر اٹھارہ ہزار کوفیوں نے ان کے ہاتھ پر فوراً بیعت کر لی لیکن جب گورنر کوفہ عبید اللہ ابن زیاد نے مسلم بن عقیل کو گرفتار کر لیا تو تمام کوفی ان سے الگ ہو گئے اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیا۔ چنانچہ ابن زیاد نے انہیں اذیت دے کر قتل کروا دیا۔ کوفہ : عراق کا وہ شہر، جس کے باشندے زمانۂ قدیم سے دغا بازی اور بے وفائی میں مشہور ہیں۔ خالق : پیدا کرنے والا، خدا۔ آبرو : عزت۔ نگہبان : محافظ۔ معاملاتِ کلام و کمال : شاعری اور دوسرے ہنروں سے متعلق امور۔ قطع نظر کرنا : کسی بات کو ترک کر دینا۔ خیال چھوڑ دینا۔ دربدر : گھر گھر، ایک ایک دروازے اور گھر پر۔ دوشنبہ : پیر کا دن۔ شانزدہم : سولھویں (تاریخ) از ماہِ صیام : رمضان کے مہینے کی۔

ص ۷۲ السلام علیکم : تم سب پر سلامتی ہو۔ آداب : ادب کی جمع، بندگی، تسلیم، وہ الفاظ جو اظہارِ نیازمندی کے طور پر کہے یا لکھے جاتے ہیں۔ پیچش : پیٹ میں مروڑ اٹھنا اور پاخانہ میں خون آنا۔ درد ہو کر دست، پاخانہ یا آنو آنا۔ رفع : دور۔ سبحان اللہ : اللہ جو تمام عیبوں سے پاک ہے (تعجب، خوشی یا تعریف کے موقع پر ادا ہونے والا کلمہ)۔ ہنگامہ فرو ہونا : شورش مٹنا یا دب جانا۔ دنگا فساد یا ہنگامہ دور ہونا۔ فراغت : خوشحالی، آرام، بے فکری۔

ص ۷۳ | حظ اٹھانا: لطف اٹھانا۔ پنج شنبہ: جمعرات کا دن۔ علاقہ: واسطہ، تعلق۔ بھولا آدمی: معصوم انسان۔ لاحول ولاقوۃ: خدا کے سوا کسی میں طاقت اور زور نہیں۔ (اظہارِ نفرت و بیزاری کے لئے بولتے ہیں) تپ: بخار۔ شتاب: جلدی، فوراً۔ عصمتِ بی بی از بے چادری: ایسے موقع پر بولتے ہیں جب کوئی شخص مجبوری سے نیک کام کرے یا مجبور ہونے کے باوجود گناہ نہ کر سکے۔ میرن صاحب: اصل نام میر افضل علی، مرزا غالب نے انہیں غالباً اس وجہ سے "میرن" کہنا شروع کیا کہ لکھنؤ میں "مجتہد العصر" کے بھائی کا عرف "میرن" تھا اور مرزا نے جب میر سرفراز حسین کو چھیڑنے کے لئے "مجتہد العصر" کہا تو میر افضل علی کے لئے "میرن" مناسب معلوم ہوا۔ یہ صاحب مرثیہ پڑھتے تھے اور غالب کے بڑے شیدائی تھے۔ حکیم میر اشرف علی: غالب کے ایک دوست جو اپنے زمانے کے مشہور طبیب تھے۔ کونسل: صلاح مشورہ۔ ملکۂ انگلستان: ملکۂ وکٹوریہ۔ سالگرہ: جشن پیدائش، عمر کا سال پورا ہونے کا دن، وہ دھاگہ جس میں بچہ کی عمر شمار کرنے کے لئے سال بسال گرہ لگاتے جاتے ہیں۔ گت: حالت (پٹائی کے بعد) مثل: ضرب المثل، کہاوت۔ دفتر را گاؤ خورد: تمام کارخانہ درہم برہم، لفظی معنی: وہ تمام کاغذات تو گائے کھا گئی۔

ص ۷۴ | سرنامہ: مکتوب الیہ کا نام اور پتہ جو خط کے شروع میں یا لفافے پر لکھا ہو۔ ترشح: بوندا باندی، ہلکا مینہ پڑنا۔ موقوف: بند، ختم۔ کلیان: مرزا غالب کے ایک ملازم کا نام۔ میر سرفراز حسین: میر مہدی مجروح کے بھائی کا نام، مرزا غالب انہیں مزاحاً "مجتہد العصر" کہتے تھے، میر سرفراز حسین کہیں نوکری کرتے تھے۔ مرزا غالب کی خواہش تھی کہ انہیں ریاست رام پور میں ملازمت مل جائے چنانچہ نواب یوسف علی خاں والئ ریاست رام پور سے ان کی سفارش کی تھی۔ اللہ اللہ: کلمۂ تعجب۔ سلطان العلماء: ایک لقب۔ لفظی معنی، عالموں کا بادشاہ۔ "مجتہد العصر": فرقہ شیعہ کے نزدیک وہ فقیہہ جس میں قرآن و سنت، اجماع اور عقل کی روشنی میں استدلال کر کے مسائل شرع اخذ کرنے کی قوت پیدا ہو جائے، شیعہ علماء کا ایک منصب، لفظی معنی، اپنے زمانے میں دینی معاملات میں اجتہاد یا کوشش کرنے والا (نئے دنیوی مسائل کا حل، دین کی روشنی میں ٹھیک ٹھیک بتانے والا) قبلہ و کعبہ: تعظیم اور احترام کے الفاظ۔ میر نصیر الدین: غالب کے ایک دوست، جنہیں وہ کبھی کبھی (حضرت شیخ نصیر الدین چراغ دہلی کے نام کی مناسبت سے) چراغِ دہلی لکھتے تھے۔ یہ شاہ محمد عالم کی اولاد میں سے تھے جو مولانا فخر الدین فخرِ عالم کے خلیفہ تھے۔ روٹھنا: خفا ہونا۔ منو گے: مان جاؤ گے۔ ناراضی بھول جاؤ گے۔ اطراف: طرف کی جمع، مراد ہے سمت۔ جوانب: جانب کی جمع، مراد ہے سمت یا طرف۔ ہرکارہ: ڈاکیہ۔ دل لگی: دل بہلنا۔ سبب: وجہ۔

آدھ آنے میں بخل نہ کرو: دو پیسے کی کنجوسی نہ کرو۔ اُس زمانے میں ڈاک کے لفافے پر دو پیسے کے ٹکٹ لگتے تھے۔ بیرنگ: بغیر ٹکٹ لگائے۔

سبق کا خلاصہ

خط نمبرا مرزا غالب کا یہ خط نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام ہے، وہ انہیں لکھتے ہیں کہ "تم نواب امین الدین احمد رئیس لوہارو کے بیٹے ہو جو میرے سامنے پلے بڑھے ہیں۔ مَیں ان کا نیاز مند بھی رہا ہوں اور ان کی مالی امداد کی وجہ سے احسان مند بھی۔ جب مجھے ان سے محبت ہے تو تم سے کیوں نہ ہوگی؟ تم، جو کہ ان کے بڑے بیٹے بھی ہو اور وارثِ ریاست بھی۔ رہی بات ہماری ملاقات کی تو اس کے دو ہی طریقے ہیں۔ یا تم دِلّی میرے پاس چلے آؤ یا پھر میں ریاست لوہارو آؤں لیکن تم پر پابندی ہے کہ لوہارو نہیں چھوڑ سکتے اور مَیں بیمار ہونے کی وجہ سے وہاں آنے سے قاصر ہوں۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مَیں نہ آنے کے لئے بہانے تراش رہا ہو۔ اگر تمہیں میرے موجودہ حالات کا پتہ ہوتا تو تم میری مجبوریوں کو سمجھ سکتے۔

حقیقت میں دو جہان ہیں: ایک یہ دنیا جس میں ہم زندہ ہیں اور دوسری وہ دُنیا جہاں سے ہم آتے ہیں اور مرنے کے بعد چلے جاتے ہیں۔ ان دونوں جہانوں پر اُس خدا کی بادشاہی ہے جو واحد بھی ہے اور طاقتور بھی۔ عام طریقہ یہ ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں رہ کر گناہ کرتے ہیں، انہیں اگلے جہان میں سزا ملتی ہے لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اُس دُنیا کے گناہگار کو سزا دینے کے لئے اِس جہان میں بھیج دیتے ہیں۔ میرے ساتھ یہی ہوا۔ میں ۸ رجب ۱۲۱۲ھ کو پیدا ہوا۔ تیرہ برس (آگرے میں) ایک قیدی کی طرح گزارے۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میری شادی کر دی گئی اور آئندہ کے لئے دہلی کو مَیں نے اپنا مستقل ٹھکانا بنا لیا۔ شعر و شاعری اور نثر نگاری میری مشقت ٹھہری۔ کچھ برس بعد مَیں ایک کام سے دہلی سے نکلا اور کلکتہ جانے کے لئے ہندوستان کے مشرقی حصے کے شہروں (کانپور، لکھنؤ، باندہ، عظیم آباد اور مرشد آباد) کی سیر کرتا پھرا۔ کلکتہ سے واپس لوٹا تو پھر دلّی سے باہر نہیں گیا۔ میری بیوی کے بھانجے نواب زین العابدین خاں عارف مرحوم کے دو کمسن بیٹے (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) بھی میرے پاس آ گئے۔ ذمے داریوں کے بوجھ سے میری زندگی عذاب بن گئی۔ شعر و شاعری اور نثر نگاری کے لئے بھی وقت نہ رہا۔ بڑھاپے نے قویٰ مضمحل کر دیئے۔ ضعیف ہو گیا ہوں۔ جسم میں طاقت بالکل نہیں رہی۔ اس پر بھی اگر زندہ ہوں تو اسے ڈھٹائی کے سوا اور کیا کہا جائے۔ پچھلے سال تنگ آ کر دہلی سے نکلا۔ دونوں بچے (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) میرے ہمراہ تھے۔ میرٹھ اور مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ دو مہینے سے بھی کم

عرصہ کے لئے وہاں رہا اور پھر مجبوراً واپس دہلی لوٹنا پڑا۔ اب طے کر لیا ہے کہ کبھی دہلی سے باہر نہیں جاؤں گا۔ اگر جانا چاہوں تو بھی نہیں جا سکتا کیونکہ کہیں آنے جانے کی ہمت نہیں رہی۔ بس موت کا انتظار کر رہا ہوں۔ دیکھیں کب آتی ہے۔ یونہی ایک خدشہ سا ہے کہ شاید اسی ماہ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں انتقال کر جاؤں۔ خدا کو منظور ہو تو آدمی قید سے رہا ہو کر سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی اس دنیا کے قید خانے سے رہا ہو کر سیدھا اُس دنیا (عقبیٰ) کا رُخ کروں گا، جو ہم سب کا اصلی گھر ہے۔"

غالب اس خط میں استعارے کے رنگ میں خود کو قیدی، دُنیا کو قید خانہ، اپنی پیدائش کو ایک مقدمے کی پیشی، اپنی زندگی کو عمر بھر کی قید، بیوی کو بیڑی، بچوں کو ہتھکڑیاں اور فکرِ نظم و نثر کو قیدی کی مشقت قرار دیتے ہیں۔ وہ دُنیا کو زنداں اور عُقبیٰ کو گھر تصوّر کرتے ہیں، اسی لئے بزبانِ شعر کہتے ہیں کہ کتنا مبارک ہوگا وہ دن، جب مَیں اس قید خانے سے رہا ہوں گا اور اس ویران وادی سے نکل کر اپنے شہر کا رُخ کروں گا۔

خط نمبر ۲ مرزا غالب نے یہ خط بھی نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام تحریر کیا ہے۔ سب سے پہلے انہیں بچے کی پیدائش پر مبارکباد دی ہے اور اللہ تعالےٰ سے، علائی، نومولود اور علائی کے دوسرے بچوں کی درازیٔ عمر کی دعا مانگی ہے، انہوں نے علائی سے دریافت کیا ہے کہ کیا نومولود لڑکا ہے یا لڑکی؟ وہ کہتے ہیں کہ نواب شہاب الدین احمد ثاقب (جو نواب ضیاء الدین احمد خاں نیر کے بیٹے ہیں) کے خیال میں وہ لڑکا ہے اور غالب سمجھتے ہیں کہ وہ لڑکی ہے، البتہ دونوں میں سے کوئی بھی یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اسی لئے اُلجھن رفع کرنے کے لئے وہ علائی سے وضاحت کی درخواست کرتے ہیں۔ غالب، علائی کو بتاتے ہیں جو خط انہوں نے شہاب الدین احمد خاں کے نام لکھا تھا وہ اُن (غالب) کی نظر سے گزرا ہے۔ وہ خط نہیں، پورا طومار ہے۔ اس خط میں غالباً نواب علائی نے ثاقب سے شکوہ کیا تھا کہ مرزا غالب کے خطوط میں اب پہلے جیسی شوخی باقی نہیں رہی، چنانچہ غالب اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ "میں نے ثاقب کے نام تمہارا پورا خط پڑھا ہے۔ مَیں اب اگر لطیفہ گوئی، خوش مزاجی، شوخی اور ظرافت کا مظاہرہ اپنے خطوں میں نہیں کرتا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اپنے بھائی یوسف میرزا کی موت نے میرا جگر خون کر دیا ہے۔ کیا یہ بات قابلِ افسوس نہیں ہے کہ مجھ جیسا شاعر، زبان دان اور رچبت انسان اس قدر بے کس، مجبور اور ناکارہ ہو کر رہ گیا ہے؟ اس کے علاوہ تمہاری جدائی کا غم بھی ہے۔ کبھی کبھی مَیں سوچتا ہوں کہ خدا نے اگرچہ مجھے فصاحت و بلاغت بخشی، علم سے نوازا، عقل عطا کی، لیکن سچ پوچھو تو کسی خاص میدان میں

مہارت حاصل نہ کر سکا۔ کسی نے میری شاعری کی بجا تعریف نہ کی۔ یوں سمجھو کہ اس معاملے میں ہم دونوں ایک جیسی قسمت لے کر دُنیا میں آئے ہیں۔ یہ درست ہے کہ مَیں نے صرف ایک فن یعنی شاعری میں کمال حاصل کیا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں جس پائے کا شاعر اور نثر نگار تھا، اس کی داد مجھے کماحقہٗ نہیں ملی۔ میری شاعری میں جو خوبیاں موجود تھیں، ان کی طرف لوگوں کی نظر نہیں گئی اور نہ اس کی لطافتیں، پڑھنے والوں پر آشکارہ ہوئیں۔ یوں سمجھو کہ میں خود ہی شعر کہتا تھا اور خود ہی اُن سے لُطف اندوز ہوتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے مجھ میں فقیری و درویشی، آزاد منشی اور ایثار و قربانی کے جو جوہر رکھے تھے اگر وہ ہزار تھے تو ان میں سے کسی ایک کو بھی ظاہر ہونے کا موقع نہ ملا۔ جی چاہتا ہے کہ کاش میرے جسم میں طاقت ہوتی تو میں ایک لاٹھی ہاتھ میں لے کر اس کے سرے پر سُوت کی رسی سے ایک دری اور ٹین کا لوٹا لٹکا لیتا اور پیدل دُنیا کی سیر کے لئے گھر سے نکل پڑتا۔ کبھی شیراز چلا جاتا، کبھی مصر کی سیر کرتا اور کبھی نجف اشرف میں حضرت علیؓ کے روضے کی زیارت کرتا۔ جی چاہتا ہے کہ خدا اتنا مال و دولت دے کہ دنیا بھر کے لئے میرے گھر کا دستر خوان کھلا رہے۔ پوری دنیا سے بھوک ختم نہ کر سکوں تو کم از کم اپنے شہر میں تو کسی کو بھوکا ننگا نہ دیکھوں۔ لیکن میرا حال یہ ہے کہ خود غریب، بیمار، بوڑھا اور ضعیف ہو چکا ہوں۔ خدا اور اس کے بندوں نے مجھے ٹھکرا دیا ہے۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ تم پر ریاست لوہارو سے باہر جانے پر باپ کی طرف سے پابندی عائد ہے، تو تمہاری حالت دیکھ کر واقعۂ کربلا یاد آتا ہے لیکن تمہیں دِلّی آنے سے روکنے والا چونکہ تمہارا باپ ہے، اس لئے واقعۂ کربلا سے تمہاری اس حالت کو تشبیہ دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا البتہ یہ کہنا درست ہو گا کہ تمہاری کیفیت لوہارو میں ویسی ہی ہے جیسی حضرت مسلم بن عقیل کی کوفے میں تھی۔ بہر حال اللہ تعالیٰ تمہاری اور تمہارے بچّوں کی عزّت و آبرو کا محافظ ہو۔ رہا مَیں اور میرے کمالاتِ نظم و نثر، تو اس کا ذکر کیا؟ میرا حال اُس آدمی جیسا ہے جو کسی دوسرے کو بھیک مانگتا نہ دیکھ سکے لیکن خود دَر دَر کا بھکاری ہو۔

خط نمبر ۳ غالبؔ کا یہ خط میر مہدی مجروحؔ کے نام ہے لیکن اس میں خطاب میران صاحب سے کیا گیا ہے۔ یہاں غالبؔ نے ڈرامائی تکنیک استعمال کی ہے، یعنی بیانیہ تحریر کی بجائے باقاعدہ مکالمے لکھے ہیں۔ گفتگو کا یہ انداز نہایت برجستہ، لطیف اور دلآویز ہے اور غالبؔ کے اس خط کو فنی شہ پارہ بنا دیتا ہے۔

خط لکھنے کا موقع و محل یہ ہے کہ میر مہدی مجروحؔ نے مرزا غالبؔ کو خط لکھا تھا جس کا جواب اُن کے ذمّے تھا۔ اتنے میں میرن صاحب تشریف لے آئے۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ

مرزا غالب فی الحال میر مہدی مجروحؔ کو خط نہ لکھیں، بلکہ اس وقت لکھیں جب وہ خود وہاں پہنچ جائیں تاکہ جب غالبؔ کا خط جائے تو وہ بھی اُسے پڑھ کر لطف اندوز ہو سکیں۔ مرزا غالبؔ ان کی بات نہیں مانتے اور میر مہدی مجروحؔ کو جواب لکھنے بیٹھ جاتے ہیں۔ غالبؔ اور میرن صاحب کے درمیان جو دلچسپ گفتگو ہوئی، غالبؔ نے اُسے ہو بہو نقل کر دیا ہے۔ یوں غالبؔ خط تو میر مہدی مجروحؔ کے نام لکھ رہے ہیں لیکن آغاز میرن صاحب کے ساتھ ہونے والی بات چیت سے کیا ہے۔

غالبؔ، میرن صاحب سے دعا سلام کے بعد پوچھتے ہیں کہ کیوں نہ میر مہدی مجروحؔ کے خط کا جواب لکھا جائے؟ اس کے جواب میں میرن صاحب کہتے ہیں کہ مَیں نے کب منع کیا ہے۔ ضرور لکھئے۔ مَیں نے تو صرف یہ کہا تھا کہ اب وہ تندرست ہو گئے ہیں، بخار اُتر گیا ہے صرف پیچش باقی ہے جو رفع ہو جائے گی۔ جب میں ان کو خط لکھتے وقت ہر دفعہ آپ کی طرف سے دعا لکھ دیتا ہوں تو پھر آپ کو بطورِ خاص خط لکھنے کی ضرورت نہیں۔ غالبؔ اس خیال سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میر مہدی مجروحؔ کے خط کا اگر جواب نہ دیا گیا تو وہ ناراض ہوں گے۔ اس پر میرن صاحب کہتے ہیں کہ وہ ناراض نہیں ہوں گے۔ کیونکہ آپ انہیں اپنے بیٹے کی طرح عزیز رکھتے ہیں۔ غالبؔ دریافت کرتے ہیں کہ بھئی آخر بتاؤ کہ تم مجھے خط لکھنے سے کیوں منع کرتے ہو۔ میرن صاحب جواب دیتے ہیں کہ لو یہ بھی خوب رہی۔ آپ خود تو خط نہیں لکھتے اور الزام مجھ پر عائد کر رہے ہیں کہ میں منع کرتا ہوں۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ چلو مان لیا کہ تم مجھے منع نہیں کرتے لیکن یہ بتاؤ کہ تم کیوں نہیں چاہتے کہ مَیں میر مہدی کے خط کا جواب دوں۔ میرن صاحب کہتے ہیں کہ اگر سچ پوچھتے ہیں تو سنئے! اگر آپ کا خط وہاں جائے گا تو میرے سوا سب اُسے پڑھ کر لطف اُٹھائیں گے۔ مَیں چاہتا ہوں کہ آپ میرے یہاں سے روانہ ہونے کے تین دن بعد خط لکھیں۔ میں جمعرات کے روز یہاں سے روانہ ہونگا۔ غالبؔ کہتے ہیں کہ میاں! عقل سے کام لو۔ تم جب چاہو، جاؤ لیکن میرے خط لکھنے یا نہ لکھنے کا تمہارے جانے سے کیا تعلق ہے، مجھے معصوم اور بوڑھا آدمی جانتے ہوئے تم نے ورغلا لیا اور اسی وجہ سے آج تک مَیں میر مہدی مجروحؔ کے خط کا جواب نہیں لکھ سکا۔

یہاں میرزا غالبؔ اور میرن صاحب کے درمیان مکالمہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد بیانیہ انداز میں براہ راست خطاب میر مہدی مجروحؔ سے شروع ہو جاتا ہے۔ غالبؔ انہیں بتاتے ہیں کہ خط کے دیر سے لکھے جانے میں، ان کا کوئی قصور نہیں۔ میر مہدی مجروحؔ کو چاہیئے کہ وہ ان کے خط کا فوراً جواب دیں اور اطلاع دیں کہ کیا اُن کا بخار اُتر گیا ہے؟ اور کیا پیچش بھی دُور ہو گئی ہے؟ وہ انہیں نصیحت کرتے ہیں کہ علاج سے پرہیز بہتر ہے، اس لئے صحت بحال کرنے کے لئے

پرہیز ضرور کریں گو انہیں معلوم ہے کہ پرہیز کرنا ان کے بس کی بات نہیں، تاہم اگر یہ کام وہ مجبوری سمجھ کر بھی کرلیں تو غنیمت ہوگا۔

اس کے بعد غالب، میر مہدی مجروح کو اطلاع دیتے ہیں کہ دہلی کے حالات انہیں میرن صاحب کی زبانی معلوم ہو جائیں گے جو اس وقت حکیم میر اشرف علی کے ساتھ جانے کے سلسلے میں کھُسر پھُسر کر رہے ہیں۔ وہ جمعرات کو روانہ ہوں گے۔ اگر وہ واقعی تمہارے پاس پہنچ جائیں تو ان سے دریافت کرنا کہ ملکہ معظمہ انگلستان کی سالگرہ کے جشن کے موقع پر ان کے ساتھ کیا سلوک ہوا تھا۔ ان سے یہ بھی معلوم کرنا کہ وہ جو فارسی میں مثل مشہور ہے کہ "دفتر را گاؤ خورد" اس کے کیا معنی ہیں؟ یہ دونوں باتیں ان سے ضرور پوچھنا کیوں کہ ان کا جواب بے حد پُر لطف ہوگا۔

پھر وہ موسمی حالات سے آگاہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے آندھی آئی تھی، اس کے بعد بارش ہوئی جو اب تک جاری ہے، وہ کہتے ہیں کہ لفافے پر پتہ لکھ کر وہ خط الگ رکھ دیں گے اور جب بارش رُک جائے گی تو اپنے ملازم کے ہاتھ اسے سپرد ڈاک کر دیں گے۔

آخر میں وہ میر مہدی مجروح کے بھائی میر سرفراز حسین کو دعا دیتے ہوئے انہیں چھیڑتے ہیں کہ وہ اب تک ضرور پانی پت کے "سلطان العلماء" اور "مجتہد العصر" بن چکے ہوں گے اور وہاں کے لوگ ان کا بہت احترام کرنے لگے ہوں گے۔ غالب خط کا اختتام میر نصیر الدین کو دعا دینے پر کرتے ہیں۔

خط نمبر ۱۴

یہ خط غالب نے منشی ہرگوپال تفتہ کے نام لکھا ہے، جو ان کے خیال میں کسی وجہ سے ان سے ناراض تھے۔ غالب اس بات کا بے حد خیال رکھتے تھے کہ ان کے کسی فعل سے ان کے شاگردوں کی دل شکنی نہ ہو۔ موجودہ خط، ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد لکھا گیا ہے، جب دِلی شہر کو زبردستی خالی کرا لیا گیا تھا اور غالب شہر میں تنہا رہ گئے تھے اس لئے انہیں اپنے عزیزوں، دوستوں اور شاگردوں کی خیریت کا خیال اور اُن کے خطوط کا شدید انتظار رہتا تھا۔ اس خط میں وہ منشی ہرگوپال تفتہ کی طرف سے خط کا جواب جلد نہ آنے پر پریشان ہو جاتے ہیں اور مضطرب ہو کر پوچھتے ہیں کہ کیا وہ اُن سے خفا ہیں؟ اگر خفا ہیں تو کیا ان کی خفگی ابھی دُور نہیں ہوئی؟ اور اگر وُہ بدستور رُوٹھے ہوئے ہیں تو کم از کم اپنے رُوٹھنے کا سبب تو بتانا چاہیئے۔ غالب بڑی دردمندی سے کہتے ہیں کہ مَیں دِلی شہر کے خالی ہو جانے کی وجہ سے تنہائی کا شکار ہوں اور اس تنہائی کو صرف دوستوں اور عزیزوں کے خطوط سے دُور کرتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی کا خط آتا ہے۔ مَیں سمجھتا ہوں کہ وہ شخص خود تشریف لایا ہے۔ خدا کے فضل و کرم سے ہر روز مختلف شہروں سے احباب کے دو چار خطوط آجاتے ہیں بلکہ بعض اوقات تو ڈاکیہ صبح و شام دو دفعہ ڈاک لاتا ہے اور اس میں میرے دو ایک خطوط لازماً ہوتے ہیں۔ دوستوں کے یہ خطوط میرے دل بہلاوے کا سامان ہیں۔ مَیں دِن بھر

اُن کو پڑھتا رہتا ہوں اور پھر ان کے جواب لکھتا ہوں۔ پھر پوچھتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ دس بارہ دن سے تمہارا خط نہیں آیا اور مَیں نے یوں جانا کہ تم نہیں آئے۔ بھئی، خط لکھو اور اب تک خط نہ لکھنے کی وجہ بھی بیان کرو۔ بے شک ڈاک کے لفافے پر دو پیسے کے ٹکٹ لگتے ہیں لیکن ان دو پیسوں کی کنجوسی کرنا اچھی بات نہیں۔ اگر بچت کا ہی ارادہ ہے تو بے شک مجھے ڈاک ٹکٹ چسپاں کئے بغیر لفافہ بھیج دو۔ میں جرمانہ ادا کر کے اُسے بخوشی وصول کر لوں گا۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درجِ ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، مع سیاق و سباق تشریح کیجئے۔

بھائی، اس معرض میں، مَیں بھی تیرا ہم طالع اور ہم درد ہوں۔ اگرچہ یک فنہ ہوں مگر مجھے اپنے ایمان کی قسم، مَیں نے اپنی نظم و نثر کی داد بہ اندازۂ بایست پائی نہیں۔ آپ ہی کہا، آپ ہی سمجھا۔ قلندری و آزادگی و ایثار و کرم کے جو دواعی میرے خالق نے مجھ میں بھر دیئے ہیں، بقدر ہزار یک، ظہور میں نہ آئے۔ نہ وہ طاقتِ جسمانی کہ لاٹھی ہاتھ میں لوں اور اس میں شطرنجی اور ایک ٹین کا لوٹا مع سوت کی رسّی کے لٹکالوں اور پیادہ پا چل دوں۔ کبھی شیراز جا نکلا، کبھی مصر میں جا ٹھہرا، کبھی نجف میں جا پہنچا۔ نہ وہ دست گاہ کہ عالم کا میزبان بن جاؤں۔ اگر تمام عالم میں نہ ہو سکے، جس شہر میں رہوں، اس شہر میں بھوکا ننگا نظر نہ آئے۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت میرزا اسداللہ خاں غالب کے ایک خط میں سے لی گئی ہے، جو انہوں نے نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کے نام لکھا تھا۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے غالبؔ نے نواب علاؤ الدین احمد خاں علائی کو ان کے نئے بچے کی پیدائش پر مبارک باد دی لیکن ساتھ ہی یہ بھی دریافت کیا کہ آیا وہ بچّی ہے یا بچہ۔ اس کے بعد انہوں نے نواب شہاب الدین احمد خاں ثاقبؔ کے نام علائی کے لکھے ہوئے طویل خط کا حوالہ دیا۔ جس میں غالبؔ کے بارے میں کہا گیا تھا کہ پہلے وہ بے حد زندہ دل، خوش طبع اور لطیفہ باز ہُوا کرتے تھے لیکن اب نہ جانے کیوں افسردہ ہو گئے ہیں۔ غالبؔ اس کا جواب دیتے ہوئے بتاتے ہیں کہ انہیں اپنے بھائی کا غم بھی ہے اور علائی کی جدائی کا بھی۔ پھر اس بات کا بھی رنج ہے کہ خدا نے علم و ہنر اور شعر و سخن کی نعمتوں سے نوازا مگر دنیا نے قدر نہ کی۔

موجودہ عبارت کے بعد غالبؔ اپنی حالتِ زار کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اب خدا اور اس کی مخلوق، دونوں کی نظروں سے اُتر گیا ہوں۔ بوڑھا، کمزور اور غربت کا مارا ہُوا ہوں۔

اس کے بعد علائی کی ریاست لوہارو سے باہر نہ جا سکنے کی پابندی کا پہلے واقعہ کربلا سے موازنہ کرتے ہیں اور پھر اسے کوفے میں مسلم بن عقیل کی حالت سے تشبیہ دیتے ہیں۔ اُس کے بعد علائی کی اپنی اور ان کے بال بچوں کی عزت و آبرو کی نگہبانی کی دعا مانگتے ہوئے اپنے بارے میں کہتے ہیں کہ میری شاعری اور کمالِ فن میرے کس کام کے؟ میں دوسروں کو تو بھیک مانگتے دیکھ نہیں سکتا لیکن خود دربدر بھیک مانگنے پر مجبور رہوں۔

تشریح غالب، نواب علاؤالدین احمد خاں علائی کی اس شکایت کے جواب میں کہ ان کی شاعری کی دُنیا نے صحیح قدر نہیں کی، اپنے خط میں اپنی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ بھائی، اس ناقدری کا غم نہ کرو۔ اس معاملے میں مَیں اور تم ایک جیسی قسمت لے کر آئے ہیں۔ جو دُکھ تمہارا ہے، وہی میرا بھی ہے۔ یہ درست ہے کہ میں صرف ایک فن یعنی شاعری میں طاق ہوں لیکن مجھے اپنے ایمان کی قسم، میں نے نظم اور نثر میں جو کچھ لکھا، اس کی تعریف جیسی ہونی چاہیئے تھی، ویسی نہیں ہوئی۔ بس یوں سمجھو کہ اپنی شاعری میں مَیں نے جن نادر اور لطیف خیالات کا اظہار کیا تھا۔ وہ لوگوں کی سمجھ میں ہی نہیں آئے۔ میں خود ہی شعر کہتا رہا اور خود ہی ان سے لطف اندوز ہوتا رہا۔ شاعری کے ہنر کے علاوہ اللہ تعالےٰ نے مجھے اور بھی کئی خوبیوں سے نوازا تھا۔ درویشی، مال و دولت سے بے اعتنائی، رسوم و رواج سے بے نیازی اور دوسروں کی خاطر ایثار و قربانی کی جو آرزوئیں میرے دل میں موجود تھیں، اگر وہ ہزار تھیں تو ان میں سے ایک بھی پوری نہ ہوئی۔ کاش مجھے اتنی جسمانی قوت نصیب ہوتی کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر محض ایک لاٹھی ہاتھ میں لیتا اور سُوت کی رسّی سے اس میں ایک دری اور ایک لوٹا لٹکا کر پیدل دنیا کی سیر کے لئے چل نکلتا۔ کبھی (حافظ و سعدی کے وطن) ایران کے مشہور شہر شیراز جا پہنچتا۔ کبھی مصر کے ملک میں گھومتا پھرتا۔ کبھی عراق کے شہر نجف پہنچ جاتا (جہاں حضرت علیؓ کا مزار ہے) یا کاش میرے پاس اتنی دولت ہوتی کہ پوری دنیا کے بھوکوں کو کھانا کھلاتا۔ اگر پوری دنیا سے غربت دُور نہ کر سکتا تو کم از کم اتنا تو کرتا کہ جس شہر میں مَیں رہتا ہوں اس میں کسی کو بھوکا ننگا نہ رہنے دیتا۔

سر سید احمد خاں (۱۸۱۷ء - ۱۸۹۸ء)

قومی اتفاق

تعارف اور پس منظر

یہ مضمون "مقالاتِ سر سید" کے حصّہ پنجم میں سے لیا گیا ہے، جسے شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے مرتب کیا ہے۔ اس جلد میں سر سید کے تمام اخلاقی اور اصلاحی مضامین شامل کئے گئے ہیں اور "قومی اتفاق" بھی ان کا ایک اصلاحی مضمون ہے۔

سر سید احمد خاں نے "قومی اتفاق" میں مسلمان قوم کی ایک اجتماعی خامی کی نشان دہی کی ہے اور وہ ہے اس قوم کے افراد کی باہمی نا اتفاقی۔ انہوں نے بتایا ہے کہ جہاں دوسری اقوام کی بنیاد نسل یا ملک پر ہے، وہاں مسلمان قوم کی بنیاد کلمۂ توحید پر ہے۔ یہ گویا ایک نیا روحانی رشتہ ہے جس نے ہر رنگ و نسل اور ملک و قوم کے افراد کو ایک وحدت میں پرو دیا ہے۔ اسلام نے ہر مسلمان کو دوسرے مسلمان کا بھائی بنایا ہے لیکن یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ ہم بھائی بھائی کی بجائے برادرانِ یوسف بن گئے ہیں کیوں کہ ہم میں بغض و عداوت اور حسد و کینہ جیسی بُری خصلتیں پیدا ہو گئی ہیں۔ ہم نے خود کو مختلف فرقوں اور مذہبی گروہوں میں بانٹ لیا ہے جس کی وجہ سے اتحاد کی برکت ہمارے اندر سے رخصت ہو گئی ہے۔ اسی لئے ہم میں نہ تو ایک دوسرے کے لئے ہمدردی کے جذبات پائے جاتے ہیں اور نہ ہم میں قومی اتفاق پیدا ہو سکا ہے۔

سر سید احمد خاں کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے اختلافات کو مذہبی قرار دے کر اپنی قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے حالانکہ عقیدہ، بندے اور خدا کے درمیان تعلق کا نام ہے جس سے ہمیں کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہیئے البتہ جن معاملات کا تعلق معاشرت اور تمدّن سے ہے، ہم ان کے حوالہ سے بنی نوعِ انسان کے ہم رشتہ ضرور ہیں۔ چنانچہ انسانیت کا تقاضا ہے کہ ہم اپنے ہم وطن بھائیوں کے ساتھ محبت، دوستی، رواداری اور صبر و تحمل کے ساتھ پیش آئیں۔ اس میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ غیر مسلم بھی اسی ملک کے باشندے ہمارے ہمسائے اور وطنی بھائی ہیں۔ اسلام نے ہمیں ہمسایوں کا ادب کرنا سکھایا ہے اور غیر مسلم ہمارے ہم مذہب نہ سہی ہموطن ضرور ہیں۔ لہٰذا ان کے ساتھ بھی ہمارا برتاؤ محبت اور رواداری کا ہونا چاہیئے۔ اگر ہم

اپنے اندر یہ خوبیاں پیدا کریں گے تو ہم میں قومی اتفاق پیدا ہوگا وگرنہ سب جانتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں ہمارے زوال کا سب سے بڑا سبب اسی قومی اتفاق کا نہ ہونا ہے۔ اتفاق کی برکتوں سے تاریخ بھری پڑی ہے۔ ماضی میں بھی انہیں قوموں نے ترقی کی جو اتحاد کی برکتوں سے مالامال تھیں اور موجودہ دور کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوموں کی طاقت کا راز بھی اتفاق میں پوشیدہ ہے۔

سر سید احمد خاں کا خیال ہے کہ ہماری قوم نیکی اور ثواب کے کاموں میں ہمیشہ پیش پیش رہتی ہے۔ مساجد، امام باڑے اور خانقاہیں تعمیر کرنا وہ اپنی مذہبی فریضہ تصور کرتی ہے۔ اسی طرح صدقہ و خیرات دینا، بھوکوں کو کھانا کھلانا اور حج و زیارت کے لئے پیسہ خرچ کرنا بھی کارِ ثواب سمجھا جاتا ہے اور یہ واقعی ہے بھی۔ تاہم ان کاموں کا دائرہ انسان کی ذاتی نیکی اور ثوابِ آخرت کے حصول تک محدود رہتا ہے جب کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ قومی فلاح اور اجتماعی بہبود کے کاموں پر روپیہ خرچ کیا جائے تاکہ پوری قوم اور سارے ملک کو اس سے فائدہ پہنچے۔ بنی نوعِ انسان کی اجتماعی بھلائی اور قومی ہمدردی، انفرادی نیکی کے ہر کام پر فوقیت رکھتی ہے کیونکہ اسی سے قومی اتفاق کی راہ ہموار ہوتی ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۷۵ | اتفاق : اتحاد، میل، دوستی۔ قوم : آدمیوں کا گروہ، خاندان، نسلی، فرقہ۔ لازم : ضروری، فرض۔ زمانۂ دراز : طویل عرصہ، لمبی مدت۔ تاریخی زمانہ : جب سے انسان کے بارے میں معلومات دستیاب ہیں۔ تقریباً پانچ ہزار سال کا زمانہ۔ بالاتر : اوپر، بلند۔ رسول اللہ : اللہ کا پیغمبر، خدا کی طرف سے مخلوق کی رہبری کے لئے بھیجا ہوا برگزیدہ انسان جو کتاب لائے یعنی جس پر خدا کا کلام نازل ہو۔ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم : اللہ کا درود اور سلامتی ہو اُن پر اور ان کی آل پر۔ بِاَبِی اَنْتَ وَاُمِّی : آپ پر میرا باپ اور میری ماں (قربان)۔ تفرقۂ قومی : قوم کے اندر پھوٹ، قومی نا اتفاقی، قوم کے ہر فرد کا الگ الگ ہونا۔ روحانی رشتۂ قومی : قوم کے افراد کے درمیان ایسا تعلق، جس کی بنیاد مادی مفادات کی بجائے پاکیزہ اور بلند پایہ قدروں پر ہو۔ یہاں مراد ہے اسلامی تعلق یا ملی رشتہ۔ حَبْلُ الْمَتِیْن : مضبوط رسی، پائیدار وسیلہ، معتبر ذریعہ۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللہِ : کوئی پرستش کے لائق نہیں سوائے اللہ کے (اور) محمدؐ اللہ کے رسول ہیں۔ یہ کلمہ طیبہ ہے جس پر ایمان کی بنیاد ہے۔ سلسلہ : تعلق، واسطہ۔ نیست و نابود : بالکل فنا ہونا، ختم ہونا، ملیامیٹ ہونا۔ تُرک : ملک ترکی کا رہنے والا۔ تاجیک : روسی ریاست تاجکستان کا رہنے والا۔ عروۃ الوثقیٰ : مضبوط کڑا، مضبوط زنجیر۔

کلمۂ توحید: سوائے اللہ کے کوئی پوجا کے لائق نہیں۔

ص ۷۶

مثل: مانند۔ برادرانِ یوسف: حضرت یوسف علیہ السلام کے دس بڑے بھائی جنہوں نے حسد کی وجہ سے انہیں صحرا میں لے جاکر اندھے کوئیں میں پھینک دیا۔ یک دلی: اتحاد، اتفاق۔ یک جہتی: اتحاد، اتفاق، دوستی۔ بُغض: دشمنی۔ عداوت: دشمنی۔ مقدس: پاکیزہ۔ بظاہر: ظاہری طور پر۔ نورانی حیلہ: مکر و فریب اور دھوکہ بازی کو خوشنما بنا بنا کر پیش کرنا۔ نِفاق: پھوٹ۔ حضرت آدم...... دھوکے میں آگئے: شیطان نے جنت میں حضرت آدم اور حواؑ کو ترغیب دی کہ جس درخت کے قریب جانے سے اللہ نے منع کیا ہے، اس کا پھل کھاؤ تاکہ تم دانا بن جاؤ اور تم پر رازِ حیات کھُل جائے۔ حضرت آدم اور حضرت حواؑ شیطان کی باتوں میں آگئے اور یہ پھل کھا لیا۔ مردود: دھتکارے جانے کے قابل۔ خلعت: بادشاہ کی طرف سے عطا کردہ پوشاک

ص ۷۷

امامِ اعظم: حضرت امام ابوحنیفہ، اصل نام نعمان بن ثابت، مشہور فقیہہ (اسلامی قانون کے ماہر) تھے۔ اہلِ سنت کی اکثریت انہیں فقہ میں دوسرے بڑے اماموں (حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد بن حنبل) پر ترجیح دیتی ہے۔ با ایں ہمہ: ان تمام چیزوں کے باوجود، ان سب چیزوں کے ہوتے ہوئے۔ فروع: فرع کی جمع، لفظی معنی شاخیں، ٹہنیاں، وہ باتیں جو اصول نہ ہوں۔ حَبْلُ المَتِین: مضبوط رسی، مراد ہے پائیدار اور مضبوط وسیلہ یا ذریعہ۔ رشتۂ اخوت: بھائی چارے کا تعلق۔ امام باڑہ: وہ مکان جس میں شیعہ مسلمان حضرت امام حسینؓ کی مجلسِ عزا منعقد کرتے ہیں اور تعزیہ رکھتے ہیں۔ اسے امام بارگاہ بھی کہتے ہیں۔ شیعہ: لفظی معنی، دوستوں کا گروہ، مسلمانوں کا ایک فرقہ جو حضور اکرمؐ کے بعد (حضرت ابوبکر صدیقؓ کی بجائے) حضرت علیؑ کو پہلا خلیفہ (اور امام) مانتا ہے اور ان کے بعد ان کی اولاد سے گیارہ اماموں کا قائل ہے جن میں سے آخری امام مہدی ہیں۔ یہ اثنا عشری (بارہ اماموں کو ماننے والے) بھی کہلاتے ہیں اور امامیہ بھی۔ وہ بارہ امام یہ ہیں۔ حضرت علیؓ۔ امام حسنؓ۔ امام حسینؓ۔ امام زین العابدین۔ امام محمد باقر۔ امام جعفر صادق۔ امام موسیٰ کاظم۔ امام علی رضا۔ امام محمد تقی۔ امام علی نقی۔ امام حسن عسکری۔ امام مہدی آخر الزمان۔ سُنّی: مسلمانوں کا وہ فرقہ جو حضور اکرمؐ کے بعد حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کو بالترتیب خلیفہ مانتا ہے۔ انہیں اہلِ سنت والجماعت بھی کہا جاتا ہے اور دنیائے اسلام میں اکثریت انہیں کی ہے۔ وہابی: مسلمانوں کا ایک فرقہ جو محمد بن عبدالوہاب نجدی مشہور مصلحِ دین کو مانتا ہے۔ انہیں اہلحدیث بھی کہا جاتا ہے اور غیر مقلد بھی۔ یہ لوگ قرآن و حدیث کو حجت مانتے ہیں اور فقہی اماموں (امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل) میں سے کسی کو قابلِ حجت و تقلید نہیں مانتے۔ بدعتی: وہ شخص جو دین میں کوئی نئی

بات نکالے، جس سے اصول میں فرق پڑتا ہو۔ مذہب میں کوئی خلاف اصول ایجاد کرنے والا۔ لامذہب: یہاں مذہب، فقہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مراد ہے جو وہ شخص جو چاروں اماموں (امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل میں سے کسی کا مقلد نہ ہو یعنی ان کی فقہ (اسلامی قانون) کو مذہبی طور پر حجت تسلیم نہ کرتا ہو۔ یہاں لامذہب منکرِ خدا کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ مقلد: وہ شخص جو چار اماموں میں سے کسی ایک کے مسلک کا پیروکار ہو یعنی حنفی، حنبلی، شافعی یا مالکی ہو)۔ نفاق وعداوت: پھوٹ اور دشمنی۔ ضعیف: کمزور۔ جمعیت: گروہ، اکٹھ۔ برکت: کسی چیز کی ایک جگہ بہتات، زیادتی، فراوانی۔ امور: امر کی جمع، کام۔ سرانجام دینا: پورا کرنا۔ نالائق: نامناسب۔ اثرِ بد: برا اثر۔ مرحلہ: منزل کی جگہ، درجہ۔ یکتائی: اتفاق واتحاد۔ یک جہتی: اتفاق۔ مبدل کرنا: تبدیل کرنا۔ عقلی ونقلی راہ: عقلی سے مراد ہے عقل سے متعلق علوم یعنی فلسفہ ومنطق۔ اور نقل سے مراد ہے نقلی علوم یعنی قرآن وحدیث، جنہیں حرف بحرف ماننا ضروری ہے۔ اور ان میں عقلی توجیہات کو دخل نہیں دینا چاہیئے۔ یہاں مراد یہ ہے کہ چاہے عقل ودانش سے مدد لیں، چاہے مذہبی علوم سے۔ ہستی: وجود، ذات، زندگی۔ ابنائے جنس: ہم جنس، ایک جنس کے بہت سے، انسانی برادری۔ اعتقاد: یقین، عقیدہ، ایمان۔ عقائد: عقیدہ کی جمع، ایمان رکھنے والی چیزیں۔

ص ۷۸ نیچری: فطرت یا قانونِ قدرت سے نسبت رکھنے والا۔ قدرت کے قانون پر چلنے والا، وہ فرقہ جو خدا کے وجود کا قائل نہیں، نیچر ہی کو سب کچھ جانتا ہے۔ عام طور پر طنزاً سر سید اور ان کے پیروکاروں کو کہا جاتا ہے کیونکہ وہ اپنی تحریروں میں نیچر کا اکثر ذکر کرتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ کائنات جن اصولوں پر چل رہی ہے، ان میں خدا ردوبدل نہیں کرتا۔ اسی لئے وہ معجزات وغیرہ کے منکر تھے۔ ملقب: لقب دیا گیا۔ برحق: حق وانصاف کے مطابق۔ بالکل درست۔ کلمے کا شریک: جو کلمۂ توحید پڑھ کر مسلمان ہوا ہو اور اسلامی برادری کا رکن بن گیا ہو۔ اخوت: بھائی چارہ۔ نادانی: بے وقوفی۔ امر: کام، بات۔ عداوت: دشمنی، مخالفت۔ ضرر: نقصان۔ ابنائے جنس: ایک جنس کے بہت سے، انسانی برادری۔ اعانت: مدد۔ اطاعت: تابع داری۔ برادرانہ: بھائیوں جیسا۔ برتاؤ: سلوک۔ روحانی بھائی: ہم مذہب لوگ۔ وطنی بھائی: ایک ہی ملک کے رہنے والے باشندے۔ کلمہ: مراد ہے کلمۂ توحید، خدا کی وحدانیت کا اقرار۔ فرقہ: گروہ،

ص ۷۹ غرض: تعلق، واسطہ۔ تمدن: رہن سہن، مل کر رہنے کا طریقہ۔ معاشرت: مل جل کر رہنا۔ بردباری: تحمل، برداشت، سنجیدگی ومتانت۔ اتفاق سے: لاعلمی میں۔ ناچیز: معمولی، حقیر۔ ریشۂ گیاہ: گھاس کی پتی، ریشہ رگ یا تار کو کہتے ہیں اور گیاہ کا مطلب ہے گھاس پھونس۔ باہمی: آپس کے، مل کر۔ قوی: طاقتور۔ مہذب:

تہذیب یافتہ۔ شائستہ اطوار والے۔ ناپید: موجود نہ ہونا، غائب۔ طبائع: طبع کی جمع، طبیعتیں مزاج، فطرت، خصلتیں۔ اغراض: غرض کی جمع، مطلب، مقصد، ضرورت۔ باہم: آپس میں۔ حسد: جلن، کسی کی نعمت کا زوال چاہنا۔ حقارت: دوسرے کو کمتر سمجھنا۔ بمقتضائے بشریت: انسان ہونے کی وجہ سے۔ انسان ہونے کا تقاضا یہی ہے۔ مراد ہے انسانی کمزوریوں کی بدولت۔ مانع: منع کرنے والا، رکاوٹ۔ جلبِ منفعت: نفع حاصل کرنا، جلب کے معنی حاصل کرنا اور منفعت کے معنی نفع یا فائدہ۔ دفعِ مضرت: نقصان سے بچنا، نقصان پہنچانے والی چیز کو دُور ہٹانا۔

ص ۸۰ تنزل: زوال۔ نسیاً منسیّا: فراموش بالکل بھولا ہوا۔ بجز: سوائے۔ مدِّنظر: سامنے رکھنا۔ پردہ پوشی: پردہ ڈالنا، چھپانا۔ نفیس: قیمتی، پسندیدہ۔ خانقاہ: درویشوں اور مشائخ (پیروں) کے رہنے کی جگہ۔ خیرات: خدا کی راہ میں دی جانے والی بھیک، صدقہ۔ حج: مقررہ دنوں میں مکہ معظمہ جا کر کعبے کا طواف کرنا اور دیگر عبادات بجالانا۔ ارکانِ اسلام میں سے ایک اہم رکن۔ زیارت: بزرگانِ دین کے مزارات پر جانا۔ کسی متبرک مقام یا مزار یا آدمی کو دیکھنا۔ دانست: خیال، سمجھ۔ روزِ حشر: قیامت کا دن، جب سب مُردے اٹھ کھڑے ہوں گے۔ ثوابِ آخرت: اگلے جہان میں ملنے والا اچھا بدلہ۔ حقارت: کم تر سمجھنا۔ امتیاز: فرق۔

سبق کا خلاصہ

پرانے زمانے میں قوم سے مراد ایسے افراد ہوتے تھے جو یا تو کسی بزرگ کی نسل سے ہوتے یا کسی ملک کے باشندے ہوتے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے افراد میں نسلی یا ملکی رشتے کی بجائے ایک نیا روحانی رشتہ قائم کر کے انہیں ملّتِ اسلامیہ کا جزو بنا دیا۔ اسلام کے نزدیک ہر کلمہ گو، مسلمان قوم کا رکن ہے چاہے وہ کسی بھی ملک کا رہنے والا ہو۔ اسلام میں قومیت کی بنیاد، وطن، رنگ یا نسل نہیں ہے بلکہ کلمۂ توحید ہے۔ اسی لئے تمام مسلمان آپس میں بھائی بھائی قرار دیئے گئے ہیں۔

تاہم یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم سب بظاہر آپس میں بھائی بھائی ہیں لیکن درحقیقت برادرانِ یوسف کی طرح ہیں۔ یعنی ہم میں محبت، اتفاق اور اتحاد بہت کم ہے، ہر جگہ حسد، بغض اور دشمنی پائی جاتی ہے اور اس کا نتیجہ نااتفاقی ہے۔ شیطان نے مکر و فریب سے کام لے کر ہم بھائیوں میں پھوٹ ڈال دی ہے لیکن ہم اپنی سادہ لوحی کی وجہ سے اسے مذہبی اختلاف کا نام دیتے ہیں۔ خدا نے ہمیں اسلام کے ذریعے متحد کیا تھا لیکن ہم نے خود کو مختلف فرقوں میں بانٹ لیا ہے۔ شہر ہو یا قصبہ، مسجد ہو یا امام باڑہ، ہر جگہ مسلمان، شیعہ و سنّی، وہابی و بدعتی، مقلد و غیر مقلد کے خانوں میں بٹے نظر آئیں گے اور ایک دوسرے کے دشمن دکھائی دیں گے۔

اس نا اتفاقی نے ہماری قوم کو کمزور اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے۔ ہم قومی اتحاد کے فوائد سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہم میں ہمدردی، قومی خدمت یا قومی ترقی کا احساس باقی نہیں رہا۔ اگر ہم واقعی قوم کی حیثیت سے ترقی کرنا چاہتے ہیں تو ہمیں چاہیئے کہ سب سے پہلے اپنے اندر کی دشمنی اور پھوٹ کو خیرباد کہیں اور آپس میں اتحاد و اتفاق قائم کریں۔ قومی اتفاق کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد ترک کر دیں اور کسی ایک عقیدے پر اکٹھے ہو جائیں۔ ایسا ہونا ممکن بھی نہیں ہے کیونکہ یہ قانونِ قدرت کے خلاف ہے۔ البتہ ایک اور طریقے سے ہم آپس میں اتفاق و اتحاد پیدا کر سکتے ہیں۔ عقل و دانش کا تقاضا بھی یہی ہے اور مذہب بھی یہی سکھاتا ہے۔ انسان اگر اپنی ہستی پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کی ذات کا ایک حصہ خدا کے لئے ہے اور دوسرا بنی نوعِ انسان کے لئے۔ عقائد کا تعلق خدا کے ساتھ ہے اور معاملات کا، اس کے بندوں کے ساتھ۔ عقیدہ اچھا ہو یا برا، اس کا اثر انسان کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ وہ جانے یا اس کا خدا جانے۔ لہٰذا عقیدہ یا مسلک کے اختلاف کی بنا پر ہمیں کسی دوسرے انسان سے عداوت نہیں رکھنی چاہیئے۔ اگر وہ خدا اور خدا کے رسُول کو برحق جانتا ہے تو ہمیں اس کو اپنا مسلمان بھائی تصور کرنا چاہیئے اور خدا کی قائم کردہ اخوت کو قائم رکھنا چاہیئے۔

ایک ایسے معاملے میں کسی شخص سے عداوت رکھنا مناسب نہیں جس کا اثر خود اُسی کی ذات تک محدود ہے اور ہم کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچتا البتہ جس معاملے کا تعلق دوسرے افراد سے ہو، ہمیں اس سے غرض رکھنی چاہیئے۔ ہمیں انسان ہونے کی حیثیت سے ایک دوسرے سے محبت، دوستی اور ہمدردی کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ اسی کا نام قومی ہمدردی ہے۔ اسی کے ذریعے خدا کے حکم کی اطاعت بھی ہوتی ہے اور اسی کے ذریعے باہمی بھائی چارہ، قومی اتفاق اور قومی ہمدردی بھی قائم ہو سکتی ہے، جو قومی ترقی کے لئے پہلی منزل ہے۔

ہمیں یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیئے کہ ہمارے مسلمان بھائیوں کے علاوہ ہمارے وطنی بھائی بھی ہیں وہ اگرچہ ہمارے کلمہ گو بھائی نہیں ہیں لیکن بہت سے تمدنی امور میں وہ بھائیوں کی طرح ہمارے شریک ہیں۔ ہمسائے کا ادب کرنا ہمارے مذہب کا ایک جزو ہے اور اگر یہی ہمسائگی وسیع ہو جائے تو وہ تمام غیر مسلم بھی ہمارے ہمسائے اور بھائی بن جاتے ہیں جو ہمارے ملک اور وطن میں رہتے ہیں لہٰذا ان کے ساتھ بھی باہمی سلوک، رواداری اور محبت کا برتاؤ ہونا چاہیئے۔۔۔ ان ہم وطن بھائیوں کے ساتھ بھی ہمارے تعلقات کی نوعیت دوہری ہے ہمیں ان کے عقیدے سے کوئی سروکار نہیں، وہ جانیں اور ان کا خدا۔ البتہ تمدنی اور معاشرتی امور میں ہمارا ان سے تعلق ہے جس کی بنیاد انسانیت پر ہونی چاہیئے یعنی ہمیں ان کی مدد کرنی چاہیئے۔ ان کے ساتھ سچی محبت، دوستی اور تحمل کے ساتھ پیش آنا چاہیئے۔

اتفاق کی خوبیاں ہر کسی نے بیان کی ہیں۔ تاریخ میں اس کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ دنیا میں بڑے بڑے کارنامے

اتفاق کی بدولت ظہور میں آئے ہیں۔ گھاس کے ریشے از خود کمزور ہوتے ہیں لیکن اگر انہیں باندھ دیا جائے تو بے حد مضبوط ثابت ہوتے ہیں۔ دنیا کی مہذب اور تعلیم یافتہ قوموں کی ترقی اور طاقت کا راز اتفاق میں پوشیدہ ہے۔

بعض داناؤں کا کہنا ہے کہ دنیا میں نہ تو حقیقی دوستی ملتی ہے اور نہ باہمی اتفاق ممکن ہے ان کے خیال میں اس کا سبب یہ ہے کہ تمام انسانوں کی طبیعتیں اور اغراض ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ قوم چاہے مہذب ہو یا غیر مہذب اس کے افراد میں باہمی حسد و نفاق، عداوت اور حقارت پائی جاتی ہے۔ یہ دلیل درست سہی لیکن یہاں بات شخصی نفاق کی نہیں بلکہ قومی اتفاق کی ہو رہی ہے۔ بشری کمزوریوں کی وجہ سے چاہے انسانوں میں کتنی ہی نا اتفاقی کیوں نہ ہو، لیکن یہ چیز قومی اتحاد کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتی۔ قومی بھلائی یا برائی کا اثر قوم کے تمام لوگوں پر ہوتا ہے۔ جہاں موقع اجتماعی نفع و نقصان کا ہو، وہاں ذاتی جھگڑے دب جاتے ہیں اور لوگ نفع نقصان سے بچاؤ اور فائدہ کے حصول کے لئے اکٹھے ہو جاتے ہیں۔

موجودہ زمانے میں ہمارے قومی زوال کا سب سے بڑا سبب قومی اتفاق کا نہ ہونا ہے۔ لوگوں کو صرف اپنے ذاتی فائدے سے غرض ہے اور قومی فلاح و بہبود کا ان کو خیال تک نہیں آتا۔ اگر کوئی شخص اجتماعی فائدے کا کوئی کام کرتا بھی ہے تو اس کے پس پشت اپنی ذاتی غرض ہوتی ہے۔ اسی لئے ہمارے قومی کاموں میں برکت نہیں ہوتی۔

اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہماری قوم کے دل نیکی کے کاموں سے خالی ہو گئے ہیں یہ عالی شان مسجدیں یہ امام باڑے اور خانقاہیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہمارے بھائی نیکی کے کاموں پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ ہر شہر اور قصبے میں نیک لوگ خدا کی راہ میں خیرات کرتے ہیں، بھوکوں کو کھانا کھلاتے ہیں، حج اور زیارت پر رقم خرچ کرتے ہیں۔ غرضیکہ ہر وہ کام جس کو وہ مذہبی طور پر کارِ ثواب تصور کرتے ہیں، اس میں دل و جان سے مصروف ہوتے ہیں۔ یہ سب کام اس نیت سے کئے جاتے ہیں کہ قیامت میں انہیں اس کا نیک بدلہ ملے گا۔ غور کیا جائے تو حقیقت میں ان کے یہ سب کام خود غرضی پر مبنی ہیں اور ذاتی فائدے کے لئے ہیں ــــ اور ان میں بنی نوعِ انسان کی اجتماعی بھلائی اور قومی ہمدردی کا خیال پیشِ نظر نہیں ہوتا۔ دراصل قومی ہمدردی کا سچا جوش اُسی وقت ہمارے دل میں پیدا ہو گا جب ہمارے کام ثوابِ آخرت کمانے کی نیت سے نہیں بلکہ قومی بھلائی کے لئے کئے جائیں گے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ ہمارے نزدیک ثواب کے کام برے یا قابلِ حقارت ہیں، بلکہ مقصد یہ ہے کہ قومی ہمدردی کے کاموں کی اہمیت لوگوں کے ذہن نشین کرائی جائے اور دوسرے کاموں کے مقابلے میں ان کی امتیازی حیثیت واضح کی جائے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال ۱ درج ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

ان نا اتفاقیوں نے ہماری قوم کو نہایت ضعیف اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے، جمعیت کی برکت ہماری قوم سے جاتی رہی ہے قومی ہمدردی اور قومی ترقی اور قومی امور کے سرانجام دینے میں اس نا لائق

نااتفاقی نے بہت کچھ اثرِ بد پہنچایا ہے۔ پس ہماری قومی ترقی کا سب سے اوّل مرحلہ یہ ہے کہ ہم سب آپس کی محبت سے اس عداوت و نفاق کو یکتائی و یک جہتی سے مبدّل کریں۔

جواب **حوالہ متن** یہ عبارت سرسید احمد خاں کے مضمون "قومی اتفاق" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنف کہتا ہے کہ پرانے زمانے میں کسی بزرگ کی نسل یا کسی ملک کے باشندوں کو قوم کہا جاتا تھا۔ البتہ اسلام نے قوم کی بنیاد کلمہ پر رکھی اور ہر کلمہ گو کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا۔ تاہم یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ہم میں وہ اتحاد و اتفاق نہیں رہا جس کا اسلام تقاضا کرتا ہے ہر جگہ حسد، بغض اور عداوت پائی جاتی ہے اور بظاہر مذہبی اختلافات کا نام لیکر ہم میں پھوٹ ڈال دی گئی ہے۔ خدا نے ہمیں اسلام کے ذریعے متحد کر کے ایک قوم بنایا تھا لیکن ہم نے شیطان کے بہکاوے میں آکر خود کو مختلف فرقوں اور مذہبی گروہوں میں بانٹ لیا اور عقائد میں اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے کے دشمن بن گئے۔

اس عبارت کے بعد مصنف کہتا ہے کہ قومی اتفاق کا یہ مطلب نہیں ہے کہ سب لوگ اپنے اپنے عقائد ترک کر دیں بلکہ اپنا اپنا عقیدہ برقرار رکھتے ہوئے بھی ہم قومی بہبود کے کاموں میں ایک دوسرے کا ساتھ دے سکتے ہیں۔ عقیدے کا تعلق صرف فرد تک رہنا چاہیئے جبکہ دیگر معاملات میں ہمیں اپنے جیسے دوسرے انسانوں کے ساتھ محبت، دوستی، رواداری، تحمل اور اخوت کا برتاؤ کرنا چاہیئے۔ ہماری ہمدردی کے مستحق صرف ہمارے مسلمان بھائی ہی نہیں ہیں بلکہ وہ تمام غیر مسلم بھی اسی سلوک کے مستحق ہیں، جو ہمارے ملک اور وطن میں رہتے ہیں کیونکہ وہ ہمارے روحانی بھائی نہ سہی، وطنی بھائی ضرور ہیں۔ وہ ہمارے ہمسائے ہیں اور ہمسایوں کے ساتھ نیک سلوک کرنا ہمارے مذہب کا جزو ہے۔ ہمیں ان کے عقائد سے غرض نہیں۔ اس سلسلے میں وہ جانیں اور ان کا خدا۔ البتہ معاشرتی اور تمدنی امور میں وہ ہمارے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ ہمارے تعلقات کی بنیاد انسانیت پر ہونی چاہیئے۔ کیونکہ یہی قومی اتفاق کی بنیاد ہے۔ ہمیں وہ کام بھی کرنے چاہئیں جنہیں ہم مذہبی طور پر نیکی کے کام سمجھتے ہیں لیکن ان کاموں کی طرف سے بھی آنکھیں بند نہیں کرنی چاہئیں جن کا تعلق ملک اور قوم سے ہے۔ انفرادی نیکی کا دائرہ محدود ہے جب کہ اجتماعی بہبود کے کاموں سے پوری قوم کو فائدہ پہنچتا ہے۔ لہٰذا ہمیں بنی نوعِ انسان کی اجتماعی بھلائی اور قومی ہمدردی کا خیال ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھنا چاہیئے۔

تشریح ہماری باہمی پھوٹ نے ہماری قوم کو بہت کمزور اور منتشر کر دیا ہے۔ متحد ہونے کی بجائے یہ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹ گئی ہے۔ اکٹھے رہنے میں جو فائدہ تھا ہم اس سے محروم ہو گئے ہیں۔ ہم میں قومی ہمدردی، قومی خدمت یا قومی ترقی کا احساس مٹ گیا ہے جس کا خمیازہ ہم انتشار کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔ لہٰذا اگر ہم چاہتے ہیں کہ بحیثیت قوم ترقی کریں تو اس کے لئے ضروری ہے کہ سب سے پہلے ہم اپنے اندر کی دشمنی اور پھوٹ کو خیرباد کہیں اور باہمی محبت و اخوت سے اپنے ہم قوموں میں اتحاد اور اتفاق پیدا کریں۔

الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

اسلام میں گداگری کی مذمّت

تعارف اور پسِ منظر

یہ مضمون، جو موضوع کے اعتبار سے بے حد مفید، مؤثر اور دلچسپ ہے، خواجہ الطاف حسین حالی نے ۱۹۰۶ء میں "انجمن بہبود مسلمانانِ دہلی" کو اس کے سیکرٹری کی فرمائش پر لکھ کر بھیجا تھا۔ مصنّف کی زندگی میں یہ غالباً شائع نہیں ہوا تھا، البتہ شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی نے اسے حالی کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسوّدے سے نقل کر کے "کلیاتِ نثرِ حالی" (جلد اوّل، مطبوعہ مجلسِ ترقیٔ ادب، لاہور) میں "مسلمانوں میں مسئلہ خیرات" کے عنوان سے شامل کیا ہے۔

یہ ایک نصیحت آموز مضمون ہے اور اس میں خواجہ الطاف حسین حالی نے بتایا ہے کہ بھیک مانگنا بہت بُرا فعل ہے۔ یہ انسان کو کاہلی، ذلّت اور بے غیرتی میں مبتلا کرتا ہے۔ مصنّف نے مضمون کے شروع میں چند احادیثِ نبوی نقل کی ہیں جن میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو سوال کرنے اور بھیک مانگنے سے منع کیا ہے۔ اندازاً ڈیڑھ سو روائتیں سوال کی مذمّت میں حدیث کی مختلف کتابوں سے "کنز العمّال" میں نقل کی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض احادیث مولانا حالی نے بھی اس مضمون میں درج کی ہیں اور ان کا اطلاق اپنے زمانے میں بڑھتی ہوئی گداگری پر کر کے اس ذلیل پیشے سے نفرت دلانے کی کوشش کی ہے۔ مصنّف نے آنحضرتؐ کی زندگی کے کچھ ایسے واقعات بھی بیان کئے ہیں جن میں آپؐ نے بعض لوگوں کو نہ صرف دستِ سوال دراز کرنے سے روکا بلکہ انہیں حلال روزی کمانے کا طریقہ بھی سکھایا۔ اس سلسلے میں "مشکوٰۃ" کی وہ حدیث خاص طور پر قابلِ ذکر ہے جس میں آنحضرتؐ نے ایک انصاری کی بھیک مانگنے کی عادت چھڑوانے کے لئے اس کی کمبلی اور پیالہ بیچ کر اُسے کلہاڑی لے دی اور لکڑیاں کاٹ کر بازار میں بیچنے کی تلقین کی۔ اسی طرح آپؐ نے (حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت کے مطابق) سات آٹھ آدمیوں سے دوبارہ بیعت لیتے ہوئے انہیں خدا کی عبادت کرنے، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانے اور احکامِ الٰہی بجالانے کی تلقین کرنے کے ساتھ ساتھ لوگوں کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرنے کی نصیحت بھی کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ توحید اور نماز کے بعد سب سے زیادہ اہمیّت، حلال ذرائع سے روزی

کمانے کو دیتے تھے۔ مولانا الطاف حسین حالی کو یہ دیکھ کر بے حد افسوس ہوتا ہے کہ گداگری کی لعنت کم ہونے کی بجائے روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور اب یہ ایک ذلیل پیشہ کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ بھیک مانگنے سے جو معاشرتی اور اخلاقی خرابیاں پھیلتی ہیں اور جس طرح انسان کی عزتِ نفس مجروح ہوتی ہے، حالی نے اس کی بھی نشان دہی کی ہے۔ ان کی رائے میں گداگری سے نجات پانے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ غیر مستحق لوگوں کی امداد سے ہاتھ روک لیا جائے اور صرف مستحق لوگوں یعنی بیواؤں، یتیموں، محتاجوں، معذوروں اور ہمسایوں کو صدقہ وخیرات دی جائے انہوں نے تاریخی واقعات سے ثابت کیا ہے کہ آنحضرتؐ کے وصال کے بعد خلفائے راشدین اور مسلمان بادشاہوں نے بھی گداگری کی حوصلہ شکنی کی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے ایک پیشہ ور بھکاری کو جس طرح تنبیہ کی اور علامہ مقری نے جس طرح اُندلس کے بارے میں بتایا کہ وہاں اپاہج اور معذور آدمی کے سوا کوئی سائل نظر نہیں آتا تھا ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے اسلامی ممالک میں گداگری کو کتنا مذموم فعل سمجھا جاتا تھا۔ مولانا حالی اپنے ملک کے علماء اور واعظوں سے درخواست کرتے ہیں کہ وہ لوگوں کو خدا اور رسول کے بتائے ہوئے ان احکامات سے آگاہ کریں جن میں گداگری، اسراف اور فضول خرچی کی مذمت کی گئی ہے۔ مضمون کے آخر میں وہ مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ وہ غیر مستحق حضرات کو ہرگز خیرات نہ دیں۔ وہ عورتوں کو خاص طور پر تاکید کرتے ہیں کہ ہٹے کٹے تندرست بھکاریوں کو خدا رسیدہ بزرگ سمجھ کر کچھ دینا نیکی اور بھلائی کا کام نہیں بلکہ اُلٹا گناہ کا ارتکاب کرنا ہے۔

مشکل الفاظ ومحاورات کے معانی

ص ۸۱ گداگری: بھیک مانگنا، فقیری۔ مذمت: برائی۔ سوال: مانگنا، بھیک۔

انسداد: کسی بری بات کی روک تھام کرنا۔ کسی برے رواج کو دُور کرنا۔ مہتم بالشان: اہم، ضروری۔ توحید: خدا کو ایک ماننا۔ نماز پنج گانہ: پانچ وقتوں کی نماز یعنی فجر، ظہر، عصر، مغرب اور عشاء۔ ہمت عالی: عالی ہمت یا سرکارِ عالیہ۔ بلند مرتبے والی ہستی مراد آنحضرتؐ۔ عبدالرحمٰن بن عوف: آپؓ بڑے پائے کے صحابیِ رسولؐ تھے، ۳۲ھ میں وفات پائی، عشرہ مبشرہ (دس صحابۂ کبار جنہیں حضور اکرمؐ نے زندگی میں ہی جنت کی خوشخبری دی تھی) میں شامل تھے۔ ابتدائی اسلام لانے والوں میں میں سے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے مشیر تھے اور تیسرے خلیفہ کے انتخاب کے وقت ثالث تھے۔ بہت دولتمند اور مخیر صحابی تھے۔ انہوں نے کئی احادیث بیان کی ہیں۔

روایت: کسی کی بات زبانی نقل کرنا۔ بیعت: کسی مذہبی پیشوا کی اطاعت کرکے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھنا۔ احکامِ الٰہی: خدا نے جو کام کرنے کا حکم دیا ہے یا جن کے کرنے سے منع کیا ہے، خدا

کی ہدایات۔ بجالانا: ماننا، تعمیل کرنا۔ وَلَا تَسْئَلُوا النَّاسَ شَيْئًا: ترجمہ: کسی کے آگے دستِ سوال دراز نہ کرو۔

ص ۸۲ | روایت: کسی کی بات زبانی نقل کرنا۔ کوڑا: چابک، قمچی۔ تاکید: زور دینے کے لئے کسی بات کا بار بار کہنا۔ گداگری: بھیک مانگنا۔ ذریعۂ معاش: روزی کمانے کا ذریعہ۔ حدیث: لفظی معنی، بات۔ یہاں مراد ہے، حدیثِ رسولؐ یعنی رسول اکرمؐ کے قول اور ان کے فعل کی خبر، بیان یا ذکر۔ زکوٰۃ: مال کا وہ حصہ جو اسلامی شریعت کے مطابق مستحق لوگوں کو دیا جائے۔ خیرات: صدقہ، خدا کی راہ میں غریبوں اور محتاجوں کو دیا ہوا مال۔ صرف: استعمال۔ بیت المال: حکومت کا خزانہ۔ وہ مالِ غنیمت جس میں تمام مسلمانوں کا حصہ ہو۔ فراہم: مہیا یا اکٹھا کرنا۔ مطلق: بالکل، قطعی۔ درہم برہم ہونا: تہ و بالا ہونا، اُلٹ پلٹ ہونا۔ منتشر ہونا۔ بیعت: کسی مذہبی پیشوا کی اطاعت کے لئے اس کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر قول و قرار کرنا۔ مذکور: جس کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ ذہن نشین: دماغ میں بٹھانا، سمجھانا۔ تصریح: وضاحت، تشریح، صاف صاف بیان کرنا۔ تکرار: بار بار کہنا۔ یاد دہانی: یاد کرانا۔ مقصود: مطلب، لفظی معنی، جس کا ارادہ کیا گیا ہو۔ دلالت: ثبوت، رہنمائی۔ ممانعت: منع کرنا، روک، بندش۔ سائل: مانگنے والا، بھکاری۔

ص ۸۳ | اضطراری: بے اختیاری، بے قراری۔ جب انسان مجبور ہو جائے۔ حرام: ناروا، ناجائز۔ خلافِ شرع۔ آتشِ دوزخ: جہنم کی آگ۔ گٹھا: بوجھ، بڑی گٹھڑی، باندھی ہوئی چیز۔ پشت: پیٹھ۔ حاجت رفع کرنا: ضرورت پوری کرنا۔ دھتکارنا: نکالنا، لعنت ملامت کرنا۔ عائذ ابنِ عمرؓ: ایک مشہور راویٔ حدیث۔ فلاسفر: فلسفی، فلسفہ جاننے والا، فلسفہ وہ علم ہے جس میں مادہ اور اس میں ہونے والی تبدیلیوں اور اجسام ارضی و سماوی کی حقیقت اور لوازمات سے بحث ہوتی ہے، حکمت و دانائی کی باتیں، جن کے ذریعے موجودات کی حقیقت جاننے کی حتی الامکان کوشش کی جاتی ہے۔ اقتصادیات: مالیات سے تعلق رکھنے والی باتیں۔ علم المعیشت، وہ علم جس میں مادی پیداوار کے مناسب طریقے سے خرچ کرنے کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جفاکشی: محنت و مشقت سختیاں جھیلنا۔ غیرت: شرم و حیا۔ حمیت: غیرت اور شرم۔ اولوالعزمی: ثابت قدمی، مستقل مزاجی، صبر و حوصلہ۔ گھاٹا: نقصان۔ مفلس: غریب۔ کاہلی: سستی۔ ترغیب: رغبت دلانا، لالچ دلانا، شوق دلانا۔ تقویت: قوت و طاقت۔ سوسائٹی: معاشرہ۔ سمِ قاتل: ہلاک کرنے والا زہر۔ حکم: درجہ۔ جامعیت: تکمیل، حاوی ہونا۔ جامع پن۔ تمام کو اپنے اندر شامل کرنا۔ مذکورہ بالا: جس چیز کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حدیثِ نبویؐ: نبی اکرمؐ کے قول یا فعل کا بیان۔

ص ۸۴ | مذموم: بُری۔ عارض ہونا: لاحق ہونا، پیش آنا۔ مَلْعُوْنٌ مَنْ سَأَلَ

لِوَجِہِ اللّٰہ : ترجمہ: جو شخص اللہ کو بھیک مانگنے کا ذریعہ بنائے وہ لعنتی ہے۔ رسول: خدا کی طرف سے مخلوق کی رہبری کے لئے بھیجا گیا ہادی جو کتاب لائے۔ خواہ مخواہ: مجبوری سے۔ قیامت: وہ دن جب مُردے زندہ ہو کر اُٹھ کھڑے ہوں گے، روزِ حشر۔ اندوختہ: جمع کیا ہوا مال، استطاعت: مالی حیثیت۔ ناداری: غربت۔ کفرانِ نعمت: نعمت کی ناشکری، احسان کا بھول جانا۔ دروغ گوئی: جھوٹ بولنا۔ مکاری: چالاکی اور دھوکے بازی۔ ذریعہ گردانتا ہے: ذریعہ مانتا ہے۔ جامع: مکمل۔ مذمت: برائی کرنا۔ لے دے کرنا: لعنت ملامت کرنا، ڈانٹنا۔ مرفوع حدیثیں: وہ احادیث جن میں آنحضرتؐ کے اقوال، افعال اور تقاریر کا بیان ہو۔ مذمت: بُرائی۔ کُتبِ احادیث: وہ کتابیں جن میں آنحضرتؐ کے اقوال اور افعال صحابہ کی زبانی محفوظ ہیں مثلاً صحیح بخاری، صحیح مسلم وغیرہ۔ مدح: تعریف۔ ذم: برائی۔ صراحت: وضاحت۔ ادنیٰ تامل: تھوڑا سا غور کرنے پر، سوچ وچار کے بعد۔

ص ۸۵ | مُوجب: سبب، وجہ۔ تبلیغِ رسالت: رسول اکرمؐ کا شرعی احکام امت تک پہنچانا۔ علاقہ: تعلق۔ صراحت: وضاحت، صاف صاف بیان کرنا۔ بہ ایں ہمہ: اس کے باوجود۔ علی الاعلان: گواہوں کے روبرو، سب کے سامنے۔ ردّ کرنا: واپس کرنا، پھیر دینا، نہ ماننا۔ مکروہ: ناگوار، گھناؤنا، قابلِ نفرت۔ متعدد: کئی۔ روایت: کسی کی بات زبانی نقل کرنا۔ فحوائے کلام: طرزِ کلام، گفتگو کا ڈھنگ، بات چیت کا انداز۔ حضرت عمرؓ: دوسرے خلیفہ راشد، جو بڑے جلیل القدر صحابی اور حکمران تھے۔ ردِّ سوال: مانگنے والے کی خواہش پوری نہ کرنا۔ باب: بارے میں۔ مشکوٰۃ: حدیث کی مشہور کتاب "مشکوٰۃ المصابیح" جسے الخطیب تبریزی (متوفی ۷۳۹ھ) نے مرتب کیا۔ مختلف کتبِ احادیث سے حدیثیں منتخب کر کے یہ مجموعہ مرتب کیا گیا ہے اور بے حد مقبول ہے۔ انصار: ناصر کی جمع، مدد کرنے والے، مدینے کے وہ لوگ جو آنحضرتؐ پر ایمان لائے تھے۔

ص ۸۶ | کمبلی: پھٹا پرانا کمبل۔ درہم: چاندی کا ایک عربی سکّہ جو چونّی کی مانند ۲½ ماشے وزن کا ہے۔ انصاری: مدینہ کا رہنے والا وہ شخص جو حضورِ اکرمؐ پر ایمان لایا ہو۔ دستِ مبارک: حضورؐ کا برکت والا ہاتھ۔ دستہ: کلہاڑی پکڑنے کے لئے لکڑی کا ڈنڈا۔ مول لینا: خریدنا۔ قیامت: روزِ حشر۔ حلال: جائز۔ محتاج: حاجت مند، ضرورت مند۔ تاوان: جرمانہ۔ ڈنڈ، عوض، کفارہ، قصاص۔ خون بہا: دیت، وہ رقم جو مقتول کے عوض لی یا دی جاتی ہے۔ ذہن نشین کرانا: سمجھانا۔ بے غیرتی: بے حیائی، ڈھٹائی: بے شرمی، ہٹ، ضد۔ فہمائش: ہدایت، نصیحت، تنبیہ۔ ممانعت: روک، بندش۔

ص ۸۷ | نظر بہ حالاتِ موجودہ : موجودہ حالات کو دیکھتے ہوئے۔ داد و دہش: خیر خیرات، فیاضی، سخاوت۔ یک قلم : بالکل، سراسر، استحقاق: حق دار ہونا، مستحق ہونا۔ ناداری: غربت۔ سلوک: برتاؤ۔ متعدی : اڑ کر لگنے والی بیماری، ایک سے دوسرے کو فوراً لگنے والی بیماری۔ سرایت کرنا : اثر کرنا۔ رچنا، نفوذ کرنا۔ بھک منگے: بھکاری۔ بیخ کنی: جڑ سے اکھاڑنا۔ مدّتِ دراز: لمبے عرصے تک۔ ممالکِ اسلامیہ: مسلمان ملک۔ مذموم: بُرا فعل۔ انسداد: سدِّباب، کسی بُرے رواج یا بُری بات کو روک دینا۔ روایت: کسی کی بات زبانی نقل کرنا۔ تاجر: سوداگر، بیوپاری۔ علامہ مقریزی (وفات ۱۶۳۱ء) "نفح الطیب" یعنی تاریخ اُندلس کے مشہور مصنّف۔

ص ۸۸ | سخت سُست کہنا: بُرا بھلا کہنا۔ اپاہج : لُولا، نکما، کاہل، سُست۔ معذور: محتاج، اپاہج۔ حُدُود: حد کی جمع، احاطہ، کنارہ، مقررہ مقام جہاں تک جانا ہو۔ دسترس: پہنچ، رسائی۔ کمینہ: بُری عادت۔ انسداد: کسی بُرے رواج کو روکنا۔ علماء: عالم کی جمع، علم رکھنے والے۔ واعظین: منبر یا سٹیج سے مذہبی تقریر کرنے والے۔ مجلس: محفل۔ مذمت: برائی کرنا۔ وارد ہونا: اُترنا، نازل ہونا، آنا۔ مضر: نقصان دہ۔ اسراف: فضول خرچی۔ زنانی: عورتوں کی۔ مستجاب الدعوات: جس کی خواہشیں قبول ہوتی ہیں۔ غیب: پوشیدہ، خدا جو نظروں سے پوشیدہ ہے۔ خدا کی طرف سے آئندہ واقعات کی اطلاع ملنا۔ آگاہ: واقف۔ ہٹا کٹا: موٹا تازہ جوان اور تندرست، مسٹنڈا۔ مُرتکب: کوئی فعل کرنے والا۔ بیوہ: رانڈ، وہ عورت جس کا شوہر مر جائے۔ یتیم: بن ماں باپ کا۔ حق تلفی: ناانصافی۔ حق مارنا۔

سبق کا خلاصہ

اسلام میں گداگری کی شدید مذمت کی گئی ہے۔ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم جس طرح توحید اور نماز کو مسلمانوں کے لئے فرض سمجھتے تھے، اسی طرح دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے کو بُرا تصوّر کرتے تھے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی روایت کے مطابق آنحضرتؐ نے ارشاد فرمایا کہ لوگوں سے کچھ نہ مانگا کرو۔ اس حکم پر اتنی شدت سے عمل کیا جاتا تھا کہ اگر کسی سوار کا کوڑا ہاتھ سے چھوٹ کر گر جاتا تھا تو وہ کسی راہ گیر سے اُسے اٹھانے کی درخواست نہیں کرتا تھا۔

گداگری آج کل بعض لوگوں کا ذریعۂ معاش بن چکی ہے۔ اسلام نے اسی لئے مانگنے سے منع کیا ہے کہ کہیں یہ عادت پختہ ہو کر پیشہ نہ بن جائے۔ تاہم اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسلمانوں کو ایک دوسرے کی امداد کرنے سے روکا گیا ہے بلکہ بعض احادیثِ نبویؐ کے مطابق آنحضرتؐ نے مسلمانوں کو تلقین کی ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کیا کریں اور اپنے کام باہمی مشورے سے سرانجام دیا کریں، اسی طرح

مسلمانوں کو زکوٰۃ ادا کرنے اور صدقہ وخیرات دینے کی تلقین بھی کی گئی ہے تاکہ بیت المال میں جمع شدہ رقوم اسلامی کاموں پر خرچ کی جاسکیں۔ آج بھی اگر قوم کی اہم ضروریات کے لئے رقم طلب کی جائے تو یہ گداگری نہیں کہلائے گی اس لئے کہ اگر لین دین رک جائے تو دنیا کا سارا کاروبار درہم برہم ہو جائے گا۔

بعض احادیث سے واضح ہوتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنی ضرورت کے لئے دوسروں کے سامنے ہاتھ پھیلانے والے آدمی کو اچھا نہیں سمجھتے تھے۔ اگر کوئی شخص اشد مجبوری کے سوا کسی سے کچھ مانگتا تھا تو آپ اسے برا تصور کرتے تھے۔ اس کے مقابلے میں آپؐ اُس انسان کو زیادہ پسند کرتے تھے جو پہاڑ پر جا کر لکڑیاں اکٹھی کرتا ہو اور بازار میں فروخت کر کے اپنی ضروریات پوری کرتا ہو۔

اگر کسی فلسفی یا ماہر معاشیات سے گداگری کے نقصانات پر بات چیت کی جائے تو اُس کا جواب یہی ہوگا کہ اس فعل کی وجہ سے قوم محنت وجفاکشی سے جان چرانے لگتی ہے وہ ہمت و حوصلہ کھو بیٹھتی ہے اور بے غیرت ہو جاتی ہے، امیر طبقہ خیرات کی آڑ میں ایک ایسے کاہل اور بے ضمیر طبقے کو برقرار رکھنے کا مجرم ہوتا ہے، جو معاشرے کیلئے زہرِ قاتل سے کم نہیں۔ اس استدلال کے مقابلے میں احادیث نبویؐ کے الفاظ زیادہ جامع ہیں۔ ان کے ذریعے ان معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کی نشان دہی کی گئی ہے، جو گداگری کا لازمی نتیجہ ہیں۔ خدا اور رسول کے نام پر بھیک مانگنے والا دراصل خدا اور رسول کو بیچتا ہے اور اس سے بڑھ کر کوئی فعل قابلِ نفرت نہیں۔ بھکاری رحم دل لوگوں کو روزِ قیامت کا واسطہ دیکر کہتا ہے کہ اگر انہوں نے اسے خیرات دی تو انہیں ایک کے بدلے میں ستر گنا زیادہ ملے گا۔ گویا اس کے نزدیک قیامت کا مطلب بھی کاروبار کے سوا کچھ نہیں۔

گداگر اس قدر لالچی ہو جاتا ہے کہ جو کچھ اس نے جمع کر رکھا ہوتا ہے، اُسے لوگوں کی نظروں سے چھپاتا ہے اور بہت کچھ پاس ہونے کے باوجود اپنی غربت کا ڈھنڈورا پیٹتا ہے، وہ لوگوں سے جھوٹ بولتا اور مکر وفریب سے کام لیتا ہے اور خدا کی عطا کردہ نعمتوں کی ناشکری کر کے سخت گناہ کا ارتکاب کرتا ہے۔

آنحضرتؐ نے گداگری کو کبھی اچھا نہیں سمجھا اور اس سلسلے میں بے شمار احادیث میں انہوں نے سائلوں کو اس مذموم حرکت سے منع کیا ہے لیکن آپؐ نے مخیر حضرات کو بھکاریوں کی مدد کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ اس کی وجہ بہ آسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ دراصل بھیک مانگنا بہت سی معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کی جڑ ہے لیکن مانگنے والے کی حاجت روائی کرنا ویسا برا فعل نہیں۔ اسی لئے آنحضرتؐ نے غیر مستحق سائلوں کے سوال پورا کرنے والوں کی کھلے لفظوں میں مذمت نہیں فرمائی۔ تاہم آنحضرتؐ کا منشاء سب پر واضح ہے۔ آپؐ یہ پسند نہیں فرماتے تھے کہ ملک میں ہاتھ پھیلانے والوں کی کثرت ہو

جائے۔ باوجود اس کے کہ اگر کوئی آپؐ سے کچھ مانگتا تھا، تو آپؐ اس کا سوال رَدّ نہیں کرتے تھے، تاہم آپؐ نے کبھی اس فعل کی حوصلہ افزائی نہیں فرمائی۔ بلکہ حضرت عمرؓ کے دریافت کرنے پر کہ، جب آپ مانگنے والوں کو اچھا نہیں سمجھتے تو ان کا مطلب کیوں پورا کرتے ہیں، آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ کیا کروں! لوگ مجھ سے کچھ مانگنے سے باز نہیں آتے اور میرے خدا کو یہ پسند نہیں کہ مَیں ان کی خواہش رَدّ کروں۔

بھیک مانگنے سے منع کرنے اور رزقِ حلال کی ترغیب دینے کے سلسلے میں مشکوٰۃ شریف کی وہ حدیث بے حد عمدہ ہے جس میں آنحضرتؐ کی خدمت میں ایک انصاری حاضر ہوتا ہے اور کچھ طلب کرتا ہے۔ حضورؐ اس سے پوچھتے ہیں کہ کیا اس کے گھر میں کچھ بھی موجود نہیں؟ وہ بتاتا ہے کہ صرف ایک موٹی کمبلی اور ایک پیالہ ہے۔ حضورؐ اس کے گھر سے یہ دونوں چیزیں منگوا کر دو درہم میں فروخت کرواتے ہیں اور اس انصاری سے فرماتے ہیں کہ ایک درہم کا کھانا گھر والوں کے لئے خریدے اور ایک درہم سے کلہاڑی خرید لائے۔ وہ کلہاڑی خرید لایا تو آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے اس کا دستہ ٹھونکا اور اسے دے کر فرمایا کہ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لایا کرے اور بازار میں بیچ دیا کرے۔ پندرہ دن کے بعد وہ حاضرِ خدمت ہوا تو اس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے۔ اس رقم سے اُس نے کپڑا اور کھانے کا سامان خریدا۔ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ تیرے لئے یہ بہتر ہے کہ اپنے ہاتھ سے کمائے بہ نسبت اس کے کہ قیامت کے دن تیرے چہرے پر بھیک کا داغ ہو۔ ہاتھ پھیلانا صرف اُس شخص کے لئے جائز ہے جو سخت حاجت مند ہو، یا اس کے ذمے بھاری تاوان ہو یا اُس نے خون بہا ادا کرنا ہو۔

موجودہ زمانے میں سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اتنی بڑھ چکی ہے کہ ان پر کسی نصیحت یا تنبیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اس لئے ضروری ہے کہ اب کسی غیر مستحق سائل کو کچھ نہ دیا جائے۔ البتہ ان مستحق لیکن غیرت مند افراد کی مدد سے ہاتھ نہ روکا جائے جو سخت غربت کی وجہ سے مجبور ہیں یا ان پر کوئی اور مصیبت آ پڑی ہے۔ ملک و قوم کے حق میں بہتر یہی ہے کہ گداگری جیسے متعدی مرض کی سختی سے روک تھام کی جائے اور روز بروز بڑھتے ہوئے بھک منگوں کی تعداد میں اضافہ کرنے کی بجائے انہیں جڑ سے اکھاڑ پھینکا جائے۔

آنحضرتؐ نے گداگری کی جن سخت الفاظ میں مذمت فرمائی تھی، اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ تمام مسلم ممالک میں گدائی کو سخت بُرا فعل سمجھا جانے لگا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ کا ایک واقعہ ہے کہ ایک سائل نے بھوکا ہونے کا بہانہ کیا۔ اُسے روٹی دی گئی لیکن تھوڑی دیر بعد اُس نے پھر کھانے کی صدا لگائی۔ صورتِ حال معلوم کرنے کے لئے جب اس کی تلاشی لی گئی تو اس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی نکلی۔ حضرت عمرؓ نے سب روٹیاں اونٹوں کے آگے ڈال دیں اور سائل پر سخت خفا ہوئے۔

علامہ مقری نے اپنی کتاب تاریخ اندلس میں لکھا ہے کہ اندلس میں اگر کوئی تندرست آدمی مانگتا ہے تو سب اُسے بُرا بھلا کہتے ہیں اور سخت ذلیل کرتے ہیں۔ اسی لیئے پورے ملک میں سوائے اپاہج یا معذور آدمی کے کوئی بھکاری نظر نہیں آتا جب کہ ہمارے اپنے ملک کا یہ حال ہے کہ اس میں جس قدر مسلمان قوم کے افراد بھیک مانگتے نظر آتے ہیں، اتنے کسی اور قوم کے نظر نہیں آتے۔ لہٰذا مسلمانوں کا فرض ہے کہ وہ سختی سے اس ذلیل پیشہ کا سدِ باب کریں۔ ہمارے علماء اور واعظوں کا بھی فرض ہے کہ وہ آنحضرتؐ کے اقوال کی روشنی میں گداگری کی سخت مذمت کریں۔ قرآن مجید نے جابجا سوال کرنے والوں کو بُرا کہا ہے اور اس کے انفرادی اور اجتماعی نقصان دہ نتائج کی طرف توجہ دلائی ہے۔ قرآن اسراف اور فضول خرچی سے بھی منع کرتا ہے لہٰذا ہمارے علماء و فضلاء کا فرض ہے کہ وہ عام مسلمانوں کو قرآن مجید کی تعلیمات سے آگاہ کریں۔

ہمارے ملک میں غیر مستحق بھک منگوں کو دریا دلی سے خیرات دینے میں عورتیں پیش پیش ہیں۔ وہ ہر فقیر کو ولی اللہ یا خدا رسیدہ بزرگ تصور کرتی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ خدا ان کی ہر دعا قبول کرتا ہے۔ ہمارا فرض ہے کہ ان فریب کاروں کے ہتھکنڈوں سے لوگوں کو آگاہ کریں۔ تندرست اور ہٹے کٹے بھکاریوں کو خیرات دینا نیکی کا نہیں، گناہ کا کام ہے۔ کیونکہ یہ مسٹنڈے ان بیواؤں، یتیموں اور ہمسایوں کا حق غصب کرتے ہیں جو دراصل ہماری مدد کے محتاج ہیں۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، مع سیاق و سباق تشریح کیجئے۔

اس زمانے کے سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اتنی حد سے گزر گئی ہے کہ کسی کی فہمائش یا ممانعت کا ان پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔ نظر بہ حالاتِ موجودہ ہم کو اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ غیر مستحق سائلوں کی داد و دہش سے یک قلم ہاتھ روک لیا جائے، اور جہاں تک ہو سکے مستحقین کی امداد کی جائے جو باوجود استحقاق کے کسی سے سوال نہیں کرتے یا جو سخت مجبوری اور ناداری کی حالت میں سوال کرتے ہیں۔ غیر مستحق سائلوں کے ساتھ کوئی بھلائی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ ان کو اس بے غیرتی اور بے شرمی کے پیشے سے باز رکھا جائے۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت الطاف حسین حالی کے مضمون "اسلام میں گداگری کی مذمت" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے حالی نے بتایا ہے کہ بھیک مانگنے کی جتنی مذمت اسلام نے کی ہے، اتنی کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ آنحضرتؐ نے توحید اور نماز پر جتنا زور دیا ہے، اتنا ہی

لوگوں کو گداگری سے متنفر کرنے کی کوشش کی ہے اور انہیں اس کے نقصانات سے آگاہ کیا ہے اس کی وجہ یہ تھی کہ بھیک مانگنے سے منع نہ کیا جائے تو رفتہ رفتہ یہ ایک ذلیل پیشہ بن جاتی ہے حضور اکرمؐ نے مسلمانوں کو ایک دوسرے کی مدد کرنے اور باہمی مشورے سے کام کرنے سے منع نہیں فرمایا۔ اسی طرح آپ نے زکوٰۃ اور صدقہ وخیرات دینے کی فضیلت بھی بیان کی ہے کیونکہ دُنیوی امور سرانجام دینے کے لئے یہ ضروری چیزیں ہیں لیکن بلاوجہ سوال کرنے اور ہر کسی کے آگے ہاتھ پھیلانے کو آپؐ نے کبھی پسند نہیں فرمایا۔ اس کی بجائے آپؐ نے اس امر کو زیادہ پسندیدہ قرار دیا ہے کہ کوئی شخص پہاڑ یا جنگل سے لکڑیاں چُن کر لائے اور بازار میں بیچ کر ان سے اپنا پیٹ پالے۔ گداگری سے جو معاشرتی اور اخلاقی برائیاں جنم لیتی ہیں اور جو روحانی بیماریاں لاحق ہوتی ہیں، ان سے مسلمانوں کو بچانے کے لئے آپؐ نے مسلمانوں کو اپنی روزی خود کمانے کی تلقین فرمائی۔ البتہ صدقہ وخیرات دینے والوں کو آپؐ نے منع نہیں فرمایا۔ گداگری کا سب سے بڑا نقصان یہ ہے کہ گداگر مستحق آدمیوں کا حق مارتے ہیں اور وہ تن آسان اور بے غیرت ہو جاتے ہیں۔

اس عبارت کے بعد حالی بتاتے ہیں کہ ملک وقوم کے حق میں بہتر یہی ہے کہ گداگری کا قلع قمع کیا جائے کیونکہ یہ مرض چھوت چھات کی طرح قوم کے افراد میں سرایت کرتا جا رہا ہے۔ روز بروز بھکاریوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا ہے اور یہ چیز ملک وقوم کے مستقبل کے لئے انتہائی خطرناک ہے۔ آنحضرتؐ کی پیروی میں مسلمانوں نے بھی ممکنہ حد تک اسلامی ممالک میں گداگری کی حوصلہ شکنی کی۔ علامہ مقری کے بیان کے مطابق اُندلس میں اگر لوگ کسی تندرست آدمی کو بھیک مانگتے ہوئے دیکھتے تو اُسے سخت ذلیل کرتے تھے۔ چنانچہ سوائے اپاہج یا معذور آدمیوں کے ملک میں کوئی سائل نظر نہیں آتا تھا۔ ہمارے علمائے کرام اور واعظین حضرات کا فرض ہے کہ وہ قرآن وحدیث کی روشنی میں لوگوں کو بتائیں کہ گداگری کتنی نقصان دہ چیز ہے اور فضول خرچی سے کون کون سی برائیاں معاشرے میں پھیلتی ہیں۔ عورتوں کو خاص طور پر سمجھانا چاہیئے جو ہر فقیر کو خدا رسیدہ بزرگ سمجھ کر، ثواب کی خاطر فراخ دلی سے بھیک دیتی ہیں، حالاں کہ ان میں سے اکثر بھکاری مکّار اور فریبی ہوتے ہیں۔ ان لوگوں کو خیرات دینے کا مطلب یہ ہے کہ مستحق افراد یعنی بیواؤں، یتیموں اور ہمسایوں کو ان کے حق سے محروم کیا جائے

تشریح

موجودہ زمانے میں بھیک مانگنے والے اتنے بے حیا اور ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ انہیں خواہ کتنی ہی تنبیہ کی جائے یا کتنا ہی منع کیا جائے، وہ ہاتھ پھیلانے سے باز نہیں آتے۔ اُن پر کسی نصیحت کا اثر نہیں ہوتا۔ ہمارے ملک میں گداگری جس رفتار سے بڑھ رہی ہے، اور افرادِ قوم میں جس تیزی سے پھیل رہی ہے، اسے دیکھتے ہوئے ہمارا

فرض ہے کہ ایسے بھک منگوں کو خیرات دینا بند کر دیں جو حقیقت میں اس کے مستحق نہیں ہیں۔ اس کی بجائے ہمیں صرف ان افراد کی مدد کرنی چاہیئے جو صحیح معنوں میں ضرورت مند ہیں لیکن حیا کی وجہ سے کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے یا اگر سوال کرتے ہیں تو انتہائی مجبور ہو کر یا غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر۔ جو گدا گر خیرات کے مستحق نہیں ہیں، ان کے ساتھ سچی ہمدردی کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں بھیک دینی بند کر دی جائے تا کہ وہ اس ذلیل پیشے کو تنگ آ کر چھوڑ دیں اور بے حیا اور بے غیرت بن کر جینے سے باز آ جائیں۔

شبلی نعمانی (۱۸۵۷ء - ۱۹۱۴ء)

شبلی نعمانی

مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم

تعارف اور پس منظر

شبلی نعمانی کا مضمون "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" مقالاتِ شبلی (جلد سوم) میں سے لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں انہوں نے مسلمانوں کے قدیم طرزِ تعلیم کی خصوصیات گنوائی ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ اسلام کی ابتداء کے زمانے میں بھی تعلیم کا حصول اہم تصور کیا جاتا تھا۔ حالانکہ اس وقت لکھنے پڑھنے والوں کی تعداد نہ ہونے کے برابر تھی اور علم حافظے کے بل بوتے پر زبانی دوسروں تک منتقل کیا جاتا تھا۔ ڈیڑھ صدی بعد عربوں میں کتابیں لکھنے کا رواج پڑا، تہذیب و تمدن کو ترقی ہوئی اور تعلیم بھی پہلے کی نسبت زیادہ باقاعدہ اور وسیع ہو گئی۔ نئے نئے علوم وجود میں آئے اور سرکاری سطح پر درس گاہیں نہ ہونے کے باوجود اسلامی ممالک میں ہر گاؤں اور ہر شہر میں پرائیویٹ مکتب کھل گئے، جہاں خاص و عام تعلیم حاصل کر سکتے تھے۔ ہزاروں کتابیں لکھی گئیں جو اس بات کا ثبوت تھیں کہ مسلمان قوم تعلیم سے کتنی دلچسپی رکھتی ہے۔ شبلی نعمانی کی رائے میں اس دور کا طرزِ تعلیم وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے، یعنی اِملا کرانا جسے اردو میں لیکچر دینا کہتے ہیں۔ شبلی نعمانی نے مسلمانوں پر واضح کیا ہے کہ جن چیزوں کو وہ آج نیا سمجھ رہے ہیں، وہ ان کے آباؤ اجداد برسوں پہلے سرانجام دے چکے ہیں۔ چنانچہ مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں استاد کسی منبر یا کرسی پر بیٹھ جاتا تھا اور کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کر دیتا تھا۔ طلبا ہمیشہ قلم اور دوات لے کر بیٹھتے تھے اور ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی۔

شبلی نعمانی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دُور دراز کا سفر کرنا اور اہلِ کمال کی خدمت میں حاضر ہو کر علمی فائدہ اٹھانا طالب علم کے لئے لازمی خیال کیا جاتا تھا۔ جن لوگوں نے اس زمانے میں علوم و فنون میں کمال حاصل کیا تھا، ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں تھا جس نے حصولِ علم و فن کے لئے سفر کی مصیبتیں برداشت نہ کی ہوں۔ اسی طرح شبلی بتاتے ہیں کہ مناظرہ اور مذہبی بحث و مباحثہ میں شریک ہونا بھی طالب علم کے لئے مفید ثابت ہوتا تھا۔ اسلامی ممالک میں تعلیم کی وسعت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ مذہب کا لازمی جزو خیال

کی جاتی تھی کیونکہ قرآن و حدیث عربی زبان میں تھے اور یہ زبان پڑھے بغیر مذہب کو جاننا ناممکن تھا۔ مذہب کی وجہ سے ہی مسلمان فلسفہ اور علم الکلام کی طرف متوجہ ہوئے اور دوسرے علوم میں بھی دلچسپی لینے لگے۔ اسلامی فتوحات کی وجہ سے غیر مسلم قومیں بھی دائرہ اسلام میں داخل ہوتی گئیں اور وہ عربوں کے مقابلے میں تہذیب و تمدن سے زیادہ آشنا تھیں، اس لئے ان میں تعلیم کا پہلے سے چرچا موجود تھا۔ جب وہ مسلمان ہوئیں تو انہوں نے مختلف علوم میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ وہ ان میں امام اور پیشوا کا درجہ اختیار کر گئیں۔

علامہ شبلی نعمانی اسلامی ممالک میں تعلیم کی مقبولیت کے اسباب گنواتے ہوئے بتایا ہے کہ دین اور تعلیم کا گہرا تعلق تو تھا ہی لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ امر بھی قابلِ ذکر ہے کہ تعلیم مخصوص درسگاہوں تک محدود نہ تھی بلکہ ہر پیشے اور طبقے کے لوگ بلا امتیازِ عہدہ و منصب پڑھتے بھی تھے اور پڑھاتے بھی تھے۔ اسی طرح نصابِ تعلیم کی پابندی بھی نہ تھی۔ ہر طالبِ علم اپنی پسند کا علم یا ہنر سیکھنے کے لئے آزاد تھا۔ پھر اُمراء اور اعلیٰ سرکاری عہدیدار علماء کی سرپرستی کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے اور علماء بھی تصنیف و تالیف میں پوری محنت اور تحقیق سے کام لیتے تھے حصولِ تعلیم اور تکمیلِ تعلیم کے لئے عمر کی کوئی قید نہیں تھی۔ بہت بعد جا کر خلافتِ عثمانیہ کے زمانے میں فارغ التحصیل ہونے کے لئے ایک خاص مدت کا تعین ہوا۔ شبلی نعمانی نے اپنے اس قسم کے مضامین کے ذریعے قوم اور معاشرے کو سدھارنے کی کوشش کی۔ انہوں نے مسلمانوں کے وہ تعلیمی کارنامے پیش کئے ہیں جن سے علوم و فنون میں گراں قدر اضافے ہوئے اور اس نظامِ تعلیم اور طریقۂ تعلیم کی صفات گنوائی ہیں جس پر عمل پیرا ہو کر مسلمان قوم دنیا کی انتہائی تعلیم یافتہ اور متمدن قوم بن گئی۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۸۹ | قدیم: پرانا۔ تصنیف: خود لکھی ہوئی کتاب۔ تالیف: مختلف کتابوں سے مضامین چن کر نئے پیرائے میں ترتیب دینا۔ تعلم: علم حاصل کرنا۔ نیچرل: فطری، قدرتی، سادہ اور حقیقی۔ بحث طلب: پیچیدہ، جن پر گفتگو کی گنجائش ہو۔ فہم: عقل۔ دسترس: پہنچ۔ سند: بیان کردہ حدیثِ نبویؐ کا حوالہ دینا یعنی راوی کون ہے؟ روایت: کسی کی بات زبانی نقل کرنا۔ یہاں مراد حدیثِ نبویؐ کی روایت ہے۔ یہ علم ان احادیث کی نقل و روایت پر مبنی ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب منسوب ہوں اور آپؐ کے قول، فعل، تقریر یا کسی صفت پر مبنی ہوں۔ جو شخص اپنی سند سے حدیث روایت کرتا ہو، خواہ مرد ہو یا عورت، اس کو راوی کہتے ہیں۔ تمدن: مل جل کر رہنے کا طریقہ، طرزِ معاشرت۔ مرتب: باقاعدہ، درست۔ نحو: وہ علم جس میں کلام

کی ترتیب کے اصول پر گفتگو ہوتی ہے۔ معانی : وہ علم جس سے الفاظ کے استعمال کا صحیح اور معانی کا درست یا نادرست ہونا معلوم ہوتا ہے۔ لغت : زبان و الفاظ کا علم۔ فقہ : علم دین، شرعی احکام کا علم۔ اصول : اصل کی جمع، ڈھنگ، قاعدہ، طریقہ، یہاں اصولِ فقہ یا اصولِ کلام مراد ہے، اصول فقہ، وہ علم ہے جس میں ان قواعد سے بحث کی جاتی ہے، جن کے تحت شرعی احکام، قرآن و سنت وغیرہ سے اخذ کئے جاتے ہیں۔ اصولِ کلام سے مراد، علم کلام میں مسائل کو دلائل عقلی سے ثابت کرنا ہے۔ حدیث : رسول کریمؐ کے قول اور فعل کی خبر یا بیان یا ذکر۔ حدیث کے لفظی معنی ہیں، بات، خبر، بیان، اطلاع، ذکر، روایت اور نقل۔ عام طور پر حدیث نبویؐ مراد ہوتا ہے یعنی وہ جملہ یا بات جو نبی کریمؐ (یا آپؐ کے صحابہ کرام) سے منسوب ہو۔ تاریخ : وہ علم جس میں ماضی کے اہم واقعات اور قوموں، ملکوں اور مشہور آدمیوں کے حالات بیان کئے جاتے ہیں۔ تاریخ کے لفظی معنی ہیں، وقت کی نشان دہی یا تعینِ وقت۔ اسماء الرجال : لفظی معنی ہیں لوگوں کے نام، اصطلاح میں وہ علم جس میں احادیث کے راویوں کے سچ اور جھوٹ سے بحث ہوتی ہے اور ان کے حالات و سیرت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ طبقات : وہ علم جس میں راویانِ حدیث کے مقام و مرتبہ کے اعتبار سے یا مشترک صفات کی وجہ سے مختلف درجے مقرر کر کے (مثلاً صحابہ کرام، تابعین، تبع تابعین وغیرہ) ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ متعلقات : تعلق رکھنے والے (دیگر علوم)۔ عقلی علوم : معقولات، وہ علوم جن کے استدلال کی بنیاد عقل پر ہے۔ مثلاً فلسفہ، علم الکلام اور فقہ وغیرہ۔ چنداں : اس قدر، کچھ۔ فلسفہ : وہ علم جس میں موجودات کی حقیقت جاننے کی کوشش کی جاتی ہے یا جس میں مادہ اور اس کے تغیرات اور اجسامِ ارضی و سماوی کی حقیقت اور لوازمات سے بحث ہوتی ہے۔ منطق : وہ علم جو قطعی دلائل سے حق کو حق اور ناحق کو باطل ثابت کرتا ہے۔ ٹیگس : (TAGUS) سپین کا سب سے بڑا دریا، عرب اسے دریائے تاجہ کہتے تھے۔ شہر طلیطلہ (TOLEDO) تین اطراف سے اس دریا کے گھیرے میں تھا۔

ص ۹۰ | حجازی فتوحات : حجاز، عرب کا ایک حصہ جس میں مکہ، مدینہ اور طائف شامل ہیں۔ حجازی فتوحات سے مراد خلفائے راشدین کے زمانے کی فتوحات ہیں، جب ان کے لشکروں نے عراق، شام، فلسطین، ایران، مصر اور دیگر ایشیائی اور افریقی ممالک تیزی سے فتح کئے۔ مفتوحہ : جن کو فتح کیا گیا۔ عمل دخل : قبضہ و اختیار۔ ریگستان : صحرا۔ ذوق : شوق، خوشی۔ حلقہ : گھیرا، احاطہ۔ سر رشتہ : محکمہ۔ اوپری : اجنبی۔ اخلاق : خُلق کی جمع، لفظی معنی، عادتیں، خصائل، انسانیت، مروت، ملنے جلنے کا مہذب طریقہ۔ اصطلاحاً وہ علم جس میں تہذیب نفس، تدبیر منزل اور ملکی سیاست کے اصول بیان کئے جاتے ہیں۔ معاشرت : مل جل کر رہنا۔ تمدن : مل جل کر

زندگی گذارنے کا طریقہ، انسانوں کے بڑے بڑے گروہوں کا ہل جل کر ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنا۔ تہذیب: شائستگی، خوش اخلاقی، عادات اور رہن سہن کی درستی اور آراستگی۔ عربی میں تہذیب کے معنی ہیں درختوں کی خراب شاخوں کو چھانٹنا تاکہ درخت میں زیادہ سرسبزی وشادابی آجائے۔ کسی قوم کی تہذیب کا مطلب ہے، اس قوم کے فکر وعمل کا خاص نظام، معاشرت یا لوازماتِ زندگی میں اصلاح، درستی اور زیبائش۔ چنداں: کچھ۔ مہر لگنا: تصدیق ہونا، چھاپ لگنا۔ علوم: علم کی جمع، جاننا، واقفیت۔ فنون: فن کی جمع، ہنر۔ مرو: روسی ترکستان کا ایک مشہور شہر۔ ہرات: افغانستان کا ایک شہر۔ نیشاپور: ایران کا ایک شہر۔ بخارا: روسی ترکستان کا ایک شہر۔ فارس: ایران کا ایک صوبہ۔ بغداد: عراق کا ایک شہر۔ اندلس: ملک سپین کا جنوبی حصہ جس پر مسلمانوں نے سات سَو سال حکومت کی۔ تحصیلی مدارس: سرکاری سکول۔ فیاض: سخی، بہت زیادہ خیرات دینے والا۔ خانقاہ: درویشوں اور مشائخ کے رہنے کی جگہ۔ حجرہ: کوٹھڑی، وہ خلوت خانہ جس میں بیٹھ کر عبادت کی جاتی ہے۔ علم کی تربیت: علم کی نشو ونما۔ قصر: محل۔ ایوان: محل۔ تذکرہ: وہ کتاب جس میں شاعروں کے مختصر حالات اور ان کا نمونۂ کلام ہوتا ہے اور ان کی شاعری پر رائے دی جاتی ہے۔ تراجم: ترجمہ کی جمع۔ اصطلاحی معنی، سوانح عمریاں۔ اسماء الرجال: وہ علم جس میں راویانِ حدیث کے صدق وکذب سے بحث ہوتی ہے اور ان کے حالات وسیرت پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ طبقات: وہ علم جس میں راویانِ حدیث کے مقام ومرتبہ کے مطابق درجے مقرر کر کے ان کے حالات لکھے جاتے ہیں۔ تخت گاہ: دار الخلافہ، دار السلطنت۔ تاتار: ترک اور مغل نسل کی ایک قوم جو ٹڈی دل کی طرح منگولیا سے اُٹھی۔ اس نے خلافتِ عباسیہ کو تباہ کر کے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ چنگیز خاں اور ہلاکو خاں، اسی نسل سے تعلق رکھتے تھے۔

غارت گری: تباہی وبربادی پھیلانا۔

ص ۹۱ نامور: مشہور لوگ۔ مجتہدین فن: کسی ہنر میں کوئی نئی راہ نکالنے والے۔ ہم عصر: ایک ہی زمانے کے۔ ڈاکٹر اسپرنگر: مشہور جرمن مستشرق (مشرقی علوم اور زبانوں کا ماہر یورپین) جس نے انگریزی اور جرمن زبان میں الگ الگ آنحضرتؐ کی سیرت لکھی۔ وہ ۱۸۱۳ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۳ء میں فوت ہوا۔ تخمینہ: اندازہ۔ اسماء الرجال: راویانِ حدیث کے حالات۔ قیاس: اندازہ۔ حلقۂ درس: تعلیم دینے کے لئے کسی استاد کی کلاس یا تعلیم پانے والوں کا مجمع۔ علامہ ذہبی: "تذکرۃ الحفاظ" اور تاریخ الاسلام کے مشہور مصنف حافظ شمس الدین ذہبی (وفات ۷۴۸ھ)۔ اجتہاد: نئی بات پیدا کرنا، غور وخوض سے کسی مسئلے کو حل کرنا۔ مستند: قابلِ اعتبار، سند پایا ہوا۔ مہذب: تہذیب یافتہ، شائستہ اطوار اور باتمیز۔ اِملا: استاد کا طالب علموں کو

اپنا لیکچر لکھانا۔ منبر: وعظ کہنے کا لکڑی کا زینہ جو عموماً مسجدوں میں ہوتا ہے۔ تحقیقات: غور و فکر کے بعد دریافت شدہ سچائیاں، حق کی تلاش یا چھان بین، جھوٹ سچ کا ثبوت۔ امالی: استاد کے کلاس نوٹس پر مبنی کتاب، جو طلباء سن کر تحریر کر لیا کرتے تھے۔ مسافت: فاصلہ۔ لائف: زندگی، سوانح عمری۔

ص ۹۲ فاضل: عالم۔ زحمت: تکلیف۔ قرطبہ: سپین کا مشہور شہر جو دریائے وادی الکبیر کے کنارے واقع ہے۔ صدیوں تک سلطنت بنی اُمیہ کا دارالحکومت رہا۔ وہ اپنی خوبصورتی اور علوم و فنون میں ممتاز حیثیت کی وجہ سے "اُندلس کی دلہن" کہلاتا تھا۔ فن کے کامل: ہنر میں کمال حاصل کرنے والے۔ خاک چھاننا: تلاش کرنا، آوارہ پھرنا۔ علامہ مقری: (وفات ۱۶۳۱ء) "نفح الطیب" (تاریخ اندلس) کا مشہور مصنف جو اندلس میں پیدا ہوا۔ سرگرمی: جوش و خروش۔ نظیر: مثال۔ مناظرہ: مذہبی بحث مباحثہ۔ اُمراء: امیر کی جمع، دولت مند، اونچے طبقے کے لوگ۔ فقہ: شرعی احکام کا علم، علمِ دین۔ ادب: ایسی تحریریں جو الفاظ اور معانی دونوں اعتبار سے اعلیٰ درجہ کی ہوں اور ان کا گہرا تعلق انسانی زندگی سے ہو۔ نظم و نثر سے متعلقہ علوم: ممتاز: نمایاں۔ تصفیہ: فیصلہ۔ نصابِ تعلیم: تعلیم کے لئے پڑھائی کا مقررہ کورس۔ پُر اثر: مؤثر۔ تحصیل: علم حاصل کرنا۔ سند: سرٹیفکیٹ۔ اجمالی: مختصر۔ طیلسان: کندھے پر ڈالنے کی چادر، عباسی علماء عمامے پر ایک کپڑا ڈالے رہتے تھے۔ جسے طیلسان کہتے تھے۔ یہ علمی فضیلت کی نشانی تھی۔ متعدد: کئی۔ نحو: وہ علم جس میں کلام کی ترتیب کے اصول پر گفتگو ہوتی ہے۔ صرف: حروف و حرکات کے اُدل بدل اور ہیر پھیر معلوم کرنے کا علم۔ وہ علم جس میں لفظوں کی ساخت اور ان کے اُدل بدل کے قواعد بتلائے جاتے ہیں۔ صرف و نحو: وہ علم جس میں لفظوں کا جوڑ توڑ اور ان کے بولنے برتنے کا قاعدہ بیان کیا جائے۔ لُغت: الفاظ کے معانی کا علم۔ معانی: وہ علم جس سے الفاظ کے استعمال کا صحیح اور معانی کا درست یا نادرست ہونا معلوم ہو۔ اسماء الرجال: وہ علم جس میں احادیث کے راویوں (بیان کرنے والوں) کے سچے یا جھوٹے ہونے کی بحث ہوتی ہے اور ان کے حالاتِ زندگی اور سیرت و کردار کا ذکر ہوتا ہے۔ فلسفہ: وہ علم جس میں عقلی استدلال کے ذریعے زندگی اور کائنات کے بارے میں حقائق بیان کئے جاتے ہیں۔ علم کلام: دینی عقائد کو عقلی دلیلوں سے ثابت کرنے کا علم۔ وہ علم جس میں مسائل نقلی کو عقلی دلائل سے ثابت کرتے ہیں۔ یا وہ علم جو مذہب کی تائید فلسفیانہ دلائل سے کرتا ہے۔

ص ۹۳ ہنوز: ابھی۔ پیہم: لگاتار، متواتر۔ سرگرم: پُرجوش۔ خاصہ: عادت، خصلت، خُو۔ تمدن: مل جل کر رہنا۔ کسی نظام کے ماتحت اکٹھے زندگی گزارنا۔ معاشرت: انسانی گروہوں کا مل جل کر رہنا۔ امام و پیشوا: رہبر۔ اُصولِ فقہ: وہ علم جس میں ان قواعد

سے بحث کی جاتی ہے۔ جن کے تحت شرعی احکام قرآن وسنت وغیرہ سے اخذ کئے جاتے ہیں۔
عجمی: غیر عرب، عرب اپنے علاوہ باقی تمام لوگوں کو عجمی (بمعنی گونگے) کہتے تھے کیونکہ وُہ خود کو فصیح البیان سمجھتے تھے۔ مقید: قید، بند۔ اہلِ منصب: عہدے دار۔ کثیر الاشتغال: بہت زیادہ کاموں میں مصروف۔ ابو علی سینا: بخارا کا رہنے والا اور ہمدان میں دفن مشہور فلسفی، طبیب، ریاضی دان اور سائنسدان۔ ۹۸۰ء میں پیدا ہؤا اور ۱۰۳۷ء میں فوت ہؤا۔ اس کی فلسفہ، منطق اور مابعد الطبیعات پر مشہور کتاب کا نام "الشفا" ہے۔ اور طب میں اس کی مشہور تصنیف "القانون فی الطب" ہے جو چھ سو سال تک مشرق ومغرب کی طبی درسگاہوں میں نصابی کتاب کے طور پر پڑھائی جاتی رہی۔
مستعد: چست، باہمت، موجود، تیار۔ اہلِ کمال: ہنر مند لوگ، لیاقت یا مہارت رکھنے والے۔
زمرہ: جماعت، گروہ، اُمراء: ارکانِ سلطنت، حاکم، رئیس، دولتمند۔ اہلِ منصب: بڑے عہدیدار۔ پایہ شناس: مرتبہ جاننے والا، رتبہ پہچاننے والا۔ اشاعت: پھیلاؤ۔ سلاطین: سلطان کی جمع، بادشاہ، وزراء: وزیر کی جمع۔ رئیس: دولت مند۔ ادیب: نظم ونثر کے متعلقہ علوم کا ماہر۔ لفظی معنی، ادب اور سلیقہ سکھانے والا۔ فاضل: عالم۔ بدل: معاوضہ۔ ذاتی کمال: ذاتی لیاقت یا مہارت۔ قبولِ عام: لوگوں کو پسند آنا۔ دام: مول۔

ص ۹۴ | تصنیفات: تصنیف کی جمع، ادیب یا شاعر کی اپنی لکھی ہوئی کتابیں۔ طبع زاد کتابیں۔ زورِ طبع: خیال یا مضمون پیدا کرنے کی قوت۔ تحقیق: علمی حقیقت دریافت کرنا۔ صاحب النظر: دانا۔ دُور اندیش۔ نکتہ چیں: عیب نکالنے والا یعنی میکھ نکالنے والا، اعتراض کرنے والا۔ دفعتاً: اچانک، فوراً۔ نصاب تعلیم: علم کا مقررہ کورس۔ وسعت: پھیلاؤ۔ قاعدہ: اصول وضوابط۔ سلطنت عثمانیہ: ترکوں کی اسلامی حکومت جس کا دار الحکومت قسطنطنیہ (ترکی میں) تھا، بیسویں صدی کے اوائل تک یہ عظیم الشان سلطنت قائم رہی تا آنکہ مصطفےٰ کمال پاشا نے خلافتِ عثمانیہ ختم کر کے ترکی کو مغربی طرز کی لادینی جمہوریہ بنا دیا۔ فارغ التحصیل: تعلیم پا لینے کے بعد۔ معیّن: مقرر۔ مغرب: یہاں اس سے مراد شمالی افریقہ کے ممالک ہیں جو مسلمانوں نے فتح کئے۔ یہ ممالک عرب کے مغرب میں واقع ہیں۔ مغرب سے مراد یورپین ممالک بھی لئے جاتے ہیں۔ مراکو: اسلامی ملک مراکش جو شمالی افریقہ میں واقع ہے۔ ٹیونس: اسلامی ملک جو شمالی افریقہ میں واقع ہے۔
اِملا: اُستاد کا کلاس روم میں لکھوایا ہؤا یا زبانی دیا گیا لیکچر، جو طلباء نوٹ کر لیتے تھے۔ ابتر: خراب، پریشان۔ مقصود بالذات: اپنی جگہ خود مقصد ہونا۔ نحو: وہ علم جس میں کلام یا عبارت کی ترتیب کے اصول پر گفتگو ہوتی ہے۔ صرف: وہ علم جس میں لفظوں کی ساخت اور ان کے ادل بدل کے قواعد بتائے جاتے ہیں۔ منطق: وہ علم جو قطعی دلائل سے حق کو حق اور باطل کو باطل ثابت کرتا ہے

امثال: مثل کی جمع، کہاوتیں، قصّے۔ اہتمام: خاص کوشش۔ موشگافیاں: چھان بین، باریک بینی۔ نذر ہونا: بھینٹ چڑھنا، سپرد ہونا۔ مقصودِ اصلی: حقیقی مطلب۔ ضرر: نقصان۔ کتابی تعلیم: وہ تعلیم جس میں عبارت آرائی پر زیادہ زور ہو۔ متعلقات: تعلق رکھنے والی چیزیں۔ فلسفہ: وہ علم جس میں عقلی دلائل سے زندگی اور کائنات کی حقیقت سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ رسائی: پہنچ۔ انقلاباتِ حکومت: حکومت میں آنے والی تبدیلیاں، حکمرانوں کا بدل جانا۔

ص ۹۵ کلیتاً: پورے کا پورا۔ آثار: نشانیاں، علامتیں۔ مواضع: موضع کی جمع، جگہیں۔ غصب کرنا: زبردستی قبضہ کر لینا۔ ہلاکو خان: مشہور تاتاری حکمران جو چنگیز خاں کی اولاد میں سے تھا اور ۱۲۵۸/۶۵۶ھ میں جس نے بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا کر سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔ غارت: تباہ و برباد۔ بے چراغ کرنا: ویران اور تباہ و برباد کرنا۔ اوقاف: وقف کی جمع، وقف کی ہوئی چیزیں مثلاً مدرسہ یا مسجد کے لئے کوئی جائیداد۔ محقق طوسی: مشہور فلسفی اور عالم ریاضی خواجہ نصیر الدین محقق، جو طوس کے رہنے والے تھے (طوس خراسان میں واقع ہے) اور جنہیں ہلاکو کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا۔ ہلاکو ان کے ہر مشورہ پر عمل کرتا تھا۔ رصد خانہ: ستاروں کی گردش کا حال معلوم کرنے کی جگہ۔ رَصَد، راصد کی جمع ہے بمعنی دیکھنے والے۔ رصد کا مطلب ستاروں کا مشاہدہ کرنے کا مینار۔ استحکام: مضبوطی۔ عظمت و جلال: بڑائی اور رعب داب۔ تعمیر: بنانا۔ فیاضی: سخاوت۔ آرٹیکل: مضمون۔ پیمانہ: معیار۔ ایجادات: نئی نئی چیزیں بنانا۔ صنائع: صنعت کی جمع، بنائی ہوئی چیزیں۔ عالمگیر: جس کا پوری دنیا پر قبضہ ہو۔ دار العلوم: یونیورسٹی۔ معمور: بھرا ہؤا۔ دروس: درس کی جمع، سبق دینے کی جگہ کو حلقۂ درس کہتے ہیں۔ علوم و فنون: بہت سے علم اور ہنر۔ قصداً: جان بوجھ کر، ارادہ کر کے۔ سلف: اگلے زمانے والے، گذشتہ بزرگ، آباؤ اجداد۔ آب و تاب: چمک کر۔ چہرے پر نہیں کھلتا: اثر ظاہر نہیں ہوتا، یقین نہیں آتا۔ مفاخر: مفخرہ کی جمع۔ فخر کے قابل باتیں۔

سبق کا خلاصہ

اسلامی ممالک میں تصنیف و تالیف کا باقاعدہ آغاز ۱۴۵ھ میں ہؤا۔ اس سے پہلے تعلیم کا انداز سادہ تھا اور عربوں کی طرزِ زندگی سے مطابقت رکھتا تھا۔ علوم عام طور پر زبانی یاد رکھے جاتے تھے اور طرزِ تعلیم، سَنَد اور روایت پر مبنی ہوتا تھا۔ ایک صدی کے اندر اندر تہذیب و تمدّن نے بہت ترقی کی اور اسی نسبت سے تعلیم کا دائرہ بھی وسیع ہؤا۔ اس دور میں جو علوم رائج ہوئے وہ نحو، معانی، لُغت، فقہ، اصول، حدیث، اسماء الرّجال، طبقات اور ان کی شاخیں تھیں۔ علومِ معقولات

ابھی عام نہیں ہوئے تھے کیونکہ فلسفہ اور منطق کے بارے میں رائے متعصبانہ تھی۔

البتہ دوسری صدی ہجری کے وسط سے شروع ہونے والا دور تعلیمی اعتبار سے بے حد اہم ہے۔ اس دور میں مسلمان اُندلس سے لے کر سندھ تک حکومت کر رہے تھے اور انہوں نے اپنے مفتوحہ علاقوں میں جابجا علمی مراکز قائم کرنا شروع کر دیئے۔ عربی حکمرانوں نے اگرچہ حکومتی سطح پر تعلیم کا بندوبست نہیں کیا تھا، لیکن بستی بستی، گاؤں گاؤں مکتب موجود تھے جو مسجدوں، خانقاہوں اور علماء کے ذاتی مکانوں میں قائم تھے۔ اگرچہ اس زمانے کے تعلیم یافتہ لوگوں کی صحیح تعداد تو معلوم نہیں لیکن ہزاروں کتابیں جو تذکروں، تراجم، اسماء الرجال اور طبقات پر مشتمل ہیں یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہیں کہ اس زمانے میں تعلیم عام تھی۔ اسلامی سلطنتوں کے زوال، اندلس سے مسلمانوں کے اخراج اور تاتاریوں کی غارت گری کے باوجود جو کتابیں بچ گئی ہیں، ان سے سینکڑوں ماہرینِ فن اور علماء کے کمالات کا پتہ چلتا ہے۔ ڈاکٹر اسپر نگر نے مسلمانوں کے اسماء الرجال کی تعریف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ اس سے پانچ لاکھ علماء کے حالات مل سکتے ہیں۔

اگر اُس زمانے کے مشہور علماء کے تعلیمی حالات پڑھے جائیں تو معلوم ہو گا کہ ایک استاد کے حلقۂ درس میں ہزاروں طالب علم شامل ہوتے تھے۔ علامہ ذہبی لکھتے ہیں کہ اس زمانے کے بعض حلقۂ درس میں دس دس ہزار سے زائد دواتیں رکھی جاتی تھیں جن سے لوگ احادیثِ نبوی لکھتے تھے۔ اس بڑے مجمع میں دو سو امام حاضر ہوتے تھے جو اجتہاد اور فتویٰ دینے کی پوری قابلیت رکھتے تھے۔ اس دور میں طریقِ تعلیم وہی تھا، جو آج کے مہذب ملکوں میں رائج ہے یعنی کلاس روم میں لیکچر دینا۔ اسے املا کہتے تھے۔ استاد کرسی یا منبر پر بیٹھ کر کسی فن کے مسائل زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا اور طالبعلم استاد کی گفتگو کو ساتھ ساتھ لکھتے جاتے تھے۔ اس طرح ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی، جو امالی کہلاتی تھی۔

جو شخص بھی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتا وہ دور دراز کے سفر کر کے اہلِ کمال کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ بغداد، نیشاپور، قرطبہ اور دیگر مشہور شہروں میں ہر فن کے کامل موجود ہوتے تھے جو خود بھی مشرقی اور مغربی ممالک میں پہنچ کر علم حاصل کرتے تھے۔

علامہ مقری نے تاریخ اندلس میں ان علماء کے حالات لکھے ہیں جو اندلس سے مصر و شام و عراق گئے یا ان ممالک سے چل کر سپین آئے۔ تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسلمانوں نے جس جوش و خروش سے سفر کئے ہیں، انسانی تاریخ اس کی کوئی مثال نہیں پیش کر سکتی۔ اہلِ علم کی خدمت میں حاضر ہونے کے علاوہ اعلیٰ تعلیم کے لئے دوسری لازمی چیز مناظرے کی محفلوں میں شرکت تھی۔ مذہبی مسائل پر بحث و مباحثہ کے لئے مشہور شہروں میں خاص اوقات اور مقامات مقرر تھے بعض امراء اپنے گھروں

پر ایسی مجالس منعقد کرتے تھے۔ فقہ، ادب اور نحو کے لئے علیحدہ مجالس ہوتی تھیں جن میں علماء اور طلباء دونوں شریک ہوتے تھے اور کوئی ممتاز عالمِ دین بحث کا فیصلہ کرنے کے لئے بطور منصف مقرر کیا جاتا تھا۔ یہ جلسے عام نصابِ تعلیم کے مقابلے میں زیادہ مفید ثابت ہوتے تھے۔ تعلیم سے فراغت پانے کے بعد طالب علم کو استاد کی طرف سے تحریری سند ملتی تھی جس میں اس کی تعلیم کی مختصر کیفیت اور درس دینے کی اجازت لکھی ہوتی تھی۔ اس سند میں طالب علم کو قبائے فضیلت پہننے کی اجازت بھی درج ہوتی جو علماء کا مخصوص لباس تھا۔

مسلمانوں میں تعلیم پھیلنے کے کئی اسباب تھے۔ اوّل تو تعلیم مذہب کا لازمی جزو تھی۔ قرآن و حدیث سے واقفیت حاصل کرنے کیلئے عربی زبان کا سیکھنا ضروری تھا علم الکلام کی وجہ سے فلسفہ سے دلچسپی بڑھ گئی۔ یہ شغف اتنا بڑھا کہ مسلمان تمام علوم و فنون میں دلچسپی لینے لگے۔ عربوں کے علاوہ دیگر نو مسلموں نے بھی تعلیم کو دلی ذوق و شوق کے ساتھ حاصل کرنا شروع کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علمی میدانوں میں عربوں سے بھی زیادہ سرگرمی دکھائی ہے۔ اسی لئے نحو، لغت، حدیث، اصولِ فقہ اور فلسفہ کے امام تقریباً سب کے سب عجمی ہیں۔ دوم یہ کہ تعلیم مساجد اور علماء کی خصوصی درسگاہوں تک محدود نہ تھی۔ وزیر، حاکم، فوجی افسر، سرکاری عہدیدار، غرضیکہ ہر طبقے کے لوگ پڑھتے پڑھاتے رہتے تھے۔ بوعلی سینا جیسا معروف وزیر بھی اپنے طلباء کے لئے وقت نکالتا تھا، جو اس سے پڑھنے کے لئے اس کے پاس پہنچتے تھے۔ سوم یہ کہ تعلیم میں نصاب کی قید نہیں تھی۔ یہ بالکل آزاد تھی، جو شخص جس خاص فن یا علم میں دلچسپی رکھتا تھا، اُسی کو حاصل کرتا تھا۔ علماء بھی خاص خاص علوم و فنون میں کمال حاصل کرتے تھے اور ضروری نہیں تھا کہ ہر عالم، ہر فن مولا ہو۔ چہارم یہ کہ حکام اور اعلیٰ عہدیدار خود بھی تعلیم یافتہ ہوتے تھے اور اہلِ علم کے قدردان تھے۔ معمولی سے معمولی رئیس کے ہاں سینکڑوں ادیب اور شاعر موجود رہتے تھے۔ جن کی عزت ان کے کمال فن کی وجہ سے کی جاتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ لوگوں میں لیاقت اور شہرت حاصل کرنے کی عام خواہش پیدا ہو گئی تھی تصنیف و تالیف میں بھی تحقیق اور علمی دیانت کا لحاظ رکھا جاتا تھا کیونکہ جن لوگوں کے سامنے وہ کتابیں آتی تھیں، وہ خود بھی بڑے صاحبِ بصیرت اور سچے نقاد ہوتے تھے۔

اسلامی ممالک میں حکومتی مدارس کے قیام سے کوئی نمایاں تبدیلی رونما نہیں ہوئی۔ نصابِ تعلیم پہلے جیسا آزاد ہی رہا۔ البتہ آہستہ آہستہ مدرسوں میں بعض نئے قواعد و ضوابط کی پابندی کرائی جانے لگی۔ سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں تعلیم کے لئے ایک قانون پاس کیا گیا۔ آٹھویں صدی ہجری کے پہلے تعلیم سے فارغ ہونے کے لئے مدت کا تعین بھی کر دیا گیا۔ املا کا طریقہ بھی چھوڑ دیا گیا اور وہ علوم و فنون جو زیادہ اہم نہ تھے مثلاً نحو، صرف، منطق اور امثال وغیرہ، ان کی تعلیم پر

زیادہ زور دیا جانے لگا اور ان کی جزئیات پر زیادہ توجہ صرف ہونے لگی۔ زبانی تعلیم کی بجائے کتابوں پر انحصار بڑھنے لگا۔ پہلے دونوں ادوار میں فن کی تعلیم زبانی دی جاتی تھی لیکن تیسرے دور میں کتابی علم کی بنیاد پڑی جس میں اصل مسائل پر توجہ دینے کی بجائے کتاب کی عبارت اور دیگر متعلقات پر بحث ہوتی تھی۔ فلسفہ اور منطق کی تعلیم بھی مدارس میں ختم کر دی گئی۔

اسلامی ممالک میں حکومتوں کی تبدیلیاں عام بات تھی لیکن ان کا علمی مقاصد پر بُرا اثر نہیں پڑا۔ اگر ایک خاندان سے حکومت چھنتی تھی تو اس کی علمی یادگاریں محفوظ رہتی تھیں۔ نئی حکومت، پرانی حکومت کے اوقاف کو نہیں چھیڑتی تھی بلکہ اپنی نیک نامی برقرار رکھنے کے لئے تعلیم کو مزید فروغ دینے کے لئے عطیات دیتی تھی۔ ہلاکو خاں نے بھی جس نے بغداد کو تباہ و برباد کر دیا اور جو اپنی وحشت و بربریت کے لئے بدنام ہے، تمام اوقاف محقق طوسی کے حوالے کئے جن سے حاصل کردہ آمدنی سے انہوں نے رصد گاہیں تعمیر کیں۔ سرکاری سرپرستی میں چلنے والے مدارس کے علاوہ پرائیویٹ تعلیم گاہوں کی مقبولیت کم نہیں ہوئی، چنانچہ مصر میں بے شمار حکومتی مدارس اور دارالعلوم الازہر کی موجودگی کے باوجود ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ دروس تھے، جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔

ہمارے اسلاف کے کارنامے اس سے بھی بڑھ چڑھ کر ہیں، جن کی ایک جھلک موجودہ مضمون میں دکھائی گئی ہے لیکن اب قوم کے افراد کی حالت یہ ہو گئی ہے کہ انہیں ان باتوں کا یقین نہیں آتا۔ اپنے آباؤ اجداد کے قابلِ فخر کارنامے بیان کرنے کا فائدہ جبھی ہے، اگر ہم خود بھی ان کی تقلید کرتے ہوئے کچھ کر کے دکھائیں۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درجِ ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

انقلاباتِ حکومت جو کثرت سے ممالکِ اسلامی میں ہوا کئے، علمی مقاصد کے لئے اکثر مفید ثابت ہوئے۔ ایک خاندان گو کلیتًا برباد ہو جاتا تھا مگر اس کے علمی آثار اکثر محفوظ رہتے تھے۔ جو مواضع اور علاقے، مدرسوں پر پہلے وقف ہو چکے ہوتے تھے، دوسری نئی حکومت ان کو غصب نہیں کر سکتی تھی۔ ہلاکو خاں نے نہ صرف بغداد کو غارت کیا بلکہ تمام ممالکِ اسلامی کو برسوں تک بے چراغ کر دیا۔ تاہم تمام اوقاف محقق طوسی کے ہاتھ میں دیئے جس کا بہت بڑا حصہ، محقق موصوف نے رصد خانے کی تعمیر میں صرف کیا۔ ممالک اسلامی میں جب کوئی نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو اس کو استحکامِ سلطنت اور عظمت و جلال قائم رکھنے کے لئے ضرور تھا کہ مدرسوں کی تعمیر اور

علم کی اشاعت میں پچھلی حکومتوں سے زیادہ فیاضیاں دکھائے۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت "شبلی نعمانی" کے مضمون "مسلمانوں کا قدیم طرزِ تعلیم" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق شبلی نعمانی اس عبارت سے پہلے بتاتے ہیں کہ اسلامی ممالک میں تعلیم کو بڑی اہمیت دی جاتی تھی۔ اسلام کی ابتداء کے زمانے میں تعلیم کا کام زبانی ہوتا تھا اور طرزِ تعلیم سند اور روایت پر مبنی ہوتا تھا۔ ڈیڑھ صدی بعد تصنیف و تالیف کا رواج شروع ہوا حکومت کی طرف سے سرکاری سطح پر تعلیم کا بندوبست نہ ہونے کے باوجود گھر گھر تعلیم کا چرچا تھا اور ہر شہر اور گاؤں میں مدرسے موجود تھے۔ طالب علم، تعلیم کے حصول کے لئے دُور دراز کا سفر اختیار کرتے تھے اور ہر اہلِ کمال کے درس میں شریک ہو کر فیضیاب ہوتے تھے۔ مسلمانوں میں تعلیم کا شوق اُن کے مذہب نے پیدا کیا۔ پھر ہر طبقے کے لوگوں میں پڑھنے پڑھانے کا شوق تھا۔ علاوہ ازیں تعلیم میں نصاب کی پابندی نہیں تھی اور جو شخص جس علم میں دلچسپی رکھتا تھا، اُسی کو حاصل کرتا تھا سلطنتِ عثمانیہ کے زمانے میں لازمی تعلیم کا ایک قانون پاس کیا گیا اور اس کے لئے مدت کا تعین بھی کر دیا گیا۔ اِملا کا طریق چھوڑ دیا گیا۔ ضمنی اور غیر اہم علوم و فنون پر زیادہ توجہ دی جانے لگی اور زبانی تعلیم کی بجائے کتابی تعلیم کا رواج پڑا جس میں کتاب کی عبارت اور دیگر متعلقات بحث ہوتی تھی۔

موجودہ عبارت کے بعد شبلی نعمانی کہتے ہیں اسلامی ممالک میں بے شمار سرکاری مدارس کی موجودگی کے باوجود پرائیویٹ درسگاہوں کی مقبولیت کم نہیں ہوئی۔ چنانچہ مصر میں حکومتی مدارس اور دارالعلوم الازہر کے پہلو بہ پہلو ایک جامع مسجد میں چالیس سے زائد حلقۂ درس تھے، جن میں ہر قسم کے علوم و فنون پڑھائے جاتے تھے۔ شبلی بتاتے ہیں کہ ہمارے اسلاف کے کارنامے اس سے بھی زیادہ ہیں جتنے کہ اس مضمون میں دکھائے گئے ہیں لیکن ہماری قوم کی اب یہ حالت ہو گئی ہے کہ اسے ان باتوں کا یقین ہی نہیں آتا۔ یوں بھی ان کارناموں کے ذکر کا کیا فائدہ جب ہم نے خود ہی کچھ نہیں کیا۔

تشریح اسلامی ملکوں میں حکمرانوں کے بدل جانے سے جو تبدیلیاں رونما ہوتی تھیں، وہ علم و ادب کے لئے کافی فائدہ مند ثابت ہوتی تھیں، کیونکہ حکومت کی تبدیلی سے حکمران خاندان اگرچہ مکمل طور پر تباہ ہو جاتا تھا لیکن وہ علوم و فنون کے میدانوں میں اپنی جو نشانیاں چھوڑ جاتا تھا، وہ ضائع نہیں ہوتی تھیں۔ مدرسوں کے اخراجات پورے کرنے کے لئے پرانی حکومت کی طرف سے جو زمین اور جائیداد وقف کی جاتی تھی، اُسے نئی حکومت زبردستی اپنے قبضے میں نہیں لیتی تھی۔ مثلاً چنگیز خاں کی اولاد میں ہلاکو خاں بڑا سفاک

حکمران سمجھا جاتا ہے جس نے ایک ایک کر کے بیشتر اسلامی ملکوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تھی۔ لیکن اوقاف کو اس نے بھی نہیں چھیڑا اور انہیں اپنے وقت کے مشہور فلسفی اور عالم ریاضی خواجہ نصیر الدین محقق طوسی کے حوالے کر دیا۔ محقق طوسی کو ہلاکو خاں کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اور ہلاکو خاں ان کے ہر مشورے پر عمل کرتا تھا۔ محقق طوسی نے اس وقف جائیداد کی آمدن سے ستاروں کی گردش کا حال دریافت کرنے کے لئے جا بجا رصد گاہیں تعمیر کرائیں۔ اسلامی ملکوں میں جب بھی پرانی حکومت کا تختہ الٹتا تھا اور نئی حکومت قائم ہوتی تھی تو وہ اپنی سلطنت کو مضبوط بنانے اور اپنی بڑائی اور رعب داب قائم کرنے کے لئے پچھلی حکومت کے مقابلے میں زیادہ تعداد میں مدارس تعمیر کرانے اور علوم و فنون کے فروغ میں زیادہ سخاوت اور دریا دلی کا مظاہرہ کرنے کی کوشش کرتی تھی۔

عبدالحق (۱۸۷۰ء - ۱۹۶۱ء)

قائداعظم اور اُردو

تعارف اور پس منظر

بابائے اردو، مولوی عبدالحق کا یہ مضمون" قائد اعظم اور اُردو" سب سے پہلے ماہنامہ "قومی زبان" کراچی کے شمارہ ۱۹۴۹ء میں شائع ہوا اور اس کے بعد کئی اور رسائل میں بھی نقل ہوا۔ اس مضمون میں مولوی عبدالحق نے، اردو زبان اچھی طرح نہ جاننے کے باوجود قائد اعظم کے اُردو زبان سے لگاؤ کا ذکر کیا ہے کیوں کہ یہ زبان برصغیر پاک و ہند کے مختلف حصوں میں بخوبی بولی اور سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں اُردو ہندی تنازعہ چل رہا تھا اور اس مسئلے نے سیاسی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ آل انڈیا نیشنل کانگرس اگرچہ خود کو قومی جماعت کہتی تھی، لیکن اس میں ہندوؤں کو بالادستی حاصل تھی، اسی لئے جب آزادی کے بعد ہندوستان کی سرکاری زبان طے کرنے کا مسئلہ اُٹھا تو ہندو لیڈروں کے اصرار پر ہندی کو قومی زبان قرار دیا گیا۔ آل انڈیا مسلم لیگ، غیر مسلم ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی اور حقیقی نمائندہ جماعت تھی لیکن اس میں مسلمان بنگالی لیڈروں کا خاصا اثر رسوخ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب علامہ اقبال اور میاں بشیر احمد بیرسٹر ایٹ لا، ایڈیٹر رسالہ "ہمایوں"، کو معلوم ہوا کہ کانگرسی لیڈر مولوی عبدالحق سے اردو زبان کے مسئلے پر کوئی سمجھوتہ کرنے والے ہیں تو انہوں نے بابائے اُردو پر زور دیا کہ وہ مسلم لیگ کے صدر قائد اعظم محمد علی جناح سے ملیں اور ان سے اُردو زبان کی اہمیت پر تبادلۂ خیال کریں۔ دوسری طرف انہوں نے قائد اعظم سے درخواست کی کہ مولوی عبدالحق کو بلا کر ان سے اردو زبان کے مسئلے پر گفتگو کریں۔ قائدِ اعظم نے یہ بات مان لی اور یوں ان کی مولوی عبدالحق سے پہلی ملاقات کی راہ ہموار ہوئی۔

مولوی عبدالحق اردو زبان کے معاملے میں بڑے جذباتی تھے۔ وہ ہر اس شخص کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہو جاتے تھے جو اردو زبان کی حمایت کرتا تھا اور ہر اس آدمی سے بگڑ جاتے تھے جو اردو کی مخالفت کرتا تھا۔ اردو زبان و ادب کی خدمت کو انہوں نے اپنی زندگی کا مشن بنا لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب گاندھی جی نے اردو کے مقابلے ہندی زبان کو دفتری زبان

بنانے کا اعلان کیا تو مولوی عبدالحق ان کے مخالف ہو گئے اور جب قائد اعظم نے انہیں ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کونسل کے اجلاس لکھنؤ کے موقع پر یاد کیا تو فوراً ان سے ملاقات کے لئے گئے۔
مولوی صاحب کی قائد اعظم سے جتنی بھی ملاقاتیں ہوئیں ان میں انہوں نے اردو زبان کی ترقی، اردو زبان کو قومی زبان بنانے، اُردو زبان کو ذریعۂ اظہار بنانے اور اُردو میں کتابیں شائع کرنے پر تبادلۂ خیال کیا۔ جب بھی انجمن ترقی اُردو کے معاملات میں انہیں قائدِ اعظم کی امداد کی ضرورت پڑی، انہوں نے بلا تامل اُن سے رجوع کیا۔ چنانچہ انجمن ترقیٔ اُردو دہلی کی عمارت کے لئے نظام حیدر آباد دکن سے چندہ وصول کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی تو انہوں نے خود قائد اعظم کی خدمت میں حاضر ہو کر تحریری سفارش کی درخواست کی۔ اسی طرح قیام پاکستان کے بعد انجمن ترقیٔ اُردو کو اپنے دفاتر قائم کرنے کے لئے عمارت ملی تو اس کے افتتاح کے لئے بھی انہوں نے قائد اعظم سے رجوع کیا۔ قائد اعظم نے جب بھی اُردو میں تقریر کی، مولوی عبدالحق نے ان کے اس اقدام کو سراہا۔ انہوں نے انجمن کی طرف سے جو کتابیں شائع کی تھیں، ان کی تفصیل بھی قائدِ اعظم کو بتائی۔ اُردو زبان کے معاملے میں وہ ذرا سی مخالفت بھی برداشت نہیں کرتے تھے، چنانچہ قائد اعظم سے پہلی ملاقات کے بعد اگلے روز مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں اُردو کے حق میں انہوں نے عبدالرحمٰن صدیقی سے جو قرارداد منظوری کے لئے پیش کروائی، اس میں بنگالی لیڈروں کی مخالفت کے باوجود ترمیم کرنے پر آمادہ نہ ہوئے۔ گو نواب اسمٰعیل خاں نے قرارداد کو متفقہ طور پر پاس کروانے کے لئے اس میں تھوڑی سی تبدیلی کر لی لیکن مولوی عبدالحق نے خاموش رہ کر اپنی ناراضی کا اظہار کیا۔
اس مضمون میں انہوں نے واضح کیا ہے کہ قائد اعظم اُردو کو پاکستان کی قومی زبان بنانے کے حق میں تھے اور اس کی ترویج و اشاعت کے لئے ہر مدد کے لئے تیار رہتے تھے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۹۶ | تحریک: کسی مقصد کا پروگرام بنا کر اُسے چلانا۔ لفظی معانی، حرکت دینا۔ کسی بات کو شروع کرنا۔ انڈین نیشنل کانگرس: ۱۸۸۵ء میں قائم ہونے والی ہندوستان کی ایک سیاسی جماعت جس میں ہندو اور مسلمان دونوں قوموں کے لوگ شامل تھے۔ ابتداء میں اس کا مقصد ہندوستانیوں کو سیاسی حالات سے باخبر کرنا تھا۔ بعد میں درجہ بدرجہ پُر امن طریقوں سے انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اس کے مقاصد میں شامل ہو گیا۔ گاندھی جی، پنڈت جواہر لعل نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد اس کے نمایاں لیڈروں میں سے تھے۔ مسلم لیگ: غیر منقسم ہندوستان میں مسلمانوں کی سب سے بڑی سیاسی جماعت جو ۱۹۰۶ء میں قائم ہوئی۔ ابتداء میں اس کا مقصد

مسلمانوں کے سیاسی، معاشی اور معاشرتی حقوق اور مفادات کا تحفظ تھا لیکن بعد میں جب قائدِ اعظم محمد علی جناح اس کے لیڈر بنے تو انہوں نے دو قومی نظریہ پیش کر کے ایک الگ وطن پاکستان کا مطالبہ کیا اور اسے حاصل کر دکھایا۔ سر سیّد احمد خاں کے جانشین نواب وقار الملک اور سر آغا خاں اس کے بانیوں میں سے تھے اور علاّمہ اقبال اور نواب زادہ لیاقت علی خاں اس کے نمایاں راہنما تھے۔ خلافت: ترکی میں عثمانی سلطنت کے آخری حکمران سلطان عبد الحمید کی خلافت برقرار رکھنے کے لئے پہلی جنگِ عظیم کے بعد مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کی سربراہی میں ہندی مسلمانوں نے تحریکِ خلافت کا آغاز کیا۔ ۱۹۲۱ء میں یہ تحریک اپنے عروج پر پہنچی اور ۱۹۲۴ء میں مصطفٰے کمال پاشا کی طرف سے سلطان عبد الحمید کی معزولی اور ترکیہ کو ایک لادینی جمہوریہ قرار دیئے جانے کے بعد یہ تحریک ختم ہو گئی۔ سروکار: واسطہ، تعلق۔ مردِ میدان: بہادر، دلیر۔ شرف: عزت، فخر۔ شملہ: ہندوستان کا ایک صحت افزا مقام جو موسمِ گرما میں حکومتِ ہند کا صدر مقام ہوتا ہے۔ کونسل: کسی جماعت کے وہ افراد جو پالیسی امور میں صلاح مشورہ دیتے ہیں۔ ممنون: احسان مند، شکر گزار۔ "ہمایوں": ایک ماہوار علمی و ادبی رسالہ جو لاہور سے نکلتا تھا اور میاں بشیر احمد اس کے مدیر تھے۔ بہ تاکید: زور دے کر۔

ص ۹۷ | قیاس: اندازہ۔ تحریک: کسی بات کو شروع کرنا یا حرکت دینا۔ اندیشہ: فکر، خدشہ۔ ہندی والے: وہ حضرات جو ہندی زبان کو (اُردو کی بجائے) آزادی کے بعد پورے ہندوستان کی قومی زبان بنانا چاہتے تھے۔ عبد الرحمٰن صدیقی: ایک مخلص سیاسی لیڈر جنہوں نے اَن تھک سیاسی جدوجہد کی۔ وہ علی گڑھ کالج کے تعلیم یافتہ تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد کراچی آ گئے اور وہیں فوت ہوئے۔ کچھ عرصہ کیلئے مشرقی بنگال کے گورنر بھی رہے۔ رفاقت: ساتھ۔ احباب: دوست۔ ریزولیوشن: قرار داد، تجویز۔ علیک سلیک: سلام دعا۔ مسوّدہ: کسی کتاب یا مضمون کی اصل تحریر، عربی میں اس کا تلفظ مُسَوَّدَہ ہے لیکن اردو میں مُسَوَّدہ رواج عام پا چکا ہے۔ حشر ہونا: بُرا حال ہونا۔ ارکان: رکن کی جمع، ممبران۔ اشاعت: پھیلاؤ۔ ترویج: رائج کرنا، رواج دینا، جاری کرنا۔

ص ۹۸ | پھُر سے اُڑنا: تیزی سے پہنچنا۔ مولانا اکرم خاں: مشرقی پاکستان کے مشہور سیاسی لیڈر، صحافی اور روزنامہ "اتفاق"، ڈھاکہ کے مدیر تھے۔ فصیح: خوش بیان، شیریں کلام، جس کی گفتگو صاف، رواں اور مؤثر ہو۔ لچھے دار: مسلسل اور پیچیدہ گفتگو، مزے دار اور تہ در تہ باتیں۔ موافقت: حمایت۔ ہنگامہ برپا ہونا: شور و غل اور جھگڑا فساد۔ بات بڑھنا: کسی معاملے کا جلد ختم نہ ہونا۔ نواب اسمٰعیل خاں: مسلم لیگ کے ایک سرکردہ رہنما۔ کثرتِ رائے: اجلاس میں شریک لوگوں میں سے زیادہ کی رائے۔ قرار داد: تجویز۔ بالاتفاق: جس پر سب کا اتفاق ہو، جس کی کوئی مخالفت

نہ کرے۔ نو نو: نہیں نہیں۔ چارہ: علاج، تدبیر۔ انجمن: انجمن ترقی اردو جس کے کرتا دھرتا مولوی عبدالحق (بابائے اُردو) تھے۔ اسے ابتداء میں انہوں نے حیدرآباد دکن میں قائم کیا۔ پھر دلی لے آئے اور قیامِ پاکستان کے بعد کراچی میں اس کا کام شروع کیا۔ پورے ہندوستان میں اس کی شاخیں پھیلی ہوئی تھیں۔ مولوی عبدالحق نے اس انجمن کی طرف سے سینکڑوں کتابیں شائع کیں۔ کراچی میں اُردو کالج قائم کیا اور اُردو یونیورسٹی قائم کرنے کے لئے کوشش کرتے رہے لیکن کامیاب نہ ہوئے۔ قدم رنجہ فرمانا: تشریف لانا، کسی کے گھر تک جانے کی تکلیف کرنا۔

ص ۹۹ | لنچ: دوپہر کا کھانا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین: مشہور ماہر ریاضی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے سابق وائس چانسلر۔ نواب زادہ لیاقت علی خاں: قائد اعظم کے دست راست، آل انڈیا مسلم لیگ کے سیکرٹری جنرل اور پاکستان کے پہلے وزیر اعظم۔ سیّد حسین امام: مسلم لیگ کے ایک مشہور لیڈر۔ مدعو کرنا: دعوت دینا۔ مطبوعات: چھپی ہوئی کتابیں۔ نذر کرنا: بطور نذرانہ پیش کرنا۔ اینگلو عربک کالج: دہلی کا ایک مشہور مسلم کالج، جو پہلے سکول تھا اور بعد ازاں ترقی کر کے کالج بنا۔ لاعلمی: نہ جاننا۔ مجمع: ہجوم۔ کم وبیش: تقریباً۔ سر عزیز الحق: ایک بنگالی لیڈر۔ تانگے والے کی اُردو: ان پڑھ اور گنوار آدمی کی ٹوٹی پھوٹی اردو زبان۔ سر فیروز خاں نون: پاکستان کی مشہور سیاسی شخصیت۔ وہ مختصر مدت کے لئے پاکستان کے وزیر اعظم بھی بنے۔

ص ۱۰۰ | محجوب: پیاری، پسندیدہ۔ جل کر: خفا ہو کر۔ صریح: واضح۔ لہٰذا: اس لئے۔ حاضرین: موجود لوگ۔ روئیداد: کارروائی۔ ہمت افزا: حوصلہ بڑھانے والا۔ پنڈال: وہ بڑا سا شامیانہ جس کے نیچے چار طرف قناتیں لگا کر گھیر دیتے ہیں اور جو بڑے جلسوں کے لئے بنایا جاتا ہے، خیمہ، سائبان۔ قطعۂ اراضی: زمین کا ٹکڑا۔ تخمینہ: خرچ کا اندازہ۔ حکومت نظام: ریاست حیدرآباد دکن کے والی حضور نظام نواب عثمان علی خاں کی حکومت، یہ سلطنت ان کے مورث اعلیٰ نظام الملک نے مغل حکومت کے زمانے میں ۱۷۲۴ء میں خود مختار ہو کر قائم کی تھی۔ اسے ہندوستانی حکومت نے ۱۹۴۸ء میں ختم کر دیا۔ عطیہ: بخشش۔ عطا کردہ رقم۔ عرضداشت: درخواست، عرضی۔ مرتّب: ترتیب دینا، لکھی جانا۔ سر تیج بہادر سپرو: مشہور ہندو وکیل جو اردو زبان کے بڑے حامی تھے۔

ص ۱۰۱ | ضمن: اندر، شرکت، درمیان، پردے یا آڑ میں۔ لنچ: دوپہر کا کھانا۔ اس اثنا میں: اس دوران میں، بیچ میں۔ دولتِ سرکارِ عالی حیدرآباد دکن: نظام دکن کی حکومت عرضداشت: درخواست، عرضی۔ حضورِ نظام: حیدرآباد دکن کی ریاست کے والی نواب عثمان علی خاں

بالمشافہ: روبرو، سامنے۔ شگوفہ کھلنا: انوکھی یا عجیب بات ہونا، فتنہ اٹھنا۔ تقاضا: خواہش کرنا۔

ص ۱۰۲ | اشتیاق: شوق، آرزو۔ دو طرفہ: دونوں طرفوں پر۔ گوالیار: ہندوستان کا ایک علاقہ۔ بوجہ کثرت بارش: مینہ زیادہ پڑنے کے سبب۔ عالم: حالت، کیفیت۔ خاک میں ملنا: تباہ ہونا، رسوا ہونا، ختم ہو جانا۔ دارالسلام: حیدر آباد دکن کا ایک مقام۔ مجمع: ہجوم۔ معرکہ آراء: یا معرکۃ الآرا۔ بڑے معرکے کی۔ پُرزور۔

ص ۱۰۳ | المناک: رنج دینے والے۔ تکلیف دہ۔ عزیز یادگاریں: پیاری نشانیاں۔ مسوّدے: کتابوں یا مضامین کی اصل تحریریں جو مصنف کے ہاتھ کی ہوں۔ تکلف: ضائع۔ عنایت: مہربانی۔ انجمن: انجمن ترقی اردو۔ ڈول ڈالنا: بنیاد قائم کرنا، انتظام کرنا۔ افتتاح: شروع کرنا، کھولنا۔ ناسازئ مزاج: طبیعت کی خرابی، بیماری۔ قبل: پہلے۔ معذرت: معافی، عذر، بہانہ۔ ہجوم کار: کاموں کی زیادتی۔ قاصر: مجبور۔ اس اثنا میں: اس دوران میں۔

سبق کا خلاصہ

مولوی عبدالحق نے اپنے مضمون "قائدِ اعظم اور اردو" میں قائدِ اعظم محمد علی جناح سے اپنی ملاقاتوں کا حال بیان کیا ہے اور ان کا اُردو کے بارے میں نقطہ نظر واضح کیا ہے۔ وہ بتاتے ہیں کہ قائدِ اعظم ایک سیاستدان اور قانون دان تھے مگر خود عبدالحق سیاسی تحریکوں سے الگ رہے، اس لئے انہیں قائدِ اعظم سے ملنے کے بہت کم مواقع نصیب ہوئے۔ ۱۹۳۷ء میں انہیں قائدِ اعظم کی طرف سے شملہ کے مقام سے ایک خط ملا، جس میں قائدِ اعظم نے مولوی عبدالحق کی قومی خدمات کی تعریف کرنے کے بعد ان سے ملنے کی خواہش کا اظہار کیا تھا۔ ان دنوں لکھنؤ میں مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا اور مولوی عبدالحق کو اس اجلاس کے دوران قائدِ اعظم سے ملنے کے لئے کہا گیا۔ قائدِ اعظم کے خط کے ایک دو دن بعد مولوی عبدالحق کو علامہ اقبال اور میاں بشیر احمد مدیر "ہمایوں" کے خطوط بھی ملے جنہوں نے انہیں تاکید کی کہ وہ محمد علی جناح سے ضرور ملیں۔ اس ملاقات کی تحریک علامہ اقبال کی طرف سے ہوئی تھی جنہیں خدشہ تھا کہ کہیں انڈین نیشنل کانگرس اور ہندی زبان کے حامی مولوی عبدالحق کو کسی ایسے سمجھوتے پر راضی نہ کرلیں جو اُردو کے لئے نقصان دہ ثابت ہو۔ اتفاقاً انہیں دنوں مسلم لیگ کونسل کے ایک رکن عبدالرحمٰن صدیقی صاحب مولوی عبدالحق کے مہمان تھے۔ چنانچہ ان کے ہمراہ مولوی صاحب لکھنؤ روانہ ہو گئے۔ انہوں نے اپنے بعض احباب کے مشورے سے اُردو کے حق میں ایک قرارداد کا مسودہ بھی تیار کر لیا جو وہ مسلم لیگ کونسل میں پیش کرنے کے خواہشمند تھے۔

لکھنؤ پہنچ کر مولوی عبدالحق، محمد علی جناح سے ملے جنہوں نے مولوی صاحب سے گلہ کیا کہ وہ ان سے (محمد علی جناح سے) تعاون نہیں کر رہے ہے۔ مولوی عبدالحق نے صاف گوئی اور جرأت سے کام لے کر کہہ دیا کہ جب قائداعظم اور مسلم لیگ دونوں اردو کے سلسلے میں کچھ نہیں کر رہے تو پھر اُن سے تعاون کی توقع کیا معنی رکھتی ہے؟ اس پر قائداعظم نے یقین دہانی کرائی کہ وہ آئندہ ضرور تعاون کریں گے۔ اس پر مولوی عبدالحق نے بھی مسلم لیگ سے بھرپور تعاون کا وعدہ کیا۔ قائدِ اعظم نے قرارداد کا پورا مسودہ پڑھا اور پسند فرمایا۔

اگلے روز مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہونے والا تھا۔ عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے قرارداد کونسل کے سامنے پیش کرنے کا ذمہ لیا۔ اجلاس سے پہلے بنگالی ارکانِ کونسل نے مولوی عبدالحق کو کلکتہ آنے کی دعوت دی اور اردو کی ترویج و اشاعت میں پوری مدد کرنے کا وعدہ کیا اور یہ بھی بتایا کہ اب وہاں لوگ اردو کی طرف مائل ہوتے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر بعد جب عبدالرحمٰن صدیقی صاحب نے قرارداد پڑھ کر اس کی توثیق کروانا چاہی تو وہی بنگالی ارکان اس کی مخالفت میں پیش پیش تھے، انہیں اس فقرے سے اختلاف تھا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی دفتری زبان اردو ہوگی۔ بنگال کے مولوی اکرم خاں نے اس کی مخالفت کی اور بنگال کے ہی بدرالدجیٰ صاحب نے قرارداد کی تائید کی۔ اس کے بعد حق اور مخالفت میں ایک ہنگامہ گرم ہوگیا۔ نواب اسمٰعیل خاں صاحب نے چاہا کہ مولوی عبدالحق صاحب ریزولیوشن میں ترمیم پر آمادہ ہو جائیں اور قرارداد کو بدل کر یوں کر دیں کہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو آل انڈیا مسلم لیگ کی دفتری زبان ہو۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب اس ترمیم پر آمادہ نہ ہوئے۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جب آل انڈیا نیشنل کانگرس نے اعلان کر دیا ہے کہ ہماری زبان ہندوستانی ہوگی تو مسلم لیگ، اردو کو دفتری زبان بنانے کا واضح اعلان کیوں نہیں کرتی؟ عبدالحق کو یقین تھا کہ کونسل میں کثرتِ رائے قرارداد کے حق میں ہے لیکن وہ اسے متفقہ طور پر منظور کروانا چاہتے تھے، اس لئے انہوں نے قرارداد واپس لینے کی تجویز پیش کی۔ جب قرارداد واپس لینے کا اعلان کیا گیا تو شرکائے اجلاس نے اپنے رویّے میں لچک پیدا کی اور یہ ترمیم کر کے کہ ہر ممکن کوشش کی جائے گی کہ اردو تمام ہندوستان کی عام زبان ہو جائے، قرارداد منظور کرلی۔ مولوی عبدالحق نے با دلِ ناخواستہ خاموشی کے ساتھ اس ساری صورتِ حال کو دیکھا اور کسی قسم کے ردِّ عمل کا اظہار نہیں کیا۔

۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو کے دفاتر حیدر آباد سے دِلّی منتقل ہو گئے۔ چند دن بعد قائدِ اعظم بھی دِلّی میں آبسے۔ لیکن مولوی عبدالحق سے ان کی ملاقات نہیں ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں انجمن کے ایک عہدیدار مولوی سعید ہاشمی صاحب کو خیال آیا کہ قائدِ اعظم کو انجمن کے دفاتر میں پہنچ پر مدعو کر کے

انہیں نئی مطبوعات دکھانی چاہئیں۔ اس دعوت میں قائدِ اعظم کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ضیاء الدین، نواب زادہ لیاقت علی خاں، سید حسن امام اور دو ایک اور صاحبوں کو بھی شرکت کے لئے کہا گیا تھا۔ مولوی عبدالحق کی قائد اعظم سے دیر تک گفتگو رہی اور انہوں نے قائد اعظم کو انجمن کی شائع کردہ انگریزی اُردو لغات اور سر سید احمد خاں کی اردو یونیورسٹی کی تجویز کی ایک نقل پیش کی، جو انہوں نے قبول فرمائی۔

کچھ دنوں بعد قائد اعظم سے اینگلو عربک کالج دِلّی کے طلباء نے حالاتِ حاضرہ پر تقریر کرنے کی درخواست کی جو انہوں نے منظور فرمائی اور وقتِ مقررہ پر تشریف لائے۔ تقریر سے پہلے کھانے کی دعوت تھی جس میں دیگر حضرات کے علاوہ مولوی عبدالحق بھی شریک ہوئے۔ اور یہاں انہیں قائد اعظم نے بتایا کہ انہوں نے سب سے پہلی اردو تقریر بنگال کے کسی مقام پر کی جہاں وہ دَورے پر گئے ہوئے تھے اور ان کی تقریر سننے کے لئے کئی ہزار آدمی جمع تھے۔ ان میں انگریزی سمجھنے والے پانچ سو اور اردو سمجھنے والے ڈیڑھ ہزار کے لگ بھگ لوگ تھے۔ سر عزیزالحق کی اس تجویز کے باوجود کہ قائد اعظم انگریزی میں تقریر فرمائیں اور وہ اس کا بنگالی میں ترجمہ کر کے سنا دیں گے، قائدِ اعظم نے اردو میں تقریر کی۔ انہیں بخوبی احساس تھا کہ ان کی اردو اتنی اچھی نہیں ہے، اس لئے انہوں نے مسکرا کر ارشاد فرمایا کہ ان کی ”اردو تانگے والے کی اُردو ہے“۔

۱۹۴۶ء میں مسلم لیگ کونسل کا ایک اجلاس دہلی میں ہوُا جس میں سر فیروز خاں نون نے اپنی تقریر انگریزی زبان میں شروع کی۔ اس پر ہر طرف سے اُردو میں تقریر کرنے کا مطالبہ ہوُا مجبوراً انہوں نے چند جملے اردو میں کہے اور پھر انگریزی میں بولنے لگے۔ اس پر پھر اُردو کا مطالبہ ہوُا۔ سر فیروز خاں نون نے عذر پیش کیا کہ محمد علی جناح بھی انگریزی میں تقریر کرتے ہیں۔ آپ نے ان سے کبھی اُردو میں تقریر کرنے پر اصرار نہیں کیا۔ یہ سُن کر قائدِ اعظم اپنی کرسی سے اُٹھے اور واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ چونکہ سر فیروز خاں نون نے ان کی آڑ لی ہے اس لئے وہ اعلان کرتے ہیں کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہو گی۔ اس پر کونسل کے تمام حاضرین نے تالیاں بجا کر اس اعلان کا خیر مقدم کیا۔

فروری ۱۹۴۶ء میں انجمن ترقیٔ اُردو کی شاندار سالانہ کانفرنس بمبئی میں ہوئی اور وہاں کے لوگوں نے انجمن کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے دل کھول کر امداد دی۔ اس کانفرنس میں قائدِ اعظم کا حوصلہ افزاء پیغام بھی پڑھ کر سنایا گیا جسے سُن کر حاضرین نے پُر جوش تالیاں بجائیں۔ اگلے روز مولوی عبدالحق،

قائد اعظم سے ملنے اُن کے مکان پر گئے تو بخار ہونے کے باوجود عبدالحق صاحب سے آکر اور کافی دیر تک کانفرنس اور اردو کے متعلق باتیں کرتے رہے۔

انجمن ترقی اُردو نے اپنی عمارت کی تعمیر کے لئے دِلّی میں زمین کا ایک ٹکڑا خریدا تھا اور اخراجات کا اندازہ لگایا گیا تو وہ آمدن سے کئی گنا بڑھ گیا چنانچہ حیدر آباد دکن کے والی حضور نظام نواب عثمان علی خاں سے عطیہ لینے کی غرض سے ایک عرضداشت تیار کی گئی جو سر تیج بہادر سپرو، صدر انجمن ترقی اُردو کی طرف سے پیش ہونا تھی۔ مولوی عبدالحق نے قائدِ اعظم سے مل کر انہیں آمادہ کرنا چاہا کہ وہ حضور نظام کے نام امداد کے لئے ایک سفارشی خط عنایت فرمائیں۔ قائد اعظم نے ہر تعاون کا یقین دلایا کہ رقعہ لکھنے سے یہ کہہ کر معذوری کا اظہار فرمایا کہ لوگوں نے اخبارات میں پہلے ہی یہ مشہور کر رکھا ہے کہ حضور نظام مجھے چھ لاکھ روپے سالانہ دیتے ہیں۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ عنقریب وہ نظام سے خود ملیں گے تو انہیں انجمن کی امداد پر آمادہ کریں گے۔ نظام حیدر آباد بھی قائد اعظم کی حیدر آباد میں آمد کے شدت سے منتظر تھے لیکن مسلم لیگ اور کانگرس کی سیاسی چپقلش کی وجہ سے وقت گزرتا جا رہا تھا اور قائد اعظم کے لئے فوری طور پر حیدر آباد جانا ممکن نہ رہا۔ تاہم کچھ دنوں بعد جب قائد اعظم وہاں تشریف لے گئے تو وہاں ان کا شاندار استقبال ہوا۔ حیدر آباد کا ہوائی اڈہ شہر سے پندرہ میل کے فاصلے پر واقع ہے اور شہر سے ہوائی اڈے تک سڑک کے دونوں جانب آدمیوں کا بے پناہ ہجوم تھا قائد اعظم کا جہاز بارش کی وجہ سے قدرے دیر سے آیا لیکن لوگوں کے جوش و خروش میں کوئی کمی نہ ہوئی بلکہ جونہی جہاز زمین پر اُترا لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور بعض تو جہاز پر چڑھ گئے، قائد اعظم کو بڑی مشکل سے ایک ٹیرول گاڑی میں بٹھا کر ہوائی اڈے سے باہر نکالا گیا اور وہاں سرکاری گاڑی میں بٹھا کر سرکاری مہمان خانے میں پہنچایا گیا۔

دوسرے دن قائد اعظم حضور نظام سے ملے اور بہت سی باتیں کیں۔ مولوی عبدالحق صاحب جب ملاقات سے واپسی کے بعد قائد اعظم سے ملنے گئے تو انہیں یہ جان کر بے حد افسوس ہوا کہ حضور نظام سے انہیں امداد کے سلسلے میں جو توقعات تھیں وہ پوری ہونے کا کوئی امکان نہیں۔ اگلے روز دارالسلام میں قائد اعظم کی تقریر سننے کے لئے ایک لاکھ کا مجمع تھا۔ قائد اعظم نے نہایت صاف اور اچھی اُردو میں تقریر کی جو ۴۵ منٹ جاری رہی۔ اس کے بعد انہوں نے انگریزی میں خطاب فرمایا اور یہ تقریر بھی بالخصوص حیدر آباد کے لئے بہت معرکے کی تھی۔ اس سے اگلے دن سیکرٹری حکومتِ نظام مولوی تقی الدین صاحب کے ہاں قائدِ اعظم کی دعوتِ طعام تھی جس میں مولوی عبدالحق بھی شریک تھے۔ مولوی صاحب نے قائد اعظم کو مبارک باد دی کہ انہوں نے اتنی اچھی اُردو میں تقریر کی ہے۔ مولوی صاحب نے قائد اعظم سے یہ بھی کہا آئندہ انہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ان کی اُردو

ٹانگے والے کی اُردو ہے۔

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کے بعد انجمن ترقی اُردو کو بہت جانی اور مالی نقصان پہنچا۔ بہت سے قیمتی مسودے اور عزیز ترین تصانیاں لوٹ مار میں ضائع ہوگئیں۔ البتہ حکومت سندھ کی عنایت سے کراچی میں انجمن کو ایک اچھی عمارت دفاتر قائم کرنے کے لئے مل گئی جس کے افتتاح کے لئے قائدِ اعظم سے درخواست کی گئی۔ قائدِ اعظم اس زمانے میں بے حد مصروف تھے۔ تاہم انہوں نے سرحد کے دَورے سے واپسی پر رسمِ افتتاح ادا کرنے کی حامی بھرلی۔ لیکن بعد میں ان کی صحت اتنی گر گئی کہ انجمن کو اپنا پروگرام بدلنا پڑا پھر شدید بیماری کی وجہ سے انہیں کوئٹہ جانا پڑا اور انہوں نے رسمِ افتتاح ادا کرنے سے معذوری کا اظہار کیا البتہ وعدہ کیا کہ کوئٹہ سے واپس کراچی آکر وہ کسی اور موقع پر انجمن کے دفاتر میں ضرور تشریف لائیں گے۔ یہ وعدہ پورا نہ ہو سکا۔ کیونکہ کوئٹہ سے کراچی وہ اس حالت میں واپس آئے کہ قریب المرگ تھے اور پھر وہ ہمیشہ کیلئے ہم سے رخصت ہوگئے

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

حیدر آباد کا بڑا ہوائی اڈا شہر سے کوئی پندرہ میل کے فاصلے پر ہے لوگوں کے اشتیاق کا یہ عالم تھا کہ ہزارہا آدمی گاڑیوں میں، موٹروں میں اور پیدل ہوائی اڈے کی طرف جارہے تھے اور ہزاروں دو طرفہ سڑک پر ان کے انتظار میں کھڑے تھے۔ جہاز کے آنے میں دیر ہوئی کیوں کہ وہ گوالیار سے بوجہ کثرتِ بارش وقت پر نہ چل سکا۔ جس وقت جہاز نظر آیا تو لوگوں نے خوشی کے نعرے لگائے جونہی زمین پر اُترا لوگ اس پر ٹوٹ پڑے اور بعض تو جہاز پر چڑھ گئے۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت مولوی عبدالحق کے مضمون "قائدِ اعظم اور اردو" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنف نے قیامِ پاکستان سے پہلے قائدِ اعظم سے اپنی چند ملاقاتوں کا ذکر کیا ہے۔ جن میں اس نے اردو کے مستقبل کے بارے میں تبادلہ خیال کرتے ہوئے قائدِ اعظم کا نقطۂ نظر معلوم کیا۔ پہلی ملاقات ۱۹۳۷ء میں لکھنؤ میں ہوئی جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ہورہا تھا۔ اس ملاقات میں مولوی عبدالحق کی یاد دہانی پر قائدِ اعظم نے وعدہ کیا کہ وہ اور مسلم لیگ ان سے آئندہ بھرپور تعاون کریں گے۔ چنانچہ اگلے روز کونسل کے اجلاس میں اردو کے بارے میں عبدالرحمٰن صدیقی نے قرارداد پیش کی جسے ترمیم کے بعد منظور کرلیا گیا۔ قائدِ اعظم سے مصنف کی دوسری ملاقات دو سال بعد ۱۹۳۹ء میں دلّی میں ہوئی جب انہیں انجمن ترقی اُردو

کے دفتر میں لنچ پر مدعو کیا گیا۔ چند دن بعد تیسری ملاقات بھی دلی میں اینگلو عربیک کالج میں ہوئی جہاں قائد اعظم طلباء کی درخواست پر تقریر کرنے تشریف لائے۔ تقریر سے پہلے کھانے پر قائد اعظم نے مولوی عبدالحق کو اپنی پہلی اُردو تقریر کے بارے میں بتایا جو انہوں نے بنگال کے کسی مقام پر کی اور جو ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں کی گئی تھی۔ پھر مصنف نے ۱۹۴۶ء کے مسلم لیگ کونسل کے اجلاس کا ذکر کیا ہے جہاں سر فیروز خاں نون کے انگریزی میں تقریر کرنے سامعین کے اردو پر اصرار اور فیروز خاں نون کے اس عذر پر کہ قائد اعظم بھی انگریزی میں تقریر کرتے ہیں، قائد اعظم نے واضح الفاظ میں ارشاد فرمایا کہ پاکستان کی سرکاری زبان اُردو ہوگی۔ اس کے بعد مصنف نے ۱۹۴۶ء میں ہی انجمن ترقی اُردو کی سالانہ کانفرنس میں پڑھے جانے والے قائد اعظم کے حوصلہ افزا پیغام کا حوالہ دیا ہے اور اگلے روز قائد اعظم سے ملنے اور ان سے کانفرنس کی کامیابی اور اُردو کے متعلق باتیں کرنے کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے بتایا ہے کہ انہوں نے انجمن ترقی اُردو دہلی کی عمارت کی تعمیر کیلئے حضور نظام سے خصوصی امداد وصول کرنے کیلئے قائد اعظم سے تحریری سفارش چاہی تو انہوں نے خط دینے سے معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کچھ دنوں بعد خود حضور نظام سے ملیں گے اور انہیں انجمن کیلئے امداد دینے پر آمادہ کریں گے۔ چند دن بعد قائد اعظم نظام دکن کی دعوت پر حیدرآباد تشریف لے گئے جہاں عوام نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

اس عبارت کے ای مصنف نے بتایا ہے کہ قائد اعظم، حضور نظام سے ملے لیکن انجمن کے بارے میں یا تو قائد اعظم کی نظام دکن سے کوئی بات نہیں ہوئی یا اگر ہوئی تو وہ مایوس کن تھی۔ اگلے روز قائد اعظم نے بہت اچھی اردو میں تقریر کی۔ پاکستان بننے کے بعد انجمن ترقی اردو کراچی کے اپنے دفاتر کی رسم افتتاح کے لئے مولوی عبدالحق نے قائد اعظم کو دعوت دی لیکن قائد اعظم بیمار پڑنے کی وجہ سے تقریب میں شرکت نہ کر سکے اور کچھ ہی دن بعد انتقال فرما گئے۔

تشریح قائد اعظم کی بذریعہ ہوائی جہاز آمد کا سُن کر لوگ بڑے شوق سے حیدرآباد کے ہوائی اڈے کی طرف دوڑے یہ لوگ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ کچھ موٹروں میں اور کچھ کاروں میں سوار تھے زیادہ تعداد پیدل چلنے والوں کی تھی۔ ان کے علاوہ ہزاروں کی تعداد میں وہ لوگ تھے جو قائد اعظم کی ایک جھلک دیکھنے کے لئے ہوائی اڈے کو جانے والی سڑک کے دونوں کناروں پر کھڑے انتظار کر رہے تھے۔ ہوائی جہاز دیر سے آیا کیونکہ گوالیار میں جہاں سے پرواز کرکے وہ حیدرآباد آرہا تھا بہت شدید بارش ہو رہی تھی اور ہوائی جہاز کے لئے پرواز کرنا مشکل تھا۔ تاہم خاصی دیر کے بعد جہاز حیدرآباد کے ہوائی اڈے پر اُترا۔ جیسے ہی وہ زمین پر رُکا، استقبال کرنے والوں کے ہجوم نے جہاز کو اپنے گھیرے میں لے لیا اور بعض جوشیلے افراد قائد اعظم کو دیکھنے کے لئے جہاز پر جا چڑھے۔

فرحت اللہ بیگ (۱۸۸۴ء - ۱۹۴۷ء)

مُردہ بدست زندہ

تعارف اور پس منظر

مرزا فرحت اللہ بیگ کا طنزیہ مضمون "مردہ بدست زندہ" "مضامین فرحت" (حصہ دوم) میں سے لیا گیا ہے۔ مضامین لکھتے وقت فرحت اللہ بیگ کوشش کرتے ہیں کہ اُردو زبان میں خوش مذاقی کے ساتھ "اصلاحِ معاشرت" کا پرچار کیا جائے، چنانچہ ان کا موجودہ مضمون ہماری معاشرتی زندگی کے ایک دردناک پہلو سے تعلق رکھتا ہے، انہوں نے باتوں ہی باتوں میں ہماری دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہے اور بڑے لطیف طنزیہ انداز میں ہماری دنیاداری پر چوٹیں کی ہیں اور ہمارے عقبیٰ کو بھول جانے پر اظہارِ افسوس کیا ہے۔

"مردہ بدستِ زندہ" کا مرکزی خیال یہ ہے کہ موجودہ زمانے میں خلوص لوگوں کے دلوں سے مٹ چکا ہے اور اس کی جگہ ظاہرداری نے لے لی ہے۔ زندگی اور موت، دونوں صورتوں میں ہمارا رویہ خودغرضی پر مبنی ہوتا ہے۔ پہلے کوئی ہمسایہ بھی فوت ہوتا تھا تو اتنا غم ہوتا تھا گویا اپنا قریبی عزیز انتقال کر گیا ہے لیکن اب اگر کوئی اپنا بھی مر جائے تو ہم اس طرح لاتعلق رہتے ہیں، جیسے وہ کوئی غیر ہو۔ حتیٰ کہ جنازہ کے ساتھ جانا بھی اب محض ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ ہم صرف اس لئے جنازے میں شریک ہوتے ہیں کہ کہیں یار لوگ یہ طعنہ نہ دیں کہ زندگی میں تو دوستی اور محبّت کا دعویٰ کیا جاتا تھا اور اب مرنے کے بعد مُڑ کر بھی نہ دیکھا کہ کون مر گیا ہے۔ یہ بات واضح کرنے کیلئے مصنف نے ایک جنازے کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔

انہوں نے کہانی کے رنگ میں ایک صاحبِ حیثیت آدمی کے انتقال کرنے کے بعد، اس کے دوست احباب کی بے حسی لاپرائی، دنیاداری اور منافقت کی بڑی دلچسپ مثال پیش کی ہے۔ بجائے مرحوم کے عزیز و اقارب سے اظہارِ غم کرنے کے، یہ سب کا محض اس فکر میں ہیں کہ ان کی موجودگی کا دوسروں کو پتہ لگ جائے۔ چنانچہ مرحوم کے مکان پر پہنچتے ہی پہلا سوال یہ پوچھا جاتا ہے کہ "کیا یہ مر گئے۔ بھئی ہمارے تو بڑے دوست تھے" اتنا کہہ کر وہ جیب سے سگریٹ کا پیکٹ یا پانوں کی ڈبیا نکالیں گے، اور پاس کھڑے لوگوں سے مصروفِ گفتگو ہو جائیں گے۔ اس کے بعد دنیا بھر کے حالات پر تبصرہ ہوگا

لیکن مرنے والے کا بھول کر بھی تذکرہ نہیں ہوگا۔ جنازہ میں بھی یہ حضرات پیدل چلنا کسرِ شان سمجھتے ہیں، چنانچہ وہ موٹر پر بیٹھ کر قبرستان پہنچیں گے، نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کی بجائے، مسجد کی اوٹ میں کھڑے کھڑے سگریٹ پی کر وقت کاٹیں گے اور پھر اس انتظار میں ہونگے کہ کب مردہ سپردِ خاک ہوتا ہے اور کب ان کے گھر واپس پہنچنے کی نوبت آتی ہے؟

مصنف نے دنیادار لوگوں کی خود غرضی اور مطلب پرستی کا پردہ خوب چاک کیا ہے۔ جنازہ میں اگر کوئی بڑا سرکاری عہدیدار شریک ہے تو اُسے جُھک جُھک کر سلام کیا جا رہا ہے، اس کی خیر خیریت دریافت کی جا رہی ہے، اس سے سفارشیں کی جا رہی ہیں اور وعدے لئے جا رہے ہیں۔ مصنف نے سڑک پر دکانداروں اور راہگیروں کی جنازے میں دلچسپی کا بھی خوب خاکہ کھینچا ہے۔ اگر جنازے کے ساتھ چند آدمی ہیں تو پھر انہیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ مرنے والا کون ہے؟ لیکن اگر مرحوم کے جنازے پر لوگوں کا ہجوم ہے تو وہ ننگے پاؤں بھاگے آئیں گے اور مرحوم کا نام اور مرض ضرور دریافت کریں گے یوں جیسے وہ میونسپل کمیٹی کے ملازم ہوں اور مرنے والے کی زندگی اور موت کے کوائف انہوں نے اپنے رجسٹر میں درج کرنے ہوں۔ اسی طرح قبرستان میں مستقل رہائش پذیر سقّے کا ذکر بھی خوب کیا گیا ہے جو اپنے بیوی بچوں اور اَن گنت پالتو جانوروں سمیت جھونپڑی بنا کر رہتا ہے۔ اس کے بچّے الواحِ مزار سے کھیلتے ہیں، قبروں کے چبوتروں پر لوٹ مارتے ہیں۔ اس کی بکریاں، مرغیاں اور ٹٹو قبرستان میں گھوم پھر کر اپنا پیٹ بھرتے ہیں اور خود میاں سقّے قبروں پر ڈالے گئے تازہ پھول اپنے بچوں کے ذریعے منگوا کر انہیں اپنے بستر کی زینت بناتے ہیں۔ ان حضرت کی جھونپڑی میں لگنے والی اینٹیں بھی کسی قبر کے چبوترے سے اکھاڑی گئی ہیں اور گھر والی کا سِل بٹہ، کسی کا سنگِ مزار غائب کر کے بنایا گیا ہے۔ مصنف نے ہمارے قبرستانوں کی ابتر حالت کی طرف بھی بڑے مؤثر انداز میں توجہ دلائی ہے۔ جہاں جا کر وحشت ہوتی ہے۔ اسی طرح قبرستان میں بعض حضرات کی حرکتیں دیکھ کر زیرِ لب ہنسی بھی آتی ہے۔ مثلاً وہ صاحب جو وقت گزاری کے لئے قبروں کے کتبے پڑھتے ہوئے خود بھی محظوظ ہو رہے ہیں اور دوسروں کو بھی محظوظ کر رہے ہیں۔ اسی طرح وہ حضرات جو یہ تو نہیں جانتے کہ مُردے کو مٹی دینے کے بعد کون سی دعا مانگنی ہے لیکن زیرِ لب کچھ نہ کچھ بڑبڑاتے رہتے ہیں البتہ ان کے منہ سے صرف ایک لفظ "منہا" سنائی دیتا ہے۔ غرض یہ مضمون بڑے پُر لطف انداز میں ہماری کمزوریوں اور خامیوں کی طرف اشارے کرتا ہے اور کمال یہ ہے کہ مصنف نے کہیں بھی خشک واعظانہ لب و لہجہ اختیار نہیں کیا۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۰۴	مُردہ بدستِ زندہ : زندہ لوگوں کے ہاتھوں، مُردے پر کیا گزرتی ہے؟ یا زندہ لوگ،

مردے کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟ خلوص: سچی دوستی، حقیقی محبت، سچائی، صفائی قلب۔ ظاہر داری:
دکھاوا، نمود، ریاکاری۔ دلی درد: حقیقی ہمدردی۔ دُنیاداری: دُنیا کے تعلقات، ظاہری ملنساری۔
عزیز: رشتہ دار۔ غیر: پرایا۔ رسماً: رواج اور عادت کے طور پر۔ دم بھرنا: (محبت کا) دعویٰ
کرنا۔ میتوں کا رنگ: مُردے کے ساتھ ہونے والے برتاؤ کا مظاہرہ۔ انتقال: فوت ہونا

ص ۱۰۵ | سواریوں میں: گاڑیوں میں۔ سگریٹ کا بکس: سگریٹ کا ڈبہ۔ تعزیت: ماتم پرسی،
مُردے کے پسماندگان سے اظہار ہمدردی۔ جنازہ: لاش، مُردہ جسم۔ مُردے کا تابوت۔
کارروائیاں: کارگزاریاں۔ کام چلانا۔ رائے زنی: تبصرہ کرنا، رائے دینا، بحث و مباحثہ۔ بھیڑ چھٹ جانا:
ہجوم کا بکھر جانا۔ شرما شرمی: شرم و لحاظ کے دباؤ میں۔ مروت کے باعث۔ طبقہ: گروہ۔ غرض مند:
حاجت رکھنے والا۔ چھٹکارا، نجات: مزاج پرسی کرنا: خیریت پوچھنا، حال دریافت کرنا۔ طبابت:
حکمت، حکیم کا طریق علاج، یونانی علاج معالجہ کا علم۔

ص ۱۰۶ | پیچھا چھوٹنا: نجات ملنا، جوڑی بدلنا: ایک آدمی کے الگ ہو جانے کے بعد دوسرے
آدمی کا ساتھ ہولینا۔ ہمراہی: ساتھ چلنے والا۔ وضع داری: ایک روش یا وضع کی پابندی۔ تعلقات
نبھانے کا اسلوب۔ آڑ: اوٹ۔ حیات و ممات: زندگی اور موت۔ میونسپل کمیٹی: وہ انتظامی ادارہ
جو شہری ترقی کا ذمے دار ہوتا ہے۔ تفویض: سپردگی، تحویل، حوالے۔ موٹر نشین: کار میں بیٹھے ہوئے۔
زہر معلوم ہونا: نہایت بُرا لگنا۔

ص ۱۰۷ | قبرستان: مُردے دفنانے کی جگہ۔ جائے عبرت: نصیحت پکڑنے کی جگہ، وہ جگہ جسے
دیکھ کر تنبیہ ہو یا خوف طاری ہو۔ جائے وحشت: ہولناک جگہ، بھیانک مقام، ویرانہ۔ سقہ: ماشکی،
پانی بھرنے والا۔ ٹٹو: چھوٹے قد کا گھوڑا۔ بلیات: بلیہ کی جمع، بلائیں، فضولیات۔ کمر کمر: کمر تک
کمر کے برابر۔ نیم: ایک نہایت کڑوے درخت کا نام۔ پیپل: ایک بڑا سایہ دار درخت جس کے
پتے پان سے ملتے جلتے ہیں۔ تعویذ: قبر کا پتھر، لوحِ مزار۔ کس مپرسی: وہ حالت جس میں کوئی حال پوچھنے
والا نہ ہو۔ پھولوں کی سیج: نرم بچھونا، آرام کی نیند سونا۔ پھول چڑھانا: تربت یا مزار پر پھول رکھنا۔
باسی: پرانے مرجھائے ہوئے۔ حرج: نقصان۔ سل بٹا: مسالہ پیسنے کا چوڑا پتھر اور اوپر سے گھسنے والا
چھوٹا ٹکڑا۔ مصالحہ: مسالہ۔ قلانچیں مارنا: چھلانگیں لگانا۔ لوٹ مارنا: سو رہنا، لوٹنی لگانا،
لڑھکنا۔ بی سقنی: ماشکی کی بیوی۔

ص ۱۰۸ | ٹٹوانی: چھوٹے قد کی گھوڑی۔ پُھدکنا: مینڈک کی طرح اچھلنا۔ چونا گرنا: قلعی
یا سفیدی کی تہہ کا اُکھڑ کر گرنا۔ کانگڑہ: ہندوستان کا ایک شہر جہاں قیامِ پاکستان سے پہلے ایک
زبردست زلزلے نے تباہی مچا دی تھی۔ لبِ گور: قبر کے کنارے۔ پٹاؤ: قبر بند کرنے کے تختے۔

رَد و کد: تبصرہ، رائے زنی۔ فراغت: فرصت، چھٹکارا۔ تخت: بیٹھنے کی چوکی، جو لکڑی کے تختوں سے بنی ہوتی ہے۔ بیٹھنے کی جگہ یا مسند۔ تعویذ: قبر کا پتھر جو قبر کے سرہانے لگایا جاتا ہے اور جس پر مُردے کا نام لکھا ہوتا ہے۔ لوحِ مزار۔ بیڑی: آبنوس کے پتے کا تمبا کو بھرا ہوا مخروطی سگریٹ۔ دَم لگانا: حُقے یا سگریٹ کا گھونٹ لینا۔ خفتگانِ خاک: قبر کی مٹی کے اندر سوئے ہوئے مُردے۔ عبرت: نصیحت، تنبیہ، خوف۔ کودنا پھاندنا: چھلانگیں لگا کر عبور کرنا۔ دن پھرنا: اچھے دن آنا۔ خدانخواستہ: خدا نہ کرے۔ فاتحہ: مُردے کی رُوح کے واسطے سورۃ فاتحہ (الحمد شریف) کی آیات پڑھنا۔ شرما شرمی: مروّت اور لحاظ کے باعث۔ منت کرم داشتن: خواہ مخواہ احسان دھرنا۔ کتبہ: لوحِ مزار یعنی قبر کے پتھر پر لکھی ہوئی عبارت۔

ص ۱۰۹ | دادِ سخن: شعر سنانے پر تعریف کرنا۔ کلام: شعر۔ چبوترہ: اونچی بنائی ہوئی جگہ جو مربع یا مستطیل شکل کی ہوتی ہے۔ متمکن: قائم۔ کسی جگہ قرار پکڑنے والا۔ پارلیمنٹ: قومی مجلس یا مقننہ۔ حکومت کی قانون ساز جماعت۔ اجلاس: بڑا جلسہ۔ تنقیح: تحقیق و تفتیش۔ کھوج اور چھان بین، صفائی اور وضاحت۔ تنقید: جانچ پڑتال۔ خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنا۔ نکتہ چینی کرنا۔ کارروائی: کام چلانا۔ افواہ: بے اصل بات، بے تحقیق خبر۔ تصدیق: سچا ثابت کرنا۔ تردید: کسی بات کی صداقت کے خلاف کچھ کہنا۔ رَدّ کرنا۔ سفارش: کسی کے حق میں بھلائی کی کوشش یا کلمہ۔ خدا خدا کرکے: بڑی مشکل سے۔ عود: ایک قسم کی سیاہ خوشبودار لکڑی جس کا برادہ پانی میں حل کر کے چھڑکتے ہیں یا جلاتے ہیں۔ منجھے کے سرے پکڑ کر: بل دیئے ہوئے کپڑے کے کنارے پکڑ کر جس کے سہارے میّت کو اٹھایا جاتا ہے اور قبر میں اتارا جاتا ہے۔ میّت: مُردہ۔ لاش۔ غل مچانا: شور کرنا۔ بے تحاشا: مضطرب اور بے چین ہو کر، اندھا دھند، ازحد۔ دم نہیں ہے: طاقت نہیں ہے، جان نہیں ہے۔ پاکھا گرنا: قبر کی دیوار کا حصّہ گرنا۔ لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ: کوئی پوجا کے لائق نہیں سوائے اللہ کے۔ بندھن: باندھی ہوئی شے، گرہ، گانٹھ۔ قبلہ: کعبہ، وہ سمت جدھر نماز پڑھتے وقت رُخ کریں۔

ص ۱۱۰ | غل غپاڑہ: شور و غل۔ احباب: حبیب کی جمع۔ دوست، آشنا۔ پٹاؤ: قبر بند کرنے کے تختے۔ کڑی: لکڑی کا تختہ یا شہتیری۔ لاحول ولا قوۃ: (ترجمہ) خدا کے سوا کسی میں طاقت اور زور نہیں، عموماً اظہارِ نفرت و بیزاری کے لئے بولتے ہیں۔ مٹی دینا: قبر پر مٹی ڈالنا جو ثواب کا کام سمجھا جاتا ہے۔ بڑبڑانا: منہ ہی منہ میں کچھ کہنا جو صاف سمجھ میں نہ آئے۔ یہاں مراد دفن کے بعد میت کی بخشش کی دعا کرنا۔ منہا: مردے کو دفن کرنے کے بعد قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے۔ ہر آدمی تین تین مٹھیاں مٹی کی ڈالتا ہے اور یہ دعا پڑھتا ہے۔ بِسْمِ اللّٰہِ وَعَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ ط مِنْهَا خَلَقْنٰکُمْ وَفِیْهَا نُعِیْدُکُمْ وَمِنْهَا نُخْرِجُکُمْ تَارَةً اُخْرٰی (ترجمہ) ہم تجھے

دفن کر رہے ہیں؟ اللہ کے نام کے ساتھ اور رسول اللہ کے بتائے ہوئے طریق پر (اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ) تم کو ہم نے اس (مٹی سے) پیدا کیا اور اسی میں ہم تم کو لوٹائیں گے، اور بالآخر تم کو اسی مٹی میں سے اٹھایا جائے گا۔ اس دعا میں دو دفعہ لفظ منہا (اس میں سے) آیا ہے اور سبق کی عبارت میں اسی لفظ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اعزّہ: عزیز کی جمع، رشتہ دار، بھائی بند۔ میّت کا رنگ: مردے کا حال، میّت کے ساتھ ہونے والا سلوک۔ بندہ: غلام، انسان۔ احکام: حکم کی جمع، ہدایات، ارشادات۔

سبق کا خلاصہ

موجودہ زمانے میں لوگوں کے دلوں سے خلوص ختم ہو گیا ہے اور اس کی جگہ ظاہر داری آ گئی ہے۔ اب نہ تو کوئی نیک نیتی سے زندگی میں ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد قبر تک پہنچانے ہمدردی کے ساتھ جاتا ہے۔ جنازہ کے ساتھ جانا اب محض ایک رسم بن کر رہ گئی ہے۔ مردے کے ساتھ زندوں کے ہاتھوں جو کچھ گزرتی ہے اس کا درج ذیل واقعہ سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس محلے کے سامنے والے مکان میں کوئی صاحب فوت ہو گئے ہیں۔ وہ شاید کوئی بڑے آدمی تھے اسی لئے ان کے مکان کے سامنے تعزیت کرنے کے لئے سینکڑوں آدمی جمع ہیں۔ ان میں امیر بھی ہیں اور غریب بھی۔ غریب تو اندر جا کر کچھ پڑھ رہے ہیں، لیکن امیر اپنی کاروں میں بیٹھے ہیں یا دروازے پر کھڑے سگریٹ پی رہے ہیں۔ جب تک جنازہ مکان سے باہر نہیں آتا، یہ لوگ اسی طرح اپنی گفتگو میں مصروف رہتے ہیں۔ جونہی جنازہ باہر نکلا، انہوں نے راستہ چھوڑ دیا۔ اب جنازہ آگے آگے چلنے لگا۔ اور یہ لوگ پیچھے پیچھے آنے لگے۔ مرنے والے کے عزیز و اقارب تو جنازے کے ساتھ رہتے ہیں، ان کے پیچھے پیدل چلنے والے وہ لوگ ہیں جن کے پاس سواری نہیں یا وہ مروّت کے مارے پیدل چلنا مناسب سمجھتے ہیں۔ جو لوگ جان بوجھ کر پیچھے رہ گئے، وہ چپکے سے اپنی گاڑیوں میں جا بیٹھے ہیں تاکہ پیدل قبرستان تک نہ جانا پڑے۔ پیدل چلنے والے بھی خاموش نہیں رہتے بلکہ وہ بات چیت کرتے جا رہے ہیں۔ ان میں اگر کوئی بڑا عہدہ دار ہے تو حاجت مند انہیں جھک کر سلام کر رہے ہیں اور ان کی خیر خیریت دریافت کر رہے ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ موجودہ علاج معالجے کی خرابیاں اور مرحوم کے محاسن بھی بیان ہو رہے ہیں اور اپنے ذاتی تجربات بھی دہرائے جا رہے ہیں جنازہ قبرستان کی مسجد تک پہنچا تو جنازے کے شرکاء بھی مختلف ٹکڑیوں میں بٹ گئے۔ کچھ وہ لوگ ہیں جو ہمیشہ نمازِ جنازہ پڑھتے آئے ہیں اور آج بھی لازماً پڑھیں گے۔ دوسرے وہ افراد ہیں جو نہا دھو کر خاص اسی جنازہ میں شرکت کے لئے آئے ہیں اور وہ بھی نمازِ جنازہ میں ضرور شریک ہوں گے۔ تیسری قسم ان اشخاص کی ہے جو صرف وضع داری نبھانے کے لئے آ گئے ہیں لیکن زندگی میں نہ تو پہلے کبھی

انہوں نے نمازِ جنازہ پڑھی ہے اور نہ آج پڑھنے کا ارادہ ہے چنانچہ جونہی جنازہ مسجد کے قریب پہنچتا ہے تو وہ کھسکتے کھسکتے ہجوم کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور کسی دیوار یا موٹر گاڑی کی اوٹ میں کھڑے ہو کر سگریٹ پیتے ہیں یا پان کھاتے ہیں۔ نماز کا وقت انہوں نے اسی طرح کھڑے کھڑے گزارنا ہے البتہ اتنا خیال ضرور رکھتے ہیں کہ جونہی نماز ختم ہو، وہ مسجد کے دروازے پر پہنچ جائیں اور جنازہ لے کر آنے والے ہجوم میں شامل ہو جائیں تاکہ دوسروں کو یہی معلوم ہو کہ وہ بھی نمازِ جنازہ پڑھ کر مسجد سے نکل رہے ہیں۔

جنازہ قبرستان کی طرف جاتا دیکھنے والے راہگیروں کا رویہ بھی قابلِ توجہ ہے۔ اگر میت کے ساتھ گنتی کے چند آدمی ہوں تو انہیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی کہ مرنے والا کون ہے؟ لیکن اگر جنازہ کے ساتھ بڑے بڑے لوگ چلتے دکھائی دیں تو پھر یہ لوگ بھاگے بھاگے آئیں گے اور مرنے والے کا نام اور اس کا مرض دریافت کر کے واپس جائیں گے۔ کاریں چلانے والوں کو اس بات پر سخت غصہ آتا ہے کہ جنازے کے ساتھ چلنے والے لوگوں نے راستہ کیوں روک رکھا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ سڑکیں صرف ان کے لئے بنائی گئی ہیں اور جنازے کی وجہ سے انہیں اپنی گاڑی کی رفتار کم کرنا پڑتی ہے اور اس طرح ان کے پٹرول کا نقصان ہوتا ہے۔

قبرستان کی ابتر حالت دیکھ کر سخت وحشت ہوتی ہے ہر طرف لمبی لمبی گھاس اور خود رو پودوں کے اُگ آنے کی وجہ سے وہ قبرستان کم اور جنگل زیادہ معلوم ہوتا ہے۔ قبرستان کے ایک سرے پر ایک شکستہ جھونپڑی ہے جس میں سقہ اپنی بیوی اور دس بارہ بچوں کے ساتھ رہتا ہے۔ اس نے پانچ چھ بکریاں، ایک لنگڑا ٹٹو، سو دو سو مرغیاں اور پانچ چھ بلیاں بھی پال رکھی ہیں۔ قبرستان میں لمبی لمبی گھاس اُگی ہوئی ہے اور اس کی دیوار توڑ کر لوگوں نے راستے بنا لئے ہیں۔ نیم، پیپل اور دیگر درختوں نے قبروں کے تعویذ اور چبوترے توڑ ڈالے ہیں۔ بعض قبریں زمین میں دھنس گئی ہیں اور گڑھوں کی صورت اختیار کر گئی ہیں۔ کسی قبر کا لوحِ مزار غائب کر دیا گیا ہے اور کسی شکستہ چبوترے کی اینٹیں سقّے نے اپنی جھونپڑی تعمیر کرنے کے لئے اکھاڑ لی ہیں۔ سقّے کا بستر پھولوں کی سیج بنا رہتا ہے کیونکہ جونہی لوگ اپنے کسی عزیز کی قبر پر تازہ پھول چڑھا کر جاتے ہیں، سقّے کے بچّے انہیں سمیٹ لاتے ہیں اور بستر پر لا کر بچھا دیتے ہیں۔ صبح اٹھ کر باسی پھول پھر قبر پر بکھیر دیتے ہیں۔ اگر کسی قبر پر مزار کا پتھر اچھی قسم کا ہو تو سقہ اسے اکھاڑ کر اپنی جھونپڑی میں لے آتا ہے اور اس سے اس کی بیوی مسالہ پیسنے کے لئے سِل بٹّے کا کام لیتی ہے۔ اس کی بکریاں قبروں پر دوڑتی پھرتی ہیں اور مُرغیاں دانے دُنکے کی تلاش میں انہیں کریدتی رہتی ہیں۔ سقّے کے بچّے یا تو قبروں کے چبوتروں پر لیٹے رہتے ہیں یا ان کے سرہانے نصب شدہ پتھر کو گھوڑا بنا کر سواری کرتے ہیں۔ اس کا ٹٹو بھی قبروں پر گھاس چرتا رہتا ہے اور کودتے پھلانگتے وقت قبروں کو توڑتا پھوڑتا ہے۔

جونہی جنازہ قبرستان میں لاکر رکھا جاتا ہے۔ لوگ کھدی ہوئی قبر کے معائنے کے لئے ایک ایک کر کے آتے ہیں۔ کوئی زمین کو سخت بتاتا ہے۔ کوئی کھدائی کرنے والوں کو سخت سست کہتا ہے کوئی لکڑی کے ان تختوں میں نقص نکالتا ہے جو قبر کا منہ بند کرنے کے لئے منگوائے گئے ہیں اور کوئی قبرستان کے محافظ کو کوستا ہے جب وہ تبصرہ آرائی سے فارغ ہو جاتے ہیں تو وقت گذارنے کے لئے دو دو تین تین آدمی ایک ایک قبر پر جا بیٹھتے ہیں اور سگریٹ یا بیڑی پینے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ بعض لوگ موقع غنیمت جان کر اپنے مرے ہوئے عزیزوں کی قبروں پر پہنچ جاتے ہیں تاکہ فاتحہ پڑھ لیں۔ ایک صاحب قبروں کے کتبے پڑھنے میں مصروف ہیں۔ اگر کوئی اچھی عبارت والا کتبہ مل جائے تو دوسروں کو بھی بلا کر پڑھواتے ہیں۔ جو لوگ قبروں کے چبوتروں پر بیٹھے ہیں، ان میں سے کچھ دنیا بھر کی خبروں پر تبصرہ کر رہے ہیں کچھ دفتری کارروائیوں پر بحث کر رہے ہیں بعض لوگ دفتر میں اڑنے والی افواہوں کی تائید و تردید کر رہے ہیں، بعض افراد بڑے افسروں سے سفارشیں کروا رہے ہیں۔ اور بعض سفارشیں پوری کروانے کے وعدے لے رہے ہیں۔ یعنی تعزیت کرنے اور موت سے عبرت پکڑنے کے علاوہ اور سب کچھ ہو رہا ہے۔

جونہی اطلاع ملتی ہے کہ قبر تیار ہو گئی ہے تو کچھ لوگ اٹھ کر قبر کے گرد جا کھڑے ہوئے اور کچھ چبوتروں پر بدستور بیٹھے رہے۔ دو ایک میت کو قبر میں اتارنے سے پہلے گلاب اور عود چھڑکنے لگے اور بعض نے میت کے اوپر پڑی ہوئی چادر سمیٹ کر اسے بل دینے شروع کئے تاکہ اس کے سہارے مردے کو قبر میں اتار سکیں۔ مردے کو دفن کرتے وقت پھر غل غپاڑہ مچتا ہے۔ قبر میں اترے ہوئے آدمی پریشان ہیں کہ مشورے دینے والوں میں سے کس کی بات مانیں اور کس کی نہ مانیں کیونکہ قبر کے کنارے کھڑا ہر آدمی مشورہ دے رہا ہے۔ بہرحال خدا خدا کر کے مردہ قبر میں اتارا جاتا ہے۔ اس کے بعد قبر کا منہ بند کرنے کے لئے لکڑی کے تختے چنے جاتے ہیں اور مٹی ڈالی جاتی ہے اور مرنے والے کی بخشش کی دعا مانگی جاتی ہے۔ سب کے ہونٹ ہلتے ہیں لیکن بیشتر لوگوں کو پتہ ہی نہیں کہ فاتحہ میں کیا پڑھنا ہے؟ بس ایک رسم پوری کی جاتی ہے اور پھر جنازے کے شرکاء اپنے اپنے گھر کی راہ لیتے ہیں۔ یہ ہے وہ سلوک جو زندہ لوگ اپنے مرنے والے دوستوں کے ساتھ کرتے ہیں۔ خدا سے دعا ہے کہ وہ اپنے ان بندوں کو نیک ہدایت دے۔ ان کے دل میں سچی ہمدردی پیدا کرے، اور اسلامی احکام پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی بحوالۂ متن، سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

جو لوگ چبوتروں پر متمکن ہیں، ان کی کچھ نہ پوچھو۔ ہر چبوترہ ایک پارلیمنٹ ہے اور ہر قبر ایک اجلاس۔ دُنیا بھر کی خبروں پر تنقیح و تنقید ہو رہی ہے۔ دفتر کی کارروائیوں پر بحث ہو رہی ہے افواہوں کے ذرائع اور ان کی تصدیق و تردید کی جا رہی ہے۔ سفارشیں ہو رہی ہیں، وعدے لئے جا رہے ہیں۔ غرض سب کچھ ہو رہا ہے۔ نہیں ہو رہا ہے تو وہ جو ہونا چاہیئے اور جس غرض سے ساتھ آئے ہیں۔

جواب | **حوالۂ متن** | یہ عبارت مرزا فرحت اللہ بیگ کے مضمون "زندہ بدست مردہ" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس عبارت سے پہلے مصنف بتاتا ہے کہ آج کل لوگوں کے دل خلوص سے خالی ہو گئے ہیں۔ سچی محبت کی جگہ ظاہر داری نے لے لی ہے۔ اب نہ تو زندگی میں کوئی اپنے عزیزوں کا اخلاص سے ساتھ دیتا ہے اور نہ مرنے کے بعد آخری رسوم ادا کرتے وقت ہمدردی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ محلے میں ایک صاحبِ حیثیت شخص کے انتقال پر اس کے دوست احباب جنازہ میں شرکت کے لئے جمع ہوتے ہیں اور بجائے پسماندگان کو پرسا دینے کے مرحوم کے مکان کے باہر کھڑے ہو کر تعزیت کے لئے آئے ہوئے دوسرے لوگوں سے گفتگو میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ جنازے کے ساتھ پیدل چلنے کی بجائے اپنی گاڑی میں بیٹھ کر قبرستان پہنچتے ہیں۔ مسجد میں نمازِ جنازہ میں شریک ہونے کی بجائے دیوار کی اوٹ میں سگریٹ پیتے اور پان کھاتے ہیں اور قبر کی کھدائی کے دوران، کسی قبر کے پختہ چبوترے پر بیٹھ کر باتیں کرتے ہیں۔ بعض حضرات موقع پا کر اس قبرستان میں دفن اپنے عزیز و اقارب کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے چل دیتے ہیں اور بعض قبروں کے کتبے پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔

اس عبارت کے بعد مصنف بتاتا ہے کہ بالآخر قبر کے کھد جانے کی اطلاع آتی ہے اور مُردے کو قبر میں اتارنے کا مرحلہ آتا ہے۔ کچھ لوگ قبر کے گرد کھڑے ہو جاتے ہیں اور باقی اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہتے ہیں۔ ایک صاحب قبر میں اُتر کر عرق گلاب اور عود چھڑکتے ہیں۔ دوسرے صاحب میت پر پڑی ہوئی چادر اتار کر اُسے بل دیتے ہیں تاکہ وہ میت کے نیچے رکھ کر اور مٹھے کے دونوں سروں کو دو آدمیوں کے ہاتھ میں پکڑوا کر قبر میں اتار سکیں۔ اس دوران قبر کے اندر اُترے ہوئے اصحاب کو قبر کے کنارے پر کھڑے مشورہ دینے والے حضرات نت نئی تجاویز سے پریشان کر دیتے ہیں۔ اس غُل غپاڑے کے ساتھ دوست احباب، مرنے والے کو قبر میں لٹاتے ہیں۔ اس کے بعد قبر بند کرنے کے لئے لکڑی کے تختے بچھانے کی باری آتی ہے۔ یہاں بھی مشورہ دینے والے حضرات تبصرہ کرنے سے باز نہیں آتے۔ آخر میں قبر پر مٹی ڈالی جاتی ہے اور

دعائے فاتحہ پڑھ کر لوگ اپنے اپنے گھر کا رُخ کرتے ہیں۔

تشریح مرنے والے کو اس کی آخری منزل تک پہنچانے کے لئے اس کے دوست احباب قبرستان میں آگئے ہیں اور قبر کی کھدائی ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہیں تاکہ میت کو دفنا کر واپس گھر جا سکیں۔ ابھی چونکہ اس میں کچھ دیر ہے اس لئے تعزیت کے لئے آئے ہوئے لوگ مختلف کاموں میں مصروف ہو گئے ہیں۔ کچھ لوگ اپنے عزیز و اقارب کی قبروں پر فاتحہ پڑھنے کے لئے چلے گئے ہیں اور ایک صاحب، وقت گزارنے کے لئے قبروں کے کتبے پڑھنے لگے ہیں۔ جو حضرات پختہ قبروں کے چبوتروں پر بیٹھے گفتگو میں مصروف ہیں، ان کے کیا کہنے! ہر چبوترہ، ایک مجلسِ قانون ساز بن گیا ہے اور ہر قبر پر گویا قومی اہمیت کا جلسہ ہو رہا ہے۔ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے اس پر سرگرمی سے بحث و مباحثہ ہو رہا ہے، لوگ ہر بات کی چھان بین کر رہے ہیں اور اپنی پسند و ناپسند کا اظہار کر رہے ہیں۔ بعض باتوں کی صفائی پیش کی جا رہی ہے اور بعض امور پر نکتہ چینی ہو رہی ہے۔ کچھ حضرات اپنے اپنے دفتر کی کارگزاری پر بحث کر رہے ہیں اور کچھ دفتر میں پھیلنے والی نت نئی افواہوں کے صحیح یا غلط ہونے کے بارے میں اپنی اپنی رائے پیش کر رہے ہیں۔ اگر ان میں کوئی سرکاری افسر موجود ہے تو اس سے بعض کام کروا دینے کی سفارش کی جا رہی ہے اور اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں وہ جا کر بھول نہ جائے اُس سے وعدے لئے جا رہے ہیں، لیکن جس کام کے لئے یہ لوگ قبرستان میں جمع ہوئے ہیں، اس کی طرف کسی کا دھیان نہیں یعنی مرنے والے کے عزیز و اقارب کو پرسا دینا، دنیا کو سرائے فانی جان کر عبرت پکڑنا اور مرنے والے کی خوبیاں بیان کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی عاقبت کو یاد رکھنا۔

ملّا واحدی (۱۸۸۸ء - ۱۹۷۶ء)

سرورِ کائنات کی معاشرت، عادات و معمولات

تعارف اور پس منظر

مضمون "سرورِ کائنات کی معاشرت، عادات و معمولات"، مُلّا واحدی کی کتاب "حیاتِ سرورِ کائناتؐ" (جلد دوم) میں سے لیا گیا ہے جو ۱۹۵۷ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب کی پہلی جلد میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے وفات تک کے نمایاں واقعات ترتیب وار شامل کئے گئے ہیں (بلکہ ولادت کے وقت اور بعثت سے قبل دُنیا، بالخصوص عرب کا جو حال تھا، وہ بھی مختصر طور پر لکھا گیا ہے) اور جلد دوم میں آپؐ کی معاشرت، گھریلو زندگی، غزوات و سرایا اور معجزات وغیرہ کو موضوع بنایا گیا ہے۔

"سرورِ کائناتؐ کی معاشرت، عادات و معمولات" کتاب کی بالکل ابتداء میں (پہلے باب کے طور پر) درج ہے اور اس میں آنحضرتؐ کی روزمرہ زندگی کے جستہ جستہ واقعات، اخلاق، عادات اور معمولات بیان کئے گئے ہیں۔ مصنف نے حضورِ اکرمؐ کی سیرت و کردار کا نقشہ بڑے خوبصورت انداز میں کھینچا ہے اور مستند و معتبر راویوں کی زبان سے آپؐ کی حیاتِ مبارکہ کے چھوٹے چھوٹے واقعات بیان کئے ہیں۔ آپؐ نے جو کچھ کہا، آپ نے جو کچھ کیا اور آپؐ نے زندگی کے دیگر امور کے بارے میں جس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا، اس کی تفصیلات بڑے سادہ و دلکش انداز میں تحریر کی گئی ہیں۔

مضمون کے آغاز میں حضرت علیؓ کی زبانی، آنحضرتؐ کی عادات و خصائل کا تذکرہ کیا گیا ہے جس میں حضرت علیؓ نے آپؐ کو خندہ جبین، نرم خو، مہربان طبع اور فیّاض بتایا ہے۔ حضرت علیؓ نے چونکہ آپؐ کے گھر میں پرورش پائی تھی، اس لئے وُہ آپؐ کی ذات اور کردار سے بخوبی واقف تھے۔ اُن کی حیثیت ایک معتبر عینی شاہد کی ہے۔ اسی طرح حضرت عائشہ صدیقہؓ اور حضرت ہندؓ بن ابی ہالہ کی زبانی آپؐ کی زندگی کے دیگر معمولات درج کئے گئے ہیں۔ حضرت عائشہؓ آپؐ کی بیوی تھیں اور حضرت ہندؓ آپؐ کے سوتیلے بیٹے تھے، جو حضرت خدیجہؓ کے پہلے خاوند سے تھے اور انہوں نے آنحضرتؐ کے ہاں پرورش پائی تھی۔ چنانچہ ان کی زبان سے آنحضرتؐ کی جو عادات و خصائل بیان ہوئی ہیں، وہ بھی حقیقی اور دیکھی بھالی ہیں۔ آنحضرتؐ کی زندگی کے معمولات سے ایک

شریف، ہنس مکھ، رحم دل، مہذب، شائستہ اطوار، کم گو، غیرت مند، حیادار، خوش معاملہ، خوش مذاق، نرم خو، منکسر المزاج، صادق، امین، عادل، اصول پسند، مستقل مزاج، رجائی اور انسانیت نواز انسان کی تصویر سامنے آتی ہے اور آپؐ کی زندگی کے جستہ جستہ واقعات پڑھ کر آپؐ ایک ایسے انسانِ کامل کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں جس کا ایک ایک فعل بنی آدم کے لئے بہترین نمونہ عمل ثابت ہوتا ہے۔ آپؐ کی سیرت و کردار کی تفصیلات پڑھ کر آپؐ سے محبت ہو جاتی ہے ہر موقع پر آپؐ نے جس طرح اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا، اس سے بہتر ردِّ عمل کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ آپؐ کا فضول باتوں سے پرہیز، دوسروں کو برا بھلا کہنے یا ان کے معاملات کی ٹوہ لگانے سے پرہیز، دوسروں کے سامنے کسی شخص کو ملامت کرنے سے پرہیز، گستاخانہ گفتگو کے جواب میں صبر و تحمل کا مظاہرہ، دوسروں کی غمی خوشی میں شمولیت، سائل کی حاجت پوری کرنے کی ہر ممکن کوشش، خطاؤں پر چشم پوشی، ذاتی انتقام سے اجتناب، عفو و درگزر کی خو، روکھی سوکھی پر قناعت، صلہ رحمی، غریبوں کی امداد، مقروضوں کے قرضوں کی ادائیگی، انسانوں اور جانوروں پر رحم، قول اور فعل میں مطابقت، سلام اور مصافحہ میں سبقت، بیماروں کی عیادت، ہر حال میں پُر اُمید اور راضی برضا رہنے کی فطرت، مجلسی، معاشرتی، ازدواجی اور اخلاقی آداب کا ہر وقت خیال، عبادات میں استقلال، خود کو دوسروں سے ممتاز نہ سمجھنے اور اپنی تعریف پسند نہ کرنے کی عادت، مسلمانوں، کافروں، منافقوں، خطا کاروں، مجرموں، بچوں، بوڑھوں، عورتوں، مردوں، دوستوں، دشمنوں، سب سے رحم دلی کا برتاؤ، تحفوں اور ہدیوں کے جواب میں بہترین تحفے اور ہدیے دینے کا رویہ، انفرادی اور اجتماعی احسانوں کا بدلہ دینے میں پیش پیش رہنے کا طرزِ عمل — ان سب اوصاف کا ایک ہستی میں جمع ہونا، انسانی تاریخ کا ایک معجزہ ہے اور حقیقت یہ ہے کہ آنحضرتؐ کی ذات میں یہ تمام خوبیاں بدرجہ اتم موجود تھیں۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۱۱ سرورِ کائنات: دنیا کا سردار، مراد ہے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ معاشرت: رہن سہن۔ معمولات: روزمرہ کی باتیں، وہ باتیں جن کی عادت ہو۔ مرتضیٰ: پسند کیا گیا، مقبول، حضرت علیؓ کا لقب۔ خصائل: خصلت کی جمع، عادتیں۔ خندہ جبین: ہنس مکھ، نرم مزاج۔ مہربان طبع: طبیعت میں رحم رکھنے والا، رحم دل۔ فیاض: سخی۔ نتیجہ خیز: حالات پر نظر کر کے انجام اخذ کرنے والی باتیں، کار آمد، مفید۔ بحث مباحثہ: جھگڑا اور تکرار۔ بعید: دور۔ ٹوہ لگانا: کھوج لگانا، پتہ لگانا۔ بے باک: نڈر، آزادانہ۔ گستاخانہ: بے ادبی والی۔ تحمل: صبر اور برداشت۔ احسان: کسی کے ساتھ نیکی کرنا، بھلائی کرنا، اچھا سلوک کرنا۔

ص ۱۱۲ حتی المقدور: جہاں تک ہو سکے، جس حد تک ممکن ہو۔ اغماض: چشم پوشی، بے پروائی، لاتعلقی۔ مزاج شناس: طبیعت کی پہچان رکھنے والے، مزاج جاننے والے۔ اصحاب: صاحب کی جمع، دوست، ہم نشین۔ تیور: نظر۔ صورت اور نگاہ کا انداز۔ خصائل: عادات حضرت عائشہ صدیقہ: آنحضرتؐ کی محبوب بیوی اور حضرت ابوبکرؓ کی بیٹی، جنہوں نے حضرت ابوہریرہؓ کے بعد سب سے زیادہ حدیثیں روایت کی ہیں۔ ہند بن ابی ہالہ: حضرت خدیجہؓ سے اُن کے پہلے خاوند ابی ہالہ بن زرارہ تمیمی کے بیٹے، جنہیں حضرت خدیجہؓ سے شادی کے بعد آنحضرتؐ نے پالا۔ وہ مشہور صحابی ہیں، آنحضرتؐ کا مفصل حلیہ ان ہی کی روایت سے منقول ہے۔ روایت: کسی کی بات (یہاں مراد آنحضرتؐ کی بات) زبانی نقل کرنا۔ درگزر: معافی، چشم پوشی، نظر انداز کرنا۔ شیوہ: عادت، دستور، طریقہ۔ زدوکوب: مارنا پیٹنا۔ حافظہ: یاد، یاد رکھنے کی قوت۔ گودیوں کے کھلائے ہوئے: بچپن سے جسے پالا ہو۔ ناک بھوں چڑھانا: بدمزہ ہونا، ناراض ہونا۔ نوش فرمانا: کھانا کھانا، تناول فرمانا۔ اظہار تشکر: شکریہ ادا کرنا۔ حضرت جبرئیل: خدا کا وہ مقرّب فرشتہ جو پیغمبروں پر وحی لاتا تھا۔ غار حرا: مکّہ معظّمہ کے قریب ایک پہاڑی جس کے غار میں رسول اللہ نبوّت ملنے سے پہلے عبادت کیا کرتے تھے۔ صلۂ رحم: عزیز و اقارب سے محبّت کا سلوک۔ رشتے داروں سے تعلقات جوڑے رکھنا۔ غرباء: غریب کی جمع۔ مقروض: وہ شخص جس پر قرض ہو۔ مصیبت زدہ: غموں کا مارا۔

ص ۱۱۳ قبل: پہلے۔ ایمان: یقین کرنا۔ حقانیت: سچائی۔ سکّہ بٹھانا: رعب وداب اور اثر قائم کرنا۔ کَانَ خُلُقُہٗ قرآن: ترجمہ، قرآن آپ کا اخلاق تھا۔ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَالَا تَفْعَلُوْنَ: ترجمہ، کیوں کہتے ہو وہ بات، جو خود نہیں کرتے (یعنی جس پر خود عمل نہیں کرتے) سورۂ صف آیت نمبر۳)۔ اِنَّکَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ: بے شک آپؐ اخلاق کے بلند ترین درجے پر ہیں (سورۃ القلم آیت نمبر۴)۔ متوازن: موزوں اور متناسب۔ اعتدال: میانہ روی، نہ کمی نہ زیادتی۔ غلُو: بے حد مبالغہ کرنا۔ بات بڑھا چڑھا کر پیش کرنا۔ مبالغہ کی وہ قسم جس میں متکلّم کا مدعا حسب عقل و عادات محال ہو۔ معتدل: میانہ روی پر مبنی۔ موسلا دھار بارش: بہت زور زور سے ہونے والی بارش۔ تقاطر: بوندا باندی۔ استقلال: مستقل مزاجی، ثابت قدمی۔

ص ۱۱۴ نفل: زائد عبادت جو ثواب کی نیت سے ادا کی جائے۔ فرض نماز سے زائد نماز بطور شکرانہ ادا کرنا۔ روایت: کسی کی بات زبانی نقل کرنا۔ عیادت: بیمار کو پوچھنا، مزاج پرسی کرنا۔ مثل فرض: فرض کی مانند ہے۔ فرض کے معنی ہیں خدا کا حکم۔ منغّص: ناخوش، رنجیدہ، افسردہ، مکدّر۔ بدفالی: بدشگونی۔ قید: پابندی۔ سبقت: پہل۔ مصافحہ: ہاتھ ملانا۔ السلام علیکم: تم سب پر سلامتی ہو۔ اوّل: پہلے۔

ص ۱۱۵ دستک: دروازہ کھٹکھٹانا۔ کامل یکسوئی: مکمل توجہ۔ متوجہ: دھیان دینا۔ ممتاز: نمایاں۔ مساویانہ: برابر کا۔ ہمراہی: ساتھ چلنے والا۔ غزوہ بدر: مدینہ سے کوئی اسّی میل کے فاصلہ پر ایک مقام جہاں قریش مکّہ اور مسلمانوں کے درمیان ۲ھ میں پہلی زبردست جنگ ہوئی۔ مسلمانوں کی کمان آنحضرتؐ کر رہے تھے اور کفار مکّہ کی کمان عتبہ بن ربیعہ کے سپرد تھی۔ قلّت: کمی۔ پیادہ پا: پیدل۔ ثواب: نیک کام کا بدلہ جو آخرت میں ملے گا، اچھا بدلہ۔ حاجت مند: محتاج، ضرورت مند۔ اجر: بدلہ، ثواب۔ اصحاب: ساتھی۔

ص ۱۱۶ امین: امانت دار۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ: شروع اللہ کے نام سے جو بہت مہربان اور رحمت کرنے والا ہے۔ بلالحاظ شخصیت: اپنے مقام و مرتبہ کا خیال کئے بغیر۔ مہمان داری: مہمان کی خاطر تواضع کرنا۔ منافق: ریاکار، دل کا کچھ، زبان کا کچھ۔ تامل: جھجک، تذبذب، روک۔ بے دھڑک: بغیر خوف کے، آزادانہ۔ جرأت: دلیری۔ مستحسن: پسندیدہ۔ غلط کار: غلطی کرنے والا۔ ناشائستہ: غیر مہذب، برُے اطوار والی، نامناسب۔ مدت العمر: پوری زندگی میں، تمام عمر۔

ص ۱۱۷ فیاض طبعی: سخاوت۔ حتیٰ کہ: یہاں تک کہ۔ زرہ: لڑائی کی ایک پوشاک جو لوہے کی کڑیوں سے بنی ہوتی ہے، بکتر، جوشن۔ رہن: گروی رکھی ہوئی شے۔ مقروض: جس شخص کے ذمّے قرض ہو۔ مزاج دکھانا: بداخلاقی یا بدمزاجی کا مظاہرہ کرنا۔ خندہ پیشانی: ہنس مکھ ہو کر۔ خوش معاملگی: معاملات میں اچھا ہونا۔ خزانچی: جس کے پاس حکومت یا ریاست کا خزانہ بطور امانت رکھا ہو۔ ہدیہ: تحفہ، نذرانہ۔ قیصر روم: بازنطینی سلطنت کا بادشاہ جس کا دارالحکومت قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) تھا۔ رومن ایمپائر کے بادشاہوں کا لقب قیصر تھا۔ آنحضرتؐ کے زمانے میں ہرقل، قیصر روم تھا، جس کی فوجیں جنگِ یرموک میں مسلمانوں کے مدِّمقابل آئیں۔ پوستین: کسی جانور کی بال دار کھال سے بنا ہوا کوٹ یا بنڈی، جو سردیوں کا پہناوا ہے۔ حضرت جعفر طیّار: آنحضرتؐ کے چچازاد بھائی (جناب ابوطالب کے بیٹے اور حضرت علیؓ کے بھائی) جو جنگ موتہ (۸ھ) میں شہید ہوئے۔ آنحضرتؐ نے فرمایا چونکہ اُن کے دونوں بازو جنگ میں کٹ گئے تھے، اس لئے اللہ تعالیٰ نے انہیں جنّت میں دو پَر عطا کئے ہیں جن سے وُہ اُڑتے پھرتے ہیں۔ نجاشی (شاہِ حبش): آنحضرتؐ کے زمانے میں ملکِ حبشہ کا بادشاہ جس کا نام نجاشی تھا۔ وہ ہجرتِ حبشہ کے موقع پر اپنے دربار میں حضرت جعفر طیّار کی تقریر سن کر خفیہ مسلمان ہو گیا تھا۔ چنانچہ اس کی وفات پر آنحضرتؐ نے اس کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھائی۔ ابوایوب انصاری: ہجرتِ مدینہ کے موقع پر آنحضرتؐ کے میزبان صحابی حضرت ابوایوبؓ انصاری تھے جن کے دروازے پر حضورؐ کی اونٹنی جا کر ٹھہر گئی تھی

اور آنحضرتؐ چھ ماہ تک اُن کے مہمان رہے

ص ۱۱۸ | اُچٹانے: بیزار کرنا، دِل برداشتہ کرنا۔ اشاعت اسلام: دین اسلام کا پھیلاؤ۔ تالیفِ قلوب: دِل جوئی کرنا۔ عدل: انصاف۔ وصف: خوبی۔ کسی آن: کسی لمحے، کسی وقت۔ انگلی اٹھانا: اعتراض کرنا۔ یہودی: حضرت یعقوبؑ کے بیٹے یہودا کی نسل کے افراد۔ عرفِ عام میں بنی اسرائیل (حضرت یعقوبؑ کی اولاد) کو یہودی کہا جاتا ہے جو حضرت موسیٰؑ کو اپنا دینی پیشوا مانتے ہیں۔ مقدمہ: دعویٰ۔ نالش۔ ضابطہ: قانون، قاعدہ۔ تعمیل: عمل کرنا۔ قطعی: یقینی، بے شبہ۔ مکمل یا بالکل ہونا۔ خاندانی عورت: امیر اور اونچے خاندان سے تعلق رکھنے والی۔ تخفیف: کمی۔ حدود اللہ: وہ سزائیں جو اسلامی شریعت کے مطابق دی جائیں۔ اللہ کے مقرر کردہ ضابطے جن کی خلاف ورزی پر سزا ملے۔ زد میں: نشانہ، ضرب، چوٹ۔ غرباء: غریب کی جمع۔ اُمراء: امیر کی جمع۔ اُمتیں: قومیں۔ درگزر: معاف کرنا۔ چشم پوشی کرنا۔ مامور: ضروری کام پر لگایا گیا شخص، مقرر کردہ (خدا کی طرف سے) یہاں مراد پیغمبر اور رسول ہے۔ نوحہ: رونا پیٹنا، ماتم کرنا۔ فعل: عمل۔ مجرم: جرم کرنے والا شخص، قصوروار۔ ٹوہ لگانا: کھوج یا پتہ لگانا۔ قطعی: بالکل۔

ص ۱۱۹ | مدح: تعریف۔ ممدوح: جس کی تعریف کی جائے۔ نفس موٹا ہونا: مغرور ہونا۔ فرستادہ: ایلچی، قاصد، بھیجا ہوا۔ فضیلت: بڑائی، برتری، ترجیح۔ انبیاء: نبی کی جمع۔ خدا کی طرف سے مقرر کردہ بندوں کو ہدایت کرنے والے پیغمبر، جو خود صاحبِ شریعت نہ ہوں۔ خیر البریہ: دنیا کے تمام لوگوں سے بہتر، تمام مخلوق سے بہتر۔ ہم سر: برابر۔ فِينَا رَسُولٌ يَعْلَمُ مَا فِي غَدًا: ترجمہ، ہم میں ایسے رسول (موجود) ہیں جو کل (مستقبل) کا حال جانتے ہیں۔ عزم: پختہ ارادہ۔ استقلال: مستقل مزاجی۔ پیکر: جسم، بدن، مجسمہ، صورت۔ انبیائے کبار: بڑے بڑے نبی اور پیغمبر۔ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ: ترجمہ، تمام رسولوں میں سے صاحبِ عزم و ہمت (یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم)۔ کامل مظہر: مکمل نظارہ، مکمل اظہار کرنے والا شخص، سراپا اظہار۔ یاس انگیز: مایوسیاں ابھارنے والا، نا امیدی والا۔ صحابہ: آنحضرتؐ کی صحبت میں بیٹھنے والے آپ کے مومن ساتھی۔ واللہ: خدا کی قسم۔ صنعا: ملک یمن کا مشہور شہر اور دارالحکومت۔ حضرموت: عرب کے جنوب میں ملک یمن سے متصل علاقہ جو سخت ویران اور دہشت ناک ہے۔

ص ۱۲۰ | خشیۃ اللہ: اللہ کا ڈر۔ نوع: قسم۔ کھٹکا: ڈر، خوف، اندیشہ، خلش۔ کفار: کافر کی جمع۔ منافقین: وہ لوگ جو زبان سے تو ایمان لے آئے تھے لیکن دل بدستور کافر تھے، ریاکار، مکار، دل کے کچھ، زبان کے کچھ۔ اخلاق: انسانیت، مروّت، ملنے جلنے کا مہذب طریقہ،

اخلاق، خلق کی جمع۔ لفظی معنی عادات وخصائل۔ نظرانداز: توجہ نہ کرنا، ٹالنا، دیکھنے سے چھوڑ دینا۔ عبداللہ بن ابی: مدینہ کا ایک سردار، جو بظاہر ایمان لے آیا تھا لیکن درحقیقت سخت منافق تھا۔ غزوۂ احد میں لڑائی سے پہلے اپنے تین سَو ساتھیوں سمیت الگ ہوگیا تھا۔ اُسے "رئیس المنافقین" کہا جاتا تھا۔ گزند: نقصان، تکلیف۔ سلوک: برتاؤ۔ مجلس: بیٹھنے کی جگہ، محفل، صحبت۔ سراپا سنجیدگی: جس میں مکمل وقار اور متانت ہوتی تھی۔ متانت: سنجیدگی۔ خشکی: روکھاپن۔ افسردگی: اُداسی، مکدر، بجھی ہوئی کیفیت، رنجیدگی، مردہ دلی۔ برابر: ایک ساتھ، قریب۔ ضعیف العمر: بوڑھی۔ صحابیہ: آنحضرت پر آپ کی زندگی میں ایمان لانے والی عورت۔ دعائے مغفرت: مرنے کے بعد بخشش کی دعا۔ بُڑھیا: بوڑھی عورت۔

ص ۱۲۱ شباب: جوانی۔ عود کر آنا: لوٹ آنا، پھر آجانا۔ متعین: مامور۔ انتقال: فوت ہونا۔ نماز جنازہ: مردے کو دفن کرنے سے پہلے اُس کی بخشش کے لئے نماز پڑھنا۔ شفقت: مہربانی۔ سواری: بیٹھنے یا سوار ہونے کا جانور مثلاً اونٹ، گھوڑا وغیرہ۔ غزوہ: وہ لڑائی جس میں آنحضرتؐ خود شریک ہوئے ہوں۔ جھپٹ: لپیٹ میں۔ مشرک: خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرانے والا کافر۔ اللہ کی فطرت پر: معصوم اور پاک۔ حق بجا لانا: حقوق پورے کرنا۔ حضرت انسؓ: انس بن مالک، حضورؐ کے خاص خادم تھے۔ آپ صحابی تھے اور آپ نے حضورؐ کی کئی احادیث روایت کی ہیں۔ مقتدی: امام کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے والا۔ چُہل: ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ۔

ص ۱۲۲ سنہرا: بہت خوبصورت، خوش نما۔ فصل: موسم۔ نذر کرنا: پیش کرنا، تحفہ کے طور پر۔ چومنا چاٹنا: پیار کرنا۔ سلب کرنا: چھین لینا۔ انسانیت: اعلیٰ رتبہ۔ مروّت و تہذیب، آدمیت۔ بے روح: بغیر زندگی اور جذبات واحساسات کے۔ مویشی: جانور۔ کنیز: لونڈی۔ ناگوار: ناپسندیدہ۔ ورثہ: مرنے والے کا اثاثہ اور جائیداد جو اس کے رشتہ داروں میں تقسیم ہوتی ہے۔ ارشاد: کچھ کہنا۔ احکام: حکم دینا۔ منزلت: عزت، رتبہ، مقام۔ قلادہ: گلے میں ڈالنے والا پٹہ۔ دُنبہ: ایک قسم کا مینڈھا جس کی دُم چوڑی اور موٹی ہوتی ہے۔

ص ۱۲۳ چکتی: دُنبے کی چوڑی اور گول دُم۔ ایال: گھوڑے کی گردن کے بڑے بڑے بال۔ ممانعت: روک ٹوک، منع کرنا۔ مورچھل: مکھیاں اڑانے والا پنکھا۔ ساز: جنگ کے بھاری ہتھیار، گھوڑے کا چار جامہ وغیرہ تاکہ جنگ میں دشمن کی تلوار، نیزے یا تیر سے زخمی نہ ہو۔ کرسی: بیٹھنے کی چیز۔ نشست گاہ: بیٹھنے کی جگہ۔ منڈلانا: چکر لگانا، بار بار ایک جگہ آنا اور جانا۔ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ: ترجمہ، اور ہم نے تمہیں نہیں بھیجا مگر رحمت سارے جہان کے لئے۔ یعنی (اے محمدؐ) ہم نے آپ کو سارے جہانوں کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے (سورۃ الانبیاء۔ آیت ۱۰۷)

حدیث: آنحضرتؐ کا قول۔ الٰہی: اے اللہ، محدود: مختصر، حد باندھ لینا۔ بدو: عرب کے خانہ بدوش اور جنگلی لوگ۔

ص ۴۴ | بلاشرکت غیرے: کسی اور کو شریک کئے بغیر۔ انسانِ کامل: ہر اعتبار سے مکمل انسان۔ اسوۂ حسنہ: بہترین نمونۂ عمل۔ معیار: کسوٹی، پرکھنے کا پیمانہ۔ درود وسلام: وہ دعا جو آنحضرتؐ کا نام آتے ہی طلب رحمت کے طور پر پڑھی جاتی ہے۔ اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلیٰ مُحَمَّدٍ وَّعَلیٰ آلِ مُحَمَّدٍ: (اے اللہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر درود بھیج اور آپؐ کی آل پر بھی)

سبق کا خلاصہ

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رہن سہن، معمولات اور سیرت و کردار میں ایک مثالی انسان تھے۔ آپؐ ہنس مُکھ، نرم دل، مہربان اور سخی تھے۔ آپؐ کی زبان سے زندگی بھر کوئی بُری بات ادا نہیں ہوئی۔ آپؐ فضول باتوں میں وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ صرف مفید اور کارآمد باتیں کیا کرتے تھے اور کسی کو بُرا بھلا نہیں کہتے تھے۔ کسی کے ذاتی معاملات کی ٹوہ نہیں لگاتے تھے اور کسی کی گستاخی پر صبر و تحمل سے کام لیتے تھے۔ دوسروں پر احسان کرتے تھے لیکن اپنی تعریف سُننا پسند نہیں کرتے تھے۔ ساتھیوں کے ہنسی مذاق میں شریک ہوتے تھے اور کسی کا سوال ردّ نہیں کرتے تھے۔ اگر کسی کی درخواست پوری نہ کر سکتے تو خاموش رہتے تھے۔

آپؐ دوسروں کی خطائیں معاف کر دیتے تھے اور کسی سے ذاتی انتقام نہیں لیتے تھے۔ کسی خادم یا جانور کو کبھی نہیں مارتے تھے۔ آپؐ دوستوں کی محفل میں بھی آداب کا خیال رکھتے تھے آپؐ باتیں آہستہ آہستہ اور ٹھہر ٹھہر کر کرتے تھے جو سُننے والوں کو فوراً یاد ہو جاتی تھیں۔ آپؐ جب بھی اپنے گھر تشریف لاتے تھے تو آپؐ کے چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔

آنحضرتؐ نہ کسی انسان کو بُرا کہتے تھے اور نہ کسی چیز کو۔ جس طرح کا کھانا آپؐ کے سامنے رکھا جاتا، آپؐ چپ چاپ کھا لیتے تھے۔ ذاتی معاملات میں آپؐ نے کبھی ناراضی کا اظہار نہیں کیا۔ چھوٹی چھوٹی باتوں پر آپؐ دوسروں کا شکریہ ادا کرتے تھے۔ آپؐ لوگوں پر مہربانی کرتے تھے غریبوں کی مدد کرتے تھے مقروضوں کے قرض ادا کرتے تھے۔ مصیبت زدوں کے کام آتے تھے۔

آنحضرتؐ کے عادات و خصائل قرآن مجید کے مطابق تھے۔ آپؐ جو کہتے تھے، وہی کرتے تھے آپؐ بہترین اخلاق کے مالک تھے۔ آپؐ کا ہر عمل متوازن ہوتا تھا۔ آپؐ مستقل مزاج تھے۔ جتنی عبادت کرتے تھے، پابندی کے ساتھ کرتے تھے۔ آپؐ بیماروں کی عیادت کے لئے تشریف لے جایا

کرتے تھے اور انہیں دلاسا دیتے اور اُن کے لئے صحت کی دُعا کرتے تھے۔ بیمار پُرسی میں آپؐ مسلمان اور کافر میں فرق نہیں کرتے تھے بلکہ جو بھی بیمار ہوتا اُس کی دلجوئی کے لئے تشریف لے جاتے۔ حضورِ اکرمؐ سلام کرنے میں دوسروں سے پہل کرتے تھے۔ راستہ خاموشی سے طے کرتے تھے البتہ کوئی راستے میں مل جاتا تو اُسے سلام ضرور کرتے تھے۔

آپؐ دوسروں سے ہاتھ ملاتے وقت بھی پہل کرتے تھے اور اس وقت تک ہاتھ نہیں چھڑاتے تھے جب تک دوسرا شخص آپؐ کا ہاتھ نہیں چھوڑتا تھا۔ آپؐ جب بھی کسی کے گھر تشریف لے جاتے تو پہلے السلام علیکم کہتے اور پھر اندر آنے کی اجازت طلب فرماتے۔ دوسروں کو بھی یہی تلقین فرماتے تھے کہ اجازت لئے بغیر کسی کے گھر میں نہ جایا کرو۔ آپؐ کسی کے گھر جاتے تو دروازے پر تین دفعہ دستک دیتے تھے اور اگر جواب نہ ملتا تو واپس تشریف لے جاتے۔

آنحضرتؐ ہر شخص کی بات پوری توجہ کے ساتھ سُنتے تھے۔ محفل میں بیٹھتے تو کسی نمایاں جگہ پر بیٹھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ دوسروں کے ساتھ آپؐ بھی کام میں شریک ہوتے تھے۔ آپؐ سب کے ساتھ برابر کا سلوک کرتے تھے۔ دوسرے پیدل چلتے تھے تو آپ بھی پیدل چلتے اور اگر دوسرے سوار ہوتے تو آپؐ بھی سوار ہوتے۔

آپؐ اپنے سب کام اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے۔ بندوں سے صلہ پانے کے لئے نہیں کرتے تھے۔ آپؐ یہ بھی پسند نہیں کرتے تھے کہ لوگ آپؐ کی محبّت میں حد سے تجاوز کر جائیں، اسی لئے آپؐ ارشاد فرماتے تھے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی محبت حاصل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انسان سچ بولے۔ پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے اور امانت میں خیانت نہ کرے۔

آپؐ ہر کام اللہ کا نام لے کر شروع کرتے تھے۔ کچھ تقسیم کرنا ہوتا تو دائیں طرف سے شروع کرتے۔ مسجد میں نمایاں ہوئے بغیر تشریف لے جاتے تھے اور دایاں پاؤں پہلے مسجد میں رکھتے۔

آپؐ بڑے مہمان نواز تھے۔ اگر کسی شخص نے مسلمانوں پر کوئی احسان کیا ہوتا تو آپؐ مدینہ میں خود اس کی مہمان نوازی کرتے۔ آپؐ نہ بُروں کو بُرا کہتے اور نہ منافقوں کو منافق۔ اگر کسی شخص کا کوئی فعل آپؐ کو ناپسند ہوتا تو آپؐ زبان سے اس کا اظہار نہیں کرتے تھے بلکہ اس کا چہرہ آپؐ کی ناپسندیدگی کو ظاہر کر دیتا تھا یا پھر آپؐ کسی سے کہتے کہ وہ اس شخص کو غلط کام کرنے سے روکے یا اُسے سمجھا دے کہ ایسی حرکت نہ کرے۔ اگر مجبوراً خود سمجھانا پڑتا تو کسی اور وقت، بغیر نام لئے اس آدمی کی حرکت کو نامناسب قرار دیتے تاکہ وہ دوسروں کے سامنے شرمندہ نہ ہو۔

آپؐ نے ساری عمر نہ تو کسی کو بُرا بھلا کہا اور نہ کسی سے ذاتی انتقام لیا۔ آپؐ اگر کسی سے کوئی چیز لیتے تو اسے اصل سے بہتر چیز پیش کرتے۔ آپؐ اتنے سخی تھے کہ مانگنے والے کی حاجت

پوری کرنے کے لئے اکثر قرض لے لیتے جو بر وقت ادا بھی کر دیتے۔ آپ کو قرض کی ادائیگی کا اتنا خیال تھا کہ اگر کسی مردے کے ذمے قرض ہوتا تو پہلے اس کا قرض ادا کرنے کا حکم دیتے اور پھر اس کی نماز جنازہ پڑھاتے۔

آپؐ کی سخاوت کا یہ حال تھا کہ کبھی کسی سائل کو نہ نہیں کی۔ آپ کے پاس جو کچھ ہوتا، مانگنے والے کو دے دیتے۔ اگر پاس کچھ نہ ہوتا اور قرض نہ ملتا تو سائل کو کسی اور وقت آنے کی تلقین کرتے۔ آپ دوسروں کے تحفے قبول فرمایا کرتے تھے اور ان کو جواباً تحفے بھیجا کرتے تھے۔

آپؐ لوگوں سے محبت کرتے تھے اور ان کی دل جوئی کا پورا خیال رکھتے تھے۔ آپؐ امانت دار بھی تھے اور عادل بھی۔ چنانچہ مکّے کے کافر شدید مخالفت کے زمانے میں بھی اپنی امانتیں آپؐ کے پاس رکھتے تھے۔ آپؐ اتنے منصف مزاج تھے کہ مدینے کے یہودی اپنے مقدمے آپؐ کے پاس لاتے تھے۔ آپ لوگوں کے ساتھ نرمی اور مہربانی سے پیش آتے، لیکن جہاں دین کی پابندی کا معاملہ ہوتا، وہاں کسی قسم کا سمجھوتہ نہیں کرتے تھے، خدا کی مقرر کردہ حدود کا خیال رکھتے تھے اور اس سلسلے میں کسی امیر یا غریب میں فرق نہیں کرتے تھے۔ مدینہ میں ایک دفعہ ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کی تو آپؐ نے اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا اور کسی کی سفارش قبول نہیں کی۔ مجرم کو سزا ضرور دیتے لیکن اس کے انجام پر آپؐ کو بے حد رنج ہوتا۔ آپ لوگوں کے عیب تلاش کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح آپؐ اپنی بے جا تعریف بھی اچھی نہیں سمجھتے تھے۔ آپؐ کا ارشاد تھا کہ میرے لئے فضیلت کے وہ الفاظ استعمال نہ کئے جائیں، جو اللہ نے دوسروں کے لئے استعمال کئے ہیں۔ آپؐ اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو بھی پسند نہیں کرتے تھے، بلکہ اس کی راہ میں صبر و تحمل کے ساتھ سختیاں برداشت کرنے کی نصیحت کرتے تھے۔ آپؐ کو اسلام کی کامیابی اور عرب میں مکمل امن و امان قائم ہونے کا مکمل یقین تھا۔ آپؐ دوسروں کے لئے رحمت بن کر آئے تھے، اسی لئے آپؐ انہیں بد دعا نہیں دیتے تھے۔ کفار اور منافقین کے ساتھ بھی آپؐ انتہائی اخلاق سے پیش آتے تھے۔

آپؐ جس محفل میں تشریف رکھتے تھے وہ سنجیدہ ہوتی تھی لیکن آپؐ روکھے پن اور مُردہ دلی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آپؐ کسی آدمی کو حقیر نہیں سمجھتے تھے۔ معمولی خاکروب بھی فوت ہو جاتا اور آپؐ کو معلوم ہو جاتا تو آپؐ اس کی نمازِ جنازہ پڑھتے۔ آپؐ بچوں پر خاص طور پر مہربان تھے۔ اگر آپؐ کسی سواری پر ہوتے تو راستے میں جو بچہ مل جاتا اُسے اپنے ساتھ بٹھا لیتے۔ جنگ میں بچوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا کرتے تھے اور آپؐ کا ارشاد تھا کہ ہر بچہ معصوم اور نیک فطرت ہوتا ہے۔ آپؐ ماں اور بچّے کی محبت دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے۔ اگر عورتیں آپؐ کے پیچھے نماز پڑھ

رہی ہوتیں اور کوئی بچہ رونے لگتا تو آپؐ نماز مختصر کر دیا کرتے تھے۔ بچوں کے ساتھ ہنسی مذاق کی باتیں بھی کیا کرتے تھے۔ اگر تازہ پھل تحفے میں ملتے تو سب سے پہلے بچوں میں تقسیم کرتے۔

آنحضرتؐ نے عورتوں کو ان کے حقوق دلائے۔ ان کا مرتبہ بحال کیا۔ انہیں مردوں کے برابر جگہ دی۔ آپؐ نے جانوروں کو بھی بہت سی مصیبتوں سے چھڑایا۔ انہیں بے جا تکلیف دینے سے منع فرمایا۔ آپؐ نے اپنی رحمت کو انسان، حیوان، دوست، دشمن، مسلم، غیر مسلم، عورت، مرد، بچے، بوڑھے سب میں برابر تقسیم کیا۔ لوگوں کو سبق دیا کہ جو اپنے لئے پسند کرو، وہی دوسروں کے لئے کرو۔ اللہ کی رحمت کو صرف اپنے لئے اور اپنے نبی کے لئے محدود کرنے سے منع فرمایا۔ آنحضرتؐ سے بڑھ کر کوئی انسان کامل نہیں ہوا اور آپؐ کی ذات اور آپؐ کا کردار بنی نوع انسان کے لئے ابدی نمونہ ہے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی تشریح کیجیۓ۔ حوالۂ متن اور سیاق سباق بھی درج کیجیۓ۔

مکے کا یاس انگیز دور تھا۔ متواتر ناکامیوں سے متاثر ہو کر صحابہ کی زبان پر کچھ مایوسانہ الفاظ آ گئے۔ حضورؐ کا چہرہ غصے کے مارے سرخ ہو گیا۔ فرمایا۔ کیا کہتے ہو؟ تم سے قبل مسلمان آروں سے چیرے جا چکے ہیں۔ ان کی کھالیں نوچی جاتی تھیں۔ واللہ اسلام ایک دن کامیاب ہو گا۔ صنعا اور حضر موت کے درمیان کا سا خطرناک راستہ اکیلا انسان طے کرے گا اور اسے خشیۃ اللہ کے سوا کسی نوع کا کھٹکا نہیں رہے گا۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت ملا واحدی کے مضمون "سرورِ کائناتؐ کی معاشرت، عادات و معمولات" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنف بتاتا ہے کہ آنحضرتؐ اپنے عادات و خصائل اور معمولات میں ایک مثالی انسان تھے۔ آپؐ ہنس مکھ، مہربان، مہمان نواز اور فیاض شخص تھے۔ آپؐ اپنی زبان سے کسی کی برائی نہیں کرتے تھے۔ آپؐ دوسروں کی گستاخیوں پر صبر سے کام لیتے تھے۔ اپنے ساتھیوں کے ہنسی مذاق میں برابر شریک ہوتے تھے اور کسی مانگنے والے کو مایوس نہیں کرتے تھے۔ آپؐ دوسروں کی غلطیاں معاف کر دیتے تھے۔ کسی سے انتقام نہیں لیتے تھے۔ انسانوں اور جانوروں کو تکلیف نہیں پہنچاتے تھے۔ دوستوں کی محفل میں بھی آدابِ مجلس کا خیال رکھتے تھے۔ گھر تشریف لاتے تو چہرے پر مسکراہٹ ہوتی تھی۔ جیسا بھی کھانا آپؐ کے سامنے رکھ دیا جاتا آپؐ چپ چاپ اسے کھا لیتے

کوئی احسان کرتا تو آپؐ اس کا بدلہ ضرور دیتے اور اس کا شکریہ ادا کرتے۔ آپؐ کا ہر عمل قرآن کے مطابق تھا۔ آپؐ جو کہتے وہی کرتے۔ آپؐ اعمال میں میانہ روی اختیار کرتے تھے۔ عبادت پابندی کے ساتھ کرتے تھے۔ بیماروں کی عیادت کے لئے تشریف لے جاتے اور اُن کی صحت کی دُعا کرتے۔ سلام کرنے اور ہاتھ ملانے میں ہمیشہ پہل کرتے۔ کسی کے گھر بلا اجازت داخل نہ ہوتے۔ محفل میں ہر شخص کی بات پوری توجہ سے سنتے۔ اپنے اور مسلمانوں کے مہمانوں کی خاطر تواضع میں پیش پیش رہتے۔ اتنے سخی تھے کہ قرض لے کر بھی حاجت مند کی غرض پوری کرتے تھے۔ آپؐ امین اور عادل تھے۔ دین کے معاملے میں کسی رُو رعایت کے قائل نہ تھے اور حدود اللہ کی پوری پابندی کرتے تھے۔ اپنی تعریف پسند نہیں کرتے تھے۔ عزم و استقلال کے پیکر تھے اور ہر کام اللہ کی خوشنودی کے لئے کرتے تھے۔

اس عبارت کے بعد مصنّف بتاتا ہے کہ آپؐ کی رحمت، مسلمانوں کے علاوہ کافروں اور منافقوں پر بھی تھی اور آپؐ چاہتے تھے کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؐ ان سے انتہائی اخلاق کے ساتھ پیش آتے تھے۔ آپؐ نے کبھی کسی کو بد دعا نہیں دی۔ آپؐ محفل میں سنجیدہ تو رہتے تھے لیکن روکھے پن اور مُردہ دلی کو پسند نہیں کرتے تھے لوگ ہنسی مذاق کی باتیں کرتے تو آپ بھی ان سے لطف اندوز ہوتے۔ آپؐ کسی شخص کو حقیر نہیں سمجھتے تھے معمولی خاکروب بھی فوت ہو جاتا تو اس کی نماز جنازہ پڑھتے۔ آپؐ بچوں پر خاص طور پر مہربان تھے۔ کہیں سے سواری پر تشریف لا رہے ہوتے تو جو بچہ راستے میں ملتا، اُسے اپنے ساتھ سوار کر لیتے۔ جنگ میں بچوں کے قتل سے منع فرماتے۔ ماں اور بچّے کی محبّت دیکھ کر بے حد متاثر ہوتے، کوئی تحفہ آتا تو محفل میں سب سے پہلے بچوں میں تقسیم کرتے۔ آنحضرتؐ نے عورتوں کو ان کا صحیح مقام و مرتبہ عطا فرمایا۔ ان کے حقوق بحال کئے، انہیں عزّت بخشی۔ انہیں مردوں کے برابر جگہ دی۔ آپؐ نے جانوروں کو کئی مصیبتوں سے چھڑایا۔ انہیں ہر وقت سواری بنانے سے منع فرمایا۔ آپؐ نے اپنی رحمت کو انسان اور حیوان، مسلم اور غیر مسلم، عورت اور مرد، بچے اور بوڑھے سب میں برابر تقسیم کیا۔ آپؐ نے لوگوں کو سبق سکھایا کہ جو اپنے لئے پسند کرو، وہی اپنے بھائی کے لئے پسند کرو۔ آپؐ انسان کامل ہیں اور آپؐ کی ذات انسانوں کے لئے بہترین نمونہ ہے۔

تشریح

یہ وہ دَور تھا جب مکّے کے حالات، مسلمانوں کے لئے، بڑے مایوس کُن تھے۔ آنحضرتؐ اور آپؐ کے صحابہؓ کی مسلسل تبلیغ کے باوجود، مکّے کے کافر راہ راست پر نہیں آئے تھے اور نہ ان کے مسلمان ہونے کی توقع تھی بلکہ وہ مسلمانوں کو سخت تکلیفیں پہنچاتے تھے۔ یہ حالات دیکھ کر آپؐ کے کچھ ساتھیوں نے زبان سے ایسے الفاظ ادا

کئے جن سے نا امیدی ٹپکتی تھی۔ آپؐ نے جونہی یہ باتیں سنیں، آپؐ بے حد ناراض ہوئے۔ غصّے کی وجہ سے آپؐ کا چہرہ سُرخ ہوگیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ تم ابھی سے مایوس ہو گئے ہو اور مصیبتوں سے گھبرا گئے ہو۔ تم سے پہلے ایسے ایسے صاحبِ ایمان بھی گزر چکے ہیں جنہوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں لیکن اللہ کا نام لینا نہ چھوڑا۔ دشمنوں نے آروں سے اُن کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے، ان کے جسموں سے کھال اتاری گئی لیکن انہوں نے اُف تک نہیں کی۔ خدا کی قسم، تمہاری قربانیاں رنگ لائیں گی اور ایک دن آئے گا جب اسلام ضرور فتحیاب ہوگا۔ اس وقت ملک میں ایسا امن و امان ہوگا کہ یمن کے دارالحکومت صنعا اور اس کے ساتھ والے ویران علاقے حضرموت کا درمیانی راستہ، جو آج بے حد خطرناک ہے، اس وقت محفوظ ہوگا اور اکیلا سوار بھی اُسے بِلا خوف و خطر طے کرے گا اور اس کو سوائے خدا کے ڈر کے اور کسی قسم کا خوف محسوس نہیں ہوگا۔

میاں بشیر احمد (۱۸۹۳ء - ۱۹۷۱ء)

تشکیلِ پاکستان

تعارف اور پس منظر

میاں بشیر احمد ایڈیٹر "ہمایوں" لاہور کا یہ مضمون "اسلامی ہند میں بیداری اور تشکیلِ پاکستان" کے نام سے "ہمایوں" رسالے میں چھپ چکا ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کا پس منظر بھی بیان کیا ہے اور یہ بھی یاد دلایا ہے کہ ہمارے رہنماؤں کی طرف سے پاکستان کو اسلامی جمہوریت کے ترقی پرور اصولوں پر چلانے کا عہد کیا گیا تھا جس کا پورا کرنا ہمارا فرض ہے۔ میاں بشیر احمد نے واضح کیا ہے کہ مسلمانوں کا نصب العین حقیقی اسلام ہے، جس کی بنیاد قرآن مجید کے احکامات پر استوار ہے اور جس نے انسانوں کو صرف خدا کے سامنے سر جھکانا سکھایا ہے۔ پاکستان میں اُس اسلام کا نفاذ ہونا چاہیئے جس کا نمونہ ہمیں اپنے پیغمبر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے عہد کے مسلمانوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ اسلام، صداقت و جرأت، خود اعتمادی و انکساری، امن پسندی و جفاکشی، عدل و مساوات، اور صبر و تقویٰ کے ابدی اصولوں کا علمبردار ہے اور یہ بلا تفریقِ مذہب و رنگ و نسل، سب انسانوں کی خدمت و حفاظت کا سبق سکھاتا ہے اور سب سے مروّت و رواداری کے ساتھ پیش آنے کی تلقین کرتا ہے۔ یہ عورتوں، مزدوروں اور کسانوں کے حقوق کا محافظ ہے اور دولت کی منصفانہ تقسیم پر زور دیتا ہے۔

میاں بشیر احمد نے قیامِ پاکستان کے لئے کی جانے والی تمام کوششوں کا مفصل ذکر کیا ہے اور گزشتہ اڑھائی سو سال کی تاریخ کے اوراق الٹتے ہوئے مسلمانوں کی اہم سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تعلیمی، صحافتی، علمی اور ادبی سرگرمیوں پر بھرپور روشنی ڈالی ہے انہوں نے اورنگ زیب کی وفات (جو ۱۷۰۷ء میں ہوئی) سے ابتداء کرکے، جو دراصل ہندوستانی مسلمانوں کے سیاسی زوال کا نقطۂ آغاز ہے، قیامِ پاکستان (جو ۱۹۴۷ء میں ہوا) تک کے تمام اہم واقعات پر اجمالی نظر ڈالی ہے اور ان تمام سیاسی اور مذہبی تحریکوں کا بطورِ خاص

ذکر کیا ہے، جنہوں نے آہستہ آہستہ قیام پاکستان کی راہ ہموار کی۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز کی مذہبی احیاء کی کوششوں سے مضمون شروع کیا گیا ہے اور سید احمد بریلوی کی تحریک جہاد، سرسید احمد خاں کی مسلمانوں کی تعلیمی اصلاح کی مساعی، نئے اسلامی اداروں کا قیام، قائدِ اعظم محمد علی جناح کی سربراہی میں مسلم لیگ کی کانگریس کی ہندو نواز پالیسیوں کے خلاف مسلسل جد وجہد اور انگریزوں اور ہندوؤں کی مشترکہ سازشوں کا مقابلہ کرتے ہوئے بالآخر قیام پاکستان کی منزل تک رسائی کے سارے مراحل ایک ایک کر کے طے ہوتے دکھائے گئے ہیں۔

میاں بشیر احمد کا موجودہ مضمون اس لحاظ سے بے حد کارآمد اور معلومات افزا ہے کہ اس میں پہلی دفعہ "تشکیلِ پاکستان" کے پس پشت تمام سیاسی، معاشرتی اور مذہبی عوامل کی نشاندہی کی گئی ہے اور تحریکِ پاکستان کا نقطۂ آغاز، ۱۹۴۰ء کی قرار دادِ لاہور کو قرار دینے کے بجائے اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے بعد شاہ ولی اللہ اور ان کے جانشینوں اور بعد ازاں سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کی ہمہ جہت مساعی سے کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم لیگ کی اسلامیانِ ہند کے حقوق کی پاسداری کی ولولہ انگیز داستان بھی (۱۹۰۶ء سے لیکر ۱۹۴۷ء تک) بڑے اجمال کے ساتھ بیان کی گئی ہے۔

قائدِ اعظم محمد علی جناح کے تدبر سے ایک شکست خوردہ گروہ کا ایک پُرعزم اور مضبوط قوم کی شکل میں ڈھل جانا اور مسلمانوں کا بیدار ہو کر قیام پاکستان کے لئے جد وجہد کرنا، موجودہ مضمون کا بنیادی نقطہ ہے اور اسی کے گرد باقی خیالات کا تانا بانا بنا گیا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۲۵ | تشکیل: شکل دینا۔ بنانا۔ اورنگ زیب: عظیم ترین مغل بادشاہ اور شاہ جہان کا تیسرا بیٹا جو ۱۶۱۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۷۰۷ء میں نوّے سال کی عمر میں فوت ہوا۔ ۱۶۵۸ء میں اپنے بڑے بھائی داراشکوہ کو شکست دے کر اور اپنے باپ شاہ جہان کو معزول کر کے بادشاہ بنا۔ اس نے پچاس سال تک حکومت کی، ملک کا انتظام شرع کے اصولوں پر قائم کیا اور ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کے لئے "فتاویٰ عالمگیری" کے نام سے ایک ضخیم کتاب مرتب کروائی۔ وہ خود سادہ زندگی بسر کرتا تھا اور بیت المال کے پیسے کو ہاتھ نہ لگاتا۔ اپنی روزی ٹوپیاں سی کر اور قرآن مجید لکھ کر کماتا تھا۔ وہ درویش بادشاہ کے طور پر مشہور رہے۔ عوام نے اُسے "عالمگیر زندہ پیر" کا لقب دیا جس کا مطلب ہے ایسا بزرگ جس کی زندگی میں اس کی پرستش کی جائے۔ امراء: ارکان سلطنت۔ سطوت:

رعب داب، دبدبہ۔ وسط : درمیان۔ تنزل : زوال، گراوٹ۔ تکمیل : مکمل ہونا۔ مذہبی احیاء : مذہبی عقائد و اعمال کا زندہ ہونا۔ معاشرتی اصلاح : لوگوں کا کردار درست کرنا۔ شاہ ولی اللہ : شاہ عبدالرحیم کے نامور فرزند، ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۷۶۲ء میں فوت ہوئے۔ یہ زمانہ سیاسی اعتبار سے ہندوستان میں اسلام کا عہدِ زوال ہے اور اسی عہد میں شاہ ولی اللہ نے دین کے احیاء و تجدید کا کام کیا۔ ان کی نمایاں صفت ہمہ گیری اور اعتدال پسندی ہے چنانچہ شریعت اور تصوف دونوں سے انہیں یکساں شغف تھا۔ مرہٹوں کے خلاف احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان بلانے اور نجیب الدولہ کو اس کا شریک کرنے میں شاہ ولی اللہ کا ہاتھ تھا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی میں مرہٹوں نے عبرت ناک شکست کھائی اور ان کا زور ٹوٹ گیا۔ شاہ ولی اللہ نے تفسیر، حدیث، تصوف، فقہ، تاریخ اور علم الکلام وغیرہ اسلامی علوم پر بیسیوں کتابیں لکھیں۔ آپ نے قرآن مجید کا فارسی میں ترجمہ بھی کیا۔ "حجۃ اللہ البالغہ" آپ کی مشہور تصنیف ہے۔ جس میں آپ نے شریعت کے حقائق و اسرار بیان کئے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز : شاہ ولی اللہ کے بڑے صاحبزادے تھے۔ وہ ۱۷۴۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۲۳ء میں فوت ہوئے۔ اپنے والد کے شاگرد اور جانشین تھے۔ ساٹھ برس تک علم حدیث کا درس دیا اور اسی میدان میں ان کی چند تصانیف بھی ہیں۔ "بستان المحدثین" اور "تحفۂ اثنا عشریہ" ان کی مشہور کتابیں ہیں۔ انہیں ۱۵۰ علوم سے شغف تھا۔ جن میں موسیقی بھی شامل تھی۔ علم دوست : علم سے محبت رکھنے والے۔ مذموم : بری۔ تخریب : بربادی، تباہی۔ مصلح : اصلاح کرنے والا۔ سید احمد بریلوی : آپ ۱۷۸۶ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۳۱ء میں شہید ہوئے۔ شاہ ولی اللہ کے پوتے شاہ محمد اسمٰعیل شہید آپ کے مرید تھے۔ آپ نے ملک میں دورے کر کے خلقِ خدا کو راہِ راست پر لانے کی کوشش کی۔ شاہ اسمٰعیل شہید کے ساتھ مل کر سکھوں کے خلاف جہاد کیا جنہوں نے مسلمانوں کی مذہبی آزادی سلب کر لی تھی، چنانچہ ہندوستانی مسلمانوں کے علاوہ افغانستان اور قبائلی علاقہ کے مسلمانوں کی مدد حاصل کر کے سکھوں کے خلاف کئی جنگیں لڑیں اور مفتوحہ علاقے میں اسلامی شریعت کا نفاذ کیا۔ بالآخر ۱۸۳۱ء میں سکھوں سے لڑتے ہوئے شاہ اسماعیل شہید سمیت بالاکوٹ کے مقام پر شہید ہوئے۔

ص ۱۲۶ حصول : حاصل کرنا۔ جہاد : کافروں سے لڑائی کرنا۔ جو لوگ مذہبی فرائض کی بجا آوری میں رکاوٹ ڈالیں، ان سے لڑنا۔ مجاہدین : اللہ کے رستے میں لڑنے والے مسلمان۔ قبائل : قبیلہ کی جمع۔ احکام : حکم کی جمع۔ نافذ کرنا : لاگو کرنا۔ غداری : بے وفائی، دشمن سے مل جانا۔ بالاکوٹ : صوبہ سرحد کا ایک مشہور پہاڑی قصبہ، جہاں سید احمد شہید

اور شاہ اسمٰعیل شہید دفن ہیں۔ مساعی: کوشش۔ جانشین: کسی کے مرنے پر اس کی جگہ لینے والا۔
سرسید: سرسید احمد خاں جو ۱۸۱۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۹۸ء میں فوت ہوئے، علی گڑھ تحریک کے بانی تھے جو انہوں نے مسلمانوں کی سیاسی، مذہبی، معاشرتی، تعلیمی، صحافتی، اخلاقی، علمی اور ادبی اصلاح کے لئے چلائی تھی۔ انہوں نے متعدد موضوعات پر کتابیں لکھی ہیں جن میں "خطبات احمدیہ" خاص طور پر مشہور ہے جو کہ آنحضرت صلعم کی سیرت پر کتاب ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے علی گڑھ کالج قائم کیا اور معاشرتی و ادبی اصلاح کے لئے رسالہ "تہذیب الاخلاق" جاری کیا۔ عقیدت مند: گہرا اعتقاد رکھنے والے، معتقد۔ دلی بھروسہ کرنے والے۔ فرائضی تحریک: انیسویں صدی عیسوی کے آغاز (۱۸۰۴ء) میں بنگال میں رونما ہونے والی مذہبی احیاء کی تحریک جس کے بانی حاجی شریعت اللہ (متوفی ۱۸۴۰ء) تھے۔ وہ ضلع فرید پور کے ایک گاؤں بندر کھولہ میں پیدا ہوئے اور نجد کی اصلاحی تحریک (جس کے بانی محمد بن عبدالوہاب تھے) سے متاثر تھے چنانچہ انہوں نے انہیں خطوط پر فرائض (خدائی احکام) کی ادائیگی اور گناہوں سے توبہ پر زور دیا۔ انہوں نے دینی اصلاح اور دعوت و تبلیغ کا بیڑا اٹھایا اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی ہندوانہ رسموں کی مخالفت کی۔ آپ کے بعد آپ کے صاحبزادے حاجی محمد محسن (عرف دُودھو میاں) نے اس تحریک کو زیادہ منظم کیا۔ دُودھو میاں ۱۸۱۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۸۶۰ء میں فوت ہوئے انہوں نے ظالم ہندو زمینداروں کے خلاف مسلمان کسانوں کو منظم کیا اور جیل کی سزا پائی۔ فرائضی تحریک نے ڈھاکہ، فرید پور اور باریسال کی مذہبی زندگی میں خاص طور پر ایک نئی حرکت پیدا کی لیکن اس کا دائرہ اثر محدود رہا اور یہ خالص مقامی تحریک بن کر رہ گئی۔ مومن: صاحب ایمان، مسلمان، یہاں مراد مشرقی بنگال کے وہ غریب مزارعین ہیں، جن پر ہندو زمینداروں نے بعض مشرکانہ ٹیکس لگا رکھے تھے اور ان سے درگا پوجا کے موقع پر زبردستی وصول کرتے تھے۔ ان مزارعوں اور کسانوں کو حاجی شریعت اللہ کے صاحبزادے حاجی محمد حسن (عرف دودھو میاں) نے فرائضی تحریک کے ذریعے اکٹھا کیا اور انہیں ہندوؤں کو ایسے ناجائز ٹیکس ادا کرنے سے روکا۔ ناگفتہ بہ: اتنی خراب اور شرمناک حالت کہ جس کا نہ کہنا ہی بہتر ہو۔ خاک میں ملنا: برباد یا پامال ہونا۔ درپے: پیچھے پڑنا۔ بتدریج: درجہ بدرجہ، آہستہ آہستہ، ایک ایک کر کے۔ ذرائع: ذریعہ کی جمع۔ عتاب: غضب۔ پسپا: پیچھے ہٹنا، شکست کھانا۔ زخموں پر نمک چھڑکنا: تکلیف کی حالت میں مزید تکلیف دینا۔ دُور اندیش: دور کی سوچنے والا، عقلمند۔ ہمدرد ملت: قوم کا خیر خواہ۔ پس ماندہ: پیچھے رہ جانے والی۔ جدوجہد: کوشش،

محنت، مشقت۔

ص ۱۲۷ ۔ ملک ہاتھوں سے گیا ملت کی آنکھیں کھل گئیں: یہ مصرع علامہ اقبال کی ایک پرانی نظم میں موجود تھا، انہوں نے اپنی نظم "خضرراہ" میں استعمال کیا ہے۔ جو "بانگ درا" کتاب میں شامل ہے۔ مصرع کا مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ ہمارا ملک ہندوستان ہمارے ہاتھ سے نکل کر دشمنوں (انگریزوں) کے ہاتھ میں چلا گیا ہے اور یہ امر مسلمان قوم کے لئے انتہائی تکلیف دہ ہے لیکن اس کا یہ نتیجہ ضرور نکلا ہے کہ قوم کو اپنی غفلت کا احساس ہو گیا ہے۔ اب کھویا ہوا ملک تو فوراً ہاتھ نہیں آسکتا لیکن قومی بیداری کو غنیمت سمجھنا چاہیئے کہ شاید اسی طرح ہم دورِ زوال سے نکل سکیں۔ قدامت پسند: پرانے خیالات اور پرانے زمانے کو اچھا سمجھنے والے، ماضی کے پرستار۔ آگاہ: واقف۔ دِقت: دشواری۔ حصول: حاصل کرنا۔ تعاون: ایک دوسرے کی مدد کرنا۔ تصانیف: تصنیف کی جمع۔ طبع زاد (خود اپنے خیالات پر مبنی) کتاب۔ "رسالہ تہذیب الاخلاق": سرسید احمد خاں نے انگلستان سے واپس آکر ۱۸۷۰ء میں یہ رسالہ جاری کیا۔ اس کے مضامین عموماً اخلاق و کردار کی اصلاح کے لئے لکھے جاتے تھے۔ سرسید اور ان کے رفقاء نے اس میں بے شمار مضامین لکھے۔ بحیثیت مجموعی ساڑھے بارہ برس تک یہ رسالہ جاری رہا، کیونکہ وقفے وقفے کے لئے یہ بند بھی ہوتا رہا۔ اس میں اخلاقی، معاشرتی، تعلیمی، مذہبی، سیاسی اور ادبی موضوعات پر کل ۳۳۳ مضامین شائع ہوئے۔ سرسید نے یہ رسالہ انگلستان کے مشہور پرچوں "سپکیٹٹر اور ٹیٹلر" کی طرز پر نکالا جن کے مدیر ایڈیسن اور سٹیل تھے۔ اجراء: جاری کرنا، شائع کرنا۔ مبنی: بنیاد ہونا۔ مساعی: کوششیں۔ تکمیل: مکمل۔ افتتاح: کھولنا، شروع کرنا۔ علی گڑھ کالج: سرسید احمد خاں نے ۱۸۷۷ء میں انگلستان کی درسگاہوں کے نمونے پر علی گڑھ کے مقام پر یہ مدرستہ العلوم کھولا لیکن اس سے دو سال پہلے علی گڑھ ہی میں ابتدائی مرحلے کے طور پر ایم۔ اے۔ او ہائی سکول کھولا گیا۔ سرسید نے ایم۔ اے۔ او کالج کی عمارات کی تعمیر کے لئے پورے ملک کے دَورے کئے اور مالدار مسلمانوں اور مسلمان والیانِ ریاست سے چندے وصول کئے۔ سرسید کی وفات کے بعد یہی کالج آگے چل کر ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ بنا۔ واحد: اکیلا۔ زندہ دلانِ پنجاب: سرسید نے کالج کے چندے کے لئے چار مرتبہ پنجاب کا دورہ کیا۔ پہلی مرتبہ ۱۸۷۳ء میں، دوسری دفعہ ۱۸۸۴ء میں، تیسری بار ۱۸۸۸ء میں اور چوتھی دفعہ ۱۸۹۴ء میں۔ دوسرے دورے میں جو ۱۸۸۴ء میں انہوں نے کیا، لدھیانہ، جالندھر، امرتسر، لاہور، پٹیالہ ہر جگہ ان کا پُرجوش خیر مقدم ہوا اور اہلِ پنجاب نے دل کھول کر ان کی مدد کی، چنانچہ سرسید نے پنجابیوں کی وسیع القلبی سے متاثر ہو کر انہیں "زندہ دلانِ پنجاب" کا

لقب دیا۔ 'زندہ دل' کے معنی ہیں خوش مزاج، کھلے دل کے مالک۔ قدردانی: عزت بڑھانا۔
تقویت: قوت ملنا، طاقت یا سہارا ملنا۔ منادی: پکار۔ اعلان یا ڈھنڈورے کی آواز۔
انجمن حمایت اسلام: لاہور میں ۱۸۸۴ء میں قائم کی جانے والی ایک انجمن جو مسلمانوں کی معاشرتی، معاشی اور تعلیمی بہبود کے لئے وقف تھی۔ اس انجمن نے بہت سے فلاحی اور تعلیمی ادارے قائم کئے۔ لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے اسلامیہ سکول اور کالج کھولے۔ اس انجمن کے کارکنوں نے گھر گھر پھر کر چندہ وصول کیا۔ سر فضل حسین اس کے دس پندرہ سال سیکرٹری رہے۔
آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس: ۱۸۸۷ء میں سرسید نے علی گڑھ میں اس کانفرنس کی بنیاد ڈالی۔ یہ مجلس ہندوستان کے چھ کروڑ مسلمانوں کی تعلیمی بہبود کے لئے قائم کی گئی جو مختلف صوبوں اور مختلف ضلعوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس انجمن کے ذریعے جلسے کر کے مسلمانوں میں جدید تعلیم کے حصول کا شوق پیدا کیا گیا۔ مسلمانوں میں عام بیداری پیدا کرنے میں یہ کانفرنس، علی گڑھ کالج سے بھی زیادہ مفید ثابت ہوئی۔ اس کے جلسوں میں حالی، شبلی، نذیر احمد اور محسن الملک وغیرہ شریک ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کے قیام سے پہلے سیاسی اور نیم سیاسی امور میں کانفرنس ہی قوم کی آواز سمجھی جاتی تھی۔ منعقد: کسی محفل کا برپا ہونا۔ بنارس: ہندوستان کا ایک شہر جو ہندوؤں کے نزدیک بہت مقدس مانا جاتا ہے۔ یہ دریائے گنگا کے کنارے آباد ہے۔ یہاں بے شمار مندر اور گھاٹ ہیں۔ اسے کاشی بھی کہا جاتا ہے۔ موقوف: برطرف کرنا۔ بھاشا زبان: ہندی بولی جو دیو ناگری رسم الخط میں لکھی جاتی ہے جب کہ اردو زبان فارسی رسم الخط میں تحریر کی جاتی ہے۔ بطور: کی حیثیت سے۔ محال: مشکل، قریب قریب، ناممکن۔ انڈین نیشنل کانگرس: ہندوستان کی ایک قومی سیاسی جماعت جو ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔ اس کا مقصد ہندوستانیوں کو سیاسی حالات سے باخبر رکھنا اور ان کے سیاسی اور معاشرتی حقوق کے لئے آواز اٹھانا تھا۔ بعد میں انگریزوں سے آزادی حاصل کرنا اس کا بڑا مقصد بن گیا۔ ابتدا میں وہ قومی جماعت تھی لیکن بعد میں ہندو رہنما اس پر حاوی ہو گئے اور یہ صرف ہندوؤں کے مفادات کی ترجمان بن گئی۔ چنانچہ اکثر مسلمان رہنما اس سے الگ ہو گئے۔ بنا: بنیاد۔ دور اندیشی: دور کی بات سوچنا۔ اہم: ضروری جمہوری طریقہ: وہ اندازِ حکومت جس کے مطابق عوام کی رائے سے ان کے نمائندے چنے جاتے ہیں اور وہ قوم کے معاملات طے کرتے ہیں۔ اس طرزِ حکمرانی میں ہر آدمی کو ووٹ کے ذریعے اپنی رائے ظاہر کرنے کا حق ہوتا ہے۔
امر: بات، معاملہ۔ خوشنودی: رضامندی، خوشی چاہنا۔

ص ۱۲۸ | اسبابِ بغاوتِ ہند: سرسید نے یہ رسالہ ۱۸۵۹ء میں لکھا۔ انہوں نے اس کتابچے میں ۱۸۵۷ء کی انگریزوں کے خلاف بغاوت کے اسباب سے بحث کی ہے، انہوں نے

واضح کیا ہے کہ ہندوستان کی عام رعایا نے نہیں بلکہ صرف دیسی سپاہیوں نے انگریزی حکومت کی حکم عدولی کی تھی اور اس کا سبب بھی ان کی جہالت اور مذہبی تعصب تھا۔ سرسید نے عام مسلمانوں کو بغاوت کے الزام سے بری قرار دیا اور ان الزامات کا برملا ذکر کیا جو لوگ برطانوی حکومت پر لگاتے تھے سر سید نے اس رسالہ میں بڑی جرأت کے ساتھ انگریزوں کی فتح کے فوراً بعد انہیں ان کی غلطیوں پر ٹوکا۔ انہوں نے اس رسالہ کا انگریزی ترجمہ کرواکر ملکہ انگلستان اور اس کی حکومت کے سرکردہ ارکان کو ارسال کیا۔ غدر: بغاوت، افراتفری، یہاں مراد وہ ناکام جنگِ آزادی ہے جو ہندوستانیوں نے انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے لئے لڑی۔ باغیوں نے بوڑھے مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کو اپنا بادشاہ بنانے کا اعلان کیا لیکن بہادر شاہ ظفر کو گرفتار کرکے رنگون بھیجدیا گیا اور بغاوت کو کچل دیا گیا۔ کونسل: حکومت کو صلاح مشورہ دینے والی جماعت۔ نامزد: مقرر، منسوب۔ مفاد: فائدہ۔ پے در پے: بار بار، مسلسل۔ خواب گراں: گہری نیند۔ رفقاء: رفیق کی جمع، مراد ساتھی، دوست۔ محسن الملک: محسن الملک نواب مولوی مہدی علی خاں ۱۸۳۷ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۰۷ء میں فوت ہوئے۔ آپ سرسید کے جانشین اور علی گڑھ کالج ٹرسٹی بورڈ کے سیکرٹری تھے۔ انہوں نے آٹھ نو سال میں سات آٹھ لاکھ روپیہ چندہ جمع کرکے کالج کو نئی زندگی اور نیا وقار دیا۔ آپ ریاست حیدرآباد میں بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے۔ ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں آل انڈیا مسلم لیگ قائم کرنے کا فیصلہ ہوا تو آغا خاں اس کے صدر اور یکے بعد دیگرے نواب محسن الملک اور نواب وقار الملک اس کے سیکرٹری منتخب ہوئے۔ وقار الملک: سرسید کے قریبی ساتھی وقار الملک نواب مولوی مشتاق حسین جو ۱۸۳۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۷ء میں فوت ہوئے۔ نواب محسن الملک کے بعد کالج ٹرسٹی بورڈ کے سیکرٹری بنے اور ساڑھے چار سال تک اس عہدے پر کام کیا۔ انہوں نے سرسید اور محسن الملک کی پالیسی کے برعکس کالج کے یورپین سٹاف کے اختیارات محدود کردیئے۔ انہوں نے رسالہ "تہذیب الاخلاق" میں مذہبی، اخلاقی، معاشرتی اور تحقیقی مضامین بھی لکھے جو ۱۸۹۷ء میں لاہور سے کتابی شکل میں شائع ہوئے مسلمانوں کی سیاسی پسماندگی کو محسوس کرتے ہوئے انہوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کے لئے زبردست کوشش کی اور اس کے سیکرٹری مقرر ہوئے۔ ذکاء اللہ: سرسید احمد خاں کے رفیق اور مشہور مصنف تھے۔ وہ ۱۸۳۲ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۱۰ء میں فوت ہوئے۔ مولوی ذکاءاللہ نے تدریس کے پیشے کو اپنایا اور مختلف کالجوں میں ریاضی، اردو اور فارسی کے استاد رہے۔ انہوں نے تاریخ، جغرافیہ، سائنس، اخلاقیات اور سیاست پر ۱۴۳ کتابیں لکھیں، جن میں سے ۱۲۹ شائع ہوئیں۔ ان کی دس جلدوں پر مشتمل تاریخ ہندوستان بہت مشہور ہوئی۔ کتابوں

کی طرح ان کے مضامین اور مقالات کا دائرہ بھی بے حد وسیع ہے۔ سرانجام دینا: تکمیل کرنا۔ تشکیل: بنانا۔ معاون: مددگار۔ حالی کی مسدس: مراد ہے مسدس "مدوجزرِ اسلام" جو "مسدس حالی" کے نام سے مشہور ہے۔ یہ طویل اصلاحی نظم کتابی شکل میں پہلی بار ۱۸۷۹ء میں شائع ہوئی۔ اس کا ہر بند تین تین شعروں (یا چھ چھ مصرعوں) پر مشتمل ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری میں "مسدس حالی" نے نے قابلِ قدر رول ادا کیا ہے۔ اس نظم میں حالی نے مسلمانوں کی گذشتہ عظمت کا حال بیان کرنے کے بعد موجودہ زوال کا بڑے موثر انداز میں ذکر کیا ہے اور انہیں تلقین کی ہے کہ اپنی پستی کے اسباب دُور کرکے کھوئی ہوئی عظمت دوبارہ حاصل کریں۔ گزشتہ: سابقہ، پچھلی۔ امیر علی: سید امیر علی ۱۸۴۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۲۸ء میں فوت ہوئے۔ ان کی قانونی اور تاریخی کتب مشہور ہیں اور سب انگریزی زبان میں ہیں "سپرٹ آف اسلام" ان کی نمائندہ تصنیف ہے جو آنحضرتؐ کی زندگی اور تعلیمات پر بہترین کتاب ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے تاریخ اسلام بھی لکھی جس کا انگریزی نام "ہسٹری آف سارا سنز" ہے۔ وقعت: عزت، اعتبار، ساکھ۔ تحریکات: تحریک کی جمع، حرکت پیدا کرنے والی چیز۔ رونما: ظاہر۔ جدید علم الکلام: وہ علم جس میں دینی عقائد دلیلوں سے واضح کئے جاتے ہیں۔ سرسید نے اپنی تفسیر قرآن میں اس علم سے کام لے کر کئی مسلمات کا انکار کر دیا ہے۔ مثلاً ابلیس اور فرشتوں کے خارجی وجود سے انکار کیا ہے اور حساب کتاب، جنت و دوزخ کو محض استعارے قرار دیا ہے۔

مساعی: کوششیں۔ بروئے کار آنا: کام میں آنا، عمل میں آنا۔ ندوۃ العلماء: لکھنؤ میں ۱۸۹۴ء میں قائم ہونے والا ایک تعلیمی ادارہ جو اس لئے بنایا گیا کہ اسلامی مدارس کا نصاب زمانے کی ضروریات کے مطابق مرتب کیا جائے۔ اس ادارے نے نصاب تعلیم کی اصلاح کی، علومِ دین کی ترقی میں حصہ لیا۔ علماء کے اختلافی مسائل کو ختم کیا اور ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم قائم کیا جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنعتوں کی تعلیم بھی ہوتی تھی اس کے محرک تو مولوی عبدالغفور ڈپٹی کلکٹر تھے لیکن اس کی تکمیل مولوی محمد علی کانپوری کے ہاتھوں ہوئی جو اس ادارے کے بانی اور ناظم اوّل تھے۔ مولانا شبلی نعمانی، محسن الملک اور وقار الملک نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کی ہر طرح مدد کی۔ ندوۃ العلماء نے بعض بہترین مصنفین پیدا کئے۔ دیوبند: دیوبند کا دینی مدرسہ جو مولانا محمد قاسم نانوتوی کے نام پر "مدرسہ قاسم العلوم" کہلاتا ہے، ۱۸۶۷ء میں قائم ہوا۔ اس کے اصل محرک تو مولوی فضل الرحمٰن (والد علامہ شبیر احمد عثمانی) وغیرہ تھے لیکن مولانا محمد قاسم نانوتوی اور بعدازاں مولانا رشید احمد گنگوہی کی سرپرستی میں اس مدرسے نے بہت ترقی کی۔ آہستہ آہستہ یہ دارالعلوم بہت بڑا ہو گیا۔ چنانچہ اب اس کی ۲۳۰ بڑی بڑی درس گاہیں ہیں جن میں ہزاروں طلبہ تعلیم پاتے ہیں۔ اس مدرسے نے کئی نامور شخصیات پیدا کی ہیں۔ درس گاہ: مدرسہ۔

ص ۱۲۹ | مساعی: کوششیں۔ بےگانگی: اجنبیت، لاتعلقی۔ غائر: وسیع۔ کامل ترین: ہر لحاظ سے مکمل۔ انفرادی: فرد کی۔ اجتماعی: معاشرے کی۔ نشوونما: پھلنا پھولنا۔ اطاعت فرمانبرداری۔ یہاں مراد اطاعتِ الٰہی ہے جو علامہ اقبال کے نظامِ فکر میں تربیتِ خودی کا پہلا مرحلہ ہے۔ یعنی اس قانونِ حیات کی پابندی کرنا جو خالقِ عالم نے ہر مخلوق کے لئے مقرر کیا ہے۔ ضبطِ نفس: خواہشات پر قابو پانا۔ یہ علامہ اقبال کے فلسفہ میں تربیتِ خودی کا دوسرا مرحلہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں کو قابو میں لائے، خصوصاً نفسانی محبّت اور خوف کے جذبات پر، جو سب سے زیادہ قوی ہیں، غالب آئے۔ نیابتِ الٰہی: اللہ تعالےٰ کا نائب یا قائم مقام (خلیفہ) بننا۔ خدا کے احکامات پر خود بھی عمل کرنا اور دوسروں سے بھی اس کی پابندی کرانا۔ یہ اقبال کے فلسفہ خودی میں تربیت کا تیسرا مرحلہ ہے، جس تک انسان، پہلے دو مراحل طے کرنے کے بعد پہنچتا ہے۔ یہ انسانیت کا اوجِ کمال ہے اور اس کا حصول ارتقائے خودی کا بلند ترین نصب العین ہے۔ علامہ اقبال نے تربیت خودی کے یہ تین درجے اپنی پہلی فارسی کتاب مثنوی "اسرارِ خودی" میں بیان کئے ہیں۔ خودی: اپنی ہستی، خودداری، اَنا یا خودشناسی، علامہ اقبال کے نزدیک خودی سے مراد احساسِ نفس یا تعینِ ذات ہے۔ فارسی زبان میں خودی کے دو معانی ہیں (ا) خود کا شعور اور (ii) خود کا حد سے بڑھا ہوا احساس جس کا دوسرا نام تکبّر یا غرور ہے۔ علامہ اقبال نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا بلکہ اپنے آپ کو پہچاننے اور اپنی صلاحیتوں سے کام لینے کے معانی میں استعمال کیا ہے۔ توحید: خدا کو ایک ماننا اور اس کے علاوہ کسی کی حکمرانی قبول نہ کرنا۔ عملاً: عملی طور پر۔ نیز: اور۔ توحیدِ الٰہی: خدا کا ایک ہونا۔ خدا کے ایک ہونے پر یقین کرنا۔ توحیدِ انسانی: انسانی وحدت، تمام انسانوں کا ایک باپ (آدم) کی اولاد ہونے کے ناطے سے ایک ہونا اور ان میں رنگ، خون اور نسل کی بنیاد پر فرق نہ کرنا۔ پرتَو افگن: سایہ، عکس، شعاع، روشنی ڈالنا یا جھلک نظر آنا۔ تقلید: پیروی۔ رجائیت: امید پرستی۔ مومن: خدا پر کامل ایمان رکھنے والا۔ لحظہ: لمحہ۔ آن: شان، ادا، عزت۔ گفتار: بات چیت۔ کردار: عمل، چال چلن۔ برہان: دلیل، نشان، حجت۔ قہّاری: بڑا غالب اور زبردست ہونا۔ غفّاری: بخشش۔ عفو و درگزر۔ قدوسی: تمام عیبوں سے پاک ہونا۔ جبروت: عظمت و بزرگی۔ عناصر: عنصر کی جمع، اصلی اجزاء۔ جگرِ لالہ: لالے کے پھول کا کلیجہ۔ شبنم: اوس کے قطرے۔ اکسانا: ابھارنا۔ نکل گئے ہیں: آگے بڑھ گئے ہیں۔ ؎ چلنے والے نکل گئے ہیں ٭ جو ٹھہرے ذرا کچل گئے ہیں، علامہ اقبال کا یہ شعر ان کی نظم "چاند اور تارے" میں سے لیا گیا ہے۔ جو ان کے پہلے مجموعۂ کلام "بانگِ درا" میں شامل ہے۔ علامہ اقبال نے اس شعر میں چاند کی زبانی ستاروں کو نصیحت کرتے ہوئے کہا ہے

کہ حرکت میں ہی زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ جو رُک جاتا ہے وہ فنا ہو جاتا ہے۔ کائنات کی ہر شئے تیز رفتاری سے اپنی منزل کی طرف گامزن ہے۔ چنانچہ زندگی کی دوڑ میں وہ لوگ آگے نکل جاتے ہیں جو سرگرمِ سفر رہتے ہیں لیکن جو ایک لمحے کے لئے بھی رکتے ہیں، وہ تیز رفتار قافلوں کے پاؤں میں آ کر کچلے جاتے ہیں۔ جدوجہد ترک کرنے والوں کا انجام سوائے موت کے اور کچھ نہیں۔ علامہ اقبال کے اوپر والے تینوں اشعار کی تشریح۔ اہم عبارت کی تشریح نمبر۲ میں ملاحظہ فرمائیں (صفحہ ۱۵۰ تا صفحہ ۱۵۱)

ص ۱۳۰ | رہنما: راستہ دکھانے والے، لیڈر، راہبر۔ آوازہ: شہرت، دھوم، نام وری۔ معاشی: روزی یا خوراک حاصل کرنے کا ذریعہ۔ پس ماندہ: جاہل، پیچھے رہ جانا۔ انحطاط: زوال، پستی۔ صحافت: اخبار نویسی۔ انجمن: محفل، چند آدمیوں کا کسی کام کے لئے کوئی ادارہ بنانا۔ منجملہ: کل میں سے۔ جامعہ عثمانیہ: عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد جس میں تمام علوم اردو زبان میں پڑھانے کا تجربہ کیا گیا جو کامیاب رہا۔ متمدن: مہذب، شہر میں بسنے والا۔ شعبہ: محکمہ کی شاخ۔ امر: بات، کام۔ اظہر من الشمس: سورج سے زیادہ ظاہر ہونا، بالکل واضح ہونا۔ متحد: اکٹھی۔ روایات: روایت کی جمع۔ بیان، پرانا ذکر، دوسرے کی بات نقل کرنا۔ ماضی کے معینہ اصول اور طور طریقے۔ اکارت: برباد، ضائع۔ دھرے کے دھرے رہ جانا: پورے نہ ہونا۔ انڈین نیشنل کانگرس: ہندوستان کی ایک قومی سیاسی جماعت جو ۱۸۸۵ء میں قائم ہوئی۔ تحفظ: حفاظت، بچاؤ۔ قدم اُٹھانا: کوئی کام شروع کرنا۔ بالعموم: عام طور پر۔ حصول: حاصل کرنا۔ صورتِ حال: حالات کی کیفیت۔ دگرگوں: رنگ بدلا ہوا۔ اُلٹ پلٹ، متغیر۔ جاپان: دنیا کے انتہائے مشرق میں ایک ملک جو بحرالکاہل کا ایک جزیرہ ہے۔ اس نے بہت تھوڑی مدت میں علوم و فنون میں حیرت انگیز ترقی کی۔ اس نے بیسویں صدی کے آغاز میں روس پر جنگ میں فتح حاصل کی۔ جذبۂ قومیت: ایک قوم ہونے کا جذبہ۔ تقسیمِ بنگال: ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے انتظامی ضرورت کے تحت صوبہ بنگال کو مسلم بنگال اور ہندو بنگال، دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہندوؤں کے سیاسی اور معاشی مفادات چونکہ مسلم بنگال سے بھی وابستہ تھے، اس لئے انہوں نے اس تقسیم کے خلاف زبردست احتجاج کیا اور کئی سال کی جدوجہد کے بعد بالآخر ۱۹۱۱ء میں اسے منسوخ کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ تحریک: حرکت پیدا کرنے والی چیز۔ یوپی: اتر پردیش، شمالی ہندوستان کا ایک صوبہ، جہاں اردو زبان عام بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ اردو ہندی جھگڑا: ۱۸۶۷ء میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں اردو زبان اور فارسی رسم الخط موقوف کرانے کی کوشش کی جائے اور اس کے

بجائے ہندی بھاشا جاری ہو جو دیوناگری میں لکھی جاتی ہے۔ ہندوؤں نے اُردو کو مسلمانوں کی زبان قرار دیا اور دلیل یہ دی کہ یہ قرآن کے حروف میں لکھی جاتی ہے۔ اس پر پورے ملک میں تنازعہ اُٹھ کھڑا ہوا کیونکہ مسلمانوں کے نزدیک اردو زبان پورے ہندوستان میں بولی لکھی اور سمجھی جاتی تھی اور وہی سرکاری زبان بننے کی مستحق تھی۔ اب ہندو، ہندی کے اور مسلمان، اُردو کے حامی ہو گئے۔ حکماً: جبراً۔ باقاعدہ احکامات جاری کر کے۔

ص ۱۳۱ تمدنی: تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی۔ مسلم لیگ: مسلمانوں کی قومی سیاسی جماعت جو ۱۹۰۶ء میں ڈھاکہ میں قائم ہوئی۔ آغا خاں کو مسلم لیگ کا پہلا صدر منتخب کیا گیا اور وہ ۱۹۱۲ء تک اس عہدے پر فائز رہے۔ اصلاحات: بہتری کی تدبیریں۔ جداگانہ انتخاب: وہ طریقۂ انتخاب جس کے مطابق ہندو، ہندو امیدواروں کو اور مسلمان، مسلمان امیدواروں کو ووٹ دے سکتے تھے۔ تنسیخ: منسوخ کرانا، رد کرانا، باطل ٹھہرانا۔ جنگِ بلقان و طرابلس: بیسویں صدی کی ابتدا میں شمالی افریقہ کے مسلمان ممالک کو کمزور پاکر یورپی ملکوں نے ان پر قبضہ کرنا شروع کیا۔ فرانس نے پہلے ٹیونس اور الجزائر پر قبضہ کیا اور بعد میں مراکش کو بھی غلام بنالیا۔ اٹلی نے ۱۹۱۱ء میں طرابلس پر چڑھائی کر دی۔ ترکی نے اپنی فوجیں بھیج کر طرابلس کا دفاع کرنا چاہا لیکن ناکام رہا اور اٹلی نے ۱۹۱۲ء میں نہ صرف طرابلس بلکہ پورے لیبیا پر قبضہ جما لیا۔ علامہ اقبال کی نظمیں "فاطمہ بنت عبداللہ" اور "حضور رسالت مآب میں"، (ے جھلکتی ہے تری امت کی آبرو اس میں ٭ طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں) اسی دَور کی یادگار ہیں۔ ترکی کو کمزور پاکر یورپین قوموں نے اس کی مقبوضہ یورپی ریاستوں کو بھی بغاوت پر اکسایا چنانچہ طرابلس پر ظلم و ستم ابھی جاری تھا کہ ریاستہائے بلقان نے جن میں یونان، بلغاریہ اور رومانیہ پیش پیش تھیں، ترکی کے خلاف علمِ بغاوت بلند کر دیا۔ اس جنگ میں ترکی نے شکست کھائی اور ایک ایک کر کے تمام یورپی ریاستیں اس کے قبضے سے نکل گئیں۔ جنگِ بلقان اور طرابلس میں متعدد یورپین طاقتیں ایک طرف تھیں اور اکیلا ترکی ان کے مدِ مقابل تھا، اس لئے شکست اس کا مقدر بن گئی۔ قومی: یہاں مراد ملّی یا ملکی ہے۔ بین الاقوامی: دوسری قوموں سے متعلق۔ سیلف گورنمنٹ: حکومتِ خود اختیاری۔ ۱۹۰۷ء میں کانگرس کے ناگ پور اجلاس میں انتہاء پسندوں کے تلک کی رہنمائی میں ہنگامہ کرنے کے بعد دوسرے روز قائدِ اعظم نے اجلاس کے نمائندوں کے کنونشن میں شرکت کی جس میں یہ طے کیا گیا کہ اہلِ ہند اپنے ملک کے داخلی معاملات میں خود مختار حکومت چاہتے ہیں۔ بعد میں یہ مطالبہ اور زور پکڑ گیا۔ چنانچہ مارچ ۱۹۱۳ء میں مسلم لیگ نے بھی حکومتِ خود اختیاری (سیلف گورنمنٹ) کے متعلق قرارداد منظور کی اور ہندوؤں پر زور دیا کہ وہ حکومتِ خود اختیاری کے حصول کے لئے مسلمانوں کی سرگرم تائید اور اتفاقِ رائے حاصل کریں کیوں کہ خود مختار ہندوستان میں مسلمان دوسرے درجے

کے شہری بن کر رہنے کے لئے تیار نہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں آئندہ کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ نے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ میثاقِ لکھنؤ: لکھنؤ کے مقام پر مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان ہونے والا تحریری معاہدہ۔ یہ خبر عام ہونے پر کہ حکومتِ برطانیہ ہندوستان کو دستوری اصلاحات عطا کرنا چاہتی ہے، ہندو اور مسلم رہنماؤں کے مشورے پر دونوں تنظیموں کا اجلاس بیک وقت لکھنؤ میں منعقد ہوا جس میں سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون کرنے کا عہد کیا گیا اور اسے باقاعدہ ایک پیکٹ (معاہدہ) کی شکل دی گئی۔ یہ ہندو مسلم اتحاد کی ایک نئی کوشش تھی اور قائدِ اعظم محمد علی جناح اس میں پیش پیش تھے۔ انہوں نے حکومتِ برطانیہ سے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کو مناسب مدت کے اندر اندر داخلی معاملات میں حکومتِ خود اختیاری دی جائے۔ "میثاقِ لکھنؤ" کے ذریعے مسلم لیگ کی جداگانہ سیاسی حیثیت مسلّم ہو گئی۔ مرکز اور صوبوں میں مسلمانوں کی آبادی کے تناسب سے کونسل کے لئے نشستیں مخصوص کرنے پر مفاہمت ہو گئی اور ہندو مسلم اتحاد کا سفیر بن کر محمد علی جناح پورے برصغیر پاک و ہند میں مشہور ہو گئے۔ بتدریج: درجہ بہ درجہ۔ طوطے کی آنکھیں پھیر لینا: بے وفائی کرنا۔ حصے بخرے کرنا: ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ گاندھی: موہن داس کرم چند گاندھی جو ہندوؤں کے مسلّمہ لیڈر تھے وہ ۱۸۶۹ء میں گجرات (کاٹھیاوار) میں پیدا ہوئے اور ۱۹۴۸ء میں قتل ہوئے۔ انہوں نے انگلستان میں بیرسٹری کی تعلیم پائی۔ کچھ عرصہ جنوبی افریقہ میں بحیثیت قانونی مشیر ملازمت کی اور پھر ۱۹۱۴ء میں ہندوستان واپس آکر ہندوؤں کی قیادت سنبھال لی۔ اگرچہ وہ رسماً کانگرس کے باقاعدہ رکن نہیں تھے۔ لیکن عملاً کانگرس پر انہیں کی حکمرانی تھی۔ انہوں نے عدم تشدد کی پالیسی اپنا کر ہندوستان کو آزاد کرایا۔ ان کی ہندوستان میں وہی حیثیت ہے جو قائدِ اعظم کی پاکستان میں۔ ان کے عقیدتمندوں نے انہیں مہاتما کا لقب دیا جس کے معنی ہیں عظیم روح یا بڑا انسان۔ گوتم بدھ کے بعد گاندھی جی دوسری بڑی شخصیت ہیں۔ جنہیں احتراماً مہاتما کہا گیا۔ علی برادران: مراد ہے مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر جو تحریکِ خلافت کے دنوں میں پورے ہندوستان کے عظیم مسلم رہنما تھے۔ مولانا شوکت علی ۱۸۷۳ء میں رام پور میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۸ء میں دہلی میں فوت ہوئے۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ ابتداءً حکومتِ ہند کے محکمۂ افیون میں ملازمت کی اور بعد ازاں خود کو قومی خدمت کے لئے وقف کر دیا۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ مل کر ہندوستان کی تحریکِ آزادی میں سرگرم حصّہ لیا اور جامعہ ملیہ اسلامیہ کے قیام کے لئے دو سال ہندوستان میں گھوم پھر کر بیس پچیس لاکھ روپیہ جمع کیا۔ مولانا محمد علی جوہر ۱۸۷۸ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۳۱ء میں لندن میں انتقال کیا اور بیت المقدس (یروشلم) میں دفن ہوئے۔ انہوں نے علی گڑھ کالج اور الہ آباد یونیورسٹی میں تعلیم پائی اور اعلیٰ تعلیم کے لئے آکسفورڈ یونیورسٹی چلے گئے۔ واپسی پر رام پور میں افسر تعلیم (ڈائریکٹر آف ایجوکیشن) مقرر ہوئے۔

وہاں سے سبکدوش ہو کر ریاست بڑودہ میں ملازمت کی پھر سیاسی میدان میں آگئے۔ وہ تحریک خلافت کے روح رواں تھے، ہندوستان کی سیاسی زندگی میں صفِ اول کے لیڈر تھے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ کے بانی تھے جو علی گڑھ یونیورسٹی کے مقابلے میں قائم کی گئی۔ کلکتہ سے انگریزی اخبار "کامریڈ" اور دہلی سے اردو اخبار "ہمدرد" نکالا جنہوں نے ہندوستان کی تحریک آزادی میں نمایاں حصہ لیا۔

عدم تعاون کی تحریک: ہندوستان کی وہ تحریک جو ۱۹۲۰ء میں چلائی گئی اور جس میں انگریزوں کی کسی بھی میدان میں مدد کرنے سے انکار کیا گیا۔ کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے حکومت سے عدم تعاون کے متعلق قرار دادیں منظور کیں اور یہ طے کیا گیا کہ انگریزوں کی نوکری چھوڑ دی جائے، تمام برطانوی خطابات اور اعزازات واپس کر دیئے جائیں، سرکاری تقریبات میں شرکت نہ کی جائے، برطانوی عدالتوں کا بائیکاٹ کیا جائے، تمام ہندوستان میں مزدوروں کی ہڑتالیں ہوں اور طالب علم سرکاری مدرسوں اور کالجوں میں کلاسوں میں نہ جائیں۔ تحریک عدم تعاون میں مسلمانوں نے گاندھی جی، مولانا شوکت علی اور مولانا محمد علی جوہر کے کہنے پر بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور علی گڑھ کالج خاص طور پر اس تحریک میں پیش پیش رہا۔ لیکن ہندو یونیورسٹی بنارس کے اساتذہ اور طلباء پر گاندھی جی کی اپیل کا کوئی اثر نہ ہوا۔ شدھی: لفظی معنی پاک کرنا یعنی ہندوستان کو ہندوؤں کے علاوہ باقی تمام مذاہب کے لوگوں سے پاک کرنا۔ سنگھٹن: لفظی معنی، اتحاد و تنظیم۔ ۱۹۲۴ء اور ۱۹۲۵ء میں ہندوؤں کی طرف سے شدھی اور سنگھٹن کی جارحانہ تحریکیں چلائی گئیں۔ شدھی، آریہ سماج (ہندوؤں کا ایک فرقہ) کی چلائی ہوئی ایک منظم تحریک تھی، جس کا مقصد اسلام سے ناواقف سادہ لوح مسلمانوں کو آریہ (ہندو) بنانا تھا۔ اس تحریک کے بانی سوامی شردھانند تھے اور پنڈت رام چندر ان کے مددگار تھے۔ دوسری طرف ڈاکٹر مونجے نے سنگھٹن قائم کی جو جنگجو ہندوؤں کی جماعت تھی اور اس کے منظم کرنے میں پنڈت مدن موہن مالویہ نے ان کی پوری پوری مدد کی۔ یہ دونوں تحریکیں ایک ساتھ شروع ہوئیں اور تھوڑے ہی عرصہ میں ساڑھے چار لاکھ نو مسلم راجپوتوں کو، جو آگرہ اور اس کے آس پاس کے علاقہ میں رہتے تھے، شدھ (مرتد) کر لیا گیا۔ اس کے جواب میں مسلمانوں نے تحریک تنظیم ملت، تحریک تبلیغ اور سیرت کمیٹیاں قائم کر کے آریہ سماجیوں کا مقابلہ کیا۔ مسلمانوں کی ان تحریکوں کے قائد ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور عبدالمجید قریشی ایڈیٹر "ایمان"، پٹنی تھے۔ اشتعال انگیز: غصہ دلانے والی۔ کارروائی: کام، سرگرمی۔ قطعاً: بالکل۔ سائمن کمیشن: ۱۹۲۵ء میں لارڈ برکن ہیڈ نے وزیر ہند کی حیثیت سے برطانوی حکومت کے ایوانِ بالا (دارالامراء) میں اعلان کیا کہ بہت جلد ہندوستان کے لئے مزید سیاسی اصلاحات کے مسئلے کی چھان بین اور ملک کے مختلف طبقوں کی رائے معلوم کرنے کے لئے ایک شاہی کمیشن کا تقرر کیا جائے گا۔ یہ کمیشن نومبر ۱۹۲۷ء میں قائم

کیا گیا اور مشہور برطانوی مدبر جارج سائمن جو بعد ازاں وزیر خزانہ بنے، اس شاہی کمیشن کے سربراہ بنائے۔ وزیر ہند نے جب اس کے ارکان اور ناموں کا اعلان کیا تو ہندوستان کے سیاسی رہنماؤں نے اس کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ کیونکہ اس کے سب ارکان یورپی تھے اور اس میں ایک بھی ہندوستانی نمائندہ شامل نہ کیا گیا۔ قائدِ اعظم محمد علی جناح نے ۱۹ر نومبر ۱۹۲۷ء کو بمبئی کے ایک جلسۂ عام میں خطاب کرتے ہوئے کمشن کی سفارشات کے بائیکاٹ کا اعلان کیا کیونکہ ان کے خیال میں اس کمیشن میں ہندوستانی عوام کے اس حق کو نظر انداز کیا گیا تھا کہ ملک کے آئندہ دستور کی تشکیل میں انہیں بھی برابر اور مساوی نمائندگی ملنی چاہیئے۔ ۳ر فروری ۱۹۲۷ء کو جب سائمن کمیشن بمبئی پہنچا تو اس کا استقبال سیاہ جھنڈیوں اور "سائمن واپس جاؤ" کے فلک شگاف نعروں سے کیا گیا۔ احتجاج کی یہ لہر کراچی سے لے کر کلکتہ تک پورے ملک میں پھیل گئی۔ چنانچہ کمیشن جہاں جہاں بھی گیا اس کا استقبال سیاہ جھنڈیوں سے ہوا۔ نتیجہ کے طور پر یہ اپنے مقصد میں ناکام رہا۔ نہرو رپورٹ : مئی ۱۹۲۸ء میں بمبئی میں ایک کل جماعتی کانفرنس منعقد ہوئی تھی۔ اس کی تجاویز کے مطابق کانگرس کے اجلاس مدراس نے ایک کمیٹی مقرر کی جو بعد میں نہرو کمیٹی (موتی لعل نہرو۔ جواہر لعل نہرو وزیر اعظم ہندوستان کے والد کے نام پر) کہلائی۔ اس کمیٹی نے جو رپورٹ مرتب کی، وہ نہرو رپورٹ کے نام سے مشہور ہوئی۔ رپورٹ تیار کرتے وقت اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی تجاویز کا جائزہ لیا اور فیصلہ کیا کہ سندھ کو بمبئی سے الگ کر کے جداگانہ حیثیت (فرقہ وارانہ بنیادوں پر) نہ دی جائے مسلمانوں کو مرکزی اسمبلی میں ایک چوتھائی (اُن کی آبادی کے تناسب سے) نشستیں دی جائیں۔ مذہبی بنیادوں پر اکثریتی صوبوں میں اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے، چنانچہ پنجاب اور بنگال میں اکثریت (مسلمانوں) کو ان کے تناسب سے کم نشستیں دی جائیں تاکہ توازن قائم رہے۔ قائدِ اعظم نے ان تجاویز سے اختلاف کیا۔ انہوں نے سندھ کی علیحدگی، مرکز میں ایک تہائی اور مسلمانوں کے اکثریتی اور اقلیتی صوبوں میں ان کی آبادی کے تناسب کے مطابق سیٹیں دینے کا مطالبہ کیا۔ چونکہ قائدِ اعظم کے جائز مطالبات تسلیم نہیں کئے گئے تھے، لہٰذا نہرو رپورٹ کی تجاویز مسترد کر دی گئیں۔ اس طرح ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے راستے ایک دوسرے سے جُدا ہو گئے۔ مسلم کش : مسلمانوں کو کچلنے والی۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس : ۲۰ر مارچ ۱۹۲۷ء کو قائدِ اعظم نے دہلی میں ہر مکتبِ فکر کے نمائندہ مسلم رہنماؤں کو ایک کانفرنس میں مدعو کیا جو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے نام سے موسوم ہوئی اور جس کی صدارت قائدِ اعظم نے کی۔ انہوں نے حاضرین سے ایک قرارداد منظور کروائی جس میں مطالبہ کیا گیا تھا کہ (۱) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے الگ صوبہ بنایا جائے (۲) جس بنیاد پر کسی دوسرے صوبے میں اصلاحات نافذ کی جائیں، شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں بھی اسی بنیاد کو پیشِ نظر رکھا جائے (۳) جن

صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں اسمبلیوں میں ان کی نمائندگی کا تعین کیا جائے اور اس کے عوض سندھ، سرحدی صوبے اور بلوچستان میں ہندوؤں کو بھی اسی بنیاد پر نمائندگی دی جائے گی۔ (۴) پنجاب اور بنگال میں دونوں قوموں کی نمائندگی، ان کی آبادی کی بنیاد پر ہوگی۔ (۵) مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب ایک تہائی یعنی ۳۳ فیصدی سے کم نہ ہو (۶) انتخابات کے لئے مخلوط حلقہ انتخاب بنایا جائے۔ یہ کانفرنس جو دہلی کانفرنس بھی کہلاتی ہے۔ قائد اعظم کی عظیم ذاتی کامیابی کی حیثیت رکھتی تھی۔ کیونکہ وہ اپنے تدبّر سے تمام مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر لانے اور آئندہ دستوری اصلاحات کی نسبت ایک مشترک پالیسی منظور کرانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

اس پالیسی کی رو سے مسلمانوں کی نمائندگی کا مسئلہ نمایاں حیثیت رکھتا تھا۔ آگے چل کر جناح کے چودہ نکات میں بھی کم وبیش یہی مطالبات کئے گئے تھے۔ جناح کے چودہ نکات: مارچ ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ کا دہلی میں ایک اجلاس ہوا جس میں ناسازگار حالات کو بدلنے اور مسلم لیگ کے لئے مسلمانوں کی زیادہ سے زیادہ حمایت حاصل کرنے کے لئے ایک مصالحتی قرارداد تیار کی گئی جس میں نہرو رپورٹ کو مسترد کرنے کے بعد مسلمانوں کے حقوق ومفاد کے تحفظ کے لئے چودہ بنیادی نکات پیش کئے گئے تھے۔ جو جناح کے چودہ نکات کہلاتے ہیں۔ ان میں مطالبہ کیا گیا کہ مسلمانوں کو مرکزی مجلس قانون ساز میں ایک تہائی سے کم نمائندگی نہ دی جائے۔ جداگانہ انتخاب کا حق منظور کیا جائے۔ تمام فرقوں کو مذہبی آزادی دی جائے۔ سندھ کو علیحدہ صوبہ بنایا جائے۔ سرحدی صوبے اور بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔ ملازمتوں میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی ملے۔ مسلمانوں کی تعلیم کو ترقی دی جائے، ان کی زبان، مذہب اور شخصی قوانین کو فروغ دیا جائے۔ مسلمانوں کی تہذیب کے تحفظ کے لئے دستور میں مناسب ضمانت رکھی جائے۔ تمام مرکزی اور صوبائی حکومتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی نمائندگی دی جائے۔ سول نافرمانی کی تحریک: ۳۱ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو کانگریس نے اپنے اجلاس لاہور میں ایک قرارداد منظور کی جس میں مکمل آزادی کا مطالبہ کرنے کے ساتھ ساتھ حکومت کو دھمکی دی گئی تھی کہ کانگریس پورے ہندوستان میں ٹیکسوں کی عدم ادائیگی اور بڑے پیمانے پر عدم تعاون کی تحریک شروع کر دے گی۔ ۱۹۳۰ء کے شروع میں کانگریس نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ چند ماہ تک یہ تحریک جاری رہی جس سے ملک میں سخت افراتفری پھیلی۔

ص ۱۳۲ گول میز کانفرنس: ہندوستان میں نافذ کی جانے والی اصلاحات کے سلسلے میں تبادلۂ خیال کے لئے برطانوی حکومت نے ہندوستانی نمائندوں کو نومبر ۱۹۳۰ء میں لندن میں پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی۔ ملک معظم کی حکومت نے کانفرنس میں ہندوستانی ریاستوں کے وفد کے علاوہ برطانوی ہند کی نمائندگی کے لئے ۵۷ لیڈر نامزد کئے جن میں ۱۶ لیڈر

مسلمان تھے۔ ان میں قائدِ اعظم، آغا خان، مولانا محمد علی جوہر اور مولوی فضل حق کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ بیگم شاہنواز مسلم خواتین کی نمائندہ تھیں۔ کانگریس نے اس کانفرنس کا بائیکاٹ کیا اور اس کا کوئی نمائندہ شریک نہیں ہوا۔ یہ کانفرنس جزوی طور پر کامیاب رہی۔ ۱۹۳۱ء میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس منعقد ہوئی۔ اس میں گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندے کے طور پر شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے۔ جنہوں نے ہندوستان میں مسلم قوم کے حقوق کے بارے میں بڑی مدلّل تقریر کی۔ گاندھی جی مسلمانوں اور سکھوں سے یہ یقین دہانی چاہتے تھے کہ ہندوستان کا آئندہ دستور جب مرتب کیا جائے تو وہ اس کی صرف اُسی صورت میں حمایت کریں جب کہ وہ ہندوستانی قومیت (ایک قومی نظریے) پر مبنی ہو اور فرقہ واریت سے پاک ہو (یعنی اقلیتیں اپنے الگ حقوق کا مطالبہ نہ کریں) لیکن مسلمانوں کو اس مؤقف سے اتفاق نہیں تھا۔ چنانچہ یہ کانفرنس قطعی طور پر ناکام رہی۔ ۱۹۳۲ء میں تیسری گول میز کانفرنس لندن میں ہوئی جو سرکاری طور پر جوائنٹ سیلیکٹ کمیٹی کے نام سے مشہور ہے۔ برطانوی حکومت نے یہ کمیٹی مقرر کی تھی اور اس کا مقصد ہندوستان کے لئے وفاقی طرز کا دستور مرتب کرنا تھا۔ قائد اعظم اس کمیٹی میں شامل نہ تھے اور کانگریس نے اس کا بائیکاٹ کیا چنانچہ ان دو مؤثر افراد کی عدم موجودگی سے کمیٹی کو اپنے مقاصد میں کوئی خاص کامیابی حاصل نہ ہوئی اور اتفاق رائے سے کوئی دستوری مسودہ تیار نہ ہو سکا۔ قائد اعظم کو دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں اس لئے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ کیوں کہ وہ وفاقی سکیم کے سخت ترین مخالف تھے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ: ۱۴ اگست ۱۹۳۲ء کو ریمزے میکڈونلڈ وزیر اعظم انگلستان نے لندن میں برطانوی حکومت کی جانب سے کمیونل ایوارڈ (فرقہ وارانہ فیصلہ) کا اعلان کیا۔ اس ایوارڈ کے تحت مسلمانوں کے لئے مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں میں آبادی کی بنیاد پر نشستیں مخصوص کی گئیں اور پست اقوام (شیڈولڈ کاسٹ یعنی اچھوت وغیرہ) کو بھی بعض مراعات دی گئیں۔ چونکہ ہندوستان کے مختلف سیاسی فریق (کانگریس، مسلم لیگ، سکھ، اچھوت وغیرہ) کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کر سکے تھے، اس لئے برطانوی حکومت نے مجبوراً خود یہ عبوری سکیم نافذ کی تاکہ اکثریت کے ہاتھوں اقلیتوں کے حقوق پامال نہ ہوں۔ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ: ۱۹۳۵ء میں شاہِ برطانیہ کی طرف سے منظور اور نافذ ہونے والا قانونِ حکومتِ ہند جو قائدِ اعظم کے خیال میں سخت نقصان دہ تھا۔ علاوہ ازیں اس میں ایسی دفعات بھی تھیں جن سے ہندوستان میں انگریزوں کے تاجرانہ مفادات کو محفوظ کر دیا گیا تھا۔ ۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے مرکزی اور وفاقی منصوبے کی عام طور پر شدت سے مخالفت ہوئی تھی اس لئے صرف صوبائی منصوبہ روبہ عمل آسکا اور سیاسی جماعتوں نے صوبائی انتخابات میں حصہ لیا۔ فیڈریشن: وفاقی طرزِ حکومت۔ یہ وحدانی طرزِ حکومت

کا الٹ ہے۔ وفاقی طرزِ حکومت میں ملک کی مختلف ریاستیں، داخلی معاملات میں خود مختار رہتے ہوئے قومی یا عام مقاصد کے لئے متحد ہو جاتی ہیں۔ نفاذ: لاگو کرنا۔ پہلے چھ اور پھر دو اور صوبوں میں حکومت: گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت فروری ۱۹۳۷ء میں ملک میں صوبائی سطح پر پہلے عام انتخابات ہوئے اور کانگریس کو گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں مکمل اکثریت حاصل ہو گئی۔ یہ پانچ صوبے تھے مدراس، بہار، یوپی، سی پی اور اڑیسہ، بمبئی اور سرحد کے چند آزاد امیدوار کانگریس میں شامل ہو گئے اور کانگریس نے ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں میں بھی اکثریت حاصل کر لی۔ مسلم لیگ کو اس انتخاب میں کسی صوبے میں اکثریت حاصل نہ ہوئی بلکہ مسلم اکثریت کے صوبوں پنجاب، بنگال، سندھ اور سرحد میں مسلمانوں کی ۲۷۲ نشستوں میں سے اُسے صرف ۴۱ نشستیں ملیں، لہٰذا مسلم لیگ ہندوستان کے کسی صوبے میں وزارت تشکیل نہ دے سکی، جب کہ کانگریس کو سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہو چکی تھی، لہٰذا اس نے ان میں وزارتیں تشکیل دیں۔ بنگال، پنجاب، آسام اور سندھ میں کانگریس اور مسلم لیگ کی بجائے دیگر مسلم گروپوں نے زیادہ نشستیں جیتیں لیکن کانگریس نے آسام میں چند ممبروں کو ملا کر وہاں بھی اپنی اکثریت قائم کر لی، یوں کانگریس نے پہلے چھ اور پھر دو صوبوں میں اپنی وزارت بنائی (یعنی پہلے مدراس، بہار، یوپی، سی پی، اڑیسہ، بمبئی میں اور پھر سرحدی صوبہ اور آسام میں) پنجاب اور بنگال میں اتحاد پارٹی نے حکومت بنائی اور سرحد اور سندھ میں مسلمان اکثریت نے۔ لیکن سرحد کی مسلمان اکثریت والی حکومت کانگرس کی حامی تھی لہٰذا عملاً کانگرس کو آٹھ صوبوں میں اقتدار حاصل تھا۔ سر پھرنا: مغرور ہونا۔ منہ پھیر کر: بے توجہی کر کے، نظر انداز کر کے۔ ملیامیٹ: مٹا دینا۔ مصمم: پختہ۔ تمدن: رہن سہن۔ جداگانہ ہستی: الگ اور منفرد وجود۔ (بحیثیت مسلمان قوم کے)۔ مدغم: ضم کرنا، ملا دینا، جذب کرنا۔ اعلانیہ: کھلم کھلا۔ مساعی: کوششیں۔ سعی کی جمع۔ ہنگامہ خیز: حرکت و فساد پیدا کرنے والے۔ جمعیۃ العلماء: ۱۹۱۹ء میں قائم ہونے والی مذہبی علماء کی سیاسی جماعت، جس کا نام جمعیۃ العلمائے ہند رکھا گیا۔ اس کے امرتسر میں منعقدہ پہلے اجلاس کی صدارت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے کی۔ یہی وہ زمانہ ہے جب مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا عبدالباری فرنگی محلی اور بعض دوسرے علماء نے فتویٰ دیا کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے ملک کو "دارالحرب" بنا دیا ہے، اس لئے مسلمانوں کو چاہیئے کہ ایسے مقام کو ہجرت کر جائیں جو "دارالاسلام" ہو۔ اس فتوے سے متاثر ہو کر ۱۹۲۰ء میں ہزاروں کی تعداد میں ہندوستانی مسلمان ہجرت کر کے افغانستان روانہ ہو گئے۔ لیکن افغانستان کی حکومت نے انہیں بسانے سے انکار کر دیا۔ لہٰذا انہیں راستے سے ہی واپس ہونا پڑا۔ اس لحاظ سے یہ زمانہ بہت ہنگامہ خیز قرار دیا جاتا ہے۔ خدائی خدمتگار: ۱۹۲۹ء میں صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خاں نے خدائی خدمتگار تنظیم

قائم کی جو اپنی سُرخ وردی کی وجہ سے سرخ پوش تحریک کے نام سے مشہور ہوئی۔ اس کا ظاہری مقصد خدمتِ خلق تھا لیکن اصل مقصد صوبہ سرحد میں سیاسی اقتدار حاصل کرنا تھا، اسی لئے ۱۹۳۱ء میں یہ تنظیم نیشنل کانگرس سے وابستہ ہوگئی اور ملک کی آزادی، متحدہ ہندوستانی قومیت اور عدمِ تشدد کا پرچار کرنے لگی۔ مجلسِ احرار: ۱۹۲۹ء میں پنجاب میں "مجلسِ احرارِ اسلام" کے نام سے ایک سیاسی جماعت کی بنیاد پڑی جس کا دائرہ عمل پنجاب تک ہی محدود رہا۔ اس کی سیاسی پالیسی کانگریس سے ملتی جلتی تھی۔ اس کے رہنماؤں میں مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا داؤد غزنوی، مولانا حبیب الرحمٰن، چوہدری افضل حق اور مولانا مظہر علی اظہر کے نام زیادہ مشہور ہیں جو اپنے زمانے کے بہترین خطیب تھے۔ مجلسِ احرارِ اسلام کو ۱۹۳۱ء میں خاص طور پر شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی جب اس نے ریاست جموں و کشمیر کے ہندو راجہ کے خلاف کشمیری مسلمانوں کی جدوجہد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا اور ہزاروں کی تعداد میں اپنے رضاکار کشمیر بھیجے۔ اس جماعت نے قادیانیت کے خلاف بھی بھرپور مہم چلائی اور عام مسلمانوں کے سامنے بڑی کامیابی سے مرزا غلام احمد قادیانی کی جھوٹی نبوت کا پول کھولا۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کی کانفرنس: ۱۹۲۹ء میں مسلم لیگ میں انتشار کے باعث اس کے جو گروپ الگ ہوئے، ان میں ایک گروپ نے علیحدہ ہو کر مولانا ابوالکلام آزاد کی قیادت میں آل انڈیا نیشنلسٹ مسلم پارٹی کے نام سے ایک تنظیم قائم کرلی۔ یہ گروپ نہرو رپورٹ کا حامی تھا اور اس کے سیکرٹری تصدق احمد خاں شیروانی تھے۔ بعد میں ڈاکٹر انصاری بھی اس پارٹی میں شامل ہوگئے۔ اس تنظیم نے اپنی ایک کانفرنس کے ذریعے ملک کے مسلمانوں کو اپنے نظریات کا حامی بنانے کی کوشش کی لیکن اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوسکی اور بالآخر کانگرس میں ضم ہوگئی۔ برسرِ اقتدار: حکومت یا اقتدار حاصل کرنا۔ قومی ہستی: بحیثیت مسلمان الگ وجود۔ چیلنج: مقابلے کے لئے دعوت دینا۔ لاجواب: بے مثل۔ بل بوتہ: بھروسے پر۔ پراگندہ: بکھری ہوئی۔ اقلیت: تعداد میں کم قوم۔

ص ۱۳۳ | لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس: اکتوبر ۱۹۳۷ء میں منعقدہ اس اجلاس میں قائدِ اعظم نے اپنی صدارتی تقریر میں واضح کیا کہ جب سے کانگرس نے چھ اکثریتی صوبوں میں وزارتیں بنائی ہیں وہ مسلمانوں سے ناانصافی کر رہی ہے۔ مسلمانوں کو ہندی پڑھنے، بندے ماترم (ترانہ) گانے اور کانگرسی ترنگے (جھنڈے) کو سلامی دینے پر مجبور کیا جا رہا ہے جس سے مسلمانوں کے جذبات مجروح ہو رہے ہیں۔ قائدِ اعظم نے مسلمانوں کو سماجی، سیاسی اور معاشی بھلائی کے طریقے معلوم کرنے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے پرچم تلے جمع ہونے کی تلقین کی۔ انہیں تنظیم اور اتحاد کا سبق دیا اور خوش آئند مستقبل کی بشارت دی۔ قرارداد: ریزولیوشن، فیصلہ۔ برقی رو: بجلی کی لہر۔ تحفظات: بچاؤ اور حفاظت کی تدابیر اور ذرائع۔ مراعات: رعائتیں۔ سائل: بھکاری، مانگنے والی۔

دعویدار: دعویٰ کرنے والی۔ تہذیب: کسی قوم کے فکر و عمل کا خاص نظام، معاشرت یا لوازماتِ زندگی میں اصلاح، درستی اور زیبائش۔ معاشی: روزی کمانے کے متعلق۔ تعمیری کمیٹی: پارٹی میں افراد کا ایسا گروہ جو مفید اور قابلِ عمل منصوبے بنائے۔ وضع: بنانا۔ مصنفین: اہلِ علم اور دانشور لوگ۔ یونینسٹ وزارت: ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں صوبہ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی (اتحاد پارٹی) کی وزارت قائم ہوئی جس کے ارکان میں مسلمان بھی تھے اور ہندو بھی۔ پارٹی کے لیڈر سر سکندر حیات ۱۹۳۷ء سے ۱۹۴۲ء تک پنجاب کے وزیر اعلیٰ رہے۔ ان کے انتقال کے بعد سر خضر حیات خاں ٹوانہ کو اس پارٹی کا لیڈر منتخب کیا گیا اور وہ وزیرِ اعلیٰ بن گئے۔ اپریل ۱۹۴۲ء میں قائدِ اعظم لاہور آئے اور انہوں نے پنجاب اسمبلی کے مسلمان یونینسٹ ممبروں پر زور دیا کہ پنجاب کی وزارت کو مسلم لیگ مخلوط وزارت کہا جائے کیونکہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان لیڈر مسلم لیگ کے رکن بھی تھے۔ لیکن خضر حیات خاں نے جو اپنی پارٹی کے ہندو ممبروں کے ہاتھ میں کھلونا بنے ہوئے تھے، ہندوؤں کی خوشنودی کی خاطر قائدِ اعظم کا کہا نہ مانا اور بات چیت ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی ایک دوسرے کی مخالف ہو گئیں۔ شملہ کانفرنس: ہندوستان کے سیاسی بحران کو ختم کرنے اور حکومتِ خود اختیاری کے قیام کے لئے کانگریس اور مسلم لیگ میں سمجھوتہ کرانے کے لئے لارڈ ویول کی تجویز پر ۲۵ جون ۱۹۴۵ء کو وائسرائے کی کوٹھی واقع شملہ میں ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں ۲۱ نمائندے شریک ہوئے۔ اس میں مسلم لیگ کی طرف سے قائدِ اعظم اور کانگریس کی طرف سے مولانا ابوالکلام آزاد نمائندگی کر رہے تھے۔ گاندھی جی شملہ میں موجود رہے لیکن کانفرنس میں شریک نہیں ہوئے۔ کانفرنس میں سرفہرست مسائل تھے ہندوستان کی آزادی، اور مسلمان اقلیت کے حقوق کا تحفظ۔ یہ کانفرنس بھی ناکام ہوئی کیونکہ کسی مسئلے پر سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ نئی برطانوی مزدور حکومت: لیبر پارٹی کی حکومت جس کے وزیرِ اعظم کلیمنٹ رچرڈ اٹیلی تھے۔ وہ ۱۹۴۵ء میں انگلستان کے وزیرِ اعظم بنے۔ وہ برطانوی قدامت پسند حکومت کے دَور میں بھی ہمیشہ ہندوستان کی حمایت کرتے رہے۔ چنانچہ جب خود وزارتِ عظمیٰ ملی تو انہوں نے ہندوستان کی آزادی کی راہ ہموار کی۔ خود اختیاری حکومت: خود مختار اور آزاد حکومت۔ وزارتی مشن: ۱۹۴۶ء میں برطانوی کابینہ نے اپنا ایک وفد (کیبنٹ مشن) ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کے لئے ہندوستان بھیجا تاکہ ہندوستان کا سیاسی تعطل دُور کیا جا سکے اور ملک کی سیاسی ترقی کے لئے ایک نیا فارمولا تیار کیا جا سکے۔ اس وفد میں برطانوی کابینہ کے تین وزیر لارڈ پیتھک لارنس، سر اسٹیفورڈ کرپس اور اے، وی الیگزینڈر شامل تھے۔ وزیرِ اعظم اٹیلی نے واضح کیا تھا کہ وہ اقلیتوں کے حقوق پامال نہیں ہونے دیں گے اور نہ کسی اقلیت کو اکثریت پر غالب آنے دیں گے۔ اسی لئے کانگریسی لیڈروں نے کیبنٹ مشن کے تقرر کا خیر مقدم کیا اور قائدِ اعظم نے بھی مشن کے ارکان سے ملنے

پر آمادگی ظاہر کی ۔ مشن نے ہندوستان پہنچ کر کانگریس، مسلم لیگ، سکھوں اور اچھوتوں کے نمائندوں سے بات چیت کی اور ہر ایک کے مطالبے سُنے۔ کافی گفت وشنید اور مختلف تجاویز پر غور کرنے کے بعد کانگرس کے صدر ابوالکلام آزاد اور مسلم لیگ کے صدر قائدِ اعظم کیبنٹ مشن پلان کی منظوری پر رضامند ہوئے۔ اس مشن کی تجویز کردہ مختصراً اسکیم یہ تھی کہ پہلے مرحلے میں برطانوی ہند اور ہندوستانی ریاستوں کی ایک یونین بنائی جائے جس کے پاس امورِ خارجہ، دفاع اور مواصلات کے محکمے ہوں گے۔ آخری مرحلہ صوبوں اور ریاستوں پر مشتمل ہوگا۔ صوبوں کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جائے گا۔ ایک حصہ مسلمانوں کی بھاری اکثریت کے صوبوں اور دوسرا ہندوؤں کی بھاری اکثریت کے صوبوں پر مشتمل ہوگا صوبائی حکومتوں کو امور خارجہ، دفاع اور مواصلات کے سوا دوسرے تمام معاملوں سے نمٹنے کا اختیار ہوگا اور صوبائی قانون ساز اسمبلیاں، دوسرے صوبوں کے ساتھ مل کر گروپ بنانے اور کسی گروپ میں شامل ہونے یا اس سے علیحدہ ہونے کے باب میں آزادی سے فیصلہ کر سکیں گی۔ اس منصوبے کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کو خوش کر کے اُسے پاکستان کے مطالبے سے ہٹنے کے لئے آمادہ کیا جائے اور پاکستان کے اصول کو تسلیم نہ کر کے کانگریس کو تسلی دی جائے۔ قائدِ اعظم نے بہ امرِ مجبوری یہ پلان بھی تسلیم کر لیا۔ لیکن جواہر لعل نہرو کی مخالفت کی وجہ سے یہ منظور نہ ہوا اور کیبنٹ مشن ناکام واپس لندن چلا گیا۔

ص ۱۳۴ گتھی: الجھاؤ۔ مسلم لیگ کی مرکزی کی عارضی حکومت میں شرکت: ۱۹۴۶ء کے انتخابات میں مسلم لیگ نے ۷۸ مسلم نشستوں میں سے ۷۴ جیت لیں، یوں اس نے ۹۴ فیصدی نشستیں حاصل کیں۔ انتخابات کے بعد نئی مرکزی حکومت ۱۴ اراکین پر مشتمل قرار پائی جس میں کانگریس اور مسلم لیگ کے پانچ پانچ نمائندے اور ایک اچھوت اور تین اراکین دوسرے فرقوں کی نمائندگی کے لئے رکھے گئے۔ مسلم لیگ اس عارضی حکومت میں شامل ہوگئی اور اس نے لیاقت علی خاں (خزانہ) آئی آئی چندریگر (تجارت) عبدالرب نشتر (مواصلات)، راجہ غضنفر علی خاں (صحت) اور جوگندر ناتھ منڈل (قانون) کو اپنے نمائندے نامزد کیا۔ مناقشات: جھگڑے۔ دستور: قانون، آئین۔ اتفاق رائے: متفق ہونا۔ یکساں: برابر۔ نتیجہ خیز: نتیجہ پیدا کرنے والی، بامقصد۔ اسلامیانِ ہند: ہندوستان کے مسلمان معرضِ التوا میں رکھنا: ملتوی کرنا، ٹالنا، معرض: کے لفظی معنی، ظاہر ہونے کی جگہ۔ فرقہ وارانہ فسادات: وہ فسادات جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوئے منظم: سوچی سمجھی، باقاعدہ انتظام کر کے۔ تہ تیغ کرنا: قتل کرنا۔ فرزندانِ توحید: خدا کو ایک ماننے والے مسلمان تنظیم: اتحاد۔ پھل لانا: نتیجہ ظاہر ہونا۔ برِ عظیم: خشکی کا بڑا ٹکڑا۔

ص ۱۳۵ قوت آفرین: طاقت پیدا کرنے والا، مضبوط۔ تغیر: تبدیلی، انقلاب۔ رونما: ظاہر۔

امر: بات، کام۔ ملّتِ اسلامیہ: مسلمان قوم۔ اسلامی جمہوریت: اسلامی اصولوں کی روشنی میں عوام کی خواہشات کے مطابق، ان کی بہبود کے لئے، ان پر حکومت کرنا۔ ترقی پرور: ترقی پسند۔ مساوی: برابر۔ کارکن: کام کرنے والا۔ بیت المال: حکومت کا خزانہ۔ عوام النّاس: عام لوگ، رعایا۔ نصب العین: اصلی مقصد۔ ڈنکا بجانا: مشہور کرنا۔ مطلق العنان: آزاد، بے لگام، بغیر روک ٹوک کے۔ خود غرض: لالچی۔ حامل: بوجھ یا کوئی چیز اٹھانے والا۔ اَن دیکھا خدا: خدا جو نظر نہیں آتا۔ خلفائے راشدین: آنحضرت صلعم کے چار جانشین جو آپ صلعم کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے حکمران بنے اور جنہوں نے اسلامی احکامات کے مطابق حکومت کی یعنی حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ۔ دلیری: بہادری۔ خود اعتمادی: اپنے آپ پر بھروسہ کرنا۔ انکسار: خود کو کم تر ظاہر کرنا، عاجزی۔ تقویٰ: خدا سے ڈرنا، پرہیزگاری۔ تحفّظ: حفاظت۔ رواداری: پاس، لحاظ۔ پرے: دُور۔ چرخ نیلی فام: نیلے رنگ کا آسمان۔ گردِ راہ: راستے کی دھول۔ کارواں: اونٹوں کی قطار، قافلہ۔

سبق کا خلاصہ

ہندوستان میں اگرچہ اسلامی حکومت ۱۸۵۷ء تک قائم رہی لیکن انیسویں صدی کے آغاز میں مسلمانوں کا سیاسی زوال مکمّل ہو چکا تھا جب انگریزوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا۔ البتہ اسی زمانے میں بعض مسلمان رہنماؤں نے مذہبی احیاء اور معاشرتی اصلاح کا فریضہ انجام دینا شروع کیا۔ ان میں شاہ ولی اللہ اور شاہ عبدالعزیز خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان بزرگوں کی اصلاحی کوششوں کا اگرچہ پڑھے لکھے لوگوں پر اثر ہوا، تاہم عوام النّاس کی مذہبی حالت بدستور خراب رہی کیونکہ وہ ہندو رسم و رواج سے زیادہ متاثر تھے۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد سید احمد بریلوی نے ان کی مذہبی، سیاسی اور معاشرتی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ ۱۸۱۶ء میں انہوں نے اپنے مشن کا آغاز کیا اور چند سال تک معاشرتی خرابیاں دُور کرنے میں لگے رہے، پھر انہوں نے مسلمانوں کی مذہبی آزادی بحال کرنے کے لئے ۱۸۲۶ء میں سکھوں کے خلاف جہاد شروع کیا اور چند ابتدائی کامیابیاں حاصل کرنے کے بعد بعض افغان سرداروں کی غداری کی وجہ سے بالاکوٹ کے مقام پر ۱۸۳۱ء میں سکھوں سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اُن کے اصلاحی کام کو اُن کے جانشینوں نے جاری رکھا۔ اُسی زمانے میں بنگال میں غریب مسلمانوں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کے لئے فرائضی تحریک اٹھی جس نے قابلِ قدر کام کیا۔

سر سید احمد خاں اگرچہ بعض باتوں میں سید احمد شہید کے ہم خیال تھے لیکن انہوں نے ملک چھن جانے کے بعد قدامت پسند مسلمانوں کو نئے زمانے کی ضروریات سے آگاہ کیا اور انہیں نئے علوم حاصل کرنے اور انگریزی حکومت سے تعاون کرنے پر آمادہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت ختم

ہوگئی تھی اور انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر لیا تھا۔ سو سال پہلے انگریزوں نے مسلمانوں سے آہستہ آہستہ ان کی زمینیں اور عہدے چھین لئے۔ اسلامی تعلیم کے ذرائع ختم کر دیئے اور فارسی زبان عدالتوں سے خارج کر دی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں پر ان کا ظلم بڑھتا گیا اور ہندوؤں نے بھی مسلمانوں سے بے رخی برتنا شروع کی۔ ان حالات میں سر سید احمد خاں نے دُور اندیشی سے کام لے کر مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے انہیں نئے حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا سبق دیا۔ انہوں نے اپنی مذہبی تصانیف اور رسالہ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعے ثابت کیا کہ اسلام عقل کے اصولوں پر مبنی ہے انہوں نے مسلمانوں کی تعلیم کے لئے ۱۸۷۷ء میں علی گڑھ کالج کھولا جو تیس برس تک ہندوستانی مسلمانوں کا واحد قومی مرکز رہا۔ ۱۸۸۴ء میں سر سید نے پنجاب کا دوسرا دورہ کیا۔ جہاں ان کا پُر جوش خیر مقدم ہوا اور پنجابیوں نے ان کی دل کھول کر مدد کی۔ اسی سال لاہور میں انجمن حمایت اسلام قائم ہوئی۔ دو سال بعد سر سید نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد ڈالی جس کے اجلاس ہر سال مختلف مقامات پر منعقد ہوتے تھے۔ ۱۸۶۷ء میں ہندوؤں نے اُردو کی بجائے ہندی زبان کو جاری کرنے پر زور دیا تو سر سید نے محسوس کیا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا ایک قوم کی حیثیت سے نباہ مشکل ہے۔ ۱۸۸۵ء میں انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد پڑی اور سر سید نے سیاسی مصلحتوں کی بناء پر مسلمانوں کو اس میں شمولیت سے منع کیا کیونکہ ان کے خیال میں نئے جمہوری طریقِ کار میں مسلمانوں کو قومی حیثیت سے نقصان پہنچنے کا خدشہ تھا۔ ۱۸۷۸ء میں جب سر سید کونسل کے ممبر نامزد ہوئے تو انہوں نے ملکی اور قومی مفاد کے حق میں تقریریں کر کے قوم کو بیدار کیا اور اس کے حقوق کی جنگ لڑی۔ ۱۸۹۸ء میں سر سید فوت ہو گئے۔

سر سید کی وفات کے بعد اُن کے ساتھیوں نے ان کے شاندار کام کو جاری رکھا، نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، حالی، نذیر احمد، ذکاء اللہ اور شبلی نعمانی وغیرہ نے تعلیمی، سیاسی اور ادبی میدانوں میں قابلِ قدر خدمات انجام دیں۔ نواب محسن الملک نے علی گڑھ کالج کو اپنے تدبر سے مضبوط بنیادوں پر کھڑا کیا۔ نواب وقار الملک نے مسلم لیگ کے قیام میں مدد دی۔ حالی کی مسدس مدو جزرِ اسلام نے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ شبلی نے تاریخی اور سوانحی کتابیں لکھ کر مسلمانوں کے دلوں میں اپنی گزشتہ عظمت کا احساس اجاگر کیا۔ سید امیر علی نے اپنی انگریزی تصانیف کے ذریعے مغرب میں اسلام کے حق میں راہ ہموار کی۔

علی گڑھ تحریک نے قومی خدمت کے ساتھ ساتھ ردِ عمل کے طور پر کئی تحریکوں کو جنم دیا۔ شبلی نے لکھنؤ میں ندوۃ العلماء قائم کیا۔ دیوبند میں راسخ العقیدہ مسلمان علماء نے ایک دینی درسگاہ بنا کر قدیم اسلامی علوم پڑھانے کا بندوبست کیا۔ علامہ اقبال نے اپنا فلسفہ پیش کیا جس کے پیشِ نظر انسان کی انفرادی اور اجتماعی خودی کی نشو و نما تھی۔ اقبال نے خودی کی تربیت کے تین درجے

بتلائے یعنی اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی اور یہ بھی بتایا کہ انسانیت کی اعلیٰ ترین منزل تک پہنچنے کے لئے مذہب کی رہنمائی ضروری ہے۔ علامہ اقبال نے چار چیزوں پر خاص طور پر زور دیا، یعنی توحید، رسولِ اکرمؐ سے محبت اور ان کی تقلید، قرآن کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کی پیروی اور رجائیت۔

مسلمان رہنماؤں کی مسلسل کوشش کے نتیجے میں مسلمان قوم ترقی کرنے لگی۔ معاشی حیثیت سے تو وہ ہندوؤں سے پیچھے رہی لیکن تعلیمی میدان میں اس نے قدم آگے بڑھائے، اُردو زبان، ادب اور صحافت میں ترقی ہوئی اور ملک میں جابجا علمی اور ادبی انجمنیں پھیلنے لگیں۔ علی گڑھ کالج ترقی کر کے ۱۹۲۱ء میں مسلم یونیورسٹی بن گیا۔ حیدر آباد دکن میں عثمانیہ یونیورسٹی قائم ہوئی۔ سیاسی میدان میں بھی مسلمانوں نے بتدریج آگے قدم بڑھائے۔

سب سے پہلے سرسید نے علی گڑھ میں مسلمانوں کے سیاسی حقوق کے تحفظ کے لئے قدم اٹھایا لیکن انہوں نے عام طور پر مسلمانوں کو ملکی سیاست سے الگ تھلگ رکھنے کی پالیسی اپنائی۔ بیسویں صدی کے آغاز میں ایشیا اور اس کے ساتھ ہندوستان میں حالات بدلنے لگے۔ ہندوؤں میں جذبۂ قومیت اُبھرا اور انہوں نے ۱۹۰۵ء کی تقسیم بنگال کے خلاف ایک زبردست تحریک شروع کی۔ اُردو ہندی تنازعہ میں یوپی کی حکومت نے علی گڑھ کے تعلیمی ادارے کو دخل دینے سے روک دیا۔ یہ دیکھ کر مسلمانوں نے ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ قائم کی تاکہ ان کے تمدنی اور سیاسی حقوق محفوظ رہ سکیں۔ ۱۹۰۹ء کی اصلاحات میں مسلمانوں نے جداگانہ انتخابات کا حق منوایا۔ ۱۹۱۱ء میں تقسیم بنگال کے حکم کی منسوخی اور اگلے سال جنگ بلقان وطرابلس چھڑ جانے سے مسلمانوں کا یقین پختہ ہو گیا کہ ان کے قومی اور بین الاقوامی حقوق حکومتِ برطانیہ کے ہاتھ میں محفوظ نہیں رہ سکتے چنانچہ انہوں نے ۱۹۱۳ء میں حکومتِ خود اختیاری کا مطالبہ کیا اور کانگرس سے تعاون کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ جنگِ عظیم اوّل نے ہندوستانیوں کو ایک اور موقع فراہم کیا چنانچہ ۱۹۱۶ء میں کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان معاہدۂ لکھنؤ ہوا۔ یہ دیکھ کر حکومت برطانیہ نے خود اختیاری حکومت بتدریج دینے کا اعلان کیا۔ لیکن جنگِ عظیم کے ختم ہوتے ہی برطانوی حکومت اپنے وعدوں سے پھر گئی۔ دوسری طرف اس نے ترکی کے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش کی۔ گاندھی جی نے مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی کی مدد سے ۱۹۲۰ء میں عدم تعاون کی تحریک شروع کی لیکن اس تحریک کے ختم ہوتے ہی ہندو لیڈروں نے شدھی اور سنگھٹن کی اشتعال انگیز کارروائیوں سے ہندو مسلم تعلقات خراب کر دیئے۔ اس زمانے میں مسلمان لیڈر غفلت کا شکار تھے۔ لیکن سائمن کمیشن کی آمد اور نہرو رپورٹ کی مسلم دشمن تجاویز نے ان کی آنکھیں کھول دیں۔ انہوں نے ۱۹۲۹ء میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں ایک متفقہ سیاسی مطالبہ کیا جو محمد علی جناح کے چودہ نکات کے قریب قریب تھا۔ ۱۹۳۰ء میں کانگرس نے گاندھی جی کی قیادت میں مکمل آزادی کا اعلان

کر کے سول نافرمانی کی تحریک شروع کر دی۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۳ء تک کے عرصے میں گول میز کانفرنسیں ہوئیں لیکن ہندو لیڈروں کی ضد کی وجہ سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا۔ ۱۹۳۵ء میں نیا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ نافذ ہوا جس کی رو سے مرکز میں وفاق اور صوبوں میں حکومتِ خود اختیاری کا نفاذ طے پایا۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات کے نتیجے میں کانگریس نے آٹھ صوبوں میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اس نے مسلمانوں کو بحیثیت قوم ملیامیٹ کرنے کا تہیہ کر لیا۔ کانگریسی حکومتوں نے اردو کو مٹا کر ہندی کو فروغ دینا شروع کیا اور مسلمانوں کے جداگانہ قومی وجود کی نفی کر کے ہندو تمدن کو غالب کرنے کی کوشش کی۔

اس زمانے میں مسلمانوں میں کئی سیاسی جماعتیں موجود تھیں۔ "مسلم لیگ" تو ۱۹۰۶ء میں قائم ہو چکی تھی، ۱۹۱۹ء میں "جمعیۃ العلماء ہند" بھی بنی اور ۱۹۲۶ء میں "خدائی خدمتگار" اور "مجلس احرار اسلام" قائم ہوئیں۔ اسی سال نیشنلسٹ مسلمانوں نے بھی اپنی ایک الگ کانفرنس منعقد کی۔ ۱۹۳۷ء کے انتخابات میں کانگریس کی کامیابی اور مسلمانوں کی قومی ہستی کو مٹانے کی کوششوں کے نتیجے میں مسلم لیگ نے قائد اعظم محمد علی جناح کی قیادت میں ہر طرح کی مشکلات سے نبٹنے کا تہیہ کر لیا۔ قائد اعظم نے ایک طرف تو کانگریس اور برطانوی حکومت کے نمائندوں سے کامیابی کے ساتھ گفتگو کی اور دوسری طرف مسلمانوں کے منتشر گروہ کو ایک قوم میں ڈھال دیا۔ چنانچہ ۱۹۳۷ء کے مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس سے، جو لکھنؤ میں منعقد ہوا، مسلمانوں کی بیداری کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کو مسلم لیگ نے لاہور میں قرارداد پاکستان منظور کی جس میں انہوں نے مطالبہ کیا کہ ہندوستان کے ایک حصے میں مسلمانوں کا خود مختار، آزاد اور جُدا وطن قائم کیا جائے۔ اس منصوبے کو مکمل کرنے کے لئے ۱۹۴۴ء میں معاشی مسئلے پر ایک تعمیری کمیٹی قائم کی گئی، تعلیمی مسئلے کو حل کرنے کے لئے ایک تعلیمی کمیٹی بنی اور دیگر اہم مسائل کے حل کے لئے مصنفین کی ایک کمیٹی بنائی گئی۔

۱۹۴۴ء میں پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ وزارت میں اختلافات پیدا ہوئے، بمبئی میں گاندھی جی اور محمد علی جناح میں ملاقات ہوئی جو نتیجہ خیز ثابت نہ ہوئی۔ ۱۹۴۵ء میں شملہ کانفرنس میں کانگریس اور مسلم لیگ کو پھر اکٹھا کیا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ بالآخر حکومت ہند نے نئے انتخابات کا اعلان کیا اور واضح کیا کہ نئی برطانوی مزدور حکومت ہندوستان کو حکومتِ خود اختیاری دینا چاہتی ہے۔ نئے انتخابات میں، جو ۱۹۴۵ء، ۱۹۴۶ء کے موسم سرما و موسم بہار میں ہوئے۔ ہندوؤں میں کانگریس اور مسلمانوں میں مسلم لیگ پورے طور پر کامیاب ہوئیں۔ ۱۹۴۶ء میں برطانوی حکومت نے پہلے ایک وفد اور پھر "وزارتی مشن" ہندوستان بھیجا تاکہ ہندوستان کے سیاسی معاملات طے کئے جائیں۔ اس مشن نے آزاد ہندوستان کے لئے ایک نئی سکیم پیش کی لیکن مسلم لیگ نے اس سکیم کو ٹھکرا دیا۔ گو بعد میں مسلم لیگ بھی مرکز کی عارضی حکومت میں شریک ہو گئی لیکن ایک طرف

تو کانگرس اور مسلم لیگ میں بات بات پر اختلافات ہوئے اور دوسرے ملک بھر میں شدید فرقہ وارانہ فسادات برپا ہوئے۔ کانگریس نے مسلم لیگ کے ساتھ آبرومندانہ سمجھوتہ کرنے سے انکار کر دیا اور برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ کسی ایسے دستور کو ہندوستان پر نافذ نہیں کرے گی جس پر دونوں جماعتیں راضی نہ ہوں۔ اس کے ساتھ ہی یہ فیصلہ کر لیا گیا کہ برطانیہ جون ۱۹۴۸ء تک ہندوستان خالی کر دے گا۔

جنوری ۱۹۴۷ء میں پنجاب مسلم لیگ نے یونینسٹ وزارت کے خلاف زبردست تحریک چلائی جس میں مردوں اور عورتوں نے برابر کا حصہ لیا۔ ایک ماہ تک جاری رہنے والی یہ تحریک کامیاب ہوئی چنانچہ برطانوی حکومت نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے مطالبے کو اب دیر تک ٹالا نہیں جا سکتا۔ اس کے ساتھ ہی ہندوؤں اور سکھوں نے پورے ہندوستان میں فسادات پھیلانے شروع کئے اور آٹھ دس لاکھ بے گناہ مسلمانوں کو قتل کر دیا۔ اسی دوران میں برطانیہ نے ۱۵ اگست ۱۹۴۷ء کو ہندوستان کو دو مملکتوں میں تقسیم کرنے اور ان کو آزاد کر دینے کا اعلان کیا۔ یوں دس کروڑ ہندوستانی مسلمانوں کی قربانیاں رنگ لائیں اور پاکستان کا قیام عمل میں آیا۔

قیامِ پاکستان سے نہ صرف برصغیر پاک و ہند اور براعظم ایشیا بلکہ پوری اسلامی دنیا میں ایک نیا انقلاب برپا ہوا، جس کے پورے نتائج ابھی رونما ہونے باقی ہیں۔ پاکستان کے مسلمانوں کو معلوم ہے کہ اگر انہوں نے اپنا اور اسلام کا وقار قائم رکھنا ہے تو پاکستان کا نظامِ حکومت، اسلامی جمہوریت کے اصولوں پر مبنی ہونا چاہیئے، جس میں مسلم اور غیر مسلم کے ساتھ برابری کا سلوک کیا جائے گا جس میں سرمایہ داری کی جڑ کاٹ دی جائے گی اور غریبوں، مزدوروں اور کسانوں کا خاص خیال رکھا جائے گا۔ جس میں عورت کے حقوق محفوظ ہونگے۔ جس میں دولت کی تقسیم منصفانہ ہو گی۔

مسلمانوں کا نصب العین اسلام ہے، وہ اسلام جو صرف خدا کے آگے سر جھکانا سکھاتا ہے اور جس کا عملی نمونہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانے میں مسلمانوں کی زندگیوں میں نظر آتا ہے۔ پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے سچائی، بہادری، خود اعتمادی، انکساری، امن پسندی، محنت، مساوات، صبر و تسلیم، تقویٰ، بنی نوعِ انسان کی خدمت و حفاظت اور ان سے محبت و روا داری جیسی اعلیٰ قدریں ہونی چاہیئں کیونکہ انہیں کے فروغ کے لئے پاکستان قائم کیا گیا ہے۔

اہم عبارت کی تشریح (۱)

سوال ۱ درجِ ذیل عبارت کی مع حوالۂ متن اور سیاق و سباق، تشریح کیجئے۔

اقبال نے اگر اسلامی و مغربی علوم کے غائر مطالعہ کے بعد اپنا خاص اسلامی فلسفہ قوم کے سامنے

پیش کیا جس کا مقصد، کامل ترین انسان کی انفرادی و اجتماعی نشو و نما ہے۔ اقبال کا خیال ہے کہ انسان، اطاعت، ضبطِ نفس اور نیابتِ الٰہی کی تین منزلیں طے کرتا ہوا خودی کی انتہائی بلندی پر پہنچ سکتا ہے۔ اس ارتقاء میں اُسے مذہب کی رہنمائی درکار ہے۔ اقبال نے چار چیزوں پر زور دیا۔ اول توحید، جس پر پورا ایمان عملاً انسان کو خوف و مایوسی سے آزاد کر دیتا ہے۔ نیز توحیدِ الٰہی، توحیدِ انسانی میں پرتو فگن ہے۔ دوم، رسول اکرمؐ سے محبت اور ان کی مکمل تقلید، سوم، قرآن کا مطالعہ اور اس کی تعلیمات کی پیروی۔ چہارم، رجائیت یعنی مایوسی اور غم پسندی کو ترک کر کے امید، ہمت اور جرأت کی راہ اختیار کرنا۔

جواب | **حوالۂ متن** | یہ عبارت میاں بشیر احمد کے مضمون "تشکیل پاکستان" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس عبارت سے پہلے مضمون نگار نے ہندوستان میں سیاسی اور مذہبی اصلاح کی ان کوششوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے، جو مسلمان رہنماؤں نے کیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، سید احمد بریلوی، فرائضی تحریک کے رہنماؤں (حاجی شریعت اللہ اور دُودھو میاں)، سر سید احمد خاں اور ان کے ساتھیوں (محسن الملک، وقار الملک، حالی، نذیر احمد، شبلی، ذکاء اللہ) سید امیر علی اور دیوبند کے رہنماؤں (مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ مولانا رشید احمد گنگوہی) کا بطور خاص حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کوششوں سے مسلمانوں میں مذہب سے دُوری بہت کم ہو گئی اور وہ مغرب کی ذہنی غلامی سے آزاد ہو گئے تاہم ساتھ ہی ایک ایسی فضا بھی پیدا ہو گئی جس میں اپنی ہر چیز اچھی اور دوسروں کی ہر چیز بُری نظر آنے لگی، لہٰذا اس رجحان کی اصلاح بھی ضروری ہو گئی۔

اس عبارت کے بعد مصنف نے معاشی، تعلیمی، علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی میدانوں میں مسلمانوں کی روز افزوں ترقی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ معاشی اور تعلیمی میدان میں ہندوؤں سے پیچھے رہ جانے لیکن علمی، ادبی، صحافتی اور سیاسی میدان میں تیزی سے آگے بڑھنے کا حوالہ دیا ہے اور اس کی مثالیں بھی پیش کی ہیں۔ اس کے بعد مسلم لیگ کا قیام، جداگانہ انتخابات، تقسیم بنگال کی منسوخی، جنگِ بلقان و طرابلس، ہندوستان کے لئے حکومتِ خود اختیاری، میثاقِ لکھنؤ، عدمِ تعاون کی تحریک، شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں، سائمن کمشن، نہرو رپورٹ، آل انڈیا مسلم کانفرنس جناح کے چودہ نکات، کانگرس کا مکمل آزادی کا اعلان اور سول نافرمانی کی تحریک، گول میز کانفرنسیں، ۱۹۳۵ء کے گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کا نفاذ، ہندوستان کے آٹھ صوبوں میں کانگریس کی حکومت اور مسلمانوں کے حقوق کی پامالی، اُردو ہندی تنازعہ، مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں مثلاً جمعیۃ العلماء ہند، خدائی خدمت گار جماعت اور مجلسِ احرارِ اسلام کا قیام، نیشنلسٹ مسلمانوں کی کانفرنس،

مسلم لیگ کی تنظیم نو، لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کے پچیسویں سالانہ اجلاس کا انعقاد، قرار داد پاکستان کی منظوری، مسلم لیگ کی طرف سے تعمیری کمیٹی، تعلیمی کمیٹی اور مصنفین کی کمیٹی کا قیام، پنجاب میں مسلم لیگ اور یونینسٹ وزارت کا جھگڑا، بمبئی میں گاندھی جناح ملاقات، حکومتِ ہند کی طرف سے نئے انتخابات کا اعلان اور ان میں کانگریس اور مسلم لیگ کی کامیابی، وزارتی مشن کی آمد اور اس کی تجاویز، مرکز میں مسلم لیگ کی عارضی حکومت میں شرکت، مسلم لیگ کی پنجاب میں سول نافرمانی کی تحریک، ملک میں فرقہ وارانہ فسادات اور آٹھ دس لاکھ مسلمانوں کا قتلِ عام اور بالآخر ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام ——— وہ بڑے بڑے موضوعات ہیں، جن پر مصنف نے اظہارِ خیال کیا ہے۔ آخر میں پاکستان میں اسلامی جمہوری نظام کے قیام اور اعلیٰ سیاسی، معاشرتی، مذہبی اور اخلاقی اقدار کے فروغ کی تلقین کی گئی ہے۔

تشریح علامہ اقبال نے اسلامی علوم (قرآن، حدیث، فقہ، تاریخ) اور مغربی علوم (فلسفہ اور سائنسی علوم) کا وسیع مطالعہ کرنے کے بعد اپنا مخصوص فلسفۂ خودی پیش کیا، جس کی بنیاد اسلام پر ہے اور جس کا مقصد ہر لحاظ سے مسلمانوں کو مکمل انسان بنانا اور بحیثیتِ فرد اور بحیثیت قوم اس کے پھلنے پھولنے اور فائدہ مند ثابت ہونے کا موقع فراہم کرنا ہے۔ علامہ اقبال نے انسانی خودی کی تربیت کے لئے تین درجے بتائے ہیں (۱) اطاعت (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی۔ اطاعت سے مراد خدا تعالیٰ کے احکامات کو دل و جان سے ماننا اور ان پر عمل کرنا ہے۔ ضبطِ نفس سے مراد اپنی خواہشات پر قابو پانا ہے خصوصاً اپنے نفس کی ادنیٰ قوتوں مثلاً نفسانی محبت اور خوف کے جذبات پر غالب آنا ہے اور نیابتِ الٰہی سے مراد انسان کا دنیا میں خدا کا نائب اور خلیفہ بننا ہے جس کا اوّلین فرض خدائی قانون پر خود عمل کرنا اور دوسروں سے اس کی پابندی کرانا ہے۔ انسان یہ تین منزلیں درجہ بدرجہ طے کرنے کے بعد خودی کی آخری بلندی تک پہنچ سکتا ہے۔ اس ترقی کے حصول میں انسان کی صرف مذہب ہی مدد کرتا ہے۔ علامہ اقبال نے چار چیزوں کو زیادہ اہم قرار دیا ہے۔ پہلی چیز توحید ہے یعنی خدا کو ایک ماننا اور اُسی کی اطاعت کرنا۔ عقیدۂ توحید پر ایمان لانے سے انسان خوف اور مایوسی سے نجات پا لیتا ہے۔ خدا کی وحدت، انسانی وحدت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ یعنی تمام بنی نوع ایک کنبہ ہے اور وہ خدائے واحد کی ایک مخلوق ہے۔ ایک کو دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ دوسری چیز حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق رکھنا اور ان کی مکمل پیروی کرنا ہے۔ تیسری چیز قرآن مجید کا پڑھنا اور خدائی احکامات پر عمل کرنا ہے۔ چوتھی چیز امید پرستی ہے یعنی ناامیدی اور غمگینی کو چھوڑ کر امید، ہمت اور دلیری کا راستہ اختیار کرنا ہے۔ گویا خدا کی رحمت سے کسی حال میں مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔

(۲) سوال درجِ ذیل اشعار کی تشریح کیجئے، شاعر کا نام بتائیے اور اپنی نصابی کتاب میں اس مضمون کا حوالہ دیجئے جس میں یہ اشعار درج کئے گئے ہیں۔

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن، نئی شان ٭ گفتار میں، کردار میں، اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت ٭ یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم ٭ دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

جواب یہ اشعار علامہ اقبال کی نظم "مردِ مسلمان"، میں سے لئے گئے ہیں جو ان کے تیسرے اردو مجموعہ کلام "ضربِ کلیم"، میں شامل ہے۔ یہ تین اشعار میاں بشیر احمد نے اپنے مضمون "تشکیلِ پاکستان" میں علامہ اقبال کا ذکر کرتے ہوئے درج کئے ہیں۔ علامہ اقبال نے پہلے شعر میں مردِ مومن کی صفات بیان کی ہیں وہ کہتے ہیں کہ مومن کی شان اور آن ہر لمحے نئی ہوتی ہے اور اس کا ہر روپ پہلے سے زیادہ دلکش ہوتا ہے۔ وہ اپنے قول اور فعل سے اللہ تعالیٰ کا قانون، اس کی منشاء اور اس کا مقصود نظر آتا ہے۔ مردِ مومن اپنی سیرت و کردار میں برابر ترقی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی ذات نیکیوں کا منبع ہوتی ہے جس سے اُسے بھی فائدہ پہنچتا ہے اور خلق خدا بھی فیضیاب ہوتی ہے۔ اُس کے مُنہ سے نکلنے والا ہر کلمہ اور اس کے وجود سے سرزد ہونے والا ہر عمل اللہ تعالیٰ کی رضا کے عین مطابق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کی گفتگو سُن کر اور کردار دیکھ کر دُنیا، خُدا پر ایمان لاتی ہے۔ وہ گویا اس جہان میں اللہ تعالیٰ کی نشانی ہے۔

دوسرے شعر میں علامہ اقبال نے مردِ مسلمان کی چار بڑی صفات گنوائی ہیں۔ درحقیقت انہی چار عناصر سے مومن ترکیب پاتا ہے۔ ان عناصر میں سے پہلا عنصر "قہاری" ہے۔ مردِ مومن اتنا قوی ہوتا ہے کہ اللہ کے دشمن اُسے دیکھ کر کانپ اُٹھتے ہیں۔ قہاری صفت خداوندی ہے اور اس کا مطلب ہوتا ہے سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا۔ قاہر وہ ہستی ہے جس کے حکم سے کوئی باہر نہ جا سکے۔ مردِ مومن میں بھی خدا کی یہ صفت جلوہ نما ہوتی ہے۔ اس صفت سے مردِ مومن کا کائنات کے عناصر پر غلبہ بھی ظاہر ہوتا ہے اور خدا کے دشمنوں کے مقابلے میں اس کے رعب و دبدبہ کا اظہار بھی ہوتا ہے۔ دوسرا عنصر "غفاری" ہے۔ غفّار کے معنی ہیں معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔ گناہ بخشنے والا۔ مردِ مومن کی پہلی صفت اگر سختی ہے۔ تو دوسری صفت نرمی ہے یعنی رحم و کرم، عفو و درگزر اور شفقت و محبت۔ قرآن مجید نے مومنوں کی صفات بیان کرتے ہوئے کہا ہے:
اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَاءُ بَيْنَهُمْ یعنی وہ کفار کے حق میں بہت سخت ہیں لیکن آپس میں رحم دل اور شفیق ہیں۔ گویا مردِ مومن اس وقت تک مکمل نہیں ہوتا جب تک اس کے کردار میں جلال کے ساتھ جمال اور سختی کے ساتھ نرمی نہ ہو۔ غفاری بھی صفتِ خداوندی ہے جس طرح اللہ اپنے

بندوں کے گناہ معاف کر دیتا ہے اور ان کے لئے شفیق و رحیم بن جاتا ہے، اُسی طرح مردِ مسلمان بھی خدا کے بندوں کی خطائیں معاف کرتا ہے اور ان کے لئے سراپا شفقت و رحمت بن جاتا ہے، تیسرا عنصر "قدوسی" ہے جس کے معنی ہیں پاک اور مقدس۔ قدّوس بھی خدا تعالیٰ کا صفاتی نام ہے۔ اللہ ہر عیب سے پاک ہے۔ مردِ مومن کی سیرت بھی حد درجہ پاکیزہ ہوتی ہے۔ اس کا قلب، نفسانی خواہشات، ہوا و ہوس اور آلودگیوں سے پاک ہوتا ہے۔ یہ چیز اُسے اطاعتِ الٰہی اور عشقِ رسول صلعم کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ پر ایمان لانے اور آنحضرت صلعم کے اُسوہ پر عمل کرنے سے اس کا کردار فرشتوں کی طرح پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ چوتھا عنصر "جبروت" ہے جس کے معانی عظمت و بزرگی کے ہیں۔ یہ صفت بھی صفتِ الٰہی ہے۔ مردِ مومن چونکہ صفاتِ الٰہی کا آئینہ ہوتا ہے اس لئے عظمت و بزرگی اس کی سیرت و کردار کا خاصہ ہے۔ وہ رفعت و برتری میں سب سے بڑھا ہوا ہوتا ہے۔ یہ عظمت و بزرگی اُسے ضبطِ نفس، اطاعتِ الٰہی اور عشقِ رسول کے طفیل حاصل ہوتی ہے۔

علامہ اقبال کا تیسرا شعر، موجودہ نصابی کتاب کے اگلے مضمون "علامہ اقبال" از رشید احمد صدیقی کی ابتداء میں بھی درج ہے، اس لئے اس کی تشریح وہاں ملاحظہ فرمائیں۔ (دیکھئے ۱۵۳-۱۵۴)

رشید احمد صدیقی (۱۸۹۲ء - ۱۹۷۷ء)

علّامہ اقبال

تعارف اور پس منظر

رشید احمد صدیقی کا مضمون "علّامہ اقبال" ان کے شخصی خاکوں کے مجموعہ "گنج ہائے گرانمایہ" میں سے لیا گیا ہے۔ رشید احمد صدیقی نے وقتاً فوقتاً علامہ اقبال کی زندگی اور فن پر مختلف مضامین بھی لکھے تھے، جو ان کے ایک اور مجموعہ کی شکل میں "اقبال ـــ شخصیت اور شاعری" کے نام سے چھپ گئے ہیں۔ اس نئے مجموعۂ مضامین میں بھی یہ خاکہ موجود ہے۔

خاکہ نگاری (کیریکٹر سکیچ) ایک باقاعدہ ادبی صنف ہے اور اس کا فنِ سوانح نگاری سے وہی تعلق ہے جو افسانہ کا ناول سے ہوتا ہے۔ یعنی خاکہ کسی شخصیت کے نمایاں خدوخال اور صرف قابلِ ذکر گوشے واضح کرتا ہے جبکہ سوانح عمری میں کسی نامور فرد کی ولادت سے وفات تک کے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ پیش کئے جاتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی فنِ خاکہ نگاری کے ماہر ادیب ہیں چنانچہ انھوں نے "گنج ہائے گرانمایہ" کے علاوہ ایک اور کتاب "ہم نفسانِ رفتہ" میں بھی اپنے دور کے مشاہیر کے خاکے لکھے ہیں۔

اپنے موجودہ خاکہ "علّامہ اقبال" میں انھوں نے اپنے عہد کی اس لازوال شخصیّت کے بارے میں اپنے خیالات، تاثرات اور احساسات قلم بند کئے ہیں۔ انہوں نے لاہور اور علی گڑھ میں حضرت علامہ سے اپنی چند ملاقاتوں کا حال بھی بیان کیا ہے اور اس دوران میں ہونے والی بات چیت بھی مختصراً تحریر کی ہے۔ علامہ اقبال سے اپنی پہلی ملاقات میں وہ ان سے متاثر بھی ہوئے اور حیرت زدہ بھی۔ جہاں انہیں اقبال کے گٹھے ہوئے جسم، بھاری بھر کم لہجے، مردانہ اطوار، تورانیوں جیسی مونچھوں اور مخصوص وضع کی خوبصورت آنکھوں نے مرعوب کیا، وہیں ان کے پنجابیوں جیسے کھُلے ڈُلے بے تکلّف تلفظ نے انھیں حیران بھی کیا۔ انہیں علامہ اقبال کی ذہانت، نرم دلی، خوش مزاجی، شرافت، انکسار، پُراعتماد، عالمانہ، صاف اور سچّی گفتگو سُن کر بے حد خوشی ہوئی۔ علامہ اقبال کا دوسروں کے ساتھ مہذب رویّہ ان کی وضع داری، قدرتِ کلام، علمیت، خطوں کا جواب دینے میں مستعدی، خدا پر پختہ ایمان، زندگی کے بارے میں رجائی (پُر امید) نقطۂ نظر اور اولاد سے محبّت کی عمدہ

مثالیں بھی موجودہ مضمون میں دی گئی ہیں۔ علامہ اقبال کی طبعی شرافت اور خلوص کے بارے میں اُس جرمن خاتون کا بیان بھی نقل کیا گیا ہے جو، ان کی بیوی کے انتقال کے بعد، اُن کے دو کم سن بچوں (جاوید اقبال اور منیرہ بیگم) کی نگہبان بن کر اُن کے گھر میں آئی تھی اور اس اعتماد کا بھی، جو انہوں نے اس جرمن خاتون پر کیا اور اسی بناء پر گھر کے سارے معاملات اس کے سپرد کر دیئے۔ رشید احمد صدیقی نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ علامہ اقبال کو صرف شاعر سمجھنا بہت بڑی غلطی ہے۔ وہ اپنے زمانے کے بہت بڑے عالم تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ ان کے افکار و نظریات کا بہت کم حصّہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔ رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ وہ بہت کچھ جانتے تھے اور یہی نہیں بلکہ اکثر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ بعض بالکل نئی باتیں گفتگو کے دوران میں ان پر بغیر کسی کوشش کے منکشف ہوئی ہیں۔ علمی مسائل میں انہیں اپنے عہد کے دوسرے علماء سے استفادہ کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ اسی لئے فقۂ اسلامی میں اجتہاد کے موضوع پر اگرچہ انہوں نے انگریزی میں ایک پوری کتاب لکھ رکھی تھی لیکن اس کے باوجود انہوں نے مولانا ابو الکلام آزاد اور مولانا سید سلیمان ندوی سے تبادلۂ خیال کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں۔ اسی لئے اُن کا ذہن ہر مسئلے کے بارے میں بڑا صاف ہوتا تھا۔ رشید احمد صدیقی نے انہیں فلسفی، مفکر اور مقنن ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھا وکیل بھی قرار دیا ہے کیوں کہ ان کے خیال میں علامہ اقبال کی تحریر و تقریر میں جذبات کی بجائے فکر و تدبر کا عمل دخل زیادہ ہوتا تھا۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۳۶ جگرِ لالہ: لالے کے پھول کا کلیجہ۔ شبنم: اوس۔ دہل جانا: خوف کھانا، رعب میں آکر لرزنا۔

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفاں

علامہ اقبال کے اس شعر کا مطلب یہ ہے کہ مردِ مومن کو اپنوں کے لئے نرم خو ہونا چاہیئے اور غیروں کے لئے سخت مزاج۔ خدا پرستوں کے لئے اس کے دل میں محبّت و شفقت اور رحم کے جذبات ہونے چاہئیں اور دشمنانِ خدا کے لئے اُسے سراپا قہر و غضب بننا چاہیئے۔ اس خیال کو شاعر نے اپنے لفظوں میں یوں بیان کیا ہے کہ مومن کبھی تو ایسی شبنم بن جاتا ہے جو لالے کے جلتے ہوئے کلیجے میں ٹھنڈک ڈال دیتی ہے اور کبھی وہ ایسا تند و تیز سیلاب بن جاتا ہے، جسے آتا دیکھ کر بے قابو دریاؤں کے دل کانپ اُٹھتے ہیں۔ یہاں جگرِ لالہ سے مراد وہ خدا رسیدہ لوگ ہیں جن کے سینے عشقِ الٰہی کی آگ

میں سدا جلتے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں اور کمزوروں اور بے بسوں کے ساتھ مردِ مومن کا سلوک نرمی اور محبت کا ہوتا ہے۔ اس کے حُسنِ سلوک سے ان کے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ جاتی ہے لیکن ان لوگوں کے لیے جو بے قابو دریاؤں کی طرح اپنے کناروں سے چھلک بہتے ہیں اور خدا کی قائم کردہ حدود پامال کر دیتے ہیں، مردِ مومن کا وجود ایک تند و تیز سیلاب کی مانند ہوتا ہے، جو اپنی رَو میں انہیں بہا کر لے جاتا ہے۔ یہ شعر علامہ اقبال کی نظم "مردِ مسلمان" کا ہے جو اُن کے تیسرے اردو مجموعہ کلام "ضربِ کلیم" میں شامل ہے۔

دُور دراز: بہت لمبے فاصلے پر۔ پلیٹ فارم: ریلوے سٹیشن کا چبوترہ، جس کے متصل ریل گھڑی ہوتی ہے۔ عزیز: رشتہ دار۔ ڈاکٹر صاحب: ڈاکٹر علامہ اقبال۔ آن: لمحہ، سیکنڈ۔ کائنات: دُنیا۔ پُرہیبت: ڈر اور خوف سے بھرا ہوا۔ پُراسرار: بھیدوں سے بھرا ہوا۔ گراں پیکر: بڑے بھاری بھرکم ڈیل وڈول والا۔ آن کی آن: لمحہ بھر کے لئے۔ مقرر: طے شدہ۔ ہنگامے: رونق، شور و غل۔ رواں: جاری، چلتی ہوئی۔ نفس: جی، دل، خواہش۔ مطالبات: مطالبہ کی جمع، خواہشات، تقاضے۔ اوراق: ورق کی جمع، کاغذات۔

ص ۱۳۷ طفولیت: بچپن۔ چھُٹ پنے: چھوٹی عمر کی، بچپن، لڑکپن۔ مزیدار: لطف والی۔ جان نثار: جن پر جان قربان کی جا سکے۔ تصوّر: خیال۔ جادوگر: جادو کر دینے والا۔ مرحوم: لفظی معنی بخشا ہوا، عموماً فوت شدہ آدمی کے نام کے ساتھ یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ کوٹھی: مکان۔ سیاہ عقدہ (بو): کالے رنگ کی چھوٹی نکٹائی۔ وارد ہونا: پہنچنا، نازل ہونا۔ گٹھا ہوا جسم: مضبوط بدن۔ ساخت: وضع: شکل۔ تورانی: ترکستان کا باشندہ، تاتاری، توران، قدیم زمانے میں دریائے سندھ سے جھیل یورال تک کا علاقہ تھا اور ایرانی کا مشرقی حصہ تھا۔ گوشہ: کونہ۔ ذکاوت: ذہانت۔ ملاطفت: نرمی، مہربانی، نیکی۔ خوش دلی: شادمانی۔ بشاشت، خوش اخلاقی۔ شفقت: مہربانی، بزرگانہ عنایت، پیار، رحم۔ بھاری بھرکم: وزنی، بوجھل، موٹا۔ اقرار کرنا: ماننا۔ ڈیل ڈول: جسم۔ متحیر: حیران۔ اندازِ تخاطب: کسی کے روبرو متوجہ ہو کر گفتگو کرنے کا طریقہ۔ دل گرفتہ: غمگین، ملول۔ تلفظ: لفظ کا منہ سے ادا کرنا۔ آشنا: واقف۔ معذوریوں: احتیاجات، کمزوریاں۔ مستثنیٰ: وہ چیز جسے باقی چیزوں سے الگ کیا گیا ہو۔ بہشت: جنت۔ درہم برہم: اجڑنا، منتشر ہونا، تباہ و برباد ہونا۔ خلوص: دلی صفائی، سچی محبت، سچی دوستی۔

ص ۱۳۸ شفقت: بزرگانہ عنایت و مہربانی۔ ناقابلِ بیان: جسے صحیح طور پر بتانا مشکل ہو۔ مروت: لحاظ، رعایت۔ خلق: بھلا مانس ہونے کی صفت۔ محبت: مہربانی۔ عنایت۔ منتظر: انتظار کرنے والا۔ مستحق: حق دار۔ حِس: حواس کا واحد۔

قوتِ ادراک۔ تفویض: سپردگی، تحویل، حوالگی۔ علی گڑھ: ہندوستان کا ایک مشہور شہر جہاں کی مسلم یونیورسٹی بہت مشہور ہے۔ زور دار: طاقت ور۔ خود اعتمادی: اپنے آپ پر بھروسہ کرنا۔ عالمانہ: علم رکھنے والا۔ والہانہ: عاشقوں کی طرح محبت ہونا۔ متوازی: ایک دوسرے سے برابر فاصلے پر آنے والا۔ متوازن: اعتدال اور توازن رکھنے والا، دونوں پلڑے برابر رکھنے والا۔ بشرطیکہ: شرط یہ ہے کہ۔ حشو و زوائد: زائد کلام، عبارت یا گفتگو میں بھرتی کے الفاظ، بے ضرورت الفاظ کا استعمال۔ قطعاً: بالکل۔ وضاحت: کھول کر بیان کرنا۔ جامعیت: مکمل ہونے کی صفت۔ صنائع بدائع: صنائع، صنعت کی جمع، لفظی مطلب کاریگریاں۔ بدائع، بدیع کی جمع۔ لفظی معنی، انوکھا۔ صنائع بدائع سے مراد وہ علم ہے جس میں کلام کی لفظی اور معنوی خوبیاں بیان کی جاتی ہیں، عجیب و غریب باریکیاں جو کلام میں ہوں۔ جدید ایرانی رنگ: فارسی شاعری کا نیا انداز۔ غالب: چھا جانا۔ تعلّی: برتری، اپنی بڑائی جتانا، شیخی بھگارنا۔ بیزاری: دل اچاٹ ہو جانا۔ صحبت: ہم نشینی، پاس بیٹھنا۔

ص ۱۳۹ اصحاب: صاحب کی جمع الجمع، پاس بیٹھنے والے، ساتھی، ہم نشین۔ برآمد ہونا: باہر نکلنا۔ انقباض: مزاج کی ناسازی، طبیعت کا بجھا بجھا ہونا، دل گرفتگی۔ کش لینا: حقّے کا دم، حقّے کا گھونٹ۔ نعمت: بخشش، عمدہ چیز، عطیہ۔ ظرف: حوصلہ، قابلیت، لیاقت۔ لعنت: پھٹکار، خدا کی رحمت سے دُوری۔ بحال: درست۔ پرسشِ حال: حال پوچھنا۔ طور: طرح، انداز۔ مشاغل: مشغلہ کی جمع، مصروفیات، دلچسپی کی چیزیں۔ دُکھ سکھ سننا: اچھے بُرے حالات دریافت کرنا۔ معتقدین: اعتقاد رکھنے والے، پیروکار، عقیدت مند۔

اقبال کا نظریۂ فوق البشر: فوق کے معنی ہیں اوپر یا اونچا اور بشر کے معنی ہیں انسان، فوق البشر سے مراد مردِ برتر یا ایک ایسی ہستی ہے جو عام انسانی اوصاف سے زیادہ صفات کی مالک ہو۔ انگریزی میں اس کے لئے SUPER-MAN کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے جرمن فلسفی نیٹشے (۱۸۴۴ء تا ۱۹۰۰ء) نے فوق البشر کا تصوّر پیش کیا ہے اور علّامہ اقبال کا تصوّرِ مردِ مومن یا تصورِ انسانِ کامل کہیں کہیں اس سے ملتا جلتا ہے اور کہیں اس سے مختلف ہے نیٹشے نے اپنی کتابوں "اور زرتشت نے کہا" "خیر و شر سے ماوراء" اور "ارادہ قوت" میں فوق البشر کا تصور پیش کیا ہے اور کہا جاتا ہے کہ اُس نے یہ اصطلاح مشہور جرمن فلسفی شاعر گوئٹے سے مستعار لی ہے۔ نیٹشے کا خیال ہے کہ انسانی معاشرے کا مقصود و منتہا تمام انسانوں کی ترقی و نشو و نما نہیں بلکہ صرف بہترین اور مضبوط افراد کی نشو و نما کرنا ہے، گویا معاشرہ ایک وسیلہ ہے جو "مردِ برتر" کی شخصیت کی تشکیل اور قوت میں اضافہ کے سامان فراہم کرتا ہے۔ نیٹشے کا فوق البشر خیر و شر کے معیار سے

ماورا ہے۔ اُسے تمام انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے، وہ خدا کا منکر ہے، اس کی تین خصوصیات ہیں یعنی قوّت، فراست اور تکبّر۔ اس کے مقابلے میں علامہ اقبال نے مردِ مومن یا انسانِ کامل کا تصوّر پیش کیا ہے۔ مردِ مومن اخلاق کا منکر نہیں بلکہ اخلاقِ فاضلہ کا نمونہ ہے۔ وہ خدا کا اطاعت گزار اور اس کا خلیفہ ہے۔ وہ طاقت حاصل کرنا چاہتا ہے تاکہ کمزوروں کی مدد کر سکے سخت کوشی، جدّو جہد اور تسخیرِ فطرت کے لئے آمادۂ جنگ ہونا اس کی صفات ہیں۔ اس کی ذات میں بہترین انسانی اوصاف جمع ہوتے ہیں۔ گویا وہ جلال اور جمال کا حسین امتزاج ہوتا ہے۔ مردِ مومن کی خودی کی تربیّت کے لئے علامہ اقبال نے تین درجے مقرر کئے ہیں (۱) اطاعتِ الٰہی (۲) ضبطِ نفس (۳) نیابتِ الٰہی۔ اقبال کا 'مردِ برتر' اخلاق، شرافت، قوّت اور انسانیّت کا مجسّمہ ہے۔ شبہات: شکوک۔ خوش دلی: شادمانی، بشاشت۔ سیرت: کردار۔ گرانقدر: قیمتی۔ عزیز: پیاری، خوش آیند، بھلی لگنے والی۔ متنازعہ فیہ: جن کے بارے میں اختلاف یا جھگڑا ہو۔ پیچیدگی: الجھاؤ۔ عالمانہ: علمی انداز رکھنے والا۔ مخلصانہ: خلوص والا۔ سچائی کا حامل۔ کرامت: انوکھی بات، کرشمہ۔ ناگہانی: اچانک۔ صحبت: ہم نشینی، محفل۔ بعثتِ نبوی: آنحضرتؐ کا تبلیغِ حق کے لئے مقرر ہونا۔ آپؐ کا اعلانِ رسالت پر مامور ہونا۔ فقۂ اسلامی: اسلامی قانون۔ اسلامی شرعی احکام کا علم۔ اجتہاد: نئی بات پیدا کرنا، غور و خوض سے کسی مسئلے کو حل کرنا۔ قرآن، حدیث اور علماء ماضی کے اجماعی فیصلے سے فروعی مسئلوں کو حل کرنا۔

ص ۱۴۰ | جہاں تہاں: ادھر اُدھر، یہاں وہاں، ہر جگہ۔ اعادہ: دہرانا۔ تکرار کرنا۔ مقیّد: محدود، قید، بند۔ فکر و نظر: مراد ہے افکار و نظریات، فکر کا مطلب زندگی اور کائنات کے مسائل پر عقلی سوچ بچار کے بعد کسی مثبت نتیجے پر پہنچنا ہے، جبکہ لفظ نظر، یہاں روحانی غور و فکر کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ ویسے علامہ اقبال کے کلام میں "خبر اور نظر" کی اصطلاحیں بھی استعمال ہوئی ہیں، "خبر"۔ علمی مشاہدے اور سائنسی تجربے کی علامت ہے گویا خبر کے ذریعے عقلی سطح پر حقیقت کا ادراک کیا جاتا ہے جب کہ "نظر" کشف و شہود کی علامت ہے، یعنی خدا کی خاص عنایت سے مردِ خدا کا سینہ اس طرح منوّر ہوتا ہے کہ حقیقت خود بخود اس پر منکشف ہو جاتی ہے۔ اقبال کے خیال میں انسانی شخصیت کا مکمل اپنی استعداد کا اظہار تبھی کر سکتی ہے۔ جب یہ دونوں قوّتیں نمو پائیں، یعنی انسان فلسفہ و منطق سے بھی کام لے اور مذہبی واردات اور کشف و الہام کی اہمیّت بھی پہچانے۔ منتقل: ایک جگہ سے دوسری جگہ جانا۔ دورانِ گفتگو میں: بات چیت کرتے وقت۔ منکشف: ظاہر ہونا، کھلنا۔ فقۂ اسلامی: اسلامی قانونِ شریعت۔ اجتہاد: نئی بات پیدا کرنا۔ غور و خوض سے کسی مسئلے کو حل کرنا۔ فقہ اسلامی میں..... انگریزی میں

مستند

بہت کچھ لکھ چکے تھے: یہاں مراد علامہ اقبال کے وہ سات خطبات ہیں جو کتابی شکل میں
"THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM"
(تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ) کے نام سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کو لکھنے سے پہلے علامہ اقبال نے سید سلیمان ندوی، مولانا ابو الکلام آزاد، مفتی حبیب الرحمٰن لدھیانوی، مولوی محمد امین لدھیانوی، مولانا غلام مرشد، مولانا اصغر علی روحی اور مولوی سید طلحہ سے تبادلۂ خیال کیا۔ ۱۹۲۴ء میں علامہ اقبال نے اجتہاد فی الاسلام کے موضوع پر بہ عنوان (THE IDEA OF IJTIHAD IN THE LAW OF ISLAM) انگریزی میں خطبہ تیار کر کے لاہور کے ایک اجلاس میں پڑھا۔ یہی خطبہ بعد میں علامہ اقبال کے مجموعہ خطبات میں چھٹے خطبہ کے طور پر THE PRINCIPLE OF MOVEMENT IN THE STRUCTURE OF ISLAM کے نام سے شامل ہوا۔ مجموعہ خطبات کا پہلا ایڈیشن (تعداد: چھ خطبات) ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا اور دوسرا ایڈیشن (تعداد: سات خطبات) ۱۹۳۴ء میں چھپا۔ مسودہ: مصنف کے ہاتھ کی لکھی ہوئی وہ عبارت جس کے صاف کرنے کی ضرورت پڑے۔ ضخیم: موٹا، لمبا چوڑا۔ مستند: قابلِ اعتبار۔ علماء: عالم کی جمع۔ رجوع: لوٹنا، توجہ کرنا۔ سود مند: فائدہ مند۔ نابلد: ناواقف، انجان۔ بیشتر: زیادہ تر۔ ماہرینِ فن: کسی خاص علم یا ہُنر کے اچھی طرح جاننے والے۔ کرام: کریم کی جمع، بزرگ لوگ۔ معذور: ناقابلِ کار، نہ کرنے کے قابل۔ متنازعہ فیہ: جس کے بارے میں اختلاف یا جھگڑا ہو۔ ہیئت: اصلیت، حقیقت۔ نوعیت: صورتِ حال۔ ابو الکلام آزاد: ہندوستان کے مشہور عالمِ دین، صحافی، خطیب اور سیاسی رہنما، وہ ۱۸۸۸ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۸ء میں فوت ہوئے۔ بطور صحافی "الہلال" اور "البلاغ" جیسے رسائل نکالے۔ "تذکرہ" اور "غبارِ خاطر" ان کی مشہور تصانیف ہیں۔ "ترجمان القرآن" کے نام سے قرآن مجید کی تفسیر لکھی جو مکمل نہ ہو سکی۔ آل انڈیا کانگریس کے چوٹی کے لیڈر تھے، ہندوستان کے آزاد ہونے پر وہ وزیرِ تعلیم بنے۔ وہ متحدہ قومیت کے حامی اور قوم پرست مسلمان تھے۔ سید سلیمان ندوی: مشہور مورخ، سوانح نگار، نقاد، عالمِ دین اور علامہ شبلی نعمانی کے شاگرد۔ آپ ۱۸۸۴ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۳ء میں فوت ہوئے۔ ان کی تصانیف میں حیاتِ امام مالک، سیرت عائشہ، خیام، خطباتِ مدراس، رحمتِ عالم، عرب و ہند کے تعلقات، نقوشِ سلیمانی، ارض القرآن، حیاتِ شبلی اور سیرۃ النبیؐ (جلد سوم تا ہفتم) زیادہ مشہور ہیں۔ دار المصنفین اعظم گڑھ سے ایک عرصہ تک وابستہ رہے اور رسالہ "معارف" اعظم گڑھ کے ایڈیٹر رہے۔ تبادلۂ خیالات: کسی بات کے متعلق دو یا زیادہ اشخاص کا باہم اظہارِ خیال کی۔

ص ۱۴۱ وصف: خوبی۔ بینائی: نظر۔ رسمی تکلفات: محض دکھاوے کے طور پر کوئی

کام کرنا، رسوم و رواج کا لحاظ رکھتے ہوئے ظاہرداری برتنا۔ واضح: کھلا ہوا۔ صاف۔
جامع: ہر لحاظ سے مکمل۔ صاف گوئی: سچائی۔ موقع بہ موقع: جب بھی موقع ملے۔ کترا کر: جان بچا کر، پہلو بچا کر۔ امکان: گنجائش۔ فلسفی: زندگی اور کائنات کے مسائل پر غور کرنے والا انسان۔
مفکّر: حیات و کائنات پر سوچ بچار کر کے کسی نتیجے پر پہنچنے والا شخص۔ جو اپنے نتائج فکر کو مربوط انداز میں پیش کر سکے۔ مقنّن: قانون بنانے والا، قانون جاننے والا۔ بیرسٹر: انگلستان سے قانونی ڈگری (بیرسٹرایٹ لاء) حاصل کرنے والا۔ فکر: سوچ بچار۔ تدبّر: غور و فکر۔ منطقی ربط: عقلی دلائل کے ذریعے جملوں میں تعلق پیدا کرنا۔ وقار: عزّت قدر و منزلت۔
شفقت: مہربانی۔ ایمان: خدا پر یقین۔ توہین: بے عزّتی۔

ص ۱۴۲ | جہان: دنیا۔ عالم بقا کو سدھارنا: فوت ہو جانا، اُس دنیا کو چلے جانا جو ہمیشہ رہنے والی ہے یعنی اگلی دنیا۔ تسکین: تسلّی۔ تشفّی: تسلّی، اطمینان۔ خاصان بارگاہ: اللہ کے دربار میں چُنے ہوئے یا خاص الخاص انسان، بھیجے ہوئے بزرگ۔ معجزہ: انبیاء سے سرزد ہونے والا ایسا حیرت انگیز کام جسے عقل تسلیم نہ کرے مثلاً حضرت موسیٰؑ کا یدِ بیضا اور عصا کا سانپ بن جانا۔ کرامت: انوکھا کام، کرشمہ، کسی بزرگ سے سرزد ہونے والا حیرت انگیز کام۔ زائل: دُور ہونے والا۔ جاوید: ڈاکٹر جاوید اقبال جو علامہ اقبال کے فرزند ہیں اور آج کل پنجاب ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہیں۔ سنہ ۱۹۲۴ء میں پیدا ہوئے، علامہ اقبال کی وفات کے وقت ان کی عمر ساڑھے تیرہ برس تھی۔ انہوں نے بھی علامہ اقبال کی طرح بیرسٹرایٹ لاء اور پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کیں اور ابتداء میں باپ کی طرح وکالت کا پیشہ اپنایا۔ پھر جسٹس بنے ان کی اردو تصانیف میں "مئے لالہ فام" اور "زندہ رود" (تین جلدیں) مشہور ہیں۔ پہلی کتاب میں علامہ اقبال کے بارے میں متفرق مضامین ہیں اور دوسری کتاب علامہ اقبال کی سوانح عمری ہے۔ ان کی کئی انگریزی تصانیف بھی ہیں۔ بانو: علامہ اقبال کی بیٹی منیرہ بیگم جو ۱۹۳۰ء میں پیدا ہوئیں۔ اقبال کی وفات کے وقت ان کی عمر تقریباً آٹھ سال تھی۔ جوان ہو کر ان کی شادی لاہور کے میاں صلاح الدین (عرف میاں صلّی) سے ہوئی۔ منیرہ بیگم زندہ ہیں اور ان کے تین بیٹے اسد، یوسف اور اقبال ہیں۔

جاوید اقبال اور منیرہ بیگم دونوں علامہ اقبال کی دوسری بیوی سردار بیگم کے بطن سے پیدا ہوئے۔ یہ بیوی ۱۹۳۵ء میں فوت ہوئیں تو دونوں کم سن بچوں کی پرورش کے لئے اقبال کو ایک آیا کی ضرورت پڑی۔ تربیت: نشو و نما۔ نگہداشت: نگرانی اور حفاظت، دیکھ بھال۔ ایک شریف جرمن خاتون: ان کا نام مسز ڈورس احمد تھا، وہ علی گڑھ کے ایک پروفیسر کی بیوی کی بہن تھیں اور کچھ مدت سے علی گڑھ میں ہی مقیم تھیں۔ وہ اردو بول سکتی تھیں اور اسلامی معاشرت سے واقف تھیں۔ یہ

خاتون جولائی ۱۹۳۷ء کے آخری ہفتے میں لاہور تشریف لائیں اور علامہ اقبال نے گھر کا انتظام اور جاوید اقبال اور منیرہ بیگم کی نگہداشت کی ذمے داریاں انہیں سونپ دیں۔ یوں مسز ڈورس احمد نے "جاوید منزل" میں جو علامہ اقبال کی ذاتی رہائش گاہ تھی۔ آئندہ مستقل رہائش اختیار کی۔ دونوں بچے انہیں "آپا جان" کہتے تھے۔ تحریک: حرکت پیدا کرنے والی چیز یا کوشش۔ تہذیب: رکھ رکھاؤ پرورش، شائستگی، معاوضہ: خدمت یا محنت کے بدلے میں رقم کی ادائیگی۔ کمی بیشی: کم یا زیادہ ہونا۔ مطلق: بالکل۔ اصرار: زور دینا۔ سیرت: کردار۔ عقائد: عقیدہ کی جمع، ایمان، اعتقاد۔ چھان بین: پرکھ، تفتیش۔ کاوش: کوشش۔ نقطہ نظر: نظریہ، خیال۔

ص ۱۴۳ | امتحاناً: آزمائش کے طور پر۔ انداز و اطوار: طور طریقے، چال چلن۔
مروّت: لحاظ اور خلق سے پیش آنا۔ اُلجھن: پریشانی، بے چینی۔ عشق: انتہا درجے کا پیار اور محبت۔ زمانۂ حیات: زندگی کا وقت۔ وابستہ: تعلق ہونا۔ ہم جولی: ساتھی، کھلونا: کھیلنے والی چیز۔ ضعف: کمزوری۔ غفلت: بے ہوشی۔ مریض: بیمار یہاں مراد علامہ اقبال۔

ص ۱۴۴ | بے تکلف: بغیر کسی جھجک کے۔ بینائی: نظر۔ زائل: ختم۔ نحیف: کمزور۔
جنبش: حرکت۔ جوں کا توں: ویسے کا ویسا۔ ایک گونہ: ایک طرح کا۔ ڈوبتی بجھتی: مدھم ہو کر بجھنے کے قریب۔ قندیل: ایک قسم کا فانوس جس میں چراغ جلا کر لٹکاتے ہیں۔ جذبۂ امتنان: احسان کرنے کے جذبے سے۔ مسرّت: خوشی۔ تذکرہ: ذکر۔ گریہ: رونا، آنسو۔ گلوگیر: حلق میں اٹکنا، وہ چیز جو گلے کو پکڑے، مراد ہے روتے وقت منہ سے آواز نہیں نکلتی۔ مخلص: خلوص کا مالک۔
آداب: ادب کی جمع، پسندیدہ طور طریقے۔ ملحوظ رکھنا: لحاظ رکھنا، خیال رکھنا۔ مستثنےٰ: الگ، علیحدہ۔ تہمد: تہ بند، جسم کے نچلے حصے میں باندھنے کا کپڑا۔ ضعف: کمزوری۔ مادّہ: صلاحیت۔ رد کرنا: لوٹا دینا، نہ ماننا۔ مطلق: بالکل۔

ص ۱۴۵ | متمنّی: خواہش مند۔ مزار: قبر، مقبرہ۔ شاہی مسجد: لاہور میں اورنگ زیب عالمگیر کی تعمیر کردہ مسجد جو وسعت اور خوبصورتی میں اپنا جواب نہیں رکھتی۔ پائیں: نیچے۔ مردِ قلندر: درویش، مراد علامہ اقبال، تصوّف کی اصطلاح میں درویش وہ ہے جو علائق دنیوی سے بالکل کنارا کر چکا ہو لیکن وہ تسخیر کائنات کے لئے جد و جہد سے کام لے۔ یہاں علامہ اقبال کی مردِ مومن کے لئے وضع کردہ اصطلاح "قلندر" کو خود اقبال پر ہی منطبق کیا گیا ہے۔
آسودۂ خاک: قبر کی مٹی کے نیچے آرام کرتے ہوئے، دفن۔ آرام گاہ: آرام کرنے کی جگہ، قبر۔
ع: سکھلائی فرشتوں کو آدم کی تڑپ جس نے: "بالِ جبریل" کی غزل نمبر ۱۵ جو تین اشعار پر مشتمل ہے اس کا آخری شعر ایک لفظ کی ترمیم کے ساتھ "اس" کی بجائے "جس" استعمال کیا گیا

ہے) یہاں درج کیا گیا ہے۔ یہ شعر فرشتوں کی زبان سے علامہ اقبال کی صفات کے بارے میں ہے۔ فرشتے کہتے ہیں کہ کلامِ اقبال کا کمال یہ ہے کہ اس نے ان کے دل میں وہ تڑپ، سوز اور ولولہ پیدا کیا ہے۔ جو اب تک صرف آدم کے سینے میں چھپا ہوا تھا۔ دوسری طرف اس نے انسان کو خدائی کے آداب سکھائے ہیں اُسے دنیا کا مالک، آقا اور حکمران قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ ساری کائنات اس کے لئے تسخیر کی گئی ہے۔ آدم کی تڑپ: انسان کے دل میں عشق الٰہی کا جوش اور ولولہ۔ آدابِ خداوندی: حکومت کرنے کے اعلیٰ طور طریقے۔ پُر اسرار: بھیدوں سے بھرے ہوئے۔ پُر وقار: رعب داب والے۔ ضخامت: بڑے اور لمبے چوڑے۔ قدامت: پرانا پن۔ روایات: روایت کی جمع، پرانے اصول اور طور طریقے۔ مُستولی: حاوی، قابض، غالب، چھا جانے والا۔ تصوّر: خیال۔ مزاحم: رکاوٹ پیدا کرنا۔ استعداد: قابلیت، صلاحیت۔ شگفتہ: کِھلا ہوا۔ مطالعہ: پڑھنا۔ دماغ پاشی: دماغ پر زور دینا۔ مغز پاشی کرنا: یاد رکھنے کے لئے ذہن کو تکلیف دینا۔ ذہنی تصوّرات: دماغ میں پیدا ہونے والے خیالات۔ دھندلے: مدھم۔ گریز پا: بھاگنے والا، ناپائیدار۔ تعمیر: عمارت بنانا۔

ص ۱۴۶ کرامات: کرامت کی جمع، انوکھی یا حیرت انگیز بات۔ درہم برہم: منتشر۔ ولولہ: جوش، شوق۔ تعین: مقرر کرنا۔ رفیق: ساتھی، دوست۔ رہبر: راستہ دکھانے والا۔ تشکیل: بنانا۔ تزئین: آرائش کرنا، بنانا سنوارنا، سجاوٹ کرنا۔

سبق کا خلاصہ

رشید احمد صدیقی لکھتے ہیں کہ شدید گرمی کے موسم میں، دور دراز کا سفر طے کر کے میں علی گڑھ سٹیشن کے پلیٹ فارم پر اُترا ہی تھا کہ کسی رشتے دار نے علامہ اقبال کے انتقال کی خبر سنائی جسے سُن کر میں سُن ہو کر رہ گیا۔ گھر پہنچا تو کمرہ بند کر کے لیٹ رہا اور شدید غم کے عالم میں نہ نہانے کو جی چاہا اور نہ کھانے کو۔ ذہن میں ماضی کے واقعات ابھرنے لگے۔ جب بچپن میں علامہ اقبال کے اشعار بڑے اچھے لگتے تھے۔ ان کے اشعار پڑھ کر میں نے ان کی ایک خیالی تصویر ذہن میں بنالی تھی جو ان کی شاعری کی طرح بڑی پُرکشش اور دل آویز تھی۔

۱۹۲۵ء میں پہلی بار لاہور میں اُن سے ملاقات کا موقع ملا۔ دن کے نو دس بجے تھے، جب میں ان کی کوٹھی پر پہنچا۔ وہ کپڑے پہن کر کچہری جانے کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ سیاہ رنگ کی بو لگائے، کالر درست کرتے وہ باہر تشریف لائے، جسم مضبوط تھا، انداز مردانہ تھے، آنکھوں کی ساخت اور مونچھوں کی وضع تورانیوں جیسی تھی سوٹ پہنے ہوئے بہت اچھے لگ رہے تھے، وہ مسکراتے تھے

تو ان کی آنکھوں کے گوشوں میں جھریاں پڑنے سے ذہانت اور نرمی کا احساس ہوتا تھا۔ انہوں نے بڑی خوش اخلاقی کے ساتھ مجھ سے ہاتھ ملایا اور اظہار شفقت کے طور پر کافی دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لئے رہے۔

انہوں نے جب بھاری بھرکم لہجہ میں مجھے "آپ ہیں صدیقی صاحب؟" کہہ کر مخاطب کیا۔ تو یقین جانیئے علامہ اقبال مرحوم کا حلیہ، جسم اور لب و لہجہ دیکھ کر میں بہت پریشان ہوا، پھر جب انہوں نے ملازم سے پنجابی زبان میں قلم لانے کو کہا تو ان کے تلفظ نے مجھ پر گھبراہٹ طاری کر دی۔ میں ڈاکٹر اقبال سے نستعلیق لب و لہجہ کی توقع رکھتا تھا۔ اسی لئے ان سے مل کر میرے ابتدائی تصورات درہم برہم ہو گئے کیونکہ میں نے اپنے خیالوں میں ان کی اور ہی طرح کی تصویر بنا رکھی تھی۔

تاہم وہ جس محبت، اپنائیت اور خلوص سے ملے، اسے دیکھ کر اب سوچتا ہوں کہ انہیں ہوبہو ویسا ہی ہونا چاہیئے تھا جیسا وہ پہلی ملاقات میں نظر آئے۔ ان سے ملاقات بہر حال ایک قیمتی اور نادر تجربہ تھی۔ وہ میری خاطر تھوڑی دیر کے لئے کمرہ میں بیٹھ گئے اور مجھ سے علی گڑھ کا حال دریافت کرتے رہے۔ مَیں نے محسوس کیا کہ ان کی آواز بلند اور زوردار تھی اور اس میں عالمانہ اور والہانہ دونوں انداز ملے جُلے تھے۔ وہ جب باتیں کرتے تو ان کی گفتگو بڑی جامع اور فکر انگیز ہوتی تھی اور ہر طرح کے تکلّفات سے پاک ہوتی تھی۔

اُسی شام اُن سے دوبارہ ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اس وقت اتفاقاً ایک نوجوان شاعر بھی تشریف لے آئے جنہوں نے اپنے جدید انداز اور لب و لہجے کے تھکا دینے والے فارسی کلام اور طویل فخریہ گفتگو سے علامہ اقبال کو خاصا بدمزہ اور بیزار کیا۔ جب وہ رخصت ہو گئے تو علامہ اقبال نے فرمایا کہ نعمت کے مطابق اگر انسان کو ظرف حاصل نہ ہو تو نعمت، لعنت بن جاتی ہے۔ اتنے میں علامہ اقبال کے کچھ اور احباب آ گئے تو ان کا تکدّر دُور ہُوا اور وہ ان کا حال احوال دریافت کرنے لگے۔ وہ ہر ملنے والے سے اس کے مشاغل اور اس کے مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے۔ ان کے ہاں بڑی محبّت اور بے تکلفی کی فضا ہوتی تھی۔ ہر شخص بلا تکلف اپنی باتیں سناتا اور علامہ اقبال مرحوم سب کی باتیں گہری توجہ سے سنتے۔

اگلے دن پھر علامہ اقبال کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا اور اُن سے ان کے نظریۂ فوق البشر (تصوّرِ مردِ مومن) پر تبادلۂ خیالات ہوا۔ میرے ذہن میں جو اُلجھنیں تھیں، انہیں حضرت علامہ نے بڑے دل نشیں عالمانہ انداز میں صاف کیا۔ اس نشست میں عورتوں کا درجہ، فوق البشر، بعثتِ نبوی کا وقت اور مقام، فقۂ اسلامی میں اجتہاد وغیرہ مسائل پر سارا دن گفتگو جاری رہی۔ علامہ اقبال کو صرف شاعر تصور کرنا درست نہیں۔ وہ درحقیقت جتنے بڑے عالم تھے، اس کا بہت کم حصّہ ان کے کلام میں منتقل ہوا ہے۔

اسلامی فقہ میں اجتہاد کے ہر مسئلہ پر انہوں نے انگریزی بہت کچھ لکھا تھا اور کتاب کا مسوّدہ بھی تیار ہو چکا تھا۔ وہ اس بارے میں جیّد علماء سے تبادلۂ خیال کرنا چاہتے تھے۔ انہوں نے مجھ سے پوچھا تو میں نے مولانا ابوالکلام آزاد اور سید سلیمان ندوی کے نام لئے۔ انہوں نے دونوں کے بارے میں اچھے خیالات کا اظہار کیا۔

علّامہ اقبال اپنے نام آئے ہوئے خطوط کا جواب بھی جلد دیا کرتے تھے۔ جب تک ان کی نظر کام کرتی رہی، وہ ہر خط کا جواب اپنے ہاتھ سے لکھتے رہے خطوں میں وہ رسمی تکلّفات سے پرہیز کرتے اور ہر بات کا جواب صاف، واضح اور جامع انداز میں دیتے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ وہ فلسفی، مفکر اور قانون دان تھے، اسی لئے وہ جو کچھ کہتے یا لکھتے، اس میں جذبات کی بجائے غور و فکر کا غلبہ ہوتا۔

۱۹۳۰ء میں علّامہ اقبال کسی سلسلے میں علی گڑھ تشریف لائے۔ میں اُن دنوں بیمار تھا۔ وہ ایک دن صبح سویرے میرے مکان پر تشریف لائے۔ اس روز بیماری کی وجہ سے مجھے سخت تکلیف تھی اس لئے میں بمشکل باہر آیا اور رک رک کر مایوسی اور شرمندگی کے عالم میں اس دکھ کا اظہار کیا کہ میرے ہوتے ہوئے وہ کسی اور جگہ قیام کر رہے ہیں۔ انہوں نے مسکراتے ہوئے بڑے وقار اور شفقت کے ساتھ اپنے مخصوص لہجہ میں مجھے تسلّی دی اور کہا کہ تم بہت جلد تندرست ہو جاؤ گے۔ مایوس ہونا گناہ ہے اور اس سے ایمان میں خلل پڑتا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا کہ عنقریب میں تو اچھا ہو جاؤں گا اور علّامہ اقبال اس جہان سے رخصت ہو جائیں گے۔

اپنی بیوی کے انتقال کے بعد وہ اپنے بچوں جاوید اقبال اور بانو (منیرہ بیگم) کی پرورش اور تربیت کے لئے بڑے پریشان تھے۔ میرے مشورے پر انہوں نے ایک شریف جرمن خاتون کی خدمات حاصل کیں جو میرے ایک عزیز کی رشتہ دار تھیں اور کچھ عرصہ تک میرے گھر رہ چکی تھیں۔ ان کے پہنچنے پر علّامہ اقبال نے اپنے خطوط میں اس خاتون کی شرافت، لیاقت، دیانت اور مروّت کا بڑے اچھے لفظوں میں ذکر کیا۔ وہ جرمن خاتون بھی علّامہ اقبال کی شرافت اور اخلاص کی ہمیشہ تعریف کرتی تھیں۔ ان کے لاہور پہنچنے اور گھر سنبھالنے کے بعد پہلے پہل تو علّامہ اقبال پورے کپڑے پہن کر آتے اور دسترخوان کے وہ آداب ملحوظ رکھتے ہوئے جو یورپ کے اونچے گھرانوں میں نظر آتے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے یہ خواہش ظاہر کی کہ انہیں ان تکلّفات سے آزاد کر دیا جائے، چنانچہ وہ صرف بنیان اور تہمد پہن کر کھانے کی میز پر چلے آتے اور جب کمزوری بڑھ گئی تو اپنے کمرے میں ہی کھانا کھا لیتے وہ جرمن خاتون کہتی ہیں کہ علّامہ اقبال دوسروں پر بھروسہ کرنے کے عادی تھے۔ انہوں نے گھر کے معاملات میں کبھی دخل نہیں دیا اور نہ کبھی میری کسی تجویز کو ردّ کیا۔ علّامہ اقبال اکثر فرماتے کہ تمہارے ہونے سے میں گھر اور بچوں کی طرف سے مطمئن ہو گیا ہوں۔

علاّمہ اقبال کو اپنی بیٹی بانو سے بہت محبت تھی۔ جب وہ آخری بار بیمار ہوئے تو وہ اپنا دل اُس سے کھیل کر بہلاتے۔ ضعف اور بیماری کی وجہ سے ان پر غفلت طاری ہوتی تو ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود بانو باپ کے سینے پر جا بیٹھتی جب اُسے ہٹایا جاتا تو اقبال خاموشی سے آنکھیں بند کئے یوں حرکت کرتے جیسے کہہ رہے ہوں کہ بانو کو اُسی طرح ان کے سینے پر رہنے دیں۔ بانو کو بھی اپنے باپ سے بہت محبت تھی چنانچہ ان کے انتقال کے بعد ایک دن رات کے وقت وہ اس جرمن خاتون سے کہنے لگی کہ آپا جان! ابّا جان موجود تھے تو یہ چاند اور ستارے چمکدار اور اچھے معلوم ہوتے تھے لیکن اب ایسے نہیں لگتے۔

رشید احمد صدیقی کہتے ہیں کہ علاّمہ اقبال کے انتقال کے بعد میں اپنے ایک رشتہ دار کو لے کر ان کے مزار پر حاضر ہوا یہ بادشاہی مسجد کے نیچے بائیں طرف بنایا گیا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ بادشاہی مسجد کا وقار، عظمت، جسامت، وسعت، قدامت، مخصوص فضا اور روایات اس طرح دل و دماغ پر حاوی ہو جاتی ہیں کہ کسی اور چیز کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا۔ علاّمہ اقبال کا مزار کہیں اور ہوتا تو بہتر تھا تاکہ اقبال کے تصوّر میں کوئی اور چیز حائل نہ ہوتی۔

علاّمہ اقبال زندہ تھے تو یہ اطمینان تھا کہ جب جی چاہے گا یا موقع ملے گا تو اُن سے مل آؤں گا اور اپنی ذہنی الجھنوں کو سلجھانے کے لئے ان کی طرف رجوع کروں گا۔ کوئی بات معلوم کرنا چاہوں گا تو خود مطالعۂ کتب کرنے کی بجائے علاّمہ اقبال سے پوچھ کر اپنا اطمینان کروں گا۔ اور ان کی دلآویز گفتگو سے اپنے دل و دماغ کو شگفتہ کروں گا۔ لیکن ان کی وفات سے میرے تصوّرات درہم برہم ہو کر رہ گئے اور کچھ اور جاننے کے ولولے سرد ہو گئے۔ اب علاّمہ اقبال جیسا دوست اور رہنما دوبارہ ملنے کی کوئی توقع نہیں۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال ۱۰ درج ذیل عبارت کی مع حوالۂ متن اور سیاق و سباق، تشریح کیجئے۔

لیکن میں کیا بتاؤں کہ اپنی پہلے سے بنائی ہوئی بہشت کو یوں درہم برہم ہوتے دیکھ کر مجھ پر جو اثر جس درجہ ہونا چاہیئے تھا وہ نہ ہوا۔ مرحوم کچھ اس انداز سے ملے اور اب میں محسوس کرتا ہوں کہ خود ان کے تلفظ میں کچھ ایسا خلوص اور ان کے ہاتھ ملانے میں وہ شفقت اور ناقابلِ بیان مروّت و مرحمت تھی کہ میں سب کچھ بھول گیا۔ ایسا معلوم ہوا کہ اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔ جیسے ایک نیا تجربہ، بڑا اچھا تجربہ، حاصل ہوا جس کا میں مستحق ضرور تھا، گو اس کا منتظر نہ تھا۔ جیسے مجھے ایک نئی حس تفویض ہوئی جس کو چھین لیا جاتا تو میں کوئی بڑی کمی محسوس

جواب | **حوالۂ متن** | یہ عبارت رشید احمد صدیقی کے مضمون "علامہ اقبال" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس عبارت سے پہلے مصنف کہتا ہے کہ جونہی مجھے علامہ اقبال کے انتقال کی خبر ملی، میں ساکت ہو کر رہ گیا مجھے اپنا بچپن یاد آیا جب علامہ اقبال کے اشعار بڑے پُر لطف لگتے تھے۔ میں نے ان کی شاعری کی روشنی میں ان کی ایک تصویر اپنے ذہن میں بنا رکھی تھی۔ ۱۹۲۵ء میں مجھے لاہور جانے اور علامہ اقبال سے ملنے کا موقع ملا تو وہ میرے تصورات سے مختلف نکلے۔ ان کے مضبوط جسم، مردانہ اطوار، آنکھوں اور مونچھوں کی ساخت اور لباس، سب نے متاثر کیا، ان کی ذہانت، نرم دلی، خوش مزاجی، شفقت اور بھاری بھر کم لب و لہجہ بھی متاثر کرنے والی چیزیں تھیں، لیکن ان کا غیر شاعرانہ حلیہ اور ڈیل ڈول دیکھ کر تعجب ہوتا تھا اور لفظوں کا پنجابی تلفظ سن کر وحشت ہوتی تھی کیونکہ ان کی علمیت دیکھتے ہوئے یقین نہیں آتا تھا کہ ان میں یہ کمزوریاں ہونگی۔

اس عبارت کے بعد مصنف نے علامہ اقبال سے اپنی متعدد ملاقاتوں کا حال قلم بند کیا ہے اور ان ملاقاتوں میں ہونے والی گفتگو کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ پھر ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کے علی گڑھ تشریف لانے، مصنف کے بیمار پڑنے، علامہ اقبال کے تسلی دینے اور خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے کا مشورہ دینے کے واقعات تحریر کئے ہیں۔ اس کے بعد علامہ اقبال کے کم سن بچوں (جاوید اور بانو) کی نگہداشت کے لئے ایک جرمن خاتون کی خدمات حاصل کرنے کا تذکرہ ہے جس کا پتہ مصنف نے علامہ اقبال کو دیا تھا۔ پھر علامہ اقبال کی اپنی بچی سے محبت کا بیان ہے اور آخر میں علامہ اقبال کے مزار کے کسی اور جگہ ہونے کی خواہش کا کا اظہار ہے کیوں کہ مصنف کے خیال میں بادشاہی مسجد کی عظمت، وسعت اور وقار کے سامنے کسی چیز کی کوئی حیثیت نہیں رہتی۔

تشریح | رشید احمد صدیقی بتاتے ہیں کہ میں نے علامہ اقبال کی شاعری پڑھ کر ان کا جو حسین تصور قائم کر رکھا تھا، وہ ان کے پنجابی تلفظ کو سُن کر ٹوٹ گیا۔ مجھے یوں لگا جیسے میری اپنی بنائی ہوئی جنت اُجڑ گئی ہو۔ علامہ اقبال کی ذہانت، نرمی، خوش مزاجی اور شفقت کا جو خوشگوار اثر مجھ پر ہونا چاہئے تھا، وہ نہ ہوا۔ میرا خیال تھا کہ وہ بعض معمولی معذوریوں سے پاک ہوں گے ــــ تاہم علامہ اقبال مرحوم مجھ سے کچھ ایسی اپنائیت سے ملے اور اس وقت تو نہیں لیکن اب محسوس کرتا ہوں کہ ان کے تلفظ میں بھی اتنا اخلاص تھا اور ہاتھ ملانے میں اتنی محبت، شفقت، مروت اور رحمت تھی کہ میں اپنی ساری ناگواری بھول گیا۔ ــ مجھے یوں لگا کہ اگر اقبال، ویسے

نہ ہوتے، جیسے کہ وہ تھے تو پھر حقیقی اقبال سے میری ملاقات نہ ہوتی۔ ان سے ملنا، میرے لئے ایک نیا تجربہ تھا جو مجھے اچھا لگا اور میں اُسی کا مستحق تھا، اگرچہ پہلے سے مجھے اس کا اندازہ نہ تھا کہ ان کی گفتگو، ان کا لب و لہجہ، ان کی آواز اور الفاظ کی مخصوص ادائیگی ویسی ہو گی جس کا مجھے سامنا کرنا پڑا۔ بہرحال مجھے یوں لگا جیسے ان کے طرزِ کلام سے لطف اندوز ہونے کے لئے مجھے قدرت کی طرف سے ایک نئی حس عطا ہوئی ہے جو اگر مجھ سے چھن جاتی تو ایک بڑی کمی کا احساس ہوتا۔

چراغ حسن حسرت (۱۹۰۲ء - ۱۹۵۵ء)

آغا حشر

تعارف اور پس منظر

مولانا چراغ حسن حسرت کا مضمون "آغا حشر" ان کے شخصی خاکوں کے مجموعہ "مردم دیدہ" میں سے لیا گیا ہے، جو ۱۹۳۹ء میں لاہور سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں آغا حشر کے علاوہ اس عہد کے دیگر مشاہیر مثلاً مولانا ظفر علی خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ اقبال اور شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی وغیرہ کے خاکے بھی موجود ہیں۔ چراغ حسن حسرت نے اگرچہ گنتی کے آٹھ خاکے لکھے ہیں، لیکن اس کے باوجود وہ فنِ خاکہ نگاری کے تقاضوں سے بخوبی واقف نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مختصر ترین لفظوں میں کسی شخصیت کو زندہ بنا کر ہمارے سامنے لے آتے ہیں۔

آغا حشر کاشمیری کا خاکہ بھی اسی ذیل میں آتا ہے۔ چراغ حسن حسرت نے بڑے خوبصورت افسانوی انداز میں اپنے عہد کے بہترین ڈراما نویس (آغا حشر) کا تعارف کرایا ہے۔ چنانچہ آغا حشر کا براہِ راست ذکر کرنے سے پہلے انہوں نے دو اور آغاؤں کے تذکرے سے مضمون کا آغاز کیا ہے۔ ان میں ایک کسی افغان سردار کا نوجوان نوکر ہے جس کی سیاہ گنجان داڑھی، لمبی زلفیں اور سرخ سرخ ڈراؤنی آنکھیں ہیں ـــــ اور دوسرا ہینگ بیچنے والا کوئی افغان ہے، جس کی لمبی داڑھی، لمبے بال اور میلی صدری ہے اور جس کے ایک ہاتھ میں گٹھڑی رہتی ہے۔ جب اس کی ہینگ نہیں بکتی تو وہ غضب ناک ہو کر گاؤں والوں کو گالیاں دیتا اور ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے۔ ان دونوں افراد کا ذکر کر کے مصنف نے قارئین کا تجسّس بیدار کیا ہے اور وہ یہ دیکھنے کے لئے بے تاب ہو جاتے ہیں کہ آغا حشر کس قسم کی شخصیت ہیں؟

آغا حشر کاشمیری دُنیائے ڈراما کے بے تاج بادشاہ تھے۔ اُس زمانے میں منشی غلام علی دیوانہ اور ماسٹر رحمت جیسے لوگ تھیٹر پر چھائے ہوئے تھے جو تُک بندی، مقفّیٰ عبارت آرائی، بھونڈے مذاق، ذومعنی فقرے بازی اور ناچ گانے کو ہی ڈرامہ نگاری کی معراج سمجھتے تھے۔ آغا حشر کاشمیری نے اپنی فنی زندگی کا آغاز بحیثیت شاعر کیا۔ انہوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں اپنی نظمیں ترنم سے پڑھ کر شہرت حاصل کی اور انجمن کو خوب مالی فائدہ پہنچایا۔ ان کی طویل نظموں "موج زمزم"

اور "شکریہ یورپ" کی اس زمانے میں اتنی دھوم تھی کہ ان کے اکثر اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے شاعرانہ صلاحیتوں سے لیس ہو کر جب انہوں نے ڈرامہ نگاری کے میدان میں قدم رکھا تو عوامی پسند کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ اپنی فنی صلاحیتوں کو اس خوبی سے بروئے کار لائے کہ ایک دو ڈرامے لکھنے کے بعد ہی کامیابی نے ان کے قدم چومے اور ان کے حریفوں کے چراغ گل ہو گئے۔ پھر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ آغا حشر اور ڈرامانگاری لازم و ملزوم ہو گئے۔

چراغ حسن حسرت نے اپنے عہد کی اسی ہنگامہ خیز شخصیت کو موجودہ شخصی خاکے کا موضوع بنایا ہے، ایک ایک کر کے اس کی تمام صفات گنوائی ہیں اور چند خامیوں کا ذکر بھی کیا ہے مصنف نے آغا حشر کی شکل وصورت، رنگ روپ، حلیہ، وضع قطع، لباس، رہن سہن، اندازِ گفتگو، تہذیبی شائستگی، چرب زبانی، حاضر جوابی، بذلہ سنجی، پھبتی بازی، ذوقِ مطالعہ، علمی وسعت، خود تعریفی، سخاوت، دریا دلی، اخلاص، حسنِ اخلاق، وضع داری، دوست نوازی، بیواؤں کی امداد اور یتیموں کی پرورش وغیرہ کا ذکر اس حسن وخوبی سے کیا ہے اور اپنے بیانات کی تائید کے لئے ایسی مؤثر مثالیں پیش کی ہیں کہ آغا حشر ایک عظیم ڈرامانگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم انسان بھی نظر آنے لگتے ہیں مضمون کے آخر میں چراغ حسن حسرت نے مختصر طور پر آغا حشر کی غزل گوئی اور ڈرامانگاری کی مخصوص تکنیک پر بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ انہوں نے آغا حشر کی بدیہہ گوئی (برجستہ شعر کہنا) کے کئی چشم دید واقعات بیان کئے ہیں اور ان کی غزلوں میں ایک خاص قسم کی سرمستی اور جوش کی نشان دہی کی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اپنی غزل گوئی سے انہوں نے کس طرح اپنے ڈراموں میں فائدہ اٹھایا۔ آغا حشر کے ڈراموں پر تبصرہ کرتے ہوئے مصنّف نے بتایا ہے کہ ان کا حسن اجزاء میں ہے، کُل میں نہیں، یعنی ان کے ڈراموں کے بعض ٹکڑے تو بہت عمدہ ہوتے ہیں لیکن بحیثیت مجموعی وہ فنی اعتبار سے حسن کاری کے کامل نمونے نہیں بن پاتے، تاہم واضح خامیوں کے باوجود وہ اُردو کے سب سے مشہور ڈرامانگار ہیں اور اس میدان میں ان کا کوئی حریف نہیں۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۶۷ | ڈراما: اسٹیج پر پردے لٹکا کر کسی کہانی کو عملی طور پر دکھانا، کھیل، ناٹک یا سوانگ۔ ڈراما کے لفظی معنی ہیں کچھ کر کے یا کھیل کر دکھانا۔ آشنا: واقف۔ کلّے ٹھلّے کا: چوڑا چکلا نوجوان۔ دیدارُو: اچھی شکل وصورت والا۔ گنجان: گھنی (زیادہ بالوں والی) زلفیں: بالوں کی لٹ جو کانوں کے قریب ہوتی ہے۔ عربی میں زلف کے معنی ہیں رات کا حصّہ،

رات کی سیاہی کی مناسبت سے بالوں کی لٹوں کو زلف کہنے لگے۔ چھٹی ہوئیں: چھوڑی ہوئیں، لٹکتی ہوئیں۔ سرخ سرخ آنکھیں نکال کے: غصّے کے مارے۔ ڈرانے کے لئے خفا ہونا۔ سہم جانا: ڈرنا۔

ص ۱۴۸ | آغا: لفظی معنی آقا۔ درحقیقت مغلوں اور پٹھانوں کے سردار کا تعظیمی لقب ہے لیکن کسی بھی ایرانی یا افغان کو مخاطب کرتے وقت آغا کہا جاتا ہے۔ وارد ہونا: پہنچنا، آنا۔ ہینگ: ایک درخت کا گوند جو اکثر امراض کے لئے مفید ہے۔ شانے: کندھے۔ صدری: ایک طرح کی واسکٹ، سینہ بند، مرزئی، روئی دار بے آستین شلوکہ۔ اینگ: ہینگ۔ جھنجلا کر: چڑ کر۔ خفا ہو کر۔ بستی: گاؤں۔ قدر شناس: قدر و قیمت پہچاننے والا، وقعت اور رتبہ جاننے والا۔ عالم: حالت۔ خو: ارے میاں۔ پٹھانوں کا دوسروں کو مخاطب کرنے کا خاص لفظ۔ ام: ہم۔ مسخری: مذاق۔ ڈراؤنے: ڈرانے والے، خوفناک۔ بھیانک: خوفناک، ڈراؤنا۔ خوشگوار: اچھا، دل خوش کرنے والا۔ ڈرامیٹک کلب: ڈرامے دکھانے کا بندوبست کرنے والی انجمن۔ اسیرِ حرص، خوابِ ہستی، سفید خون: آغا حشر کاشمیری کے تین مشہور ڈراموں کے نام۔ ان میں "اسیرِ حرص" آغا حشر کی ڈراما نگاری کے پہلے دور (۱۹۰۱ء تا ۱۹۰۵ء) کا، "سفید خون" دوسرے دَور (۱۹۰۶ء تا ۱۹۰۹ء) کا اور "خوابِ ہستی" تیسرے دَور (۱۹۱۰ء تا ۱۹۱۶ء) کا ڈراما ہے۔ ان ڈراموں میں عوام کے ذوق کا خیال رکھا گیا ہے، اس لئے ہنسی مذاق، چھیڑ چھاڑ اور فقرے بازی سے کام لیا گیا ہے اور اشعار اور گانوں کا کثرت سے استعمال کیا گیا ہے۔ یہ ڈرامے زیادہ تر مزاحیہ ہیں۔ "اسیرِ حرص" اور "سفید خون" انگریزی ڈراموں کے آزاد ترجمے ہیں تاہم ہندوستانی عوام کی پسند کا خیال رکھتے ہوئے ان کے حزنیہ (المناک) انجام کو طربیہ (خوش کن) میں بدل دیا گیا ہے۔ "سفید خون" انگریزی ڈراما نگار ولیم شیکسپیئر کے مشہور ڈرامے کنگ لیئر (KING LEAR) کا چربہ ہے۔ ہیملٹ: ولیم شیکسپیئر (جو دنیا کا بہترین ڈراما نگار ہے) کے معروف ترین ڈرامے کا نام ہے۔ "ہیملٹ" (HAMLET) ڈنمارک کا شہزادہ ہے جو اپنے بادشاہ باپ کے قتل کا انتقام، باپ کے قاتل (اپنے چچا) سے لیتا ہے، جس نے اس کے باپ کو قتل کرنے کے بعد اس کی ماں سے شادی کر لی تھی۔ یہ ایک حزنیہ ڈراما (ٹریجڈی) ہے جو ہیملٹ سمیت بہت سے کرداروں کی موت پر ختم ہوتا ہے۔ دُور افتادہ: دور دراز کا۔ افتادہ کے لفظی معنی ہیں پڑا ہوا، گرا ہوا یا غیر کاشت کردہ زمین، یہاں دُور کی مناسبت سے افتادہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تفریح: شگفتگی، دل بہلاوا۔ تھیئٹر: تماشا گاہ۔ وہ جگہ جہاں ڈرامے کھیل کر دکھائے جاتے ہیں۔ ہنڈولا: ایک قسم کا جھولا جس میں کئی گہوارے ہوتے

ہیں۔ سہیلیاں: تھیٹر کے زنانہ کردار جو عموماً لڑکے ہوتے تھے۔

ص ۱۴۹ گیسو: لمبے بال جو سر کے دونوں طرف ہوتے ہیں۔ ایکٹر: اداکار، ڈرامے میں کام کرنے والے افراد۔ چنداں: کچھ زیادہ، اس قدر۔ کینڈے: انداز، نمونہ، ڈیل ڈول۔ سند الوقت: اپنے زمانے کے مانے ہوئے (مستند عالم لوگ) اتھارٹی۔ دھوم: شہرت۔ انجمن حمایت اسلام: لاہور کی ایک فلاحی انجمن جس نے کئی سکول، کالج، یتیم خانے اور دیگر فلاح و بہبود کے ادارے کھولے۔ یہ انجمن عوام کے چندے سے چلتی تھی، اسی لئے اس کے سالانہ اجلاس دھوم دھام سے ہوتے تھے اور مشہور رہنماؤں کی تقریریں اور شاعروں کی نظمیں سن کر لوگ دل کھول کر چندہ دیتے تھے۔ ذوق و شوق: جوش و خروش اور محویت کے ساتھ۔ کربلائے معلّیٰ: کربلا کا وہ قابلِ احترام مقام، جو عراق میں واقع ہے اور جہاں حضرت امام حسینؓ کو یزیدی فوجوں نے بیعتِ یزید نہ کرنے پر ان کے بہتر ساتھیوں سمیت شہید کر دیا تھا۔ ہر سال یکم سے دسویں محرم تک اس المناک واقعہ کی یاد تازہ کرنے کے لئے شیعہ فرقے کے مسلمان سوگ مناتے ہیں، ماتم کرتے ہیں اور مرثیئے پڑھتے ہیں۔ محرم: عربی سال کا پہلا مہینہ۔ کربلا کے شہیدوں کے سوگ کا مہینہ۔ "موجِ زمزم" اور "شکریہ یورپ": آغا حشر کی دو مشہور طویل قومی نظمیں، جنہوں نے اپنے زمانے میں دھوم مچا دی تھی۔ مٹھیاں بھینچ کر: مٹھیاں بند کر کے، جوش و خروش کی حالت میں۔ گونجیلی: گونجنے والی، اونچی آواز۔ عروجِ شباب: بھرپور جوانی کا زمانہ۔ عوام: عام لوگ۔ خواص: خاص لوگ۔ قیامت: غضب، انوکھی بات، بے تابی اور اضطراب پیدا کرنے والا واقعہ۔ ثقہ: مردِ معتبر۔ ایسا انسان جس کے قول و فعل پر اعتماد ہو۔ بدوضع: بُرے اطوار والے۔ آوارہ: بدچلن، بدمعاش، بیکار اِدھر اُدھر پھرنے والا۔ روپے پیسے کا مینہ برسنا: لوگوں نے چندے کے طور پر بہت پیسہ دیا۔ مداح: تعریف کرنے والے، عقیدت رکھنے والے۔

ص ۱۵۰ پھبتی: ایسی بات جو کسی پر پھب یا جم کر رہ جائے، ہنسی کی بات جو کسی پر چپکتی ہو، طنزیہ یا مزاحیہ تشبیہ یا استعارہ جو ٹھیک اور برمحل بیٹھتا ہو۔ عقیدت مند: احترام کرنے والے، عقیدت رکھنے والے۔ نیکی اور پوچھ پوچھ؟: بھلائی کرنے کے لئے پوچھنا کیا؟ بخطِ مستقیم: سیدھا، بغیر کہیں رکے ہوئے۔ لنگی: دھوتی۔ زمین و آسمان کا فرق: بہت زیادہ فرق، ایک دوسرے سے بہت دُور۔ دہرا جسم: بھاری بدن۔ میانہ قد: درمیانے درجے کا قد، نہ بہت لمبا نہ بہت چھوٹا۔ تپاک: گرم جوشی، اخلاص و محبت۔ خیر و عافیت: خیر خیریت۔ اذکار: ذکر کی جمع۔ ادبی ذکر و افکار: شعر و ادب کے بارے میں گفتگو۔ لاکھوں اڑائے: لاکھوں روپے خرچ کر ڈالے یا ضائع کئے۔ معاشرت: رہن سہن۔

کوچ: صوفہ سیٹ کی گدے دار بنچ جس کے تکیے پر بھی نرم گدا چڑھا ہوتا ہے۔ غالیچہ: بیل بوٹوں والا قالین۔ کھرّی: بغیر بستر کی چار پائی۔

ص ۱۵۱ وضع: حالت، انداز۔ ٹھاٹھ سے رہنا: آن بان اور شان وشوکت سے رہنا۔ حاضر جواب: فی البدیہہ جواب دینے والا، بات سنتے ہی معقول جواب دینے والا۔ بذلہ سنج: خوش طبع، چٹکلے چھوڑنے والا، ظریف اور خوش مزاج۔ ضلع جگت: رعایت لفظی، ذومعنی بات۔ طاق: ماہر۔ پھبتی: ایسی تشبیہ جس میں کسی کا مذاق اڑایا گیا اور جو اس پر چپک کر رہ جائے۔ مشّاق: ماہر جس نے اچھی طرح مشق کر رکھی ہو۔ صحبت گرم ہونا: محفل میں لوگوں کا جمع ہونا اور بات چیت اپنے زوروں پر ہونا۔ جھاڑ باندھنا: لگاتار کچھ کہے جانا۔ تار باندھنا: مراد ہے مسلسل پھبتیاں کسنا۔ چومکھی لڑنا: پٹّے بازی کا وہ ہاتھ جو چاروں طرف اس طرح پھرایا جائے کہ کسی طرح حریف قابو نہ پاسکے، وہ پھکڑ باز جو اکیلا چار آدمیوں کو جواب دے۔ حریف: دشمن، مدِّمقابل۔ دم بھر میں: ایک ہی لمحے میں۔ ہتھیار ڈال دینا: شکست تسلیم کرنا۔ بانکا: البیلا، بہادر۔ پھکیت: لکڑی پھینکنے کے فن کا واقف، گتکے باز، بہت چالاک شخص۔ سروہی: فولاد کی سیدھی تلوار جس کی نوک دو دھاری ہوتی ہے، سروہی ایک مشہور قصبہ کا نام ہے جو مارواڑ (بھارت) میں کوہ آبو کے پاس ہے اور وہاں کی تلوار بہت سیدھی اور اچھی ہوتی ہے۔ ہاتھ پھینکنا: وار کرنا، تلوار چلانا۔ کمر کو بنا کے: کمر پر وار کرنے کا دھوکہ دے کر۔ پالٹ: پٹہ بازی۔ تلوار کی ایک ضرب جو حریف کے پاؤں پر لگائی جاتی ہے۔ دہنے سے: دائیں طرف سے۔ حریف: مدِّمقابل۔ ادنیٰ: معمولی، گھٹیا۔ بازاری ناول: گندے اور فحش قصے کہانیاں۔ فلسفہ: زندگی اور کائنات کے بارے میں عقل کی مدد سے سوچ بچار کرنے اور کسی نتیجہ پر پہنچنے کا علم۔ مابعد الطبیعات: لفظی معنی، طبیعات (مادی دنیا) کے بعد یا اس کے پیچھے یا اس سے ماورا۔ مراد ہے وہ علم جو ذاتِ خداوندی اور اس کی صفات وغیرہ سے متعلق ہو۔ انگریزی میں اسے میٹا فزکس (META PHYSICS) کہتے ہیں۔ تصانیف: تصنیف کی جمع، مصنف کی طبع زاد کتابیں جو اس کے اپنے خیالات پر مبنی ہوں۔ دار المصنفین: اعظم گڑھ (یو۔ پی بھارت) میں مولانا شبلی نعمانی کا قائم کردہ اشاعتی ادارہ جس نے تاریخ، مذہب اور علم و ادب سے متعلق سینکڑوں کتابیں لکھوا کر شائع کیں۔ اس علمی ادارے کی کتابیں بے حد معیاری ہوتی ہیں اور یہ اب تک اپنے فرائض خوش اسلوبی سے انجام دے رہا ہے۔ معمول: دستور، عادت، روزمرہ کی باتیں یا عادتیں۔ سہ پہر: پچھلے پہر، دن کے پانچ چھ بجے کے قریب۔ بخطِ مستقیم: سیدھی لکیر کی طرح، بغیر کہیں

رُکے ہوئے یا مُڑے ہوئے۔ عصرِ جدید: کلکتہ کا ایک مشہور روزنامہ اخبار جس میں چراغ حسن حسرت بھی بطور اخبار نویس کام کرتے تھے۔ ریویو: تبصرہ۔ نذر ہونا: بطور احترام یا بطور نذرانہ پیش ہونا۔ چھانٹ کے: چُن کر، انتخاب کر کے۔

ص ۱۵۲ سودا سلف: کھانے پینے کی اشیاء۔ بنیا: ہندو پرچون فروش دکاندار۔ اوراق: ورق کی جمع۔ شکر: چینی، کھانڈ۔ شبلی: مولانا شبلی نعمانی، جو مشہور مورخ، سوانح نگار، سیرت نگار، مضمون نگار، نقاد اور شاعر تھے۔ مطالعہ: کتابیں، رسالے اور اخبارات پڑھنا۔ شغف: انتہائی لگاؤ، شوق۔ حافظہ: زبانی یاد رکھنے کی صلاحیت۔ علائق: علاقہ کی جمع، تعلقات، ذمے داریاں۔ بکھیڑے سینت سنبھال کر: دوسروں سے بچا کر حفاظت سے رکھنا۔ جھنجٹ: مصیبت، پریشانی۔ گوشے: کونے۔ برکت: کسی چیز کی فراوانی یا بہتات ہونا۔ طب: علاج معالجہ کا علم۔ ادب: بہترین لفظوں میں بہترین خیالات قلم بند کرنا، ناول، افسانہ وغیرہ اس میں شامل ہیں۔ بند نہیں تھے: کسی ایک موضوع تک محدود یا پابند نہیں تھے۔ ذہانت آڑے آتی تھی: ذہانت مدد کے لیئے آتی تھی۔ مول لینا: خریدنا۔ فضائل: فضل کی جمع، خوبیاں۔ محاسن: خوبیاں، بھلائیاں۔ دباغت: چمڑا رنگنے یا پکانے کا عمل۔ وضع قطع: حلیہ، شکل وصورت۔

ص ۱۵۳ مناظرہ: مذہبی بحث مباحثہ۔ مناظرہ کے میدان کے شیر: مذہبی بحث مباحثہ کے ماہر۔ واجبی: معمولی تھوڑی سی۔ سوانح حیات: زندگی کے حالات وواقعات، سوانح، سانحہ کی جمع ہے بمعنی واقعہ یا حادثہ۔ افتاد: اچانک مصیبت یا حادثہ۔ ڈیرے ڈالنا: قیام کرنا، رہ پڑنا، ڈیرہ کے لفظی معنی خیمہ یا عارضی طور پر ٹھہرنے کا مکان ہے۔ سعی: کوشش۔ وضع: انداز، طور اطوار۔ مُلّائے مکتبی: مسجد یا دینی مدرسے کا مولوی، جو عموماً تنگ نظر سمجھا جاتا ہے۔ مُلّائیت: مُلّا کے اصلی معنی تو دینی علوم میں بہت پڑھا لکھا آدمی کے ہیں لیکن انگریزوں نے اسے تنگ نظری، کم علمی، کٹ حجتی اور جہالت کی علامت بنا کر پیش کیا، اس لیئے اس لفظ کے ساتھ نفرت وابستہ ہو گئی۔ مسّیں بھی نہیں بھیگی تھیں: ابھی بالغ نہیں ہوا تھا، مسّیں، مرد کے بالائی ہونٹ پر اُگنے والے وہ مہین بال ہیں جو چودہ برس کی عمر میں نظر آنے لگتے ہیں اور جو بلوغت اور جوانی کی علامت ہیں۔ طلسم باندھنا: جادو جگانا، جادو کرنا۔ ادنیٰ واعلیٰ: معمولی لوگ اور اونچے درجے کے لوگ۔ غش: عاشق، مدہوش۔ ذریعہ معاش: روزی کمانے کا ذریعہ۔ شیکسپیئر: مشہور انگریز شاعر اور ڈرامانگار جو ۱۵۶۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۶۱۶ء میں فوت ہوا۔ ولیم شیکسپیئر نہ صرف انگلستان بلکہ دنیا کا بہترین شاعر

اور ڈراما نگار گِنا جاتا ہے۔ اس نے ۳۸ ڈرامے لکھے جن میں المیہ ڈرامے بھی ہیں، طربیہ ڈرامے بھی اور تاریخی ڈرامے بھی "ہیملٹ"، "کنگ لیئر"، "میکبھ"، "اوتھیلو"، "رومیو اینڈ جیولیٹ" اور "جیولیس سیزر" وغیرہ اس کے مشہور ڈراموں میں شامل ہیں۔ اس کے "سانیٹ" بھی مشہور ہیں جو انگریزی کی ایک مشکل لیکن مشہور شعری صنف ہے۔ ہاتھ صاف کیا: اس کے ڈراموں کے پلاٹ توڑ مروڑ کر اپنے ڈراموں میں استعمال کیئے۔ انشاء پرداز: مضمون نگار یا مصنّف جس کا اپنا مخصوص طرزِ تحریر ہو۔ گرد ہو جانا: پیچھے رہ جانا۔ ناگوار: بُری۔ ہیچ: کم تر، پست۔

ص ۱۵۴ | اماں: او میاں، طرزِ تخاطب۔ خوب کہتے ہو: اچھے شعر کہتے ہو۔ کانٹوں میں گھسیٹنا: شرمندہ کرنا۔ جب کوئی حد سے زیادہ تعریف کرے تو انکسار کے طور پر جواباً یہ کہا جاتا ہے۔ مذمّت: برائی۔ جھک مارنا: لغو باتیں کرنا، بے ہودہ بکنا۔ ہیچ مدان: نادان، بے علم، اپنے لئے انکسار کے طور پر بولتے اور لکھتے ہیں، پنبہ دہان: کم بولنے والا، لفظی معنی جس کے منہ میں روئی ٹھنسی ہو، تاکہ بول نہ سکے۔ کج مج زبان: وہ شخص جو اچھی طرح بات نہ کر سکے، جو صاف نہ بول سکے، جس کی زبان میں لکنت ہو۔ انکسار کے طور پر اپنے لئے بولتے ہیں، جب کوئی حد سے زیادہ تعریف کرے۔ حقیر: کم تر۔ فقیر: درویش، بھکاری، پُر تقصیر: بہت زیادہ گناہگار یا قصور وار۔ شعور: عقل و فہم۔ حضور کی ذرّہ نوازی ہے: آپ کی، مجھ معمولی حیثیت کے شخص پر، مہربانی ہے۔ آپ مجھ ذرّۂ ناچیز پر عنایت کر رہے ہیں۔ انکسار: خود کو کم تر ظاہر کرنا، خاکساری، عاجزی۔ فاقے کرنا: بھوکے مرنا۔ سینہ تان کے: جرأت اور دلیری کے ساتھ۔ فخر کے ساتھ۔ تُرکی حور: آغا حشر کا ایک ڈراما جو انھوں نے اپنی ڈراما نگاری کے چوتھے دَور (۱۹۱۷ء تا ۱۹۲۴ء) میں لکھا۔ اس زمانے میں وہ کلکتہ میں تھے رستم جی: ایک تھیٹریکل کمپنی کے پارسی مالک جس کے لئے آغا حشر نے کئی ڈرامے لکھے۔ واہ واہ کرنا: تعریف کرنا۔ سرگوشیاں: کھسر پھسر۔ حریف: دشمن۔ تاک میں تھے: موقع کی تلاش میں ہوشیاری سے انتظار کر رہے تھے۔ اکھیڑ مارنا: کشتی کے داؤ پیچ لگا کر گرانا۔ چاروں شانے چت گرانا: کشتی کا ایک کرتب جس میں حریف کی پُشت اور گدّی زمین سے ملا دیتے ہیں۔ کڑک کے: رعب کے ساتھ گرج کر۔ پیر و مرشد: ہادی اور رہنما، کسی ولی یا بزرگ کو کہتے ہیں۔ بجا و درست: بالکل ٹھیک کہا۔ کان ہونا: نصیحت حاصل ہونا، خبردار ہونا۔ ہاتھ کا سخی: دوسروں پر بے دریغ خرچ کرنے والا، فیّاض، بخشش کرنے والا۔ دل کا صاف: مخلص، کینہ و کدورت سے پاک۔

ص ۱۵۵ | تھیئٹر: تماشا گاہ، جہاں ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ ایکٹر: ڈرامے میں مختلف کردار ادا کرنے والے۔ ڈوم اور ڈھاڑی: میراثی۔ گانے بجانے والی قوم۔ بے تکلفی:

دوستانہ تعلقات، خلق: اخلاق، تہذیب، عمدہ سلوک۔ مروّت: تہذیب اور لحاظ کے ساتھ۔ چھوٹی امت: نیچ قوم۔ وضع داری: اختیار کی ہوئی بات کو آخر تک نبھانا مستقل شعار یا طریقہ۔ لیاقت: قابلیت۔ مذاق: ذوق۔ حدوث: نیا ہونا، قدیم کی ضد۔ قدوم: پرانا ہونا۔ مادّہ: ہر چیز کی اصل، وہ اصل شئے جس سے ہماری یہ کائنات بنی ہے۔ حدوث و قدوم مادہ: مادہ نیا ہے یا پرانا؟ مادہ کی ابتدا اور انجام۔ وہ کب اور کیسے پیدا ہُوا، کیا وہ نیا بھی پیدا ہوتا ہے؟ وہ کب تک رہے گا۔ کیا وُہ فنا پذیر ہے؟ یہ فلسفے کا ایک اہم مسئلہ ہے جس میں موجودہ کائنات کا آغاز اور انجام جاننے کے لئے غور و فکر کیا جاتا ہے۔

احادیث: حدیث کی جمع، بمعنی حضورِ اکرمؐ کا قول یا فعل جو کسی راوی نے بیان کیا ہو۔

آریہ سماج: پنجاب میں ہندوؤں کا ایک فرقہ جو سوامی دیانند سرسوتی (متوفی ۱۸۸۳ء) کا پیروکار تھا۔ یہ فرقہ ہندوؤں کی مذہبی اور معاشرتی اصلاح کا دعویٰ دار تھا۔ دیوی دیوتاؤں کی پوجا کے خلاف تھا اور ذات پات کا قائل نہیں تھا۔ اس کا نظریہ تھا کہ ہندوستان (آریہ ورت) ہندوؤں (آریاؤں) کا ملک ہے اور انہیں کو یہاں رہنے کا حق ہے، لہٰذا باہر سے آنے والے مذاہب (اسلام۔ یہودیت، عیسائیت، پارسیت وغیرہ) کے ماننے والوں کو یا تو ہندومت قبول کر لینا چاہیئے یا یہ ملک چھوڑ دینا چاہیئے۔ آریہ سماجیوں نے مسلمانوں، عیسائیوں اور قادیانیوں کے ساتھ بالخصوص زبردست مناظرے کئے۔ دراصل "آریہ سماج" فرقہ ہندوؤں کی عسکری اور علمی روح بیدار کرنے کے لئے ایک تحریک بن کر اٹھا تھا، اسی لئے اس نے ہندومت کی برتری کا نعرہ لگایا اور اس کے مقابلے تمام ادیان کو ہیچ ٹھہرایا۔ آریہ سماجیوں نے اسلام اور بانیٔ اسلام کی مخالفت میں کتابیں بھی لکھیں، اور تقاریر کے ذریعے بھی اپنے نظریات کی تبلیغ کی وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو ہندو بنانے میں زیادہ کامیاب نہیں ہوئے لیکن ہندوؤں میں مذہبی اور قومی تعصب گہرا کرنے میں یقیناً کامیاب ہوئے۔ ضلع جگت: رعایت لفظی۔ پھبتی: طنزیہ یا مزاحیہ تشبیہ جو مخالفت پر چپک کر رہ جائے۔ تنہا خوری: اکیلے کھانا پینا۔ بیوہ: وہ عورت جس کا شوہر فوت ہو چکا ہو۔ یتیم: وہ بچہ جس کا باپ فوت ہو چکا ہو۔ درماہہ: ماہوار تنخواہ یا امداد۔ بےکس: بےسہارا۔

ص ۱۵۶ | مصرع: کسی شعر کی ایک سطر، شعر کے دو ٹکڑوں میں سے ایک ٹکڑا۔ آدھا شعر۔ برجستہ: فی البدیہہ، بغیر تیاری یا غور و فکر کے فوراً شعر کہہ دینا۔ سرمستی: نشہ میں چور ہونا۔ غزل گوئی: غزلیں کہنا۔ اجزاء: جزو کی جمع۔ گارا: مٹی اور پانی کا مرکب۔ حریف: مدِّمقابل۔ مذاق: ذوق۔ ملحوظ رکھنا: لحاظ رکھنا، خیال رکھنا۔ عالم: حالت، کیفیت۔ ابرو پر بل پڑنا:

ناراض ہونا، بُرا ماننا۔ پیروی : تقلید۔ جوتیاں چٹخاتا پھرنا : آوارہ اور بیکار پھرنا، مارا مارا پھرنا۔

ص ۱۵۷ زمانے کی نبض پہچاننا : حالات کا صحیح اندازہ لگانا۔ موٹروں میں اُڑا پھرنا : موٹروں میں سیر کرنا۔ اواخر : آخر کی جمع۔ اخبار نویسی : اخبار میں کام کرنا۔ برقی کرنا : طاق کرنا۔ نیاز مندانہ تعلق : کسی بڑے یا قابل احترام آدمی سے عقیدت مندانہ، عاجزانہ اور حاجت مندانہ تعلق، عموماً کسی بڑے آدمی کے سامنے اپنی ذات کے متعلق یہ لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ملازمت کا قصّہ : ملازمت کا تعلق۔ صاحب سلامت : دعا سلام۔ پیچ پڑنا : رکاوٹیں یا الجھنیں پڑنا۔ لے ڈالا : بُرا بھلا کہا۔ حکیم فقیر محمد : یہاں مراد شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی ہیں جو لاہور کے نامور طبیب تھے اور مشہور آدمیوں کے معالج رہ چکے تھے۔ حلقے : دائرے۔

ص ۱۵۸ وضعداری : مستقل شعار یا طریقہ۔ عالم : حالت، جُودت : تیزیٔ طبع، عقل کی تیزی، ذہانت۔ چل چلاؤ لگ رہا ہے : کوچ کرنا، سفر کرنا، مراد ہے مرنے کے قریب پہنچے ہوئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن : ہم اللہ کے لئے ہیں اور اُسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ نیلا گنبد : انار کلی بازار لاہور کے قریب ایک مشہور چوک۔ نیاز مند : عقیدت مند۔ میانی صاحب کا قبرستان : لاہور کا مشہور گورستان جہاں کئی نامور شخصیتیں دفن ہیں۔ سپردِ خاک کرنا : دفن کرنا۔

سبق کا خلاصہ

چراغ حسن حسرت لکھتے ہیں کہ مجھے یہ تو یاد نہیں کہ میں نے آغا حشر کاشمیری کا نام پہلی دفعہ کب سُنا تھا، لیکن اتنا یاد ہے کہ "ڈراما" کا لفظ سُننے سے پہلے مَیں اُن کے نام سے واقف ہو چکا تھا۔ کچھ دنوں بعد مجھے معلوم ہوا کہ آغا حشر جو کچھ لکھتے ہیں، وہ ڈراما ہوتا ہے۔

ہمارے پڑوس میں ایک افغان سردار کے نوکر کو لوگ "آغا، آغا" کہتے تھے۔ اُس کی داڑھی گھنی اور سیاہ تھی اور سر پر لمبے لمبے بال تھے۔ اکثر وہ لڑکوں سے "آغا" کا لفظ سن کر مسکراتا ہُوا گزر جاتا لیکن کبھی کبھار وہ ناراض ہو کر اپنی زبان میں چیختا چلّاتا جس سے لڑکے سہم جاتے۔

کچھ دنوں بعد ہمارے گاؤں میں ایک اور آغا صاحب تشریف لائے، وہ ہینگ بیچتے تھے۔ ان کی داڑھی لمبی تھی، لمبے بال کندھوں پر بکھرے ہوئے تھے اور واسکٹ میلی کچیلی تھی۔ وہ گٹھڑی ہاتھ میں لئے چلا آ کر ہینگ بیچتے تھے لیکن ان سے کوئی شخص ہینگ نہیں خریدتا تھا چنانچہ تنگ آ کر وہ اپنی زبان میں گاؤں والوں کو بُرا بھلا کہتے تھے، اگر کوئی شخص اتفاقاً ان کے پاس آ نکلتا تو وہ اسے ہینگ خریدنے کیلئے کہتے اور جب وہ انکار کرتا تو وہ خفا ہو کر اُسے کہتے : کیا میں تمہارے باپ کا نوکر ہوں کہ اتنی دُور

سے تمہارے واسطے ہینگ لایا ہوں اور تم اسے خریدتے نہیں ہو۔ دیکھو ہینگ لے لو اور مجھ سے مذاق نہ کرو۔"

یوں ابتداء میں میرے لئے لفظ آغا، لفظ حشر اور لفظ ڈراما تینوں بڑے خوفناک تھے اور انہیں سُن کر میرے ذہن پر کوئی اچھا اثر نہیں پڑتا تھا۔

کچھ عرصہ بعد ہمارے گاؤں میں ایک "ڈرامیٹک کلب" بنایا گیا۔ اب آغا حشر کے ڈراموں "اسیر حرص"، "سفید خون"، "خواب ہستی" اور ولیم شیکسپیئر کے ڈرامے "ہیملٹ" کا ذکر ہر شخص کرنے لگا۔ آغا حشر کا نام بھی بار بار لوگوں کی زبان پر آنے لگا۔ اس زمانے میں تھیئٹر تفریح کا واحد ذریعہ تھا، اس لئے بچے، بوڑھے، جوان، سب تھیئٹر دیکھنے جاتے تھے۔ میرے ذہن میں آغا حشر کا عجیب و غریب نقشہ بن گیا تھا۔ مجھے یوں لگتا تھا جیسے وہ تھیئٹر کے پردوں کے پیچھے کھڑے ہیں، ان کا سر چھت سے لگا ہوا ہے، ان کی لمبی سی داڑھی ہے، بال کمر تک پہنچتے ہیں۔ ان کے ایک ہاتھ میں ہینگ کی گٹھڑی ہے اور دوسرے میں جادو کا ڈنڈا ہے۔ انہیں کے حکم پر پردے گرتے اور اُٹھتے ہیں اور انہیں کے کہنے پر اداکار نئے نئے بھیس بدل کر سٹیج پر آتے ہیں۔ جی چاہتا تھا کہ پردے کے پیچھے جا کر ان کی ایک جھلک دیکھوں لیکن ہمت نہیں پڑتی تھی۔

اس زمانے میں پنجاب میں تھیئٹر نے کوئی خاص ترقی نہیں کی تھی۔ منشی غلام علی دیوانہ اور ماسٹر رحمت جیسے لوگ ڈراما نگاری میں مستند مانے جاتے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں جب میں پہلی مرتبہ لاہور آیا تو یہاں آغا حشر کی شاعری کی بہت شہرت تھی۔ وہ انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں بڑے جوش و خروش کے ساتھ نظمیں پڑھتے تھے اور ان کی نظموں "موجِ زمزم" اور "شکریۂ یورپ" کے اشعار لوگوں کو زبانی یاد تھے۔ آغا حشر اپنی جوانی کے زمانے میں صرف ایک بار پنجاب تشریف لائے تھے اور ان کی آمد نے یہاں خوشگوار اثرات چھوڑے۔ اس سے پہلے لوگ ڈراموں میں کام کرنے والوں کو آوارہ، لفنگے اور بدمعاش سمجھتے تھے۔ لیکن تھیئٹر کے ایک آدمی یعنی آغا حشر نے جب انجمن حمایتِ اسلام کے ایک جلسہ میں قومی نظم پڑھی تو لوگوں نے دِل کھول کر چندہ دیا۔ یہ کام بڑے بڑے عالموں سے نہیں ہو سکا تھا، اس لئے اب شائستہ لوگوں کی رائے تھیئٹر میں کام کرنے والوں کے بارے میں اچھی ہو گئی۔

۱۹۲۵ء میں جب میں کلکتہ گیا تو آغا حشر کلکتہ چھوڑ کر مہاراجہ ٹکاری کے ہاں جا چکے تھے۔ لیکن ان کے ہزاروں عقیدت مند اور دوست احباب کلکتہ میں موجود تھے ان کی زبانی آغا صاحب کی زندگی کے دلچسپ واقعات، لطیفے، اشعار اور پھبتیاں سننے کا موقع ملا۔ ایک سال بعد کسی نے آکر بتایا کہ آغا صاحب آئے ہوئے ہیں۔ فائن آرٹ پریس کے مالک لالہ برج لال اروڑہ آغا صاحب

کے مداح تھے۔ وہ مجھے لے کر آغا صاحب کی قیام گاہ پر پہنچے۔ جب اُن سے ملاقات ہوئی تو وُہ ایک لُنگی اور کرتا پہنے چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھتے ہی وُہ اُٹھ بیٹھے اور بڑے تپاک سے ملے۔ اس آغا حشر اور میرے تصوّرات کے آغا حشر میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ حقیقی آغا حشر کے سر کے بال انگریزی فیشن کے تھے، ان کی داڑھی صاف، مُونچھیں چھوٹی چھوٹی، جسم بھاری، رنگ سرخ و سپید، قد درمیانہ اور ایک آنکھ میں قدرے نقص تھا۔ ہم سے گفتگو شروع کی تو پہلے ہماری خیر خیریت دریافت کی اور پھر ادبی بحث مباحثہ میں مصروف ہو گئے۔

آغا حشر کاشمیری نے اگرچہ لاکھوں روپیہ کمایا اور خرچ کیا لیکن ان کا رہن سہن ہمیشہ سیدھا سادا رہا۔ ان کے مکان میں نہ تو قالین تھے، نہ صوفے اور نہ ریشمی پردے۔ انہیں اچھے اور قیمتی کپڑے پہننے کا بھی شوق نہیں تھا۔ گھر پر لُنگی باندھے، بنیان پہنے، خالی چارپائی پر بیٹھے رہتے، باہر نکلتے تو ریشمی لُنگی اور لمبا کرتا پہن لیتے۔ ساری زندگی ان کا یہی چلن اور یہی لباس رہا۔ تاہم لوگوں نے بتایا کہ اپنے قیام کلکتہ کے زمانے میں وہ بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے تھے۔

آغا حشر بڑے حاضر جواب، خوش مزاج، لطیفہ گو اور پھبتی باز شخص تھے۔ پھبتیوں میں کوئی آدمی ان سے جیت نہیں سکتا تھا۔ تین تین چار چار آدمیوں کا بیک وقت مقابلہ کرتے اور انہیں لاجواب کر دیتے۔ انہیں مطالعہ کا بھی بے حد شوق تھا، ہر قسم کی کتابیں، رسالے، اور اخبارات پڑھتے تھے۔ تاریخ، فلسفہ اور مابعد الطبعیات کی کتابوں سے لے کر بازاری ناولوں تک ان کی نظر تھی۔ ان کا روزمرّہ کا معمول تھا کہ سہ پہر کے وقت گھر سے نکلتے، اخبار "عصر جدید" کے دفتر میں پہنچ کر سارے اخبارات پڑھتے، رسالوں کی ورق گردانی کرتے، تبصرہ کے لئے آئی ہوئی کتابوں پر نظر ڈالتے۔ جو کتابیں، اخبارات اور رسالے وہاں نہ پڑھ سکتے، وہ گھر لے جاتے۔ بازار میں اگر کتابوں کی کوئی دکان نظر آتی تو جو کتابیں پسند آتیں، خرید کر گھر لے آتے۔ راستے میں کسی کتاب کا کوئی ورق پڑا نظر آتا تو اُسے اٹھا کر پڑھنے لگتے۔ نوکر بازار سے سودا سلف لاتا تو اخبارات اور کتابوں کے اوراق سے بنائی ہوئی پڑیوں میں لے کر آتا۔ آغا حشر ان پڑیوں کو کھلوا کر پھینکنے سے پہلے پڑھتے۔ مطالعہ سے کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ آغا صاحب کے ہاں کوئی بہت بڑا کتب خانہ تھا۔ ان کے گھر میں گنتی کی چند کتابیں تھیں۔ البتہ ان کا حافظہ بہت اچھا تھا چنانچہ جو کتاب ایک دفعہ پڑھ لیتے اُسے دوبارہ دیکھنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ یوں بھی ان کو کتابیں سنبھال کر رکھنے کا شوق نہیں تھا۔ جب کتاب پڑھ لیتے تو جس کا جی چاہتا اٹھا کر لے جاتا۔

اس مطالعہ کی وجہ سے ان کا علم بہت وسیع تھا۔ طب، شاعری، فلسفہ اور ادب، ہر موضوع

انہیں ازبر تھا۔ پھر ذہین بھی بہت تھے۔ چنانچہ نئی جوتی خریدتے تو اس کے چمڑے کی خوبیوں پر اس تفصیل سے اظہارِ خیال کرتے کہ سننے والے حیران رہ جاتے اور سوچتے کہ آغا صاحب کی جوتی تاریخی حیثیت کی حامل ہے۔

آغا صاحب نے مذہبی مناظروں میں بھی شرکت کی تھی۔ گو باقاعدہ تعلیم تو معمولی پائی تھی لیکن مطالعۂ کتب نے انہیں بہت اعتماد عطا کیا تھا۔ جس محفل میں گفتگو کرتے، سب پر چھا جاتے۔ ایک دفعہ میں نے ان کی سوانح حیات قلم بند کرنے کے لئے عرض کیا تو مختصراً بتایا کہ میرے بزرگوں کا وطن کشمیر ہے۔ وہاں سے کسی ناگہانی مصیبت کی وجہ سے امرت سر چلے آئے۔ میرے والد شالوں کے کاروبار کے سلسلے میں بنارس گئے تو وہیں کے ہو کر رہ گئے۔ والد صاحب کی خواہش تھی کہ میں تعلیم حاصل کر کے مکتب کا مُلّا بنوں لیکن میرا جی تعلیم میں نہیں لگتا تھا۔ چنانچہ فارسی کی چند کتابیں پڑھ کر اُکتا گیا اور ابھی پوری طرح جوان بھی نہیں ہوا تھا کہ بھاگ کر بمبئی پہنچ گیا۔ وہاں اس زمانے میں پارسی سیٹھوں نے تھیئٹر کھول رکھے تھے اور ادنیٰ و اعلیٰ سب بڑے شوق سے ان میں کھیلے جانے والے ناٹک دیکھتے تھے۔ مجھے بھی ڈراما لکھنے کا شوق چرایا۔ چنانچہ ابتداء میں ایک دو ڈرامے لکھتے وقت ولیم شیکسپیئر کے ڈراموں سے فائدہ اٹھایا۔ گو اس زمانے میں بمبئی میں کئی پڑھے لکھے ادیب اور شاعر موجود تھے لیکن قدرت مجھ پر مہربان تھی، اس لئے سب میرے مقابلے میں ماند پڑ گئے۔ میری زندگی کے اہم واقعات بس اتنے ہی ہیں۔

آغا حشر جب اپنی تعریف خود کرتے تھے تو اکثر لوگ اس کا بُرا مناتے لیکن آغا صاحب سمجھتے تھے کہ دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے اپنی تعریف کرنا بہت ضروری ہے۔ ایک مرتبہ کسی اخبار میں میری ایک نظم عید کے بارے میں شائع ہوئی جو آغا صاحب کو پسند آئی اور انہوں نے اس کی بڑی تعریف کی، خصوصاً آخری شعر کئی مرتبہ پڑھا۔ میں نے ازراہِ انکسار کہا کہ میں کس قابل ہوں؟ میں کیا اور میری نظم کیا؟ اس پر بہت خفا ہوئے اور کہنے لگے کہ اگر تمہارے انکسار کا یہی حال رہا تو بھوکے مرو گے۔ فخر سے کیوں نہیں کہتے کہ میری یہ نظم تعریف کے قابل ہے۔ پھر اپنی مثال دیتے ہوئے بتایا کہ جب میں نے "ترکی حور" ڈراما لکھ کر تھیئٹر کے مالک رستم جی کو سنایا تو سب حاضرین نے تعریف کی لیکن چند ایک نے دبے لفظوں میں کھسر پھسر بھی کی۔ میرے حریف اس کوشش میں تھے کہ مجھے پچھاڑ دیں۔ میں نے کڑک کر کہا کہ آج کون ایسا ڈراما لکھ سکتا ہے؟ یہ سن کر سب پکار اُٹھے کہ آپ نے درست فرمایا۔ اُن کی یہ بات سُن کر میں نے بھی اپنا رویّہ بدل لیا۔ ان کی طرح میں اپنی تعریف تو نہیں کرتا لیکن اب تعریف سُن کر انکسار کے طور پر خود کو جاہل بھی نہیں کہتا۔

آغا صاحب بے حد وضع دار، مخلص اور سخی انسان تھے۔ ان کے واقف کاروں میں ہر طرح کے لوگ تھے۔ تھیٹر کے ایکٹروں اور گانے بجانے والوں سے لیکر علماء تک، سب سے ان کے تعلقات تھے اور وہ ان سے بڑے اخلاق سے پیش آتے تھے۔ اُن کے چھوٹے بھائی آغا محمود کو یہ پسند نہ تھا کہ آغا صاحب کمتر حیثیت کے لوگوں سے ملیں، لیکن آغا حشر وضع دار شخص تھے، اس لئے جن کے ساتھ ایک دفعہ دوستانہ تعلقات قائم ہو گئے، انہوں نے انہیں مرتے دم تک نبھایا۔ وہ ہر شخص کی قابلیت اور ذوق کے مطابق بات چیت کرتے تھے۔ علماء کے ساتھ فلسفہ، مذہب اور احادیث پر گفتگو ہوتی تھی اور ایکٹروں کی صحبت میں لطیفہ گوئی، ضلع جگت، پھبتیوں اور قہقہوں میں وقت گزارتے تھے۔

آغا حشر نے بہت روپیہ کمایا لیکن وہ انہوں نے صرف اپنی ذات پر خرچ نہیں کیا۔ انہوں نے اپنے عزیز و اقارب کی دل کھول کر مدد کی۔ والدہ کی بے مثال خدمت کی۔ دُور کے رشتہ داروں کو بھی نہیں بھولے۔ اپنے عزیزوں میں کئی بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے، جو انہیں باقاعدگی سے ملتے تھے۔ آغا صاحب کی ذات کئی بے سہارا لوگوں کی زندگی کا سہارا بنی ہوئی تھی۔

مولانا ظفر علی خاں کی طرح آغا حشر بھی فی البدیہہ شعر کہتے تھے اور چند منٹوں میں غزل مکمل کر لیتے تھے۔ ان کی غزلوں میں سرمستی اور جوش کی کیفیت موجود ہے، وہ ڈرامے بھی بہت تھوڑے وقت میں لکھ لیتے تھے بلکہ خود بولتے جاتے اور کوئی دوسرا شخص لکھتا جاتا۔ ان کی غزل گوئی کا اثر ان کے ڈراموں پر بھی پڑا ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنی جگہ مستقل حیثیت رکھتا ہے اور ضروری نہیں کہ اس کا معنوی تعلق دوسرے اشعار کے ساتھ بھی ہو، اسی طرح ان کے ڈراموں کے مختلف اجزاء اپنی اپنی جگہ تو خوب ہیں لیکن بحیثیت مجموعی ان کا حسن برقرار نہیں رہتا۔ گویا آغا حشر کے ڈرامے جزوی طور پر تو اچھے ہیں، لیکن کلی طور پر نہیں۔ تاہم انہوں نے اُردو ڈرامے کو جس مقام تک پہنچا دیا تھا، اس میں کوئی اُن کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔ درحقیقت انہیں اپنے ہاتھ سے لکھنے میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ کاہلی کا یہ عالم تھا کہ اول تو خطوط کا جواب نہیں دیتے تھے لیکن اگر کبھی مجبوراً جواب دینا ہی پڑتا تو اپنے ہاتھ سے نہیں لکھتے تھے بلکہ کسی سے لکھوا کر بھیجتے تھے۔

ڈراما نگاری میں ان کا ایک خاص نقطہ نظر تھا۔ وہ کہا کرتے تھے کہ میں عوام کی پسند و ناپسند کو سامنے رکھ کر ڈرامے لکھتا ہوں، گو میری طبیعت کا رجحان اور ہے لیکن اگر میں عوامی ذوق کو سامنے نہ رکھتا تو پھر عمر بھر بیکار پھرتا اور بھوکا مرتا۔ میں نے زمانے کی نبض کو پہچان لیا اور عام لوگوں کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر ڈرامے لکھے، یہی وجہ ہے کہ آج میں موٹروں میں گھومتا ہوں اور خوشحال ہوں۔

۱۹۲۸ء کے آخر میں آغا حشر تکاری سے کلکتہ آئے اور ملاقات کے بعد مجھ سے کہنے لگے

کہ اخبار نویسی چھوڑو اور میرے ساتھ کلکتہ چلو۔ میں تمہیں ڈراما لکھنے کا ماہر بنادوں گا۔ اس وقت تو میں نے حامی بھر لی لیکن گھر آ کر ارادہ بدل گیا۔ میں نے سوچا کہ اب تو آغا صاحب سے اچھے تعلقات ہیں۔ جب ان کی ملازمت کر لی تو خدا جانے یہ تعلقات اچھے رہیں یا نہ رہیں۔ بہرحال اگلی ملاقات میں جب انہوں نے مجھ سے کلکتہ چلنے کے بارے میں پوچھا تو میں نے جواب دیا کہ میں لاہور جانے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ یہ سن کر بہت خفا ہوئے اور میرے ساتھ لاہور کے اخبار نویسوں کو بھی برا بھلا کہا۔ دوسرے تیسرے دن وہ کلکتہ چلے گئے۔

اس واقعہ کے سات سال بعد ان سے لاہور میں شفاء الملک حکیم فقیر محمد چشتی مرحوم کے گھر پر ملاقات ہوئی تو میں انہیں پہچان نہ سکا۔ ان کی آنکھوں کے گرد سیاہ دائرے پڑ چکے تھے، گال پچک گئے تھے اور ان کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ گردن کا گوشت بھی لٹک گیا تھا۔ انہیں مختلف امراض لاحق ہو گئے تھے اور اب طبیعت میں پہلی سی شوخی اور تیزی نہیں رہی تھی انہوں نے لاہور میں ایک کوٹھی کرائے پر لے لی اور وہیں رہنے لگے۔ میں کبھی کبھار ان کی ملاقات کو جاتا تھا۔ وہ اگرچہ بیمار تھے لیکن ان کی وضع داری میں کوئی کمی واقع نہ ہوئی۔ ایک دن میکلوڈ روڈ پر ان سے ملاقات ہوئی تو میرے نہ آنے کا گلہ کیا اور جب میں نے فرصت نہ ملنے کا عذر کیا تو اداس ہو کر بولے کہ اب ہمارے دنیا سے رخصت ہونے کے دن قریب آ گئے ہیں ہم مر گئے تو بعد میں افسوس کرو گے کہ آغا صاحب سے ان کی زندگی کے آخری دنوں میں نہیں ملے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ اُن کے جنازہ کے ساتھ سَو سوا سو آدمی تھے جن میں یا تو فلم کمپنی کے لوگ تھے یا ان کے خاص عقیدت مند۔ انہیں لاہور کے میانی صاحب کے قبرستان میں دفن کیا گیا۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی مع حوالۂ متن، سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

آغا بڑے حاضر جواب اور بذلہ سنج شخص تھے۔ جس محفل میں جا بیٹھتے، سب پر چھا جاتے تھے، ان کے ملنے والوں میں اکثر لوگ ضلع جگت میں طاق اور پھبتی میں مشّاق تھے اور جب شام کی صحبت گرم ہوتی، تین تین، چار چار آدمی مل کے آغا پر پھبتیوں کا جھاڑ باندھ دیا کرتے تھے لیکن آغا چومکھی لڑنا جانتے تھے۔ حریف دم بھر میں ہتھیار ڈال دیتا لیکن آغا کی زبان نہ رکتی تھی۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک بانکا پھکیت سروہی

کے ہاتھ پھینکتا چلا جا رہا ہے۔ کبھی کمر کو بتا کے سر پر وار کیا۔ کبھی پالٹ کا ہاتھ مارا۔ کبھی دہنے سے، کبھی بائیں سے۔ اس فن میں، ان کا کوئی حریف نہیں تھا۔

جواب | **حوالۂ متن** | یہ عبارت چراغ حسن حسرت کے تحریر کردہ شخصی خاکے "آغا حشر" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق | اس عبارت سے پہلے، مصنّف نے پہلے تو آغا حشر سے اپنی غائبانہ واقفیت اور ان کے ڈراموں کی شہرت کا ذکر کیا ہے اور پھر ۱۹۲۵ء میں ان سے اپنی پہلی ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔

آغا حشر کو ملنے سے پہلے مصنّف کے ذہن میں آغا کا عجیب و غریب تصور تھا۔ وہ دو ایسے آدمیوں سے مل چکے تھے جنہیں سب آغا کہتے تھے۔ ایک تو ان کے پڑوس کے افغان سردار کا نوکر تھا جو تھا تو خوش شکل لیکن اس کی سیاہ گھنی داڑھی اور لہراتی ہوئی زلفیں تھیں اور وہ لڑکوں کے چھیڑنے پر خفا ہوتا تھا۔ دوسرا آغا، مصنف کے گاؤں میں ہینگ بیچنے والا ایک افغان تھا۔ اس کی لمبی داڑھی تھی اور بال کندھوں پر بکھرے رہتے تھے۔ اس کی صدری بھی میلی کچیلی ہوتی تھی اور وہ ہینگ نہ بکنے پر برہم ہو کر گاؤں والوں کو برا بھلا کہتا تھا۔ جب مصنف نے پہلی بار آغا حشر کو دیکھا تو وہ انہیں اپنے تصورات کے آغا حشر سے بہت مختلف نظر آئے۔ ان کے سر پر انگریزی فیشن کے بال تھے، داڑھی منڈھی ہوئی، چھوٹی چھوٹی مونچھیں، بھاری جسم، سرخ و سپید رنگ، درمیانہ قد اور ایک آنکھ میں نقص تھا۔ بہت کچھ کمانے کے باوجود ان کا رہن سہن سادہ تھا اور سب ملنے جلنے والوں کے ساتھ عزت و احترام سے پیش آتے تھے۔

تشریح طلب عبارت کے بعد مصنف نے آغا حشر کاشمیری کے ذوقِ مطالعہ کا ذکر کیا ہے۔ وہ ہر طرح کے اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھتے تھے۔ اخباروں کے دفتروں میں اور کتابوں کی دکانوں میں جو کچھ ملتا، وہ تو پڑھتے ہی تھے، سڑک پر گرے پڑے کاغذات اور سودا سلف کے لئے آئی ہوئی پڑیاں تک پڑھے بغیر نہیں چھوڑتے تھے۔ اسی مطالعہ کی برکت سے طب، فلسفہ، شاعری، ادب غرضیکہ ہر موضوع پر حاوی ہو گئے تھے۔ مناظرہ میں بھی طاق تھے، اس لئے جس محفل میں جاتے، اپنی گفتگو سے چھا جاتے۔ آغا صاحب اپنی تعریف خود کرنا برا نہیں سمجھتے تھے۔ بلکہ دوسروں کو بھی اس کی تلقین کرتے تھے۔ وہ ہاتھ کے سخی اور دل کے صاف تھے۔ اپنے عزیز و اقارب اور دوستوں کی دل کھول کر مالی امداد کرتے تھے۔ وہ شعر فی البدیہہ کہتے تھے اور چند منٹوں میں غزل مکمل کر لیتے تھے۔ ان کے ڈراموں میں بھی جزوی طور پر حسن موجود ہے۔ وہ ڈراما لکھتے وقت عوام کے ذوق اور ان کی پسند کا خیال رکھتے تھے۔ اسی لئے کامیاب

رہتے تھے۔ مضمون کے آخر میں مصنف نے آغا حشر کی بیماری اور وفات کا ذکر کیا ہے۔

تشریح آغا حشر کاشمیری بڑے خوش مزاج اور حاضر جواب انسان تھے یعنی کسی کی بات سنتے ہی اس کا فوراً ظریفانہ اور معقول جواب دیتے تھے۔ اسی وجہ سے وہ جس مجلس میں موجود ہوتے، سب پر حاوی ہو جاتے۔ ان کے دوست احباب میں اکثر لوگ ایسے تھے جو گفتگو میں رعایت لفظی اور ذو معنی بات کے ماہر تھے اور دوسروں پر چوٹیں کرنے اور پھبتیاں کسنے میں مشہور تھے یعنی ایسی برمحل طنزیہ یا مزاحیہ تشبیہ تراشتے جو دوسرے پر فوراً چپاں ہو جاتی اور اس کا خوب مذاق اُڑتا تھا۔ عموماً جب شام پڑتی تو سب احباب جمع ہو جاتے۔ اس وقت کئی کئی آدمی مل کر آغا حشر کو اپنے چُست جُملوں، دلچسپ پھبتیوں اور ہنسی مذاق کا نشانہ بناتے، لیکن آغا حشر ایسے پھکڑ باز تھے کہ بیک وقت سب کو خاموش کر دیتے تھے۔ بڑے سے بڑا مدمقابل ان کے سامنے نہ ٹھہرتا اور اپنی شکست تسلیم کر لیتا تھا۔ آغا حشر حریف کی پسپائی کے باوجود اس کو نہ چھوڑتے اور اس پر لفظی وار کرتے رہتے۔ اس وقت یوں لگتا تھا کہ جیسے وہ ایک ماہر گتکے باز ہیں جس کے ہاتھ میں فولاد کی سیدھی دو دھاری تلوار ہے اور جس سے وہ حریف پر مسلسل حملے کرتا جا رہا ہے۔ کبھی کمر پر وار کرنے کا دھوکہ دے کر سر پر وار کرتا ہے، کبھی دائیں طرف سے حملہ کرتا ہے، کبھی بائیں طرف سے اور کبھی حریف کے پاؤں پر ضرب لگاتا ہے۔ غرضیکہ پھبتی بازی کے فن میں کوئی شخص آغا حشر کا مقابلہ نہیں کر سکتا تھا۔

محمد حسین آزاد (۱۸۳۰ء - ۱۹۱۰ء)

ایران کے موسم

تعارف اور پس منظر

"ایران کے موسم" مضمون، مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب "سخن دانِ فارس" (حصہ دوم) میں سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب لیکچروں (خطبات) کی شکل میں ہے۔ حصہ اوّل میں دو لیکچر ہیں اور حصہ دوم میں گیارہ لیکچر ہیں۔ حصہ اوّل لغات اور زبانوں کی تحقیق سے شروع ہوتا ہے اور فارسی اور سنسکرت زبانوں کے آپس میں گہرے تعلق کی مثالوں پر ختم ہوتا ہے جب کہ حصۂ دوم ایک طرح سے فارسی زبان و ادب کی تاریخ ہے۔ فارسی زبان کی ابتدا، نشوونما، عروج وغیرہ کی داستان بڑے دلچسپ انداز میں بیان ہوئی ہے۔ اور فارسی میں نثر اور شاعری کے سرمائے کا عہد بہ عہد جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ "ایران کا موسم"، "سخن دانِ فارس" (حصۂ دوم) کے ساتویں لیکچر کا ایک حصہ ہے جس کا عنوان ہے: "ہر ایک سرزمین اور اس کے موسموں کی بہار انشاء پردازی پر کیا اثر کرتی ہے؟" اس لیکچر میں مصنف نے پہلے تو عرب، ہندوستان، فرنگ اور فارس (ایران) کی انشاء پردازی کے نمونے دکھائے ہیں جن کے موضوعات اس ملک کے شاعروں اور ادیبوں نے اپنے اپنے ملحول سے اخذ کئے ہیں اور پھر مختلف خطوں کی آب و ہوا کا ان کے ادب اور شاعری پر اثر دکھایا ہے۔ پھر ہندوستان کے چھ موسموں کے مقابلے میں ایران کے چار موسموں کا ذکر کیا ہے یعنی بہار، گرمی، خزاں اور جاڑا۔ لیکچر کا آخری حصہ انہی موسموں کے چشم دید حالات، واقعات، کیفیات اور مشاہدات پر مبنی ہے اور اسی حصے کے بعض ٹکڑوں کو جوڑ کر موجودہ مضمون "ایران کے موسم" تشکیل دیا گیا ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد نے ایران کے چار موسم بتائے ہیں، جن کے بارہ مہینے، بارہ آسمانی بروج کے عین مطابق ہیں۔ "موسم بہار" ۲۱ر مارچ سے، "موسم گرما (تابستان) ۲۱ر جون سے، "موسم خزاں" (پائیز) ۲۱ر ستمبر سے اور موسم سرما (زمستان) ۲۱ر دسمبر سے شروع ہوتا ہے۔ محمد حسین آزاد نے مزے لے لے کر ان موسموں کی تفصیل بتائی ہے، جو ان کے مخصوص اسلوبِ بیان کی وجہ سے اور بھی دلکش نظر آتی ہے۔ انہوں نے بتایا ہے کہ ایران میں موسم بہار کا آغاز جشن نوروز

سے ہوتا ہے جو ۲۱ یا ۲۲ مارچ کو (عید کی طرح) قومی تہوار کے طور پر منایا جاتا ہے۔ انہوں نے موسموں کی تبدیلیوں کا گہرا اور قریبی مشاہدہ کیا ہے اور اپنے ذاتی تجربات کو برمحل تشبیہات و استعارات کی مدد سے قارئین تک پہنچایا ہے۔ بدلتے ہوئے موسموں کا تذکرہ اتنا حقیقی، خوشنما، جاندار اور پُر اثر ہے کہ ہر موسم اپنی جملہ رعنائیوں سمیت ہمارے سامنے مجسم آکھڑا ہوتا ہے۔ موسم بہار کی ابتداء سے پہلے زمین کا سانس لینا، در و دیوار کے مسامات سے گرمی کا نکلنا اور پھر بہار کے آغاز کے ساتھ ہی درختوں پر سبز کونپلوں کا پھوٹنا، نہروں، دریاؤں، تالابوں اور حوضوں کے یخ بستہ پانی کا پگھلنا، نہروں کا بہنا اور نالیوں میں پانی کا سرسرانا، کسانوں اور باغبانوں کا کھیتوں اور باغوں میں جانا اور ان کی نگہداشت کرنا، لوگوں کا اپنے گھروں میں درختوں کو چھانٹنا، انگور کی دار بستیں باندھنا اور گھروں سے باہر باغوں میں جا کر رات رات بھر بہار کا لطف اٹھانا۔

یہ سب چیزیں اس حسن و خوبی سے بیان ہوئی ہیں کہ مضمون پڑھنے والا خود کو اس حسین ماحول کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔ اسی طرح موسم گرما میں فصلوں اور پھلوں کے پکنے کا ذکر کیا گیا ہے اور ہمارے یہاں کے گلابی جاڑے سے ملتے جلتے اس موسم میں وہاں کے باشندوں کی زندگی کے معمولات اور اشیائے خورد و نوش کی تفصیلات بڑے لذیذ اور دلکش انداز میں بیان کی گئی ہیں۔ گرمی کے موسم میں جہاں ایک طرف ایرانی باشندے گرم میووں، یخنی، چائے، پلاؤ اور شب دیگ سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہاں دوسری طرف برف اور شربتِ انگور والے ٹھنڈے فالودے کے مزے لیتے دکھائے گئے ہیں۔ موسم خزاں میں پتوں کے زرد اور تانبے کی طرح سُرخ ہونے کا نقشہ بھی خوب کھینچا گیا ہے اور پھر اُن کے جھڑنے کی اُداس کیفیت بھی دکھائی گئی ہے۔ موسم خزاں میں جو دراصل موسم سرما کا پیش خیمہ ہے، ایک عجیب ویرانی کا عالم ہوتا ہے اور اسی موسم میں کسان ہل چلا کر اگلی فصل کے لئے بیج بوتے ہیں۔ آخر میں موسم سرما کی بڑی حسین تصویر کھینچی گئی ہے جسے خوبصورت تشبیہات نے چار چاند لگا دیئے ہیں۔ آسمان سے برف کا اس طرح گرنا جیسے دُھنیا روئی دُھنک رہا ہو یا مہین مہین برف کا جھالے کی صورت میں اُترنا، کبھی غبار کی طرح برسنا اور کبھی آٹے کی طرح زمین، مکانوں کی چھتوں، دیواروں اور منڈیروں پر چھڑ کاؤ۔ جاڑے کی وہ کیفیات ہیں، جو محمد حسین آزاد نے اپنے جادو نگار قلم سے زندہ کر دکھائی ہیں، انہوں نے بتایا ہے کہ اس موسم میں راستے شدید برف باری سے بند ہو جاتے ہیں، ہر طرف برف کے انبار لگے ہوتے ہیں۔ کھیت، میدان، گلی کوچے، گھر سب برف سے اَٹ جاتے ہیں، پہاڑوں پر برف کے پہاڑ جم جاتے ہیں، لوگ آتش دانوں اور انگیٹھیوں کے سامنے بیٹھے آگ تاپتے رہتے ہیں اور ماکولات و مشروبات سے دل بہلاتے رہتے ہیں، گھروں میں خوب چہل پہل ہوتی

ہے۔ لیکن گھروں کے باہر ویرانی اور سناٹا ہوتا ہے۔ درخت پتوں سے خالی ہو جاتے ہیں اور ننگی جھاڑیوں کی طرح تنہا اور اداس لگتے ہیں۔ پرندوں، درندوں، چرندوں میں سے کوئی باہر نظر نہیں بلکہ سردی کے خوف سے سب اپنے اپنے آشیانوں، بھٹوں اور بلوں میں گھسے رہتے ہیں اور اچھے موسم کے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔

"ایران کے موسم" مضمون کو فنی اعتبار سے باقاعدہ سفر نامہ تو نہیں کہا جا سکتا لیکن چونکہ اس میں خالی خولی خشک بیانات کی بجائے مصنف نے اپنے پُر لطف اور حقیقی مشاہدات قلم بند کئے ہیں، اس لئے یہ سفر نامہ، رپور تاژ اور آپ بیتی کی ملی جلی صفات کا حامل ہے۔ گلاب کی ٹہنیوں پر بلبل کا درد بھری آواز میں رات بھر چلانا اور مصنف کا ہاتھوں کی دستک سے اُسے اُڑا دینا، اپنے ایران سے تاتار کے ملک (روسی ترکستان) کے سفر کے دوران میں دریائے سیحوں کے کنارے کھڑے ہو کر اس کا تا حدِ نگاہ اونٹوں، گھوڑوں، سواروں اور پیدل چلنے والوں کو چیونٹیوں کی قطار کی طرح ایک سیدھ میں چلتے دیکھنا، شدید برف باری کے موسم میں ایک پتھر کی اوٹ میں برف ہٹا کر زمین نکالنا اور اپنے ہم سفروں کے ساتھ بستر بچھا کر بمشکل رات گزارنا — وہ ذاتی احوال اور چشم دید واقعات ہیں، جنھوں نے مضمون میں حقیقت نگاری کا رنگ بھر کر اسے مزید دلکش بنا دیا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۵۹ | بہار: پھول کھلنے کا موسم۔ نوروز: نئے سال کا پہلا دن۔ ۲۱ مارچ جس سے ایران کا موسم شروع ہوتا ہے اور ایرانی اس دن جشنِ عید مناتے ہیں۔ آفتاب: سورج۔ حوت: آسمان کے بارھویں برج کا نام جو مچھلی کی شکل کا ہے۔ پرانے ماہرین فلکیات نے آسمان کو بارہ بروج (حصوں) میں تقسیم کر رکھا تھا، جن کی شکلیں مختلف چیزوں سے ملتی جلتی تھیں چنانچہ انہیں کے نام پر ان برجوں کے نام رکھ دیئے گئے۔ وہ بارہ بروج بالترتیب اور ان کے معانی، یہ ہیں: (۱) حَمَل (مینڈھا) (۲) ثَور (بیل) (۳) جَوزا (دو جڑواں بچے) (۴) سرطان (کیکڑا) (۵) اَسد (شیر) (۶) سُنبلہ (گندم کا خوشہ) (۷) میزان (ترازو) (۸) عَقرَب (بچھو) (۹) قوس (کمان) (۱۰) جَدِی (بکرا) (۱۱) دَلو (ڈول) (۱۲) حُوت (مچھلی)۔ آمدِ بہار کی تاثیر ہے: موسمِ بہار کے آنے کے اثر سے۔ زمین سانس لیتی ہے: زمین سے بخارات نکلتے ہیں۔ زمین کی بھڑاس نکلتی ہے۔ در و دیوار: مکان کے دروازے اور دیواریں۔ مسامات: جسم کی جلد کے باریک باریک سوراخ جن سے پسینہ نکلتا ہے۔ شاخِ بلور: بلور، ایک چمکدار جوہر ہے جو کان سے نکلتا ہے۔ اس سے مراد نہایت صاف شفاف ہے، شاخِ بلور کا مطلب ہے، برف باری کی وجہ سے درختوں کی شاخیں بلور کی ٹہنیاں بنی ہوئی تھیں

جو بہت سفید اور صاف شفاف تھیں۔ موقوف: بند۔ جھالا پڑ گیا: جھالا وہ زور کا مینہ ہے جو ایک دفعہ خوب برس کر جلدی ختم ہو جائے۔ یہاں مراد ہے ایک ہی دفعہ مینہ کی بوچھاڑ ہوئی۔ برطرف: بند یا موقوف۔ زمستان: سردیوں کا موسم، جاڑا۔ حوض: تالاب، پانی جمع کرنے کی پکی بنی ہوئی جگہ۔ حاشیے کے اندر کی جگہ۔ تلاؤ: جوہڑ۔

ص ۱۶۰ آئینہ ہو گئے: صاف شفاف اور چمکدار ہو گئے۔ سر سرانا: آہستہ آہستہ بہنا۔ تختہ: حصّہ، ٹکڑا، قطعہ۔ دہن: منہ۔ سبزہ: گھاس۔ کلیاں: منہ بند پھول۔ خانہ باغ: مکان کی چار دیواری کے اندر کا باغ۔ آشنا: واقف۔ دار بست: انگور کی بیل چڑھانے کی ٹٹی یا ٹھاٹھر، سرکنڈوں کا بنایا ہوا وہ جال (باڑ) جس پر انگور کی بیلیں اوپر کی سمت چڑھائی جاتی ہیں تاکہ پھل خراب نہ ہو۔ چھانٹنا: تراشنا۔ کاٹ چھانٹ کرنا۔ سبزی کی تحریر: سرسبز ہونے لگنا۔ کونپل: نئے پتے جو ابھی پھوٹے ہوں۔ شفاف: صاف۔ طراوت: تروتازگی، نمی، ٹھنڈک۔ زمرد: سبز رنگ کا ایک قیمتی پتھر۔ لہلہانا: لہرانا۔ سرسبز و شاداب ہونا، پھلنا پھولنا۔ گلزار: باغ۔ سبزۂ خودرو: خود بخود اُگنے والی گھاس۔ گلِ خودرو: بغیر کسی بیج کے بوئے، از خود اُگنے والا پھول۔ سکڑنا: سمٹنا۔ آسودہ حال: مالدار۔ بلبلِ ہزار داستان: ایک قسم کا بلبل (سیاہ رنگ کا ایک خوشنما پرندہ جو ایران میں پایا جاتا ہے) جو ہزاروں بولیاں بولتا اور نہایت خوش الحان ہوتا ہے۔ خوب گیت گانے اور چہچہانے والا بلبل۔ چہچہے: پرندوں کی خوش الحانی، پرندوں کا خوشی سے بولنا یا گانا۔ عالم: حالت، کیفیت۔ مست: نشے میں چور۔

ص ۱۶۱ زمزمہ: گیت گانا، نغمہ سرائی۔ گل و لالہ: گلاب کا اور لالہ کا پھول، لالہ کا پھول گہرے سرخ رنگ کا ہوتا ہے۔ مضمون باندھنا: خیالات پیش کرنا۔ اصلیت: حقیقت۔ نیم: ایک نہایت کڑوے درخت کا نام۔ کیکر: ایک درخت کا نام جس کے لمبے لمبے کانٹے ہوتے ہیں اور اپنے موسم میں اس پر چھوٹے چھوٹے زرد رنگ کے پھول کھلتے ہیں۔ اسے ببول بھی کہتے ہیں۔ بہی: ایک پھل جو امرود کے مشابہ ہوتا ہے۔ رات کا کالا گنبد: زمین کے چاروں طرف جھکے ہوئے آسمان کو گنبد قرار دیا ہے جو رات کے وقت سیاہ ہو جاتا ہے یہاں مراد ہے کہ بلبل کی آواز رات بھر تاریکی میں گونجتی رہتی ہے۔ زمزمے میں تانیں لیتی ہے: اس کے گیتوں میں کئی سُر تال اور گت، ہوتے ہیں، مراد ہے مختلف طریقوں سے اور رنگا رنگ بولیوں میں چہچہاتی اور گیت گاتی ہے۔ چہچہ چہچہ: بلبل کے بولنے کی آواز۔ جی: دل۔ فصلِ بہار: بہار کا موسم۔ چہکارنا: چہچہانا، بولنا یا گانا۔ ایک عالم گزرنا: ایک خاص کیفیت طاری ہونا۔ نوبت: حالت، موقع۔ دستک: تالی بجانا، ہاتھ پر ہاتھ مارنا، دروازہ کھٹکھٹانا۔ آشنا: واقف کار، دوست۔ ہم طبع: ہم مزاج۔

ہم نفس: دوست، ساتھی۔ زندہ دلی: خوش مزاجی، شگفتگی۔ امنگ: جوش، ولولہ، ترنگ، شوق۔ بیا تا امشب شب گل کنیم: آؤ آج کی رات ہم بہار کی رات کے طور پر منائیں۔ زندگی کی بہاریں لوٹنا: زندگی کا لطف اٹھانا۔ پٹے پڑے تھے: بند تھے۔ کاروان: قافلہ۔ رختِ سفر باندھنا: دوسرے ملکوں کو لے جانے کے لئے سامانِ تجارت باندھنا اور روانگی کی تیاریاں کرنا۔ کاریگر: ہاتھ سے کام کرنے والے ہنرمند۔ کارخانے: کام کاج، کاروبار، کام کرنے کی جگہ۔ میوے: پھل۔ ہرے: سبز۔ مخمل: ملائم اور روئیں دار کپڑا۔ موجیں مارنا: لہریں اٹھنا۔

ص ۱۶۲ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی: بہت زیادہ شور ہوتا ہے۔ پن چکیاں: پانی کے زور سے چلنے والی چکیاں جو اناج (آٹا وغیرہ) پیستی ہیں۔ گنگا بہنا: فیض جاری ہونا، دولت لٹنا، دولت کی کثرت ہوتی ہے۔ گھڑیوں میں: چند پہروں میں، گھنٹوں میں۔ جھٹ پٹ: فوراً۔ دم لینا: تھوڑی دیر کے لئے آرام کرنا۔ فصل: کھیتی۔ تازہ دم: ترو تازہ۔ میوے: پھل۔ باسلیقہ: ہنرمند، اچھے انداز اور طور طریقوں کے مالک۔ نعمتِ الٰہی: اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ اور عطا کی ہوئی رنگا رنگ لذیذ چیزیں۔ نگار خانہ: تصویر خانہ، تصویروں والا مکان۔ ایسا گھر جس میں رنگا رنگ، انوکھی اور خوبصورت چیزیں ہوں۔ بہی: امرود سے ملتا جلتا ایک پھل۔ بوقلموں: رنگا رنگ، رنگ برنگے۔ میوہ خانے: پھلوں کی دکانیں۔ حجرہ: وہ کمرہ جہاں الگ تنہائی میں بیٹھ کر عبادت کی جاتی ہے۔ یہاں مراد کمرہ یا دکان کا الگ حصہ ہے۔ قندیل: ایک قسم کا فانوس جس میں چراغ جلا کر لٹکاتے ہیں۔ قمقمہ: ایک چھوٹی قندیل۔ چھت میں لٹکانے کا شیشے کا ایک گولہ جو مختلف رنگوں کا ہوتا ہے۔ ایک ایک تہہ بھس کی دیتے جاتے ہیں: پھلوں کو محفوظ کرنے کے لئے ہر تہہ کے اندر بھوسہ (اناج کا چھلکا) رکھتے ہیں جو پھلوں کو ایک دوسرے کی رگڑ سے محفوظ رکھتا ہے اور وہ گلنے سڑنے نہیں پاتے۔ تہ بہ تہ: ایک تہ کے اوپر دوسری تہ۔ لطافت: عمدگی، پاکیزگی، صاف، ہلکی پھلکی اور نرم ہونا۔ پاکیزگی: صفائی۔ سڑنا: گلنا۔ خراب ہونا۔ اجناس: جنس کی جمع، اناج کی مختلف قسمیں۔ سیاحت: سیر و سفر۔ بازار گرم ہونا: خوب رونق ہونا، خوب خرید و فروخت ہونا۔ بھیڑ بھاڑ: ہجوم، رش۔ رونق: گہما گہمی، چہل پہل۔ مزاج شناس: نازک مزاج۔ خوش پوشاک: اچھا لباس پہننے والے۔ خوش وضع: خوبصورت، اچھی وضع قطع یا شکل و صورت رکھنے والے۔ ولایت: علاقہ، ملک، پرانے ایرانی ادبیات میں ولایت سے مراد ایران اور افغانستان کا علاقہ ہوتا تھا (جس طرح آج کل انگلستان کو کہتے ہیں)

ص ۱۶۳ منافع: فائدہ۔ آسائش: آرام، سہولت۔ گلابی جاڑا: وہ موسم جب ہلکی ہلکی خوشگوار سردی ہو۔ یخنی: گوشت کا ابلا ہوا نمکین پانی۔ چائیں: چائے کی جمع۔ مزاج:

طبیعت۔ گڑھیے: ڈھیلے، بڑے بڑے ٹکڑے، تودے۔ فالودہ: پکا اور جما ہوا نشاستہ، جو سفید سویوں کے لچھوں کی شکل میں شربت میں ڈال کر گرمیوں میں پیتے یا کھاتے ہیں۔ کٹورا: پانی یا کوئی مشروب پینے کا پیالہ۔ شربت انگور: وہ شربت جس میں انگور کا رس بطور مٹھاس اور ذائقہ شامل کیا گیا ہو۔ شربت عموماً مصری یا قند (شکر) میں پکے ہوئے کسی چیز کے عرق کو کہتے ہیں۔ لچھا: باریک کتری ہوئی چیز۔ خزاں: پت جھڑ کا موسم، سردیوں کا موسم جب درختوں پر سے پتے جھڑ جاتے ہیں۔ آفتاب: سورج۔ میزان: لفظی معنی، ترازو یہاں مراد آسمان کا ساتواں برج، ۲۱ ستمبر کو سورج برج میزان میں آتا ہے اور اس تاریخ سے موسم خزاں کا آغاز ہو جاتا ہے۔ جاڑا: سردیوں کا موسم۔ یخ بندی: برف کا جمنا۔ اُنگل: انگلی کے برابر۔ برف کی پپڑی: برف کی جمی ہوئی باریک تہہ۔ یخ: جمی ہوئی برف۔ آب انباروں: پانی کا ذخیرہ کرنے کی جگہ۔ زمین جوت کر: ہل چلا کر زمین نرم کرنا تاکہ تخم ریزی کے لئے تیار ہو سکے۔ آثار: نشانیاں۔ قدرتی دائی: فطرت یا قدرت جو ایک دایہ کی طرح بیج کی پرورش کرتی ہے باہر کے کام والے: گھر سے باہر کام کرنے والے کاریگر، کسان اور کھیت مزدور۔ پوستین: بالوں والی کھال (کسی جانور کی) کا بنایا ہوا کوٹ، بنڈی یا واسکٹ۔ توشک: روئی والا گدیلہ، بچھونا یا بستر۔ آتشدان: کمروں یا کسی زمینی طاق کے اوپر کا چھجا۔ کمرہ گرم کرنے کے لئے چولھا، انگیٹھی یا جلتی ہوئی لکڑیاں رکھنے کی جگہ۔ ذخیرے: گودام۔ جمع کی ہوئی چیزوں کا انبار۔ میوہ خانے: نعمت خانے، باورچی خانہ یا گھر کا وہ حصہ جہاں پھل فروٹ یعنی خشک و تر میوے رکھے ہوتے ہیں۔ تر و خشک میوے: تازہ اور خشک پھل، تازہ پھلوں میں سیب، انگور، خوبانی وغیرہ اور خشک پھلوں میں اخروٹ، بادام، کشمکش، پستہ وغیرہ۔ قیمہ کئے ہوئے: دُنبے کو ذبح کر کے اس کی کھال اُتار لینا۔ نمک سود کر کے: نمک لگا کر۔ قاق: سوکھا ہوا گوشت، خشک گوشت۔ شب دیگ: ایک خاص قسم کا سالن جو شلغم اور گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے رات بھر میں تیار کیا جاتا ہے۔

ص ۱۶۴ پلاؤ دم دینا: یخنی کے گوشت میں پکے ہوئے چاول، جن کو گلانے کے لئے آخر میں برتن کے اندر کی بھاپ استعمال کی جاتی ہے اور اس کام کے لئے ڈھکنے کو اچھی طرح بند کر دیا جاتا ہے تاکہ بھاپ باہر نہ نکلنے پائے۔ سناٹے چلنے لگے: گہری خاموشی چھا گئی۔ عالم: دُنیا۔ زعفرانی: زعفران کے زرد رنگ کی طرح، زعفران ایک قسم کا زرد رنگ کا پھول ہے جو کشمیر میں خاص طور پر پیدا ہوتا ہے۔ بھیڑیا: ایک درندے کا نام جو انسانی بچوں اور بکری جیسے کمزور جانوروں کو پھاڑ کر کھاتا ہے۔ گلہ: جانوروں کا ریوڑ یا ہجوم۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا: گھور کر دیکھنا۔ غور سے دیکھنا، مقابلے کے خیال سے دیکھنا۔ آنکھ جھپکنا: ذرا سی دیر کے لئے آنکھ بند ہونا۔ تکا بوٹی کرنا: ٹکڑے ٹکڑے کرنا۔ گرگ: بھیڑیا۔ آشتی: صلح صفائی، دوستی۔ گرگ آشتی:

بھیڑیے کی طرح ظاہری طور پر دوستی ہونا لیکن دل میں دشمنی رکھنا۔ بدذات: کمینہ صفت، پاجی۔ ملاپ: دوستی، میل جول، صلح۔ برف کا کیڑا: برف باری کے ماحول کے عادی۔ بازار چلنا: کاروبار جاری رہنا۔ حاجت مند: ضرورت مند۔ نمدی چغے: اون کے (ملائم بالوں کے) بنے ہوئے، چغے یا عبائیں جو عام لباس کے اوپر پہنی جاتی ہیں تاکہ سردی سے بچاؤ رہے۔ شیشے کی سلائیاں: برف کی سلائی کی طرح باریک اور لمبوترے ٹکڑے جو شیشے کی طرح چمکتے ہیں۔ عالم: حالت یا کیفیت۔ پرند: اڑنے والے پردار جانور۔ جانور: حیوانات۔ جھکڑ: تیز ہوا کا طوفان۔ چھرے: سنگریزے، کنکر یا کارتوس کے اندر سکے کی بنی ہوئی چھوٹی چھوٹی گولیاں جو بندوق میں رکھ کر چھوڑتے ہیں تو زد میں آنے والے کو بوچھاڑ کی شکل میں لگتی ہیں۔

ص ۱۶۵ | دریائے جیحوں: ملک تاتار (روسی ترکستان) کا ایک دریا جو جھیل ارال میں گرتا ہے۔ تختہ آئینے کا: پانی جما ہوا تھا، برف آئینے کی طرح چمکتی تھی اور ایک وسیع و عریض قطعہ کی شکل میں تھی۔ شتری: اونٹوں کے۔ اسپی: گھوڑوں کے۔ پیادہ: پیدل چلنے والے۔ سوار: اونٹوں یا گھوڑوں پر سواری کرنے والے۔ برابر چلے جانا: مسلسل سفر اختیار کرنا۔ چیونٹیوں: چیونٹی کی جمع، ایک بے حد چھوٹا سا حقیر اور کمزور کیڑا۔ منزل: پڑاؤ، دن بھر کے سفر کے بعد ٹھہرنے کی کوئی مخصوص جگہ۔ سرا: سرائے کرائے پر ٹھہرنے کی جگہ، ہوٹل۔ لکڑ: لکڑیاں۔ گٹھڑی ہو کر: اکٹھے ہو کر، ہاتھ پاؤں اور بدن سمیٹ کر۔ غنیمت: قدر کرنے کے قابل، بہتر ہے، شکر کا مقام ہے۔ خدا خدا کر کے: بڑی مشکل سے۔ تپایا ہوا تانبا: گرم تانبا (ایک دھات) جو سرخ ہوتا ہے۔ دفعتہً: اچانک، یک لخت۔ ابر سا گھر آیا: بادل چھا گئے۔ دھواں دھار: نہایت سیاہ۔ غبار: دھول، باریک مٹی، گرد۔ منڈیر: چھت کا کنارا۔ جھکولا: کسی چیز (برف یا پانی کا) لہر کی طرح زور سے آنا، بوچھاڑ۔ برگ ریز: پتے جھڑنا، پتے نچھاور کرنا۔ سناٹا ہوا کا: ہوا کی وحشتناک آواز۔

ص ۱۶۶ | بجلی مارا لوہا: وہ لوہا جس پر آسمانی بجلی گری ہو اور وہ کالا ہو گیا ہو۔ روئی دھنکنا: دھنئے کا صاف کرنے کے لئے روئی کے گالے اڑانا۔ تار لگنا: مسلسل برسنا۔ بلور: ایک چمکدار صاف شفاف جوہر جو کان سے نکلتا ہے۔ برف کے پہاڑ: برف کے تودے۔ جہاں کے تہاں: جہاں تھے وہیں پر۔ قد آدم: آدمی کے قد کے برابر، چھ چھ فٹ۔ سناٹا: گہری ہولناک خاموشی۔ کارخانے: کاروبار۔ کاریگر: ہاتھ سے کام کرنے والے۔ سوا: زیادہ، بڑھ کر۔ انبار: ڈھیر۔ امراء: امیر کی جمع، دولت مند۔ پنج شاخہ: پانچ شاخوں یا سروں والا پھاوڑا۔ لکڑی کا بنا ہوا پنجا۔ پھاوڑا: بیلچے کی شکل کا لکڑی کا اوزار جس سے گوبر یا برف وغیرہ صاف کرتے ہیں۔ غربا: غریب کی جمع۔ آتش دان: انگیٹھی۔ لکڑیاں جلا کر کمرہ گرم کرنے کا مقام۔ بخاری: چمنی یا انگیٹھی جو دیوار

میں چھت تک دھوآں نکلنے کے لئے بناتے ہیں۔ بخاری ایسی انگیٹھی کو بھی کہتے ہیں، جس میں لکڑیاں جلائی جائیں۔ گوشت قاق: خشک کیا ہؤا گوشت۔ پلاؤ دم دینا: پلاؤ پکانا (پلاؤ والے برتن کی اندر کی بھاپ کے ذریعے چاول گلا کر تیار کرنا) یخنی: اُبلے ہوئے گوشت کا پانی جو بڑا طاقتور اور مزیدار ہوتا ہے۔ کلّے پائے: جانور کے سری پائے۔ کلّا بمعنی جبڑا اور پائے بمعنی پاؤں۔ شب دیگ: گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے اور شلغم ملا کر رات بھر پکانا۔ چائیں اڑانا: چائے پینا۔ سنسان: ویران۔ گیدڑ: ایک بزدل درندہ جو کتے سے ذرا چھوٹا ہوتا ہے۔ لومڑی: ایک درندہ جو قریباً بلی کے برابر ہوتا ہے۔ اس کی دُم گچھے دار ہوتی ہے۔ اس کی عیاری اور مکاری مشہور ہے، گوشت اناج اور پھل کھاتی ہے۔ سرد ملکوں میں زمین کے اندر بھٹ بنا کر رہتی ہے۔ خرگوش: ایک تیز رفتار لیکن ڈرپوک جانور جو قد میں بلی کے برابر ہوتا ہے۔ اس کے کان لمبے لمبے اور گدھے کے کانوں سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اتنا تیز دوڑتا ہے کہ بعض اوقات شکاری کتے بھی اسے نہیں پکڑ سکتے۔ یہ زمین کھود کر گھر بناتا ہے۔ اس کی کھال بہت قیمتی اور کار آمد ہوتی ہے جس سے ایک قسم کی ٹوپی بنائی جاتی ہے۔ چوہا: خاکی رنگ کا مشہور جانور جو زمین میں سوراخ بنا کر رہتا ہے اس کے دانت تیز ہوتے ہیں جن سے وہ کتابوں، کپڑوں، اور کار آمد چیزوں کو کتر ڈالتا ہے۔ بھٹ: جنگلی جانوروں کے رہنے کی کھوہ یا پناہ گاہ۔ بِل: جانوروں کے رہنے کا سوراخ۔

سبق کا خلاصہ

مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں کہ ایران میں چار موسم ہوتے ہیں (۱) بہار (۲) گرمی (۳) خزاں (۴) جاڑا

بہار ۲۱ مارچ سے ایران میں موسم بہار شروع ہوتا ہے۔ اُس دِن عیدِ نوروز ہوتی ہے۔ اب برف باری بند ہو جاتی ہے۔ اگر آٹھ دس دن بعد ہلکی سی برف کی بوچھاڑ ہوتی بھی ہے تو وہ فوراً پانی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ نہروں، حوضوں، تالابوں اور دریاؤں کا جما ہوا پانی پگھلنے لگتا ہے اور نہروں کی نالیوں میں پانی آہستہ آہستہ بہنے لگتا ہے۔ حوضوں کے کنارے گھاس اُگ آتی ہے اور پھول کھلنے لگتے ہیں۔ زمیندار کھیتوں میں اور باغوں والے باغوں میں پہنچتے ہیں، غریب، امیر، سب کے گھروں میں باغیچے ہوتے ہیں۔ وہ انگوروں کی بیلیں چڑھاتے، درختوں کی چھنگائی کرتے اور کیاریاں صاف کرتے ہیں۔ درخت ہرے بھرے ہونے لگتے ہیں۔ گھروں کی کیاریوں اور باغوں میں گلاب کھِل اُٹھتا ہے۔ سردی کی وجہ سے جو لوگ گھروں میں بند تھے، اب باہر نکلتے ہیں۔ کھاتے پیتے گھرانوں کے لوگ اپنے دوست احباب کو ساتھ لے کر باغوں میں جاتے ہیں اور

بہار کے مزے لوٹتے ہیں۔ عورتیں بھی کھیتوں اور باغوں میں جا کر خوشیاں مناتی ہیں۔

گلاب کے کھلتے ہی بلبل اس کی شاخ پر بیٹھ کر چہچہاتی ہے۔ جب زیادہ سرشار ہوتی ہے تو پھول پر منہ رکھ دیتی ہے اور آنکھیں بند کر کے گیت گاتی ہے۔ اس وقت معلوم ہوتا ہے کہ شاعروں نے موسم بہار میں گل و بلبل کے عشق کے جو مضمون شاعری میں باندھے ہیں، وہ بالکل درست ہیں۔ ہر گھر میں سیب، ناشپاتی اور بہی کے درخت اور انگور کی بیلیں ہوتی ہیں۔ چاندنی رات میں ان درختوں پر بیٹھ کر جب بلبل جوش و خروش کے ساتھ درد بھری آواز میں بولتی ہے تو یوں لگتا ہے، جیسے اس کا سینہ پھٹ جائے گا۔ دردمند لوگ اس کے گیت سن کر بے چین ہو جاتے ہیں۔ محمد حسین آزاد بتاتے ہیں کہ میں موسم بہار میں ایران میں تھا اور چاندنی رات میں میں نے خود اُسے درخت پر چہچہاتے دیکھا۔ اس کی دردناک آواز سن کر دل پر قیامت گزر جاتی تھی۔ میں نے کئی دفعہ بے چین ہو کر اُسے تالی بجا کر اُڑا دیا۔ یہ موسم دلوں میں جوش پیدا کرتا ہے۔ چنانچہ زندہ دل لوگ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ باغ میں چلے جاتے ہیں اور رات وہیں گزار کر زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔

گرمی ۲۱ جون سے گرمی کا موسم شروع ہوتا ہے۔ جو راستے برف سے بند تھے، وہ کھل جاتے ہیں اور سوداگر اپنا اپنا سامانِ تجارت لے کر دُور دراز ملکوں کو روانہ ہوتے ہیں۔ اس موسم میں درختوں پر پھل پکنے لگتے ہیں۔ پہاڑوں پر برف پگھلتی ہے۔ دریا، نہریں اور چشمے بہنے لگتے ہیں۔ پن چکیاں چلنے لگتی ہیں، دریاؤں، نہروں اور چشموں کا پانی کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ گرمی سے فصل پکتی ہے تو کسان اسے کاٹتے ہیں اور اناج حاصل کر کے فراغت پاتے ہیں۔ باغوں میں پھل پک کر تیار ہوتے ہیں تو انہیں اتار لیا جاتا ہے اور دکانوں پر لا کر سجایا جاتا ہے۔ سیب، ناشپاتی، بہی اور انگور وغیرہ افراط سے اور قسم قسم کے ہوتے ہیں۔ ہر گھر میں دو دو چار چار اقسام کے درخت موجود ہوتے ہیں۔ دُکاندار اپنی اپنی دُکان میں انگور کے خوشے، خربوزے اور تربوز قندیلوں کی طرح لٹکاتے ہیں جو بے حد خوشنما معلوم ہوتے ہیں۔ پھل اتنے زیادہ ہوتے ہیں کہ دنبے اور بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں۔ ہوا لطیف اور پاکیزہ ہے جو پھلوں کو کافی دیر تک خراب نہیں ہونے دیتی۔ لوگ زمین کھود کر بھُس کی تہوں کے اندر پھل دبا تے ہیں تاکہ پک جائیں اور محفوظ رہیں۔ گرم خطوں کے لوگ اپنی اپنی قابلِ فروخت اجناس لے کر ٹھنڈے علاقوں کی طرف چلے جاتے ہیں، کیونکہ سیر و سفر کو یہ لوگ بے حد پسند کرتے ہیں۔ شہروں میں خریداروں کی وجہ سے خوب رونق ہوتی ہے۔ دکانیں مال و اسباب سے بھری ہوتی ہیں۔ بازاروں میں بے فکرے، خوش لباس اور خوبصورت لوگ گھوم پھر کر زندگی کا لطف اٹھاتے ہیں۔ گرمی کا موسم ایران میں کاروبار کے لئے مفید ہے۔ یہ آرائش و آرام کا موسم ہے۔ وہاں کی گرمی ہمارے ملک کے گلابی جاڑے کی طرح ہوتی ہے۔ اسی لئے وہاں کے باشندے گرم میوے اور دُنبوں کا گوشت اس

موسم میں کھاتے ہیں اور یخنی اور چائے پیتے ہیں۔ ان کے مزاج گرمی برداشت نہیں کرتے چنانچہ اگر وہ تھوڑا سا بھی چلیں پھریں، تو پسینہ پسینہ ہو جاتے ہیں۔ دکاندار پہاڑوں سے برف کے بڑے بڑے ڈھیلے توڑ کر لاتے ہیں، برف کو باریک کر کے فالودے کے کٹورے میں ڈالتے ہیں اور شربت انگور ملا کر گاہک کے حوالے کرتے ہیں، جو بڑے شوق سے اُسے کھاتا ہے۔

خزاں ۲۱ ستمبر سے ایران میں خزاں کا موسم شروع ہوتا ہے، جو سردی کے موسم کا پیغام لاتا ہے۔ اب برف جمنے لگتی ہے۔ پہاڑی چشموں کا پانی جم کر بہنا بند ہو جاتا ہے اور دریاؤں میں پانی کم ہوتا چلا جاتا ہے۔ نہریں قلتِ آب سے خشک ہونے لگتی ہیں۔ اگر کہیں تھوڑا بہت پانی موجود بھی ہو تو اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ سطح پر برف کی تہہ جمی ہوئی ہے اور نیچے پانی بہتا جاتا ہے۔ پانی حاصل کرنے کے لئے برف کی تہہ کو مکا مار کر توڑتے ہیں اور پانی لے جا کر مٹکوں کے حوضوں میں بھر لیتے ہیں یا گھر کی ٹینکیوں میں محفوظ کر لیتے ہیں اور یہی پانی اُن کے روزمرہ استعمال کے کام آتا ہے۔ جونہی پانی جمنے لگتا ہے، کسان زمین میں ہل چلا کر بیج بو دیتے ہیں اور جونہی برف باری کی علامتیں نظر آنے لگتی ہیں، وہ کھیت اور باغ خدا کے آسرے پر چھوڑ کر گھروں کو چلے جاتے ہیں۔ خدا کو منظور ہوتا ہے تو فصلیں اُگنے لگتی ہیں اور درخت نشو و نما پانے لگتے ہیں موسم خزاں میں کھیت اور باغ خالی خالی اور اُداس اُداس نظر آتے ہیں۔ کارکن، کسان اور کھیت مزدور، اپنے اپنے کام چھوڑ کر گھروں میں آ بیٹھتے ہیں۔ سردی کے لوازمات، کھانے پینے کا سامان اور دیگر ضروریاتِ زندگی ہر گھر میں موجود ہوتی ہیں، واسکٹیں، لحاف، رضائیاں اور آتش دان سردی سے بچاؤ کے کام آتے ہیں۔ گھروں کے نعمت خانے خشک اور تر میووں سے بھرے ہوتے ہیں۔ لوگ خود بھی کھاتے ہیں اور مہمانوں کو بھی کھلاتے ہیں۔ دُنبوں کو ذبح کر کے ان کی کھال اتار لی جاتی ہے اور ثابت و سالم انہیں نمک لگا کر اور خشک کر کے گھر میں لٹکا دیتے ہیں اور بوقت ضرورت اور حسب خواہش ان سے یخنی تیار کر کے پی جاتی ہے اور شب دیگ یا پلاؤ تیار کر کے کھایا جاتا ہے۔

جونہی سردی کا موسم شروع ہوتا ہے، ہوا ٹھنڈی ہو جاتی ہے، ہر طرف سناٹا چھا جاتا ہے اور بعض درختوں کے پتے زرد اور بعض کے گرم تانبے کی طرح سرخ ہو جاتے ہیں۔ اس موسم میں بھیڑیئے ایک دوسرے کو چیر پھاڑ کر کھا جاتے ہیں۔ اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ بھیڑیوں کے گلے برف باری کی وجہ سے کسی غار میں پناہ لیتے ہیں اور اس انتظار میں ہوتے ہیں کہ جونہی کسی ایک کی آنکھ جھپکے، دوسرے اُس پر جھپٹ پڑیں اور اس کی تکہ بوٹی کر دیں۔ اسے طنزاً "گرگ آشتی" (یعنی بھیڑیوں کی صلح صفائی یا پیار محبت) کا نام دیا جاتا ہے۔ ایران کے باشندے سردی کے موسم کے عادی ہو گئے ہیں، اس لئے وہ سردی اور برف باری کے باوجود اپنے کاموں میں مصروف رہتے ہیں

بعض ضرورت مند سفر سے بھی باز نہیں رہتے۔ چنانچہ حالتِ سفر میں ان کے ننگی جنگوں، پلکوں، مونچھوں اور ڈاڑھی پر باریک برف کے ذرے جمے نظر آتے ہیں۔ اس موسم میں عام جانور اور پرندے بھی باہر نہیں نکلتے البتہ خاص قسم کے کوّے اور اِکّا دُکّا جانور غذا کی تلاش میں اُڑتے پھرتے دکھائی دیتے ہیں جن کی پشت اور پروں پر برف جمی دکھائی دیتی ہے۔ جب تیز ہوا کا طوفان آتا ہے تو زمین پر پڑی ہوئی برف اُڑتی ہے اور چہرے اور جسم پر بندوق کے چھرّے کی طرح لگتی ہے۔

مولانا محمد حسین آزاد اپنا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک دفعہ جاڑے کے موسم میں میں ایران سے روسی ترکستان جا رہا تھا۔ جب ہمارا قافلہ دریائے سیحوں کے کنارے پہنچا تو کیا دیکھتے ہیں کہ حدِ نگاہ تک پانی جما ہوا تھا اور اونٹوں اور گھوڑوں پر سوار اور پیدل آدمیوں کے قافلے چیونٹیوں کی قطار کی طرح دُور تک چلے جا رہے تھے۔ راستے میں کئی منازل آئیں لیکن ٹھہرنے کے لئے کوئی سرائے یا مکان موجود نہ تھا۔ زمین پر کئی کئی فٹ برف جمی تھی اور ہر طرف پہاڑ برف سے سفید دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے رات آرام کرنے کے لئے ایک پتھر کی اوٹ میں برف ہٹا کر زمین نکالی، اِدھر اُدھر سے چند لکڑیاں اکٹھی کیں، انہیں جلایا، بستر بچھایا اور آگ کے پاس گٹھڑی بن کر پڑے رہے۔ خدا کا شکر ہے کہ رات کو ہوا بند تھی، اس لئے زیادہ تکلیف نہیں ہوئی، پھر بھی ہم ہر ایک دو گھنٹے کے بعد اُٹھ کر چائے بناتے، پیتے اور لیٹ رہتے۔ یوں بڑی مشکل سے رات کاٹی۔

جاڑا ۱۸ دسمبر سے صحیح معنوں میں موسم سرما کا آغاز ہوتا ہے۔ اس موسم میں اچانک ہوا بند ہو جاتی ہے اور یوں لگتا ہے گویا بادل چھا گئے ہیں۔ فضا تاریک ہو جاتی ہے۔ پھر برف سفید دھول کی طرح برسنے لگتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد ہر جگہ برف کی باریک تہہ جم جاتی ہے۔ وقفے وقفے کے بعد رات بھر ہوا کے ساتھ برف کی بوچھاڑیں آتی ہیں اور صبح ہوتے ہوتے درختوں سے تمام پتے جھڑ جاتے ہیں اور وہ ٹنڈ مُنڈ ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا رنگ سیاہ ہو جاتا ہے۔ جیسے لوہے پر بجلی گرنے کے بعد ہوتا ہے۔ چند دن بعد پھر برف برسنے لگتی ہے اور اتنی باریک ہوتی ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے کوئی دُھنیا آسمان پر بیٹھ کر روئی دھنک رہا ہو۔ ایک دن اور ایک رات مسلسل برف گرنے سے در و دیوار، زمین و آسمان، جھاڑیاں اور درخت غرضیکہ سب کچھ سفید ہو جاتا ہے۔ پہاڑ برف سے ڈھک جاتے ہیں اور جنگلوں میں برف باری سے راستے رُک جاتے ہیں۔ میدان، کھیت، گلی، کوچے برف سے اَٹ جاتے ہیں۔ گھروں کے صحنوں میں اور چھتوں پر بھی برف کے ڈھیر لگ جاتے ہیں۔ سوداگر جہاں رُک گئے، بس رُک کے رہ گئے۔ کارخانے بند ہو جاتے ہیں اور غریب کاری گر بے روزگار ہو جاتے ہیں۔ غریب اپنے گھروں کی برف خود

صاف کرتے ہیں اور امیر اپنے ملازموں سے صاف کرواتے ہیں۔ سردی اتنی شدید پڑتی ہے کہ آگ کے بغیر گزارہ نہیں ہوتا۔ انگیٹھیاں، آتش دان اور بخاریاں روشن رہتی ہیں اور لوگ ان کے پاس بیٹھ کر آگ تاپتے ہیں۔ وہ کمرے بند کر کے بیٹھتے ہیں۔ دُنبے اور مُرغ تازہ ذبح کر کے، یا خشک گوشت سے جو پہلے سے جمع کر رکھا ہوتا ہے کبھی پلاؤ پکاتے اور یخنیاں پیتے ہیں اور کبھی سری پائے اور شب دیگیں پکا کر کھاتے اور چائے پیتے ہیں۔ گھروں میں تو رونق ہوتی ہے۔ لیکن گھروں کے باہر ویرانی ہوتی ہے۔ کھیت اور باغ سب سنسان نظر آتے ہیں۔ شدید سردی کی وجہ سے جنگل کے جانور مثلاً گیدڑ، لومڑی اور خرگوش تو ایک طرف رہے چوہا تک نظر نہیں آتا۔ سب اپنے اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھسے رہتے ہیں۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی مع حوالۂ متن اور سیاق و سباق، تشریح کیجئے۔

دفعتہً ہوا بند ہوئی۔ ابر سا گھر آیا۔ دُنیا دھواں دھار ہو گئی۔ پھر سفید غبار سا برستا معلوم ہوُا۔ تھوڑی دیر بعد دیکھا تو زمین پر، کوٹھوں پر، دیواروں اور منڈیروں پر کوئی سفید سفید آٹا سا چھڑک گیا۔ غرض کہ ایک جھکولا برف کا اور پڑا۔ رات گزری صبح کو دیکھا تو تمام درختوں پر برگ ریز کا حکم پہنچ گیا۔ دوسرے دن ایک جھکولا اور ساتھ ہی ایک سناٹا ہوا کا آیا۔ پھر جو دیکھا تو درخت پر پتے کا نام نہیں۔ جو درخت ہفتہ بھر پہلے پتّوں سے بھرے تھے، اب خالی جھاڑیاں کھڑے ہیں۔ جیسے کسی نے کپڑے اتار لئے۔ وہ بھی سیاہ رنگ، جیسے بجلی مارا لوہا۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت محمد حسین آزاد کے مضمون "ایران کے موسم" میں سے لی گئی ہے اور اس میں جاڑے کے موسم کا حال بیان کیا گیا ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنّف نے ایران میں موسمِ بہار، موسمِ گرما اور موسمِ خزاں کا نقشہ کھینچا ہے۔ مصنّف بتاتا ہے کہ موسمِ بہار ۲۱ مارچ سے، موسمِ گرما ۲۱ جون سے اور موسمِ خزاں ۲۱ ستمبر سے شروع ہوتا ہے۔ موسم سرما کے اختتام پر موسمِ بہار کا آغاز ہوتا ہے۔ موسمِ بہار میں جما ہوُا پانی پگھلنے لگتا ہے اور کسان اور باغبان اپنے اپنے کھیتوں اور باغوں کا رُخ کرتے ہیں۔ لوگ اپنے گھروں کے باغیچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں اور انگور کی بیلیں چڑھاتے ہیں۔ اس موسم میں گلاب کھِلتا ہے اور بلبل چہچہاتی ہے۔ اس کی درد بھری آواز سے اہلِ دل پر قیامت گزر جاتی ہے۔ زندہ دل لوگ اپنے دوستوں یا بال بچّوں کو ہمراہ لے کر باغوں میں چلے جاتے ہیں اور وہاں بہار کے مزے لوٹتے ہیں۔ موسم گرما میں سفر کے راستے صاف

ہوجاتے ہیں۔ پہاڑوں کی برف پگھلنے سے دریاؤں اور نہروں میں وافر پانی جمع ہوجاتا ہے جو کھیتوں کو سیراب کرتا ہے۔ گرمی کے موسم میں پھل پکتے ہیں۔ جب فصل پکتی ہے تو کسان کاٹ کر اناج حاصل کرتے ہیں۔ پھل اتنی افراط سے ہوتا ہے کہ دُنبے اور بکریاں تک اُسے کھاتے کھاتے عاجز آ جاتی ہیں۔ وہاں کی گرمی ہمارے گلابی جاڑے کی طرح ہوتی ہے۔ اس لئے وہاں کے باشندے گرم میوے اور دُنبوں کا گوشت گرمی کے موسم میں بھی خوب استعمال کرتے ہیں۔ اس موسم میں بعض دکان دار فالودہ بھی بیچتے ہیں جس میں باریک برف اور شربتِ انگور ملا کر اس کے لطف کو دوبالا کیا جاتا ہے۔ موسمِ خزاں میں درختوں کے پتے جھڑ جاتے ہیں اور برف جمنے کا آغاز ہونے لگتا ہے۔ کسان زمین میں ہل چلا کر بیج بو دیتے ہیں اور کھیتوں اور باغوں کو خدا کے حوالے کر کے گھروں کا رُخ کرتے ہیں۔ اس موسم میں گھروں میں تو رونق ہوتی ہے لیکن کھیت اور باغ اُداس دکھائی دیتے ہیں۔ موسمِ خزاں دراصل موسمِ سرما کا نقطۂ آغاز ہے۔ چنانچہ لوگ گھروں میں گھسے رہتے ہیں۔ انگیٹھیوں اور آتش دانوں کے گرد بیٹھے رہتے ہیں اور خشک و تر میوے، یخنی، چائے، پلاؤ اور شب دیگ کھا پی کر وقت گزارتے ہیں۔

اس عبارت کے بعد مصنّف نے موسمِ سرما کا نظارہ دکھاتے ہوئے بتایا ہے کہ آسمان سے برف اس طرح گرتی ہے۔ جیسے دُھنیا روئی دُھنک رہا ہو۔ چوبیس گھنٹے لگاتار برف باری سے ہر چیز سفید ہو جاتی ہے اس موسم میں پہاڑوں پر برف کی موٹی تہ جم جاتی ہے۔ جنگلوں میں برف سے راستے رُک جاتے ہیں، میدان، کھیت، گلی، کوچے، گھر ہر جگہ برف کے انبار دکھائی دیتے ہیں۔ غریب اپنے کوٹھوں سے خود برف صاف کرتے ہیں اور امیر اپنے ملازموں سے صاف کرواتے ہیں تاکہ مکان برف سے بیٹھ نہ جائیں۔ لوگ سردی کی شدّت ہونے کی وجہ سے کمرے بند کر کے انگیٹھیوں اور آتش دانوں کے گرد جمع رہتے ہیں اور یخنی اور چائے پیتے اور پلاؤ اور شب دیگ کھاتے ہیں۔ گھر کے اندر تو خوب رونق ہوتی ہے لیکن گھر کے باہر ہر طرف ویرانی ہوتی ہے۔ انسان تو انسان، کوئی جانور چلتا اور پرندہ اڑتا بھی نظر نہیں آتا۔ پرندے اپنے گھونسلوں میں اور جانور اپنے بھٹوں اور بلوں میں گھس کر سردی سے اپنا بچاؤ کرتے ہیں۔

تشریح

مصنّف جاڑے کا حال بتاتے ہوئے کہتا ہے کہ اچانک ہوا بند ہو جاتی ہے اور یوں لگتا ہے گویا بادل چھا گئے ہوں۔ فضا سیاہ ہو جاتی ہے اور پھر آسمان سے سفید رنگ کی دھول سی برستی نظر آتی ہے۔ یہ برف ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد دیکھیں تو یوں لگتا ہے۔ جیسے کسی نے زمین پر، مکانات کی چھتوں پر، دیواروں اور

منڈیروں پر سفید سفید آٹا سا چھڑک دیا ہو۔ القصہ برف بوچھاڑ کی شکل میں ہوا کے جھونکوں کے ساتھ اچانک آتی ہے اور وقفے وقفے کے بعد یونہی برستی رہتی ہے۔ رات گزرنے کے بعد صبح ہوتی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ پت جھڑ کا موسم آن پہنچا۔ اگلے دن پھر برف کی بوچھاڑ سی ہوا کی لہروں کے ساتھ آتی ہے اور پھر کیا دیکھتے ہیں کہ سارے درخت پتوں سے خالی ہو گئے۔ وہ تمام درخت جو ایک ہفتہ پہلے پتوں سے لدے کھڑے تھے، اب ٹنڈ منڈ ہو کر ننگی جھاڑیوں کی طرح بے لباس ہو جاتے ہیں۔ درختوں کے تنے اور شاخیں اس طرح کالی ہو جاتی ہیں جیسے لوہے پر آسمانی بجلی گر پڑی ہو۔

اشفاق احمد (ولادت: ۱۹۲۵ء)

خوابوں کا جزیرہ

تعارف اور پس منظر

"خوابوں کا جزیرہ" اشفاق احمد کی کتاب "سفر مینا" (اشاعت ۱۹۸۳ء) میں سے لیا گیا ہے جو اُن کے سات مختصر سفر ناموں، گیارہ افسانوں اور ایک ناولٹ (مہمانِ بہار) پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کا دوسرا سفر نامہ "خوابوں کا جزیرہ" ہے، جو مصنف کی نیویارک کی سیاحت اور اس کے بارے میں اُس کے تاثرات پر مبنی ہے۔ یہ سفر نامہ ۱۹۷۱ء سے پہلے لکھا گیا تھا کیونکہ اس میں پاکستان کے دونوں بازوؤں (مغربی اور مشرقی پاکستان) کا حوالہ موجود ہے۔

اشفاق احمد کو لڑکپن ہی سے اپنے خوابوں کا یہ جزیرہ (نیویارک) دیکھنے کی خواہش تھی۔ ان کا یہ خواب اس وقت پورا ہوا جب انہیں امریکی حکومت کی طرف سے نیویارک آنے کی دعوت ملی۔ چنانچہ اپنی دو ہم سفروں گلوریا اور میری کے ہمراہ وہ بذریعہ بوئنگ طیارہ، نیویارک پہنچے۔ بچپن سے ان کے تصوّرات میں جو نیویارک بسا ہوا تھا، اس کی سڑکیں صاف شفّاف تھیں۔ گھر اُجلے اُجلے تھے۔ سڑکوں پر کاروں کی ریل پیل تھی اور کوئی آدمی پیدل چلتا نظر نہیں آتا تھا۔ ہر شخص خوبصورت سوٹ میں ملبوس اور ہر عورت سر سے پاؤں تک حُسن کے سانچے میں ڈھلی ہوئی تھی، لیکن جب پہلی بار مصنّف کو اصلی نیویارک دیکھنے کا موقع ملا تو اس کے سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ یہ وہ نیویارک نہیں تھا، جس کو اس نے اپنے خوابوں میں دیکھا تھا۔ گلوریا جو نیویارک میں رہتی تھی، اپنے شہر کو امریکی تہذیب کا نمائندہ قرار دیتی تھی، لیکن یہ تہذیب کسی اور ہی رنگ میں جلوہ گر تھی۔ مصنّف کو نیویارک میں اپنے مختصر سے قیام میں جو تجربات ہوئے، اس سے امریکی معاشرے کی ایک بھیانک تصویر اس کے سامنے آئی۔ بسوں میں لوگ بیٹھے ہوئے ہیں لیکن اردگرد سے اتنے بے نیاز اور کاروباری امور میں اتنے مصروف کہ ساتھ والے مسافر سے چند منٹ بات کرنے کا وقت بھی ان کے پاس نہیں۔ اگر ایک تاجر اپنی گود میں سفری ٹیپ ریکارڈر رکھے، دفتری چٹھیاں ریکارڈ کر رہا ہے تو دوسرا آدمی برقی شیور سے اپنی داڑھی مونڈ رہا ہے۔ ایک عورت اپنے ہینڈ بیگ کے آئینے میں مسلسل اپنی صورت دیکھے جا رہی ہے اور مصنّف سمیت دوسرے مسافر

اسے گھور رہے ہیں۔ ہوائی اڈے پر نوٹس بورڈ کے ذریعے جاپانی پسوؤں سے خبردار رہنے کی تلقین ہے، جو مسافروں کے سامان اور کپڑوں سے چمٹ کر جہاز میں پہنچ جاتے ہیں۔ ٹیکسی ڈرائیوروں کے کپڑے بوسیدہ اور میلے چکٹ ہیں۔ کوئی کام ٹپ (بخشش) کے بغیر نہیں ہوتا۔ ٹیکسی ڈرائیور ہو یا ہوٹل کا حبشی بیرا، سب کو مجبوراً ٹپ دینا پڑتی ہے۔ مصنف کو امریکی حکومت نے نیو یارک کے ہوٹل کے جس کمرے میں ٹھہرایا، وہ نہ صرف نیو یارک کی کھوکھلی زندگی کا نمائندہ ہے بلکہ امریکہ کی موجودہ نمائشی تہذیب کا منہ بولتا نمونہ ہے، اس کا ظاہر اُجلا اور چمکیلا ہے لیکن باطن غلیظ اور تاریک ہے۔ اگر ہوٹل کے اندر پرانی وضع کا ٹیلی فون خراب ریگولیٹر والا بے کار فریج، بغیر سیاہی کے دواتیں اور قلمدان، میز کے درازوں میں کاغذات کے نیچے پھیلا ہوا چوہوں کا فضلہ، اور ہوٹل کے باہر یو۔ این۔ او بلڈنگ کے سامنے بیکار بیٹھے مدقوق بوڑھے حبشی، (جنہیں صحت مند اور صاف ستھری غذا نصیب نہیں، لہٰذا ان جیسے ہزاروں امریکی ہر سال تپ دق کا شکار ہو جاتے ہیں) اور ہٹے کٹے گورے امریکی فقیر (جو راہ چلتے اجنبیوں سے کبھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کر کے اور کبھی چاقو دکھا کر زبردستی بھیک حاصل کرتے ہیں) اور ان کی آوارہ، بدکار بیویاں، سب مِل جُل کر نیو یارک کی ایک جھلک دکھاتے ہیں، تو دوسری جھلک، فلک بوس، سو منزلہ عمارتوں، روشنی میں نہائی ہوئی گلیوں، کشادہ شاہراہوں اور کھاڑی میں پانی کی سطح سے دو فٹ اوپر بھاگتی ہوئی موٹر بوٹ میں نظر آتی ہے۔ یہ تضاد اس وقت اور بھی دردناک ہو جاتا ہے۔ جب مصنف بظاہر ایک مہنگے لیکن درحقیقت واہیات ہوٹل میں قیام پذیر ہونے، سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی اور سُوکھا ہوا پنیر زہر مار کرنے اور نل کی ٹونٹی سے ٹھنڈا پانی پینے کے باوجود، وطن میں اپنے دوست ریاض کو خط لکھتے ہوئے اُس کے سامنے اپنی موجودہ قابلِ رشک اور پُر تعیش زندگی کی جعلی تصویر کھینچتا ہے اور اسے بتاتا ہے کہ نیو یارک کی اپنی ایک فضا اور اپنی بُو باس ہے جو دُنیا کے کسی اور شہر میں نہیں ملتی۔ اپنے دوست پر رعب گانٹھنے کے لئے وُہ اسے لکھتا ہے کہ میں اِس وقت ہلٹن ہوٹل کی بار میں ایک کاک ٹیل پارٹی میں شریک ہوں جو مشہور امریکی رسالوں "ٹائم" اور "لائف" کے ڈائرکٹروں نے میرے اعزاز میں دی ہے۔ ہال کی مدھم روشنیوں میں دھوئیں کے مرغولے بل کھا رہے ہیں اور ساٹھ پیس کا آرکسٹرا بج رہا ہے۔ جب کبھی دروازے پر اطلس کا ریشمی چمکیلا پردہ ہٹتا ہے، تو سامنے بلند و بالا عمارتیں نظر آنے لگتی ہیں۔ دراصل نیو یارک اُونچی عمارتوں اور اونچے امیروں کا شہر ہے یوں لگتا ہے کہ اس خوابوں کے جزیرے میں ہر شخص کے ہاتھ میں الہ دین کا طلسمی چراغ ہے۔ چنانچہ وہ جو مانگتا ہے، اُسے مِل جاتا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مصنف جس وقت یہ سطور لکھ رہا ہے، عین اُسی وقت اُس کے ہوٹل کے کمرے میں، جہاں وہ قیام پذیر ہے، ایک بھوکا چوہا، اس کے

تھیلے میں پڑی سیاہ ڈبل روٹی اور سوکھے پنیر کی تلاش میں آیا ہے، جو مصنف کو اپنی طرف متوجہ دیکھ کر بھاگتا ہے اور میز کے نیچے چھپ جاتا ہے اور مصنف، اس کی دستبرد سے اپنی بچی کھچی خوراک بچانے کے لئے، تھیلا مضبوطی سے بند کر کے اُسے کھونٹی پر لٹکا دیتا ہے۔

"خوابوں کا جزیرہ" ایک مختصر سفرنامہ ہے اور اس میں کامل چابک دستی کے ساتھ نیویارک جیسے بڑے شہر کی جھلکیاں چھوٹی چھوٹی مؤثر تصاویر کی مدد سے دکھائی گئی ہیں۔ کہانی کردار نگاری اور مکالمہ نویسی کو گوندھنے کے لئے اس میں افسانوی ٹیکنیک استعمال کی گئی ہے جو اس کے حسن اور تاثیر میں اضافہ کا باعث بنی ہے۔ حقیقی واقعات، مشاہدات اور تجربات کو تھوڑے سے مبالغہ کے ساتھ اس طرح افسانوی سانچے میں ڈھالا گیا ہے کہ مختصر ہونے کے باوجود اس سفرنامے میں پورا نیویارک، بلکہ پورا امریکہ سمٹ آیا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۶۷ نیویارک: شمالی امریکہ کے مشرقی ساحل پر ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک مشہور ریاست اور اسی نام کا شہر۔ امریکہ کی سب سے بڑی بندرگاہ۔ ٹوکیو اور لندن کے بعد دُنیا کے شہروں میں سب سے بڑا شہر۔ کوئلے اور لوہے کی کثرت کی وجہ سے یہاں بکثرت کارخانے ہیں۔ عمارتوں کی بلندی کے لحاظ سے کوئی شہر اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ بعض عمارتیں سو سو منزل اُونچی ہیں جن میں لفٹ کے ذریعے اُوپر نیچے آتے جاتے ہیں۔ کیلی فورنیا: شمالی امریکہ کے مغربی ساحل پر واقع ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی ایک ریاست کا نام۔ نیویارک سٹی: یہاں مراد نیویارک کا شہر ہے (ریاست نہیں)۔ سان فرانسسکو: شمالی امریکہ کے مغربی ساحل پر واقع ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک مشہور شہر۔ بوئنگ طیارہ: ایک بڑا امریکی مسافر بردار ہوائی جہاز۔ منڈلانا: چکر لگانا۔ گرد پھرنا۔ کیپٹن: جہاز چلانے والا۔ لینڈ کرنا: زمین پر اُترنا۔ لینڈنگ کیو: اُترنے والے طیاروں کی قطار۔

ص ۱۶۸ ہستی: زندگی، وجود۔ ٹیکسی کرنا: جہاز کا زمین پر (رَن وے پر) اترنے کے بعد بتدریج آہستہ آہستہ چلنا۔ فلک بوس عمارتیں: بہت اونچی عمارتیں، جو گویا آسمان کو چھو رہی ہوں۔ آنکھ مچولی کھیلنا: بچوں کا ایک کھیل جس میں ایک بچہ آنکھیں بند کرتا ہے اور دوسرے چھپ جاتے ہیں، پھر وہ بچہ آنکھیں کھول کر چھپے ہوئے بچوں کو ڈھونڈتا ہے۔ یہاں عمارتوں کے آنکھ مچولی کھیلنے سے مراد یہ ہے کہ وہ کبھی چھپ جاتی تھیں اور کبھی نظر آنے لگتی تھیں۔ بریڈلاف: ایک شہر کا نام۔ آتش دان: لکڑیاں جلانے کی وہ جگہ جو کمرے کے اندر بنائی جاتی ہے، انگیٹھی۔

ادب: وہ تخیلی تحریریں جن میں بہترین موضوعات کو بہترین انداز میں پیش کیا گیا ہو۔ مثلاً داستان، ناول، افسانہ، ڈراما وغیرہ۔ تھیٹر: تماشا گاہ۔ ناٹک یا ڈراما دکھانے کی جگہ۔ فریج: ایک طرح کی برقی الماری جس میں رکھی جانے والی چیزیں ٹھنڈی رہتی ہیں۔ نمائندہ: قائم مقام۔ وہ فرد جو کسی جماعت کی ترجمانی کے لئے چُنا جائے۔ متصور کرنا: خیال کرنا۔ باسی: رہنے والی۔ تہذیب: کسی قوم کا نظامِ فکر و عمل، معاشرت اور مخصوص لوازماتِ زندگی، شائستگی و خوش اطواری اور ادب آداب کے طور طریقے۔ علمبردار: جھنڈا اُٹھانے والا۔ گرما گرمی: بحث مباحثہ میں زور شور اور جوش و خروش، تیزی۔ بھونڈا: بھدّا، بدنما اور بدصورت۔ صلح جُو: امن و اتفاق چاہنے والا۔ بھڑ بھڑ: جلتی ہوئی لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز۔ ایرپورٹ: ہوائی اڈا۔ نوٹس بورڈ: اعلانات چسپاں کرنے کے لئے تختہ۔ پسّو: ایک چھوٹا سا پَردار کیڑا جو اکثر مرطوب جگہوں میں ہوتا ہے۔ تلف کرنا: ضائع کرنا، ختم کرنا۔ حتی الوسع: جہاں تک ممکن ہو، جہاں تک ہو سکے۔

ص ۱۶۹ | بکس: صندوق۔ پورچ: آگے بڑھی ہوئی ڈیوڑھی یا برآمدہ جس کے نیچے کاریں اور بسیں ٹھہر سکیں۔ تعبیر: خواب کی حقیقت بیان کرنا۔ کوچ: آرام دہ سیٹوں والی بس۔ شفاف: صاف۔ اُجلے: صاف۔ بلا کی بھیڑ: بے پناہ ہجوم۔ طرح دار: خوبصورت، بانکپن رکھنے والا۔ میم: سفید رنگت والی مغربی عورت۔ نک سُک سے درست: سر سے پاؤں تک خوبصورت، ہر طرح سے ٹھیک ٹھاک، بنی سنوری، موزوں ناک نقشے والی، اصل لفظ نکھ سُکھ ہے۔ دہلی میں نکھ سُکھ بولتے ہیں اور لکھنؤ میں نکھ سکھ، نک سُک کے معنی ہیں سراپا، حلیہ۔ ہیروئن: فلم یا ڈرامے میں نسوانی مرکزی کردار۔ بھائیں بھائیں کرنا: غیر آباد ہونے کی وجہ سے خوفناک معلوم ہونا۔ ویرانی برسنا۔ سڑک کا سینہ کاٹنا: سڑک کو چیر کر آگے نکل جانا۔ بزنس مین: تاجر، کاروباری آدمی۔ ٹیپ ریکارڈر: وہ مشین جس میں ٹیپ پر آوازیں محفوظ کر لی جاتی ہیں۔ شیور: داڑھی مونڈنے کی برقی مشین یا آلہ۔ ہینڈ بیگ: چھوٹا سا دستی تھیلہ۔ ایئر ٹرمینل: ہوائی اڈہ یا ہوائی اڈے کی حد۔ ادھیڑ عمر: درمیانی عمر، نہ جوان نہ بوڑھا۔ بوسیدہ: پھٹی پرانی۔ برساتی: بارش سے بچاؤ والا کوٹ۔ میل سے چکٹ ہونا: سخت گندے ہونا، چکناہٹ اور مَیل کی جس پر تہیں جمی ہوئی ہوں۔ میزبان: مہمان کو اپنے ہاں آنے کی دعوت دینے والا۔ یہاں مراد ہے امریکی حکومت۔

ص ۱۷۰ | کھنکار کر: کھانس کر، بلغم صاف کرنے کے لئے کھانسنے کی آواز۔ ردِ عمل: جوابی عمل۔ سٹیرنگ: موٹر کار چلانے کا ہینڈل۔ کرخت: سخت۔ نوکیلی: نوک دار۔ برفیلی: برف کی طرح ٹھنڈی۔ کٹاریں مارنا: خنجر کی طرح چبھنا۔ میٹر: ٹیکسی میں نصب شدہ سفر کی پیمائش کا وہ آلہ جس میں فاصلہ طے کرتے وقت میلوں یا کلومیٹروں کے حساب سے رقم بنتی جاتی ہے۔ کھٹا کھٹ:

ایک آواز کے ساتھ فوراً دو سخت چیزوں کے ٹکرانے کی آواز۔ سینٹ: امریکہ کا ایک چھوٹا سکہ، ایک ڈالر میں سو سینٹ ہوتے ہیں۔ ڈالر: امریکی سکہ (نوٹ) جس کی قیمت آج کل تقریباً ۱۸ پاکستانی روپوں کے برابر ہے۔ دھک سے رہ جانا: حیران رہ جانا۔ بریکیں باندھنا: گاڑی روکنے کے لیئے بریک لگانا۔ پٹڑی: سڑک کے ساتھ اونچا کنارا۔ ریزگاری: روپے وغیرہ کا خوردہ یا چھوٹے سکے۔ بھان یا چینج۔ خوف زدگی: ڈر کر۔ مبادا: کہیں ایسا نہ ہو، خدا نہ کرے۔ ڈرٹی: گندی، غلیظ۔ صلواتیں: گالیاں۔ اصل کتاب ("سفر مینا") میں یہاں مصنّف نے "ڈرٹی سوائن" لکھا تھا جس کا مطلب ہے غلیظ، سؤر یا خنزیر، جو ایک گالی ہے۔ گردان شروع کرنا: کوئی بات بار بار کہنا۔ کاؤنٹر کلرک: وہ ملازم جو کاؤنٹر (لکڑی کا کٹہرا) پر کھڑا ہوتا ہے اور کمروں کی الاٹمنٹ اور حساب کتاب کا ذمے دار ہوتا ہے۔ کھلی باچھوں کے ساتھ: ہنس کر۔ خوش آمدید کہنا: استقبال کرنا۔ بکنگ: مخصوص کر لینا۔ سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ: ریاست ہائے متحدہ امریکہ کا امور خارجہ کا محکمہ۔ اوراق: ورق کی جمع۔

ص ۱۷۱ | سروس: خدمت۔ سڈکین: ۱۹۳۰ء میں امروہہ میں پیدا ہونے والا پاکستان کا مشہور مصوّر صادقین (جس کا نام یہاں بگاڑ کر لیا گیا ہے) نامی گرامی: مشہور۔ مصوّر: تصویریں بنانے والا۔ نفیس: عمدہ۔ اپنا پن: اپنائیت، ہمدردی، انس۔ باس: خوشبو۔ لندن: انگلستان (برطانیہ) کا دارالحکومت اور دُنیا کا مشہور ترین شہر۔ راشد صاحب: ن، م، راشد (اصل نام نذر محمد) جو جدید اردو شاعری کے بانیوں میں سے ہیں۔ وہ آزاد نظم کو باقاعدگی سے استعمال میں لانے والے پہلے شاعر ہیں۔ ۱۹۱۰ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۷۵ء میں فوت ہوئے۔ ان کے چار شعری مجموعے چھپ چکے ہیں یعنی "ماورا"، "ایران میں اجنبی"، "لا = انسان"، "گماں کا ممکن"۔ نیگرو: حبشی۔ لفٹ: بڑی عمارتوں میں اوپر نیچے لے جانے والا برقی ڈبہ۔ گیلری: برآمدہ، راہ داری۔ تپائی: تین پایوں والا چھوٹا میز۔

ص ۱۷۲ | بسم اللہ: اللہ کے نام کے ساتھ۔ ہنہنانا: گھوڑے کا آواز نکالنا۔ نتھنے: ناک کے سوراخ۔ کھٹ سے: دروازے کے بند ہونے کی آواز۔ پٹ بھڑا: دروازہ بند ہوا کشادہ: کھلا۔ روغن: رنگ۔ گرے رنگ: سلیٹی رنگ۔ دبیز: موٹے۔ قلم دان: قلم رکھنے کا آلہ۔ ایستادہ: کھڑا۔ روشنائی: سیاہی۔ دراز: میز کا خانہ۔ آلتی پالتی مار کر: چار زانو بیٹھنا۔ وہ مخصوص انداز جس میں کولہے زمین پر اور ٹانگیں ایک دوسری میں پھنسا کر بیٹھ جاتے ہیں۔ یہ بیٹھنے کا سب سے آرام دہ انداز ہے۔ پنیر: کھانے کی ایک چیز جو دہی سے پانی نکال کر بناتے ہیں۔ نانِ جویں: جَو کی روٹی۔ نعمتیں: خدا کی عطا کردہ چیزیں۔ زہر مار کرنا: بے دلی کے ساتھ کھانا۔

مجبور ہو کر کھانا۔ لفظی معنی، زہر کی طرح کھانا۔ ٹونٹی: وہ جگہ جہاں سے نل کا پانی نکلتا ہے اور اُسے حسب ضرورت کھولتے اور بند کرتے ہیں۔ کافی: ایک سیاہ رنگ کا تلخ گرم مشروب جو چائے یا قہوہ کی طرح پیا جاتا ہے اور ایک مخصوص پودے کے بیج پیس کر نسواری سفوف کی شکل میں تیار کیا جاتا ہے۔ بُقعۂ نُور: نور کا ٹکڑا، نور کی چار دیواری، جہاں نور اس طرح پھیلا ہو جیسے نور کا مکان بن گیا ہے۔ اڈا جمانا: مستقل بیٹھے رہنا۔ دھڑا دھڑ: تیزی سے، پَے درپے، لگاتار۔

ص ۱۷۳ | قہوہ خانے: وہ ہوٹل جن میں گرم مشروب قہوہ عام ملتا ہے۔ ریستوران: ہوٹل جہاں کھانا ملے۔ اشیائے خوردنی: کھانے پینے کی چیزیں۔ ٹرے: وہ مستطیل تھال یا برتن جس میں کھانے پینے کے برتن اور چیزیں رکھی جاتی ہیں۔ آٹومیٹک: خود کار، خود بخود کام کرنے والا، وہ کمرہ جس میں خود کار مشین لگی ہو، اس مشین میں سکہ ڈالا جاتا ہے تو مطلوبہ چیز (کافی یا چائے) برآمد ہونے لگتی ہے۔ شیرہ: گاڑھا میٹھا مشروب یا قوام۔ بھرم رہ جانا: عزت قائم رہنا، ساکھ باقی رہنا، یہاں مراد ہے، کھانا کھانے کی پھر حاجت نہ رہی۔ خوابوں کا جزیرہ: مراد ہے، نیویارک۔ گڑگڑاہٹ: کڑک یا گرج کی بھیانک آواز۔ ہڑبڑا کر: گھبرا کر، بے قرار ہو کر۔ مین ہٹن: نیویارک کا عظیم تجارتی مرکز جو دو دریاؤں میں گھرا ہوا علاقہ ہے اور ایک جزیرے کی مانند ہے۔ اس میں بڑی اونچی اونچی عمارتیں ہیں جن میں سے بعض کی سَو سے زائد منزلیں ہیں۔ فلک بوس: بہت اونچی عمارت، آسمان کو چھونے والی۔ رعشہ: ایک بیماری جس میں بدن یا ہاتھ پاؤں کانپتے اور تھرتھراتے رہتے ہیں۔ دھڑ پھڑ پھٹاک: کسی چیز کے ٹکرانے کی آواز۔ گھرر گھرر: کسی چیز کے چکی کی طرح مسلسل چلنے کی آواز۔ سوئچ: بجلی جلانے بجھانے کا بٹن۔ پلگ: وہ سوراخ جن میں بجلی کے تاروں کی مدد سے بجلی آتی ہے۔ ریگولیٹر: بجلی کو کنٹرول کرنے والا آلہ۔ کوزہ مصری: آب خورے کی شکل کا بنا ہوا مصری کا ڈلا؛ شکر یا قند کی قلمیں جو ڈورے کے ساتھ لپٹ جاتی ہیں۔ شاخِ نبات۔ کین اوپنر: بوتلوں اور ٹینوں کے ڈھکنے کھولنے والا اوزار۔ تعویز: لوحِ مزار، قبر کے سرہانے سنگ مرمر کا نصب شدہ ٹکڑا جس پر مرنے والے کا نام لکھا ہوتا ہے، قبر کا پتھر یا نشان: وہ پتھر جو قبر کے بیچ میں چبوترے کے اوپر رکھا جاتا ہے۔ ہچکاک: الفریڈ ہیچ کاک، امریکہ کا مشہور فلم ڈائریکٹر جس نے سَو سے زائد کامیاب ڈراؤنی اور نفسیاتی فلمیں بنا کر شہرت حاصل کی۔

ص ۱۷۴ | پائنتی: چار پائی یا پلنگ کا وہ حصہ جدھر ادوائن ہوتی ہے یا جدھر سوتے وقت پاؤں پھیلاتے ہیں۔ سیماب پا: پارے کی طرح حرکت کرنے والی یا تھرکنے والی۔ تُربت: قبر۔ بھیک مانگ رہا تھا: یہ ٹکڑا غلط درج ہوا ہے۔ اصل کتاب "سفر مینا"

میں اس طرح ہے۔ "اِدھر اُدھر پھُدک رہا تھا"۔ پھُدکنا کے معنی ہیں، مینڈک کی طرح اُچھلنا یا چھلانگ مارنا۔ محیّر العقول: عقل کو حیران کر دینے والے، حیرت انگیز۔ رونما: ظاہر۔ جمبو سائز: جمبو جیٹ (طیارے) کے حجم کا مراد ہے بہت بڑا۔ کھدیڑنا: دگیدنا، نوچنا، کوئی چیز باہر نکالنے کی کوشش کرنا۔ نانِ جویں: جَو کی روٹی۔ پنیر: دہی سے پانی نکال کر بنائی ہوئی کھانے کی ایک چیز۔ زقند: چھلانگ۔ پیڈ: خط لکھنے کے کاغذ کی کاپی جو اکثر اپنے نام کی چھپوائی جاتی ہے۔ اے وینیو (اے وی نیو): چوڑی سڑک جو عظیم الشان عمارتوں کے سامنے سے گزرتی ہے۔ کہکشاں: آسمان پر وہ سفید شاہراہ جو رات کے وقت غبار کی شکل میں دکھائی دیتی ہے۔ یہ در اصل اَن گِنت ستارے ہیں جو مل کر روشن ہوتے ہیں۔ اور اس طرح روشنی کا ایک راستہ سا بن جاتا ہے، جو اندھیری رات میں زیادہ نمایاں ہوتا ہے۔ اپنے ملک کے دونوں حصّے: مراد ہے مغربی اور مشرقی پاکستان۔ یہ سفرنامہ بھارتی جارحیت کی بدولت پاکستان کی تقسیم اور بنگلہ دیش (سابقہ مشرقی پاکستان) کے قیام (۱۹۷۱ء) سے پہلے لکھا گیا تھا۔ اس لئے ملک کے دونوں حصّوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ حسرت: آرزو۔ چاہ محبّت۔ برتری: اونچا ہونا، فوقیت، فضیلت۔ ہالی وُڈ: ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے مغربی ساحل کی ریاست کیلی فورنیا کے شہر لاس انجلیس کے قریب واقع امریکہ کا مشہور فلمی مرکز۔ شکاگو: ریاستہائے متحدہ امریکہ کا ایک اور مشہور صنعتی شہر جو ریاست اِلّی نوائس میں واقع ہے۔

استطاعت: مالی حیثیت۔ جملہ: کُل، ساری۔ ناز: فخر۔ سراہنا: تعریف کرنا۔ یو۔ این۔ او: یونائٹیڈ نیشنز آرگنائزیشن کا مخفّف یعنی مجلسِ اقوامِ متحدہ جو ۱۹۴۵ء میں قائم ہوئی اور جس کے صدر دفاتر نیو یارک میں ہیں۔ سیاسی مسائل کو افہام و تفہیم کے ذریعے حل کرنے کے لئے یہ بین الاقوامی تنظیم بنائی گئی۔ دُنیا کے تمام آزاد ممالک اس کے رکن ہیں لیکن قراردادوں کو مسترد کرنے کا حق دنیا کے صرف پانچ بڑے ممالک کو حاصل ہے (یعنی روس، امریکہ، برطانیہ، چین اور فرانس) یہ مجلس، جمعیتِ اقوام (لیگ آف نیشنز) جو ۱۹۱۹ء میں قائم ہوئی اور جس کا صدر مقام جنیوا تھا، کی ناکامی کے بعد قائم کی گئی، کیونکہ جمعیت اقوام دوسری جنگ عظیم کو روکنے میں ناکام ہو گئی تھی۔ "جمعیت اقوام" اور "مجلس اقوام متحدہ" کے قیام کے بڑے بڑے مقاصد یہ تھے۔ قیامِ امن، حصولِ عدل و انصاف، معاہدوں کا احترام اور بین الاقوامی اتحاد و تعاون کے لئے فضا ہموار کرنا۔ افسوسناک امر یہ ہے کہ اپنی پیش رو تنظیم کی طرح مجلسِ اقوام متحدہ بھی اپنے بنیادی مقاصد کے حصول میں ناکام ثابت ہوئی۔ یو۔ این۔ او بلڈنگ: مجلس اقوام متحدہ کی ۳۸ منزلہ عمارت۔

ص ۱۷۵ | برتری: فضیلت۔ عظمت: بڑائی۔ کیلنڈر: سالانہ تاریخوں کا نقشہ جو دنوں کے حساب سے مرتب کیا جاتا ہے۔ انکوائری: معلومات کے حصول کی جگہ یا دفتر۔ فلیٹ:

نمدے کی بنی ہوئی ایک خاص وضع کی انگریزی ٹوپی یا ہیٹ۔ برساتی: بارش سے کپڑوں کے بچاؤ کے لئے پہنا جانے والا کوٹ۔ کھونٹی: الگنی، کپڑے ٹانگنے کی ہک یا میخ۔ اسمبلی: یہاں مراد پنجاب اسمبلی کی عمارت ہے جو لاہور ریلیں چیئرنگ کراس کے پاس واقع ہے۔ آٹھ منزلہ عمارت: یہاں مراد غالباً واپڈا ہاؤس کی نئی خوبصورت عمارت ہے جو ان دنوں پنجاب اسمبلی کی عمارت کے پاس تازہ تازہ بن رہی تھی۔ "الفلاح" بلڈنگ اس کے بعد جا کر بنی۔ کھاڑی: پانی کا وہ تنگ حصہ جو دُور تک خشکی میں چلا جائے۔ شہر نیویارک کا محل وقوع ایسا ہے کہ اس کے ایک حصے میں ایک کھاڑی بن گئی ہے جس کے کنارے فلک بوس عمارتیں تعمیر کی گئی ہیں۔ باوجودیکہ: اس کے باوجود کہ۔ دریچے: کھڑکیاں۔

ص ۱۷۶ | نسیمِ سحری: صبح کی ٹھنڈی ٹھنڈی خوشگوار ہوا۔ مٹیالی: مٹی کے رنگ کی میلی یا خاکستری۔ دُخانی جہاز: بھاپ کے زور پر چلنے والا جہاز، دُخان کے معنی ہیں دھواں یا بخارات یا بھاپ۔ موٹر لانچ: وہ کشتی جو موٹر انجن (مشین) کے ذریعے چلتی ہے۔ سکتے میں آجانا: حیران رہ جانا۔ بے حس و حرکت ہو جانا۔ موٹر بوٹ: انجن سے چلنے والی کشتی۔ پلندہ: ڈھیر، بنڈل، مُٹھا، گٹھڑی۔ اِکا دُکا: کوئی کوئی، ایک آدھ۔ سستانا: تھوڑی دیر آرام کرنا۔ بینچ: لمبے تختے کے بیٹھنے کی تپائی جو سکولوں، باغوں اور پارکوں میں عموماً ہوتی ہے۔ نیگرو: حبشی، کالی نسل کا فرد۔ فیلٹ: نمدے کی ٹوپی۔ نیم دراز: آدھا لیٹا ہوا۔ شالا مار: مغل بادشاہوں کا بنایا ہوا لاہور کا ایک باغ جو اب تفریحی مقام ہے۔ وسیع و عریض: لمبے چوڑے۔ قطعہ ہائے سبز: گھاس کی کیاریاں۔ لُڈی ناچ: پنجاب کا ایک مقبولِ عام ناچ جس میں شرکاء زمین پر پاؤں مار کر اور ہاتھوں سے تالی بجا کر ایک دائرے کی شکل میں چکر لگاتے ہیں۔ شکر بھجی: بچوں کا ایک کھیل جو گھوڑی گھڑمس یا ہیٹلی اُتے بھی کہلاتا ہے اس میں ایک ٹولی کے بچے ایک دوسرے کی کمر پکڑ کر گھوڑیاں بن جاتے ہیں اور دوسری ٹولی کے بچے دوڑ کر باری باری ان پر سوار ہوتے ہیں، اگر سواروں کا پیر زمین پر لگ جائے یا وہ گر پڑیں تو گھوڑیاں سوار اور سوار گھوڑیاں بن جاتے ہیں۔ لفظی مفہوم ہے "شکر بھیگی کہ نہیں؟" سال خوردہ: بوڑھا۔ تڑاخ: تیزی سے۔

ص ۱۷۷ | بلغم: کھانسی کے ساتھ منہ سے خارج ہونے والا غلیظ مادہ۔ گھن کھانا: نفرت و کراہت ہونا۔ پلے کارڈ: چھوٹے چھوٹے اشتہار۔ تپِ دق: وہ مرض جس میں انسان کے پھیپھڑے خراب ہو جاتے ہیں۔ موذی: تکلیف دینے والا۔ ترغیب: رغبت دلانا، شوق پیدا کرنا۔ جُزدان: بستہ۔ سٹاپ: بس کے ٹھہرنے کی جگہ۔ احمق: بے وقوف۔ خندہ پیشانی: خوش دلی ہنس مکھ بن کر۔ ڈائم: دس سینٹ کا سکہ، ایک ڈالر کے دسویں حصے کے برابر۔

ص ۱۷۸ | میں نے کہا: "کیا مطلب؟"...... اس کے بعد درج ذیل چند مکالمے درج ہونے سے رہ گئے ہیں جن کے نہ ہونے سے مطلب خبط ہو گیا ہے۔ کہنے لگا: "ایک ڈائم خدا کے نام پر"۔ میں نے سُرخ و سپید چہرے پر، کلائی پر بندھی ہوئی گھڑی اور جسم پر درمیانے درجے کے سوٹ کو دیکھ کر ڈرتے ڈرتے پوچھا: "تم فقیر ہو؟" اُس نے سر کو ہلکے سے جھٹک کر جواب دیا: "یس سر"۔
سرگوشی: کانا پھوسی، کان میں کھسر پھسر کرنا۔ واہیات: فضول۔ گندے کام: اپنی عزت بیچنا، عصمت فروشی کرنا۔ جرأت: ہمت۔ خاراشگاف: پتھر میں شگاف ڈالنے والا (یعنی تیز چاقو)۔ بُوباس: خوشبو، مہک، رنگ ڈھنگ۔ ہلٹن: نیویارک میں واقع ایک اعلیٰ درجے کا مشہور ہوٹل۔ اس کی شاخیں دُنیا کے بڑے بڑے شہروں میں موجود ہیں۔ بار: ہوٹل کی شراب گاہ۔ کٹ گلاس: ایک قیمتی، نازک اور شفاف شیشہ۔ جام: شراب کا پیالہ۔ کاک ٹیل: ملی جلی شراب، کئی شرابوں کو ملا کر ایک نیا مشروب تیار کرنا۔ اعزاز: عزت افزائی۔ ٹائم اینڈ گفٹ: یہاں لفظ "گفٹ" غلطی سے درج ہو گیا ہے۔ اصل کتاب ("سفرِ مینا") میں "ٹائم اینڈ لائف" ہے۔ یہ دو مشہور امریکی رسالے ہیں، یعنی ہفت روزہ "ٹائم" (TIME) اور ماہنامہ "لائف" (LIFE) اور یہ ایک ہی انتظامیہ کے تحت نیویارک سے نکلتے ہیں۔ "ٹائم" بنیادی طور پر سیاسی ہفت روزہ ہے۔ تاہم اس میں آرٹ، بزنس، سینما، قانون، طب، موسیقی، مذہب، کھیلوں اور سائنس وغیرہ کے بارے میں تازہ ترین معلومات فراہم کی جاتی ہیں جب کہ ماہنامہ "لائف" نفیس کاغذ پر چھپنے والا باتصویر تفریحی اور معلوماتی رسالہ ہے اور اس میں عام لوگوں کی دلچسپی کے مضامین متعلقہ بڑی بڑی تصاویر سمیت شائع کئے جاتے ہیں۔ پوری دنیا میں یہ دونوں رسالے بہت مقبول ہیں۔ ڈائریکٹر: ناظم، رسالہ کے اشاعتی اور ادارتی امور کا نگران۔ مرغولے: گول گول چھلّے، دھوئیں کے دائرے یا محرابیں۔ ہالہ: دائرہ۔ ساتھ پلیس کا آرکسٹرا: مغربی موسیقی کے لئے سازندوں کا ایک بہت بڑا گروہ جو مل کر ایک تال پر مختلف قسم کے ساز بجاتا ہے۔ اطلسی پردہ: ریشمی پردہ۔ اطلس ایک قسم کے ریشمی چمکیلے کپڑے کو کہتے ہیں۔

ص ۱۷۹ | بلند و بالا: اونچے۔ کاخ و کو: محلات اور گلی کوچے، مراد ہے بڑی بڑی شاندار عمارتیں۔ امارت: دولتمندی، امیری۔ الٰہ دین کا چراغ: "الف لیلہ و لیلہ" (ایک ہزار ایک راتیں) عربی زبان کی مشہور طویل داستان ہے جو دراصل ایک ہزار ایک مختلف کہانیوں کا مجموعہ ہے، اس کتاب میں شامل ایک کہانی کا مرکزی کردار اٹھارہ سالہ الہ دین ہے جو چین کے شہر پیکن میں رہتا ہے، وہ غریب درزی کا بیٹا ہے اور دن رات آوارہ پھرتا رہتا ہے۔ ایک افریقی جادوگر کے بتانے پر ایک زیرِ زمین خزانے سے وہ طلسمی چراغ حاصل کر لیتا ہے جسے رگڑنے پر اس کا مؤکل جن حاضر ہوتا ہے اور وہ جن الہ دین کی تمام خواہشات فوراً پوری

کرتا ہے۔ اُسی چراغ کی مدد سے وہ اپنے لئے شاندار محل بنواتا ہے اور شاہِ چین کی بیٹی سے شادی کرتا ہے۔ بے باکانہ: بے خوف، نڈر ہو کر۔ ہڑبڑا کر: گھبرا کر، بدحواس ہو کر، بوکھلا کر۔ جست: چھلانگ۔ نانِ جویں: جو کی روٹی۔ پنیر: ایک کھانے کی چیز جو دہی میں سے پانی نکال کر بنائی جاتی ہے۔

سبق کا خلاصہ

ہوائی جہاز میں گلوریا اور میری آپس میں بحث و تکرار کر رہی تھیں۔ گلوریا، نیویارک میں رہتی تھی اور میری کا رہائشی شہر سان فرانسسکو تھا۔ دونوں اپنے اپنے شہر کو امریکی تہذیب کا نمائندہ قرار دیتی تھیں۔ مصنف (اشفاق احمد) جو ان کے ساتھ ہی طیارے میں سفر کر رہا تھا، ان کی گفتگو سے لطف اندوز ہونے لگا اور اُسے کچھ عرصہ پہلے بریڈلاف کی وہ بھیگی ہوئی سرد شام یاد آگئی جب گلوریا، میری اور مصنف تینوں، اپنی ایک اور دوست بیٹی کے کمرے میں بیٹھے، آتشدان میں لکڑیاں جلاتے، ادب اور تھیئٹر پر گفتگو کر رہے تھے اور فریج میں سے ٹھنڈے خربوزے نکال کر کھا رہے تھے۔ یہی بحث و مباحثہ اُس وقت بھی جاری تھا جب ان کا بوئنگ طیارہ نیویارک کے ہوائی اڈے پر اُترنے کی تیاری کر رہا تھا۔ جہاز کے کپتان کی اطلاع کے مطابق اُترنے کے لئے اپنی باری کا انتظار کرنے والے طیاروں میں ان کا نمبر ساتواں تھا۔ جب اُس نے زمین پر اپنے قدم رکھے تو مسافروں کی جان میں جان آئی۔ اشفاق احمد لکھتے ہیں کہ جب جہاز آہستہ آہستہ رینگتا ہوا اپنے ٹھہرنے کی جگہ پر پہنچ رہا تھا تو میں نے اس کے شیشوں میں سے نیویارک کی بلند و بالا عمارتوں کو ایک دوسری کے پیچھے چھپتے دیکھا۔ ہوائی اڈے کی عمارت کے بڑے ہال میں پہنچ کر جب ہم اپنے سامان کا انتظار کر رہے تھے۔ تو میری نظر سُرخ رنگ کے نوٹس بورڈ پر پڑی جس میں مسافروں کو اُن جاپانی پسوؤں سے ہوشیار رہنے کی تلقین کی گئی تھی جو جہاز میں مسافروں کے سامان اور ان کے کپڑوں سے چمٹ کر دور دراز کے علاقوں میں پہنچ جاتے ہیں۔ انتظامیہ نے انہیں تلف کرنے میں مسافروں سے مدد کی اپیل کی تھی۔ جب میرا صندوق آگیا تو مَیں نے اسے کندھے پر اُٹھا لیا اور بس پکڑنے کے لئے ہوائی اڈے کے پورچ میں چلا آیا۔

نیویارک میرے خوابوں کا جزیرہ تھا۔ مَیں نے لڑکپن میں اُس کے خواب دیکھے تھے اور اب یہی نیویارک میرے سامنے تھا۔ میرا خیال تھا کہ نیویارک بڑا صاف ستھرا شہر ہوگا۔ اس کی سڑکیں شفاف اور گھر اُجلے اُجلے ہوں گے۔ سڑکوں پر کاروں کی ریل پیل ہوگی۔ کوئی آدمی پیدل چلتا نظر نہیں آئے گا۔ ہر شخص خوبصورت سوٹ پہنے ہوگا اور ہر عورت بنی سنوری اور سراپا حسن ہوگی، جیسے کسی فلم کی ہیروئن ہوتی ہے۔ لیکن نیویارک نے مجھے سخت مایوس کیا۔ بس میں سوار

ہم میں سے بیشتر مسافر شہر کا نظارہ کر رہے تھے، البتہ ایک تاجر وقت بچانے کے لئے گود میں سفری ٹیپ ریکارڈر رکھے کاروباری خطوط ریکارڈ کر رہا تھا جب کہ دوسرا مسافر بجلی کے شیور سے اپنی داڑھی مونڈ رہا تھا۔ ایک عورت ہینڈ بیگ کے آئینے میں مسلسل اپنی صورت دیکھ رہی تھی۔ اور میں اُسے اس عمل میں مصروف دیکھ رہا تھا۔

ہوائی اڈے کی حدود کے باہر میں جس ٹیکسی میں بیٹھا، اُس کا ڈرائیور چھ فٹ سے اونچا ایک دُبلا پتلا اُدھیڑ عمر آدمی تھا جس نے ایک پھٹی پرانی برساتی پہن رکھی تھی اور جس کی ٹوپی میلی چکٹ تھی۔ اُس کے یہ دریافت کرنے پر کہ میں کہاں جانا چاہتا ہوں، میں نے اپنے کوٹ کی جیب سے امریکی حکومت کا دعوت نامہ نکال کر اُسے دکھایا جس پر میرے قیام والے ہوٹل کا نام اور پتا درج تھا۔ ٹیکسی جب ہوٹل کے دروازے پر آکر رُکی تو کرایہ تین ڈالر سے کچھ اُوپر تھا، لہٰذا میں نے ڈرائیور کو چار ڈالر دیئے۔

ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا اور یہ بتانے پر کہ میرے لئے یہاں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ نے ایک کمرہ بُک کرایا ہے، اُس نے اپنے رجسٹر سے اُس کی تصدیق کی اور بتایا کہ مجھے کمرہ ۵۱۳ دیا گیا ہے۔ میرے یہ بتانے پر کہ میں پاکستان کا رہنے والا ہوں، وہ بڑا خوش ہوا اور اس نے پاکستان کو ایک بڑا ملک اور امریکہ کا دوست قرار دیا اور یہ بھی بتایا کہ پاکستان کا مشہور مصوّر صادقین بھی دو ماہ تک اُن کے ہوٹل میں ٹھہر چکا ہے۔ اس نے صادقین کی بھی بہت تعریف کی اور اس کے لمبے بالوں کا ذکر کر کے اپنی واقفیت کا ثبوت بہم پہنچایا۔ یہ سُن کر مجھے اس ہوٹل سے اپنائیت کا احساس ہوا لیکن صادقین ان دنوں اس ہوٹل کو چھوڑ کر لندن جا چکا تھا، اس لئے سوائے مشہور شاعر، ن، م، راشد کے اب نیو یارک میں میرا اور کوئی واقف کار نہ تھا۔ کاؤنٹر کلرک سے چابی لے کر اور ایک حبشی ملازم کے ہاتھ میں صندوق دے کر میں اپنے کمرے میں پہنچا۔ ملازم کو پچاس سینٹ بطور ٹِپ دیئے اور کمرے کا جائزہ لینے لگا۔

اس کمرے کا روزانہ کرایہ آٹھ ڈالر تھا اور یہ خاصا سستا تھا۔ کمرہ کھلا اور ہوا دار تھا۔ دیواروں پر رنگ و روغن پھرا تھا، پردے لٹک رہے تھے، پلنگ کے سرہانے ایک تپائی پڑی تھی جس پر پرانی وضع کا ٹیلی فون دھرا تھا۔ ایک کونے میں فریج پڑا تھا۔ لکھنے کی میز پر قلم دان میں نیلے اور سُرخ رنگ کے دو قلم کھڑے تھے لیکن دواتوں میں سیاہی نہ تھی۔ میز کی دراز میں ہوٹل کے چھپے ہوئے کاغذ اور لفافے تھے اور ان کے نیچے چوہے کا فضلہ چھوٹے چھوٹے بیجوں کی مانند بکھرا پڑا تھا۔ میں نے منہ ہاتھ دھو کر اپنے تھیلے سے پنیر اور سیاہ رنگ کی ڈبل روٹی نکالی۔ دونوں چیزیں بمشکل حلق سے نیچے اتاریں، ٹونٹی کا ٹھنڈا پانی پیا اور نیچے کافی

پینے چلا گیا۔

ہوٹل کے پہلو میں انیسویں گلی روشنیوں سے جگمگا رہی تھی۔ کاریں تیز تیز ہارن بجاتے ہوئے گزر رہی تھیں اور سڑک کے فٹ پاتھ پر جوتے پالش کرنے والے اپنے اڈے لگائے بیٹھے تھے۔ شام کے اخبارات بک رہے تھے۔ ہوٹلوں اور قہوہ خانوں میں لوگ اپنی اپنی کھانے کی ٹرے اٹھائے خالی میزیں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے ایک کمرے میں داخل ہو کر خودکار مشین سے سیاہ کافی کی ایک پیالی لی اور اس میں چینی کے آٹھ چمچے ڈال کر شیرہ کی شکل میں پی گیا۔ اس سے تھکاوٹ بھی قدرے کم ہو گئی اور رات کے کھانے کی بھی حاجت نہ رہی۔

جب آدھی رات گزری تو اچانک گڑگڑاہٹ کی آواز سن کر میری آنکھ کھل گئی، مجھے یوں لگا جیسے نیویارک کے مشہور تجارتی مرکز مین ہٹن میں زلزلہ آگیا ہے اور بلند و بالا عمارتیں ایک دوسری کے ساتھ ٹکرا گئی ہیں۔ میں خوف کی وجہ سے کانپنے لگا اور اس کے ساتھ ہی میرا پلنگ بھی لرزنے لگا۔ پھر کمرے سے طرح طرح کی آوازیں آنے لگیں۔ کونے میں پڑا ہوا فریج بھی بلند آواز پیدا کر رہا تھا اور میں نے جب اسے بند کرنے کی کوشش کی تو اس کا بٹن نظر نہ آیا۔ بھاری ہونے کی وجہ سے اسے ہلانا بھی ممکن نہیں تھا اور اندر اس کا ریگولیٹر بھی خراب تھا۔ میں نے فریج کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا، فریج خالی تھا، البتہ اس کے خانوں میں برف جمی ہوئی تھی اور اس برف میں کسی بوتل کے دو ڈھکنے پھنسے ہوئے تھے، جن کے نیچے برف میں غالباً کین اوپنر دفن تھا جس کا ایک بازو برف میں سے باہر نظر آرہا تھا اور ہچ کاک کی کسی ڈرائونی فلم کا منظر پیش کر رہا تھا۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد میری دوبارہ آنکھ لگ گئی۔

تقریباً ایک گھنٹہ بعد پھر مجھے محسوس ہوا جیسے میرے پلنگ کی پائنتی کوئی چیز بھاگ رہی ہے۔ غور سے دیکھا تو وہ ایک موٹا تازہ چوہا تھا جو میرے تھیلے میں سے ڈبل روٹی اور پنیر نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے مجھے جاگتا دیکھا تو چھلانگ لگا کر غائب ہو گیا۔ اس وقت مجھے میز کی درازوں میں ہوٹل کے چھپے ہوئے پیڈوں اور لفافوں میں کالے بیجوں کی مانند اس کا فضلہ پڑا ہوا یاد آیا اور تب یہ راز کھلا کہ فریج کے اندر جسے میں کین اوپنر سمجھا تھا، وہ دراصل یہی جمبو جیٹ سائز چوہا تھا جو برف پگھلنے کے بعد فریج میں ادھر ادھر پھدک رہا تھا اور کمرے میں طرح طرح کی آوازیں پیدا کرنے کا موجب تھا۔

اگلے روز میں اپنے ہوٹل سے نکلا اور پانچویں ایوینیو (بلند و بالا عمارتوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی کشادہ سڑک) پر یوں چلنے لگا جیسے میرے قدموں کے نیچے کہکشاں بچھی ہوئی ہو۔ مجھے یوں لگا جیسے میرے ہم وطن ملک کے دونوں حصوں (مغربی اور مشرقی پاکستان) میں کھڑے مجھے رشک

بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ مجھے واضح طور پر اپنی برتری کا احساس ہونے لگا اور ان لوگوں پر ترس آنے لگا جنہوں نے ابھی تک امریکہ نہیں دیکھا تھا یا صرف فلموں میں اس کے چند مشہور شہر مثلاً ہالی وُڈ، شکاگو اور نیویارک دیکھے تھے۔ ان میں بعض تو ایسے تھے جو کراچی تک نہیں پہنچ سکے تھے۔ اپنی خوش نصیبی پر فخر کرتے ہوئے میں نے یو، این، او بلڈنگ (مجلس اقوام متحدہ کے دفاتر) کا رُخ کیا، جہاں میں اُردو کے مشہور شاعر ن، م، راشد سے ملنا چاہتا تھا۔

یو۔ این۔ او کی شاندار عمارت دیکھ کر خوشی کے مارے میری چیخ نکل گئی۔ جن لوگوں نے اس عمارت کی تصویر صرف ڈاک کے ٹکٹوں، کیلنڈروں اور ہوائی کمپنیوں کے اشتہارات پر دیکھی ہے وہ اس کی عظمت کا اندازہ نہیں لگا سکتے۔ انکوائری آفس سے ن، م، راشد کا پتہ پوچھ کر میں لفٹ کے ذریعے اکیسویں منزل پر پہنچ گیا۔

راشد صاحب اپنے کمرے میں فائلوں پر جھکے کام کر رہے تھے۔ اُن کی فیلٹ کونے میں میز پر پڑی تھی اور برساتی کھونٹی سے لٹک رہی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی خیر مقدم کے لئے اُٹھے اور پوچھا کہ کیا تمہیں نیو یارک پسند آیا؟ میرے ہاں میں جواب دینے پر لاہور کا حال پوچھا اور جب میں نے یہ بتایا کہ پنجاب اسمبلی کی عمارت کے پہلو میں ایک آٹھ منزلہ عمارت (واپڈا ہاؤس) بن رہی ہے تو انہوں نے بے ساختہ قہقہہ لگایا اور طنزاً بولے کہ ہمارا شہر تو بہت ترقی کر رہا ہے۔ نیویارک کی سَو منزلہ عمارات کے مقابلے میں آٹھ منزلہ عمارت کی کیا حیثیت تھی؟ راشد صاحب کے کمرے کی کھڑکیوں سے باہر سمندری کھاڑی کا نیلا پانی نظر آرہا تھا اور ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا اندر آ رہی تھی۔ میں شیشوں میں سے باہر دیکھنے لگا۔

میرے سامنے دُور تک مٹیالی عمارتیں پھیلی تھیں اور دخانی جہاز دھواں چھوڑتے گزر رہے تھے۔ اچانک راشد صاحب نے میری توجہ ایک موٹر لانچ کی طرف مبذول کی، جو بڑی تیزی کے ساتھ پانی کی سطح سے دو فٹ اونچا تیرتی چلی جا رہی تھی۔ میں یہ ایجاد دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس کے بعد اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں اور جب راشد صاحب کے پاس تازہ ڈاک کا پلندہ آگیا تو مَیں اگلے دن ملنے کا وعدہ کرکے نیچے اُتر آیا۔

یو۔ این۔ او کی عمارت کے سامنے سڑک پر لکڑی کے بنچوں پر گنتی کے چند آدمی فارغ بیٹھے تھے۔ میں بھی تھوڑی دیر آرام کرنے کے لئے ایک خالی بنچ پر جا بیٹھا۔ اس کے دوسرے کونے پر ایک بوڑھا حبشی، چہرے پر فیلٹ رکھے، اور ہاتھ گود میں دھرے کچھ بیٹھا اور کچھ لیٹا ہوا تھا۔ مَیں نے تھیلے میں سے اپنی بیوی کا خط نکالا اور بچوں کی رنگین تصویریں دیکھنے لگا جو انہوں نے میری غیر حاضری میں شالامار باغ جا کر کھنچوائی تھی۔ ان تصاویر میں میرے اور میرے

بھائی کے بچے کھیل رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد بوڑھے حبشی کو کھانسی آئی تو اس کے بلغم بھرے تھوک میں سیاہی مائل خون کا دھبہ تھا، جو اس کے دِق زدہ ہونے کی نشان دہی کر رہا تھا۔ مَیں نے اپنا تھیلا اٹھایا اور سامنے آ کر رُکنے والی بس پر سوار ہو گیا۔

بس کے اندر محکمہ تعلقاتِ عامہ کی طرف سے جاری کردہ اشتہارات میں امریکیوں کو صاف ستھری غذا کھانے اور تپ دِق سے محفوظ رہنے کی تلقین کی گئی تھی کیوں کہ اس مرض سے ہر سال ہزاروں امریکی مر رہے تھے۔ اشتہارات میں ہر امریکی کو تلقین کی گئی تھی کہ وہ خود بھی حفاظتی ٹیکہ لگوائے اور دوسروں کو لگوانے کی ترغیب بھی دے۔ ایک اور اشتہار میں ایک ننھا مُنا بچہ بستہ لٹکائے اسکول جاتا دکھایا گیا تھا اور نیچے لکھا تھا کہ اسے دودھ اور تازہ پھلوں کی ضرورت ہے۔ اس اشتہار میں بھی بچوں کی غذائی ضروریات کا خیال رکھنے اور امریکہ کو صحت مند بنانے کی اپیل کی گئی تھی۔

مَیں بس پر سوار ہو کر اپنے ہوٹل آنا چاہتا تھا جو انیسویں گلی میں واقع تھا لیکن بس کا روٹ مختلف تھا، اس لئے اگلے سٹاپ پر اُتر گیا اور راستہ بھولنے کی وجہ سے گھبرا گیا اتنے میں مجھے ایک آدمی نے قریب آ کر سلام کیا اور مسکرا کر میرے کان میں آہستہ سے کہا کہ ایک ڈائم دیجئے۔ میں نے اس کی وضع قطع دیکھ کر اُس سے پوچھا کہ کیا تم فقیر ہو؟ اس پر اُس نے کام نہ کرنے کا یہ عذر بتایا کہ اُسے کام کرنا پسند نہیں۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ کیا اس کی بیوی بھی کام نہیں کرتی؟ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ کر جواب دیا کہ کام تو کرتی ہے لیکن وہ اچھا کام نہیں ہے۔ اس کے بعد پھر اس نے ایک ڈائم کا مطالبہ کیا۔ میں نے فوراً اسے ڈائم دے دیا۔ کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ اگر میں نے اُسے خیرات نہ دی تو وہ میرے پیٹ میں چاقو اتار دے گا۔

رات کے گیارہ بجے میں نے اپنا تھیلا کھولا۔ اس میں سے لیٹر پیڈ نکال کر اور میز پر ٹھنڈے پانی کا ایک گلاس رکھ کر اپنے دوست ریاض کو خط لکھنے لگا جس میں مَیں نے نیویارک کی بڑی رومانوی تصویر کھینچی۔ میں نے اُسے بتایا کہ نیویارک کی اپنی دلکش فضا اور اپنی مخصوص خوشبو ہے جو کہیں اور نہیں ملتی۔ میں نے گپ مارتے ہوئے اس پر رعب جمانے کی خاطر لکھا کہ میں اس وقت نیویارک کے سب سے مہنگے ہوٹل ہلٹن کے شراب خانے میں بیٹھا شراب پی رہا ہوں اور تمہیں یاد کر رہا ہوں۔ یہ کاک ٹیل پارٹی، میرے اعزاز میں امریکہ کے مشہور رسالوں "ٹائم" اور "لائف" کے ڈائریکٹر نے دی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ہال کی مدھم روشنیوں میں سگریٹ کا دھواں بل کھا رہا ہے اور نیویارک شہر کی خوشبو ہوٹل کے اندر بھی موجود ہے۔ میرے سامنے ساٹھ پیس کا آرکسٹرا بج رہا ہے۔ جب بھی دروازے کا ریشمی پردہ سرکتا ہے تو باہر کی حسین اور بلند و بالا عمارات نظر آنے

لگتی ہیں۔ نیو یارک میں نہ صرف عظیم الشان عمارتیں ہیں، بلکہ دُنیا کے امیر ترین افراد بھی یہیں ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے یہاں کے ہر باشندے کے پاس الہ دین کا چراغ ہے، چنانچہ وہ جو مانگتا ہے اُسے مل جاتا ہے۔ ابھی مَیں نے اتنا ہی لکھا تھا کہ کل رات والا چوہا پھر میز کے نیچے سے نکل کر میرے پلنگ کے پاس گھومنے لگا۔ مجھے پتہ تھا کہ وہ پھر تھیلے میں پڑے میرے پنیر اور سوکھی سیاہ ڈبل روٹی کی تلاش میں آیا ہے۔ چنانچہ جونہی میں نے اس کی طرف دیکھا، وہ گھبرا کر بھاگا اور چھلانگ لگا کر میز کے نیچے چھُپ گیا۔ میں نے بڑی احتیاط کے ساتھ اپنا تھیلا بند کیا اور کھونٹی پر لٹکا دیا۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی بحوالہ متن سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

اگلے دن صبح سویرے پانچویں اے وی نیو پر چلتے ہوئے میرے قدم پٹڑی پر یوں پڑ رہے تھے، جیسے میں کہکشاں پر چلا جا رہا ہوں اور میرے ہم وطن، اپنے ملک کے دونوں حصّوں میں، نیچے کھڑے مجھے حسرت اور چاہ کی نظروں سے دیکھ رہے ہوں۔ اپنی برتری کا احساس مجھے اوپر ہی اوپر لے جا رہا تھا اور ان لوگوں پر مجھے مسلسل ترس آ رہا تھا جنہوں نے امریکہ نہیں دیکھا اور ان لوگوں سے میری ہمدردی بڑھتی جا رہی تھی، جنہوں نے فلموں میں ہالی ووڈ، شکاگو اور نیو یارک کو دیکھا تھا اور ان کی کراچی تک پہنچنے کی بھی استطاعت نہیں تھی۔ اپنی جملہ صلاحیتوں پر ناز کرتا اور اپنی خوبیوں کو سراہتا، مَیں ناک کی سیدھ "یو، این، او بلڈنگ" کی طرف چلا جا رہا تھا۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت اشفاق احمد کے مضمون "خوابوں کا جزیرہ" میں سے لی گئی ہے جو نیو یارک کے بارے میں مصنّف کے تأثرات پر مبنی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنّف نے گلوریا اور میری کے ہمراہ، بذریعہ ہوائی جہاز، نیو یارک پہنچنے اور اس ہوٹل میں پہنچنے کا ذکر کیا ہے۔ یہاں سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی طرف سے اس کے لئے کمرہ بک کیا گیا تھا۔ اس نے نیو یارک کی مصروف زندگی، نچلے طبقے کی خراب حالت، شہر کے درمیان طویل مسافت، ٹیکسی ڈرائیوروں کی عادات و اطوار اور ہوٹلوں کے عملے کے مصنوعی اخلاق اور لازمی بخشش کا ذکر کیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا ہے کہ گلوریا، نیو یارک کو اور میری، سان فرانسسکو کو امریکی تہذیب و ثقافت کا نمائندہ قرار دیتی تھی۔ مصنّف کے لئے بھی نیو یارک خوابوں کا جزیرہ تھا اور اب یہ اس کے سامنے تھا۔ ہوٹل کے کاؤنٹر کلرک کی زبانی اُسے معلوم ہوا کہ صادقین (مشہور مصوّر) بھی اس ہوٹل میں قیام کر چکا ہے لیکن ان دنوں وہ لندن جا چکا تھا، اس لئے نیو یارک میں ن، م، راشد کے سوا اس کا اور واقف کار نہ تھا

چنانچہ اگلے روز انہیں ملنے کا ارادہ کر کے اس نے اپنے کمرے کا رُخ کیا۔ اس کے بعد مصنّف نے پہلے تو کمرے کا نقشہ کھینچا ہے۔ پھر سوکھی سیاہ ڈبل روٹی اور پنیر کھا کر اور کافی کا ایک کپ پی کر رات کا کھانا بچانے کا ذکر کیا ہے اور اس کے بعد رات بھر کمرے میں ہونے والی کھڑ کھڑاہٹ (جو دراصل چوہے کی وجہ سے تھی) اور اس کی وجہ سے اپنے ڈر اور خوف محسوس کرنے اور بعد ازاں سونے کا ذکر کیا ہے۔

اس عبارت کے بعد مصنّف نے ن، م، راشد سے یو، این، او، بلڈنگ میں اپنی ملاقات کی تفصیل بتائی ہے۔ نیویارک کی سو منزلہ عمارتوں کے مقابلے میں، لاہور میں بننے والی آٹھ منزلہ نئی عمارت کے بارے میں راشد صاحب کو آگاہ کیا ہے اور راشد صاحب کے کمرے کی کھڑکی سے سمندر کی کھاڑی میں پانی کی سطح سے دو دو فٹ اوپر تیرنے والی موٹر بوٹ دیکھ کر نیویارک کی ترقی کا اندازہ لگایا ہے۔

راشد صاحب کے دفتر سے واپس لوٹنے کے بعد یو، این، او، بلڈنگ کے سامنے بنچ پر بیٹھے ہوئے ایک مدقوق حبشی سے ملاقات اور بعد ازاں ایک امریکی خوش پوش فقیر کی طرف سے ایک ڈائم کا سکّہ بطور خیرات مانگنے کا ذکر کیا ہے۔ آخر میں مصنّف نے اپنے ہوٹل پہنچ کر اپنے دوست ریاض کو خط لکھنے اور اس میں مبالغہ انگیز پیرائے میں نیویارک کی خوبصورتی اور اپنے خیالی عیش و آرام کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔

تشریح مصنّف لکھتا ہے کہ دوسرے روز صبح کے وقت میں نیویارک کے پانچویں اے وی نیو (جو ایک کشادہ سڑک کا نام ہے) کے فٹ پاتھ پر اس طرح فخر سے چل رہا تھا جیسے میں آسماں کی دُودھیا شاہراہ یعنی کہکشاں پر ہوں۔ مجھے یوں لگا جیسے پاکستان کے دونوں بازوؤں (مغربی اور مشرقی پاکستان) کے لوگ مجھے بڑی حسرت اور رشک کی نظروں سے دیکھ رہے ہیں کیونکہ ان میں سے ہر ایک کی خواہش تھی کہ وہ بھی امریکہ جا سکے۔ مَیں نے خود کو اُن سے بہت برتر اور بلند محسوس کیا اور اس احساس نے مجھے آسمان پر پہنچا دیا۔ مجھے ان لوگوں پر رحم آنے لگا جنہوں نے آج تک امریکہ نہیں دیکھا تھا اور ان لوگوں کے ساتھ تو خاص طور پر ہمدردی ہوئی، جنہوں نے، خواہش رکھنے کے باوجود، صرف فلم کے پردے پر امریکہ کے مشہور شہروں یعنی ہالی ووڈ، شکاگو اور نیویارک کو دیکھا تھا کیوں کہ ان کی مالی حالت اتنی کمزور تھی کہ وہ کراچی تک کا سفر نہیں کر سکتے تھے، کجا یہ کہ امریکہ پہنچ سکیں۔ مجھے اپنی خوش قسمتی، اعلیٰ صلاحیتوں اور خوبیوں پر بے حد فخر محسوس ہوا اور مَیں نے بغیر اِدھر اُدھر مُڑے، سیدھا مجلسِ اقوام متحدہ کے صدر دفاتر کا رُخ کیا جو یو، این، او، کی عمارت میں واقع تھے۔

احمد شاہ بخاری (پطرس)
(۱۸۹۸ء-۱۹۵۸ء)

لاہور کا جغرافیہ
تعارف اور پس منظر

"لاہور کا جغرافیہ" احمد شاہ بخاری (قلمی نام پطرس) کی کتاب "پطرس کے مضامین" میں سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب پہلی دفعہ ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی اور یہ مصنّف کے گیارہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل ہے۔ "لاہور کا جغرافیہ" ایک پیروڈی ہے اور پیروڈی یا تحریف نگاری، کسی مضمون، کتاب یا کلام کی ایسی لفظی نقّالی کو کہتے ہیں، جس سے اصل تحریر مضحکہ خیز معلوم ہونے لگے اور پڑھنے والے کو لطف آئے۔ "لاہور کا جغرافیہ" لکھتے وقت مصنف کے پیشِ نظر جغرافیہ کی وہ خشک درسی کتابیں تھیں، جو اس زمانے میں سکولوں میں طلباء کو پڑھائی جاتی تھیں اور جن میں کسی ملک کے جغرافیائی حالات بیان کرتے وقت اس کے حدودِ اربعہ، محلِ وقوع، ذرائع رسل و رسائل، آب و ہوا، صنعت و حرفت، پیداوار اور باشندوں وغیرہ کے بارے میں چیدہ چیدہ معلومات فراہم کی جاتی تھیں۔ پطرس نے ان کتابوں کی زبان اور اسلوبِ بیان کا خوب مضحکہ اڑایا ہے اور لاہور اور اہلِ لاہور کے بارے میں اپنے دلچسپ مشاہدات و تجربات کو قارئین تک پہنچانے کے لئے جغرافیہ کی کتابوں کے اس اندازِ تحریر کو فنکارانہ طور پر استعمال کیا ہے۔ یوں "لاہور کا جغرافیہ" ایک ایسے شگفتہ مضمون کی شکل میں ہمارے سامنے آتا ہے، جس میں طنز کی تلخی کم سے کم اور مزاح کی چاشنی زیادہ سے زیادہ ہے۔ مزاح، موضوع کے ساتھ جس ہمدردی کا تقاضا کرتا ہے، وہ بھی اس مضمون میں موجود ہے، اور طنز، معاشرے کی ناہمواریوں کو نشانہ بنا کر جس طرح اس کی اصلاح کرتی ہے، اس سے بھی صرفِ نظر نہیں کیا گیا۔

"لاہور کا جغرافیہ" میں مصنّف نے بڑے لطیف اور شگفتہ انداز میں لاہور کے محلِ وقوع، حدودِ اربعہ، آب و ہوا، ذرائع آمد و رفت، قابلِ دید مقامات، صنعت و حرفت اور پیداوار کی تفصیلات فراہم کی ہیں۔ لاہور کے محلِ وقوع کے بارے میں وہ کرۂ ارض کے طول البلد اور عرض البلد کے چکر میں نہیں پڑتا بلکہ لاہور، لاہور ہے، کہہ کر بات ختم کر دیتا ہے۔ اور اگر کوئی مزید معلومات کا خواہاں ہو تو اسے فاتر العقل قرار دیتا ہے۔ لاہور کے قریب سے بہنے والے دریائے راوی کو وہ آدھا دریا کہتا

کہتا ہے اور وہ بھی ایسا کاہل کہ پلوں کے نیچے ریت میں لیٹا رہتا ہے اور بہنا اس نے ترک کر رکھا ہے۔ یہاں اس کا اشارہ بوڑھے راوی کی طرف ہے جو اب پرانی گزرگاہ پر ایک نالے کی شکل اختیار کر گیا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے لاہور کی بڑھتی ہوئی آبادی پر طنز کیا ہے اور لاہور کا حدود اربعہ بیان کرتے وقت یہ دلچسپ بیان دیا ہے کہ اب لاہور کا حدود اربعہ منسوخ ہو چکا ہے کیونکہ طلباء کو اسے یاد رکھنے میں دقت ہوتی تھی۔ اصل وجہ یہ ہے اب لاہور چاروں طرف پھیل رہا ہے اور روز بروز اس کی حدود بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ مصنف کہتا ہے کہ لاہور اب پنجاب کا صدر مقام ہے لیکن اگر اس کی روز افزوں آبادی کا یہی حال رہا تو ایک دن یہ شہر پھیل کر صوبہ پنجاب کی جگہ لے لے گا اور صوبہ پنجاب سمٹ کر لاہور کی جگہ آ جائے گا۔ آب و ہوا کے ضمن میں اس نے میونسپل کمیٹی کی کارکردگی پر خوب چوٹیں کی ہیں جو شہریوں کو پینے کا پانی فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے اور اب نلوں میں سے پانی کی جگہ ہوا نکلتی ہے، بلکہ آکسیجن اور ہائیڈروجن گیس، جن سے مل کر پانی بنا کرتا ہے۔ اسی طرح خالص اور صاف ہوا بھی اب لاہور کے شہریوں کو میسّر نہیں کیوں کہ اس میں ہر دم اڑتی ہوئی گرد اور موٹروں کے غلیظ دھوئیں نے شامل ہو کر شہریوں کیلئے صحت کے مسائل پیدا کر دیئے ہیں میونسپل کمیٹی بہم رسانی آب میں ناکام ہو کر جس طرح نئی نئی اسکیمیں بناتی ہے، اس کا بھی مصنف نے اس مضمون میں خوب مضحکہ اڑایا ہے۔ پینے کا پانی تو ملتا نہیں لیکن بارش کا پانی کوچہ و بازار میں جمع ہو جاتا ہے، مصنف نے کہا ہے کہ اگر بارش کے پانی کی نکاسی کا یہی ناقص انتظام رہا تو ایک دن ہر محلے کا اپنا دریا ہوگا جس میں مچھلیاں تیرا کریں گی۔ ذرائع آمد و رفت کے ضمن میں مصنف نے لاہور کی سڑکوں اور پرانی طرز کے ٹانگوں کی خوب خبر لی ہے میونسپل کمیٹی کی ناقص کارکردگی کی وجہ سے سڑکیں ٹوٹ پھوٹ گئی ہیں اور ان کی مرمت کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا جاتا۔ اسی طرح لاہور میں چلنے والے ٹانگے بھی سواریوں اور تماشائیوں کے لئے عبرت کا سامان مہیا کرتے ہیں کیونکہ ایک تو ان میں مریل گھوڑے جوتے جاتے ہیں اور دوسرے گڑھوں اور خندقوں کو عبور کرتے وقت ہر لمحہ یہ خطرہ رہتا ہے کہ کہیں گھوڑے کے پاؤں پھسل نہ جائیں اور سواریاں نیچے نہ آ رہیں۔ قابلِ دید مقامات کے ضمن میں مصنف نے اپنا یہ دلچسپ مشاہدہ رقم کیا ہے کہ کوئی عمارت بھی اپنی اصلی شکل میں نظر نہیں آتی کیوں کہ ہر دیوار پر چھوٹے بڑے پوسٹر اور اشتہارات چسپاں ہیں۔

جہاں تک لاہور کی صنعت و حرفت کا تعلق ہے، مصنف نے رسالہ سازی اور انجمن سازی کو اس شہر کی مشہور صنعتوں میں شمار کیا ہے۔ کیونکہ یہاں بے شمار رسالے نکلتے ہیں اور بے شمار انجمنیں بنتی ہیں۔ ادبی رسائل میں فلمی ایکٹرسوں یا خود ایڈیٹر کی تصاویر چھپتی ہیں اور شہر بھر کی انجمنوں کی صدارت کے لئے وہی جانے پہچانے دو تین چہرے ہوتے ہیں جو ہر جگہ نظر آتے ہیں، خواہ تقریب کی

نوعیت کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

مصنّف نے طلباء کو لاہور کی سب سے مشہور پیداوار قرار دیا ہے جو شہر میں بھی کثرت سے پائے جاتے ہیں اور ہزاروں کی تعداد میں باہر جانے کے باوجود ان کی تعداد میں کوئی کمی نہیں آتی۔ مصنّف نے ان طلباء کو چار دلچسپ اقسام میں تقسیم کیا ہے، یعنی جمالی طلباء، جلالی طلباء، خیالی طلباء اور خالی طلباء۔ جمالی طلباء کو حصولِ تعلیم سے زیادہ اپنے بناؤ سنگار، وضع قطع اور لباس کی تراش خراش کی فکر ہوتی ہے۔ جلالی طلباء سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں محض اپنا رعب جمانے اور چودھراہٹ کا مظاہرہ کرنے کے لئے آتے ہیں۔ ان کا وقت کالج اور ہوسٹل سے زیادہ شہر کے ہوٹلوں اور رستورانوں میں کٹتا ہے۔ خیالی طلباء گپ شپ اور بحث مباحثے کے شوقین ہوتے ہیں یا پھر صبح وشام کی ورزش کے۔ خالی طلباء: محض نام کے طلباء ہوتے ہیں اور انہیں امتحانات، مطالعۂ کتب اور درس وتدریس سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی، وہ جیسے کورے کالج میں داخل ہوتے ہیں، ویسے ہی کورے کالج چھوڑتے وقت بھی ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں مصنّف نے طلباء کی ایک اور قسم مضمون کے آخر میں بتائی ہے اور یہ وہ طلباء ہیں جو پستہ قد کم عمر اور دُبلے پتلے ہوتے ہیں۔ وہ شکل وصورت وضع قطع اور حُلیے سے نوجوان نہیں بلکہ بچے معلوم ہوتے ہیں چنانچہ مصنّف نے یہ کہہ کر اُن پر چوٹ کی ہے کہ یہ طلباء آدھے ٹکٹ پر ریل کا سفر کر سکتے ہیں اور اگر پسند کریں تو اپنی آیا کے ساتھ زنانے ڈبے میں بھی سفر کر سکتے ہیں۔

احمد شاہ بخاری (پطرس) نے بڑے ہلکے پھلکے انداز میں اپنے معاشرے کی بعض خرابیوں کی نشان دہی کی ہے اور باتوں ہی باتوں میں لاہور کے شہریوں کو درپیش بعض تکلیف دِہ مسائل روشنی میں لانے کی کوشش کی ہے۔ یہ مسائل صرف لاہور اور اہل لاہور کے نہیں، بلکہ پورے ملک کے ہیں اور جب تک یہ تسلی بخش طور پر حل نہیں ہوں گے۔ اس مضمون کی اہمیت بھی کم نہیں ہو گی۔

مشکل الفاظ ومحاورات کے معانی

ص ۱۸۰ جغرافیہ: وہ علم جس میں سطح زمین اور اس کی خشکی وتری کا حال بتایا جاتا ہے۔ تمہید: کسی بات کا آغاز، کسی مضمون کی اٹھان، ابتدا۔ دلائل: دلیل کی جمع۔ براہین: بُرہان کی جمع، مراد ہے ثبوت، دلیل، واضح بیان۔ کُرہ: گول چیز، حلقہ، یہاں مراد زمین کا گلوب ہے یعنی کُرۂ ارض، جس کا مطلب گیند کی طرح گول زمین ہے۔ حتیٰ کہ: یہاں تک کہ۔ طول البلد: کسی مقام کا خطِ استوا سے مشرق یا مغرب میں فاصلہ، شہر یا ملک کا وہ فاصلہ جو نصف النہار کے خطوط سے معلوم کیا جائے۔ انگریزی میں اسے LONGITUDE کہتے ہیں، چنانچہ کسی جگہ کا مقام

معلوم کرنے کے لئے گلوب پر شمالاً جنوباً فرضی خط کھینچے جاتے ہیں۔ عرض البلد: کسی مقام کا خطِ استوا سے شمال یا جنوب میں فاصلہ۔ انگریزی میں اسے LATITUDE کہتے ہیں۔ چنانچہ کسی جگہ کا محلِ وقوع معلوم کرنے کے لئے گلوب پر شرقاً غرباً فرضی خط کھینچے جاتے ہیں۔ مقامِ انقطاع: وہ جگہ جہاں یہ خطوط ایک دوسرے کو کاٹتے ہیں۔ مرقوم: لکھا ہوا۔ محلِ وقوع: واقع ہونے کی جگہ۔

تحقیقات: دریافت شدہ حقائق یا سچائیاں۔ مختصر: کم۔ جامع: زیادہ معانی جمع کرنے والے، مکمل۔ فاتر: خرابی والی، خلل والی، ناقص۔ ذہانت فاتر ہے: ذہن میں فتور یا خلل یا خرابی ہے۔ رفع: دور۔ پنجاب: پہلے ہندوستان اور اب پاکستان کا ایک صوبہ جو تقسیم ہند کے بعد مشرقی پنجاب (بھارت) اور مغربی پنجاب (پاکستان) میں بٹ گیا ہے۔ اپنے پانچ دریاؤں (ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم) کی وجہ سے اس نے یہ نام پایا تھا۔ پنج آب: پانچ دریاؤں والا۔

ص ۱۸۱ اصطلاح: کسی لفظ کو حقیقی معنوں کی بجائے کسی خاص معنی میں استعمال کرنا۔ راوی ضعیف: بڈھا دریائے راوی۔ جواب اقبال پارک لاہور کے پاس ایک نالے کی شکل میں بہتا ہے اور پرانے زمانے میں یہ جگہ دریائے راوی کی گزرگاہ تھی۔ شغل: کام۔ حدودِ اربعہ: چاروں سمتیں یعنی مشرق، مغرب، شمال اور جنوب۔ میونسپلٹی (MUNICIPALTY): میونسپل کمیٹی جو شہری بہبود کے امور کی ذمے دار ہوتی ہے، وہ جماعت جو شہر کی صفائی، پانی اور روشنی وغیرہ کا انتظام کرتی ہے۔ منسوخ: کاٹ دینا، ختم کر دینا۔ واقع تر: مزید پھیلنا۔ ماہرین: کسی علم یا فن کے اچھی طرح جاننے والے یا اس میں کمال حاصل کرنے والے۔ صوبہ: ملک کا حصّہ جس میں کئی ضلعے شامل ہوں۔ دارالخلافہ، صدر مقام، پایۂ تخت، وہ جگہ یا شہر جہاں ملک یا صوبے کا حاکمِ اعلیٰ رہتا ہو، دارالخلافہ، اصل میں مسلمانوں کے دارالحکومت کو کہتے تھے یعنی جہاں مسلمانوں کا خلیفہ یا امیرالمومنین رہتا تھا۔ اب اس کی جگہ دارالسلطنت یا دارالحکومت استعمال ہوتا ہے۔

ورم: سوجن، جسم کی کسی جگہ کا پھوڑے کی طرح اُبھر آنا۔ موادِ فاسد: گندہ مادہ۔ توسیع: پھیلاؤ۔ عارضہ: بیماری۔ مرض۔ لاحق: لگا ہوا۔ آب و ہوا: پانی اور ہوا۔ روایات: زبانی باتیں، کہانیاں۔ بحث و تمحیص: بحث و تکرار، لفظی یا زبانی جھگڑا، سوال و جواب۔ بحث کے لفظی معنی ہیں پاؤں سے مٹی ہٹانا، حقیقت سے پردہ ہٹانا، کھودنا۔ تحقیق کرنا۔ ہوم رول: حکومت خود اختیاری۔

آثار: نشانیاں، اثر کی جمع، جس کے لفظی معنی ہیں نشانی، یادگار۔ غور و خوض: توجہ، غور و فکر۔ کمیٹی: مراد ہے میونسپل کمیٹی یعنی جماعت رفاہِ عامہ۔ قلت: کمی۔ مفادِ عامہ: عام لوگوں کا فائدہ۔ بے جا: غلط، غیر ضروری۔ کفایت شعاری: بحث، کم خرچ کرنے کی عادت۔

ص ۱۸۲ | مرکبات : مرکب کی جمع۔ مختلف چیزوں کو جمع کر کے بنائی ہوئی ایک نئی چیز۔
نتائج : نتیجہ کی جمع۔ بہم رسانیٔ آب : پانی مہیا کرنا۔ سکیم : منصوبہ۔ نظام سقہ : نظام نام کا
وہ ماشکی جس نے مغل بادشاہ ہمایوں کی دہلی کے قریب دریائے جمنا میں ڈوبتے وقت جان بچائی
تھی اور ہمایوں نے خوش ہو کر اُسے ایک دن کے لئے بادشاہ بنا دیا تھا۔ اُس نے ایک دن کی
حکومت میں چام کے دام (چمڑے کے سکّے) چلائے جنہوں نے اس کے عزیز و اقارب کو مالا مال کر دیا۔
مسوّدات : کسی کتاب یا مضمون کی مصنّف کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر۔ تلف : ضائع۔ دقت :
مشکل۔ تحقیق : حق بات دریافت کرنا، اصلیت معلوم کرنا۔ تدقیق : غور و فکر، باریک بینی۔ عارضی طور
پر : تھوڑی مدت کے لئے۔ فی الحال : ابھی۔ حتی الوسع : جہاں تک ممکن ہو، جہاں تک ہو سکے۔
رائے دہندگی : رائے دینے کا موقع یا ووٹ دینا۔ رائے دہندہ : رائے یا ووٹ دینے والا۔ نل : پانی
پہنچانے والا جستی پائپ۔ جابجا : مختلف جگہوں پر۔ ہائیڈروجن اور آکسیجن : دو گیسیں جن کے
ایک عمل انگیز کی موجودگی میں بجلی گزارنے پر ایک خاص ترکیب سے ملنے پر پانی بنتا ہے۔ یعنی
ہائیڈروجن کے لئے ایچ ("H") اور آکسیجن کے لئے او "O" استعمال ہوتا ہے اور یوں پانی کا
فارمولا H_2O بنتا ہے۔ تاخیر : دیر۔ دل شکنی : دل ٹوٹنا۔
ص ۱۸۳ | ذرائع آمد و رفت : آنے جانے کے ذریعے۔ سیاح : سیر و سیاحت کرنے
والا۔ ذرائع : ذریعہ کی جمع، وسیلہ۔ ذہن نشین کرنا : دماغ یا ذہن میں بٹھانا۔ یاد رکھنا۔ سیاحت :
سیر و سفر۔ کما حقہٗ : جیسا کہ اس کا حق ہے، ٹھیک ٹھیک۔ اثر پذیر ہونا : اثر قبول کرنا۔
بل کھانا : موڑ مڑنا، خم کرنا۔ شیر شاہ سوری : اصل نام فرید الدین : دہلی کے سوری خاندان کا
بانی سہسرام (بہار) کا رہنے والا اور ۱۵۴۰ء میں ہمایوں بادشاہ کو شکست دے کر ہندوستان کا
بادشاہ بننے والا افغان، جو بہادری، دانائی، نظم و نسق، اور رفاہ عامہ کے کاموں کے سلسلے میں بہت
مشہور ہے۔ اس نے دریائے سندھ سے سونار گاؤں (بنگال)، تک مشہور جرنیلی سڑک (گرینڈ ٹرنک روڈ)
تعمیر کروائی تھی اور اس پر اٹھارہ سو سرائیں بنوائیں اور جا بجا کنوئیں کھدوائے تھے۔ ہر کاروان
سرائے کے ساتھ ایک مسجد اور پورا عملہ متعین تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کے لئے کچے اور
پکے ہوئے کھانے کا انتظام کیا۔ ہر منزل پر گھوڑے ہر وقت تیار ملتے اور مسافروں کے
استفادہ کے لئے سڑکوں کے کنارے پھل دار درخت اُگائے تھے۔ آثار قدیمہ : پرانی نشانیاں یا
یادگاریں یعنی عمارتیں، سڑکیں اور باغات وغیرہ۔ ردّ و بدل : تبدیلی۔ گوارا کرنا : برداشت کرنا۔
خندق : کھائی یا گڑھا۔ شہر کے گرد کھُدی ہوئی زمین۔ تختہ اُلٹ دینا : حکومت تبدیل کرنا،
سلطنت برباد کرنا۔ عظمت رفتہ : گزرے ہوئے وقت کی بڑائی۔ عبرت : سبق، نصیحت۔

ہُک : خم دار کیل۔ اصطلاح : کسی لفظ کو حقیقی معنی کی بجائے کسی خاص معنی میں استعمال کرنا۔ شوقین : کسی چیز کا شوق رکھنے والا۔ موم جامہ : مومی کپڑا، وہ کپڑا جس پر موم کا روغن کیا ہُوا ہوتا کہ پانی اثر انداز نہ ہو۔ منڈھ لینا : چڑھا لینا۔ خوراک : کھانا۔ قصاب : جانور ذبح کرنے والا۔ نباتی گھوڑے : مصنوعی یا نقلی گھوڑے مراد ہے کمزور گھوڑے، جو اصلی گھوڑوں کی نقل معلوم ہوتے ہیں۔ دُم دار ستارہ : وہ تارا جس کے ساتھ روشنی کی لمبی سی لکیر دکھائی دیتی ہے۔ ساخت : بناوٹ۔ ضبطِ نفس : اپنی خواہشات پر قابو پانا۔ سنجیدہ : متین۔ اعتدال : میانہ روی۔ ہچکولہ : جھٹکا۔ نقش : نشان، تصویر۔ ثبت کرنا : لکھنا۔ لگانا۔ مسام : جسم کا سوراخ جس میں سے پسینہ خارج ہوتا ہے۔

ص ۱۸۴ | قابلِ دید : دیکھنے کے لائق۔ دوہری : دو تہوں والی۔ اشتہار : وہ کاغذ یا پوسٹر جو کسی اطلاع کے لئے دیوار پر چسپاں کیا جاتا ہے۔ پلستر کرنا : دیوار پر لیپ جمانا۔ دبازت : موٹائی۔ سائز : حجم، لمبائی، چوڑائی۔ مبہم : غیر واضح، الجھی ہوئی عبارت والے۔ غیر معروف : جو زیادہ مشہور نہ ہو۔ چپکانا : چسپاں کرنا۔ مژدہ : خوش خبری۔ سخن فہم : بات یا کلام سمجھنے والا۔ گریجوایٹ : بی اے پاس آدمی۔ سٹوڈنٹس : طلبا۔ نادر : انوکھا، عجیب، کمیاب۔ ؎ کہتی ہے ہم کو خلقِ خدا غائبانہ کیا : آتش کا مصرع جس میں "تجھ کو" کی بجائے "ہم کو" استعمال کیا گیا ہے۔ پورا شعر یوں ہے۔ ؎

سُن تو سہی جہاں میں ہے تیرا فسانہ کیا ٭ کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا

خلقِ خدا کا مطلب ہے، اللہ کی مخلوق۔ غائبانہ کا مطلب ہے غیر حاضری میں۔ رفتہ رفتہ : آہستہ آہستہ۔ چہار دیواری : چاروں سمتیں۔ ڈائریکٹری : کتابِ حوالہ، وہ کتاب جس میں اداروں، کارخانوں یا متعلقہ لوگوں کے نام، پتے اور فون نمبر وغیرہ درج ہوتے ہیں۔ حافظہ : یادداشت۔ خدامِ ملّت : قوم کے خدمت گزار۔ خانگی حالات : گھریلو حالات۔ بالوضاحت : تفصیل کے ساتھ۔ عقبی دیوار : پچھلی دیوار۔ سرکس : ورزشوں اور زور آزمائیوں کے کرتبوں کا تماشا، آدمیوں اور جانوروں کے کرتب دکھانے کی جگہ۔ اصطبل : گھوڑے باندھنے کی جگہ۔ مس نغمہ خان : فلمی ادارہ کا نام۔ محاسن : خوبیاں۔ سرعت : تیزی، جلدی۔ ایجاد : کوئی نئی چیز بنانا۔ انقلابِ عظیم : بہت بڑی تبدیلی۔ ابتدا : آغاز۔ چشم زدن میں : پلک جھپکنے میں، فوراً۔ ساکن : غیر متحرک، ٹھہری ہوئی۔ لیپ دینا : چپکا دینا۔ دقّت : مشکل۔ صنعت : کاریگری، پیشہ، ہنر، حرفت : پیشہ۔ رسالہ سازی : رسالے نکالنا۔ کوئی تنظیم بنانا۔

ص ۱۸۵ | ایڈیٹر : مدیر، رسالے کے مضامین وغیرہ ترتیب دینے والا۔ مس سلوچنا : قیام

پاکستان سے پہلے ہندوستان کی فلموں کی ایک مشہور ہیروئن جس نے بے شمار فلموں میں کام کیا۔
مس کجن: اصل نام جہاں آرا۔ قیامِ پاکستان سے پہلے کی ایک اور مشہور اداکارہ جس نے پہلے
تھیئٹر میں اور پھر خاموش فلموں میں بحیثیت ہیروئن کام کیا۔ فروغ: پھیلاؤ، رونق، عزت،
ترقی۔ فنِ تنقید: ادب کو پرکھنے اور جانچنے کا فن، ادبی خوبیاں اور خامیاں تلاش کرنے کا علم۔
انجمن: محفل یا تنظیم۔ پریذیڈنٹ: صدر۔ فی الحال: ابھی۔ اصحاب: صاحب کی جمع، افراد۔
اغراض: غرض کی جمع۔ مراد ہے ارادہ یا مطلب۔ بسا اوقات: بعض اوقات۔ کانفرنس:
صلاح و مشورے کے لئے جلسہ کسی خاص مقصد کے لئے بلایا جانے والا اجلاس۔ افتتاح: شروع
کرنا۔ لفظی معنی، کھولنا۔ سہ پہر: دن کا تیسرا پہر، چار پانچ بجے بعد از دوپہر کا وقت۔ مس نغمہ جان:
ایک فلمی اداکارہ کا نام۔ ڈنر: رات کا کھانا۔ مطمحِ نظر: نظر پڑنے کی جگہ۔ مراد ہے اصلی مقصد،
خیال یا نقطۂ نظر۔ سامعین: سننے والے۔ پیداوار: زمین سے پیدا ہونے والی چیزیں یعنی اجناس اور
پھل وغیرہ۔ دساور: پردیس، ولایت، بیرونِ ملک۔ فصل: کھیتی۔ سرما: سردی کا موسم۔
عموماً: عام طور پر۔ اواخرِ بہار: بہار کے آخری دنوں میں۔ اواخر، آخر کی جمع اور بہار، وہ
موسم ہے جب سردیوں کے بعد از سرِ نو سبزہ اگتا ہے اور پھول کھلتے ہیں۔ جمالی: جمال کا
مطلب ہے حسن یا خوبصورتی۔ جمالی، شانِ رحمت کی تجلّی کو کہا جاتا ہے یعنی وہ صفتِ الٰہی جس سے
شانِ رحمت ظاہر ہو۔ یہاں طنزاً وہ طلباء مراد ہیں جو اپنے حسن و جمال اور ظاہری ٹیپ ٹاپ
یعنی فیشن ایبل لباس اور وضع قطع پر زیادہ توجہ دیتے ہیں۔ بعد ازاں: اس کے بعد۔ ریستوران:
ہوٹل، طعام گاہ یا چائے خانہ۔ نمائش: دکھاوا۔ جلالی: جلال کے لفظی معنی ہیں عظمت، برتری، تیزی
و تندی، جلالی، وہ صفتِ الٰہی ہے جس سے شانِ غضب کا اظہار ہو۔ یہاں طنزاً مراد وہ طلباء ہیں
جو اپنے ساتھیوں پر جا و بے جا رعب جماتے ہیں۔ شجرہ: نسب نامہ، آبا و اجداد کا سلسلہ، وہ
کاغذ جس میں مورثِ اعلیٰ کی کُل اولاد ترتیب وار درج کرتے ہیں۔ جلال الدین اکبر: خاندانِ مغلیہ
کا مشہور بادشاہ جو بابر کا پوتا اور ہمایوں کا بیٹا تھا۔ وہ ۱۵۴۲ء میں عمر کوٹ (سندھ) کے مقام
پر اس وقت پیدا ہوا، جب ہمایوں، شیر شاہ سوری سے شکست کھا کر مارا مارا پھر رہا تھا۔ ۱۵۵۶ء
میں تیرہ سال کی عمر میں، باپ کے مرنے پر، تخت نشین ہوا اور ۱۶۰۵ء میں فوت ہوا۔ اس نے اپنے
اتالیق بیرم خاں کی مدد سے پہلے بغاوتوں پر قابو پایا پھر نئے علاقے فتح کر کے اپنی سلطنت کی
حدود وسیع کیں اور ملک میں امن و امان قائم کیا (اورنگ زیب کو چھوڑ کر) مغلوں میں
سب سے عظیم سلطنت قائم کرنے کی وجہ سے وہ "مغلِ اعظم" کہلایا۔ اس کے نام جلال الدین
کی رعایت سے طلباء کی اس دوسری قسم کو جلالی کہا گیا ہے۔ ملکیت: جائیداد۔ مصاحب: صحبت

میں بیٹھنے والے، ساتھی، دوست، ہم نشین۔

ص ۱۸۶ جُود و سخا: بخشش، سخاوت۔ خُم لنڈھاتے پھرنا: شراب کے مٹکے زمین پر اُلٹ دینا۔ بے ضرورت صرف کرنا۔ یہاں مراد ہے کہ اپنی سخاوت اور دریا دلی کا بے دریغ مظاہرہ کرتے ہیں۔ راس آنا: موافق آنا، اچھی لگنا۔ ہوسٹل: طلباء کے ٹھہرنے کی جگہ۔ فروکش: قیام کرنا۔ خیالی طلباء: غور و فکر کرنے والے طالب علم۔ رُوپ: حُسن شکل و صورت۔ اخلاق: خُلق کی جمع، اچھی عادتیں۔ علم الاخلاق، وہ علم ہے جس میں انسانوں کے نیک و بد افعال سے بحث ہوتی ہے۔ آواگون: آنا جانا، بار بار جنم لینا۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق مرنے کے بعد آدمی کی روح کا کسی دوسرے جسم میں اپنے اعمال کے مطابق جانا۔ اسے عقیدۂ تناسخ بھی کہتے ہیں۔ جمہوریت: وہ نظامِ حکومت جس میں لوگ اپنی مرضی سے اپنا حاکم یعنی صدر یا وزیر اعظم چنیں۔ صدر یا وزیر اعظم کی مدد کے لئے انتظامیہ مجلس (کابینہ) ہوتی ہے۔ قانون سازی کے لئے مقننہ (پارلیمنٹ) ہوتی ہے جس کے نمائندے عوام اپنے ووٹوں سے چُنتے ہیں اور وہ قوم کے معاملات طے کرتے ہیں۔ باآواز بلند: اونچی آواز میں۔ تبادلۂ خیالات: گفتگو کرنا۔ آفرینش: پیدائش، یہاں مراد کائنات کی ابتداء کے بارے میں غور و فکر ہے۔ ارتقائے انسانی: انسان کا درجہ بدرجہ ترقی کرنا۔ علی الصبح: صبح وسویرے۔ ڈنٹر پیلنا: ڈنڈ نکالنا۔ ایک قسم کی ورزش کرنا۔ بے سرا: بھونڈی آواز میں بغیر کسی سُر تال کے گانا۔ خالی طلباء: وہ طلباء جو محض نام کے طالب علم ہیں اور پڑھنے لکھنے سے انہیں کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ آلائش: گندگی، میل کچیل۔ دامن تر ہونا: آلودہ یا لتھڑا ہوا ہونا۔ خرخشے: جھگڑے، لڑائیاں، دنگا فساد۔ خلل انداز: خرابی پیدا کرنے والا۔ معصومیت: پاکیزگی، بے گناہی۔ ملوث: آلودہ، لتھڑا ہونا۔ نصاب: تعلیم کا کورس۔ درس: سبق۔ ہنگامہ: جھگڑا، فساد۔ شور و غل، فتنہ۔ محدّب شیشہ: وہ اُبھرا ہوا شیشہ جس میں سے چیزیں بڑی دکھائی دیتی ہیں۔ انّا: دودھ پلانے والی عورت، ملازمہ، دایہ۔

سبق کا خلاصہ

احمد شاہ بخاری (پطرس) نے لاہور کا جغرافیہ بیان کرتے ہوئے، اس کے محلِ وقوع، حدود اربعہ، آب و ہوا، ذرائع آمد و رفت، قابلِ دید مقامات، صنعت و حرفت اور پیداوار کی مزاحیہ انداز میں تفصیل بتائی ہے۔ وہ کہتے ہیں:

تمہید: لاہور کا وجود ثابت کرنے کے لئے کسی دلیل یا ثبوت کی ضرورت نہیں کیونکہ

یہ کافی عرصہ پہلے دریافت ہو چکا تھا۔ نہ یہ بتانے کی ضرورت ہے کہ کرۂ ارض (گلوب) کو دائیں سے بائیں سمت گھماتے ہوئے برصغیر پاک وہند کو سامنے لایا جائے تو فلاں طول بلد اور فلاں عرض بلد کے خطوط جہاں ایک دوسرے کو کاٹیں گے وہاں لاہور موجود ہوگا۔ بزرگوں نے مختصر لفظوں میں لاہور کی نشان دہی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ لاہور، لاہور ہے لیکن اگر اس نشانی کے باوجود آپ کو (گلوب پر) لاہور نہ ملے تو پھر سمجھ لیجئے کہ آپ کی تعلیم اور ذہانت دونوں میں کوئی خرابی ہے۔

محل وقوع لاہور، اگرچہ پنجاب میں واقع ہے لیکن یہ پنجاب اب پانچ دریاؤں (ستلج، بیاس، راوی، چناب اور جہلم) والا علاقہ نہیں۔ کیوں کہ اب اس میں ساڑھے چار دریا بہتے ہیں۔ ان میں آدھا دریا راوی ہے جو اب بہنے کے قابل نہیں رہا، اسی لئے اسے بڈھا راوی کہتے ہیں۔ یہ اب شہر کے قریب دو پلوں کے نیچے ریت میں لیٹا رہتا ہے۔

حدود اربعہ کسی زمانے میں لاہور کا حدود اربعہ ہوا کرتا تھا لیکن طالب علموں کی سہولت کے لئے میونسپل کمیٹی نے اسے ختم کر دیا ہے۔ روز بروز آبادی بڑھنے کی وجہ سے اب لاہور کے چاروں طرف بھی لاہور ہی واقع ہے۔ اگر آبادی کی رفتار یہی رہی تو دس بیس سال تک لاہور شہر کی بجائے صوبہ بن جائے گا اور صوبہ پنجاب سمٹ کر صدر مقام (شہر) کی شکل اختیار کرے گا۔ اگر لاہور کو ایک جسم تصور کیا جائے تو اس میں نمودار ہونے والی نئی آبادیاں پھوڑے کے ابھار کی طرح ہیں جس میں گندا مواد بھرا ہے۔ یوں لگتا ہے، جیسے یہ ایک بیماری ہے جو لاہور کے جسم کو چمٹی ہوئی ہے۔

آب وہوا حال ہی میں لاہور کے باشندوں نے دوسرے شہروں کی طرح اپنے لئے آب وہوا کا مطالبہ کیا ہے۔ میونسپل کمیٹی نے لاہوریوں کی اس خواہش کو جائز قرار دیا ہے لیکن بدقسمتی سے اس کے پاس ہوا کی کمی ہے، اس نے شہریوں سے اپیل کی ہے کہ وہ ہوا کے استعمال میں بچت سے کام لیں۔ چنانچہ لاہور کے باشندے اپنی ضرورت پوری کرنے کے آب وہوا کی بجائے دھول اور خاص حالات میں دھواں استعمال کرتے ہیں کمیٹی کی مہربانی سے جا بجا دھوئیں اور گرد کے مراکز کھل گئے ہیں جہاں یہ چیزیں مفت تقسیم کی جاتی ہیں۔ امید ہے کہ ان کے مؤثر نتائج نکلیں گے۔

پانی مہیا کرنے کے سلسلے میں میونسپل کمیٹی نے ایک منصوبے پر کافی عرصہ سے غور وفکر شروع کر رکھا ہے۔ یہ منصوبہ مغل بادشاہ ہمایوں کے زمانے میں ایک دن کے لئے بادشاہت کرنے والے نظام سقہ نے تیار کیا تھا لیکن بدقسمتی سے اس کے اپنے ہاتھ سے لکھے ہوئے بعض کاغذات

ضائع ہو گئے اور جو بچ گئے ہیں، انہیں پڑھنے میں دشواری پیش آرہی ہے۔ چنانچہ ان کی تحقیق میں مزید چند سال لگ جائیں گے۔ البتہ عارضی طور پر یہ انتظام کیا گیا ہے کہ بارش کے پانی کو کسی صورت میں بھی شہر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے۔ کمیٹی اس بندوبست میں بہت کامیاب ہوئی ہے اور امید ہے کہ تھوڑے ہی عرصہ میں بارش کا اتنا پانی جمع ہو جائے گا کہ ہر محلہ اپنے الگ دریا کا مالک ہو گا جس میں مچھلیاں پالی جائیں گی اور ہر مچھلی کے پیٹ میں سے میونسپل کمیٹی کی عطا کردہ انگوٹھی برآمد ہو گی جو ووٹر حضرات انتخاب کے موقعہ پر پہن کر آئیں گے۔

نظام سقّے کے کاغذات سے اتنا پتہ چلا ہے کہ گھروں میں پانی پہنچانے کے لئے نل ضروری ہیں چنانچہ کمیٹی نے کروڑوں روپے خرچ کر کے شہر میں جا بجا نل لگوا دیئے ہیں اور فی الحال ان میں ہائیڈروجن اور آکسیجن دونوں گیسیں بھر دی ہیں۔ کیونکہ سائنسدانوں کے خیال میں یہی دونوں گیسیں مل کر پانی بن جائیں گی۔ اسی لئے بعض نلوں میں سے پانی کے چند قطرے روزانہ ٹپکنے لگے ہیں اور اہل لاہور کو نصیحت کی گئی ہے کہ وہ اپنے اپنے گھڑے نلوں کے نیچے رکھ دیا کریں تاکہ جو بھی پانی آئے، وہ اُسے بھر لیا کریں۔ وگرنہ دیر ہو جانے پر پانی نہیں ملے گا اور خواہ مخواہ ان کا دِل خراب ہو گا۔ شہریوں نے کمیٹی کی اس مہربانی پر بے حد خوشی کا اظہار کیا ہے۔

ذرائع آمد و رفت لاہور آنے والے سیاحوں کو یہاں کے ذرائع آمد و رفت کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کر لینی چاہئیں تاکہ بعد میں انہیں پریشانی نہ ہو۔ لاہور کے بازاروں میں سے بل کھاتی ہوئی ایک سڑک گزرتی ہے جو شیر شاہ سوری نے اپنے زمانے میں تعمیر کرائی تھی۔ ٹوٹ پھوٹ کے باوجود اسے اپنی اصل حالت میں رکھا گیا ہے کیونکہ یہ آثارِ قدیمہ میں سے ہے اور احترام کے طور پر اس میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں کی گئی۔ سینکڑوں سالوں کے استعمال نے اس میں جو گڑھے اور خندقیں پیدا کر دی ہیں وہ بھی تاریخی حیثیت حاصل کر گئی ہیں، اس لئے ویسی کی ویسی موجود ہیں، پہلے بھی ان کی وجہ سے کئی حکومتیں تباہ و برباد ہوئیں اور اب بھی ان میں گر کر کئی لوگوں کا بیڑا غرق ہوتا ہے۔ ان میں گرنے والے اپنی پرانی عظمت کو یاد کرتے ہیں اور گرتوں کو دیکھنے والے ان سے سبق حاصل کرتے ہیں۔ جو لوگ زیادہ عبرت پکڑنا چاہتے ہیں، وہ لاہور کے ٹانگوں میں بیٹھ جاتے ہیں کیونکہ جب وہ ٹانگے ان گڑھوں میں پھسلتے ہیں تو سواریوں کو چوٹیں لگتی ہیں اور یہ زیادہ سبق آموز منظر ہوتا ہے۔

ٹانگوں میں اصلی گھوڑوں کی بجائے نقلی گھوڑے جوتے جاتے ہیں۔ اصلی گھوڑے قصابوں کی دکانوں پر پائے جاتے ہیں، جہاں انہیں ذبح کر کے ان کا گوشت فروخت کیا جاتا ہے۔ ٹانگوں میں استعمال ہونے والے گھوڑوں کی شکل و صورت دُم دار ستاروں سے

ملتی جلتی ہے کیونکہ ان کی ساخت میں گھوڑا کم اور دُم زیادہ ہوتی ہے۔ جب یہ گھوڑا چلتا ہے تو اپنی دُم ٹانگوں میں دبا لیتا ہے اور اپنے جسم کو قابو میں رکھتے ہوئے ایسی معتدل چال اختیار کرتا ہے کہ سڑک کا ہر تاریخی گڑھا اپنا احساس دلاتا ہے اور ٹانگے کا ہر جھٹکا آپ پر اپنا نقش چھوڑتا ہے یوں ان جھٹکوں سے آپ کے جسم کا ہر مسام لطف اندوز ہوتا ہے۔

قابلِ دید مقامات لاہور میں قابلِ دید مقامات کی تلاش بہت مشکل ہے کیونکہ وہاں کی ہر عمارت کی بیرونی دیواریں دوہری ہوتی ہیں۔ پہلے اینٹوں اور چونے سے دیوار بنائی جاتی ہے اور پھر اس پر اتنے پوسٹر چسپاں کئے جاتے ہیں کہ ان کی ایک اور تہہ جم جاتی ہے۔ ابتداء میں چھوٹے سائز کے غیر واضح اور کم مشہور اشتہارات دیوار پر چپکائے جاتے ہیں مثلاً "اہلِ لاہور کو مژدہ" یا "اچھا سستا مال" وغیرہ۔ اس کے بعد وہ اشتہارات آتے ہیں جو پڑھے لکھے اور خوش ذوق حضرات کے لئے ہوتے ہیں۔ مثلاً "گریجویٹ درزی ہاؤس" یا "سٹوڈنٹس کے لئے نادر موقع" یا "کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"۔ آہستہ آہستہ گھر کی چاروں دیواریں اشتہارات سے اٹ جاتی ہیں۔ ان سے ہر طرح کی معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ گویا وہ ایک ڈائریکٹری کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ کہیں بوٹ پالش کا اشتہار ہے تو کہیں تازہ مکھن ملنے کا پتہ درج ہے۔ ایک جگہ حافظہ تیز کرنے والی گولیوں کا ذکر کیا گیا ہے تو دوسری جگہ "انجمن خدامِ ملت" کے جلسے کا پروگرام چسپاں ہے۔ کہیں کسی مشہور سیاسی لیڈر کے نجی حالات درج ہیں، کہیں سرکس کے جانوروں کی فہرست چھپی ہے اور کہیں ایک فلمی اداکارہ مس نغمہ جان کی تصویر اور اس کی تازہ فلم کا تعارف شائع ہوا ہے۔ یہ اشتہارات مستقل موجود نہیں رہتے بلکہ ان پر نئے نئے اشتہارات لگتے رہتے ہیں۔ جن میں کوئی نئی خوش خبری، کوئی نئی دریافت یا ایجاد یا کسی نئے انقلاب کے رونما ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔ ان اشتہارات کی وجہ سے عمارتوں کی ظاہری شکل اس طرح بدلتی رہتی ہے کہ خود لاہور کے باشندوں کو انہیں پہچاننے میں مشکل پیش آتی ہے۔

صنعت وحرفت اشتہارات کے علاوہ لاہور کی سب سے بڑی صنعت رسائل ہیں اور سب سے مقبول پیشہ انجمن سازی ہے۔ کوئی رسالہ عام نمبر کے طور پر نہیں چھپتا بلکہ ہر رسالے کا ہر نمبر عموماً خاص نمبر ہوتا ہے اور عام نمبر صرف خاص خاص مواقع پر شائع کئے جاتے ہیں۔ عام شمارے میں رسالے کے مدیر کی تصویر ہوتی ہے اور خاص شماروں میں مشہور فلمی ایکٹرسوں مثلاً مس سلوچنا اور مس کجن کی تصادیر شائع ہوتی ہیں جو ادب کی مقبولیت میں مددگار ہوتی ہیں اور ان سے تنقید کا فن بھی ترقی کرتا ہے۔ باقی رہی انجمنیں تو لاہور کے انچ انچ رقبے پر ایک نئی انجمن موجود ہے۔ یہاں انجمنیں زیادہ اور صدر کم ہیں، لہٰذا دو تین اشخاص ہی ان سب انجمنوں کے صدر بن گئے ہیں۔

ان انجمنوں کے اغراض و مقاصد بھی یکساں ہوتے ہیں، اسی لئے بعض اوقات ایک ہی صدر صبح کو کسی مذہبی کانفرنس کی رسم افتتاح میں شریک ہوتا ہے، پچھلے پہر کسی سینما کی محفل میں مس نغمہ جان کا تعارف کراتا ہے اور شام کو کسی کرکٹ ٹیم کے کھانے میں شامل ہوتا ہے۔ صدر نے ایک جامع تقریر تیار کر رکھی ہے، جو تینوں مواقع پر اس کے کام آتی ہے اور سننے والے بھی اس میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔

پیداوار لاہور کی مشہور ترین پیداوار یہاں کے طلباء ہیں جو نہ صرف یہاں کثرت سے پائے جاتے ہیں بلکہ بوقتِ ضرورت ہزاروں کی تعداد میں دوسرے ملکوں کو بھیجے جاتے ہیں۔ طلباء کی فصل سردیوں کے آغاز میں بوئی جاتی ہے۔ اور موسم بہار کے آخری دنوں میں پک کر تیار ہو جاتی ہے۔ مراد یہ ہے کہ وہ کالجوں میں ستمبر میں داخل ہوتے ہیں اور اپریل میں امتحانات دے کر فارغ ہوتے ہیں۔

ان طلباء کی اگرچہ کئی اقسام ہیں لیکن ان میں چار قسمیں زیادہ مشہور ہیں (۱) جمالی طلباء (۲) جلالی طلباء (۳) خیالی طلباء اور (۴) خالی طلباء۔ جمالی طلباء کو فیشن ایبل لباس اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے لگاؤ ہوتا ہے، اس لئے ان کا زیادہ وقت درزیوں، دھوبیوں اور نائیوں کے پاس گزرتا ہے یا پھر وہ ریستورانوں میں گپ لڑانے، چائے پینے اور کھانا کھانے میں وقت صرف کرتے ہیں۔ جلالی طلباء ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے اور دوسروں پر اپنا رعب جمانے کے چکر میں رہتے ہیں۔ ان کا جاہ و جلال دیکھ کر شہنشاہ جلال الدین اکبر کی یاد تازہ ہوتی ہے اور ان کے رئیسانہ چونچلے دیکھ کر لگتا ہے جیسے سارا ملک ان کی ملکیت ہے۔ وہ ہر روز شام کے وقت اپنے دوستوں کے ہمراہ باہر نکلتے ہیں اور ہوٹلوں وغیرہ میں جا کر دولت لٹاتے ہیں۔ کالج کے ہوسٹل کا کھانا انہیں پسند نہیں آتا، اس لئے اکثر ہوسٹل سے غائب رہتے ہیں۔ خیالی طلباء یا تو بحث و مباحثہ میں وقت گزارتے ہیں یا اپنی دنیا میں مگن رہتے ہیں، وہ رنگ روپ، اخلاق، آواگون، جمہوریت اور کائنات کی پیدائش کے موضوعات پر دوسروں سے بحث و تکرار کرتے ہیں یا صبح و شام ورزش کرتے ہیں۔ کبھی کبھار بے سُری آواز میں گنگناتے بھی ہیں۔ خالی طلباء وہ طلباء ہیں جنہیں پڑھنے لکھنے سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ کتابیں، نصابِ تعلیم، استاد کے اسباق، امتحانات اور مطالعہ وغیرہ ان کے نزدیک بے معنی چیزیں ہیں۔ وہ جیسے کورے کالج میں داخل ہوتے وقت تھے آخر تک ویسے ہی کورے رہتے ہیں۔

پچھلے چند سالوں سے طلباء کی ایک اور قسم بھی نظر آنے لگی ہے، وہ اتنے چھوٹے قد کے ہوتے ہیں کہ انہیں اچھی طرح دیکھنے کے لئے محدب شیشہ استعمال کرنا پڑتا ہے۔ وہ اتنے کم سن ہوتے ہیں کہ ریل میں آدھے ٹکٹ پر سفر کر سکتے ہیں اور اگر پسند کریں تو اپنی آیا کے ساتھ

ریل کے زنانہ ڈبے میں بیٹھ بھی سکتے ہیں۔

اہم پیراگراف کی تشریح

سوال درج ذیل پیراگراف کی مع حوالۂ متن وسیاق وسباق تشریح کیجئے۔

جو سیاح لاہور تشریف لانے کا ارادہ رکھتے ہوں، ان کو یہاں کے آمد و رفت کے ذرائع کے متعلق چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لینی چاہئیں تاکہ وہ یہاں کی سیاحت سے کماحقہٗ اثر پذیر ہو سکیں۔ جو سڑک بل کھاتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے، تاریخی اعتبار سے بہت اہم ہے یہ وہی سڑک ہے جو شیر شاہ سوری نے بنوائی تھی۔ یہ آثارِ قدیمہ میں شمار ہوتی ہے۔ اور بے حد احترام کی نظروں سے دیکھی جاتی ہے، چنانچہ اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل گوارا نہیں کیا جاتا۔ وہ قدیم تاریخی گڑھے اور خندقیں جوں کی توں موجود ہیں جنہوں نے کئی سلطنتوں کے تخت الٹ دیئے تھے۔ آج کل بھی کئی لوگوں کے تختے یہاں الٹتے ہیں اور عظمتِ رفتہ کی یاد دلا کر انسان کو عبرت سکھاتے ہیں۔

جواب **حوالۂ متن** یہ پیراگراف احمد شاہ بخاری (پطرس) کے مضمون "لاہور کا جغرافیہ" میں سے لیا گیا ہے۔

سیاق وسباق اس پیرے سے پہلے مصنف نے طنزیہ و مزاحیہ انداز میں لاہور کے محلِ وقوع، حدودِ اربعہ اور آب وہوا کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے۔ لاہور کے محلِ وقوع کے بارے میں اس نے بتایا ہے کہ کرۂ ارض پر لاہور کا محلِ وقوع دریافت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، اس لئے کہ لاہور پہلے ہی بہت مشہور ہے۔ یہ پنجاب میں واقع ہے جو پہلے پانچ دریاؤں کی سرزمین تھی اور اب ساڑھے چار دریاؤں کا علاقہ ہے۔ آدھا دریائے راوی ہے جس نے بہنے کا کام عرصہ سے ترک کر رکھا ہے اور اب بڈھا راوی کہلاتا ہے۔ رہا لاہور کا حدودِ اربعہ تو اب میونسپل کمیٹی کی مہربانی اور روز افزوں آبادی کے طفیل، لاہور کا کوئی حدود اربعہ ہی نہیں رہا۔ آب وہوا کے متعلق مصنف نے بتایا ہے کہ ہوا کی جگہ دھول اور دھواں ملتے ہیں اور پانی کی بجائے نلوں میں آکسیجن اور ہائیڈروجن گیسیں ملتی ہیں۔ اگر کبھی نل سے پانی کے چند قطرے ٹپکتے ہیں تو لاہور کے باشندے خوشیاں مناتے ہیں۔

اس پیرے کے بعد مصنف نے لاہور کے ذرائع آمد و رفت، قابلِ دید مقامات، صنعت و حرفت اور پیداوار کے بارے میں اپنے شگفتہ انداز میں معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ آمد و رفت کے سلسلے میں اس نے لاہور کے ٹانگوں کا ذکر کیا ہے جن کے آگے مریل گھوڑے بندھے ہوتے ہیں۔

قابلِ دید مقامات کی عدم موجودگی کا سبب یہ بتایا ہے کہ ہر عمارت پر اس کثرت سے اشتہارات چسپاں کئے جاتے ہیں کہ اس کی شکل وصورت چھُپ کر رہ جاتی ہے۔ صنعت وحرفت میں رسالہ سازی اور انجمن سازی کا تذکرہ کیا ہے۔ رسالوں میں یا تو ایڈیٹر کی تصویر چھپتی ہے یا مشہور فلمی ایکٹرسوں کی۔ بے شمار انجمنوں کے دو تین صدر ہیں، جو ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ پیداوار میں طلباء کی چار قسمیں یعنی جمالی، جلالی، خیالی اور خالی بتائی گئی ہیں اور ان میں سے ہر ایک قسم کی خصوصیات گنوائی گئی ہیں۔ آخر میں طلباء کی ایک اور قسم کا ذکر کیا ہے جو اتنے کم سن اور پستہ قد ہوتے ہیں کہ ریل کے آدھے ٹکٹ پر سفر کر سکتے ہیں اور انہیں دیکھنے کیلئے محدب شیشے کی ضرورت پڑتی ہے۔

تشریح اگر کچھ سیاح، لاہور شہر کی سیر کے لئے آنا چاہیں تو انہیں سب سے پہلے یہاں کے ذرائع سفر کے بارے میں ضروری معلومات حاصل کرنی چاہئیں تاکہ وہ سیر وسیاحت سے پوری طرح لطف اندوز ہو سکیں۔ یہاں ایک تاریخی سڑک (جی، ٹی روڈ) موجود ہے جو دُور دراز سے آتی ہے اور مڑتی ہوئی لاہور کے بازاروں میں سے گزرتی ہے۔ یہ سڑک ہندوستان کے مشہور افغان بادشاہ شیر شاہ سوری نے تعمیر کرائی تھی اور اب پرانی تاریخی یادگاروں میں شمار ہوتی ہے۔ تاریخی ہونے کی وجہ سے اس کی اتنی عزت کی جاتی ہے کہ اس میں کسی قسم کی تبدیلی کو پسند نہیں کیا جاتا۔ اس سڑک پر صدیوں کے استعمال سے جو گڑھے اور کھائیاں پڑ گئی ہیں، وہ بدستور موجود ہیں۔ ان گڑھوں اور خندقوں نے کئی سلطنتوں کو تباہ وبرباد کیا ہے اور آج بھی جو لوگ اس سڑک پر سفر کرتے کرتے ہیں، ان کا اسی طرح بیڑا غرق ہوتا ہے یہ سڑک ہماری گزشتہ بڑائی کی نشانی ہے تاہم اس کے گڑھوں میں گرنے والوں کو دیکھ کر دوسرے لوگ نصیحت حاصل کرتے ہیں۔

ابن انشاء (۱۹۲۷ - ۱۹۷۸ء)

اشتہارات "ضرورت نہیں ہے" کے

تعارف اور پس منظر

ابن انشاء کا مضمون۔ اشتہارات "ضرورت نہیں ہے" کے ۔۔۔ اُن کی کتاب "خمارِ گندم" میں سے لیا گیا ہے جو ابنِ انشاء کی وفات کے بعد ۱۹۸۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب ابنِ انشاء کے مضامین، خاکوں اور اخباری کالموں پر مشتمل ہے۔ "خمارِ گندم" کے بیشتر مضامین سادہ، عام فہم، ہلکے پھلکے اور لطیف طنز و ظرافت کی چاشنی لئے ہوئے ہیں اور یہی خصوصیات ان کے موجودہ مضمون "اشتہارات۔ ضرورت نہیں ہے۔ کے" میں بھی پائی جاتی ہیں۔ ابنِ انشاء مزاح میں تبسمِ زیرِ لب کے قائل ہیں اور ان کی طنز کاٹ دار ہونے کے باوجود لطف و تاثیر سے خالی نہیں ہوتی۔

مضمون "اشتہارات، ضرورت نہیں ہے، کے" کو دو حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلا حصّہ بیانیہ ہے اور دوسرا حصّہ "پیروڈی" کی شکل میں ہے۔ مضمون کے پہلے حصّے میں ابتداً ابن انشاء نے دو اشخاص کا ذکر کیا ہے اور دونوں کی دلچسپ عادات و اطوار پر تبصرہ کیا ہے۔ پہلے صاحب اپنے نوکر سے اس لئے خفا ہیں کہ وہ ان کے دوست میر صاحب کے نوکر کی طرح دُور اندیش اور چُست کیوں نہیں، جسے ایک کام کے لئے بھیجا جائے تو وُہ دو تین کام کر کے آتا ہے۔ ان صاحب کا نوکر بھی اپنے مالک کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے جب ان کی بیماری کے ایّام میں حکیم صاحب کو بلانے جاتا ہے تو وہ کفن سینے کے لئے" درزی' غسل دینے کے غسّال اور قبر کھودنے کے لئے گورکن کو اپنے ساتھ لے آتا ہے۔ یہ اس کی مستعدی اور دُور اندیشی کی ایسی مثال ہے جو قاری کو زیرِ لب مسکرانے پر مجبور کر دیتی ہے۔ دوسرے بزرگ مصنّف کے دوست ہیں اور ان کی عادت ہے کہ گلی میں سے گزرنے والے ہر ریڑھی والے کو پہلے بلاتے ہیں اور پھر بغیر پھل خریدے واپس کر دیتے ہیں۔ جب ان سے اس اقدام کی وجہ دریافت کی جاتی ہے تو جواب دیتے ہیں کہ میں نے احتیاطاً ایسا کیا تھا کہ کہیں وہ بے چارا مایوس نہ چلا جائے یا یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ ہمارے گھر میں سبھی بہرے ہیں اور اس کی ہانک پکار نہیں

سنتے۔ اسی طرح ایک دفعہ جب وہ مصنف کے ہمراہ کار میں کراچی کے گولی مار کے علاقے سے گزر رہے تھے تو ایک دکان پر یہ بورڈ لگا دیکھ کر کہ "تشریف لائیے۔ ربڑی، قلفی اور لسی تیار رہے" ــــ کار سے اُتر کر دکاندار کو یہ بتانے چلے گئے کہ ربڑی اور قلفی کھانے کے لئے نہ ان کے پاس فرصت ہے اور نہ انہیں ان چیزوں سے کوئی رغبت ہے۔ رہی لسی تو یہ موسم لسی پینے کا نہیں۔ اسی طرح انہیں اس بات پر بھی غصّہ آتا ہے کہ میزبان دعوت نامہ کے آخیر میں "معذرت کی صورت میں جواب سے مطلع فرمائیں" کے الفاظ کیوں تحریر کرتے ہیں، جب کہ دعوت میں تشریف نہ لانے والے کبھی جواب سے مطلع نہیں کرتے۔ ان کے نزدیک پاکستان کے بیشتر لوگ معاشرتی آداب سے بیگانہ ہیں۔ جب مصنّف ان کی باتوں پر غور کرتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ خود بھی انہیں لوگوں کے زُمرے میں شامل ہے، جو مجلسی آداب سے بے بہرہ ہیں تاہم وہ یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہے کہ اِخبارات میں چھپنے والے تمام اشتہارات کس طرح پڑھنے والوں کا دل لبھاتے ہیں اور کس طرح اخبار کا ہر قاری یہی سمجھتا ہے کہ ان اشتہارات کا مخاطب دراصل وہی ہے۔ یہ اشتہارات گوناگوں قسم کے ہوتے ہیں۔ کوئی ٹینڈر نوٹس ہے اور کوئی کسی ٹھیکے کا اشتہار ہے۔ کسی میں پلاٹ یا مکان بیچنے کی اطلاع دی جاتی ہے اور کسی میں اپنے نالائق اور نافرمان بیٹے کو جائیداد سے عاق کرنے کا اعلان ہوتا ہے۔ کہیں ضرورتِ رشتہ کا اشتہار چھپا ہوتا ہے۔ جسے پڑھ کر ہر شخص یہی سمجھتا ہے کہ اس کی تمام شرائط پوری کرنے کا صرف وہی اہل ہے۔ کسی اشتہار میں گھر بیٹھے لاکھوں روپے کما لینے کا نسخہ درج ہوتا ہے اور کسی میں شارٹ ہینڈ سکھانے کی پیش کش کی جاتی ہے۔ بعض اشتہارات مختلف کالجوں کی طرف سے ہوتے ہیں اور ہر کالج اتنی پرکشش رعائتیں دینے کا اعلان کرتا ہے کہ اخبار پڑھنے والا ان میں داخلہ لینے کے لئے بیتاب ہو جاتا ہے۔ بعض اشتہارات میں کاریں اور ریفریجریٹر مناسب قیمت پر بیچنے کی پیش کش ہوتی ہے۔ غرضیکہ مصنّف اخبار میں ان مختلف النوع اشتہاروں کو پڑھ کر پریشان ہو جاتا ہے اور غور و فکر کرنے کے بعد اس کے ذہن میں یہ تجویز آتی ہے کہ کیوں نہ وہ اخبارات میں "ضرورت ہے" کی بجائے "ضرورت نہیں ہے" کے اشتہارات شائع کرائے؟ یہاں سے مضمون کا دوسرا حصّہ شروع ہوتا ہے جو پیروڈی کی شکل میں ہے اور اس میں مصنّف نے پانچ اشتہارات بطور نمونہ دیئے ہیں۔

عموماً اخباروں میں اشتہار چھپتا ہے کہ "کرائے کے لئے مکان خالی ہے"۔ مصنّف نے اس کی جگہ "کرائے کے لئے خالی نہیں ہے" کا اشتہار سوچا ہے اور طنزیہ انداز میں ۲۰۰ گز پر تعمیر شدہ تین بیڈروم کے ایک پُر فضا بنگلہ نما مکان کو کرایہ پر نہ چڑھانے کا اعلان کیا ہے۔

اس مکان میں نلکا بھی ہے اور دروازے کے سامنے کارپوریشن کا گندگی جمع کرنے کا ڈرم بھی ہے۔ یہاں اشارۃً مصنف نے روزافزوں بڑھتے ہوئے کرایوں اور چھ چھ ماہ کے پیشگی کرایوں کی وصول یابی کا ذکر کیا ہے جو اب مالک مکانوں کا وطیرہ بن چکے ہیں۔ اسی طرح "اطلاعِ عام" والے اشتہار میں بھی ان اشتہاروں کا مضحکہ اڑایا گیا ہے جن میں کوئی صاحب اپنے نافرمان بیٹے کو ساری جائیداد سے عاق کر دیتے ہیں۔ "ضرورت نہیں ہے" کے اشتہار میں نقل مکانی کرتے وقت اپنی کار، ریڈیو، الماری، موٹر سائیکل، پنکھے، پلنگ بیچنے والوں کی ذہنیت کا پردہ چاک کیا گیا ہے۔ "عدمِ ضرورتِ رشتہ" کے اشتہار میں "ضرورت رشتہ" کے اشتہاروں پر لطیف چوٹ کی گئی ہے، جن میں لڑکے کے برسرِ روزگار ہونے اور اچھی تنخواہ پانے پر زور ہوتا ہے اور اس کے لئے کسی سلیقہ مند، تعلیم یافتہ، خوبصورت اور شریف خاندان سے تعلق رکھنے والی دوشیزہ کا رشتہ طلب کیا جاتا ہے۔ یہاں "دفتر شادی" جیسے پُرفریب اداروں کا پردہ چاک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ "داخلے جاری نہ رکھئے" میں "داخلے جاری ہیں" کی سرخیوں والے اشتہارات پر طنز کرنا مقصود ہے جو مختلف منظور شدہ اور غیر منظور شدہ کالجوں کی طرف سے ہر سال جاری کئے جاتے ہیں اور جن میں اپنی تعلیمی استعداد بڑھانے کے خواہشمندوں کو انٹر اور بی۔ اے کلاسوں میں داخلہ لینے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ مصنف نے یہ کہہ کر ان اشتہارات کی سنجیدگی کے غبارے میں سے ہوا نکال دی ہے کہ اس نے تو کئی سال پہلے ایم اے پاس کر لیا تھا۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۸۷ | اشتہار : اعلان کی غرض سے چھپا ہوا کاغذ۔ بزرگ : عمر رسیدہ، رشتے میں بڑا، معزز آدمی۔ فہمائش : ہدایت، نصیحت، ڈانٹ ڈپٹ، تنبیہ۔ گھامڑ : ناتجربہ کار، احمق، سست، پھوہڑ۔ دُور اندیش : سمجھ دار، ہوشیار، دُور کی بات سوچنے والا۔ بلب فیوز ہونا : بلب بے کار ہو جانا۔ لالٹین : پرانی طرز کا روشنی کرنے کا آلہ۔ اس میں مٹی کا تیل ایک بتی کے ذریعے جلتا ہے اور شیشے کی چمنی کے اندر روشنی ہوتی ہے۔ چمنی : شیشے کا بنا ہوا فانوس جو لالٹین میں استعمال ہوتا ہے۔ بتی : کپڑے یا روئی کی بنی ہوئی ڈوری جسے چراغ یا لالٹین میں استعمال کرتے ہیں۔ ٹیکسی : کرائے کی کار۔ ہاتھ لٹکاتے آنا : خالی ہاتھ یعنی بغیر کام کئے آجانا۔ موٹر رکشا : وہ رکشا جو موٹر انجن کے ذریعے چلتا ہے۔ آقا : مالک۔ پلے باندھ لینا : یاد رکھنا۔ تھان : کپڑے کی ایک معین لمبائی۔

ص ۱۸۸ | لوٹا : ایک قسم کا ٹونٹی دار برتن جو طہارت یا وضو کے کام آتا ہے۔ بھاڑ ڑا :

مٹی کھودنے کا آلہ، کسّی، بیلچہ۔ تعارف : واقفیت، جان پہچان۔ حاذق : کامل، اپنے فن میں یکتا۔ خدانخواستہ : خدا نہ کرے، ایسا نہ ہو۔ ایسی ویسی بات ہونا : مصیبت واقع ہونا، یہاں مراد ہے، وہ انتقال کر جائے۔ کفن : وہ کپڑا جس میں مُردے کی لاش لپیٹتے ہیں۔ غسّال : مُردے کو غُسل دینے والا۔ گورکن : قبر کھودنے والا۔ حلقۂ احباب : دوستوں کا دائرہ یا مجمع۔ ہانک لگانا : صدا لگانا، پکارنا، سبزی فروش کی سودا بیچنے کی آواز۔ چمن : صوبہ بلوچستان کا ایک سرحدی قصبہ، جہاں افغانستان سے انگور اور دیگر پھل پہنچتے ہیں اور پھر سارے ملک میں پھیل جاتے ہیں۔ چمن کے قصبے میں بالخصوص انگوروں کے باغات نہیں ہیں۔ پپیتا : ایک پھل جو اوپر سے کھیرے کی طرح ہوتا ہے اور اُس کا گودا آم کے گودے کی طرح ہوتا ہے۔ پیڑ : درخت۔ زحمت : تکلیف۔ احتیاط : دُور اندیشی، ہوشیاری سے اپنا بچاؤ۔ معذرت : معافی چاہنا۔ گمان : خیال۔ بہرے : جو سُن نہ سکیں۔ گولی مار : کراچی کا ایک علاقہ۔ ربڑی : کھانے کی ایک لذیذ چیز جو دودھ کو گاڑھا کر کے بنائی جاتی ہے۔ قلفی : اصل لفظ قُفلی ہے لیکن بگڑ کر قلفی بن گیا ہے۔ برف سے جما ہوا میٹھا دودھ جو ایک سرکنڈے کے گرد لپٹا ہوتا ہے۔ فرصت : فارغ وقت۔ بہرحال : ہر حالت میں۔ جس طرح بنے یا ہو سکے (مجبوری کے مفہوم میں) پیش کش : نذر، تحفہ، ہدیہ، کوئی چیز پیش کرنا یا حاضر کرنا۔ وضاحت : کھول کر بیان کرنا۔ آداب : ادب کی جمع، احترام کی روایات، تہذیب، شائستہ طور طریقے۔ دعوت نامہ : دعوت کا رقعہ۔ R.S.V.P : یہ فرنچ الفاظ REPONDEZ S'IL VOUS PLAIT کا مخفف ہے معنی ہیں "جواب سے مطلع فرمائیں"۔ انگریزی میں اس کا ترجمہ ہوگا۔ PLEASE REPLY۔ شادی بیاہ یا کسی اور تقریب کے دعوت ناموں میں لکھا جاتا ہے۔ مطلع فرمانا : اطلاع دینا، آگاہ کرنا۔

ص ۱۸۹ | میزبان : صاحب خانہ (گھر کا مالک) جس کے ہاں کوئی مہمان آیا ہو۔ مطلع کرنا : آگاہ کرنا۔ معذور : مجبور، قابلِ معافی، ناچار۔ آداب : تہذیبی رویّے، شائستہ طور طریقے۔ بے بہرہ : ناواقف۔ اشتہار : اعلان کی غرض سے چھپا ہوا کاغذ۔ متوجہ : توجہ کرنا۔ ٹھیکہ : کسی میعاد کے لئے کسی چیز کا حق استعمال، اجارہ۔ بندوبست : انتظام۔ ٹینڈر نوٹس : ٹھیکے کی درخواست اور اخراجات کا تخمینہ طلب کرنے کا اعلان عموماً سرکاری یا غیر سرکاری اداروں کی طرف سے بذریعہ اخبارات، ٹینڈر طلب کئے جاتے ہیں اور جس ادارے یا فرم کا تخمینہ سب سے کم ہوتا ہے اس کا ٹینڈر (ٹھیکہ) منظور کر لیا جاتا ہے۔ پلاٹ : زمین کا ٹکڑا۔ عاق کرنا : نافرمان اولاد کو ماں باپ سے سرکشی کے سبب ورثہ سے محروم کرنا۔ اولاد یا فرزندی سے خارج کرنا۔

فرزندی قبول کرنا : دامادی قبول کرنا، ان کی بیٹی سے شادی کر کے گویا ان کا بیٹا بن جائیں۔ ذات پات : ذات یا برادری کا تعصب۔ مِن وعَن : ہو بہو، حرف بحرف، جوں کی توں،

بالکل اُسی طرح۔ شارٹ ہینڈ: مختصر نویسی، حروف اور فقروں کیلئے چند علامتیں مقرر کر کے طویل عبارت کو مختصر انداز میں لکھنا۔ مشتاق: خواہشمند، شوق رکھنے والے۔ ریفریجریٹر: چیزوں کو ٹھنڈا رکھنے والی برقی الماری۔ معقول: مناسب، جائز۔ نذر کرنا: پیش کرنا۔ عہدہ برآ ہونا: فرض ادا کرنا، اقرار پورا کرنا۔ ترکیب: تدبیر۔ دانست: سمجھ۔ بیڈروم: سونے کا کمرہ۔ بنگلہ نما: کوٹھی جیسا۔ کارپوریشن: بڑے شہر کا وہ ادارہ جو صفائی، روشنی اور پانی کا انتظام کرتا ہے۔ کوڑا: الا بلا، گھاس پھوس، فضول اور نکمی چیزیں، کچرا۔ مقصود: مقصد ہونا، مطلوب یا مراد، ارادہ۔ پیشگی: پہلے۔ رجوع: لوٹنا، مائل ہونا، متوجہ۔

ص ۱۹۰ | راقم: لکھنے والا۔ کریانہ مرچنٹ: پنساری، آٹا، دال اور روزمرہ استعمال کی دیگر چیزیں بیچنے والا پرچون فروش دکاندار۔ فرزند: بیٹا۔ نافرمان: کہنا نہ ماننے والا، سرکش۔ اوباش: آوارہ، بدمعاش۔ صحبت: محفل میں۔ پاس بیٹھنا۔ عاق کرنا: نافرمانی کے باعث فرزندی سے خارج کرنا۔ مارس مائنر: برطانیہ کی بنی ہوئی ایک سستی قسم کی کار کا نام۔ کنڈیشن: حالت۔ بے آواز: جو بے ہنگم آواز پیدا نہ کرے۔ کیبنٹ: سٹیل یا لوہے کی خانوں والی الماری، جس میں ضروری کاغذات اور قیمتی اشیاء بند کر کے رکھی جاتی ہیں۔ ویسپا موٹر سائیکل: اٹلی کا بنا ہوا مشہور سکوٹر۔ قسط: وہ مقرر کردہ روپیہ جو تھوڑا تھوڑا کر کے ادا کیا جائے۔ اوقات: وقت کی جمع۔ عدم ضرورت رشتہ: رشتہ کی ضرورت نہ ہونا۔ برسرِ روزگار: ملازم۔ باسلیقہ: تمیز دار، ہنرمند، اچھا انتظام رکھنے والی۔ دوشیزہ: کنواری لڑکی۔ صیغۂ راز: چھپا کر رکھنا۔ راز کے شعبے میں مطلوب: طلب کئے جانا، خواہش ہونا۔ پوسٹ بکس: ڈاک خانہ کی طرف سے کسی خاص شخص یا ادارے کو الاٹ کیا گیا ڈبہ جس میں اس کی ڈاک ڈالی جاتی ہے۔ انٹر: انٹرمیڈیٹ یعنی ایف اے یا ایف ایس سی، گیارھویں، بارھویں جماعت۔ ڈگری کلاسیں: بی اے کی جماعتیں، تیرھویں، چودھویں جماعت۔ دھڑا دھڑ: لگاتار، پے در پے۔ مقصود: ارادہ کیا گیا۔ مطلب، مراد، مقصد ہونا۔ ایم اے: ماسٹر آف آرٹس یعنی سولھویں جماعت۔

سبق کا خلاصہ

ابن انشاء لکھتے ہیں کہ ایک بزرگ اپنے نوکر کو اس کی حماقت پر ڈانٹ ڈپٹ کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ میر صاحب کا نوکر اتنا ہوشیار ہے کہ اگر میر صاحب اُس سے بجلی کا بلب لانے کے لئے کہیں تو وہ بلب کے علاوہ مٹی کے تیل کی بوتل اور دو موم بتیاں بھی لے آتا ہے تاکہ اگر بلب ناکارہ ہو جائے تو لالٹین استعمال کی جا سکے اور اگر لالٹین کی چمنی ٹوٹ جائے

یا اس کی بتی ختم ہو جائے تو موم بتی سے کام چلایا جا سکے۔ ایک طرف تم ہو کہ آدھ گھنٹہ پہلے تمہیں ٹیکسی لانے کے لئے بھیجا تھا لیکن وقت ضائع کر کے تم خالی ہاتھ لوٹ آئے ہو۔ اگر تمہاری جگہ میر صاحب کا نوکر ہوتا تو ٹیکسی نہ ملنے کی صورت میں وہ موٹر رکشا لے آتا تاکہ دوبارہ نہ جانا پڑتا۔ بزرگ کی تنبیہ سُن کر نوکر بہت شرمسار ہوُا اور آئندہ کے لئے اُس نے اپنے مالک کی یہ نصیحت ذہن نشین کر لی۔ کچھ دن گزرنے کے بعد اتفاقاً مالک بخار میں مبتلا ہوُا تو اس نے نوکر کو بھیجا کہ جا کر حکیم صاحب کو بلا لائے۔ کچھ دیر بعد حکیم صاحب تشریف لائے تو ان کے پیچھے تین اور آدمی بھی آ گئے اور مالک کو سلام کر کے ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک کے پاس کپڑے کا تھان تھا، دوسرے کے پاس لوٹا اور تیسرے کے پاس پھاوڑا۔ آقا کے یہ پوچھنے پر کہ یہ تینوں کون ہیں اور یہاں کیا کرنے آئے ہیں، نوکر نے بتایا کہ ویسے تو حکیم صاحب بہت ماہر طبیب ہیں لیکن اللہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ اگر آپ اس بیماری کی وجہ سے خدانخواستہ فوت ہو جائیں تو سب انتظامات مکمّل ہونے چاہئیں۔ اسی لئے میں یہ تین آدمی اپنے ہمراہ لے آیا ہوں تاکہ بار بار واپس جا کر انہیں بلانا نہ پڑے۔ ان میں سے ایک درزی ہے اور آپ کے کفن کے لئے کپڑا ساتھ لایا ہے۔ دوسرا مُردے کو غسل دینے والا آدمی ہے اور تیسرا قبر کھودنے والا۔

ان سے ملتے جلتے ایک اور بزرگ ہمارے دوست ہیں۔ ایک دن گلی میں سے کوئی ریڑھی والا "چمن کے انگور ہیں" "درخت کے پکے ہوئے پپیتے ہیں" کی ہانک لگاتا ہوُا گزر رہا تھا۔ ہمارے دوست نے لڑکا بھیج کر ریڑھی والے کو بلایا اور جب وہ آگیا تو یہ کہہ کر اُسے لَوٹا دیا کہ ہمیں ان پھلوں کی ضرورت نہیں ہے۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ اگر پھل خریدنے نہیں تھے تو ریڑھی والے کو بلایا کیوں تھا؟ اس پر بولے کہ مَیں نے یہ سب کچھ احتیاطاً کیا تھا۔ وہ اتنی دُور سے پھل لے کر آیا تھا، اس لئے اُسے بلا لیا گیا لیکن چونکہ مَیں نے پھل خریدنے نہیں تھے۔ اس لئے اُسے واپس بھیج دیا۔ بلانے کی دوسری وجہ یہ تھی کہ کہیں وہ یہ نہ سمجھ لے کہ ہمارے گھر میں سب بہرے ہیں اور کسی کے کانوں تک اس کی آواز نہیں پہنچتی۔ ہمارے یہی دوست ایک دن ہمارے ہمراہ کار پر کراچی کے گولی مار کے علاقے میں سے گزر رہے تھے۔ انہوں نے ایک دکان کے بورڈ پر یہ لکھا ہوُا دیکھا کہ "تشریف لائیے۔ ربڑی، قلفی اور لسّی تیار ہے"۔ ہمارے دوست نے فوراً کار رکوا کر دکان دار سے کہا کہ اوّل تو ہمارے پاس فی الحال فرصت نہیں کیونکہ ہم کسی ضروری کام سے جا رہے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے، ہم قلفی اور ربڑی نہیں کھاتے، رہی لسّی، تو لسّی پینے کے لئے یہ موسم مناسب نہیں۔ تاہم تمہاری پیش کش کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے۔ دکاندار نے خاموشی سے اُن کی باتیں سُنیں۔ ہمارے دوست کار میں واپس آ کر بیٹھے تو کہنے لگے کہ ہمارے ملک کے لوگ

معاشرتی آداب سے واقف نہیں ہیں۔ جب بھی کسی کا کوئی دعوت نامہ ہمیں ملتا ہے تو اس کے نیچے لکھا ہوتا ہے کہ "تشریف نہ لا سکنے کی صورت میں جواب سے مطلع فرمائیں۔" حالاں کہ جو لوگ دعوت میں شریک نہیں ہونا چاہتے، وہ میزبان کو یہ اطلاع دینا ضروری نہیں سمجھتے۔ اسی لئے اس بیچارے کا ان کے لئے پکوایا ہوا کھانا ضائع ہو جاتا ہے۔

جب ہم نے اپنی حالت پر غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود بھی ان لوگوں میں شامل ہیں جو آداب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ لوگ ہمیں متوجہ کرنے کے لئے طرح طرح کے اشتہارات اخبارات میں شائع کراتے ہیں لیکن ہم ان کی پروا نہیں کرتے اور اخبار پڑھ کر پرے پھینک دیتے ہیں۔ ذرا غور کیجئے کہ یہ جو آئے دن اخباروں میں ٹھیکے کے اشتہار یا ٹینڈر نوٹس چھپتے ہیں، یا پلاٹ یا مکان فروخت کرنے کی پیشکش ہوتی ہے یا کوئی شخص اپنے نافرمان بیٹے کو اپنی جائیداد سے عاق (بے تعلق) کرنے کا اعلان کرتا ہے یا کسی جگہ لڑکی کے لئے ضرورت رشتہ کا اشتہار چھپا ہوتا ہے اور جس میں ذات پات، تعلیم اور تنخواہ کی وہی شرائط درج ہوتی ہیں، جو صرف ہم پوری کرتے ہیں یا کسی اشتہار میں ہمیں لاکھوں روپے کمانے کی ترغیب دی جاتی ہے یا ہمیں شارٹ ہینڈ سیکھنے کی تلقین کی جاتی ہے یا کالج میں داخلہ لینے کے لئے اصرار کیا جاتا ہے یا ہمارے ہاتھ مناسب قیمت پر کار اور ریفریجریٹر بیچنے پر آمادگی ظاہر کرتا ہے ـــــ یہ سب کچھ ہماری خاطر ہوتا ہے لیکن ہماری مشکل یہ ہے کہ ہم سب کی پیش کش قبول نہیں کر سکتے۔ بہت سوچ بچار کے بعد ایک تدبیر ہمارے ذہن میں آئی ہے اور وہ یہ ہے کہ اخبارات میں "ضرورت ہے" کے اشتہارات چھپوانے کی بجائے "ضرورت نہیں ہے" کے اشتہارات چھپوانے چاہئیں۔ ان کے کچھ نمونے یہاں درج کئے جاتے ہیں۔

(۱) کرایہ کے لئے خالی نہیں ہے | چار سو گز رقبہ پر بنا ہوا تین بیڈ روم کا ایک ہوا دار کوٹھی نما مکان، جس میں نلکا لگا ہوا ہے اور دروازے کے بالکل سامنے کارپوریشن کی طرف سے کوڑا جمع کرنے کا ڈرم پڑا ہوا ہے، ہم کرائے پر نہیں دینا چاہتے۔ نہ تو اس کا کرایہ تین سو روپے ماہوار ہے اور نہ ہم چھ ماہ کا کرایہ پیشگی مانگتے ہیں، جو اصحاب کرائے کے مکان کی تلاش میں ہوں وہ فون نمبر ۳۴۵۶۷ پر رابطہ قائم نہ کریں کیونکہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔

(۲) اطلاع عام | میں، محمد دین ولد فتح دین، کریانہ فروش یہ اطلاع دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ میرا بیٹا رحمت اللہ نہ تو نافرمان ہے اور نہ بدمعاشوں کے پاس بیٹھتا ہے، اس لئے اُسے جائیداد سے عاق (لاتعلق) کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آئندہ جو صاحب اسے کوئی اُدھار وغیرہ دیں گے، اس کی ادائیگی کی ذمے داری مجھ پر ہو گی۔

(۳) ضرورت نہیں ہے | ہمیں ایک کار مارس مائنر۔ ماڈل ۱۹۵۹ء کی جو بہترین حالت میں ہے، ایک صاف آواز والے ریڈیو کی، ایک خوبصورت کیبنٹ کی، ایک ویسپا موٹر سائیکل کی اور دیگر گھریلو سامان از قسم پلنگ اور پنکھے وغیرہ کی قسطوں یا بغیر قسطوں کے ضرورت نہیں، کیوں کہ خدا کی مہربانی سے یہ سب چیزیں پہلے ہی ہمارے پاس موجود ہیں۔ ملاقات کا وقت ۳ بجے سے ۸ بجے شام تک ہے۔

(۴) عدم ضرورت رشتہ | ایک ملازم پیشہ پنجابی نوجوان کو جس کی ماہوار آمدنی پندرہ سو روپے ہے، کسی سلیقہ مند، خوبصورت اور شریف خاندان کی تعلیم یافتہ دوشیزہ کے رشتہ کی ضرورت نہیں ہے۔ کیوں کہ لڑکا پہلے ہی شادی شدہ ہے۔ خط و کتابت چھپا کر نہیں رکھی جائے گی۔ اس کے علاوہ اور بے شمار لڑکے اور لڑکیوں کے رشتے نہیں چاہیئں۔ پوسٹ بکس نمبر کراچی۔

(۵) داخلے جاری نہ رکھئے | کراچی کے اکثر کالجوں کی طرف سے آج کل انٹرمیڈیٹ اور ڈگری کلاسوں میں داخلے کے لئے لگاتار اشتہارات چھپ رہے ہیں۔ ان پر خواہ مخواہ وقت اور پیسہ ضائع ہو رہا ہے۔ ہم ان کالجوں میں داخل نہیں ہونا چاہتے کیوں کہ ہم نے کئی سال پہلے ایم اے پاس کر لیا تھا۔

اہم پیراگراف کی تشریح

سوال | درج ذیل پیراگراف کی تشریح کیجئے اور سیاق و سباق بھی لکھئے۔

ہم نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ ہم خود انہی آداب سے بے بہرہ لوگوں میں سے ہیں۔ لوگ اخباروں میں طرح طرح کے اشتہارات چھپواتے ہیں کہ ہم پڑھ کر ان کی طرف متوجہ ہوں لیکن ہم انہیں پڑھ کر ایک طرف ڈال دیتے ہیں۔ کوئی ہمارے لئے ٹھیکے کا بندوبست کرتا ہے اور ٹینڈر نوٹس شائع کرتا ہے کبھی کسی کو ہمارے ہاتھ پلاٹ یا مکان بیچنا ہوتا ہے۔ کوئی ہمیں یہ اطلاع دیتا ہے کہ اس نے اپنے نالائق فرزند کو جائیداد سے عاق کر دیا ہے۔ کہیں کسی کی کوشش ہوتی ہے کہ ہم اس کی فرزندی قبول کر لیں اور ذات پات، تعلیم اور تنخواہ کی شرطیں من و عن وہی رکھی جاتی ہیں جو ہم میں ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان سب ضرورت مندوں سے آدمی کیسے عہدہ برآ ہو۔

جواب | **حوالۂ متن** | یہ پیراگراف ابن انشاء کے مضمون "اشتہارات ضرورت نہیں ہے۔ کے" میں سے لیا گیا ہے۔

سیاق و سباق | مصنّف نے اس عبارت سے پہلے دو اشخاص کا ذکر کیا ہے۔ ایک بزرگ اپنے نوکر کو اس بات پر ڈانٹ رہے تھے کہ وہ احمق اور سست ہے۔ اسے ٹیکسی لانے کے لئے آدھ گھنٹے سے بھیج رکھا تھا لیکن وہ خالی ہاتھ واپس لوٹا حالاں کہ اس کی جگہ میر صاحب کے نوکر ہوتا تو ٹیکسی نہ سہی، موٹر رکشا کا بندوبست کر کے آتا۔ میر صاحب کے نوکر کو ایک چیز لانے کے لئے بھیجا جائے تو وہ اتنا سمجھ دار ہے کہ دو تین ایسی چیزیں بھی ساتھ لے آتا ہے جن کی مستقبل میں ضرورت پڑ سکتی ہے۔ ان بزرگ کے نوکر نے یہ بات پلے باندھ لی اور ایک دن جب وہ بیمار ہوئے اور اُسے حکیم صاحب کو بلا لانے کے لئے بھیجا گیا تو وہ اپنے ہمراہ درزی، غسّال اور گورکن کو بھی لیتا آیا۔ مصنّف نے ایک اور دوست کا ذکر ہے۔ جو گلی میں سے گزرنے والے پھل فروش کو پہلے بلاتے اور پھر واپس جانے کے لئے کہتے تھے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ وہ پھل فروش کو مایوس نہیں کرنا چاہتے اسی طرح ایک دفعہ وہ مصنّف کے ہمراہ کار پر گولی مار سے گزرے تو ایک ربڑی، قلفی اور لسّی والے کی دکان پر اُتر کر اُس سے بحث و تکرار کرنے لگے اور اُسے یہ بات بتانے لگے کہ انہیں ربڑی اور قلفی سے کوئی دلچسپی نہیں ہے اور لسّی پینے کے لئے یہ موسم موزوں نہیں ہے۔

اس عبارت کے بعد مصنّف نے اخبارات میں چھپنے والے اشتہارات کو دیکھ کر خود بھی اشتہارات چھپوانے کا ارادہ کر لیا اور اس سلسلے میں "ضرورت نہیں ہے" کے پانچ اشتہارات چھپوانے کی خواہش ظاہر کی یعنی کرائے کے لئے خالی ہے"۔ "اطلاعِ عام"۔ "ضرورت نہیں ہے"۔ "عدمِ ضرورتِ رشتہ" اور "داخلے جاری نہ رکھئے"۔

تشریح | مصنّف کہتا ہے کہ اپنے دوست کی یہ بات سُن کر کہ ہمارے مُلک کے لوگوں کو آداب و اخلاق سے کوئی واسطہ نہیں، جب میں نے اپنی حالت پر غور کیا تو محسوس ہوُا کہ میں خود بھی ان لوگوں میں شامل ہوں جو معاشرتی آداب سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اخبارات میں لوگوں کی طرف سے مختلف قسم کے اشتہارات شائع ہوتے ہیں اور ان کی عبارت پڑھ کر عموماً لوگ ان میں کشش محسوس کرتے ہیں لیکن میرا حال یہ ہے میں ان اشتہارات کو پڑھ کر اخبار پرے پھینک دیتا ہوں۔ ان اشتہاروں میں کسی کی عبارت ایسی ہوتی ہے جس میں خوش خبری سنائی جاتی ہے کہ جس ٹھیکے کا اشتہار چھپا ہے، وہ میرے لئے ہے یا جو ٹینڈر نوٹس شائع ہوُا ہے۔ اس کا مخاطب میں ہوں۔ کبھی کسی پلاٹ یا مکان کو بیچنے کا اشتہار چھپتا ہے اور لگتا

ہے کہ وہ میرے لئے شائع ہوُا ہے۔ کسی اشتہار میں ایک صاحب اپنے نافرمان بیٹے کو جائیداد سے لاتعلق کرنے کا اعلان چھاپتے ہیں۔ کہیں کسی لڑکی کے لئے ضرورتِ رشتہ کا اشتہار شائع ہوتا ہے جسے پڑھ کر یوں لگتا ہے کہ جیسے میں ہی اشتہار دینے والے کا داماد بننے کا اہل ہوں کیوں کہ انہوں نے ذات برادری، تعلیم اور تنخواہ کی جو شرائط رکھی ہوتی ہیں، وہ حرف بحرف میں پوری کرتا ہوں۔ اب ان اشتہاروں کو پڑھ کر سمجھ میں نہیں آتا کہ میں ان تمام لوگوں کی اتنی ڈھیر ساری ضروریات اکیلا کیسے پوری کروں۔

شفیق الرحمٰن (ولادت: ۱۹۲۰ء)

کلیدِ کامیابی

تعارف اور پس منظر

شفیق الرحمٰن کا موجودہ طنزیہ مضمون "کلیدِ کامیابی" اُن کی کتاب "مزید حماقتیں" میں سے لیا گیا ہے، جہاں وہ "کلیدِ کامیابی" (حصہ دوم) کے عنوان سے شامل ہے۔ موجودہ نصابی کتاب میں پورے مضمون کی بجائے اس کا صرف ایک منتخب حصہ شامل کیا گیا ہے "کلیدِ کامیابی" ایک پیروڈی ہے، ان مقبولِ عام کتابوں کی جو لوگوں کو کامیابی کے گر سکھانے کی دعویدار ہیں۔ شفیق الرحمٰن بڑے کامیاب پیروڈی نگار ہیں، چنانچہ اپنی کتابوں "مزید حماقتیں" اور "پرواز" میں انہوں نے کئی اور پیروڈیاں بھی لکھی ہیں مثلاً تزکِ نادری عرف سیاحت نامۂ ہند۔ سفرنامہ جہاد باد سندھی۔ دو نظمیں اور زنانہ اُردو خط و کتابت ("مزید حماقتیں" میں) اور قصہ حاتم طائی بے تصویر۔ تحت الشعور اور لاشعور اور ہدایت نامہ طلبا ("پرواز" میں)

موجودہ مضمون "کلیدِ کامیابی" لکھنے کا محرک بقولِ مصنف وہ بے شمار کتابیں ہیں، جو کامیابی کے موضوع پر اس کی نظر سے گزریں۔ اس نے ان کتابوں کے نام بھی گنوائے ہیں۔ مثلاً "لاکھوں کمائیے"، "رہنمائے قانون"، "گھر کا طبیب"، "کامیاب زندگی"، "کامیاب مرغی خانہ" "ریڈیو کی کتاب"، "کلیدِ کامیابی" اور "کلیدِ مویشیاں" وغیرہ۔ ان میں بعض کتابیں واقعی کانوں پر ان ناموں سے بجتی ہیں اور بعض کے نام مصنف نے ازراہِ تفنن گھڑ لئے ہیں۔ بہرحال مصنف کہتا ہے کہ وہ اس قسم کی کتابوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے بھی "کلید کامیابی" کے نام سے ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کر لیا۔ اس نے بتایا ہے کہ وہ پہلے بھی اس نام سے ایک کتاب لکھ چکا ہے جو دراصل حصۂ اول تھی اور اب اس کا حصۂ دوم وہ لکھ رہا ہے۔ درحقیقت نہ اس نے پہلے کوئی کتاب اس نام کی لکھی تھی اور نہ اب لکھ رہا ہے، بلکہ وہ تو اس قسم کی عامیانہ کتابوں کی مضحکہ خیزی کو نشانۂ طنز بنانا چاہتا ہے۔ کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ اس قبیل کی کتابیں محض روپیہ کمانے اور لوگوں کو اُلّو بنانے کے لئے لکھی جاتی ہیں۔ اسی لئے اس نے اپنے موجودہ مضمون کی ابتداء میں طنزاً یہ بتایا ہے کہ آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد پر خواہ مخواہ تلا ہوا

ہے اور بلاوجہ دوسروں کو شاہراہِ کامیابی پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ مصنّف نے اپنے مضمون میں کامیابی کا گُر سکھانے والی ان کتابوں کے اسلوب کی نقل اتارتے ہوئے، نہ صرف ان کی مضحکہ خیزی آشکار کی ہے بلکہ اپنے معاشرے کی بعض خامیوں اور بعض انسانی رویّوں پر بھی لطیف انداز میں تبصرہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں اس نے درجِ ذیل آٹھ عنوانات کے تحت اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔ (۱) عظمت کا راز (۲) حافظہ تیز کرنا (۳) خوف سے مقابلہ (۴) وقت کی پابندی (۵) وہم کا علاج (۶) بے خوابی سے نجات (۷) گفتگو کا آرٹ اور (۸) تربیتِ اطفال۔

انسان چونکہ زود رنج ہوتا ہے، اس لئے "عظمت کا راز" میں مصنّف نے ایسے تمام لوگوں کو آڑے ہاتھوں لیا ہے، جو بات بے بات رنجیدہ ہونے کے مواقع خود پیدا کرتے رہتے ہیں۔ "حافظہ تیز کرنا" میں ان زود فراموش لوگوں کا مذاق اڑایا ہے، جو اُٹھتے بیٹھتے اپنے حافظہ کی خرابی کا رونا روتے رہتے ہیں۔ "خوف سے مقابلہ" میں بچوں کو بھوت پریت، چڑیل اور ہوّے سے ڈرانے کے رویّے کی مذمت کی ہے۔ "وقت کی پابندی" میں ان لوگوں کو نشانۂ تنقید بنایا ہے جو تقریبات میں کبھی وقت پر نہیں پہنچتے۔ "وہم کا علاج" میں ان لوگوں کی خبر لی ہے جو اچھے بھلے تندرست آدمی کو بیماری کے وہم یا احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ "بے خوابی سے نجات" میں فلسفہ اور ریاضی کی ان موٹی موٹی اور خشک کتابوں کی بھداڑائی ہے، جنہیں پڑھتے ہی نیند آنے لگتی ہے۔ "گفتگو کا آرٹ" میں ان "بور" لوگوں کے لتّے لئے ہیں جو ایک دفعہ بولنا شروع کر دیتے ہیں تو پھر رکنے کا نام نہیں لیتے۔ "تربیّتِ اطفال" میں والدین کی طرف سے بچّوں پر سختی کرنے، ان کے سوالوں کا جواب دینے کی بجائے حوصلہ شکنی کرنے، انہیں بھوتوں سے ڈرانے، دلچسپ کتابیں پڑھنے سے روکنے اور صرف نصابی کتابیں رٹنے، انہیں مہمانوں کے سامنے نہ ڈانٹنے اور تنہائی میں خوب پٹائی کرنے، ان کی غذا کے بارے میں غیر ضروری احتیاطیں کرنے، ان کی ضد کے جواب میں خود ضد کرنے اور ان کی نفسیاتی اُلجھنیں خود رفع کرنے کی بجائے ماہرینِ نفسیات کے پاس دوڑے دوڑے جانے کی مذمت کی ہے۔ "تربیتِ اطفال" کے سلسلے میں مصنّف نے والدین اور ماہرینِ نفسیات کی بھی یہ کہہ کر چٹکیاں لی ہیں کہ بچّوں کا تجزیۂ نفس کرانے سے پہلے خود ان کا اپنا تجزیۂ نفس کرا لینا زیادہ مفید ثابت ہوگا۔ اسی طرح اس نے مزاحاً کہا ہے کہ عموماً گھر میں دو تین بچّے ہوں تو ان سے بہت لاڈ پیار کیا جاتا ہے لہٰذا اس عادت سے بچنے کے لئے کنبہ میں ہمیشہ دس بارہ بچوں کا ہونا ضروری ہے تاکہ ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔ اسی طرح مصنّف کے اس آخری جملے میں بھی بڑا پُر لطف پیراڈاکس

(PARADOX) یا قولِ محال موجود ہے کہ "آخری بچہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے بگاڑ دیا جاتا ہے، چنانچہ آخری بچہ نہیں ہونا چاہیئے"۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۹۱ کلید: کنجی، چابی۔ خوش قسمت: اچھے نصیب والے۔ حیرت انگیز: حیران کر دینے والا۔ دور: زمانہ۔ ہنر: کام، فن۔ خواہ مخواہ: مجبوری سے۔ تلا ہؤا: جوش اور رغبت کے ساتھ آمادہ ہونا۔ بلا وجہ: بغیر کسی سبب کے۔ شاہراہِ کامیابی: کامیابی کا راستہ، شاہراہ، بڑے راستے یا چوڑی سڑک کو کہتے ہیں۔ گامزن: چلتے ہوئے۔ موضوع: عنوان۔ مخدوش: خراب، خطرناک، خدشات سے بھری ہوئی۔ مقدمہ بازی: دوسروں پر مقدمے دائر کرنا یا نالش کرنا۔ طبیب: حکیم، علمِ طب کا ماہر۔ شفا: بیماری سے صحت یابی۔ مویشیاں: مویشی کی جمع، جانور۔ لاتعداد: بے شمار۔ بنی نوعِ انسان: انسان کی نسل، بے شمار انسان۔ واقف: آگاہ۔ ازراہِ تشکر: شکریے کے طور پر۔ افادی ادب: وہ ادبی کتابیں جو انسانیت کے لیئے مفید ثابت ہوتی ہیں۔

ص ۱۹۲ عظمت: بڑائی۔ غمگین: غم زدہ۔ کارلائل: تھامس کارلائل، انگریزی زبان کا مشہور مورخ، ادیب اور دانشور، وہ ۱۷۹۵ء میں پیدا ہؤا اور ۱۸۸۱ء میں فوت ہؤا۔ اس کی کتابوں میں اون ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ۔ فرینچ ریوولیوشن۔ سارٹر ریزارٹس۔ پاسٹ اینڈ پریزنٹ۔ لائف اینڈ لیٹرز آف آلیور کرامویل اور فریڈرک دی گریٹ، مشہور ہیں۔ اس نے ایڈنبرا یونیورسٹی میں تعلیم پائی، کچھ عرصہ درس و تدریس کا پیشہ اپنایا اور بعد ازاں خود کو علم و ادب کے لیئے وقف کر دیا۔ ہاضمہ: نظامِ ہضم، ہضم کرنے کی قوت۔ پیٹ میں غذا کی تحلیل کا عمل۔ سیزر: جولیس سیزر، مشہور رومی جرنیل اور بعد ازاں اٹلی کا آمرِ مطلق (ڈکٹیٹر) جو ۱۰۰ء قبل مسیح میں پیدا ہؤا اور ۴۴ء قبل مسیح میں قتل ہؤا۔ اس نے گال (فرانس) اور برطانیہ پر حملہ کیا، خانہ جنگی میں پومپئی کو شکست دی، سکندریہ (مصر) کی لڑائی میں قلوپطرہ (مصری ملکہ) سے ملا اور اسے مصر کے تخت پر مستحکم کیا۔ ۴۵ء قبل مسیح میں جب وہ متعدد فتوحات کے نشے میں چُور روم آیا تو اُسے بادشاہ بننے کے لیئے تاج پیش کیا گیا لیکن اُس نے قبول نہ کیا۔ اس کی کامرانیوں کی وجہ سے ملک کا بالائی طبقہ اس سے جلنے لگا۔ بالآخر، کاسکا اور بروٹس سمیت کئی آدمیوں نے اسے روم کے سینیٹ میں قتل کر دیا اور عذر یہ پیش کیا کہ انہوں نے رومنوں کو سیزر کے ظلم سے نجات دلانے کے لیئے ایسا کیا ہے۔ مرگی: ایک مرض جس میں اچانک غشی آجاتی ہے اور مُنہ سے جھاگ نکلتا ہے۔ زار: روس کے بادشاہوں کا لقب۔ آئیوان (IVAN): اس

نام کی دو مشہور حکمران روسی شخصیتیں ہوئی ہیں (۱) آئیوان اعظم (IVAN THE GREAT) جو ۱۴۴۰ء میں پیدا ہؤا اور ۱۵۰۵ء میں فوت ہؤا۔ اس نے مسکووی (روس) کے منتشر علاقوں کو متحد کر کے ایک عظیم اور مضبوط حکومت کی بنیاد رکھی اور تاتاریوں کی حکمرانی کا خاتمہ کر دیا۔ (۲) آئیوان ہیبت ناک (IVAN THE TERRIBLE) جو ۱۵۳۰ء میں پیدا ہؤا اور ۱۵۸۰ء میں فوت ہؤا، روس کا بہت مضبوط اور مطلق العنان حکمران تھا۔ وہ ۱۵۴۷ء میں روس کا پہلا زار بنا۔ اس نے روس میں داخلی اتحاد قائم کیا اور اپنی سلطنت کی حدود وسیع کرنے کے لئے روس کے مشرقی سمت کے علاقوں کو فتح کیا۔ اس نے برطانیہ کی ملکہ ایلزبیتھ کے ساتھ تجارتی روابط استوار کئے۔ یہاں ("کلید کامیابی" میں) یہ دوسرا آئیوان مراد ہے کیونکہ وہ روس کا مشہور زار بتایا گیا ہے۔ نیم پاگل: کچھ کچھ پاگل، جس پر کبھی کبھی پاگل پن کے دورے پڑیں۔ خودکشی: اپنے آپ کو مارنا۔ کلائیو: لارڈ رابرٹ کلائیو (CLIVE) ۱۷۲۵ء میں انگلستان میں پیدا ہؤا اور ۱۷۷۴ء میں فوت ہؤا۔ اس نے سترہ سال کی عمر میں ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت میں ایک کلرک کی حیثیت سے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا۔ جب ہندوستان میں فرانس کے اثر و رسوخ کو محدود کرنے کے لئے انگلستان اور فرانس کے نمائندوں کے درمیان بعض ڈپلومیٹک مشکلات اُٹھ کھڑی ہوئیں تو کمپنی کے کارپردازوں کی نظر کلائیو پر پڑی جس نے انہیں بڑے مفید مشورے دیئے پھر جب انگلستان اور فرانس کے درمیان ہندوستان کی بندر بانٹ کے سلسلے میں لڑائی چھڑی تو کلائیو کو بھی چند فوجی دستوں کی کمان دی گئی۔ اس میدان میں اس نے کمال درجے کی عسکری ذہانت کا ثبوت دیا حتیٰ کہ وہ عملاً انگریزی فوج کا کمانڈر انچیف بن گیا۔ ہندوستان کے مقامی حکمرانوں کو یکے بعد دیگرے شکستیں دے کر اس نے ہندوستان میں انگریزی حکومت کی بنیادیں بے حد مضبوط کر دیں۔ وہ ہندوستان میں برطانوی حکومت کا سب سے بڑا محسن تھا۔ ۱۷۶۰ء میں وہ انگلستان واپس چلا گیا جہاں اُسے لارڈ بنایا گیا۔ اپنی عمر کے آخری برسوں میں اُس کا دماغی توازن بگڑ گیا اور آخر کار اس نے خودکشی کر کے اپنا خاتمہ کر لیا۔ کانٹ: عمانوایل کانٹ، جو جرمن سائنسدان اور فلسفی تھا ۱۷۲۴ء میں پیدا ہؤا اور ۱۸۰۴ء میں فوت ہؤا۔ اس کی مشہور کتاب "عقل محض پر تنقید" (CRITIQUE OF PURE REASON) جو ۱۷۸۱ء میں شائع ہوئی، نے اس کے ملک میں ایک ہنگامہ برپا کر دیا کیونکہ اس کی زد عیسائی مذہب کے مروّجہ عقائد پر پڑتی تھی۔ اس کتاب کی وجہ سے اُسے پرشین حکومت کی طرف سے تکالیف کا سامنا کرنا پڑا۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپین فلسفیانہ افکار پر کانٹ کے نظریات کی چھاپ سب سے گہری ہے۔ کلاسیکی موسیقی: قدیم، پختہ، اعلیٰ اور معیاری موسیقی۔ بیمار اور بیزار فن کار: یہاں مراد یورپ کے اٹھارویں اور انیسویں صدی

عیسوی کے وہ شہرہ آفاق موسیقار ہیں جو یا تو جسمانی طور پر معذور تھے یا عام لوگوں سے ملنے سے گریز کرتے تھے مثلاً بیتھوون، (BEETHOVEN) موزارٹ، (MOZART) باخ، (BACH) وگینر (WAGNER)، ہینڈل (HANDEL) اور شوپاں (CHOPIN) وغیرہ۔ مرہونِ منت: احسان مند۔ مغموم موڈ: غمگین دماغی کیفیت یا طبیعت کا رجحان۔ تخلیق: بنائی یا پیدا کی ہوئی چیز۔ لہٰذا: پس، اس لئے۔ آسرا: سہارا۔ دنیا کا عظیم ادب...... جیلوں میں لکھا گیا: یہاں شاید مصنف کا اشارہ آسکر وائلڈ کی شاہکار کتاب "ڈی پروفن ڈِس (دل کی گہرائیوں سے) کی طرف ہے جو اس نے ریڈنگ جیل (برطانیہ) میں لکھی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی کتاب "غبارِ خاطر" بھی جیل کی پیداوار ہے۔ فیض احمد فیض کی "دستِ صبا" اور "زنداں نامہ" کی نظمیں بھی جیل کی سلاخوں کے پیچھے لکھی گئیں۔ رنجیدہ: غمگین۔ ماشاء اللہ: جو اللہ چاہے، کلمۂ تحسین و آفرین ہے، سبحان اللہ، کیا کہنا۔ حُزن: رنج و ملال۔ الم: غم۔ برآمد: نکلنا۔ طعنہ: چبھتی ہوئی بات یا طنز۔ پڑوسی: ہمسائے۔ عنقریب: بہت جلد۔ افواہ: بے بنیاد خبر، بے تحقیق خبر۔ قرض: ادھار۔ پائی: پرانے زمانے کا ایک معمولی سکہ۔ مدعو کرنا: دعوت دینا۔ آہیں بھرنا: ٹھنڈی سانس لینا۔ ہائے ہائے کرنا۔ شکن: بل، لکیر۔ جھُرّی۔ احساس برتری: بڑائی کا احساس۔ آشنا: واقف۔

ص ۱۹۳ | سدا: ہمیشہ۔ بیزار: ناخوش۔ نطشے: فریڈرک ولہلم نیٹشے، مشہور جرمن فلسفی، جو ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا اور ۱۹۰۰ء میں فوت ہوا۔ جوانی کے ایام میں وگینر (۱۸۱۳ء-۱۸۸۳ء) اور شوپن ہار (۱۷۸۸ء-۱۸۶۰ء) کے افکار سے بہت متاثر ہوا۔ اس کا نظریۂ فوق البشر (SUPER MAN) اس کی درج ذیل کتابوں میں بڑی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ "اور زرتشت نے کہا" (THUS SPAKE ZARATHUSTRA) "خیر و شر سے ماوراء" (BEYOND GOOD AND EVIL) اور ارادۂ قوت (THE WILLTO POWER) فوق الانسان: نطشے کا فوق البشر (SUPER MAN) یا "مردِ برتر"۔ وہ ایسی ہستی ہے جو عام انسانی اوصاف سے زیادہ صفات کی مالک ہے۔ نطشے نے "مردِ برتر" کی یہ اصطلاح جرمن شاعر گوئٹے سے لی ہے۔ نطشے کے خیال میں انسانی معاشرے کا مقصود و منتہا تمام انسانوں کی ترقی و نشوونما نہیں بلکہ صرف بہترین اور مضبوط افراد کی پرورش کرنا ہے۔ گویا معاشرہ وہ وسیلہ ہے جو "مردِ برتر" کی شخصیت کی تشکیل اور قوت میں اضافہ کا سامان مہیا کرتا ہے۔ نطشے کا فوق الانسان خیر و شر کے اخلاقی اصولوں سے بالاتر ہے۔ اُسے عام انسانوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔ وہ خدا کا منکر ہے۔ اس کی تین صفات ہیں۔ (۱) قوت (۲) فراست (۳) تکبر۔ موڈ: مزاجی حالت یا کیفیت۔ مسرور: خوش۔ حافظہ: یاد رکھنے کی صلاحیت۔ فقط: صرف۔ ترکیب: طریقہ۔ دانشمند: عقل مند۔

مشاہدہ: دیکھنے کی صلاحیت، دیکھنا۔ پھرتی: چستی، تیزی، ہوشیاری۔ فہرست: چیزوں کی تفصیل کی فرد، لسٹ۔ ٹریننگ: تربیت۔ حافظ: یاد رکھنے والا۔ لہٰذا: اس لئے، پس۔ فرحت: خوشی، راحت۔ فلسفی: زندگی اور کائنات کے مسائل پر غور و فکر کر کے اپنے نتائج افکار کو کسی نتیجہ پر پہنچانے والا اور انہیں مربوط انداز میں پیش کرنے والا۔ شوپن ہار: آرتھر شوپن ہار (SCHOPENHAUER) قنوطی ذہن (جس کا رجحان غم اور مایوسی کی طرف ہو) کا جرمن فلسفی جو ۱۷۸۸ء میں پیدا ہوا اور ۱۸۶۰ء میں فوت ہوا، وہ مشہور فلسفیوں افلاطون اور ہیراکلیٹس کا بے حد مداح تھا اس کی مشہور کتابیں یہ ہیں: "ارادہ اور خیال کی دنیا" (THE WORLD CONSIDERED AS WILL AND IDEA) اور "اخلاقیات کے دو بنیادی مسائل" (THE TWO FUNDAMENTAL PROBLEMS OF GTHICS) مردِ عاقل: دانا آدمی۔

ص ۱۹۴ سکونِ قلب: دل کا اطمینان۔ نقش قدم پر چلنا: پیروی یا تقلید کرنا۔ مشاہدہ: دیکھنا۔ بے سُود: بیکار۔ ٹریننگ: تربیت۔ بھوت: بدروح جو بھٹکتی پھرتی ہے۔ چڑیل: ڈائن، خوفناک اور بدصورت عورت۔ ہاؤ: ہوا۔ وہ بھیانک خیالی شکل جس سے بچوں کو ڈراتے ہیں فرضی جن، بھوت پریت۔ تاریکی: اندھیرا۔ تنہائی: اکیلاپن۔ خوفزدہ: ڈرنے والا، خوف کا مارا ہوا۔ وہم: وہ خیال جس کی کوئی بنیاد نہ ہو۔ طبیب: حکیم۔ احساس کمتری: خود کو دوسروں سے پست تصور کرنا۔ مندرجہ ذیل: نیچے درج کئے گئے۔

ص ۱۹۵ قابل: لائق۔ خامی: نقص۔ بے خوابی: نیند نہ آنا۔ انہماک: توجہ۔ فلسفہ: مجرب: آزمایا ہوا۔ مطالعہ: پڑھنا۔ آرٹ: فن۔ دورانِ گفتگو: بات چیت کرتے وقت۔ بور کرنا: بدمزہ کرنا۔ واضح کرنا: وضاحت کرنا۔ قطع کلامی: بات میں دخل دینا، گفتگو کے بیچ میں بولنا، کسی کی بات پوری ہونے سے پہلے بول پڑنا۔ طویل: لمبی۔ جمائی لینا: اوپر کا جبڑا اوپر کو اور نیچے کا نیچے کو پورے تناؤ سے کر کے (دہانہ کھول کر) سینے سے سانس باہر نکالنا۔ ایسا سستی اتارنے کے لئے یا نیند کے خمار میں کیا کرتے ہیں۔ مجلسی تکلفات: باہمی میل جول کے وقت ظاہرداری برتنا۔ خلل: خرابی، بگاڑ۔

ص ۱۹۶ سرزد ہونا: ظاہر ہونا، واقع ہونا۔ ٹوکنا: پوچھ گچھ، روک ٹوک، مزاحمت۔ اُلٹے سیدھے: جن کا کوئی سر پیر نہ ہو، بے ترتیب، بے قاعدہ۔ دلائل: دلیل کی جمع، ثبوت، حجت، وجہ۔ سر پر چڑھنا: گستاخ ہونا۔ تربیت: پرورش۔ اطفال: طفل کی جمع، بچے۔ انداز: طریقہ۔ بھوت: بدروح جو بھٹکتی پھرتی ہے۔ ادب: احترام۔ کورس: نصاب، پڑھانے کے لئے مقررہ کتابیں۔ جینیئس: غیر معمولی ذہین انسان، نابغہ، عبقری۔ تحت الشعور: انگریزی میں

اسے SUB - CONSCIOUS کہتے ہیں اور یہ علم نفسیات کی اصطلاح ہے۔ نفس کا وہ حصہ جس میں نفسی عمل واقع ہوتا ہے مگر اس کا پورا شعور نہیں ہوتا۔ وہ باتیں جو انسان کے ذہن میں موجود تو ہوتی ہیں لیکن دبی ہوئی۔ اور وہ تھوڑے سے غور کے بعد یاد آجاتی ہیں۔ گویا وہ ذہن کی بالائی سطح پر آجاتی ہیں۔ تواضع کرنا: لفظی معنی خاطر اور خدمت کرنا۔ یہاں مراد ہے ٹھکائی کرنا یا مارنا پیٹنا۔ خوب مرمت کرنا۔ احتیاط: خبرداری، ہوشیاری، دُور اندیشی۔ پبلک: عوام۔ ضد: ہٹ۔ کسی بات پر اڑ جانا۔ ماہرین: مہارت رکھنے والے۔ اصرار: تاکید۔ موزوں: مناسب۔ تجزیۂ نفسی: انگریزی میں اسے (PSYCHO - ANALYSIS) کہتے ہیں اور یہ علم نفسیات کی اصطلاح ہے۔ اُردو میں اسے تحلیل نفسی بھی کہتے ہیں۔ یہ اعصابی یا ذہنی امراض کے علاج کے لئے ایک خاص طریقۂ تفتیش یا طریقۂ علاج ہے جس میں مریض کے ذہن میں دبی ہوئی یا فراموش کردہ خواہشات کو باہر لا کر ان کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ یہ انسانی کردار اور ذہن کا سائنسی مطالعہ ہے۔ اس میں نفسیاتی مریض کی اندرونی کیفیات و واردات اور خارجی اعمال و افعال کو روشنی میں لا کر اس کے عصبی و ذہنی امراض کا علاج کیا جاتا ہے۔

ص ۱۹۷ کنبہ: گھرانہ، بال بچے، خاندان۔ لاڈلا: وہ بچّہ جسے ماں باپ نے بہت پیار سے پالا ہو۔ لہٰذا: اس لئے۔ مصنّف: مضمون یا کتاب خود اپنے ذہن سے لکھنے والا۔ رائیگاں: بے کار، اکارت، برباد ہونا۔

سبق کا خلاصہ

شفیق الرحمٰن لکھتے ہیں کہ آج کا انسان اس لحاظ سے خوش قسمت ہے کہ اُسے ترقی کرنے کے بہت سے مواقع حاصل ہیں۔ پرانے زمانے میں ہر شخص کو کوئی نہ کوئی ہنر سیکھنا پڑتا تھا لیکن موجودہ زمانے میں ہر شخص دوسروں کی مدد کرنا اپنا فرض سمجھتا ہے اور انہیں ترقی کرتے دیکھنا چاہتا ہے۔

کامیابی حاصل کرنے کے موضوع پر بے شمار کتابیں ملتی ہیں۔ کسی کی مالی حالت خراب ہو، یا وہ مقدمے بازی میں مصروف ہو یا وہ بیمار ہو، اس کی رہنمائی کے لئے طرح طرح کی کتابیں بازار میں موجود ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں "لاکھوں کماؤ"، "رہنمائے قانون" اور "گھر کا طبیب" وغیرہ کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔ اسی طرح "کامیاب زندگی"، "کامیاب مرغی خانہ"، "ریڈیو کی کتاب"، "کلید کامیابی"، "کلید مویشیاں" اور ایسی ہی دیگر کتابیں انسانیت کی بے پناہ خدمت کر رہی ہیں۔ مصنّف ان کتابوں سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے بھی شکریے کے طور پر "کلید کامیابی" (حصّہ دوم) لکھنے کا ارادہ کر لیا تاکہ "کلید کامیابی" (حصّہ اوّل) میں جو فائدہ بخش نکتے درج ہونے سے رہ گئے تھے، وہ اب اس کتاب میں شامل

کئے جا سکیں۔ اس کے نزدیک دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے وُہ گر درج ذیل ہیں :-

۱۔ عظمت کا راز | دنیا میں عظمت حاصل کرنے کے لئے غمگین رہنا ضروری ہے کیونکہ تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ دنیا کے عظیم ترین انسان ہمیشہ کسی نہ کسی غم میں مبتلا رہے ہیں مثلاً مورخ کارلائل کا ہاضمہ خراب رہتا تھا۔ رومی فاتح جولیس سیزر کو مرگی کا مرض تھا، زارِ روس آئیوان نیم پاگل تھا اور لارڈ کلائیو نے کئی بار خودکشی کی کوشش کی فلسفی کانٹ کو اپنا قد چھوٹا ہونے کا غم تھا۔ یورپ کی کلاسیکی موسیقی وہاں کے بیمار اور بیزار فن کاروں نے تخلیق کی۔ اسی طرح دنیا کا بہترین ادب، المیہ کیفیات کے زیرِ اثر تحریر کیا گیا اور اکثر جیلوں میں لکھا گیا۔ اس سے ثابت ہوا کہ غمگین ہوئے بغیر کوئی بھی بڑا کارنامہ سرانجام دینا ناممکن ہے۔ لہٰذا آپ بھی آج سے رنجیدہ رہنا شروع کر دیں۔

یوں بھی ہمارے ملک میں غمگین رہنے کے بے شمار مواقع میسر ہیں اور تو اور خود ہماری اُردو شاعری بھی رنج و غم سے بھرپور ہے۔ اگر آپ اپنے دل کو دُکھی کرنا چاہتے ہیں تو زندگی کو بے معنی سمجھنے لگئے۔ رشتہ داروں کے طعنوں اور پڑوسیوں کی اڑائی ہوئی افواہوں کو یاد کیجئے۔ ان لوگوں کے بارے میں سوچئے جو آپ سے قرض لے کر ادا کرنا بھول گئے ہیں یا خیال کیجئے کہ زندگی کتنی مختصر ہے اور مرنے کے بعد ہمارا کیا حشر ہوگا؟ یا شام کی گاڑی سے جو پندرہ بیس رشتہ دار بغیر پیشگی اطلاع دیئے آپ کے ہاں تشریف لانے والے ہیں، آپ نے ان کے بستروں کا کیا انتظام کرنا ہے یا چشتی صاحب اور قطب الدین صاحب کے اس ناروا سلوک کو یاد کیجئے، جنہوں نے آپ کو جان بوجھ کر اپنی دعوتوں میں نظر انداز کر رکھا ہے۔ یہ ساری باتیں آپ کو غمگین کرنے کے لئے کافی ہیں۔ آپ ان کے زیر اثر ہر ایک سے لڑائی کیجئے اور اپنے اندر وہ احساسِ برتری پیدا کیجئے جو ہمیشہ بیزار رہنے والوں کا وطیرہ ہے۔ اِسی احساس نے انسان کو مشہور فلسفی نطشے کا فوق الانسان بنایا ہے۔ کوئی عظیم کام کر چکنے کے بعد اپنا موڈ بدلنے کے لئے ایسی کتابیں بازار سے منگوا کر پڑھیئے جن میں آپ کو خوش رہنے کے طریقے بتائے گئے ہوں۔

۲۔ حافظہ تیز کرنا | اگر آپ کا حافظہ کمزور ہے تو آپ ساری باتیں یاد رکھنے کی کوشش ہی نہ کریں۔ اس طرح کچھ نہ کچھ باتیں آپ کو یقیناً یاد رہ جائیں گی۔ بعد میں اس پچھتاوے سے بچنے کے لئے کہ آپ نے یہ بات پہلے کیوں نہ سوچی، آپ کو چاہیئے کہ یا تو باتوں کو ہمیشہ پہلے سے سوچ کر رکھئے یا پھر ایسی باتیں یاد دلانے والے لوگوں سے دُور رہئے۔ مشاہدہ تیز کرنے کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کچھ دیکھئے اور پھر سوچ سوچ کر دیکھی جانے والی چیزوں کی فہرست بنائیے۔ اس طرح آپ کے حافظے کی آزمائش ہو جائے گی۔ جب آپ فارغ ہوں تو جیب میں کاغذ اور پنسل رکھیں اور چیزوں کی فہرستیں بناتے رہیں۔ اس عمل سے آپ کو

بہت خوشی حاصل ہو گی۔ فلسفی شوپن ہار سیر کے لئے جاتے وقت اپنی چھڑی سے درختوں کو چھوا کرتا تھا اور اگر کوئی درخت چھوٹ جاتا، چاہے وہ ایک میل دور ہی کیوں نہ ہوتا تو وہ واپس جا کر اُسے پہلے چھوتا اور پھر سیر کے لئے آگے بڑھتا تھا۔ اُس سے اُسے دلی سکون حاصل ہوتا تھا۔ آپ کو بھی اس کے نقش قدم پر چلنا چاہیئے۔

۳۔ خوف سے مقابلہ | ہمیں بچپن ہی سے بھوت، چڑیل، ہوے اور دیگر چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے۔ اگر آپ کو اندھیرے سے ڈر لگتا ہے تو وہاں مت جائیے اگر مجبوراً جانا پڑے یا تاریکی ہو جائے تو جلدی سے روشنی کی طرف آ جائیے۔ اس طرح آپ کا خوف دور ہو جائے گا۔ اگر آپ تنہائی سے خوفزدہ ہوں تو دوسرے لوگوں سے ملیئے۔ ایک وقت میں آپ کو صرف ایک چیز سے ڈرنا چاہیئے، ورنہ یہ معلوم کرنا مشکل ہو جائے گا کہ دراصل آپ کس چیز سے خوف کھاتے ہیں؟

۴۔ وقت کی پابندی | تجربے سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر آپ کسی تقریب میں وقت پر پہنچ جائیں تو ہمیشہ دوسروں کا انتظار کرنا پڑتا ہے کیونکہ وہ اکثر دیر سے آتے ہیں۔ لہٰذا بہتر یہی ہے کہ آپ خود بھی ذرا دیر سے جایا کریں۔ اگر آپ وقت پر پہنچ گئے تو دوسرے لوگ یہ سمجھیں گے کہ آپ کی گھڑی آگے ہے۔

۵۔ وہم کا علاج | اگر آپ کو اپنے تندرست ہونے کا وہم ہے تو کسی حکیم سے ملیئے۔ وہ آپ کی غلط فہمی فوراً دور کر دے گا یعنی آپ میں کئی بیماریاں تلاش کر لے گا۔ لیکن اگر آپ کو وہم کی بیماری ہے تو آپ ہر روز اپنے آپ سے کہیئے کہ میں تندرست ہو رہا ہوں۔ احساسِ کمتری ہونے کی صورت میں بار بار کہنا چاہیئے کہ میں بے حد لائق اور عظیم آدمی ہوں۔ مجھ میں کوئی خامی نہیں ہے۔ میرے متعلق لوگ جو کچھ کہتے ہیں، جھوٹ کہتے ہیں۔

۶۔ بے خوابی سے نجات | اگر آپ کو نیند نہ آ رہی ہو تو فلسفہ یا ریاضی کی کوئی موٹی سی کتاب پڑھنا شروع کر دیجئے۔ فوراً نیند آ جائے گی۔

۷۔ گفتگو کا فن | آپ جب بولنے پر آئیں تو بغیر رُکے مسلسل بولتے چلے جائیں اور دل میں جو کچھ ہے، کہہ ڈالیں۔ کیونکہ اگر آپ ذرا دیر کے لئے چُپ ہو گئے تو کوئی دوسرا بولنا شروع کر دیگا۔ لہٰذا بولتے بولتے جونہی آپ سانس کے لئے رکیں، مخاطب پر ہاتھ کے اشارے سے واضح کر دیں کہ ابھی آپ کی بات ختم نہیں ہوئی یا پھر قطع کلامی معاف کہہ کر اپنی بات پھر شروع کر دیجئے۔ اگر آپ کی بجائے کوئی دوسرا آدمی خشک اور لمبی گفتگو کر رہا ہو تو بے شک جمائیاں لیجئے، کھانسیئے، بار بار گھڑی دیکھئے، اور ابھی آیا کہہ کر باہر چلے جائیے یا وہیں سو جائیے۔

یہ گُر یاد رکھئے کہ لگاتار بول کر ہی آپ فریقِ مخالف کو شکست دے سکتے ہیں۔ اگر آپ خاموش ہو گئے، تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ آپ کے پاس کہنے کو کچھ نہیں اور یوں دوسروں کو آپ کی ذہانت پر شبہ ہو جائے گا۔ لہٰذا مسلسل بولتے رہیئے اور مجلسی آداب کی پروا نہ کیجئے تاکہ آپ کی ذہانت کا سکّہ بیٹھ جائے۔ البتہ گفتگو کے دوران میں لڑنے سے پرہیز کیجئے کیوں کہ اس طرح بحث آگے نہیں بڑھ سکے گی۔

یاد رکھئے کہ آپ اپنی کسی غلطی کو تسلیم نہیں کریں گے۔ دوسرے لوگ اگر آپ کو غلطی پر ٹوکیں تو زور زور سے بولتے ہوئے اور اُلٹے سیدھے دلائل دے کر انہیں چُپ کرا دیجئے ورنہ وہ خواہ مخواہ آپ کے سر پر سوار ہو جائیں گے۔ گفتگو کے دوران میں زیادہ تر "میں" کا لفظ استعمال کیجئے اور "آپ" کا لفظ دو تین بار سے زیادہ مت استعمال کیجئے کیونکہ اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو دوسرے ایسا کرنے لگیں گے۔

۸۔ بچّوں کی تربیت: بچّوں کو ہر وقت ڈانٹتے رہیئے تاہم کبھی کبھی نرمی سے بھی پیش آیئے۔ اگر بچّے کوئی سوال پوچھیں تو اس انداز میں جواب دیجئے کہ انہیں دوبارہ سوال کرنے کی جرأت نہ ہو۔ اگر اپنے سوالوں سے زیادہ تنگ کریں تو کہہ دیجئے کہ جب تم بڑے ہو گے تو سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ بچّوں کو بھوتوں سے ڈراتے رہیئے۔ اس طرح وہ اپنے سے بڑوں کا ادب کرنے لگیں گے۔ بچّوں کو صرف نصاب کی خشک کتابیں پڑھنے دیجئے اور دلچسپ کتابوں کو ہاتھ نہ لگانے دیجئے۔ اگر بچّے بیوقوف ہوں تو زیادہ فکر نہ کیجئے کیونکہ وہ بڑے ہو کر یا تو نابغہ بنیں گے یا کم از کم اپنے آپ کو نابغہ سمجھنے لگیں گے۔ بچّوں کو سب کے سامنے کبھی نہ ڈانٹیئے کیونکہ اس طرح اُن کی نفسیات پر بُرا اثر پڑے گا۔ بہتر ہو گا کہ انہیں ایک طرف لے جا کر تنہائی میں ان کی پٹائی کیجئے۔

بچّوں کو پالتے وقت دھیان رکھیں کہ وہ کہیں ضرورت سے زیادہ نہ پل جائیں یعنی موٹے تازے نہ ہو جائیں۔ اس طرح وہ والدین اور عوام الناس کے لئے مسائل پیدا کریں گے۔ اگر کوئی بچّہ ضدّ کرے تو جواباً آپ کو بھی ضد کرنی چاہیئے۔ اس طرح وہ خود ہی شرمندہ ہو جائے گا۔

مشہور ماہرینِ نفسیات کہتے ہیں کہ مناسب تربیّت کے لئے بچّوں کا نفسیاتی تجزیہ کرانا ضروری ہے لیکن ہمارا خیال ہے کہ بچّوں سے زیادہ اُن کے والدین اور ماہرینِ نفسیات کا تجزیۂ نفس کرانا زیادہ ضروری ہے۔ عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ اگر کسی خاندان میں صرف دو تین بچّے ہوں تو وہ لاڈلے بن جاتے ہیں لہٰذا بہتر یہی ہے کہ بچّے ہمیشہ دس بارہ ہونے چاہیئں تاکہ ان میں سے ایک بھی لاڈلا نہ بن سکے۔ اسی طرح آخری بچّہ سب سے چھوٹا ہونے کی وجہ سے اور لاڈ پیار کی زیادتی سے ہمیشہ بگڑ جاتا ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ آخری بچّہ پیدا ہی نہیں ہونے دینا چاہیئے۔

آخر میں مصنّف نے باخبر کیا ہے کہ اگر اس کے اس مضمون کو پڑھ کر ایک بھی آدمی کا بھلا ہو گیا تو وہ سمجھے گا کہ اس کی ساری محنت ضائع گئی ہے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی، مع حوالہ متن و سیاق و سباق، تشریح کیجئے۔

دل ہی دل میں خوف سے جنگ کرنا بے سُود ہے، کیونکہ ڈرنے کی ٹریننگ ہمیں بچپن سے ملتی ہے اور شروع ہی سے ہمیں بھُوت، چڑیل، ہاؤ اور دیگر چیزوں سے ڈرایا جاتا ہے اگر آپ کو تاریکی سے ڈر لگتا ہے تو تاریکی میں جائیے ہی مت۔ اگر اندھیرا ہو جائے تو جلدی سے ڈر کر روشنی کی طرف چلے آئیے۔ آہستہ آہستہ آپ کو عادت پڑ جائے گی اور خوف کھانا پرانی بات ہو جائے گی۔

جواب **حوالہ متن** یہ عبارت شفیق الرحمٰن کے مضمون "کلیدِ کامیابی" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنّف نے کامیابی کے موضوع پر لکھی ہوئی بے شمار کتابوں سے متاثر ہو کر خود بھی ایک کتاب "کلیدِ کامیابی" حصہ دوم لکھنے کا ارادہ کیا کیونکہ اس کے خیال میں آج کل ہر شخص دوسروں کی مدد کرنے پر تُلا ہوا ہے اور انہیں بلا وجہ کامیابی کی شاہراہ پر گامزن دیکھنا چاہتا ہے۔ چنانچہ مصنّف نے اپنی اس نئی کتاب میں کامیاب ہونے کے جو گُر بتائے ہیں ان میں "عظمت کا راز" اور "حافظہ تیز کرنا" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں "عظمت کا راز" میں اُس نے بتایا ہے کہ کامیابی حاصل کرنے کے لئے غمگین رہنا بے حد ضروری ہے کیونکہ دنیا کے عظیم انسان ہمیشہ دُکھی رہے ہیں مثلاً کارلائل، جولیس سیزر، زار اوّل آئیوان اور لارڈ کلائیو۔ اسی طرح عظیم فن بیمار اور بیزار فن کاروں کا مرہونِ منت ہے اور عظیم ادب المیہ جذبات کا "حافظہ تیز کرنا" میں مصنّف نے گُر کی بات یہ بتائی ہے کہ اگر آپ کو باتیں یاد نہیں رہتیں تو انہیں یاد کرنے کی کوشش ہی نہیں کرنی چاہیئے۔

اس عبارت کے بعد مصنّف نے "وقت کی پابندی"۔ "وہم کا علاج"۔ "بے خوابی سے نجات"۔ "گفتگو کا آرٹ" اور "تربیّت اطفال" کے بارے میں ماہرانہ مشورے دیئے ہیں۔ "وقت کی پابندی" کے سلسلے میں اس نے بتایا ہے کہ تقریبات میں آپ کو ہمیشہ دیر سے جانا چاہیئے۔ "وہم کا علاج" یہ ہے کہ اپنے صحت مند ہونے کا اعلان کرتے رہیں

احساسِ کمتری دور کرنے کے لئے خود کو قابل اور غلطیوں سے پاک سمجھیں۔ "بے خوابی سے نجات" پانے کے لئے بہترین علاج یہ تجویز کیا ہے کہ سونے کی کوشش ہی نہ کی جائے بلکہ زیادہ بہتر ہے کہ فلسفہ یا ریاضی کی کوئی ضخیم کتاب پڑھنی شروع کر دیں۔ "گفتگو کا آرٹ" میں یہ بتایا گیا ہے کہ کسی دوسرے کو مت بولنے دیجئے اور خود ہمیشہ بولتے رہیئے۔ اس سے آپ کی ذہانت کی دھاک بیٹھ جائے گی۔ "تربیتِ اطفال" کے ضمن میں یہ سنہری مشورہ دیا گیا ہے کہ بچوں کے سوالوں کے جواب اس طرح دیں کہ آئندہ وہ سوال ہی نہ کر سکیں۔ انہیں بھوتوں سے ڈراتے رہیں۔ انہیں سب کے سامنے نہ ڈانٹیں بلکہ تنہائی میں ان کی گوشمالی کریں۔ ان کی ضد کا جواب ضد سے دیں۔ ان کے تجزیۂ نفس کی بجائے اپنا اور ماہرینِ نفسیات کا نفسیاتی تجزیہ کرائیں۔

تشریح | مصنف نے اس عبارت میں "خوف سے مقابلہ" کرنے کا گُر بتایا ہے وہ کہتا ہے کہ اگر آپ خاموشی سے خوف کا مقابلہ کرنا چاہتے ہیں تو یہ بیکار ہے، کیونکہ ہمیں ڈرنے کی تربیت بچپن سے ہی دی جاتی ہے۔ ابتداء ہی سے ہمیں کبھی بھوت، کبھی چڑیل اور کبھی ہوّے سے ڈرایا جاتا ہے۔ یاد رکھئے کہ اگر آپ اندھیرے سے خوف کھاتے ہیں تو اندھیری جگہ پر مت جائیں اور اگر کہیں اندھیرا ہو جائے تو فوراً اس سے ڈر کر روشنی میں آجائیے، یوں آہستہ آہستہ آپ کے اندر خوف کا مقابلہ کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے گی اور کچھ عرصہ بعد آپ کو محسوس ہو گا کہ اب وہ زمانہ نہیں رہا جب آپ ڈرا کرتے تھے۔

حمید عسکری (۱۹۰۹ء - ۱۹۷۱ء)

جابر بن حیّان: ایک نامور مُسلم سائنس دان

تعارف اور پس منظر

حمید عسکری کا مضمون "جابر بن حیان ـــــ ایک نامور مسلم سائنس دان" اُن کی کتاب "نامور مسلم سائنسدان" میں سے لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں دُنیائے اسلام کے اس پہلے قابلِ ذکر کیمیادان اور موجد کا تعارف کرایا گیا ہے اور کیمیا کے میدان میں اس کی خدمات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

جابر بن حیان ۱۲۰ھ/۷۳۷ء میں طوس (اور بعض روایات کے مطابق خراسان) میں پیدا ہوُا اور ۲۰۰ھ/۸۱۷ء میں طوس میں ہی فوت ہوُا۔ وہ اسلام کے اوّلین دَور میں علمِ کیمیا کے ممتاز نمائندوں میں سے ایک تھا اور ابتدائی عباسی خلفاء کا ہم عصر تھا۔ اس کا باپ حیان بن عبداللّٰہ الکوفی الصوفی ازدی قبیلے کا ایک فرد تھا اور پیشہ کے اعتبار سے عطّار تھا۔ جابر کی تصانیف مختلف مجموعوں کی شکل میں محفوظ ہیں۔ علمِ کیمیا میں اس کی اہم تصانیف یہ ہیں: (۱) کُتُبُ المِائَۃ وَالاثنا عَشَرَ (اس میں فنِ کیمیاگری کے بارے میں جابر کے غیر مربوط مضامین ہیں، جن میں قدیم کیمیاگری اور کیمیاگروں کے کئی حوالے آتے ہیں) (۲) کِتابُ السّبعین (اس میں علم کیمیا میں جابر کی تعلیمات کا مرتب اور منظم بیان ہے) (۳) کُتُبُ المِائَۃِ والاَربعَۃِ وَ الاَربعُونَ یا کُتُبُ المَوازِین (یعنی کیمیاگری اور جملہ علوم باطنی کی نظری اور بالخصوص فلسفیانہ اساس) (۴) کُتُبُ الخمسمِائۃ (یہ کتب الموازین کے بعض مسائل کی مزید تحقیق میں متفرق رسائل پر مشتمل ہے) ان کے علاوہ جابر نے چھوٹے چھوٹے کئی اور رسائل بھی لکھے ہیں جن میں ارسطو اور افلاطون کی کتابوں پر شرحوں کے حوالے سے کیمیاگری پر بحث کی گئی ہے۔ مغربی دانشور لی بان (LEBON) کہتا ہے کہ جابر پہلا ماہر کیمیا ہے جس نے عملِ تقطیر و تذویب و تحویل بیان کیا ہے۔ علمِ کیمیا کے علاوہ جابر نے فلسفہ، فلکیات، نجوم، ریاضیات، موسیقی، طب، سحر اور مذہب پر بھی رسائل لکھے ہیں۔ مغربی کیمیاگری نے آگے چل کر جابر کی تحریروں سے خاصا اثر قبول کیا اور اٹھارویں صدی عیسوی تک جابر کے دھاتوں کے متعلق نظریے کو لوگ صحیح مانتے رہے۔

جابر بن حیان (جیسا کہ مصنف نے اس مضمون کے آخر میں بتایا ہے) ابھی دودھ پیتا بچہ تھا جب اس کے باپ کو بغاوت کے جرم میں گرفتار کرکے قتل کر دیا گیا اور خود اُسے عرب کے ایک دُور دراز علاقے میں ایک بدّوی قبیلے میں رہنا پڑا جہاں اس نے اپنا لڑکپن اور جوانی کا زمانہ گزارا، صحرا میں رہنے کی وجہ سے اس کی باقاعدہ تعلیم تو نہ ہو سکی، اسی لئے وہ اپنے زمانے کی اعلیٰ تعلیم سے محروم رہا لیکن چونکہ وہ بے حد محنتی، ذہین اور قابل تھا، اس لئے خداداد صلاحیتوں سے کام لیتے ہوئے اور ناسازگار حالات کا مقابلہ کرتے ہوئے اس نے سائنس کی دنیا میں اتنا نام پیدا کیا کہ یورپ کے محققین نے اسے تاریخ میں پہلا باقاعدہ کیمیا دان قرار دیا۔

جابر بن حیان کیمیا میں تجربے کو سب سے ضروری شئے سمجھتا تھا۔ چنانچہ اپنے زمانے میں کیمیا گری (کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کا عمل) کے مقبولِ عام ہونے کے باوجود اس نے کیمیا کے تجرباتی عملوں (مثلاً تحلیل، تقطیر، کشید، تصعید اور قلماؤ) میں زیادہ دلچسپی لی۔ اور یوں وہ تجرباتی کیمیا کا بانی کہلایا۔ صنعتی کیمیا میں بھی اس کا علم اعلیٰ اور فنی مہارت بے مثال تھی۔ چنانچہ اس نے اپنی کتابوں میں فولاد بنانے، چمڑا رنگنے، دھاتیں صاف کرنے، موم جامہ بنانے، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لئے اس پر وارنش کرنے، خضاب تیار کرنے اور دیگر بیسیوں مفید اشیاء بنانے کے طریقے بتائے ہیں۔

جابر بن حیان نے کیمیا میں نہ صرف بعض نئی چیزیں دریافت کیں بلکہ آلاتِ کیمیا بنانے میں بھی جدّت سے کام لیا۔ اُس نے عملِ کشید کے لئے قرع و انبیق جیسا مفید آلہ ایجاد کیا جو ریٹارٹ کا پیش رو ثابت ہُوا۔ اس آلہ کی مدد سے (جو اس نے اعلیٰ چکنی مٹی سے تیار کیا تھا) اس نے شورے اور گندھک کے تیزاب دریافت کئے۔

دھاتوں کے متعلق جابر بن حیان کا نظریہ، جدید تحقیقات کی روشنی میں فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ تمام دھاتیں گندھک اور پارے سے بنی ہیں اور جب یہ دونوں اشیاء بالکل خالص حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ کیمیائی طور پر ملتی ہیں تو سونا پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ ناخالص حالت میں کیمیائی ملاپ کرتی ہیں تو دیگر کثافتوں کی موجودگی اور ان کی مقدار کی کمی بیشی کی وجہ سے دوسری کم قیمت کی دھاتیں مثلاً چاندی، سیسہ، تانبا اور لوہا وغیرہ وجود میں آتی ہیں۔ جدید علم کیمیا نے جابر کے اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا ہے تاہم اٹھارویں صدی عیسوی تک اس نظریے کی دھاک بیٹھی رہی اور ہزاروں انسانوں نے اس نظریے کے پیشِ نظر (کہ دیگر دھاتوں اور سونے کی کیمیائی ترکیب میں چونکہ بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کر لینا عین ممکن ہے) اپنی

زندگیاں گندھک اور پارے کو ملا کر سونا بنانے میں ضائع کر دیں۔ انہیں سونا تو کیا ملنا تھا' البتہ شنگرف ضرور مل گیا جو در حقیقت پارے اور گندھک کا مرکب ہے۔ جابر بن حیان چونکہ تجربات کے بغیر کسی بات کو تسلیم نہیں کرتا تھا' اس لئے اس نے تجربات کر کے یہ بھی واضح کر دیا کہ گندھک اور پارے کو ملا کر سونا بنانے کی کوشش بعض نامعلوم وجوہات کی بنا پر کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس نے بتایا کہ وہ گندھک جس کو پارے کے ساتھ کیمیائی طور پر ملانے سے سونا بنتا ہے' عام گندھک کے علاوہ کوئی اور شے ہے۔ لوگوں نے جابرؒ کا یہ بیان پڑھ کر اس خیالی گندھک کا نام گوگردِ احمر (سرخ گندھک) رکھ دیا اور اس کی تلاش میں عمریں کھپا دیں لیکن یہ گندھک انہیں نہ مل سکی کیونکہ اس کا دُنیا میں کوئی وجود ہی نہیں تھا۔

جابر بن حیان نے دھاتوں کے مرکبات یعنی کُشتے بنانے کے طریقے بھی اپنی ایک کتاب میں بیان کئے ہیں۔ اسے عملِ تکلیس کہا جاتا ہے جس کے مطابق ایک دھات کو گرمی پہنچا کر اس کا اوکسائڈ (اور بعض حالتوں میں اس کا کوئی اور مرکب) تیار کیا جاتا ہے

حمید عسکری کا جابر بن حیان پر یہ مضمون اس لحاظ سے ایک اچھی کوشش ہے کہ اس میں اسلامی دنیا کے پہلے نامور مسلمان سائنسدان کے کارناموں سے نئی نسل کو متعارف کرایا گیا ہے۔ ایک ایسے زمانے میں جب کیمیا کا علم موجودہ زمانے کے مقابلے میں بے حد محدود تھا۔ جابر کا نت نئے تجربات کر کے اتنی زیادہ کار آمد اشیاء تیار کر لینا واقعی ایک شاندار کارنامہ ہے اور اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے کم ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۱۹۸ | نامور: مشہور۔ یورپ: مغرب کا برِ اعظم۔ محقق: تحقیق کرنے والا' چھان بین کرنے والا۔ حقیقت کی تہ تک پہنچنے والا۔ متفق: اتفاق کرنے والا' ہم رائے' ہم خیال۔ کیمیا دان: علم کیمیا کا ماہر۔ مادہ یعنی چیزوں کی خاصیت معلوم کرنے' ان کے اجزاء کو ملانے اور جدا کرنے کا علم کیمیا کہلاتا ہے۔ صادق: منطبق ہونا۔ چسپاں ہونا۔ کائنات: پونجی' سرمایہ۔ کھتوسی: کیمیا گری' کم تر دھاتوں سے سونا بنانے کا علم۔ پارہ: ایک مائع دھات کا نام جو ہر وقت بے قرار اور متحرک رہتی ہے۔ تانبا: سُرخی مائل ایک دھات جو لوہے کی نسبت زیادہ ملائم ہوتی ہے اور جس کے قلعی کئے ہوئے برتن میں کھانا پکاتے ہیں۔ چاندی: ایک سفید دھات جس سے روپیہ کا سکہ' برتن اور زیور بنائے جاتے ہیں۔ سونا: سنہرے رنگ کی ایک انتہائی قیمتی دھات۔ منتقل: تبدیل۔ محور: وہ چیز جس پر کوئی چیز گھومے' دُھرا یا

کیلی جس پر پہیہ گھومتا ہے۔ وہ فرضی خط جس پر زمین گردش کرتی ہے اور جو اس کے مرکز سے گزرتا ہے۔ مہوس: کم قیمت دھاتوں سے سونا بنانے والا۔ تحقیقات: تحقیق کی جمع، مراد حقیقت کا کھوج لگانا۔ رائیگاں: بیکار، برباد، ضائع۔ حل کرنا: جب دو اشیاء ایک ہی طبعی حالت میں ہوں تو وہ ایک دوسرے میں کسی بھی مقدار میں مکمل طور پر حل ہو سکتی ہیں۔ فلٹر کرنا: (FILTRATION) عمل تقطیر، صاف کرنا، ٹھوس چیز کو کسی مائع چیز سے علیحدہ کرنا۔ کشید کرنا: (DISTILLATION) عرق کھینچنا۔ عمل تصعید: (SUBLIMATION) حرارت کے ذریعے کسی چیز کے بخارات جمع کرنا، کسی مادے کو گیس بنا کر اڑانا۔ اشیاء: شئے کی جمع، چیزیں۔ جوہر اڑانا: کسی خاص ترکیب سے کسی چیز کے اجزائے لطیف جدا کرنا۔ قلماؤ: قلمیں بنانا، کسی چیز کو مائع میں حل کر کے عمل تبخیر (بخارات بنانا) کے ذریعے مائع اڑایا جائے تو نیچے اس چیز کی باریک باریک ٹکڑیاں رہ جاتی ہیں، جو قلمیں کہلاتی ہیں۔

ص ۱۹۹ تجربہ: (EXPERIMENT) کسی مفروضہ یا نظریہ (THEORY) کی آخری اور یقینی شکل کلیہ (LAW) ہے مفروضہ کو کلیہ ثابت کرنے کے لئے اس کی پرکھ ضروری ہے اور پرکھ کا یہ عمل، تجربہ کہلاتا ہے۔ واقف: جاننے والا۔ بکثرت: بہت زیادہ۔ تجرباتی کیمیا: تجربات کی مدد سے مادے کے خواص معلوم کرنے کا علم۔ خصوصیت: صفت۔ قدیم: پرانا۔ ممتاز: نمایاں۔ تجربہ: سائنس کے اصول کی آزمائش کے لئے کوئی عمل کر کے دیکھنا۔ انحصار: دار و مدار، بھروسہ۔ عظمت: بڑائی۔ دھات: کان سے نکلا ہوا جوہر جس میں پگھلنے کی صلاحیت ہو جیسے سونا، چاندی، تانبا وغیرہ۔ نظریہ: خیال جو پورے غور و فکر کے بعد قائم کیا جائے۔ گندھک: زرد رنگ کے ایک آتشی مادے کا نام جو کان سے نکلتا ہے۔ پارہ: ایک مائع دھات جو ہر وقت بے قرار رہتی ہے۔ اشیاء: شئے کی جمع، چیزیں۔ کیمیائی ملاپ: دو یا دو سے زائد چیزوں کو کیمیائی طور پر باہم ملا کر ایک نئی چیز بنانا۔ کثافت (DENSITY): علم کیمیا کی اصطلاحی زبان میں اکائی حجم کی کمیت، کثافت کہلاتی ہے۔ کثافت دریافت کرنے کا فارمولا یہ ہے۔ کثافت (DENSITY) = کمیت (MASS) / حجم (VOLUME)۔ کسی شئے میں مادے کی مقدار کو کمیت (MASS) کہتے ہیں۔ وزن اور کمیت میں کچھ فرق ہے۔ کمیت کسی شئے کی مقدارِ مادہ ہے جب کہ وزن وہ قوت ہے جس سے زمین اُس شئے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کمیت پر مقام کے بدلنے سے کوئی اثر نہیں پڑتا لیکن وزن، زمین کے مرکز سے دُور ہونے پر کم اور قریب ہونے پر زیادہ ہو جاتا ہے۔ کمی بیشی: کمی اور زیادتی۔ سیسہ: ایک دھات جو نیلاہٹ لئے ہوئے ہوتی ہے۔ لوہا: ایک سیاہی مائل سخت دھات کا نام جو اوزار وغیرہ بنانے کے کام آتی ہے۔ ظہور: ظاہر ہونا۔ دیگر: دوسری، اور۔ کم و بیش: کم اور زیادہ، مراد ہے تقریباً، اندازاً، لگ بھگ۔ گوگرد: گندھک۔ احمر: سرخ۔ صرف کرنا: استعمال کرنا، خرچ کرنا۔

ص ۲۰۰ حیران کن: حیران کردینے والا۔ طور: انداز، طریقہ۔ چنداں: کچھ، اس قدر، ایسی زیادہ۔ وجوہ: وجہ کی جمع، سبب۔ شنگرف: سندھور، سرخ رنگ کی ایک چیز جسے گندھک اور پارے کی آمیزش سے تیار کرتے ہیں۔ اسے شنجرف بھی کہتے ہیں۔ وسائل: وسیلہ کی جمع، ذریعے۔ صرف: استعمال۔ کشتہ: پھنکی ہوئی دھات، دھات کو اتنا گرم کرنا کہ وہ اپنی اصلی حالت کھو بیٹھے اور کسی نئی شکل میں ظاہر ہو جائے، کسی دھات یا دوا کو پھونک کر اکسیر بنانا۔ اوکسائیڈ: آکسیجن کا کسی اور عنصر کے ساتھ کیمیائی مرکب۔ مرکب: دو یا دو سے زائد عناصر کا کیمیائی عمل کے ذریعے ایک ہو جانا۔ اگر یہ عناصر کیمیائی عمل کے بغیر ملیں تو اُسے آمیزہ کہا جاتا ہے۔ بخوبی: اچھی طرح۔ جامع: مکمل تصنیف کرنا: لکھنا۔ وضاحت: تفصیل۔ فولاد: اعلیٰ قسم کا لوہا، ایک قسم کا نہایت سخت جوہر دار لوہا۔

ص ۲۰۱ مصفا کرنا: صاف کرنا۔ موم جامہ: مومی کپڑا جس پر پانی اثر نہیں کرتا، وہ کپڑا جس پر موم کا روغن کیا گیا ہو۔ زنگ: وُہ میل جو لوہے کی چیزوں کو نم دار ہوا میں لگ جاتا ہے۔ وارنش: روغن، وہ مسالہ جس سے چیزوں کو چمکدار کرتے ہیں۔ خضاب: یہ لفظ خضب (رنگ کرنا) سے نکلا ہے۔ بالوں کو سیاہ کرنے والی دوا۔ بیسیوں: بہت سی۔ مفید: فائدہ مند۔ فنی قابلیت: ہنر مندانہ صلاحیت۔ محدود: مختصر۔ کار آمد: مفید، کام کی۔ صنعتی کیمیا: وہ علم کیمیا جس سے کام لے کر مختلف قسم کی مصنوعات بنائی جاتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان میں چینی، کاغذ، سیمنٹ، شیشہ، معدنی تیل، پولی ایسٹر فائبر (مصنوعی ریشہ) مصنوعی ربڑ، لوہے اور فولاد سے بنی ہوئی اشیاء مصنوعی رنگ، ادویات اور پلاسٹک کی مصنوعات وغیرہ شامل ہیں۔ بے مثل: اعلیٰ، جس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ مہارت: ماہر ہونا۔ آلاتِ کیمیا: کیمیائی تجربات میں استعمال ہونے والا ساز و سامان۔ قابلِ قدر: عمدہ۔ کشید کرنا: عرق کھینچنا۔ ست: جوہر، نچوڑ۔ بھبکا: عرق کھینچنے کا ظرف۔ چکنی: ملائم اور چمکدار، روغنی۔ مائع: بہنے والی چیز۔ عرق: نچوڑ، دواؤں کی بھاپ سے بنا ہوا پانی۔ مقامِ اتصال: ملنے کی جگہ۔ گاچنی مٹی: ایک خاص قسم کی مٹی جو تختیاں پوتنے کے کام آتی ہے۔

ص ۲۰۲ لیپ کرنا: چپکانا، وہ مٹی جو اوپر تہ کی شکل میں لگائی جائے۔ حرارت: گرمی۔ بخارات: بھاپ۔ مائع: بہنے والی چیز مثلاً پانی۔ شورے کا تیزاب: انگریزی میں نائٹرک ایسڈ کہلاتا ہے۔ تیزاب: (ACIDS) مرکبات کی ایسی قسم ہے جو آبی محلول میں درج ذیل خواص کا مظاہرہ کرتی ہے۔ (i) ان کا ذائقہ مخصوص ترش ہوتا ہے۔ (ii) تیزاب نیلے لٹمس (ایک نباتاتی رنگ) کو سرخ کر دیتے ہیں (iii) بعض دھاتوں کے اوکسائڈ اور ہائیڈرو اوکسائیڈ کے ساتھ عمل کر کے نمکیات بناتے ہیں۔ تیزاب کی ایک تعریف یہ بھی کی گئی ہے کہ وہ ایک ایسی شئے ہے جو آبی محلول میں ہائیڈروجن آئن (H^+) پیدا کرے۔ شورے کا تیزاب (فارمولا HNO_3) طاقتور

تیزاب کہلاتا ہے۔ دریافت : کسی نئی چیز کا پتہ لگانا۔ ریٹارٹ : شیشے کا بنا ہوا ایک مخصوص وضع کا برتن یا آلہ۔ ترمیم شدہ : بدلی ہوئی، تبدیل شدہ۔ قلمی شورہ : انگریزی نام، پوٹاشیم نائٹریٹ (فارمولا (KNO_3) صاف کیا ہوا شورہ (ایک قسم کی کھار) جس کی قلمیں سی بن جاتی ہیں۔ گندھک کا تیزاب : انگریزی میں اسے سلفیورک ایسڈ کہتے ہیں۔ یہ بھی ایک طاقت ور تیزاب ہے اور اس کا فارمولہ ہے H_2SO_4۔ پوٹاشیم سلفیٹ : اس کا فارمولہ ہے K_2SO_4۔ گندھک کا تیزاب جب قلمی شورے میں ملایا جاتا ہے تو شورے کا تیزاب اور پوٹاشیم سلفیٹ بنتا ہے جس کا فارمولہ درجِ ذیل ہے۔

$$KNO_3 + H_2SO_4 \longrightarrow HNO_3 + K_2SO_4$$

(پوٹاشیم سلفیٹ) + (نائٹرک ایسڈ) ⟵ (سلفیورک ایسڈ) + (پوٹاشیم نائٹریٹ)

ص ۲۰۳ | پھٹکڑی : نمک کی طرح ایک شفاف سفید دوا۔ اسے انگریزی میں ALUM کہتے ہیں اور اس کا فارمولہ یہ ہے۔

$$K_2SO_4 \cdot Al_2(SO_4)_3 - 24\,H_2O$$

پانی + ایلومینیم سلفیٹ + پوٹاشیم سلفیٹ

ہیرا کسیس : انگریزی میں FERROUS SULPHATE - اس کا فارمولہ یہ ہے۔ $FeSO_4$ - قلمی شورہ : انگریزی میں پوٹاشیم نائٹریٹ — POTASSIUM NITRATE اس کا فارمولا ہے KNO_3 - کٹوری : چھوٹی پیالی۔ چھید : سوراخ۔ جزو : حصہ غالب : زیادہ، بھاری۔

ص ۲۰۴ | گاڑھا : گھنا، موٹا، جس میں پانی کم ڈالا گیا ہو۔ دھار : رقیق چیز کے بہنے کی لکیر، پانی یا کسی مائع چیز کا بہاؤ۔ ٹمپریچر : درجۂ حرارت۔ سرکہ اور لیموں کے رس سے زیادہ طاقت ور : سرکہ میں (ACETIC ACID) پایا جاتا ہے اور لیموں میں CITRIC ACID موجود ہوتا ہے جو ہلکے تیزاب ہیں۔ براہِ راست : بغیر کسی واسطے کے، سیدھے راستے سے، بلاواسطہ۔ شیر خوارگی : بچے کا دُودھ پینے کا زمانہ۔ یتیم : وہ بچہ جس کا باپ فوت ہو چکا ہو۔ مغضوب : جس پر غضب (غصہ) کیا گیا ہو۔ بغاوت : سرکشی، نافرمانی، بدامنی تربیت : نشو و نما۔ دُور افتادہ : دُور واقع۔ بدوی : ریگستانِ عرب میں رہنے والا، بدّو، عربی میں صحرا یا ریگستان کہتے ہیں۔ ایام : یوم کی جمع، دن۔ امور : امر کی جمع، باتیں، معاملات۔ ناسازگار : ناموافق۔ قابلیت : لیاقت۔ ذہانت : سمجھداری۔

سبق کا خلاصہ

یورپ کے تمام محقّق اس سے اتفاق کرتے ہیں کہ جابر بن حیان پہلا کیمیا دان تھا۔ اس کے زمانے میں علمِ کیمیا صرف عملِ کیمیا گری (کمتر دھاتوں سے سونا بنانا) تک محدود تھا۔ چنانچہ پارہ، تانبا اور چاندی کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ اس قسم کے لوگ کیمیا گر یا مہوّس کہلاتے تھے۔ جابر کو یقین تھا کہ کم قیمت دھاتیں سونے میں تبدیل کی جا سکتی ہیں لیکن اس نے اپنی تحقیقات کے لئے اور میدان بھی چُنے، وہ علمِ کیمیا کے تمام تجرباتی عملوں مثلاً عملِ تحلیل، عملِ تقطیر، عملِ کشید، عملِ تصعید اور عملِ قلماؤ سے بخوبی واقف تھا اور اپنے کیمیائی تجربوں میں ان سے اکثر کام لیتا تھا۔ اس لحاظ سے اُسے تجرباتی کیمیا کا بانی قرار دیا جا سکتا ہے۔

دھاتوں کے بارے میں جابر بن حیّان کا نظریہ یہ تھا کہ تمام دھاتیں گندھک اور پارے سے بنی ہیں۔ جب یہ دونوں چیزیں (گندھک اور پارہ) بالکل خالص حالت میں ایک دوسرے کے ساتھ کیمیائی ملاپ کرتی ہیں تو سونا پیدا ہوتا ہے لیکن جب وہ ناخالص حالت میں کیمیائی طور پر ملتی ہیں تو دیگر کثافتوں کی موجودگی اور ان کی مقدار میں کمی بیشی کی وجہ سے دوسری دھاتیں مثلاً چاندی، سیسہ، تانبا اور لوہا وغیرہ بنتی ہیں۔ اس نظریے کی رو سے چونکہ دیگر دھاتوں اور سونے کی کیمیائی ترکیب میں بنیادی طور پر کوئی فرق نہیں ہے، اس لئے کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنا بالکل ممکن ہے۔ دھاتوں کے بارے میں جابر بن حیّان کا یہ نظریہ اٹھارویں صدی تک قائم رہا، اسی لئے آئندہ صدیوں میں ہزاروں انسانوں نے اپنی عمریں سُرخ گندھک کی تلاش میں کھپا دیں کیونکہ وہ گندھک کی خالص قسم تصوّر کی جاتی تھی اور اس کے متعلق یہ خیال کیا جاتا تھا کہ اسے پارے کے ساتھ گرم کر کے سونا بنایا جا سکتا ہے۔ جابر بن حیّان نظریاتی طور پر تو اس کا قائل تھا لیکن اُس نے خود اس طرح سونا بنانے کی کوشش میں اپنا وقت ضائع نہیں کیونکہ تجربات کی بناء پر وہ اس نتیجہ پر پہنچا تھا کہ عملی طور پر گندھک اور پارے کو ملا کر سونا بنانے کی کوشش بعض نامعلوم وجوہات کی بناء پر کامیاب نہیں ہو سکتی کیونکہ جب بھی اُس نے یہ تجربہ کیا اُسے سونے کی بجائے شنگرف حاصل ہوا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ گندھک جس کو پارے کے ساتھ کیمیائی طور پر ملانے سے سونا بنتا ہے، اس عام گندھک کے علاوہ کوئی اور چیز ہے۔ اس فرضی گندھک کو لوگوں نے گوگردِ احمر (سرخ گندھک) کا نام دیا اور اس کی تلاش میں بے شمار لوگوں نے اپنی عمریں اور سارے وسائل استعمال کئے لیکن یہ گندھک کسی کو نہ مل سکی۔

جابر بن حیان، عملِ تکلیس (دھات کا کشتہ بنانا) سے بھی بخوبی واقف تھا۔ جس کے ملتحت ایک

دھات کو گرمی پہنچا کر اس کا اوکسائڈ (اور بعض اوقات اس کا مرکب) تیار کیا جاتا ہے۔ اس نے اس خاص عمل (دھاتوں کے مرکبات یا کشتے بنانا) پر ایک مکمل کتاب لکھی ہے۔ جس میں تمام تجربات وضاحت کے ساتھ بیان کئے ہیں۔

جابر بن حیان نے اپنی علم کیمیا پر لکھی ہوئی کتابوں میں فولاد بنانے، چمڑا رنگنے، دھاتوں کو صاف کرنے، موم جامہ بنانے، لوہے کو زنگ سے بچانے اور اس پر وارنش کرنے، بالوں کو سیاہ کرنے کے لئے خضاب تیار کرنے اور اس قسم کی اور بہت سی فائدہ مند چیزیں بنانے کے طریقے بیان کئے ہیں۔ ان اشیاء کو موجودہ زمانے میں بھی تیار کرنا خاصا مشکل کام ہے کیوں کہ اس کے لئے بہت زیادہ فنی مہارت کی ضرورت ہے۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ جب عملِ کیمیا اپنی ابتدا میں تھا تو ان اشیاء کا تیار کرنا، صنعتی کیمیا میں اس کے وسیع علم اور بے مثال فنی قابلیت کا کتنا بڑا ثبوت ہے۔

جابر بن حیان نے آلاتِ کیمیا میں قرع و انبیق ایجاد کیا جس کی مدد سے کشید کرنا، عرق کھینچنا اور ست یا جوہر نکالنا آسان ہو گیا۔ یہ آلہ دو علیحدہ علیحدہ برتنوں پر مشتمل تھا جن میں ایک کو قرع اور دوسرے کو انبیق کہتے تھے۔ قرع عموماً صراحی کی شکل کا ہوتا تھا، جس کی گردن چوڑی مگر چھوٹی ہوتی تھی۔ انبیق بھبکے کی شکل کا برتن تھا جس کے پہلو میں ایک لمبی نلی ہوتی تھی۔ یہ دوسرا حصّہ (انبیق) پہلے حصّہ (قرع) کے اوپر صحیح طور سے آجاتا تھا اور اس میں پھنس جاتا تھا۔ قرع اور انبیق دونوں اعلےٰ درجے کی چکنی مٹی سے بنائے جاتے تھے اور انہیں خاص طریقوں سے پکایا جاتا تھا۔ جب قرع و انبیق سے کسی مائع کو کشید کرنا ہوتا تو اسے قرع میں ڈال دیا جاتا اور اگر کسی شے کا عرق نکالنا ہوتا تو اسے بھی پانی میں بھگو کر قرع میں بھر دیا جاتا۔ پھر اس کی گردن میں انبیق کو اُلٹا کر کے لگا دیا جاتا اور دونوں کے ملنے کی جگہ کو ہوا بند کرنے کیلئے گندھا ہوا آٹا یا بھیگی ہوئی گاچنی مٹی لیپ کر دی جاتی۔ اس کے بعد قرع کو اسی حالت میں چولھے پر رکھ کر آگ سے حرارت پہنچائی جاتی۔ حرارت کے اثر سے ان اشیاء میں سے بخارات اُٹھنے شروع ہوتے جو انبیق میں داخل ہو کر اس کی لمبی نال سے نکلتے۔ اس نالی کے ساتھ ایک بوتل لگا دی جاتی اور بوتل کے بیرونی حصّے کو ٹھنڈے پانی میں ڈبو دیا جاتا۔ بوتل کے اندر، ٹھنڈک کی وجہ سے یہ بخارات دوبارہ مائع بن جاتے۔ یہی مائع قرع میں ڈالی ہوئی اشیاء کا عرق یا جوہر یا عطر ہوتا تھا۔

شورے کا تیزاب (نائٹرک ایسڈ) جابر بن حیان کی ایک اہم ایجاد ہے۔ یہ اس نے اسی قرع و انبیق کی مدد سے بنایا تھا۔ موجودہ زمانے میں شورے کا تیزاب بنانے کیلئے ریٹارٹ استعمال کیا جاتا ہے جو شیشے کا ایک مخصوص برتن یا آلہ ہوتا ہے اور یہ قرع و انبیق کی بدلی ہوئی شکل ہے۔ ریٹارٹ میں قلمی شورہ (پوٹاشیم نائٹریٹ) ڈال کر اس میں گندھک

کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) ملا دیا جاتا ہے پھر ریٹارٹ کو آگ کی حرارت پہنچائی جاتی ہے جس سے گندھک کا تیزاب کیمیائی طور پر شورے پر عمل کرتا ہے اور اس کے نتیجے میں شورے کا تیزاب اور پوٹاشیم سلفیٹ (ایک ٹھوس مرکب) بنتے ہیں۔ پوٹاشیم سلفیٹ تو ریٹارٹ میں رہتا ہے، مگر شورے کے تیزاب (نائٹرک ایسڈ) کے بخارات ریٹارٹ کی گردن سے باہر نکل کر ایک صراحی میں چلے جاتے ہیں جن کے اندر ریٹارٹ کی گردن داخل کی ہوتی ہے۔ اس صراحی کو پانی میں رکھا جاتا ہے جس کی وجہ سے تیزاب کے بخارات دوبارہ ٹھنڈے ہو کر مائع بن جاتے ہیں صراحی میں جمع شدہ یہی مائع شورے کا تیزاب ہے۔

جابر بن حیان نے شورے کے تیزاب کی تیاری میں گندھک کے تیزاب کو براہِ راست استعمال نہیں کیا تھا بلکہ اس مقصد کے لئے اس نے عام ملنے والی تین چیزوں پھٹکڑی (ALUM)، ہیرا کسیس (FERROUS SULPHATE) اور قلمی شورہ (POTASSIUM NITRATE) سے کام لیا تھا۔

وہ اپنی ایک کتاب میں شورے کا تیزاب تیار کرنے کی ترکیب یوں بتاتا ہے کہ میں نے قرع میں کچھ پھٹکڑی، ہیرا کسیس اور قلمی شورہ ڈالا اور اس کے منہ کو انبیق سے بند کر کے اُسے کوئلوں کی آگ پر رکھ دیا۔ تھوڑی دیر بعد میں نے دیکھا کہ گرمی سے انبیق کی نلی میں سے بھورے رنگ کے بخارات نکل رہے تھے، یہ بخارات بیرونی برتن میں، جو تانبے کا بنا ہوا تھا، داخل ہو کر مائع حالت میں بدل جاتے تھے۔ لیکن یہ مائع اتنا تیز تھا کہ اس نے تانبے کے برتن میں سوراخ پیدا کر دیئے۔ جب اس مائع کو چاندی کی کٹوری میں جمع کرنے کی کوشش کی گئی تو اس میں بھی سوراخ پڑ گئے۔ چمڑے کی تھیلی میں بھی اس مائع نے چھید کر دیئے۔ قرع اور انبیق کو بھی اس سے نقصان پہنچا اور اس کا رنگ اُتر گیا۔ اس مائع کو جب میں نے انگلی لگائی تو انگلی جل گئی۔ میں نے اس مائع کا نام تیزاب رکھا اور چونکہ اس کی تیزی میں قلمی شورے کا جزو غالب ہے، اس لئے اسے شورے کا تیزاب کہنا مناسب ہوگا۔ عام اشیاء میں صرف سونے اور شیشے پر اس تیزاب کا اثر نہیں ہوا۔

اس تجربے میں کامیاب ہونے کے بعد اس نے گندھک کا تیزاب (سلفیورک ایسڈ) بنانے میں بھی کامیابی حاصل کی۔ اس نے قرع اور انبیق میں پھٹکڑی اور ہیرا کسیس کو ڈال کر اور اسے حرارت پہنچا کر اسے حاصل کیا۔ یہ مائع شربت کی طرح گاڑھا اور تیل کی طرح دھار رکھتا تھا اور کاغذ کو جلا ڈالتا تھا جب کھانڈ پر اسے ڈالا جاتا تو اسے سیاہ کر ڈالتا۔ پانی ملانے سے اس میں بہت زیادہ حرارت پیدا ہو جاتی تھی۔ یہ تیزاب، شورے کے تیزاب جتنا تیز

تو نہ تھا لیکن سرکہ اور لیموں کے رس سے زیادہ طاقت ور تھا۔ آج کل گندھک کا تیزاب حاصل کرنے کے لئے گندھک استعمال کی جاتی ہے لیکن جابر کو علم نہ تھا کہ گندھک کے ساتھ بھی اس کا کوئی تعلق ہے۔ وہ اس مائع کو ہیرا کسیس کا تیل کہتا تھا۔

جابر بن حیّان ابھی دودھ پیتا بچہ تھا کہ وہ یتیم ہوگیا۔ اس کے باپ نے حکومت کے خلاف بغاوت کی تھی اور اس جرم میں اسے قتل کر دیا گیا تھا۔ اس کی نشوونما عرب کے ایک دُور دراز کے علاقے میں ایک صحرائی قبیلے میں ہوئی تھی، جہاں اس نے اپنا بچپن اور جوانی کا زمانہ گزارا۔ اسی لئے وہ اپنے زمانے کی اعلیٰ تعلیم نہ حاصل کر سکا۔ اس کے باوجود اس نے ناموافق حالات کا مقابلہ کیا اور اپنی محنت، ذہانت اور لیاقت سے سائنس میں ایسا مقام حاصل کیا جو اس کے زمانے میں کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی حوالۂ متن اور سیاق و سباق کے ساتھ تشریح کیجئے۔

جابر شیر خوارگی ہی میں یتیم ہوگیا تھا اس کا باپ حکومت کا مغضوب تھا اور بغاوت کے جرم میں قتل ہوا تھا۔ اس کی تربیت عرب کے ایک دُور افتادہ علاقے کے ایک بدوی قبیلے میں ہوئی تھی۔ جہاں اس نے اپنے بچپن اور جوانی کے ایام گذارے تھے۔ یہ تینوں امور ایسے تھے جن کے باعث اس زمانے کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کا کوئی موقع اُسے میسّر نہیں آسکتا تھا لیکن ان ناسازگار حالات کے باوجود اس نے اپنی محنت، قابلیت اور ذہانت سے سائنس میں اپنے لئے اتنا اونچا مقام حاصل کر لیا جو اس کے زمانے میں کسی اور کو حاصل نہ ہو سکا تھا۔

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت حمید عسکری کے مضمون "جابر بن حیان، ایک نامور مسلم سائنس دان" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق و سباق اس عبارت سے پہلے مصنف نے بتایا ہے کہ جابر بن حیّان تاریخ میں پہلا کیمیادان قرار دیا جاتا ہے۔ اس کے زمانے میں علم کیمیا، کیمیا گری تک محدود تھا جس کے مطابق کم قیمت دھاتوں کو سونے میں تبدیل کرنے کی کوشش کی جاتی تھی جس کے لئے پارے اور گندھک کو استعمال کیا جاتا تھا۔ جابر بن حیّان بھی اس بات کا قائل تھا کہ کم قیمت دھاتیں سونے میں تبدیل کی جا سکتی ہیں لیکن اس نے دیگر کیمیائی تجربات کو زیادہ اہم سمجھا، اسی لئے وہ نہ صرف حل کرنا، فلٹر کرنا، کشید کرنا، عملِ تصعید سے اشیاء کا جوہر اڑانا اور قلماؤ کے ذریعے اشیاء کی قلمیں بنانا جانتا تھا بلکہ اپنے کیمیائی تجربات میں ان سے بہت کام لیتا تھا۔ وہ علم کی بنیاد تجربے پر رکھتا تھا اور علم کیمیا کا صحیح

علم حاصل کرنے کے خواہش مندوں کو بھی اس امر کی تلقین کرتا تھا۔ دھاتوں کے متعلق اس کا نظریہ یہ تھا کہ تمام دھاتیں پارے اور گندھک سے بنی ہیں اور جب یہ دونوں اشیاء خالص حالت میں کیمیائی طور پر ملتی ہیں تو سونا بن جاتی ہیں لیکن اگر ناخالص حالت میں ملیں تو پھر کمتر دھاتوں مثلاً چاندی، سیسہ، تانبا اور لوہا میں تبدیل ہو جاتی ہیں۔ اس کے خیال کے مطابق دیگر دھاتوں اور سونے کی کیمیائی ترکیب میں کوئی بنیادی فرق نہیں تھا۔ اٹھارھویں صدی عیسوی تک اس کا یہ نظریہ قائم رہا اور لوگ گندھک اور پارے کو ملا کر سونا بنانے کی کوشش کرتے رہے لیکن سوائے شنگرف کے کچھ حاصل نہ کر سکے۔ اس سے انہوں نے خیال کیا کہ شاید خالص گندھک (سُرخ گندھک) نہ ملنے کی وجہ سے سونا نہیں بنتا۔ جابر بن حیّان نے دھاتوں کے مرکبات یعنی کشتے بنانے کے طریقے بھی اپنی کتاب میں لکھے ہیں جسے عملِ تکلیس کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنی کتابوں میں فولاد بنانے، چمڑا رنگنے، دھاتیں صاف کرنے، موم جامہ بنانے، لوہے کو زنگ سے بچانے کے لئے اُس پر وارنش کرنے، بالوں کو سیاہ کرنے کے لئے خضاب تیار کرنے اور اسی طرح اور بیسیوں مفید چیزیں بنانے کے طریقے بیان کئے ہیں۔ یوں صنعتی کیمیا میں بھی اس کی ذہانت اور مہارت کا پتہ چلتا ہے۔ اس نے قرع اور انبیق جیسے آلاتِ کیمیا ایجاد کئے، جن کی مدد سے اس نے شورے کا تیزاب بنایا۔ شورے کا تیزاب بنانے کیلئے اس نے پھٹکڑی، ہیرا کسیس (فیرس سلفیٹ) اور قلمی شورہ استعمال کیا۔ اسی طرح پھٹکڑی اور ہیرا کسیس کو حرارت پہنچا کر اس نے گندھک کا تیزاب حاصل کیا۔ اُسے یہ علم نہیں تھا کہ گندھک کے تیزاب کا گندھک کے ساتھ کوئی تعلق ہے، اس لئے وہ گندھک کے تیزاب کو ہیرا کسیس کا تیل کہا کرتا تھا۔

تشریح جابر بن حیّان ابھی دودھ پیتا بچہ تھا کہ وہ اپنے باپ سے محروم ہو گیا۔ دراصل اس کے باپ نے حکومتِ وقت کے خلاف سرکشی اختیار کی تھی جس سے غضبناک ہو کر حکومت نے اسے قتل کرا دیا۔ جابر بن حیّان کو عرب کے ایک دُور دراز علاقے میں لے جایا گیا اور اس نے ایک صحرائی قبیلے میں پرورش پائی۔ اس نے اپنا بچپن اور جوانی کا زمانہ صحرا میں ہی گزارا۔ ان حالات میں وہ اپنے زمانے کی اعلیٰ تعلیم حاصل نہ کر سکا۔ تاہم اس نے ہمت نہ ہاری اور ناموافق حالات کے باوجود اس نے اپنی محنت، لیاقت اور ذہانت سے سائنس کی دنیا میں اپنے لئے اتنا بلند مقام حاصل کر لیا جو اس کے عہد میں کسی اور کو حاصل نہیں ہوا۔

آفتاب حسن (ولادت: ۱۹۰۹ء)

پٹرولیم

تعارف اور پس منظر

آفتاب حسن کا مضمون "پٹرولیم" نہ صرف ان کے سلسلۂ مضامین میں ایک نمایاں مقام کا حامل ہے بلکہ اردو زبان میں مشکل سائنسی موضوعات کو عام فہم بنا کر پیش کرنے کی کوششوں میں ایک مثال کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اس مضمون میں پٹرولیم کی اہمیت، تاریخ، ماخذ، کیمیائی ترکیب، پیدائش کے بارے میں نامیاتی اور غیر نامیاتی نظریات، اس کی موجودگی کے یقینی مقامات اور طریقِ حصول پر بڑے دل نشیں انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

مصنّف نے سب سے پہلے زمین کے انمول خزانوں میں سے پٹرولیم کی اہمیت واضح کی ہے اور بتایا ہے کہ دورِ جدید میں مشینوں کو چلانے کے لئے جن تین اہم ذرائع کی ضرورت ہے۔ (یعنی بجلی، کوئلہ اور پٹرول) ان میں پٹرول سب سے اہم چیز ہے، کیونکہ خشکی، تری اور ہوا میں چلنے والی کوئی مشین بھی اس سے بے نیاز نہیں رہ سکتی۔ یہ کسی نہ کسی شکل میں لازماً اس میں استعمال ہوتا ہے۔ اگر ایندھن کی حیثیت سے نہیں تو چکنائی کی حیثیت سے۔ پھر مصنّف نے بتایا ہے کہ قدیم زمانے کے لوگ بھی پٹرولیم اور اس کے استعمال سے بخوبی واقف تھے۔ چنانچہ اس کی مختصر تاریخ بیان کرتے ہوئے اس نے انجیل، مورّخ ہیروڈوٹس، مورّخ بلنیاس، جاپانی اور چینی کتابوں اور سیاح مارکوپولو وغیرہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ پرانے زمانے میں یہ کہاں کہاں پایا جاتا تھا اور وہ لوگ اسے کس طرح استعمال کرتے تھے۔ مصنّف کی وضاحت کے مطابق وہ لوگ نہ صرف اسے جلاتے تھے بلکہ زخموں کو اچھّا کرنے کے لئے بھی اسے برتتے تھے۔ اسی طرح اس کے بخارات اڑا کر باقی بچنے والی قیر (تارکول) کو کشتیوں کے تختوں پر لگا کر انہیں پانی کے اثرات سے محفوظ کرتے تھے۔ مصنّف نے بابل (عراق)، زانٹے، صقلیہ، چین، جاپان، باکو (روس) اور برما کا بطور خاص ذکر کیا ہے جہاں قدیم مؤرخین اور سیاحوں نے پٹرول کی موجودگی کی نشان دہی کی ہے

اس کے بعد مصنّف نے پٹرولیم کے ماخذ اور کیمیائی ترکیب کا ذکر کیا ہے اس نے بتایا

ہے کہ کیمیاوی نقطۂ نگاہ سے پٹرولیم ایک سادہ چیز ہے۔ یہ دو عناصر یعنی کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے جسے کیمیائی زبان میں ہائیڈرو کاربن کہتے ہیں۔ دراصل پٹرولیم مختلف قسم کے بے شمار ہائیڈرو کاربنوں کا ایک آمیزہ ہے۔ رہی یہ بات کہ یہ ہائیڈرو کاربن زمین کے اندر کہاں سے آ گئے، تو اس سلسلے میں مصنّف نے دو نظریات کا ذکر کیا ہے، جن کے بارے میں اس نے واضح کر دیا ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی قطعیت سے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ صحیح ہے۔ یہ دو نظریات ہیں (i) غیر نامیاتی نظریہ (INORGANIC THEORY) اور (ii) نامیاتی نظریہ (ORGRNIC THEORY) غیر نامیاتی نظریے کے حامی سائنسدانوں کا خیال ہے کہ پٹرول کے کاربن اور ہائیڈروجن، ان معدنیات سے حاصل ہوتے ہیں جو زمین کے اندر مختلف مرکبات (COMPOUNDS) کی شکل میں موجود ہیں اور جو زمین کے زبردست دباؤ اور اندرونی بے پناہ حرارت اور لاکھوں برسوں کے عمل کے نتیجے میں تحلیل ہو کر ہائیڈرو کاربنوں میں تبدیل ہو جاتے ہیں اور یہی ہائیڈرو کاربن پٹرول کی اصلیت ہیں۔ نامیاتی نظریے کے حامی سائنسدان کہتے ہیں کہ پٹرولیم کے کاربن اور ہائیڈروجن دراصل مردہ معدنی اشیاء نہیں بلکہ نہایت ہی ننھے ننھے حیوانی اور نباتاتی جاندار ہیں جو کروڑوں سالوں سے یا تو سمندر میں پہلے سے موجود تھے یا بارش کے پانی کی وجہ سے ندی نالوں اور دریاؤں کے ذریعے سمندر میں پہنچ گئے۔ زمین کی حالت چونکہ بدلتی رہتی ہے اس لئے جہاں پہلے سمندر تھا وہاں لاکھوں سال گزرنے کے بعد خشکی نکل آئی اور جہاں خشکی تھی، وہاں سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگے۔ ان سمندروں کے نیچے گھنے جنگل اور بلند پہاڑ اور ان میں رہنے والے جانور بھی آ گئے جن پر دریاؤں کی مٹی کی تہیں بتدریج چڑھتی چلی گئیں اور وہ ان کے نیچے دب کر رہ گئے۔ یہ نباتاتی اور حیوانی جاندار مر مر کر سمندر کی تہ میں بیٹھتے رہے اور ان کے اوپر مٹی کی گہری ہوتی ہوئی تہوں نے انہیں گلنے سڑنے سے محفوظ رکھا۔ زمین کے زبردست دباؤ اور بے پناہ اندرونی حرارت نے انہیں آہستہ آہستہ تحلیل کرنا شروع کر دیا اور وہ پہلے ہائیڈرو کاربنوں اور بعد ازاں پٹرولیم میں تبدیل ہو گئے۔

مصنّف نے بتایا ہے کہ نامیاتی نظریے کے حامیوں کے بھی تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ تیل صرف ننھے ننھے کیڑوں کی تحلیل سے پیدا ہوتا ہے۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ اس کی پیدائش کا باعث ننھے ننھے پودے ہیں۔ تیسرے گروہ کی رائے میں پٹرول کی تخلیق میں حیوانی اور نباتاتی دونوں قسم کے جانداروں کا حصہ ہے۔ نامیاتی نظریہ تو اب بھی کسی حد تک مقبول ہے۔ لیکن غیر نامیاتی نظریے کی صحت پر اب بہت کم لوگ یقین رکھتے ہیں۔ تاہم مصنّف نے واضح کر دیا ہے کہ دونوں میں سے کسی ایک نظریے

کے بارے میں قطعیت سے یہ کہنا کہ وہ درست ہے ـــــ صحیح نہ ہوگا۔

اس کے بعد مصنّف نے زمین کی تہوں کے اندر پٹرول کے بننے کے عمل، اس کے بہنے اور جمع ہونے کی تفصیل قلم بند کی ہے اس ضمن میں اس نے سمندر کی تہہ میں موجود رسوبی چٹانوں کا ذکر کیا ہے جو در اصل سنگِ مرمر، ریت پتھر، چونا پتھر، شیل (SHALE) اور دوسری اقسام کے مسام دار پتھر ہیں۔ انہیں چٹانوں کے مساموں میں یہ پٹرول جمع ہوتا رہتا ہے جہاں وہ زمین کے غیر مسام دار حصّوں میں پہنچ کر محفوظ ہو جاتا ہے اور پھر وہاں سے نکال لیا جاتا ہے۔

مضمون کے آخر میں مصنف نے بتایا ہے جہاں تیل ہوتا ہے، وہاں گیس بھی ضرور ہوتی ہے لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں گیس ہو وہاں سے تیل بھی نکلے کیونکہ اکثر جگہ جہاں زمین میں سوراخ کرنے سے صرف گیس نکلتی ہے، وہاں تیل کا نام ونشان تک نہیں ہوتا۔ اس کی ایک مثال بلوچستان کے علاقے میں سوئی گیس کی دریافت ہے، جو تیل تلاش کرتے کرتے اتفاقاً نکل آئی۔ البتہ جہاں تیل ہو، وہاں گیس اور پانی بھی اپنی اپنی کثافت (DENSITY) کے لحاظ سے جمع ہو جاتے ہیں۔ گیس چونکہ سب سے ہلکی ہوتی ہے، اس لئے وہ اوپر رہتی ہے۔ اس کے نیچے تیل ہوتا ہے اور سب سے نیچے پانی۔ مصنّف نے یہ بھی واضح کر دیا ہے کہ جہاں تیل ہوتا ہے، وہاں تالاب کی سی کیفیت نہیں ہوتی بلکہ وہ مسام دار چٹانوں یا ریتلی جگہوں کے اندر ہی اندر موجود رہتا ہے، جہاں سے وہ ان ٹھوس مقامات پر پہنچ جاتا ہے جو کوہان یا گنبد کی طرح زمین کے اندر چھپے رہتے ہیں اور ان میں مسام نہیں ہوتے۔ اسی لئے ان مقامات سے تیل نکالنا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہاں ان کا ذخیرہ ہوتا ہے۔

مشکل الفاظ و محاورات کے معانی

ص ۲۰۵ | **پٹرولیم:** یہ لاطینی زبان کا لفظ ہے اور دو لفظوں سے مل کر بنا ہے ایک پٹرا (PETRA) جس کے معنی چٹان ہیں اور دوسرا اولیم (OLEUM) جس کے معنی تیل ہیں۔ اس طرح لفظ پٹرولیم کے لفظی معنی چٹان کا تیل ہیں۔ پٹرولیم کو ہم زمینی تیل، معدنی تیل یا کروڈ آئل (CRUDE OIL) بھی کہتے ہیں۔ یہاں مراد وہ معدنی تیل ہے جو مشینوں کے چلانے کے کام آتا ہے یا مائع ہائیڈرو کاربنوں کا وہ مرکب جسے عمل کشید کے ذریعے صاف کیا جاتا ہے۔ پٹرولیم سبزی مائل سُرخ، ہلکے زرد، بھورے یا کالے رنگ کا ایک بودار مائع ہے جس میں کئی ہزار مرکبات ہوتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر کاربن اور ہائیڈروجن کے مرکبات (ہائیڈرو کاربن) ہیں لیکن اس کے ساتھ آکسیجن، نائٹروجن اور سلفر کے مرکبات بھی کم مقدار میں موجود ہوتے ہیں۔ **انمول:** نہایت قیمتی۔ جس کا کوئی مول (قیمت) نہ دے سکے **خزانہ:** وہ جگہ جہاں روپیہ یا قیمتی چیزیں

جمع ہوں، ذخیرہ۔ بدل: عوض، بدلہ، معاوضہ۔ جدید: نئی۔ مشین: کل پرزوں سے بنی ہوئی چیز۔ قوت: طاقت۔ اہم: ضروری۔ موزوں: مناسب۔ حمل ونقل: چیزوں کو ایک جگہ سے اٹھانا اور دوسری جگہ لے جانا۔ سردست: فی الحال، ابھی۔ مناسبت: تعلق، نسبت۔ تیزرو: تیز رفتار۔

ص ۲۰۶ | بل بوتے پر: زور پر۔ طویل: لمبے لمبے۔ پل بھر میں: ایک لمحہ میں۔ ایندھن: آگ جلانے کی چیز مثلاً لکڑی، مٹی کا تیل، اُپلے، کوئلہ یا قدرتی گیس۔ چکنائی: گاڑھے تیل۔ چکنا: تیل سے ملائم کرنا۔ مزاحمت: روکاوٹ، روک، اٹکاؤ۔ معدنی: زمین کھود کر نکالی جانے والی چیز۔ نباتاتی تیل: وہ تیل جو زمین سے اُگنے والی چیزوں (مثلاً پودوں وغیرہ) سے حاصل کیا جائے۔ حیوان: جانور، مویشی، ڈھور ڈنگر۔ چربی: چکنائی، گوشت کے ساتھ ایک سفید مادہ۔ دریافت: معلوم کی جانے والی چیز۔ انجیل: عیسائیوں کی ایک مقدس کتاب جو حضرت عیسیٰؑ پر نازل ہوئی تھی۔ یہ اپنی اصلی شکل میں دُنیا سے غائب ہو چکی ہے، البتہ مختلف مسخ شدہ نسخے جو بعد میں مرتب کئے گئے اور جن میں حضرت عیسیٰؑ کی زندگی کے مختصر واقعات اور آپ کی تعلیمات قلم بند کی گئی ہیں) اب بھی ملتے ہیں ان کے نام ہیں۔ انجیل لوقا، انجیل متّی، انجیل مرقس۔ انجیل یوحنّا۔ ہیرو ڈوٹس (HERODOTUS): عظیم یونانی مورخ جو ۴۸۵ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۴۲۰ قبل مسیح میں فوت ہوا۔ اس نے یونان و ایران کی تاریخ لکھی ہے اور اسی ضمن میں مصر، افریقہ اور عرب کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ رومی فلسفی سسرو (CICERO) نے اسے بابائے تاریخ قرار دیا ہے نیز اُسے بابائے انتھروپالوجی (علم الانسان) بھی کہتے ہیں۔ بابل: قدیم عراق کا شہر جو بغداد سے ساٹھ میل جنوب میں اور موجودہ کوفہ کے قریب، دریائے فرات کے کنارے پر واقع تھا۔ اب اس کے کھنڈرات باقی رہ گئے ہیں۔ اس کے معلّق باغات عجائبات عالم میں شمار ہوتے تھے یہ اپنے زمانے میں عراق کا دارالحکومت تھا۔ مؤرخ: تاریخ لکھنے والا۔ جزیرہ: خشکی کا وہ ٹکڑا جو چاروں طرف سے پانی میں گھرا ہوا ہو۔ جزیرہ زانٹے: (ZANTE) یہ ملک یونان کا ایک قدیم جزیرہ ہے جو آئی اونین (IONIAN) سمندر میں واقع ہے۔ یہ سمندر بحیرہ روم کی ایک شاخ ہے۔ آج کل جزیرہ زانٹے کو جزیرہ زاکن تھاس (ZAKINTHOS) کہتے ہیں۔ بلنیاس (پلینی) (PLINY): متوفی ۷۹ء ایک قدیم اطالوی مورخ جو کتاب "تاریخ طبعی" (NATURAL HISTORY) کا مصنف ہے۔ اس نے عرب کے مشرقی سواحل کا اور خصوصاً اس مہم کا ذکر کیا ہے جو رومیوں نے مشرقی سواحل کے اکتشاف کے لئے روانہ کی تھی۔ صقلیہ: ملک اٹلی میں شامل جزیرہ سسلی۔ یہ بحیرہ روم کے وسط میں واقع ہے اور کافی عرصہ مسلمانوں کے قبضے میں رہا ہے۔ معدنی تیل: زمین کی کھدائی کر کے

نکالا جانے والا تیل۔ سیّاح: مختلف ملکوں کی سیر کرنے والا۔ مارکوپولو: وینس (اٹلی) کا رہنے والا مشہور سیّاح جو ۱۲۵۶ء میں پیدا ہؤا اور ۱۳۲۳ء میں فوت ہؤا۔ اس نے روس، چین، ہندوستان اور دیگر مشرقی ممالک کی سیاحت کی، اس نے اپنا سفر نامہ بھی لکھا ہے، جس میں مختلف ممالک کے حالات، اپنے ذاتی تجربات اور عجائباتِ عالم کا ذکر کیا ہے۔ باکو: آذر بائیجان (روس) کا صدر مقام جو تیل کے چشموں کے لئے مشہور ہے۔

ص ۲۰۷ | لائق: قابل۔ بخارات: گیس یا بھاپ کی شکل۔ اجزاء: جزو کی جمع، حصّے۔ قیر: تارکول، ایک قسم کا سیاہ روغن۔ عیسیٰ علیہ السلام: عیسائیوں کے پیشوا اور مسلمانوں کے جلیل القدر پیغمبر جو یسوع مسیح بھی کہلاتے ہیں۔ بن باپ کے اور یہودیہ کے بیت لحم (نزد یروشلم) کے مقام پر ہیرودیس بادشاہ کے عہد میں حضرت مریم کے بطن سے معجزانہ طور پر پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کا صحیح تعین موجودہ عیسوی کیلنڈر کے مطابق ۶ء قبل مسیح سے ہوتا ہے اور ان کا رفع (آسمانوں پر زندہ اٹھایا جانا) ۲۹ء میں ہؤا۔ گویا انہوں نے ۳۵ برس کی زندگی پائی۔ آپ کے حالات زیادہ تر چار انجیلوں میں ملتے ہیں جو متی، لوقا، یوحنا اور مرقس نے مرتب کیں۔ ان سب کے مجموعے (چند صحائف سمیت) کو "نیا عہد نامہ" کہا جاتا ہے۔ حضرت عیسےٰ کا گھرانہ ناصرہ (گلیل) میں رہتا تھا اور جوانی تک آپ بھی ناصرہ میں رہے اس لئے آپ مسیح ناصری کہلائے۔ یہودیوں اور عیسائیوں کے عقیدے کے مطابق آپ کو یہودیوں کے اصرار پر رومی حاکم پیلاطس نے یروشلم میں پھانسی دی لیکن مسلمانوں کے عقیدے کے مطابق آپ پھانسی پانے سے قبل زندہ آسمانوں پر اٹھا لئے گئے۔ بعض روایات کی رو سے قیامت کے قریب آپ آسمان سے منارۂ دمشق پر اتریں گے۔ دجّال کو قتل کریں گے اور مہدی آخر الزمان کے ساتھ مل کر دنیا میں اسلام قائم کریں گے پھر آپ اپنی طبعی عمر گزار کر فوت ہوں گے اور آنحضرتؐ کے مقبرے میں اُن کے پہلو میں دفن ہوں گے۔ برما: بھارت کے مشرق میں ایک ملک جہاں زیادہ بدھ مذہب کے لوگ آباد ہیں۔ یہاں جنگلات کی کثرت ہے جن میں ہاتھی، شیر اور دوسرے درندے پائے جاتے ہیں۔ ان جنگلات سے ساگوان کی لکڑی بکثرت حاصل ہوتی ہے اور یہاں سے تیل بڑی مقدار میں نکلتا ہے۔ ایراودی ندی: برما کا ایک دریا۔ اسے دریائے ایراوتی بھی کہتے ہیں یہ ساڑھے بارہ سو میل لمبا ہے اور خلیج بنگال میں آکر گرتا ہے۔ قدیم: پرانے۔ برما: لکڑی یا زمین میں سوراخ کرنے کا لوہے کا آلہ۔ جدید: نئے۔ آلات: آلہ کی جمع۔ مزیّن: آراستہ، سجے ہوئے، لگے ہوئے۔ پہلو بہ پہلو: ساتھ ساتھ۔ کیمیاوی: کیمیا وہ علم ہے جس میں مادہ یعنی چیزوں کے خواص معلوم کرنے، ان کے اجزاء کو ملانے اور جدا کرنے کے لئے تجربات کئے گئے ہوں۔ عناصر: عنصر کی جمع۔ عنصر کا مطلب ہے مفرد چیز یا اصل جزو۔ سائنسی زبان میں عنصر—

(ELEMENT) سے مراد وہ مادہ ہے جو مزید سادہ تر اجزاء میں تقسیم نہ ہو سکے اور اپنے خواص برقرار رکھے۔ دُنیا کی تمام اشیاء عناصر سے بنی ہیں۔ یہ عناصر منفرد ہیں اور ایک ہی مادے سے بنے ہوتے ہیں۔ اب تک ۱۰۶ عناصر دریافت ہو چکے ہیں۔ عموماً ان کے ناموں کو اختصار کے ساتھ آسان علامتوں کی شکل میں لکھا جاتا ہے، جیسے کاربن کے لئے C ہائیڈروجن کے لئے H اور آکسیجن کے لئے O۔ البتہ بعض عناصر کے نام یونانی اور لاطینی زبانوں سے بھی لئے گئے ہیں مثلاً لوہا کیلئے FERRUM (علامت Fe) اور پوٹاشیم کے لئے (KALIUM) (علامت K)

مرکب: (COMPOUND) دو عناصر کا کیمیائی طور پر مل کر ایک نئی چیز بن جانا۔ آمیزہ: (MIXTURE) مجموعہ، ڈھیر، وہ عناصر جو مل کر ایک نہ ہوں بلکہ اپنی الگ الگ خصوصیات برقرار رکھیں۔ قطعی: بالکل مکمل طور پر۔ ناظرین: دیکھنے والے۔ صنعت: بنائی ہوئی چیزیں۔

ص ۲۰۸ | قطعی: مکمل طور پر، بالکل، تعجب انگیز: حیران کرنے والی۔ گروہ: افراد کا مجموعہ۔ معدنیات: زمین کھود کر نکالی ہوئی چیزیں۔ عناصر: عنصر کی جمع۔ مادے کی اصل و بنیاد، اصلی جزو۔ مادے کے وہ چھوٹے چھوٹے اجزاء جو اپنے خواص برقرار رکھیں مرکبات: (COMPOUNDS) مرکب کی جمع۔ دو یا دو سے زائد عناصر کا کسی خاص ترکیب سے مل کر ایک نئی چیز بننا۔ حرارت: گرمی۔ جوہر: کسی چیز کے اجزائے لطیف۔ غیر نامیاتی نظریہ (INDRGANIC THEORY) اس نظریہ کو روسی سائنسدان مینڈلیف نے پیش کیا تھا۔ اس نظریے کے مطابق زمین کے اندر پائی جانے والی دھاتوں کے کاربائیڈ (METALLIC CARBIDES) پانی اور بھاپ کے ساتھ بہت زیادہ دباؤ پر تعامل کر کے پٹرولیم بناتے ہیں۔ یہ نظریہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ نامیاتی نظریہ: (ORGANIC THEORY) اس نظریہ کو اینگلر (ENGLER) نے پیش کیا تھا۔ اس کی رو سے بڑے بڑے سمندری جانور مٹی کی تہوں میں لاکھوں سال تک دفن رہے، زمین کی تپش، دباؤ اور جراثیموں کے اثر نے انہیں پٹرولیم اور قدرتی گیس میں تبدیل کر دیا۔ یہی پٹرولیم آج تک زمین کے اندر بڑے بڑے ذخیروں کی شکل میں موجود ہے۔ لفظ نامیاتی یا نامیہ، نمو سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں بڑھنا یا اُگنا۔ نامیاتی مرکبات، حیوانات (جاندار چیزیں) یا نباتات (اُگنے اور بڑھنے والی چیزیں) سے حاصل ہوتے ہیں۔ اندیشہ: خوف، ڈر۔ کثرتِ رائے: اکثر لوگوں کی رائے۔ ماخذ: اصل بنیاد، منبع، اخذ کرنے یا لینے کی جگہ، وہ جگہ جہاں سے کوئی چیز نکلے۔ مردہ: بے جان۔ اشیاء: شے کی جمع، چیزیں۔ حیوانی: زندگی رکھنے والے۔ نباتاتی: زمین سے اُگنے اور پھلنے پھولنے والے۔ جاندار: زندگی یا جان رکھنے والی چیزیں۔ سنگِ مرمر: سفید رنگ کا ملائم قیمتی پتھر جو عمارتوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ریت پتھر: ریتلا یا بھُربھُرا پتھر۔ چونا پتھر: وہ پتھر جو کوٹھوں پر پکا کر سفید ہو جاتا ہے اور اسے قلعی یا سفیدی کے لئے استعمال کیا

جاتا ہے۔ شیل: (SHALE) ایک قسم کا بُھربُھرا مٹی نما پتھر۔ تہ بہ تہ: ایک تہ کے اوپر جمی ہوئی دوسری تہ۔ ایک پرت کے نیچے دوسرا پرت۔ رسوبی چٹانیں: سمندری تہ میں بیٹھی ہوئی چٹانیں۔ رسُوب، رسب کی جمع ہے، جس کے معنی ہیں تہ نشین، نیچے بیٹھنے والی چیزیں یا تلچھٹ۔ چٹان اونچی پتھریلی زمین یا پتھریلے تودے کو کہا جاتا ہے۔ رسنا بسنا: رہنا سہنا، آباد ہونا۔ ٹھاٹھیں مارنا: دریا یا سمندر کی لہروں کا زور شور سے بہنا۔ گھنے: گنجان، بہت تعداد میں گھنے والے۔

ص ۲۰۹ | سبب: وجہ۔ نالہ: نالہ، ندی سے چھوٹا ہوتا ہے، اور بارش کے پانی کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ مقدار: مجموعہ، تول، وزن، تعداد۔ بہاؤ: بہنا۔ مدّ و جزر: سمندر کے پانی کا اتار چڑھاؤ، جوار بھاٹا۔ مَد کے معنی پانی کی افزونی یا چڑھاؤ۔ جزر کے معنی ہیں سمندر کے پانی کا اتار۔ یکساں: برابر۔ ٹھوس: سخت، بھاری، بوجھل۔ قرار: چین۔ مادے: ہر چیز کی اصل، اجزا، جسم، وجود، چیزیں۔ ہل چل: افراتفری، ہنگامہ، حرکت۔ ہلچل مچنا: تہ و بالا ہونا۔ اضطراب اور حرکت ہونا۔ سطح: کسی چیز کا اوپری یا بالائی حصہ۔ سطحی حرکات: زمین کے اوپر کی تہ پر ہونے والی تبدیلیاں۔ غرق کرنا: ڈبونا۔ نباتاتی: اُگنے، بڑھنے اور پھلنے پھُولنے والے۔ نامئے: اُگنے، پیدا ہونے، بڑھنے یا پھلنے پھولنے والی جاندار اشیاء۔ نامیہ، نمو سے نکلا ہے۔ یہاں مراد ہے حیواناتی یا نباتاتی چیزیں۔ گویا: غالباً، جیسے، بالفرض، مانا کہ۔

ص ۲۱۰ | دفن: زمین یا پانی میں دب جانا۔ محفوظ: حفاظت میں ہونا، بچ جانا، سڑنا گلنا: گل کر یا خراب ہو کر۔ تحلیل: حل ہونا۔ مائع حالت میں تبدیل ہونا، اجزاء کا گھل مل کر ایک ہو جانا۔ یکساں: ایک جیسا، برابر۔ شیل: (SHALE) ایک قسم کا بھربھرا مٹی نما پتھر جس میں سوراخ ہوں اور ان سوراخوں میں تیل جمع ہو جائے۔ نچڑ کر: دباؤ پڑنے سے نکلنا۔ مسام دار: باریک سوراخوں والے۔ خوردبینی: اتنے باریک کہ وہ صرف خوردبین کی مدد سے نظر آئیں، خوردبین وہ آلہ ہے جو چھوٹی چیزوں کو بڑا کر کے دکھاتا ہے۔ خطۂ زمین: زمین کا گھرا ہوُا ٹکڑا یا حصہ۔ امکان: ممکن، جو ہو سکے۔

ص ۲۱۱ | بناوٹ: ساخت۔ ماخذ: منبع۔ نکلنے کی جگہ۔ موزوں: مناسب۔ آتش فشانی چٹانیں: وہ چٹانیں (پتھریلے تودے) جن سے آگ اور لاوا نکلتا ہے۔ لاوہ، وہ جھلسا دینے والا گرم پگھلا ہوُا مادہ ہے جو آتش فشاں پھٹنے کے بعد نکلتا ہے۔ اثرات: اثر کی جمع، خاصیت۔ سنگ خارا: ایک قسم کا سخت پتھر، نیلا پتھر۔ اسباب: سبب کی جمع، وجوہات۔

ص ۲۱۲ | رسوبی چٹانیں: سمندر کی تہ میں موجود چٹانیں۔ ارضیات: ارض سے مشتق، وہ علم

جو زمین اور اس کی ہیئت مجموعی سے تعلق رکھتا ہے۔ علمِ ترکیب زمین، علمِ طبقات الارض۔ ماہرِ ارضیات: انگریزی میں جیالوجسٹ، یعنی زمین کی مٹی اور اس میں موجود اشیاء کے بارے میں علم رکھنے والا۔ امتحان: جانچ، آزمائش، تجربہ۔ بناوٹ: ساخت۔ محدود: گھرا ہُوا، کم، مختصر۔ مسام دار: باریک سوراخوں والی۔ قبل: پہلے۔ دباؤ: بوجھ، زور۔ ارضیاتی: زمینی۔ سطحی حرکات: زمین کی اوپر کی سطح پر ہونے والی تبدیلیاں۔ تہ: نیچے۔ شکن: سلوٹ۔ تہ بہ تہ: پرت کے نیچے پرت۔ کوہان: اونٹ کی پیٹھ کا ابھار یا بلندی۔ گنبد نما: گنبد کی مانند گنبد، مسجد اور مقبرے کی گول چھت کو کہا جاتا ہے۔ ماخذ: منبع، نکلنے کی جگہ۔

ص ۲۱۳ | دھکیل: دھکا لگا کر، زور لگا کر آگے بڑھانا یا کھینچنا۔ گنبد: گول چھت کی طرح کوئی چیز۔ گنبد نما: گنبد کی طرح گول۔ آزو بازو: اِدھر اُدھر سے، دائیں بائیں سے۔ خم: جھکاؤ۔ مقید: قید، بند۔ گیس: مادے کی تیسری حالت (پہلی دو حالتیں ٹھوس اور مائع ہیں) روشنی یا حرارت دینے والا وہ دھواں جو ہڈیوں، کوئلوں یا پٹرولیم کی جگہ سے پیدا ہوتا ہے۔

کثافت: (DENSITY) سائنسی زبان میں اکائی حجم کی کمیت (MASS)

کمیت کسی شے کی مقدار مادہ ہے، جبکہ وزن وہ قوت ہے جس سے زمین اُس شے کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ کسی چیز کی کثافت معلوم کرنے کے لئے کمیت (MASS) پر حجم (VOLUME) کو تقسیم کرنا پڑتا ہے۔ کثافت یہاں لغوی نہیں بلکہ اصطلاحی معنی میں استعمال ہُوا ہے۔ سوئی گیس: بلوچستان کے علاقہ سوئی سے نکلنے والی قدرتی گیس جو جلانے کے کام آتی ہے۔ اتفاقیہ: کسی خاص مقصد یا ارادے کے بغیر۔ تالاب: پانی کا بڑا حوض۔ مسام دار: چھوٹے چھوٹے سوراخوں والی۔

سبق کا خلاصہ

پٹرولیم، ہماری زمین کے ان انمول خزانوں میں سے ایک ہے جس کا بدل ملنا بہت مشکل ہے۔ آج کی دنیا مشین کی دنیا ہے اور مشینوں کو چلانے کے لئے بجلی، کوئلہ اور پٹرول کی ضرورت پڑتی ہے۔ بجلی صرف ان مشینوں کے لئے موزوں ہے جو یا تو ایک جگہ قائم رہیں یا پھر تار کے ذریعے ان کا تعلق بجلی گھر سے رہے پھر بجلی کی مقدار جمع کر کے اسے محفوظ بھی نہیں رکھا جا سکتا۔ کوئلہ عموماً کارخانوں، بحری جہازوں اور ریلوں میں استعمال ہوتا ہے لیکن یہ بہت وزنی ہوتا ہے، اس لئے تیز رفتار اور ہلکی مشینوں کے لئے کارآمد نہیں۔ صرف پٹرول ایسی چیز ہے جو صاف ستھری بھی ہے، جلد بھڑک بھی اُٹھتی ہے اور مشینوں کے جسم میں خون کا درجہ رکھتی

ہے۔ ہوائی جہاز، موٹریں اور مختلف طرح کی گاڑیاں اسی سے چلتی ہیں، خشکی، تری اور ہوا میں حرکت کرنے والی ہر مشین میں پٹرولیم ایندھن یا چکنائی کی حیثیت سے استعمال ہوتا ہے۔ پٹرولیم سے ہی ایسے گاڑھے تیل بھی نکلتے ہیں جن سے مشینوں کے مختلف حصوں کو چکنا کر کے ان کی مزاحمت کم کی جاتی ہے۔

پٹرولیم، معدنی تیل بھی کہلاتا ہے کیونکہ یہ زمین کھود کر نکالا جاتا ہے۔ پودوں سے نکلنے والے تیل کو نباتاتی تیل اور حیوانوں سے حاصل ہونے والے تیل (چربی) کو حیوانی تیل کہا جاتا ہے۔ پٹرولیم جدید زمانے کی دریافت نہیں ہے کیونکہ پرانے زمانہ کے لوگ اس سے بخوبی واقف تھے۔ انجیلِ مقدس میں اس کا ذکر موجود ہے۔ مشہور یونانی مؤرخ ہیروڈوٹس نے بابل کے قریب اور جزیرہ زانٹے میں تیل کے چشموں کا ذکر کیا ہے۔ ایک اور مؤرخ بلنیاس (پلینی) نے جزیرہ صقلیہ (سسلی) میں معدنی تیل کے موجود ہونے کی نشاندہی کی ہے۔ پرانی جاپانی اور چینی کتابوں میں جگہ جگہ معدنی تیل کا بیان موجود ہے۔ مشہور سیاح مارکو پولو نے اپنے سفر نامے میں باکو کے قریب تیل کے چشموں کا وضاحت سے ذکر کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ یہاں کے صرف ایک چشمے سے اتنا تیل نکلتا ہے کہ اس سے سَو جہازوں کو بھرا جا سکتا ہے، تاہم اس نے وضاحت کر دی ہے کہ یہ تیل کھانے کے نہیں جلانے کے کام آ سکتا ہے۔

پرانے زمانے میں تیل کو جلانے کے علاوہ دوا کے طور پر زخموں کو اچھا کرنے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا۔ پٹرولیم سے جب بخارات میں تبدیل ہونے والے اجزا نکل جاتے تھے تو باقی گاڑھی سی قیر (تارکول) رہ جاتی تھی جسے قدیم زمانے میں کشتیوں کو پانی کے اثر سے محفوظ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ چینی لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے بھی بہت پہلے زمین کھود کر تیل نکالتے تھے۔ برما میں ایراودی ندی کے کنارے تیل کے پرانے چشمے آج تک موجود ہیں جو ہاتھ سے کھودے گئے تھے اور جن سے برمی اب بھی تیل نکالتے ہیں حالاں کہ اب ان کے قریب جدید آلات سے کھودے ہوئے کنوئیں بھی کام کر رہے ہیں۔

کیمیائی اعتبار سے پٹرولیم صرف دو عناصر (ELEMENTS) کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے جسے ہائیڈرو کاربن کہا جاتا ہے۔ پٹرولیم مختلف قسم کے ہائیڈرو کاربنوں کا آمیزہ ہے۔ زمین کے اندر تیل کی موجودگی کے اسباب کے سلسلے میں دو نظریات پیش کئے جاتے ہیں (۱) غیر نامیاتی نظریہ (INORGANIC THEORY) (۲) نامیاتی نظریہ (ORGANIC THEORY)

جو سائنسدان غیر نامیاتی نظریے کے قائل ہیں، ان کے خیال میں پٹرول کا کاربن اور ہائیڈروجن، معدنیات سے حاصل ہوتا ہے کیونکہ زمین کے اندر یہ عناصر (کاربن اور ہائیڈروجن) مختلف

مرکبات (COMPOUNDS) کی شکل میں موجود ہیں، جن پر زمین کے زبردست دباؤ، اس کی اندرونی حرارت اور لاکھوں سال اسی حالت میں پڑے رہنے کے نتیجہ میں کاربن اور ہائیڈروجن کے جوہر آپس میں مل کر ہائیڈرو کاربن میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو پٹرولیم کی اصل ہے۔ یہ نظریہ زیادہ مقبول نہیں ہوا۔ اس کے مقابلے میں نامیاتی نظریے کے قائل سائنسدان کہتے ہیں کہ پٹرولیم کے کاربن اور ہائیڈروجن، مردہ معدنی اشیاء سے پیدا نہیں ہوتے بلکہ ان کے ماخذ ننھے ننھے حیوانی اور نباتاتی جاندار ہیں۔ سنگ مرمر، ریت پتھر، چونا پتھر، شیل (SHALE) اور دیگر قسموں کے تہ بہ تہ جمے ہوئے پتھر جو اب زمین پر نظر آتے ہیں، رسوبی (سمندر کی تہ میں بیٹھی ہوئی) چٹانیں کہلاتے ہیں، یہ چٹانیں اب تو خشکی پر ہیں لیکن دراصل یہ سمندر کی تہ میں لاکھوں سال کے عمل سے تیار ہوئی ہیں آج سے کروڑوں سال پہلے زمین کی حالت مختلف تھی۔ جہاں آج خشکی ہے وہاں پہلے سمندر تھا اور جہاں اب سمندر پھیلا ہوا ہے، وہاں پہلے گھنے جنگل اور پہاڑ تھے جو جانوروں سے بھرے ہوئے تھے۔

بارش کی وجہ سے، ندیاں، نالے اور دریا خشکی سے ریت اور مٹی کی بڑی مقدار بہا کر سمندر میں لے آتے ہیں جو آہستہ آہستہ سمندر کی تہ میں بیٹھتی جاتی ہے اور پانی کے بہاؤ اور اتار چڑھاؤ کی وجہ سے سمندر کی تہ میں یکساں طور پر پھیل جاتی ہے یہ سلسلہ جاری رہتا ہے اور یوں مٹی کی تہ پر تہ جمتی چلی جاتی ہے، اور یہ موٹی اور بوجھل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے نچلی تہیں دب کر پتلی ہو جاتی ہیں اور ان میں اتنی سختی پیدا ہو جاتی ہے کہ وہ پتھر کی شکل میں ڈھل جاتی ہیں۔

زمین بظاہر ٹھوس اور پرسکون لگتی ہے لیکن اس کو اندر اور باہر سے کہیں بھی قرار نہیں۔ زمین کے اندر موجود مادی اشیاء میں ہل چل مچی رہتی ہے۔ کبھی اس کی سطح دب جاتی ہے اور کبھی اُٹھ جاتی ہے۔ ان سطحی حرکات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کبھی سمندر کی سطح بلند ہو کر خشک زمین بن جاتی ہے اور کبھی پانی بہہ کر خشک زمین کو غرق کر کے سمندر بنا دیتا ہے۔ اسی لئے آج ہمیں خشک زمین پر کبھی سطح کے اوپر اور کبھی سطح کے نیچے، پتھروں کی تہ پر جمی ہوئی چٹانیں نظر آتی ہیں۔

جو سائنسدان نامیاتی نظریے کے قائل ہیں، ان کی رائے میں دریائی مٹی کے ساتھ ساتھ بے شمار ننھے ننھے حیوانی اور نباتاتی جاندار بھی سمندر میں داخل ہوتے رہتے ہیں اور خود سمندر میں بھی ایسے جانداروں کی بڑی کثرت ہوتی ہے جو مر کر اس کی تہ میں بیٹھتے رہتے ہیں۔ اس طرح یہ ننھے نامیے (حیوانی اور نباتاتی اشیاء) بہت بڑی مقدار میں سمندر کی تہ میں تہ بہ تہ جمع ہوتے رہتے ہیں۔ تہوں کے نیچے آجانے کی وجہ سے وہ دب کر رہ جاتے ہیں اور باہر کی ہوا سے محفوظ ہو جاتے ہیں۔ سمندر کا نمکین پانی انہیں گلنے سڑنے سے بچائے رکھتا ہے۔ پھر اندرونی گرمی اور زبردست بوجھ کی وجہ سے وہ آہستہ آہستہ مائع حالت میں ڈھلنا شروع ہوتے ہیں اور گھل مل کر یک جان ہو جاتے ہیں۔ لاکھوں سال یہ عمل

جاری رہتا ہے اور پھر وہ پٹرولیم میں تبدیل ہو جاتے ہیں جو یکساں طور پر مٹی کی تہ میں پھیل جاتا ہے لیکن جب اوپر سے اور دباؤ پڑتا ہے تو مٹی کی تہ دب کر شیل (SHALE) یعنی بھربھرا مٹی نما مسام دار پتھر بن جاتی ہے جس میں تیل پہلے تو جمع ہوتا رہتا ہے اور پھر نچڑ کر زیادہ مسام دار حصوں (مثلاً ریتلی جگہوں) میں جمع ہو جاتا ہے۔ ریت کے ذرات کے درمیان تیل جمع رہنے کی کافی جگہ ہوتی ہے۔

نامیاتی نظریے کے حامیوں کے بھی تین گروہ ہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے تیل ایسے ننھے ننھے کیڑوں کی تحلیل سے پیدا ہوتا ہے جو صرف خوردبین سے نظر آ سکتے ہیں۔ دوسرے گروہ کا خیال ہے کہ وہ ننھے ننھے پودوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔ تیسرے گروہ کی رائے میں پٹرول بننے میں دونوں قسم کے جانداروں (حیوانی اور نباتاتی) کا حصہ ہے۔

اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ خطۂ زمین پر کن کن جگہوں پر تیل پایا جا سکتا ہے اور کہاں اس کی موجودگی کے امکانات نہیں ہیں۔ ایک بات واضح ہے کہ زمین کے ہر حصے میں پٹرول پائے جانے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اگر کسی حصے میں پٹرول کسی زمانے میں بن بھی گیا ہو تو بھی اس کا باقی رہنا ضروری نہیں ہے۔ کیوں کہ جب تک اس کے جمع رہنے اور محفوظ رکھنے کا کوئی سامان نہ ہو تو تیل لازماً ضائع ہو جائے گا۔

پہلی ضروری بات یہ ہے کہ تیل کی موجودگی کے لئے مسام دار چٹانوں کا ہونا ضروری ہے جن میں تیل جمع رہ سکے۔ دوسری ضروری چیز ایک غیر مسام دار چٹان ہے جو مسام دار تہ کے اوپر ہو اور تیل کو محفوظ رہ سکے۔ اگر تیل کی سطح کے نیچے سے پانی بڑے دباؤ کے تحت اوپر اٹھنا شروع ہو تو وہ تیل کو آگے دھکیل دے گا اور غیر مسام دار چٹان اس کے اوپر موجود نہ ہو تو تیل اوپر اٹھتے اٹھتے زمین کی سطح پر آ جائے گا اور یوں یہ بہہ کر ضائع ہو جائے گا۔ تیسری ضروری چیز یہ ہے کہ زمین کی اندرونی بناوٹ ایسی ہونی چاہئے کہ تیل دُور دُور سے اکٹھا ہو کر ایک جگہ جمع ہو جائے۔ اگر ایسا نہ ہو سکے تو پھر تیل کا حصول ناممکن ہو جائے گا۔ اگر تیل تو موجود ہو لیکن وہ سینکڑوں میل کے رقبے میں پھیلا رہے تو اس کا نکالنا اور حاصل کرنا ناممکن ہو جاتا ہے۔ چوتھی اور سب ضروری چیز یہ ہے کہ کوئی ایسا ماخذ یا منبع ہونا چاہیئے جہاں سے تیل نکل سکے کیونکہ جب تک کوئی خطۂ زمین ایسا نہ ہو جس میں کسی زمانے میں تیل تیار ہوا ہو، جس سے تیل نکل کر موزوں مقامات پر جمع ہو سکے تو باقی سب چیزوں کا ہونا نہ ہونا ایک برابر ہے۔ جب تک یہ چاروں چیزیں ایک جگہ نہ پائی جائیں، تیل پائے جانے کا کوئی امکان نہیں۔

زمین کے بعض حصوں میں آتش فشانی چٹانیں پائی جاتی ہیں جن کے اندر پگھلی ہوئی دھاتیں موجود ہوتی ہیں اور وہ دیگر اشیاء کے ساتھ مل کر سنگِ خارا یا دوسری قسم کے سخت پتھر بن جاتی

ہیں۔ ایسی جگہوں پر تیل کی موجودگی کا کوئی امکان نہیں۔ افسوس ناک امر یہ ہے کہ سطح زمین کا تقریباً آدھا حصہ اسی قسم کی چٹانوں سے بھرا پڑا ہے لہٰذا اگر تیل کی تلاش کرنا ہو تو صرف ان جگہوں پر کی جائے جہاں رسوبی چٹانیں (سمندر کی تہہ میں موجود چٹانیں) خود موجود ہوں یا جہاں وہ قریب ہی پائی جائیں۔ علاوہ ازیں وہ علاقہ آتش فشاں چٹانوں سے پاک ہو۔ وہاں ریت پتھر، چونے کا پتھر یا ریت یا اسی قسم کی دوسری ایسی تہ موجود ہو جہاں تیل جمع رہ سکے۔ یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ زمین کے اندر کوئی حصہ ایسا ہے یا نہیں جہاں تیل تیار ہوا ہو۔ (ماہر ارضیات، سطح زمین کے اندر سے نکالی ہوئی مٹی اور پتھر کا جائزہ لے کر یہ بتا سکتا ہے) پھر یہ دیکھنا بھی ضروری ہے کہ آیا زمین کی ساخت ایسی ہے یا نہیں کہ اس میں دُور دور سے تیل آکر ایک مختصر علاقے میں جمع ہو سکے۔ یہ بھی دیکھنا چاہیئے کہ کیا مسام دار تہ کے اوپر ایک غیر مسام دار تہ موجود ہے یا نہیں! اگر یہ سب شرائط پوری ہوں تو پھر اس جگہ تیل کی موجودگی کا امکان ہو سکتا ہے۔

جب زمین کے کسی حصے میں تیل تیار ہو جاتا ہے تو پہلے وہ مٹی کی تہ میں پھیلا رہتا ہے پھر جب مٹی کی تہ پر زیادہ دباؤ پڑتا ہے تو اس میں سے تیل باہر نکل کر زیادہ مسام دار اور کم دبنے والے حصوں مثلاً ریت وغیرہ کی تہ میں چلا جاتا ہے۔ پھر چٹانوں کے دباؤ، پانی کے دباؤ، اندرونی سطح کی تبدیلیوں یا دیگر طبعی اسباب سے تیل اپنی جگہ سے حرکت کر کے اس جگہ جمع ہو جاتا ہے جہاں سے وہ باہر نہیں نکل سکتا۔

زمینی تبدیلیوں اور اس کی سطحی حرکات سے زمین کی تہوں میں شکنیں پڑ جاتی ہیں اور وہ مختلف جگہوں پر تہ بہ تہ اُٹھ کر کوہان یا گنبد کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی حصے آئندہ تیل کا منبع بن جاتے ہیں۔ تیل نچلی تہوں سے اُٹھتا ہوا غیر مسام دار سطح تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اس کے نیچے نیچے چلتا ہوا گنبدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیچے کا پانی اسے دھکیل کر گنبد کے اندر داخل کر دیتا ہے اور یوں تیل گنبد کے اندر محفوظ ہو جاتا ہے۔

جہاں تیل ہوتا ہے وہاں گیس بھی لازماً ہوتی ہے۔ البتہ یہ ضروری نہیں ہے کہ جہاں گیس ہو وہاں سے تیل بھی نکلے۔ بعض جگہوں پر زمین میں سوراخ کرنے سے گیس نکلتی ہے لیکن وہاں تیل کا نام و نشان تک نہیں ہوتا۔ گنبد کے اندر گیس، تیل اور پانی اپنی کثافت (DENSITY) کے لحاظ سے جمع ہو جاتے ہیں۔ گیس سب سے ہلکی ہونے کی وجہ سے اوپر رہتی ہے۔ اس کے نیچے تیل ہوتا ہے اور سب سے نیچے پانی۔ پاکستان میں بلوچستان کے علاقے میں تیل کی تلاش کرتے کرتے اتفاق سے سوئی گیس دریافت ہو گئی۔

ایک اور بات یاد رکھنی ضروری ہے اور وہ یہ کہ جن جگہوں میں تیل جمع رہتا ہے وہ تالاب کی مانند بھری بھری نہیں رہتیں یہ جگہیں درحقیقت مسام دار چٹانوں یا ریت وغیرہ سے بھری ہوتی ہیں اور انہیں مسام دار چٹانوں یا ریتلے پتھروں میں تیل موجود رہتا ہے۔

اہم عبارت کی تشریح

سوال درج ذیل عبارت کی مع حوالۂ متن اور سیاق وسباق تشریح کیجئے:۔

ارضیاتی تبدیلیوں اور زمین کی سطحی حرکات کے سبب اس کی تہوں میں شکنیں پڑ جاتی ہیں اور جگہ جگہ تہ بہ تہ اُٹھ کر کوہان اور گنبد نما بن جاتی ہے اور یہی حصّے آئندہ تیل کے ماخذ بن جاتے ہیں۔ تیل نیچے سے اُٹھتا ہوا غیر مسام دار سطح تک پہنچ جاتا ہے اور پھر اس کے نیچے نیچے چلتا گنبدوں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیچے کا پانی اس کو دھکیل کر گنبد کے اندر داخل کر دیتا ہے۔ گنبد کے اندر تیل محفوظ ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نہ اب نیچے ہی آ سکتا ہے اور نہ آزو بازو سے نکل سکتا ہے

جواب **حوالۂ متن** یہ عبارت آفتاب حسن کے مضمون "پٹرولیم" میں سے لی گئی ہے۔

سیاق وسباق اس عبارت سے پہلے مصنف نے پٹرولیم کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے بتایا ہے کہ خشکی، تری اور ہوا میں حرکت کرنے والی ہر مشین میں پٹرولیم کسی نہ کسی صورت میں ضرور استعمال ہوتا ہے۔ اسے معدنی تیل بھی کہتے ہیں اور پرانے زمانے کے لوگ اس سے بخوبی واقف تھے وہ نہ صرف اسے جلاتے تھے بلکہ اس سے دوا کا کام بھی لیتے تھے اور کشتیوں کو پانی کے اثرات سے محفوظ کرنے کے لئے اس کی قیر سے بھی استفادہ کرتے تھے پھر مصنّف نے زمین کے اندر پٹرولیم کے بننے کے اسباب پر بحث کی ہے اور اس کی کیمیادی ترکیب بتائی ہے، وہ کہتا ہے کہ یہ کاربن اور ہائیڈروجن سے مل کر بنا ہے۔ اس کے وجود میں آنے کے بارے میں اس نے غیر نامیاتی اور نامیاتی نظریوں کی تفصیل بیان کی ہے۔ غیر نامیاتی نظریے کے مطابق پٹرولیم کا کاربن اور ہائیڈروجن معدنیات سے حاصل ہوتا ہے جب کہ نامیاتی نظریے کے مطابق اس کاربن اور ہائیڈروجن کا ماخذ حیوانی اور نباتاتی جاندار ہیں۔ پھر مصنف نے پٹرولیم کے زمین کی اندرونی تہوں میں جمع ہونے کی تفصیل بتائی ہے اور یہ بھی واضح کیا ہے کہ پٹرول کن کن جگہوں پر ملنے کا امکان ہوتا ہے اور کن کن جگہوں پر نہیں۔

اس عبارت کے بعد مصنّف نے بتایا ہے کہ جہاں تیل ہوتا ہے، وہاں گیس بھی ضرور

ہوتی ہے، البتہ یہ ضروری نہیں کہ جہاں گیس ہو وہاں سے تیل بھی نکلے، زمین کے اندر بعض تبدیلیوں کی وجہ سے جو گنبد بن جاتے ہیں ان کے اندر گیس، تیل اور پانی اپنی کثافت کے لحاظ سے جمع ہو جاتے ہیں۔ گیس ان میں سب سے ہلکی ہوتی ہے اس لئے اوپر رہتی ہے، اس کے نیچے تیل ہوتا ہے اور سب سے نیچے پانی۔ پاکستان میں سوئی گیس بلوچستان کے علاقے میں اتفاقاً تیل تلاش کرتے ہوئے مل گئی تھی۔ مصنف نے یہ بھی بتایا ہے کہ جن جگہوں پر تیل جمع ہوتا ہے وہ تالاب کی طرح نہیں ہوتیں بلکہ وہ جگہیں در اصل مسام دار چٹانیں ہوتی ہیں یا وہاں ریت کی تہیں ہوتی ہیں۔

تشریح زمین کے اندر ہونے والی تبدیلیوں اور زمین کی سطح پر رونما ہونے والی حرکات کی وجہ سے زمین کی تہوں میں سلوٹیں پڑ جاتی ہیں اور مختلف مقامات پر اوپر نیچے پرت در پرت اونٹ کی پیٹھ پر ابھرے ہوئے کوہان کی طرح کے زمین کے یہ تودے گنبد جیسے بن جاتے ہیں اور یہی حصے آگے چل کر تیل کے منابع اور سرچشمے بن جاتے ہیں جن میں وہ آہستہ آہستہ جمع ہوتا رہتا ہے۔ پھر یہی تیل نیچے سے اٹھ کر زمین کی اس ٹھوس سطح تک پہنچ جاتا ہے جس میں چھوٹے چھوٹے سوراخ نہیں ہوتے اور پھر اس سطح کے نیچے نیچے چلتا ہوا وہ گنبد نما تودوں تک پہنچ جاتا ہے۔ تیل کے نیچے موجود پانی، تیل کو زور سے دھکیل کر گنبد کے اندر داخل کر دیتا ہے اور یہ تیل گنبد کے اندر پہنچ کر محفوظ ہو جاتا ہے۔ اب یہ تیل نہ تو نیچے جا سکتا ہے اور نہ دائیں بائیں کہیں سرک سکتا ہے بلکہ وہیں بند ہو جاتا ہے اور یوں ضائع ہونے سے بچ جاتا ہے۔

شرح
حصۂ منظومات

از

پروفیسر سید احسن زیدی

نظیر اکبر آبادی (۱۷۳۶ء - ۱۸۳۰ء)

انجام

تعارف

اِس پوری نظم میں شاعر نے نگاہِ تصوّر سے انسان کو بڑھاپے کی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے دیکھا ہے اور اُسے یاد دلایا ہے کہ یہاں کی ہر چیز یہیں رہ جانے والی ہے انسان خالی ہاتھ یہاں آیا تھا اور خالی ہاتھ ہی جائیگا۔ اگر کوئی شے آخرت میں کام آنے والی ہے تو وہ نیک اعمال ہیں۔

بٹ مارا جل کا آپہنچا ٹک اس کو دیکھ ڈرو بابا! اب اشک بہاؤ آنکھوں سے اور آہیں سرد بھرو بابا
دل ہاتھ اٹھا اس جینے سے۔ لے بس جی مار مرو بابا جب باپ کی خاطر روتے تھے۔ اب اپنی خاطر رو بابا
تن سوکھا۔ کُبڑی پیٹھ ہوئی۔ گھوڑے پہ زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا۔ چلنے کی فکر کرو بابا

مشکل الفاظ کے معانی
بٹ مار۔ ڈاکو - اجل۔ موت - ٹک - ذرا
اشک - آنسو تن - جسم - نقارہ - نوبت۔
ایک طرح کا ڈھول۔

تشریح: اخلاقی مضامین نظیر اکبر آبادی کی شاعری کا اہم موضوع ہیں۔ اس نظم میں انہوں نے انسان کو اس کے انجام سے باخبر کیا ہے۔ اس بند میں کہتے ہیں کہ موت کا ڈاکو آگیا ہے۔ اس سے خوف کھاؤ۔ آنسو بہاؤ۔ ٹھنڈی سانسیں بھرو۔ زندگی سے ہاتھ اٹھالو اور اپنی خواہشات کو کم کرو۔ ایک وقت تھا کہ تمہارا باپ فوت ہوا تھا اور تم اس کے لئے روتے تھے۔ اب تمہاری اپنی موت قریب آگئی ہے۔ اب اپنی خاطر آنسو بہاؤ۔ تم نے بہت جی لیا ہے۔ اب تو تمہارا جسم سوکھ گیا ہے۔ کمر دوہری ہوگئی ہے۔ موت کا ڈھول بج چکا ہے اب یہاں سے اگلی دنیا کی طرف چلنے کی تیاری کرو۔

تن سوکھنا اور پیٹھ کبڑی ہونا بڑھاپے کی علامتیں ہیں۔ گھوڑے پر زین کسنا

اپنی منزل کی طرف روانہ ہونے کی تیاری کرنا ہے اور نقارہ بجنا کا معنی اعلان کرنا ہے۔ آخری شعر جو ہر بند کے بعد دہرایا جا رہا ہے یہ مفہوم رکھتا ہے کہ اے انسان، تیرا جسم سوکھ گیا ہے۔ کمر دوہری ہو گئی ہے۔ یعنی تو بوڑھا ہو گیا ہے' یہ اعلان ہے اس بات کا کہ تمہاری موت کے دن قریب آ گئے ہیں لہٰذا اب اگلی دنیا کی طرف جانے کی تیاری کرو۔

اب جینے کو تم رخصت دو اور مرنے کو مہمان کرو ۔۔۔ خیرات کرو، احسان کرو، یا پُن کرو یا دان کرو
یا پوری لڈو بٹواؤ۔ یا خاصہ حلوا مان کرو ۔۔۔ کچھ لطف نہیں اب جینے کا اب مرنے کا سامان کرو
تن سوکھا۔ کبڑی پیٹھ ہوئی۔ گھوڑے پہ زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا، چلنے کی فکر کرو بابا

مشکل الفاظ کے معانی

احسان کرنا - اچھا سلوک کرنا۔ پُن کرنا - نیک کام کرنا
دان کرنا - خیرات کرنا - خاصہ - اچھا کھانا۔

تشریح

شاعر انسان سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم زندگی کو اب چھٹی دے دو اور موت کا استقبال کرو، جس کا طریقہ یہ ہے کہ غریبوں کو خیرات دو۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ حسن سلوک سے پیش آؤ۔ اچھے کام کرو۔ بھوکوں کو عمدہ اور مزیدار کھانا کھلاؤ۔ بڑھاپے میں تمام قویٰ جواب دے جاتے ہیں، اس لیے زندگی کا کچھ لطف نہیں رہتا۔ خون کی حرارت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاتھ پاؤں کام کرنے سے عاری ہو جاتے ہیں اور ذہن ماؤف ہونے لگتا ہے۔

چنانچہ انسان کو زندگی کی دلچسپیوں کے پیچھے نہیں بھاگنا چاہیئے۔ بلکہ موت کے بعد جو زندگی ملنے والی ہے، اس کی طرف دھیان کرنا چاہیئے۔

دیکھو، تمہارا جسم سوکھ گیا ہے۔ کمر دوہری ہو گئی ہے۔ موت کا ڈھول بج چکا ہے۔ اب گھوڑے پر زین کس لو اور اگلی منزل کی طرف چلنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔

گر اچھی کرنی۔ نیک عمل تم دنیا سے لے جاؤ گے ۔۔۔ تو گھر بھی اچھا پاؤ گے اور بیٹھ کے سکھ سے کھاؤ گے
اور ایسی دولت کے چھوڑ کے تم جو خالی ہاتھوں جاؤ گے ۔۔۔ کچھ بات نہیں بن آنے کی گھبراؤ گے پچھتاؤ گے
تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا!
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا!

مشکل الفاظ کے معانی اچھی کرنی - اچھے کام - بات بننا - کامیاب ہونا

تشریح شاعر انسان سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اگر اس دنیا میں رہتے ہوئے تم اچھے کام کرو گے اور اس دنیا کو چھوڑتے وقت نیک اعمال تمہارے ساتھ ہوں گے، تو اگلے جہان میں تمہیں اس کا اچھا اجر ملے گا۔ تمہیں جنت میں جگہ ملے گی، جہاں اطمینان ہی اطمینان ہوگا اور غم و اندوہ تمہارے پاس نہیں پھٹکے گا۔ لیکن اگر تم نے اعمالِ صالح سر انجام نہ دیئے اور یہاں سے خالی ہاتھ اگلی دنیا کو روانہ ہوئے تو سوائے پریشانی اور پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ لیکن اس وقت تمہاری پریشانی کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ شاعر انسان کو یاد دلا رہا ہے کہ تمہارا جسم سوکھ چکا ہے۔ کمر دوہری ہو چکی ہے۔ موت کی نوبت بج چکی ہے۔ گھوڑے پر زین کسو اور اگلی منزل کی طرف چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

یہ عمر جسے تم سمجھے ہو یہ ہر دم تن کو چنتی ہے جس لکڑی کے بل بیٹھے ہو دن رات وہ لکڑی گھنتی ہے
تم گٹھڑی باندھو کپڑے کی اور دیکھ اجل سر دھنتی ہے اب موت کفن کے کپڑے کا یاں تانا بانا بنتی ہے
تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پر زین دھرو بابا
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

مشکل الفاظ کے معانی چنتی ہے - مراد ہے کھاتی ہے - گھنتی ہے - گھن لگ جاتا ہے
سر دھننا - خوش ہونا۔

تشریح انسان کی عمر ہر وقت اس کے جسم کو کھاتی رہتی ہے یوں سمجھئے کہ انسانی عمر لکڑی کی مانند ہے جسے ہر وقت گھن لگ رہا ہے جب انسان اپنی عمر کو طویل سمجھتے ہوئے عمدہ قسم کے ڈھیر سارے کپڑے جمع کرتا ہے تو موت بہت خوش ہوتی ہے اور وہ انہیں کپڑوں سے اس کے کفن کا تانا بانا تیار کرتی ہے۔

غور کرو تمہارا جسم سوکھ گیا ہے۔ تمہاری کمر دوہری ہو گئی ہے۔ موت کی نوبت بج چکی ہے۔ گھوڑے پر زین کسو اور اگلی منزل کی طرف چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

بیوپار تو یاں کا بہت کیا اب واں کا بھی کچھ سودا لو جو کھیپ ادھر کو چڑھتی ہے اس کھیپ کو یاں ہی لدوا لو
اس راہ میں جو کچھ کھاتے ہو اُن کھانے کو بھی منگوا لو سب ساتھی پہنچے منزل پر اب تم بھی اپنا رستہ لو
تن سوکھا۔ کبڑی پیٹھ ہوئی۔ گھوڑے پہ زین دھرو بابا
اب موت نقارا باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

مشکل الفاظ کے معانی بیوپار - کاروبار - سودا - مال - کھیپ - بوجھ -

تشریح اے انسان! تُو نے دنیا میں زندگی گزارنے کے لئے بہت سے کاروبار کئے ہیں تم ایک جگہ سے مال لیتا تھا اور دوسری جگہ بیچ دیتا تھا - اب تم ایسا سودا خریدو جو آخرت میں کام آئے اور جس مال کی وہاں طلب ہے، اس کو یہیں سے اپنے ساتھ لے لو۔ راستے میں جس قسم کے کھانوں کی ضرورت ہے، وہ بھی منگوا لو - تمہارے تمام ساتھی موت کے گھاٹ اتر چکے ہیں - اب تم بھی ادھر کو کوچ کرو - ذرا دیکھو، تمہارا جسم سوکھ چکا ہے - کمر دوہری ہو چکی ہے - موت کی نوبت بج چکی ہے - گھوڑے پہ زین کسو اور اگلی منزل کی طرف چلنے کے لئے تیار ہو جاؤ -

اس بند میں شاعر نے اسی بات کو مختلف انداز میں دہرایا ہے جس کو وہ پہلے بندوں میں بیان کر چکا ہے - یہاں اس نے کاروباری اصطلاحیں استعمال کی ہیں - مراد یہ ہے کہ اگلی دنیا میں جو سودا کام آنے والا ہے وہ نیک اعمال ہیں - یہ وہ کھیپ ہے جو آخرت میں زیادہ قیمت پانے والی ہے - یہی وہ زادِ راہ ہے جو اس سفر کے دوران تمہاری ضرورتوں کو پورا کرنے والا ہے - انہیں کو ساتھ لے کے چلو

دو چار گھڑی یا دو دن میں اب تن سے جان نکلتی ہے　　یہ ہڈی پسلی جتنی ہے یا کھلتی ہے یا جلتی ہے
ہے رات جو باقی تھوڑی سی کوئی دم میں وہ بھی ڈھلتی ہے　　اُٹھ باندھ لو کمر سویرے سے تم کو بھی منزل چلنی ہے
تن سوکھا، کبڑی پیٹھ ہوئی، گھوڑے پہ زین دھرو بابا!
اب موت نقارہ باج چکا چلنے کی فکر کرو بابا

مشکل الفاظ کے معانی تن - جسم - کھلتی ہے - سوکھ جاتی ہے

تشریح شاعر کہتا ہے کہ انسانی زندگی ناپائیدار ہے - یہ فنا ہو جانے والی ہے - انسان کا قیام اس دنیا میں بڑا مختصر ہے - کسی کی زندگی دو چار گھڑی ہے، کسی کی دو چار دن ہے - آخر جان انسان کے جسم کو چھوڑ کر چلی جائے گی - اور اس کی ہڈیاں یا تو زمین میں دفن ہو کر اور سوکھ کر ریزہ ریزہ ہو جائیں گی یا چتا کے شعلوں میں جل کر راکھ ہو جائیں گی - جس طرح ہر رات کے مقدّر میں ڈھلنا لکھا ہے، اسی طرح زندگی کی مختصر سی رات بھی ڈھل جائے گی - اُٹھو اور کمر ہمت باندھو کہ تم نے صبح کو ایک نئے سفر کی تیاری کرنی ہے - تمہارا جسم سوکھ چکا ہے - کمر دوہری ہو گئی ہے، یعنی بڑھاپا آ گیا ہے - یہ گویا موت

کی نوبت ہے جو بج رہی ہے۔ اب اٹھو گھوڑے پر زین کسو اور اپنی آخری منزل کی طرف روانہ ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

"نظم انجام" کا خلاصہ

نظیر اکبر آبادی نے اس نظم میں انسانی زندگی کی ناپائیداری کا اظہار کیا ہے اور انسان کو اس کے انجام سے باخبر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ زندگی بڑی مختصر ہے۔ موت آ رہی ہے۔ اس سے ڈرو۔ نیک اعمال کرو۔ حسن مروت سے کام لو اور خیرات کرو۔ اگر اس دنیا سے تم نیک اعمال کا اثاثہ لے کر جاؤ گے تو اگلی زندگی میں آرام اور چین سے رہو گے۔ اگر تم نے اچھے عمل نہ کئے اور یہاں سے خالی ہاتھ گئے تو اگلے جہان میں کامیابی نصیب نہ ہو گی اور سوائے پچھتاوے کے کچھ ہاتھ نہ آئے گا۔ انسانی عمر لکڑی کی طرح ہے جسے ہر وقت گھن لگتا رہتا ہے، جس سے اسکی زندگی کا عرصہ کم ہوتا ہے۔ تم نئے نئے کپڑے اکھٹے کرتے رہتے ہو جنہیں دیکھ کر موت کا فرشتہ خوش ہوتا ہے کہ تم اپنے کفن کا سامان فراہم کر رہے ہو۔ اس دنیا میں تم نے بہت لین دین کیا ہے۔ اب کوئی ایسا مال اکٹھا کرو جو اگلے جہان میں تمہارے کام آئے اور یہ مال سوائے نیک اعمال کے اور کچھ نہیں ہے۔ تمہارے بہت سے ساتھی زندگی سے ناطہ توڑ کر اگلی منزل پر پہنچ چکے ہیں۔ تم بھی وہاں جانے کی تیاری کرو۔ اپنی طرف دیکھو۔ تمہارا جسم سوکھ گیا ہے اور پیٹھ دوہری ہو گئی ہے۔ موت کی نوبت بج چکی ہے۔ اب گھوڑے پر زین کسو اور یہاں سے کوچ کرنے کے لئے تیار ہو جاؤ۔

نظم "انجام" کا مرکزی خیال

انسانی زندگی ناپائیدار ہے۔ موت ایک ابدی حقیقت ہے۔ انسان کو چاہیے کہ دنیا میں نیک کام کرے تاکہ اگلی دنیا میں اسے جنّت میں جگہ ملے اور وہ آرام اور سکون کے ساتھ اپنا وقت گزارے۔ اگر وہ دنیائے فانی میں رہتے ہوئے اعمال صالح کی دولت اکٹھی نہیں کرتا تو اسے آئندہ زندگی میں پچھتانا پڑے گا۔ لیکن اس وقت اس کی پشیمانی اسے کوئی فائدہ نہیں دے گی۔ اس لئے جس مال کی کھپت وہاں ہے اسے یہیں سے لے کر چلنا چاہیئے اور یہ مال اچھے کاموں اور نیک اعمال کے سوا اور کچھ نہیں۔

میر انیس

(۱۸۰۲ء - ۱۸۷۴ء)

دُنیا

تعارف

میر انیس اُردو مرثیہ گو شاعروں کے قافلہ سالار ہیں۔ انہوں نے اپنی قادر الکلامی، وسیع ذخیرۂ الفاظ اور جدتِ تشبیہ و استعارہ سے مرثیہ کی زمین کو آسمان کر دیا۔ لغوی اعتبار سے مرثیہ وہ نظم ہے جو کسی شخص کے انتقال پر لکھی جاتی ہے لیکن اصطلاحی مفہوم میں مرثیہ ایسی نظم کو کہتے ہیں جس میں حضرت امام حسین رضؓ، اُن کے رفقا اور اہلِ خاندان کی شہادت کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے کئی حصّے ہوتے ہیں۔ مثلاً منظر کشی۔ گھوڑے کی تعریف۔ تلوار کی تعریف۔ امام عالی مقام اور ان کے رفقا کے مصائب وغیرہ۔

نظم "دنیا" میں دُنیا کی بے ثباتی کا ذکر ہے۔ یہ کسی ایک مرثیے کا ٹکڑا نہیں ہے، بلکہ مختلف ہم وزن مرثیوں سے اس موضوع پر لکھے گئے چند بندوں کو جمع کر کے یہ نظم تشکیل دی گئی ہے۔

دنیا بھی عجب گھر ہے کہ راحت نہیں جس میں
وہ گُل ہے یہ گُل، بُوئے محبت نہیں جس میں
وہ دوست ہے یہ دوست مروّت نہیں جس میں
وہ شہد ہے یہ شہد حلاوت نہیں جس میں
بے درد و الم شامِ غریباں نہیں گزری
دنیا میں کسی کی کبھی یکساں نہیں گزری

مشکل الفاظ کے معانی

راحت ۔ خوشی ۔ مروّت ۔ حُسنِ سلوک ۔ حلاوت ۔ مٹھاس ۔ بے درد و الم ۔ بغیر درد اور رنج کے ۔ شامِ غریباں ۔ مسافروں کی شام ۔

تشریح میر انیس دنیا کی بے ثباتی اور ناپائیداری سے یہاں کے بسنے والوں کو آگاہ کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا دکھوں کا گھر ہے۔ یہاں خوشی نام کی کوئی شئے نہیں ہے۔ یہ وہ پھول ہے جس میں محبت کی خوشبو نہیں۔ یہ وہ دوست ہے جو کسی سے اچھا سلوک نہیں کرتا۔ یہ وہ شہد ہے جو مٹھاس سے خالی ہے۔ انسان کی حیثیت یہاں مسافر کی سی ہے جس کی شام، رنج و غم سے بھرپور ہوتی ہے۔ دنیا میں کوئی بھی شخص متوازن زندگی نہیں گزارتا۔

شاعر نے مختلف تشبیہوں اور استعاروں کے ذریعے دُنیا کے بارے میں اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ کی وضاحت کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ دُنیا ایک گھر کی مانند ہے لیکن یہ ایک ایسا گھر ہے جہاں انسان کو سکون اور اطمینان نصیب نہیں ہوتا۔ یہ پھول کی مانند ہے۔ جس میں محبت کی خوشبو نہیں ہے۔ یہ دوست کی طرح ہے
— — — — — — — — — — لیکن ایک ایسا دوست ہے جو دوسروں سے اچھا سلوک روا نہیں رکھتا۔ اسکی مثال شہد کی سی ہے۔ لیکن یہ مٹھاس سے خالی ہے۔ مراد یہ ہے کہ دیکھنے میں یہ دنیا خوبصورت دکھائی دیتی ہے۔ گھر کی طرح، پھول کی طرح، دوست کی طرح اور شہد کی طرح لیکن حقیقت میں ایسی نہیں ہے۔ یہاں کسی کی زندگی آرام اور سکون سے نہیں گزرتی ہے

اس منزلِ فانی پہ نہ دل اپنا لگاؤ ‏ ‏ ‏ اُلفت نہ کرو اُس سے جسے چھوڑ کے جاؤ
یہ عاریتی جا ہے یہاں گھر نہ بناؤ ‏ ‏ ‏ پابندیٔ دنیا سے بس اب ہاتھ اٹھاؤ

چلتے ہوئے ہرگز کوئی کام آ نہ سکے گا
ہمراہ کچھ اسبابِ جہاں جا نہ سکے گا

مشکل الفاظ کے معانی منزلِ فانی ۔ فنا ہو جانے والی جگہ۔ عاریتی۔ ادھار مانگی ہوئی۔ جا۔ جگہ۔
اسبابِ جہاں ـــــ دنیا کا مال۔

تشریح یہ دنیا ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ یہ فنا ہو جانے والی ہے اس کو اپنے دل میں جگہ نہ دو۔ اسکی رنگینیوں میں کھو کر نہ رہ جاؤ۔ جس جگہ کو چھوڑ ہی جانا ہے، اس سے محبت کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔ یہ غیر مستقل ٹھکانہ ہے۔

اُدھار لی ہوئی جگہ ہے۔ یہاں ہمیشہ قیام کرنے کے خواب نہ دیکھو۔ اور اسکی دلچسپیوں سے ہاتھ اٹھاؤ۔ جب تم یہاں سے کوچ کرو گے تو کوئی دوست، عزیز یا رشتہ دار تمہارے کام نہ آئے گا۔ اس دنیا کا کمایا ہوا مال یہیں رہ جائیگا۔ انسان یہاں خالی ہاتھ آیا تھا۔ اور خالی ہاتھ ہی یہاں سے رخصت ہو گا۔

یاں رختِ اقامت کا سرانجام ہے بے جا — اس منزلِ پُرخوف میں آرام ہے بے جا
عقبیٰ کے سوا یاں کا ہر اک کام ہے بے جا — مانند نگیں آرزوئے نام ہے بے جا

سینے میں یہ دم مثلِ چراغِ سحری ہے
کر لو عملِ خیر، یہی ناموری ہے

مشکل الفاظ کے معانی

رخت۔ ضروری سازو سامان۔ اقامت۔ قیام کرنا۔ ٹھہرنا۔ عقبیٰ۔ آخرت۔ آرزوئے نام۔ شہرت کی خواہش۔ بے جا۔ نامناسب۔ دم۔ سانس۔ چراغِ سحری۔ صبح کا چراغ

تشریح

اس دنیا میں زندگی کا عرصہ گزارنے کے لئے ضروری سازو سامان جمع کرنا مناسب نہیں۔ یہ دکھوں اور مصیبتوں کا گھر ہے۔ یہاں آرام کی طلب ٹھیک نہیں جو کام بھی کرو آخرت کے لئے کرو۔ یہاں کے لئے نہ کرو۔ یہاں ناموری اور شہرت کی خواہش بھی درست نہیں۔ انسان کے سینے میں جو سانس چل رہا ہے اسکی مثال صبح کے چراغ کی ہے جو بجھنے ہی والا ہے۔ نیک کام کرو۔ اصل شہرت اور ناموری یہی ہے کہ انسان کے مرنے کے بعد لوگ اسے اچھے الفاظ سے یاد کریں:

اس بند میں شاعر نے انسان کو یہ درس دیا ہے کہ وہ دنیا سے دل نہ لگائے اور جو کام بھی کرے، آخرت کو سامنے رکھتے ہوئے کرے۔ عملِ خیر اس کا سب سے بڑا اثاثہ ہے۔ یہی اس کے مرنے کے بعد باقی رہے گا۔

اُمید نہیں جینے کی یاں صبح سے تا شام — ہستی کو یہ سمجھو کہ ہے خورشیدِ لبِ بام
یاں کام کرو ایسا کہ جو آئے وہاں کام — آجائے خدا جانیئے کب موت کا پیغام

اپنی نہ کوئی ملک نہ املاک سمجھنا
ہونا ہے تمہیں خاک، یہ سب خاک سمجھنا

مشکل الفاظ کے معانی ہستی - زندگی۔ خورشیدِ لبِ بام - وہ سورج جو ڈوبنے ہی والا ہو۔ مِلک - ملکیت۔

تشریح اس دنیا میں زندگی پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی ڈور صبح سے شام تک کسی وقت بھی کٹ سکتی ہے۔ یوں سمجھو کہ زندگی ایک سورج ہے جو غروب ہونے کے قریب ہے۔ یہاں کوئی ایسا کام کرو جو اگلی دنیا میں تمہارے کام آئے۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ کب موت کا فرشتہ آ جائے اور تمہیں اپنے ساتھ لے جائے۔ اس جہان میں کسی چیز کو اپنی ملکیت نہ سمجھنا۔ یہاں کی ہر چیز مٹی میں مل جانے والی ہے اور اس کے ساتھ تم نے بھی مٹی ہو جانا ہے۔

بھائی نہ تو کام آئے گا اُس وقت نہ فرزند عرصہ نہیں کھل جائے گا جب آنکھ ہوئی بند
وہ کام کرو جس سے خدا ہووے رضامند ہوشیار کہ ہونا ہے تمہیں خاک کا پیوند

پیری کی بھی مدّت ہے جوانی کی بھی حد ہے
آرام گہِ شاہ و گدا کنجِ لحد ہے

مشکل الفاظ کے معانی آنکھ بند ہونا - موت آ جانا۔ خاک کا پیوند ہونا - مٹی میں مل جانا۔ پیری - بڑھاپا۔

کنجِ لحد - قبر کا گوشہ - مراد قبر۔

تشریح جب موت انسان کو آ لے گی تو اس وقت بھائی کام آئیگا نہ بیٹا۔ دنیا میں ایسے کام کرو جن سے خدا راضی ہو۔ دیکھو تمہیں ایک دن مٹی میں مل کر مٹی ہو جانا ہے۔ انسان کا بڑھاپا بھی ختم ہو جاتا ہے۔ جوانی بھی اپنا وقت پورا کر کے مٹ جاتی ہے۔ کوئی شخص بادشاہ ہو یا فقیر، اسے قبر کے گوشے ہی میں آرام ملے گا۔

ہیں زیرِ زمین، صاحبِ تخت و عَلم و تاج جو صاحبِ نوبت تھے، نشاں اُنکے نہیں آج
جو شاہ کہ لیتے رہے شاہوں سے سدا باج وہ بعد قضا آپ، کفن کے رہے محتاج

درویش و غنی اس کے ہمیشہ رہے شاکی !
بتلاؤ کہ دنیا نے کسی سے بھی وفا کی ؟

مشکل الفاظ کے معانی زیرِ زمیں — زمین کے نیچے۔
صاحبِ تخت و علم و تاج — وہ لوگ جن کے پاس تخت تھے، جھنڈے تھے اور تاج تھے۔ صاحبِ نوبت — جن کے نام کی نوبت بجتی تھی۔
باج — ٹیکس۔

تشریح وہ لوگ جو اس دنیا میں تخت کے مالک تھے، جن کے جھنڈے فضا میں لہراتے تھے، جن کے سروں پر تاج تھے اور جن کے نام کی نوبت بجتی تھی، آج ان کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ وہ شہنشاہ جو دوسرے بادشاہوں سے ٹیکس وصول کرتے رہے، جو بے پناہ جاہ و جلال اور مال و دولت کے مالک تھے۔.........
مرنے کے بعد دو گز کفن کے لئے دوسروں کے محتاج ہو گئے۔ دنیا میں کوئی امیر ہو یا غریب، اس دنیا سے کبھی خوش نہیں رہا۔ وہ ہمیشہ اس کی شکایت کرتا رہا کیونکہ اس دنیا نے کبھی کسی سے وفا نہیں کی۔

اس نظم میں میر انیس نے دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچا ہے۔ نظم کے تمام بندوں میں مختلف انداز سے اس نے اسی بات پر زور دیا ہے کہ یہاں کی ہر شے یہاں رہ جانے والی ہے، اس لئے دنیا سے دل نہ لگاؤ۔ نیک کام کرو، جو اگلی زندگی میں تمہارے کام آئیں۔

نظم "دنیا" کا خلاصہ

اس دنیا میں رہتے ہوئے کوئی شخص خوشی سے ہمکنار نہیں ہو سکتا۔ یہ فنا کی منزل ہے۔ اس سے دل نہیں لگانا چاہیئے۔ جب اسے چھوڑ ہی جانا ہے تو اس سے الفت کرنے کا کیا فائدہ ہے؟۔ جب انسان یہاں سے کوچ کرتا ہے تو کوئی شے اس کے ساتھ نہیں جاتی، اس لئے یہاں رہتے ہوئے مال و اسباب اکٹھا کرنا بے فائدہ ہے۔ یہاں زندگی گزارتے ہوئے انسان کو نیک اعمال کرنے چاہیئں کیونکہ اس کا اصل اثاثہ یہی اعمالِ خیر ہیں جو بعد ازاں بھی اس کے کام آتے ہیں۔ انسانی زندگی غروب ہونے والے سورج کی

طرح ہے۔ صبح سے شام تک کسی وقت بھی موت کا پیغام آسکتا ہے اور انسانی زندگی کی ڈور کٹ سکتی ہے۔ یہاں کی کسی چیز پر انسان کو حقِ ملکیت نہیں جتانا چاہیئے۔ اسے یہ سوچنا چاہیئے کہ یہاں کا سب کچھ خاک ہے اور اُسے خود بھی ان چیزوں کے ساتھ مل کر خاک ہو جانا ہے۔ جب انسان کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں تو بھائی کام آتا ہے نہ بیٹیا۔ اس لیئے ایسے کام کرو جن سے خدا خوش ہو۔ وہ لوگ جو تاج و تخت کے مالک تھے؛ آج اُن کا نام و نشان تک باقی نہیں رہا۔ کوئی امیر ہو یا غریب ہر شخص دُنیا کا شاکی رہا ہے کیونکہ اس نے کس کے ساتھ کبھی وفا نہیں کی۔

نظم "دنیا" کا مرکزی خیال

یہ دُنیا عارضی اور ناپائیدار ہے۔ اس لیئے انسان کو یہاں کی کسی شے سے دل نہیں لگانا چاہیے۔ اُسے ایسے کام کرنے چاہئیں جو موت کے بعد اس کے کام آسکیں اور جو خدا تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث ہوں۔ جب موت انسان کو آلیتی ہے تو بھائی یا بیٹے کام نہیں آتے۔ صرف خیر اور نیکی کے عمل ہی اسکو فائدہ دیتے ہیں۔ دینا نے کبھی کسی کے ساتھ وفا نہیں کی اسلیئے غریب اور امیر سبھی اس کے شاکی رہے ہیں۔

میر انیسؔ

"غربت"

تعارف یہ نظم بھی میر انیسؔ کے کسی ایک مرثیے کا ٹکڑا نہیں ہے، بلکہ ایک ہی بحر میں کہے گئے مختلف مرثیوں سے سفر کے موضوع پر لکھے گئے بندوں کو جمع کر کے اسے ترتیب دیا گیا ہے۔

ہوتے ہیں بہت رنج مسافر کو سفر میں
راحت نہیں ملتی کوئی دم آٹھ پہر میں
سو شغل ہو، پر دھیان لگا رہتا ہے گھر میں
پھرتی ہے سدا شکل عزیزوں کی نظر میں
سنگِ غمِ فرقت دلِ نازک پہ گراں ہے
اندوہِ غریب الوطنی کاہشِ جاں ہے

مشکل الفاظ کے معانی کوئی دم - ایک لمحے کے لئے۔ شغل - کام
سنگ - پتھر - غمِ فرقت - جدائی کا غم۔
گراں - بھاری - اندوہ - دکھ غریب الوطنی - وطن سے دور پردیس میں ہونا۔ کاہشِ جان - جان کا روگ۔

تشریح جب کوئی شخص اپنے وطن کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لیتا ہے تو بے شمار قسم کے غم اور دکھ اُسے آگھیرتے ہیں۔ اسے آٹھ پہروں میں یعنی دن اور رات میں ایک لمحہ بھی سکون اور اطمینان کا نصیب نہیں ہوتا۔ خوشی اس کے پاس نہیں پھٹکتی اسے خواہ سو کام ہوں، یعنی اسے بہت سی مصروفیات بھی ہوں تو بھی وہ اپنے گھر کو نہیں بھولتا۔ گھر کی یاد اسے ہمیشہ اور ہر وقت آتی رہتی ہے۔ اس کے عزیزوں اور دوستوں کی شکلیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہیں۔ انسان کا دل بڑی نازک شئے ہے۔ عزیزوں اور رشتہ داروں سے جدائی کے غم کا پتھر اس کے لئے بڑا بھاری ہے۔

اپنے وطن کو چھوڑنے اور دیارِ غیر میں ہونے کا دکھ انسان کی جان کو روگ لگا کر اسے پریشان کر دیتا ہے۔

آخری شعر میں شاعر نے غمِ فرقت یعنی جدائی کے غم کو پتھر سے تشبیہ دی ہے۔ جس نے شعر کے مفہوم کو واضح کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔

گو راہ میں ہم راہ بھی ہو راحلہ و زاد
جاتی نہیں افسردگیٔ خاطرِ ناشاد
جب عالمِ تنہائی میں آتا ہے وطن یاد
ہر گام پہ دل، مثلِ جرس کرتا ہے فریاد
اک آن غم و رنج سے فرصت نہیں ملتی
منزل پہ بھی آرام کی صورت نہیں ملتی

مشکل الفاظ کے معانی

ہم راہ - ساتھ - راحلہ - سواری -
زاد - سفر کا خرچ - افسردگی - اداسی -
خاطرِ ناشاد - غمگین دل - ہر گام - ہر قدم - مثلِ جرس - گھنٹی کی مانند
اک آن - اک لمحہ -

تشریح

جو شخص اپنے گھر کو چھوڑ کر پردیس کی راہ لیتا ہے وہ ہمیشہ افسردہ دل رہتا ہے۔ اس کے پاس اگر سواری کا جانور بھی ہو، اور اس کے پاس راستے کا خرچ بھی کم نہ ہو، سفر کی ساری سہولتیں بھی اسے میسر ہوں، تو بھی اس کے دل کی افسردگی کم نہیں ہوتی اور وطن کی یاد اس کو ستاتی رہتی ہے۔ جب وہ اکیلا ہوتا ہے اور اسے وطن میں چھوڑے ہوئے عزیز، رشتہ دار، شدت کے ساتھ یاد آتے ہیں، تو اس کا دل گھنٹی کی آواز کی طرح ہر قدم پر فریاد کرنے لگتا ہے۔ یہاں شاعر نے نالہ و فریاد کو گھنٹی سے نکلنے والی آواز کے مشابہ قرار دیا ہے۔ یہ وہ گھنٹی ہے جو قافلے میں موجود اونٹوں کے گلے میں بندھی ہوتی ہے اور اونٹ کے ہر قدم کے ساتھ بج اٹھتی ہے۔ اس صورتِ حال میں بے چارے مسافر کو ایک لمحے کے لئے بھی رنج و غم سے فرصت نہیں ملتی۔ وہ ان مصائب سے گزرتا ہوا منزلِ مقصود پر بھی پہنچ جائے تو بھی وطن کی یاد اس کے دل

کو چین نہیں لینے دیتی۔

دکھ دیتے ہیں ایک ایک قدم پاؤں کے چھالے
منزل پہ پہنچنے کے بھی پڑ جاتے ہیں لالے
ہاتھوں سے اگر بیٹھ کے کانٹوں کو نکالے
ڈر ہے کہ نہ بڑھ جائیں کہیں قافلے والے
واماندوں کے لینے کو بھی آتا نہیں کوئی
تھک کر کبھی بیٹھے، تو اٹھاتا نہیں کوئی

مشکل الفاظ کے معانی

لالے پڑنا۔ خطرے میں ہونا۔
وامانده۔ تھکا ہارا۔

تشریح

چلتے چلتے مسافر کے پاؤں پر چھالے نکل آتے ہیں۔ جو ہر قدم پر مسافر کے لئے پریشانی کا باعث بنتے ہیں، یہاں تک کہ اس کا منزل تک پہنچنا بھی مشکل نظر آنے لگتا ہے۔ اگر وہ راستے میں بیٹھ کر ان کانٹوں کو نکالنے لگے جو راہ چلتے پاؤں میں چبھ جاتے ہیں تو یہ خوف ذہن پر محیط ہو جاتا ہے کہ کہیں قافلے والے ساتھی آگے نہ نکل جائیں اور ان کے ساتھ دوبارہ شامل ہونا مشکل نہ ہو جائے، کیونکہ زمانہ ہمیشہ آگے کی طرف دیکھتا ہے اور تیز رفتاری کے ساتھ چلتا ہے۔ جو لوگ پیچھے رہ جائیں، انہیں لینے کے لئے کوئی واپس نہیں آتا اور جو تھک ہار کر بیٹھ جائیں، انہیں اٹھانے کے لئے کوئی نہیں لوٹتا۔

کتنے ہیں مسافر کہ نہ پھر آئے سفر سے
جنگل میں عزیزوں کو اجل لے گئی گھر سے
رک جاتی ہے شمشیر کی ضربت تو سپر سے
ساعت وہ اجل کی ہے کہ ٹلتی نہیں سر سے
کتنے ہیں مسافر کہ تہِ خاک نہاں ہیں
قبریں تو ہیں ویرانے میں، بستی میں مکاں ہیں

مشکل الفاظ کے معانی

اجل۔ موت۔ ضربت۔ چوٹ۔ سپر۔ ڈھال۔
ساعت۔ لمحہ۔ گھڑی۔ تہِ خاک۔ خاک کے نیچے۔

تشریح بہت سے مسافر ایسے ہیں جو سفر پر نکلے، اس اُمید کے ساتھ کہ اپنا کام ختم کر کے واپس گھر آ جائیں گے، لیکن انہیں گھر واپس آنا نصیب نہیں ہوا اور وہ راہ میں لقمۂ اجل بن گئے۔ ہر شخص کی موت کا جس طرح وقت متعین ہے، اسی طرح جگہ اور مقام بھی طے شدہ ہے۔ وہ لوگ جنہیں جنگل میں موت آنی ہے، انہیں موت خود گھروں سے نکال کر جنگلوں کی طرف لے جاتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی دوسرے پر تلوار سے حملہ آور ہو تو اس حملہ کو ڈھال سے روکا جا سکتا ہے، لیکن موت کی گھڑی ایسی ہے جسے سر سے نہیں ٹالا جا سکتا۔ موت اٹل ہے اور ایک لمحے کے لئے اس کا وقت تبدیل نہیں ہو سکتا۔ کتنے مسافر ایسے ہیں جو اپنی اپنی منزلوں کی تلاش میں نکلے لیکن راہ ہی میں ہلاک ہو کر مٹی کے نیچے چھپ گئے اور وہیں ویرانوں میں انکی قبریں بن گئیں، حالانکہ ان کے گھر شہروں اور بستیوں میں تھے۔ لیکن انہیں موت وہاں نہیں آئی۔ اجل ان کو کھینچ کر ان مقامات کی طرف لے گئی جہاں اُن کی موت لکھی ہوئی تھی۔

دشمن کو بھی اللہ چھڑائے نہ وطن سے
جانے وہی بلبل، جو بچھڑ جائے چمن سے
واقف ہے مسافر کا دل اِس رنج و محن سے
چھٹتا نہیں گھر، جان نکل جاتی ہے تن سے
آرام کی صورت نہیں مسکن سے بچھڑ کر!
طائر بھی پھڑکتا ہے نشیمن سے بچھڑ کر

مشکل الفاظ کے معانی
رنج و محن۔ رنج اور دکھ۔ مسکن۔ رہائش گاہ، گھر
نشیمن۔ پرندے کا گھونسلا۔

تشریح عربی کا ایک مقولہ ہے: "السفر سقر ولو کان میل" یعنی سفر عذاب ہے خواہ وہ ایک میل ہی کا کیوں نہ ہو۔ شاعر نے اس سے پہلے بندوں میں سفر کی صعوبتوں کا ذکر کیا ہے۔ اس بند میں وہ کہہ رہا ہے کہ خدا کسی کو وطن سے دُور نہ کرے۔ خدا دشمن کو بھی پردیس نہ لے جائے کیونکہ یہ بڑا تکلیف دہ تجربہ ہے۔ اس سے صرف وہی شخص آگاہ ہے، جو اس تجربے سے گزرا ہے۔ شاعر نے بلبل کی مثال دے

کر اپنے مفہوم کی وضاحت کی ہے کہ ایک بلبل جس کو صیاد نے پکڑ کر پنجرے میں ڈال دیا ہو، وہی باغ کی قدر و قیمت کو صحیح طور پر سمجھتا ہے۔ اسی طرح ایک مسافر جو سفر کر کے واپس آیا ہے، وہی جانتا ہے کہ سفر کی دشواریاں اور تکلیفیں کیا ہوتی ہیں۔ اس میں دوبارہ سفر کرنے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اس کے لئے سفر پر نکلنا ایسا ہی ہے جیسے جان جسم سے نکل رہی ہو۔ گھر کو چھوڑ کر کہیں آرام نہیں ملتا۔ آدمی کی مثال اس پرندے کی سی ہو جاتی ہے جو گھونسلے سے بچھڑ کر قفس میں پھڑک رہا ہو۔ یعنی وہ بے چین و بیقرار رہتا ہے اور اسے سکون اور اطمینان کا کوئی لمحہ میسّر نہیں آتا۔ جب اسے گھر کی یاد ستاتی ہے تو کوشش کے باوجود اسے نیند نہیں آتی۔

غربت کی بھی ہوتی ہے عجب صبح، عجب شام
کرتا ہے سفر قافلۂ راحت و آرام
وہ دشت نوردی، وہ غم و صدمہ و آلام
منزل پہ بھی ممکن نہیں راحت کا سرانجام
نیند آتی ہے کب، لاکھ جو پٹکے وہ سر اپنا
یاد آتا ہے منزل پہ مسافر کو گھر اپنا

مشکل الفاظ کے معانی

غربت ۔ سفر دشت نوردی ۔ صحراؤں میں گھومنا۔
آلام ۔ غم ۔ سر پٹکنا ۔ کوشش کرنا۔

تشریح

انسان گھر میں ہو تو صبح جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے تو تازہ دم ہوتا ہے۔ شام کو دن بھر کے کام کاج سے فارغ ہو کر گھر آتا ہے تو اپنے اہلِ خانہ سے مل کر اسے بڑی خوشی ہوتی ہے۔ ویسے بھی گھر کے ساتھ خوشی اور مسرت کا تصور وابستہ ہے۔ لیکن سفر کے دوران نہ صبح مسافر کو تازہ دم کرتی ہے نہ شام اس کے لئے راحت و آرام کا پیغام لاتی ہے کیونکہ سفر کے مسائل مسافر کو اس طرح گرفت کئے ہوتے ہیں کہ اس کی توجّہ ایک لمحے کے لئے ان سے ہٹنے نہیں پاتی۔ اسے صحراؤں سے گزرنا پڑتا ہے اور غم و آلام سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ منزل پر پہنچ کر بھی راحت و آرام اس کی قسمت میں نہیں ہوتا۔ پریشانیوں میں اس کی نیند اُڑ جاتی ہے اور لاکھ کوشش

کے باوجود اسے اطمینان سے سونا نصیب نہیں ہوتا، کیونکہ اسے منزلِ مقصود پر پہنچ کر بھی گھر کی یاد ستاتی رہتی ہے اور عزیزوں اور رشتہ داروں کے چہرے اس کی نظروں کے سامنے ابھرتے رہتے ہیں۔

نظم کی تلخیص

کوئی مسافر جب سفر اختیار کرتا ہے تو اسے بہت سے مصائب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُسے خوشی کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ اس کا دھیان ہر وقت اپنے گھر میں لگا رہتا ہے اور اس کے عزیزوں کی شکلیں اس کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہتی ہیں۔ اس کے پاس سفر کے لیے سواری بھی ہو، سفر خرچ کے لیے سرمایہ بھی میسر ہو تو بھی اس کی افسردگی کم نہیں ہوتی، اور تنہائی میں جب وطن کی یاد آتی ہے، تو دل آہیں بھرنے لگتا ہے۔ سفر میں چلتے چلتے پاؤں پر چھالے پڑ جاتے ہیں۔ بعض اوقات کانٹے بھی چُبھ جاتے ہیں لیکن اگر ان کو نکالنے بیٹھ جائیں تو ڈر رہتا ہے کہ کہیں قافلے والے آگے نہ نکل جائیں کیونکہ جو مسافر تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور قافلے سے پیچھے رہ جاتے ہیں انہیں لینے کے لئے کوئی واپس نہیں آتا۔ کئی مسافر ایسے بھی ہوتے ہیں جو ایک دفعہ گھر سے نکلے تو لوٹ کر گھر نہیں آئے۔ انہیں سفر کی حالت میں موت نے آلیا۔ وہ رہنے والے تو بستیوں کے تھے مگر اجل نے ویرانوں میں ان کی قبریں بنوا دی ہیں۔ جس طرح ایک بُلبل اپنا گھونسلا چھوڑ کر بے چین رہتا ہے، اسی طرح مسافر بھی اپنے گھر سے جدا ہو کر سکون حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی راتوں کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ وہ لاکھ کوشش کرے لیکن وہ ایک لمحے کے لیے بھی سو نہیں سکتا۔

نظم کا مرکزی خیال

مسافر جب سفر پر نکلتا ہے، تو اسے بہت سے رنج برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اسے اپنے عزیز و اقارب یاد آتے ہیں اور وہ پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے پاس سواری کے لیے جانور اور خرچ کے لئے مال بھی ہو تو بھی اسے آرام نصیب نہیں ہوتا۔ اگر وہ تھک ہار کر بیٹھ جائے تو اسے کوئی نہیں اٹھاتا۔ خدا دشمن کو بھی وطن اور گھر سے دُور نہ کرے۔ سفر ہمیشہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

میر انیس

شہادت

تعارف | میدانِ کربلا میں حضرت امام حسن رضؓ کے بیٹے قاسم، امام حسین رضؓ کے بھائی حضرت عباس، حضرت علی رضؓ کے نواسے اور حضرت زینب کے بیٹے عون و محمد اور امام حسین رضؓ کے نوجوان بیٹے علی اکبر شہید ہو چکے تھے۔ امام عالی مقام میدانِ جنگ سے ان کی لاشیں اٹھا کے لاتے ہیں۔ یہ نظم بھی میر انیس کے ایک مرثیہ کا حصہ ہے اور مسدس کی ہیئت میں ہے۔

لاشے سبھوں کے سبطِ نبیؐ خود اٹھا کے لائے
قاتل کسی شہید کا سر کاٹنے نہ پائے
دشمن کو بھی نہ دوست کی فرقت خدا دکھائے
فرماتے تھے بچھڑ گئے ہم سب سے ہائے ہائے
اتنے پہاڑ گر پڑیں جس پر وہ خم نہ ہو
گر سو برس جیوں تو یہ مجمع بہم نہ ہو

مشکل الفاظ کے معانی | لاشے ۔ لاشیں ۔ سبطِ نبیؐ ۔ نبیؐ کے نواسے مراد ہے امام حسین رضؓ۔ فرقت ۔ جدائی ۔ خم ہونا ۔ جھکنا ۔ مجمع بہم ہونا ۔ لوگوں کا اکٹھا ہونا ۔

تشریح | حضرت امام حسینؓ میدانِ جنگ سے اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کی لاشیں خود اٹھا کے لائے۔ ان لاشوں میں حضرت قاسم، حضرت عباس، عون و محمد، اور حضرت علی اکبر کی لاشیں شامل تھیں۔ ان لاشوں کو اٹھا کے لانا اس لئے بھی ضروری تھا کہ کہیں دشمن ان کے سر کاٹ کر ان کی بے حرمتی نہ کریں۔ کسی عزیز کی میت کو دیکھ کر جذبات کا بے قابو ہو جانا قدرتی سی بات ہے۔ خدا کسی دشمن کو بھی درد و کرب کی اس کیفیت سے دوچار نہ کرے۔ امام حسینؓ فرطِ غم سے فرماتے تھے کہ افسوس ہم ان سب سے جدا ہو گئے۔ انسان کے لئے ایک چھوٹا سا غم برداشت کرنا بھی مشکل ہو

جاتا ہے لیکن جس پر غموں کے پہاڑ گر پڑیں وہ کیونکر اسے برداشت کر سکتا ہے۔ اس کی کمر ان صدمات سے دوہری کیوں نہ ہو جائے۔ یہ شہید ہونے والے ایسے عظیم لوگ تھے کہ اگر میں سو برس بھی جیتا رہوں تو بھی ایسے افراد نہ مل سکیں گے۔ ایسے انسان روز روز پیدا نہیں ہوتے۔

لاشے تو سب کے گرد تھے اور بیچ میں امام
ڈوبی ہوئی تھی خوں میں نبیؐ کی قبا تمام
افسردہ و حزین و پریشان و تشنہ کام
برچھی تھی دل کو فتح کے باجوں کی دھوم دھام
اعداء کسی شہید کا جب نام لیتے تھے
تھرّا کے دونوں ہاتھوں سے دل تھام لیتے تھے

مشکل الفاظ کے معانی

قبا - لباس - افسردہ - غمگین - حزیں - غم زدہ
تشنہ کام - پیاسا - اعدا - دشمن - تھرّانا - کانپنا۔

تشریح

منظر کشی میں میر انیس کو خصوصی ملکہ حاصل ہے۔ انہیں اس فن پر اتنا عبور ہے کہ منظر جیتا جاگتا آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام حسینؓ نے اپنے شہید ہونے والے عزیزوں کی لاشیں جمع کر لی تھیں اور ان کے درمیان کھڑے تھے۔ انہوں نے جو لباس زیب تن کر رکھا تھا وہ حضور اکرمؐ کا لباس تھا اور شہیدوں کی لاشیں اٹھاتے ہوئے وہ خون آلود ہو گیا تھا۔ امام عالی مقام ان عزیزوں کی لاشیں دیکھ کر ملول اور غمگین تھے۔ چہرے پر پریشانی کے آثار نمایاں تھے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وہ پیاسے بھی تھے۔ یزیدی لشکر میں جب فتح کے شادیانے بجتے تھے تو ان کی آواز امام عالی مقام کے دل پر برچھی بن کر لگتی تھی، یعنی انہیں اس سے بڑی تکلیف پہنچتی تھی۔ اور جب دشمن یہ اعلان کرتے تھے کہ عباسِ علمدار شہید ہو گئے، قاسم شہید ہو گئے، عون و محمد شہید ہو گئے۔ علی اکبر جامِ شہادت نوش کر گئے تو حضرت امام کانپ اٹھتے تھے اور بے قراری کے عالم میں اپنے دل کو تھامتے تھے۔

پوچھو اسی سے جس کے جگر پر ہوں اتنے داغ
اک عمر کا ریاض تھا جس پر، لٹا وہ باغ

فرصت نہ اب بُکا سے، نہ ماتم سے ہے فراغ
جو گھر کی رَوشنی تھے، وہ گل ہو گئے چراغ
پڑتی تھی دھوپ سب کے تنِ پاش پاش پر!
چادر بھی اک نہ تھی علی اکبر کی لاش پر

مشکل الفاظ کے معانی

ریاض - محنت۔ بُکا - رونا۔ فراغ - فرصت
چراغ گل ہونا - چراغ بجھنا۔ پاش پاش - ٹکڑے ٹکڑے۔

تشریح

جس شخص پر غم واندوہ کے پہاڑ ٹوٹ پڑے ہوں، اسی کو اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شدّت اور گہرائی کیا ہے؟۔ دوسرے شخص کو اس کا اندازہ نہیں ہوتا۔ امام عالی مرتبت پر دکھوں اور غموں کی جو کیفیت تھی اس کا اندازہ کیسے ہو سکتا ہے؟ ان کا گھرانہ ایک باغ کی طرح تھا جو ان کی ساری عمر کی دیکھ بھال کا ثمرہ تھا۔ وہ باغ ان کی نظروں کے سامنے پامال ہو گیا۔ ان کے عزیز واقربا میدانِ کربلا میں ظالموں کے ہاتھوں جامِ شہادت نوش کر گئے۔ ان کا دکھ اتنا شدید تھا کہ وہ اس وقت مسلسل آنسو بہا رہے تھے اور ماتم کر رہے تھے۔ ان کے وہ سب چراغ ایک ایک کر کے بجھ گئے تھے جن کے دم قدم سے ان کا گھر روشن تھا۔ سب کے جسم ٹکڑے ٹکڑے تھے۔ ان پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ کہیں سائے کا نام ونشان نہ تھا۔ کہ لاشوں کو ادھر کر دیا جاتا۔ امام حسین رضؓ کے بیٹے علی اکبر کی لاش پر ڈالنے کے لئے ایک چادر بھی میسّر نہ تھی۔ اس صورتِ حال میں، غم واندوہ کے اس طوفان میں، حضرت امام پر جو گزر رہی تھی اس کا احساس کون کر سکتا ہے؟

اس بند میں شاعر نے حضرت امام کے گھرانے کو باغ سے تشبیہ دی ہے۔ جو لُٹ چکا ہے۔ تیسرے مصرعے میں حضرت امام کے خاندان کو گھر سے اور ان کے عزیز واقارب کو چراغوں سے مشابہ قرار دیا ہے۔ یہ چراغ اب بجھ گئے ہیں اور گھر بے نور ہو چکا ہے۔

مقتل سے آئے خیمے کے اندر شہِ زمن
پَرشدّتِ عطش سے نہ تھی طاقتِ سُخن
پردے پہ ہاتھ رکھ کے پکارے بہ صد محن

اصغر کو گاہوارے سے لے آؤ اے بہن
پھر ایک بار اس مہِ انور کو دیکھ لیں
اکبر کے شیر خوار برادر کو دیکھ لیں

مشکل الفاظ کے معانی | مقتل ۔ قتل گاہ ۔ میدان جنگ ۔ شہِ زمن ۔ زمانے کے بادشاہ مراد امام حسین رض ۔ عطش ۔ پیاس
طاقت سخن ۔ گفتگو کی طاقت ۔ بہ صد محن ۔ بڑی مشکل سے ۔ گاہوارہ ۔ پنگھوڑا ۔
مہِ انور ۔ چمکتا ہوا چاند ۔ برادر ۔ بھائی ۔

تشریح | حضرت امام حسین جو اپنی خاندانی فضیلت اور برتری کی بنا پر زمانے کے بادشاہ تھے، غم واندوہ میں گھرے ہوئے میدان جنگ سے اپنے خیمے کی طرف لوٹے۔ یزیدی فوجوں نے اہل بیت اور ان کے رفقا کا پانی بند کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ معصوم بچوں کے لئے پانی کی ایک بوند تک نہ تھی۔ پیاس کی وجہ سے خود جناب امام حسین کی حالت یہ تھی کہ ان کے لئے بولنا اور گفتگو کرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ ان کی زبان خشک اور حلق سوکھا ہوا تھا۔ انہوں نے پردے پر ہاتھ رکھ کر بڑی مشکل سے اپنی بہن حضرت زینب کو آواز دی کہ علی اصغر کو پنگھوڑے سے اٹھاکر باہر لے آؤ تاکہ میں ایک دفعہ پھر اس چمکتے ہوئے چاند کو دیکھ سکوں جو علی اکبر شہید کا دودھ پیتا بھائی ہے۔ حضرت امام بڑے بیٹے کی شہادت کے بعد چھوٹے بیٹے کو دیکھ کر اپنا غم غلط کرنا چاہتے تھے اور اپنے بلبلاتے ہوئے دل کو سہارا دینے کی کوشش کر رہے تھے۔

بچّے سے ملتفت تھے شہِ آسماں سریر
تھا اس طرف کمیں میں بن کاہلِ شریر
مارا جو تین بھال کا اس بے حیا نے تیر
بس وفعتاً نشانہ ہوئی گردن صغیر
تڑپا جو شیر خوار تو حضرت نے آہ کی
معصوم ذبح ہوگیا گودی میں شاہ کی

مشکل الفاظ کے معانی | مُلتفت ۔ متوجہ ۔ شہ ۔ بادشاہ مراد ہے

امام حسین رضؓ۔ آسمان سریر۔ آسمان جن کا تخت تھا۔ کیس۔ گھات۔ بن کاہل۔ حرملہ بن کاہل، یزیدی فوجوں کا ایک تیرانداز۔ تین بھال۔ تین نوکوں والا۔ گودی۔ گود۔

تشریح حضرت امام حسینؓ علی اصغرؓ کو اٹھائے ہوئے اسے پیار کر رہے تھے اور اس طرح علی اکبر کی شہادت کا غم ہلکا کرنے کی کوشش میں تھے۔ یزیدی فوجوں میں حرملہ بن کاہل جو کمال کا تیرانداز تھا، ان کی گھات میں تھا۔ اس بے حیا اور بدلحاظ انسان نے خونِ رسالت کی پرواکئے بغیر ایک تین پھلوں والا تیر کمان سے چھوڑا جو فوراً معصوم علی اصغر کی گردن میں اتر گیا۔ معصوم بچّہ اس تیر کو برداشت کرنے کی ہمت کہاں رکھتا تھا؟ وہ مظلوم تیر کھاکر تڑپا اور حضرتِ امامؓ کی گود ہی میں جان دے دی۔ حضرت امامؓ نے فرطِ غم سے آہ بھری اور رضائے الٰہی کے سامنے اپنی گردن خم کر دی۔

جس دم تڑپ کے مرگیا وہ طفلِ شیر خوار
چھوٹی سی قبر تیغ سے کھودی بحالِ زار
بچے کو دفن کر کے پکارا وہ ذی وقار
اے خاکِ پاک! حرمتِ مہماں نگاہ دار

دامن میں رکھ اسے جو محبت علیؓ کی ہے
دولت ہے فاطمہؓ کی امانت نبیؐ کی ہے

مشکل الفاظ کے معانی طفلِ شیر خوار۔ دودھ پیتا بچّہ۔ تیغ۔ تلوار۔ بحالِ زار۔ تکلیف کی حالت میں۔ ذی وقار۔ شان و شوکت والی شخصیت۔ حرمت۔ احترام۔ نگاہ دار۔ خیال رکھ۔

تشریح معصوم علی اصغر نے امام عالی مقام کی گود میں تڑپ کر جان دے دی۔ حضرت امامؓ میدانِ جنگ میں تھے اور حالتِ جنگ میں تدفین کے لوازمات مثلاً غسل، کفن، نمازِ جنازہ وغیرہ کو پورا کرنا ضروری نہیں ہوتا۔ انھوں نے اپنی تلوار سے تھوڑی سی جگہ کھودی۔ قبر کھودتے ہوئے حضرت امام کی حالت اس شخص کی سی تھی جو انتہائی کرب سے گزر رہا ہو، یا بڑی تکلیف میں ہو۔ ظاہر ہے کہ بیٹے کی قبر کھودنے سے زیادہ تکلیف دہ امر اور کونسا ہو سکتا ہے؟ جب اس باوقار ہستی نے بچّے کو دفن کر دیا تو انھوں نے اس سرزمین کو پکار کر کہا کہ اے خاکِ پاک! اپنے ننھے مہمان کے

احترام کا خیال رکھنا اور اس کی بے حرمتی نہ ہونے دینا۔ اسے اپنے دامن میں سنبھال کر رکھنا کہ یہ شیر خدا حضرت علیؓ کی محبت کی نشانی ہے۔ یہ سیّدۃ النساء فاطمۃ الزہرہ کا سرمایہ ہے اور سرکارِ دو عالمؐ کی امانت ہے۔ شاعر نے یہ رشتے اس لیے گنوائے ہیں کہ اس ننھے معصوم کے مقام اور مرتبے کو سمجھا جا سکے۔ علی اصغر حضرت علیؓ اور سیّدۃ النساءؓ کے پوتے تھے اور آلِ رسول میں سے تھے، اس لیے اپنی شیر خوارگی اور بچپن کے باوجود عالی مرتبت تھے۔ چنانچہ ان کی معصومیت کی وجہ سے شاعر نے اس مٹی کو خاکِ پاک کہا ہے جس میں وہ دفن ہوئے۔

نظم کی تلخیص

امام حسینؓ اپنے تمام عزیزوں کی لاشیں میدانِ کربلا سے اٹھا کر لے آئے تاکہ ایسا نہ ہو کہ دشمن کسی شہید کا سر کاٹ کر اس کی بے حرمتی کرے۔ حضرت امام بڑے پریشان تھے اور جب دشمن فتح کے شادیانے بجاتے تھے اور کسی کا نام لے کر اعلان کرتے تھے کہ فلاں شہید ہو گیا تو حضرت امام کو اتنی تکلیف ہوتی تھی کہ وہ دونوں ہاتھوں سے دل کو تھام لیتے تھے۔ ان کا وہ باغ لٹ گیا تھا جس پر انہوں نے عمر بھر محنت کی تھی۔ ان کے گھر کے چراغ بجھ گئے تھے، اس لیے ان کا آہیں بھرنا اور اشک بہانا بجا تھا۔ حضرت امام میدانِ جنگ سے اپنے خیموں کی طرف آئے اور پردے پر ہاتھ رکھ کر حضرت زینب کو آواز دی کہ شیر خوار علی اصغر کو پنگھوڑے سے اٹھا کر باہر لے آؤ تاکہ اسے دیکھ کر علی اکبرؓ کی شہادت کا غم کم کر سکوں۔ حضرت امام حسینؓ علی اصغر کو پیار کر رہے تھے کہ حرملہ بن کاہل کا تیر ننھے معصوم کے حلق میں ترازو ہو گیا اور اس نے حضرت امام کی گود ہی میں جان دے دی۔ حضرت نے ایک چھوٹی سی قبر تلوار سے بنائی اور اس میں ننھے سے جسم کو دفن کر دیا۔

نظم کا مرکزی خیال

اس نظم میں شہادتِ اہلِ بیت اور خاص طور پر شہادتِ علی اصغر کا ذکر ہے۔ حضرت امام حسین اپنے عزیزوں کی لاشیں میدانِ جنگ سے لے کر آتے ہیں۔ حضرت علی اکبر کی شہادت کا غم کم کرنے کے لیے اپنے چھوٹے بیٹے علی اصغر کو گود میں لے کر پیار کر رہے تھے کہ دشمنوں کا ایک تیر آیا اور علی اصغر بھی اس سے شہید ہو گئے۔

الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء - ۱۹۱۴ء)

"مسلمانوں کا تابناک ماضی"

تعارف "مسدّس حالی"، مولانا حالی کی معروف نظم ہے، جس میں انہوں نے مسلمانوں کے عروج اور زوال کی کہانی بڑے مؤثر انداز میں بیان کی ہے۔ یہ نظم اُردو کی قومی نظموں میں خاص مقام رکھتی ہے۔ "مسلمانوں کا تابناک ماضی" اسی نظم کا ایک ٹکڑا ہے۔

گھٹا اِک پہاڑوں سے بطحا کے اُٹھی ــــ پڑی چار سُو یک بیک دھوم جس کی
کڑک اور دمک دُور دُور اس کی پہنچی ــــ جو ٹیگس پہ گرجی تو گنگا پہ برسی
رہے اُس سے محرُوم آبی نہ خاکی
ہری ہو گئی ساری کھیتی خدا کی

مشکل الفاظ کے معانی بطحا - مکہ۔ چار سو - چاروں طرف۔ ٹیگس - سپین کا ایک بڑا دریا۔ گنگا - ہندوستان کا مشہور دریا۔ آبی - پانی کی مخلوق۔ خاکی - خاک پر بسنے والی مخلوق۔

تشریح حالی کہتے ہیں کہ مکہ کے پہاڑوں سے بادل اٹھا اور دیکھتے ہی دیکھتے چاروں طرف اس کی دھوم مچ گئی۔ اس کی کڑک اور دمک نے سپین سے لے کر ہندوستان تک کے علاقے کو گھیر لیا۔ خشکی اور تری میں بسنے والی ساری مخلوق اس سے فیض یاب ہوئی اور خدا کی سرزمین پر ہر طرف ہریالی نظر آنے لگی۔

ان اشعار میں شاعر نے ظہورِ اسلام کی برکتوں کا ذکر کیا ہے۔ گھٹا سے مراد اسلام کا پیغام ہے۔ یہ پیغام مکہ کی سرزمین سے ابھرا اور مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ ساتھ ہر طرف پھیل گیا۔ سرزمین سپین سے لے کر ہندوستان تک اس کی گھن گرج کو محسوس کیا گیا۔ کوئی قوم

خواہ وہ چھوٹے چھوٹے جزیروں میں بسنے والی ہو یا بڑے بڑے، وسیع و عریض ملکوں میں آباد ہو، اس کی برکات سے محروم نہ رہی۔ اس پیغام کی بدولت خدا تعالیٰ کی سرزمین پر بسنے والی مخلوق خوشحال ہو گئی۔

لیے علم و فن اُن سے نصرانیوں نے　　کیا کسبِ اخلاق روحانیوں نے
ادب اُن سے سیکھا صفاہانیوں نے　　کہا بڑھ کے لبیک یزدانیوں نے
ہر اک دل سے رشتہ جہالت کا توڑا
کوئی گھر نہ دنیا میں تاریک چھوڑا

مشکل الفاظ کے معانی نصرانی —— عیسائی۔ روحانی —— وہ لوگ جن کے نزدیک مذہب کا دارومدار صرف روحانی باتوں پر ہے۔
صفاہانی۔ اصفہان کے رہنے والے۔ صفاہان ایران کا ایک شہر ہے۔ یزدانی —— یزدان کو ماننے والے۔ یزداں نیکی کے خدا کو کہتے ہیں۔ برائی کے خدا کو اہرمن کہتے ہیں۔

تشریح شاعر کہتا ہے کہ اسلام کے دورِ اوّل میں مسلمانوں نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی اور ان کی ترقیات نے دنیا کی دوسری قوموں کو بڑا متاثر کیا۔ عیسائیوں نے ان سے علوم و فنون سیکھے۔ روحانی باتوں پر یقین رکھنے والوں نے ان سے اخلاقیات کا سبق لیا۔ (اصفہان) کا شہر اپنی علمی و ادبی فضا کے لئے خصوصی شہرت رکھتا تھا۔ وہاں کے لوگوں نے مسلمانوں سے علم و ادب کا درس لیا۔ آتش پرست ایرانیوں نے اپنی تمام تہذیبی عظمتوں کے باوجود اسلام کے پیغام پر لبیک کہا اور اسے قبول کر لیا۔ اسلام نے جہالت کی تاریکی کو ختم کیا اور ہر طرف علم کا نور پھیلا دیا۔
اس بند کا مرکزی مضمون یہ ہے کہ جب اسلام کا آغاز ہوا تو اس وقت کی دو قومیں (عیسائی اور ایران کے آتش پرست) تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے اوجِ کمال پر پہنچی ہوئی تھیں، لیکن اسلام کی روشنی کے سامنے ان کا چراغ نہ جل سکا اور انہوں نے اسلام کی عظمت کے سامنے اپنا سر جھکا دیا۔

ہر اک میکدہ سے بھرا جا کے ساغر　　ہر اک گھاٹ سے آئے سیراب ہو کر
گرے مثلِ پروانہ ہر روشنی پر　　گرہ میں لیا باندھ حکمِ پیمبر
کہ حکمت کو اک گمشدہ لال سمجھو
جہاں پاؤ اپنا اسے مال سمجھو

مشکل الفاظ کے معانی میکدہ - شراب خانہ - مراد علم و حکمت کا خزانہ - ساغر - پیالہ - گھاٹ - مراد ہے دریا یا تالاب -

مثل پروانہ - پتنگے کی مانند - گرہ میں باندھ لینا - یاد رکھنا - حکمت - دانائی -

حکمِ پیمبرؐ - اس حدیث کی طرف اشارہ ہے، جس کا مفہوم یہ ہے کہ حکمت، مومن کا گمشدہ مال ہے۔ وہ اسکو جہاں پائے لے لے۔

تشریح حالی کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے ہر شراب خانے سے اپنا پیالہ بھرا۔ پانی کے ہر سرچشمے سے سیراب ہو کر آئے۔ جہاں انہوں نے روشنی دیکھی اس پر پروانوں کی طرح گرے۔ انہوں نے سرکارِ دو عالم کا یہ حکم گرہ میں باندھ رکھا تھا کہ دانائی مومن کا گمشدہ مال ہے۔ اسے جہاں دیکھے، لے لے۔

ان اشعار کا آسان مفہوم یہ ہے کہ مسلمان تعصّب سے پاک ایک عالی ظرف قوم تھی۔ مسلمانوں نے علم و حکمت کے ہر خزانے سے اپنا دامن بھرا۔ انہوں نے حصولِ علم میں کبھی تنگ نظری کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انہوں نے غیر قوموں سے بھی بہت کچھ لیا ہے۔ ان کا علم کے ساتھ وہی تعلق تھا جو پتنگے کا روشنی کے ساتھ ہوتا ہے۔ حضور اکرمؐ کی حدیث ہے کہ دانائی مومن کا گمشدہ مال ہے، وہ اس کو جہاں دیکھے لے لے۔ اس حدیث کو انہوں نے یاد رکھا اور دنیا کے تمام علوم و فنون کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔

ہر اک علم کے، فن کے جویا ہوئے وہ ہر اک کام میں سب سے بالا ہوئے وہ

فلاحت میں بے مثل و یکتا ہوئے وہ سیاحت میں مشہورِ دنیا ہوئے وہ

ہر اک ملک میں اُن کی پھیلی عمارت

ہر اک قوم نے اُن سے سیکھی تجارت

مشکل الفاظ کے معانی جویا - تلاش کرنے والے - بالا - بلند

فلاحت - کھیتی باڑی - سیاحت - سفر کرنا -

بے مثل - جس کی کوئی مثال نہ ہو - یکتا - بے مثال -

تشریح حالی کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے تمام علوم و فنون کو بڑے شوق کے ساتھ حاصل کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر کام میں ان کو بلند مقام حاصل ہوا۔ اگر انہوں نے کھیتی باڑی کی تو اس محنت اور لگن کے ساتھ کہ دنیا میں ان کا کوئی جواب نہ

تھا۔ وہ اپنے ملکوں میں قید ہو کر نہیں بیٹھے۔ وہ سیر و سفر کے شوقین تھے۔ اسی لئے انہوں نے دنیا دور دراز علاقوں کے سفر کیے۔ وہ جہاں جہاں پہنچے وہاں انہوں نے عظیم الشان عمارتیں تعمیر کیں اور دنیا کی تمام قوموں کو تجارت کے گُر سمجھائے۔

اس بند میں شاعر نے دَورِ اوّل کے مسلمانوں کی خوبیاں گنوائی ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ان کے دل میں علوم و فنون حاصل کرنے کی شدید خواہش موجود تھی۔ انہوں نے کھیتی باڑی کی۔ وہ سیر و سیاحت بھی کرتے رہے۔ انہوں نے عظیم الشان عمارتیں بھی تعمیر کرائیں اور دُنیا کو تجارت کرنے کے طریقے بھی سمجھائے۔ غرض انہوں نے جس کام کو ہاتھ لگایا اسے کمال تک پہنچا دیا۔

نہیں اس طبق پر کوئی بَرِّ اعظم — نہ ہوں جس میں اُن کی عمارات محکم
عرب، ہند، مصر، اندلس، شام، دَیلم — بناؤں سے ہیں اُن کی معمور عالم
سرِ کوہِ آدم سے تا کوہِ بیضا
جہاں جاؤ گے کھوج پاؤ گے اُن کا

مشکل الفاظ کے معانی

طبق۔ مراد روئے زمین۔ محکم۔ مضبوط۔ اندلس۔ سپین۔ دَیلم۔ گیلان کے پاس ایک پہاڑی ملک۔ پہلے ایران میں تھا، اب روس میں ہے۔ بناؤں۔ عمارات۔ معمور۔ بھرا ہوا۔ عالم۔ دُنیا۔ سرِ کوہِ آدم۔ لنکا میں جو پہاڑوں کا سلسلہ ہے، اسکی سب سے اونچی چوٹی۔ کوہِ بیضا۔ یہ پہاڑ اندلس میں ہے چونکہ اس کی چوٹی اکثر برف سے سفید رہتی ہے اس لئے عرب اسکو کوہِ بیضا یا قلۂ بیضا کہتے ہیں۔ کھوج۔ نشان۔

تشریح

حالی کہتے ہیں کہ روئے زمین پر کوئی ملک ایسا نہیں ہے جس میں مسلمانوں کی بنائی ہوئی مضبوط عمارتیں موجود نہ ہوں۔ وہ عرب کی سرزمین ہو یا ہندوستان کی۔ وہ مصر کا علاقہ ہو یا سپین کا۔ وہ شام کا ملک ہو یا دَیلم یعنی ایران کا، تمام دنیا اُن کی بنائی ہوئی عمارتوں سے بھری پڑی ہے۔ لنکا کے پہاڑوں سے لے کر اُندلس کے پہاڑوں تک ہر جگہ ان کی نشانیاں موجود ہیں۔

اس بند کا مفہوم یہ ہے کہ مسلمان عظیم روایات کی حامل قوم ہے۔ دُنیا کے

ایک وسیع وعریض خطّہ پر ان کی حکومتیں قائم تھیں وُہ جہاں بھی گئے، وہاں اپنی نشانیاں چھوڑ آئے۔ ان کی تعمیر کردہ عمارتیں آج بھی دنیا کے گوشے گوشے میں موجود ہیں اور اس قوم کی فنِ تعمیرات سے دلچسپی کی گواہی دیتی ہیں۔

ہوا اندلس اُن سے گلزار یکسر — جہاں اُن کے آثار باقی ہیں اکثر
جو چاہے کوئی دیکھ لے آج جا کر — یہ ہے بیتِ حمرا کی گویا زباں پر
کہ تھے آلِ عدنان سے میرے بانی
عرب کی ہوں میں اس زمیں پر نشانی

مشکل الفاظ کے معانی

گلزار - باغ۔ یکسر - مکمل طور پر۔ آثار - نشانیاں۔ بیتِ حمرا - قصرِ الحمرا - یہ عمارت شہر غرناطہ (سپین) میں اب تک مسلمانوں کی یادگار ہے۔ آلِ عدنان - بنو امیّہ کی وہ شاخ جو صدیوں تک سپین میں حکمران رہی - ان کے جدِّ اعلیٰ کا نام عدنان تھا۔

تشریح

حالی کہتے ہیں کہ مسلمانوں کا ماضی دیکھنا ہو یا ان کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرنی ہو تو سپین کی سرزمین کو دیکھو۔ انہوں نے یہاں خوبصورت باغات بنوائے جن کے نشان آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ دوسرا مفہوم یہ ہے کہ ان کے دورِ حکومت میں سپین اپنی زرخیز زمین اور پُرکیف فضا کی وجہ سے باغ کا منظر پیش کرتا تھا۔ غرناطہ میں الحمرا کی عمارت آج بھی زبانِ حال سے کہہ رہی ہے کہ مجھے بنو امیّہ نے تعمیر کیا تھا اور میں اس یورپی سرزمین پر عربوں کی نشانی ہوں۔

سپین کی سرزمین پر عربوں نے کئی صدیوں تک حکومت کی۔ ان کے عہدِ حکومت میں اس علاقے نے زندگی کے ہر شعبے میں ترقی کی۔ یہاں بڑے بڑے علماء، فضلا، اطبّاء، حکماء اور عظیم دانشور پیدا ہوئے، جن سے فیض حاصل کر کے اہلِ یورپ دنیا میں سربلند ہوئے۔ عربوں کی چھوڑی ہوئی نشانیوں میں مسجدِ قرطبہ اور قصرِ الحمرا خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

ثمرقند سے اندلس تک سراسر — اُنہیں کی رصدگاہیں تھیں جلوہ گستر
سوادِ مراغہ میں اور قاسیوں پر — زمیں سے صدا آ رہی ہے برابر
کہ جن کی رصد کے یہ باقی نشاں ہیں
وہ اسلامیوں کے منجّم کہاں ہیں؟

مشکل الفاظ کے معانی

سمرقند۔ روسی ترکستان کا ایک مشہور شہر۔ رصدگاہ۔ وہ مقام جہاں سے ستاروں کی رفتار اور حالات کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جلوہ گستر۔ جلوہ پھیلانے والا۔ مراغہ۔ آذربائیجان کا ایک شہر۔ سوادِ مراغہ۔ مراغہ شہر کے گرد و نواح۔ قاسیون۔ دمشق کے شمال میں ایک پہاڑ، جہاں مامون الرشید نے رصدگاہ بنوائی تھی۔ منجم۔ ستاروں کا علم جاننے والے۔ اسلامیوں۔ مسلمانوں۔

تشریح

پرانے دور میں مسلمانوں نے علم نجوم میں بڑی ترقی کی تھی۔ انہوں نے ستاروں کی رفتار اور حالات کا مشاہدہ کرنے کے لئے جو رصدگاہیں بنوائیں، ان میں سمرقند، قرطبہ، مراغہ اور قاسیون کی رصدگاہیں خاص طور پر مشہور تھیں۔ ان کے نشانات آج تک موجود ہیں۔ زمین پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ وہ مسلمان علم نجوم کے ماہر کہاں ہیں، جن کی رصدگاہوں کے یہ نشان ہیں۔

مزید وضاحت کے ساتھ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ترکستان سے لے کر اندلس کی سرزمین تک مسلمان بادشاہوں نے علم نجوم کے فروغ کے لئے رصدگاہیں بنوائیں۔ محقق طوسی کی نگرانی میں آذربائیجان میں مراغہ کے مقام پر ایک رصدگاہ بنوائی گئی۔ قاسیون کے پہاڑ پر جہاں ایک روایت کے مطابق قابیل نے ہابیل کو قتل کیا تھا، عباسی خلیفہ مامون الرشید نے بڑے اہتمام سے رصدگاہ تعمیر کروائی لیکن افسوسناک بات یہ ہے کہ مسلمانوں کے زوال کے ساتھ ہی یہ رصدگاہیں بھی ویران اور ناکارہ ہو گئیں۔ ظاہر ہے کہ جب ستارہ شناس ہی نہ رہے تو انہیں استعمال کون کرتا؟

نظم کی تلخیص

اس نظم میں حالی نے مسلمانوں کے روشن ماضی کی تصویر کشی کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ سرزمینِ مکہ کے پہاڑوں سے وہ بادل اٹھا جس کی گرج اور چمک کو ساری دنیا نے محسوس کیا۔ کبھی وہ اندلس پر گرجا اور کبھی ہندوستان پر برسا۔ دنیا میں بسنے والی کوئی قوم اس کے فیض سے محروم نہ رہی۔ اس نے ساری مخلوقِ خدا کی کھیتوں کو سرسبز کر دیا۔ شاعر نے یہاں استعارے کی زبان میں مسلمان قوم کا ذکر کیا ہے جس سے یورپ کے عیسائیوں نے

علوم وفنون سیکھے۔ روحانیت پر یقین رکھنے والوں نے ان سے اخلاقیات کا درس لیا۔ صفاہان کے رہنے والوں نے ان سے شعروادب کا سبق پڑھا اور آتش پرستوں نے ان کی آواز پر "لبیک" کہتے ہوئے ان کے دین کے سامنے سر جھکا دیا۔ انہوں نے جہالت کو ختم کر کے ہر طرف علم کی روشنی پھیلائی۔ انہوں نے خود بھی علم و دانش سیکھنے کے معاملے میں تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔ وہ اس کی خاطر جگہ جگہ گئے۔ انہوں نے سرکارِ دوعالم ؐ کی یہ حدیث اپنے "پلّے" باندھ رکھی تھی کہ دانائی مومن کی گمشدہ متاع ہے، وہ جہاں اسے دیکھے لے لے۔ انہوں نے جس علم کی طرف توجہ کی، اس میں کمال حاصل کیا۔ کھیتی باڑی کی تو اس میں بے مثال ہوئے۔ سیر و سیاحت کو نکلے تو دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا۔ ہر ملک میں ان کے فنِ تعمیرات کے نمونے موجود ہیں اور ہر قوم نے تجارت کرنے کا گر انہیں سے سیکھا ہے۔ دنیا کے تمام بڑے بڑے ممالک میں ان کی تعمیر کردہ مضبوط عمارتیں کھڑی ہیں۔ انہوں نے ترکستان سے لے کر سپین تک رصد گاہیں بنوائیں جہاں سے مسلمان ماہرینِ علمِ نجوم ستاروں کی رفتار اور حالات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ ان رصد گاہوں کے کھنڈر آج بھی موجود ہیں جو مسلمانوں کے شاندار ماضی کی عکاسی کر رہے ہیں۔

نظم کا مرکزی خیال

مسلمانوں کا ماضی بڑا روشن تھا۔ انہوں نے بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں اور اہلِ دنیا کو علوم وفنون کی دولت سے مالا مال کیا۔ انہوں نے خود بھی دوسری قوموں سے بہت کچھ سیکھا۔ انہیں رسالت مآب ؐ کی یہ حدیث یاد تھی کہ دانائی مومن کا گمشدہ مال ہے، وہ اسے جہاں پائے لے لے۔ انہوں نے کاشتکاری، تجارت اور فنِ تعمیرات میں خاص طور پر بڑی مہارت حاصل کی اور جگہ جگہ اپنے نشانات چھوڑے ہیں۔ انہوں نے علمِ نجوم سے خصوصی دلچسپی کا اظہار کیا اور جگہ جگہ رصد گاہیں تعمیر کروائیں۔ بعدازاں جب مسلمانوں کا زوال شروع ہوا تو یہ جگہیں ویران ہو گئیں اور آج صرف ان کے کھنڈرات ہی باقی رہ گئے ہیں۔

الطاف حسین حالی

اسلامی مساوات

تعارف یہ نظم بھی "مسدس حالی" سے لی گئی ہے۔ یہاں قوموں کے زوال کی داستان بیان کی گئی ہے اور اس کے ساتھ اسلام کے پیغام اُخوّت پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔

کسی قوم کا جب اُلٹتا ہے دفتر تو ہوتے ہیں مسخ اُن میں پہلے تونگر
کمال اُن میں رہتے ہیں باقی نہ جوہر نہ عقل اُن کی ہادی نہ دین اُن کا رہبر
نہ دنیا میں ذلّت نہ عزّت کی پروا
نہ عقبیٰ میں دوزخ نہ جنّت کی پروا

مشکل الفاظ کے معانی دفتر اُلٹنا ۔ حالت خراب ہونا۔ مسخ ہونا۔ بگڑنا
تونگر ۔ امیر لوگ ۔ جوہر ۔ خوبی
رہبر ۔ رہنما ۔ ہادی ۔ ہدایت دینے والا۔ عقبیٰ ۔ آخرت ۔

تشریح اس بند میں حالی کہتے ہیں کہ جب کسی قوم کی حالت بگڑتی ہے تو سب سے پہلے جو طبقہ متاثر ہوتا ہے وہ امراء کا طبقہ ہوتا ہے۔ اُمراء میں کوئی کمال اور کوئی خوبی باقی نہیں رہتی۔ وہ عقل اور دین کو اپنا رہنما نہیں بناتے بلکہ ان کا دامن ساتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ بے حس ہو جاتے ہیں اور ان میں عزّت اور بے عزّتی کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ انہیں دنیا میں برے اعمال اور نیک اعمال میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ ان کے لئے دنیا و آخرت اور جنت و دوزخ کا تصوّر مٹ جاتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ قوم مجموعی طور پر زوال کا شکار ہو جاتی ہے۔

نہ مظلوم کی آہ و زاری سے ڈرنا نہ مفلوک کے حال پر رحم کرنا
ہَوا و ہوس میں خودی سے گزرنا تعیّش میں جینا، نمائش پہ مرنا
سدا خوابِ غفلت میں بے ہوش رہنا
دمِ نزع تک خود فراموش رہنا

مشکل الفاظ کے معانی مفلوک ۔ غریب ۔ ہَوا و ہوس ۔ لالچ ۔

تعیّش - عیش و عشرت - نمائش - دکھاوا - دمِ نزع - موت کے وقت -

تشریح

جب کسی قوم کا امیر طبقہ بگڑ جاتا ہے تو یہ لوگوں پر ظلم وستم ڈھانے لگتا ہے۔ اس کی بے حسّی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ اسے کسی مظلوم کی آہ و زاری سے ڈر نہیں لگتا۔ یہ کسی غریب آدمی کے حال پر رحم نہیں کھاتا۔ امیر لوگ ہر وقت لالچ اور طمع کا شکار رہتے ہیں۔ ان کی زندگی عیش و عشرت میں گزرتی ہے۔ وہ نمود و نمائش پر جان دیتے ہیں۔ وہ غفلت کی گہری نیند میں پڑے رہتے ہیں اور جب ان کی موت قریب آجاتی ہے تو بھی وہ ہوش میں نہیں آتے۔

اس بند کا مفہوم یہ ہے کہ جب تک کسی قوم کا امیر طبقہ خدا ترس رہتا ہے، وہ کسی پر ظلم نہیں کرتا، غریبوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتا ہے، لالچ اور طمع کا شکار نہیں ہوتا، اس وقت تک وہ قوم زوال کا شکار نہیں ہوتی لیکن جب امیر لوگ بگڑتے ہیں تو قوم اوجِ کمال سے ذلّت کے گڑھے میں آن گرتی ہے۔

کہاں بندگانِ ذلیل اور کہاں وہ ۔۔۔ بسر کرتے ہیں بے غمِ قوت و ناں وہ
پہنتے نہیں جز سمور و کتاں وہ ۔۔۔ مکاں رکھتے ہیں رشکِ خلدِ جناں وہ
نہیں چلتے وہ بے سواری قدم بھر
نہیں رہتے بے نغمہ و ساز دم بھر

مشکل الفاظ کے معانی

بندگانِ ذلیل - مراد ہے عام لوگ معمولی درجے کے لوگ -
قوت - خوراک - ناں - روٹی
سمور و کتان - قیمتی لباس - رشکِ خلدِ جناں - بہشت سے بھی زیادہ شاندار -
بے نغمہ و ساز - گانے بجانے کے بغیر - مراد ہے سامانِ تفریح کے بغیر -

تشریح

حالی کہتے ہیں کہ یہ بگڑے ہوئے امیر لوگ وہ لوگ ہیں جو معمولی درجے کے آدمیوں سے کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ انہیں کھانے پینے کی چیزوں کی کوئی فکر نہیں ہوتی۔ سمور اور کتان جیسے قیمتی کپڑوں سے بنے ہوئے لباس کے علاوہ کوئی لباس ان کی نظر میں نہیں جچتا۔ ان کے گھر بہشت کے محلّات سے بڑھ کر شاندار ہیں۔ ان کے چلنے کے لئے ہر وقت سواری موجود رہتی ہے اور ہر لمحہ ان کی تفریح کے لئے گانے بجانے کے سامان فراہم رہتے ہیں۔

ان اشعار میں حالی نے بگڑے ہوئے امراء کی زندگی کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ امیر لوگ معمولی درجے کے انسانوں کو انسان نہیں سمجھتے۔ وہ عمدہ کھاتے ہیں قیمتی لباس پہنتے ہیں عظیم الشان گھروں میں رہتے ہیں۔ وہ سواری کے بغیر قدم نہیں اٹھاتے اور ان کا سارا وقت گانے بجانے میں گزرتا ہے۔ ایسے ہی لوگ قوموں کی تباہی کا سبب بنتے ہیں۔ علامہ اقبال نے قوموں کی ترقی اور زوال کا راز یہ بتایا تھا۔

آ تجھ کو بتاؤں میں تقدیر امم کیا ہے؟
شمشیر و سناں اول، طاؤس و رباب آخر

لیکن یہ لوگ شمشیر و سناں کو چھوڑ کر طاؤس و رباب میں کھو جاتے ہیں اس لئے تباہی و بربادی ان کا مقدر بن جاتی ہے۔

یہ ہو سکتے ہیں ان کے ہم جنس کیونکر — نہیں چین جن کو زمانے سے دم بھر
سواری کو گھوڑا نہ خدمت کو نوکر — نہ رہنے کو گھر اور نہ سونے کو بستر
پہننے کو کپڑا نہ کھانے کو روٹی
جو تدبیر الٹی تو تقدیر کھوٹی

مشکل الفاظ کے معانی — ہم جنس ۔ ساتھی ۔ دم بھر ۔ ایک لمحے کے لئے ۔ تدبیر ۔ طریقہ ۔ کھوٹی تقدیر ۔ بدقسمتی

تشریح — حالی کہتے ہیں کہ یہ امیر لوگ ایسے غریب لوگوں کے ساتھی کس طرح ہو سکتے ہیں جن کو تمام عمر چین اور سکون کا ایک لمحہ میسر نہیں آتا۔ جو اتنے مفلوک الحال ہیں کہ ان کے پاس نہ سواری کے لئے گھوڑا ہے نہ خدمت کے لئے نوکر ہیں۔ جن کے پاس رہنے کے لئے گھر ہے نہ آرام کرنے کے لئے بستر ہے۔ جنہیں پہننے کے لئے کپڑا اور کھانے کے لئے دو وقت کی روٹی میسر نہیں ہے۔ نہ ان کی کوئی تدبیر کام کرتی ہے اور نہ تقدیر ان کا ساتھ دیتی ہے۔ امراء دولت کے نشے میں مست رہتے ہیں اور غریبوں کو اپنے پاس پھٹکنے تک نہیں دیتے۔

یہ پہلا سبق تھا کتاب ہدیٰ کا — کہ ہے ساری مخلوق کنبہ خدا کا
وہی دوست ہے خالق دوسرا کا — خلائق سے ہے جس کو رشتہ ولا کا
یہی ہے عبادت یہی دین و ایماں
کہ کام آئے دنیا میں انساں کے انساں

مشکل الفاظ کے معانی

کتابِ ہدیٰ - ہدایت کی کتاب، مراد ہے قرآن مجید۔
خالقِ دوسرا - دونوں جہانوں کا پیدا کرنے والا۔
خلائق - مخلوقات۔ رشتۂ وِلا کا - محبت کا رشتہ۔

تشریح

سرکارِ دو عالمؐ کی ایک حدیث ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ جو اس کے ساتھ نیکی کرتا ہے، خدا اسے دوست رکھتا ہے۔ اس بند میں اسی حدیث کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ حالیؔ کہتے ہیں کہ قرآن مجید کا پہلا سبق مخلوقِ خدا سے محبت اور اخوت رکھنا ہے۔ اس سے یہی واضح ہوتا ہے کہ ساری مخلوق خدا کا کنبہ ہے۔ وہی شخص حقیقی معنوں میں خدا تعالیٰ کو عزیز ہے جو اس کی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔ عبادات اور دین و ایمان کی روح یہ ہے کہ انسان دنیا میں دوسرے انسانوں کے کام آئے۔ اگر کوئی شخص حقوق العباد پورے نہیں کرتا تو وہ کتنا ہی عابد اور زاہد کیوں نہ ہو، خدا تعالیٰ کی بارگاہ میں پسندیدہ نہیں ہو سکتا۔

نظم اسلامی مساوات کی تلخیص

حالیؔ کی یہ نظم بھی "مسدسِ حالی" سے لی گئی ہے۔ اس میں حالیؔ بتاتے ہیں کہ جب کوئی قوم تباہ و برباد ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے اس کے اُمرا بگڑتے ہیں۔ وہ عقل سے عاری ہو جاتے ہیں اور دین کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیتے ہیں۔ وہ عزت اور ذلت کے تصور سے بے نیاز ہو جاتے ہیں اور جنت اور دوزخ ان کے نزدیک بے معنی الفاظ بن جاتے ہیں۔ وہ مظلوموں کی آہ و زاری سے نہیں ڈرتے اور غریبوں پر رحم نہیں کھاتے۔ وہ ساری عمر عیش و عشرت میں گزار دیتے ہیں۔ وہ ہمیشہ خوابِ غفلت میں پڑے رہتے ہیں اور زندگی کے آخری لمحے تک ہوش میں نہیں آتے۔ وہ قیمتی لباس زیبِ تن کرتے ہیں۔ شاندار گھروں میں رہتے ہیں اور اپنا سارا وقت تفریح میں گزارتے ہیں۔ یہ لوگ ایسے انسانوں کا ساتھ کس طرح دے سکتے ہیں جنہیں سکون و اطمینان کا ایک لمحہ بھی نصیب نہیں ہوتا۔ جن کے پاس سواری کے لئے گھوڑا اور خدمت کے لئے نوکر تو کجا کھانے کو دو وقت کی روٹی بھی نہیں ہوتی۔ قرآن مجید نے تو اخوت اور بھائی چارے کا درس دیا ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ بنی نوعِ انسان خدا کا گھرانہ ہے۔ جس کو انسانوں سے محبت ہے، وہی صحیح معنوں میں خدا کا دوست

ہے۔ عبادت اور دین کی اصل روح یہی ہے کہ انسان دوسرے انسانوں کے ساتھ ہمدردی کرے اور مصیبت میں ان کے کام آئے۔

نظم کا مرکزی خیال

جب کوئی قوم تباہ ہونے لگتی ہے تو سب سے پہلے اس کے اُمرا میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ وہ بنیادی انسانی خوبیوں سے محروم ہو جاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں مجبور اور معذور لوگوں کے لیے شفقت اور محبت نہیں رہتی۔ عیش و عشرت اور گانا بجانا ان کے روزمرہ کے معمولات بن جاتے ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کا ہوا، حالانکہ اسلام نے بھائی چارے، اخوت اور ہمدردی کا سبق دیا تھا اور عیش و عشرت سے دور رہنے کی تلقین کی تھی۔

اکبرالہ آبادی

(۱۸۴۵ء - ۱۹۲۱ء)

رباعیات

تعارف

اکبر الہ آبادی اردو کے طنز نگار شعراء میں ممتاز حیثیت کے مالک ہیں۔ وہ اس دور میں پیدا ہوئے جب برصغیر پاک و ہند میں انگریزوں کے پاؤں مضبوطی سے جم چکے تھے اور انگریزی تہذیب و معاشرت ذہنوں کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ مشرقی اقدار پامال ہو رہی تھیں اور مغربی اندازِ فکر کے زیرِ اثر اپنی ہر چیز حقیر اور گھٹیا محسوس ہونے لگی تھی۔ اکبر الہ آبادی نے اپنی طنزیہ شاعری کی بدولت قوم کو مغربیت کے مضر اثرات سے بچانے کی کوشش کی اور انہیں آزادی اور خود اعتمادی کا درس دیا۔ ان کے اشعار ہماری ملی شاعری کا بہت بڑا سرمایہ ہیں۔

رباعیات کی تشریح

گزرا ہے مری نظر سے سب کا جلوہ
سب سے بہتر ہے روز و شب کا جلوہ
کہتا ہے عجم۔ عجم میں جمؔ ہے موجود
کہہ دو کہ عرب میں دیکھ ربّ کا جلوہ

مشکل الفاظ کے معانی

عجم - غیر عرب - وہ علاقے جو عربی نہیں ہیں۔
جلوہ دیکھنا - مشاہدہ کرنا۔

تشریح

اکبر یہ سمجھتے تھے کہ اسلام جیسے سیدھے سادے اور قابلِ عمل مذہب میں لوگوں نے کئی غیر اسلامی باتیں شامل کر دی ہیں۔ ان غیر اسلامی باتوں

کو "عجم" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں اور اس کے مقابلے میں خالص اسلامی تعلیمات کو "عرب" کی اصطلاح سے بیان کرتے ہیں۔ وہ مسلمانوں کو تعلیماتِ اسلامی کی طرف راغب کرنا چاہتے ہیں اور عجمی خیالات سے بچانا چاہتے ہیں۔

چنانچہ کہتے ہیں کہ میں نے زندگی میں بہت سے تجربے اور مشاہدے کئے ہیں۔ میں نے جو سب سے اچھے مناظر دیکھے ہیں وہ دو ہیں۔ طلوعِ صبح اور غروبِ آفتاب، معجزات کا پیش خیمہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں مناظرِ فطرت کا مشاہدہ ہی سب سے عمدہ اور بہتر ہے۔ یہ مناظر خالقِ کائنات کے وجود کا احساس دلاتے ہیں۔ جوش ملیح آبادی کہتے ہیں۔

ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لئے
اگر رسول نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

خدا کا ذکر کرانے کے بعد عرب و عجم کا تقابل کرتے ہیں۔ عجم والے مسلمان ہونے کے باوجود رندی و شاہد بازی کے رسیا ہیں۔ ان کی سب سے محترم شخصیت بادشاہ جمشید ہے جس کے پاس جامِ جم تھا اور جس میں دنیا کا جلوہ نظر آتا تھا۔ لفظ "عجم" سے پہلا حرف "ع" کاٹ دیا جائے تو باقی "جم" رہ جاتا ہے، لہٰذا عجم والے کہتے ہیں کہ جم تو ہمارے اندر ہی موجود ہے، یعنی شراب نوشی تو ہماری گھٹی میں داخل ہے۔ ان کے مقابلے میں اہلِ عرب کا موقف یہ ہے کہ ہمارے اندر رب موجود ہے۔ "عرب" کا پہلا حرف "ع" کاٹ دیا جائے تو باقی "رب" رہ جاتا ہے۔ لہٰذا ہم رب سے یا دوسرے لفظوں میں مذہب سے بیگانہ نہیں رہ سکتے۔ اس رباعی میں اکبر نے عجم پر عربوں کی دینی فضیلت کا اظہار کیا ہے۔

ایک اور رباعی میں وہ کہتے ہیں۔

معاملہ تھا عرب کا خدائے واحد سے
عجم نے واسطہ رکھا شراب و شاہد سے
ادھر تھی حمدِ خدا ہی سے آشتی دل کو
ادھر تھی بحث نزاعِ حمید و حامد سے

(۲)

مجلس میں خیالِ بادہ نوشی پایا
مکتب میں سر سخن فروشی پایا
مسجد میں اگرچہ امن تھا اے اکبرؔ
لیکن اک عالمِ خموشی پایا

مشکل الفاظ کے معانی

بادہ نوشی ۔ شراب نوشی ۔ مکتب ۔ مدرسہ
سخن فروشی ۔ بحث و مباحثہ ۔
عالمِ خموشی ۔ خاموشی کی حالت ۔

تشریح

اکبر الہ آبادی مسلمانوں کے ہمہ جہت زوال پر کڑھتے رہتے تھے ۔ برصغیر میں مسلمانوں کے سیاسی زوال کے ساتھ ہی مذہبی اور اخلاقی اقدار بھی پامال ہونے لگیں ۔ تو انہوں نے اپنے طنزیہ اشعار سے مسلمانوں کو اس صورتِ حال کا احساس دلانے کی کوشش کی ۔ ایک تنکا ایک سیلابِ عظیم کو تو کیا روکتا مگر اکبر الہ آبادی کی کوشش بہرحال قابلِ تحسین ہے ۔

اس رباعی میں وہ کہتے ہیں کہ جدید تعلیم یافتہ لوگ جب مجالس میں بیٹھتے ہیں تو انگریزوں کی تقلید میں شراب ضرور پیتے ہیں گویا شراب نوشی ان مجالس کا ایک لازمی جزو ہے ۔ یہ لوگ ملک اور قوم کی بھلائی کے بارے میں کیا سوچیں گے ؟ ۔ پرانی وضع کے دینی مدرسوں کی حالت یہ ہے کہ تقریریں اور مباحثے وغیرہ ہوتے ہیں ، فصاحت و بلاغت کے دریا بہائے جاتے ہیں ، لیکن عملی طور پر وہاں بھی کچھ نہیں ہوتا ۔ مجلسیں اور مدرسے اجتماعی مقامات تھے اس دور میں ان سے بھلائی کی توقع رکھنا عبث ہے ۔ اب رہ گئی مسجد ، جہاں لوگ نماز کے لئے جمع ہوتے ہیں ، تو وہاں شراب نوشی نہیں ہوتی ، بے کار تقریریں نہیں ہوتیں ، لیکن اہلِ مسجد اس طرح خاموش ہیں جیسے ان کے پاس کہنے کے لئے کوئی بات ہی نہیں ۔ ان کے نزدیک قوم و ملک کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو حل طلب ہو اور جس پر وہ اپنی رائے کا اظہار کر سکیں ۔ اس رباعی میں اکبرؔ نے دینی حلقوں کی بے حسی پر طنز کیا ہے اور کہا ہے کہ یہ لوگ عوام کے لئے کچھ کر سکتے ہیں لیکن انہوں نے چپ سادھ رکھی ہے اور حالات

کے ساتھ سمجھوتہ کر لیا ہے۔

۳

لے جاؤں لحد میں اپنا اسلام بخیر
لکھیں یارب مَلک مرا نام بخیر
اسلام سے جس نے بے وفائی کی ہے
پایا نہیں میں نے اُس کا انجام بخیر

مشکل الفاظ کے معانی

لحد - قبر - مَلک - فرشتے -
انجام - آخیر -

تشریح مغربی تہذیب کے ہاتھوں اسلام کی دھجیاں اڑتی دیکھ کر اکبرؔ پریشان ہو جاتے تھے - دنیا کا دستور ہے کہ مفتوح قومیں، فاتح قوموں کی تہذیب و معاشرت کی گرویدہ ہو جاتی ہیں اور انہیں اپنی ہر چیز - زبان - مذہب - ثقافت وغیرہ حقیر دکھائی دینے لگتی ہے - یہی کچھ برصغیر میں ہوا - مسلمان مذہب سے بیگانہ ہو کر انگریزوں کے طور طریقے اپنانے لگے - یہ صورت حال اکبرؔ کے لئے بڑی تکلیف دہ تھی -

وہ کہتے ہیں کہ اے خدا - مجھے توفیق دے کہ میں اسلامی اقدار کے ساتھ وفادار رہوں اور مجھ سے اسلام کا دامن چھوٹ نہ جائے - موت کا فرشتہ جب مری جان لینے آئے تو وہ حالت ایمان میں میری جان نکالے اور مرنے کے بعد جب نکیرین میرے پاس آئیں تو میرا نام مسلمانوں کی فہرست میں لکھیں - جس قوم نے اسلام کے ساتھ بے وفائی کی ہے اس کا انجام اچھا نہیں ہوا - تاریخ عالم گواہ ہے کہ جب مسلمانوں نے اسلامی شعائر کو ترک دیا اور پاکیزگی اور طہارت کی زندگی کو خیر باد کہہ دیا تو ان کو زوال نے گھیر لیا اور ان کی عظیم الشان حکومتیں دیکھتے ہی دیکھتے تباہی اور بربادی کا شکار ہو گئیں -

۴

شیطان سے دل کو ربط ہو جاتا ہے
دشوار انسان کو ضبط ہو جاتا ہے
حد سے جو سوا ہو حرص یا خود بینی
اکثر ہے یہی کہ خبط ہو جاتا ہے

مشکل الفاظ کے معانی

ربط۔ تعلق
ضبط۔ اپنے آپ پر قابو رکھنا۔
حرص۔ لالچ۔
خود بینی۔ غرور
خبط۔ جنون۔ پاگل پن۔
حد سے سوا ہو۔ حد سے بڑھ جائے۔

تشریح

شیطان برائی کا نمائندہ ہے۔ جب انسان کے دل میں برائی آجاتی ہے تو وہ اپنی نفسانی خواہشات کے تابع ہو جاتا ہے

ایسی صورت میں انسان کے لیے اپنے آپ کو سنبھالنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اس کی طمع اور لالچ یا اس کا خود پسندی اور غرور اس حد تک بڑھ جاتا ہے کہ اس کی دانش اور عقل جواب دے جاتی ہے۔ وہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لئے ایسی ایسی حرکات کرنے لگتا ہے کہ وہ ایک عقل مند انسان کی بجائے دیوانہ اور پاگل دکھائی دینے لگتا ہے۔

اس رباعی میں اکبر نے ایک اخلاقی سبق دیا ہے اور وہ یہ کہ انسان کو اپنے ذاتی فائدے یا غرور اور تکبر کے مظاہرے میں پاگل پن کی حد تک نہیں بڑھنا چاہیے۔ اسے اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے اور شیطانی قوتوں کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔

(۵)

کچھ منع نہیں ہر اک کی تحریر پڑھو
لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
عظمت دنیا کی جب دبائے دل کو
خالق کا کرو خیال، تکبیر پڑھو

مشکل الفاظ کے معانی

تفسیر۔ قرآن مجید کی شرح۔
خالق۔ پیدا کرنے والا

تشریح برصغیر میں جب انگریز آئے تو اپنے ساتھ جدید علوم بھی لائے۔ مغربی سائنس اور فلسفہ نے نوجوانوں کو تشکیک کا شکار بنا کر مذہب سے بے گانہ کر دیا۔ بعض لوگوں نے انگریزی تعلیم کی اسی بنا پر شدید مخالفت کی۔ ہمارے علماء نے کہا کہ جو انگریزی پڑھے گا، وہ کرسٹان (عیسائی) ہو جائیگا۔ لیکن اکبر انگریزی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ وہ ان لوگوں کے مخالف ضرور تھے جو انگریزی پڑھ کر اپنی تہذیب و معاشرت کو حقیر اور گھٹیا جاننے لگے تھے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ جو علوم و فنون تمہاری دسترس میں ہیں، انہیں حاصل کرو۔ میں ان کا مخالف نہیں ہوں، لیکن اپنے مذہب کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھو۔ قرآن مجید کی تفسیر پڑھو تاکہ تم اسے بہتر طریق پر سمجھ سکو اور تمہارے دل میں جو شکوک و شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ رفع ہو جائیں اور جب کبھی تمہارے دل میں یہ خیال آئے کہ جدید تعلیم نے لوگوں کو اعلیٰ مقامات پر فائز کر دیا ہے اور دین سے بیگانگی ان کی عظمت کا سبب بن گئی ہے۔ تو اللہ کو یاد کیا کرو اور تکبیر (یعنی اللہ اکبر)، کا ورد کیا کرو تاکہ یہ باطل خیالات تمہارے دل سے نکل جائیں۔ اگر مغربی تعلیم نے لوگوں کو مادی ترقی سے ہم کنار کیا ہے تو مغربی تعلیم کی بجائے انداز یعنی محنت اور کوشش کی بنا پر ایسا ہوا ہے۔ مذہب کسی شخص کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ نہیں بنتا۔ اس لئے مسلمان نوجوانوں کی ترقی کی خاطر مذہب سے بیگانہ نہیں ہونا چاہیئے۔

کانفرنس

تعارف

یہ نظم ایک طویل نظم کا اقتباس ہے۔ اس کا عنوان مرتبین کا اپنا تجویز کردہ ہے کیونکہ کلیات اکبر" میں یہ نظم بغیر عنوان کے درج ہے۔ اس کے مجموعی تاثر سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں سرسید کی قائم کردہ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس پر طنز کی گئی ہے۔ ہیئتی اعتبار سے یہ قطعہ بند نظم ہے۔ ہر قطعہ (بند) چار چار مصرعوں پر مشتمل ہے اور ہر بند کے تمام مصرعے باہم ہم قافیہ وہم ردیف ہیں۔

کانفرنس احباب سے پُر ہے
جو صف ہے وہ سلکِ دُر ہے
سب کو یاد استاد کا گُر ہے
دلکش ہر اسپیچ کا سُر ہے

مشکل الفاظ کے معانی

کانفرنس ۔ مشورے کی مجلس ۔ احباب ۔ دوست ۔ پُر ۔ بھری ہوئی ۔ صف ۔ قطار ۔ سلکِ دُر ۔ موتی کی لڑی ۔ استاد کا گُر یاد ہونا ۔ ہوشیار اور چالاک ہونا ۔ اسپیچ ۔ تقریر ۔ سُر ۔ راگ ۔ مترنم آواز ۔

تشریح

سرسید احمد خان نے مسلمانوں کے تعلیمی مسائل کے بارے میں غور کرنے کے لئے ایک اجلاس بُلایا تھا۔ اس نظم میں اکبر نے اس اجلاس پر طنز کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس اجلاس میں دوست احباب جمع ہیں۔ ساری نشستیں پُر ہو چکی ہیں۔ شرکاء میں سے ہر شخص اپنی شخصیت اور اہمیت کے اعتبار سے کسی موتی سے کم نہیں۔ اسی لئے شاعر نے ہر قطار کو موتیوں کی لڑی کہا ہے۔ اس کانفرنس

میں شریک سب حضرات بڑے ہوشیار اور تیز طرّار ہیں، اس لیئے انہوں نے بڑی عمدہ تقریریں کی ہیں۔ ہر ایک نے قوم کے لئے بڑی سے بڑی قربانی دینے کا وعدہ کیا ہے۔ مالی اعانت کا عہد کیا ہے اور جان تک نثار کرنے کا اعلان کیا ہے۔ یہ باتیں سامعین پر بڑی مؤثر ثابت ہوئی ہیں اس لئے انہیں بہت پسند آئی ہیں۔

قومی ترقی کی رادھا پیاری
بیٹھی ہے پہنے جوڑا بھاری
نو من تیل کی فکر ہے طاری
چندے کی تحصیل ہے جاری

مشکل الفاظ کے معانی رادھا۔ ہندوؤں کے مذہبی رہنما کرشن جی کی ایک پیاری گوپی (گوالن)، یا محبوبہ۔ بھاری جوڑا۔ قیمتی لباس۔ نو من تیل۔ مثل مشہور ہے کہ نہ نو من تیل ہوگا نہ رادھا ناچے گی۔ رادھا رقاصہ بھی تھی۔ نو من تیل سے چراغاں ہوتا تو پھر وہ ناچتی۔ مثل کا مفہوم یہ ہے کہ نہ شرط پوری ہوگی۔ نہ کام ہوگا۔ تحصیل۔ حاصل کرنا۔

تشریح اس کانفرنس میں جتنے رہنما شریک ہیں، وہ قومی ترقی کے بارے میں سوچ رہے ہیں، لیکن اس کے لئے شرط یہ ہے کہ پہلے مناسب رقم جمع ہو۔ اس مفہوم کو شاعر نے ایک تشبیہ کے ذریعے خوبصورت طریقے سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ قومی ترقی مہاراج کی گوپی رادھا کی مانند ہے، جو عمدہ لباس پہنے ہوئے ہے اور ناچنے کے لئے تیار ہے لیکن اسکی شرط یہ ہے کہ پہلے نو من تیل لایا جائے اور اس سے چراغ روشن کئے جائیں۔ یہ بڑی کڑی شرط ہے۔ قومی ترقی بھی ممکن ہے، لیکن اس کے لئے لاکھوں کا سرمایہ چاہیئے، اس لئے حاضرین سے چندے کی درخواست کی جارہی ہے۔

جاڑے کا موسم پھولے پھالے ۔ جمع ہیں ممبر بھولے بھالے
چندہ دے کر پھنس نہ جائیں ۔ آنکھیں پھاڑے دانت نکالے

مشکل الفاظ کے معانی بھولے بھالے۔ سادہ
سردی کے موسم میں گرم

دانت نکالنا۔ ہنسنا۔ آنکھیں پھاڑنا۔ غور سے دیکھنا۔

تشریح اس کانفرنس میں مقررین کے علاوہ کچھ شہر کا موجود سادہ اور شریف لوگ ہیں۔ انہوں نے سردیوں کی مناسبت سے گرم لباس پہنے ہوئے ہیں اور بھولے بھولے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے کانفرنس کو چندہ دے دیا ہے اور اب مسکرا کر اِدھر اُدھر غور سے دیکھ رہے ہیں کہ اور لوگ بھی چندہ دے رہے ہیں یا ہم ہی چندہ دے کر پھنس گئے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ زیادہ چندہ جمع نہیں ہو رہا۔ صرف یہی لوگ بے چارے پھنسے ہوئے ہیں

بعض ہیں بادہ و جام کے خواہاں

بعض نمود و نام کے خواہاں

بعض فقط آرام کے خواہاں

کم ہیں فیضِ عام کے خواہاں

مشکل الفاظ کے معانی بادہ۔ شراب۔ جام۔ شراب کا پیالہ۔
خواہاں۔ خواہش کرنے والے

نمود و نام۔ دکھاوا اور شہرت۔ فیضِ عام۔ عام لوگوں کی بھلائی۔

تشریح یہ کانفرنس تو عام لوگوں کی بھلائی کے لیے بلائی گئی تھی، لیکن بہت کم لوگ اس کے مقصد کے ساتھ مخلص ہیں۔ صورتِ حال یہ ہے کہ بعض لوگ اس پلیٹ فارم کو اپنے ذاتی عیش و عشرت کے لیے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ کانفرنس ہو گی تو وہاں انگریزی طرزِ معاشرت اور آدابِ محفل کے مطابق شراب بھی پیش ہو گی۔ اور وہ جی بھر کر پی سکیں گے۔ کچھ لوگ ایسے ہیں جو کانفرنس میں کھوکھلی تقریریں کر کے اپنی ذاتی شہرت اور نمائش میں اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ لوگ انہیں قوم کے خیر خواہ اور محسن خیال کریں، حالانکہ انہوں نے ایک کوڑی بھی چندہ میں نہیں دی۔ کچھ اور لوگ ہیں جو کانفرنس کے ذریعے اپنا ذاتی آرام و آسائش حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بہت کم لوگ ایسے ہیں جو حقیقت میں قوم کی بھلائی چاہتے ہیں اور دل سے اس کے خیر خواہ ہیں۔

مدعیان رونق دیں ہیں

لیکن باہم بر سرِ کیں ہیں

واقف فن و ہنر سے نہیں ہیں

کم ہیں ان میں جو آخر بیں ہیں

مشکل الفاظ کے معانی

مُدعیانِ رواجِ دیں۔ دین کی ترقی کے دعوےدار۔
برسرِ کیں۔ کینہ اور دشمنی رکھنے والے۔
آخر بیں۔ انجام پر نظر رکھنے والے۔

تشریح

یہ لوگ جو کانفرنس میں شریک ہیں انہیں یہ دعویٰ ہے۔ کہ وہ دین کی ترقی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن ان کا حال یہ ہے کہ آپس میں بھی اتفاق اور اتحاد سے نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ہر وقت ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے قومی ترقی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔ ان میں کوئی شخص ایسا نہیں جو کسی ہنر یا فن میں ماہر ہو۔ یہ سائنسی دور ہے۔ قوموں کی ترقی ٹیکنیکل ترقی کے ساتھ وابستہ ہے، لیکن یہ لوگ اس میدان میں بالکل کورے ہیں۔ یہ ایسے لوگ ہیں جو کسی کام کے انجام پر نظر نہیں رکھتے۔ یہ جذباتی ہو کر فیصلے کر لیتے ہیں۔ بغیر یہ سوچے کر ان فیصلوں کا انجام کیا ہو گا۔

دوڑاؤ تدبیر کے ریشے قوم میں پھیلیں فن اور پیشے
صنائی کے چلاؤ تیشے تاکہ کٹیں افلاس کے بیشے

مشکل الفاظ کے معانی

تدبیر کے ریشے دوڑانا۔ تدبیریں سوچنا۔
فن۔ فنی علوم۔ صنائی۔ دستکاریگری۔ بیشے۔ جنگل۔

تشریح

اس بند میں اکبر کہتے ہیں کہ اے کانفرنس منعقد کرنے والو۔ صرف زبانی باتیں نہ بناؤ۔ عملی طور پر بھی کچھ کرو۔ ایسی تدبیریں سوچو، ایسے منصوبے بناؤ، جن سے قوم فنی تعلیم کی طرف مائل ہو اور وہ عملی زندگی میں ان کے کام آئے۔ جو تعلیم تم دینا چاہتے ہو اس سے قومی فلاح و بہبود حاصل نہیں ہو گی۔ کسی قوم کی ترقی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ قوم کے افراد ٹیکنیکل کاموں میں کتنے ماہر ہیں۔ یورپ کی ساری ترقی اس کی صنعتی ترقی کے سبب سے ہے۔ اس لئے قوم کو صنعتی محاذ کی طرف راغب کرو، اور اس میدان میں انکی تربیت کا اہتمام بھی کرو، تاکہ غربت کے جنگل کاٹے جا سکیں۔ یعنی قوم کی غربت دور کی جا سکے۔

تم ہو فکر جاہ میں الجھے شہرت و شان کی چاہ میں الجھے
نافہموں کی واہ میں الجھے دل کیوں کر اللہ میں الجھے

مشکل الفاظ کے معانی

جاہ۔ مرتبہ۔ منصب۔
چاہ۔ خواہش۔ محبّت۔ نافہم۔ ناسمجھ
اللہ۔ مراد اللہ تعالیٰ کا ذکر۔

تشریح

اس بند میں بھی شاعر نے کانفرنس کے منتظمین ہی کو مخاطب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تم لوگ اپنے مقصد کے ساتھ مخلص نہیں ہو۔ تم اس کانفرنس کے پلیٹ فارم کو اپنا مرتبہ بڑھانے اور اعلیٰ منصب حاصل کرنے کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہو۔ تم چاہتے ہو کہ لوگوں میں تمہاری شہرت ہو اور تمہاری شان بڑھے۔ ناسمجھ لوگ تمہاری باتیں سن کر واہ واہ کرتے ہیں اور تم اپنی تعریف سُن کر خوش ہوتے ہو۔ ایسی صورت حال میں نہیں خدا کس طرح یاد آئے؟ ۔ خدا یاد آتا تو تم راہ مستقیم اختیار کرتے۔ مسلمانوں کے مفاد کو دلی طور پر عزیز رکھتے اور حقیقتاً ان کی بہتری کے لئے سوچتے۔ لیکن افسوس ہے کہ ایسا نہیں ہو رہا۔ تم خلوص دل سے قوم کے ہی خواہ نہیں ہو۔

خالق کی توحید سکھاؤ عقبیٰ کی تمہید سکھاؤ
ملحد کی تردید سکھاؤ روحانی امید سکھاؤ

مشکل الفاظ کے معانی

خالق۔ اللہ تعالیٰ۔ دنیا کی تخلیق کرنے والا۔
عقبیٰ۔ آخرت۔ تمہید۔ آغاز۔ ملحد۔ بے دین۔

تشریح

اس بند میں بھی شاعر نے کانفرنس سے متعلقہ لوگوں کو خطاب کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ قومی ترقی کا راز اس بات میں پوشیدہ ہے کہ وہ اپنی مذہبی اقدار کو پیش نظر رکھیں اور کسی حالت میں بھی مذہب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب کے ساتھ وابستگی بھی نہایت ضروری ہے۔ کانفرنس کا اہتمام کرنے والوں کو یہ بھی چاہیئے کہ لوگوں کو یہ بھی یاد دلائیں کہ کائنات کا خالق ایک ہے۔ اور وہی انسان کی ساری ضرورتیں اور حاجتیں پوری کرنے والا ہے۔ وہی ہے جو قوموں کو عزت اور ذلّت سے دوچار کرتا ہے لہٰذا اس کے احکام کی پابندی کرو۔ آخرت کو پیش نظر رکھو۔ مغربیت کے سیلاب میں یہ مت بھولو کہ تم نے ایکدن اللہ تعالیٰ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کے لئے جوابدہ ہونا ہے۔ الحاد اور بے دینی کی روک تھام کرو اور قوم کو روحانیت کی طرف لاؤ۔ کیونکہ خالی مادیت پرستی قوم کو تباہ کر دے گی۔ وہ تعلیم جو

مادیت اور روحانیت میں توازن پیدا نہیں کرتی۔ کسی کام کی نہیں ہے۔

نظم کی تلخیص

مسلمان اکابرین نے تعلیمی مسائل پر غور کے لیے ایک کانفرنس بلائی تھی۔ اکبرالٰہ آبادی نے اس کانفرنس پر اپنے طنزیہ انداز میں تنقید کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس کانفرنس میں جو لوگ جمع ہیں وہ قومی مفادات کے ساتھ مخلص نہیں ہیں۔ وہ اس پلیٹ فارم کو اپنی ذاتی شہرت اور نام ونمود کے لئے استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ کسی فن یا ہنر سے واقف نہیں ہیں۔ یہ عاقبت نااندیش لوگ ہیں۔ ان سے کسی قسم کی قومی بھلائی کی توقع بے سود ہے۔ یہ دین کی خدمت کے دعویدار ہیں لیکن ان کا حال یہ ہے کہ ان میں آپس میں بھی اتفاق اور اتحاد نہیں ہے۔ یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں اور ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ وہ کانفرنس کے منتظمین کو مشورہ دیتے ہیں کہ جس طرح کی تعلیم تم دینا چاہتے ہو وہ بیکار ہے۔ قوم کو صنعتی اور فنی تعلیم کی طرف راغب کرو۔ پیشہ ورانہ تعلیم ہی سے مسلمانوں کی غربت دور ہو سکتی ہے اور ان کی مالی حالت مضبوط بن سکتی ہے، لیکن اس کے ساتھ یہ بھی یاد رکھو کہ اگر تم نے دین کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا تو تم کہیں کے نہ رہو گے۔ صنعتی طور پر ترقی بھی کرو اور اپنے دین کے ساتھ وابستہ رہ کر مغربی الحاد اور بے دینی کا مقابلہ بھی کرو۔

اکبر الہ آبادی

متفرق اشعار

ہم ایسی کل کتابیں قابلِ ضبطی سمجھتے ہیں
کہ جن کو پڑھ کے لڑکے باپ کو خبطی سمجھتے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی قابلِ ضبطی ۔ ضبط کرنے کے قابل ۔ خبطی ۔ پاگل ۔ دیوانہ ۔

تشریح اس شعر میں شاعر نے مغربی تہذیب کے اثرات پر بھرپور طنز کیا ہے۔ انگریزوں کی سیاسی فتح کے بعد برصغیر پاک و ہند میں انگریزی تعلیم کا دور دورہ ہوا۔ انگریزوں کا مقصد یہاں کے لوگوں کو صرف زیورِ تعلیم سے آراستہ کرنا نہ تھا بلکہ وہ انہیں ذہنی طور پر مرعوب کر کے ان کو اپنے ڈھب پر لانا چاہتے تھے تاکہ ان کی حکومت کو چلانے کے لیے کل پرزے حاصل ہوتے رہیں۔ اس نئی تعلیم نے نوجوانوں کے ذہنوں پر بڑے گہرے اثرات چھوڑے۔ اور انہیں اپنی ہر چیز حقیر اور گھٹیا نظر آنے لگی۔ انہیں اپنی دینی اور اخلاقی روایات سے نفرت ہو گئی۔ جو انہیں اس طرف لانے کی کوشش کرتا وہ اسے دقیانوسی۔ اور پاگل قرار دیتے۔ اور اس کے مقابلے میں اپنے آپ کو روشن خیال اور تہذیبِ جدید کا نمائندہ تصور کرتے۔ یہاں تک کہ اگر باپ بیٹے کو نصیحت کرتا اور اسے اپنی معاشرتی اور تہذیبی روایات اور دینی عقائد کی طرف راغب کرنے کی کوشش کرتا تو بیٹا اسے بھی پاگل اور خبطی کہنے سے گریز نہ کرتا۔ اکبر کو اپنی مشرقی اقدار کی یہ پامالی انتہائی ناگوار گزرتی تھی اور وہ کہتے ہیں کہ ایسی تمام کتابیں قانونی طور پر ضبط کر لینی چاہئیں۔ ان پر پابندی لگ جانی چاہیے۔ جنہوں نے ہمارے اخلاقی نظام کی بنیادیں ہلا دی ہیں۔

تھی شبِ تاریک۔ چور آئے۔ جو کچھ تھا لے گئے
کر ہی کیا سکتا تھا بندہ کھانس لینے کے سوا

مشکل الفاظ کے معانی

شبِ تاریک۔ اندھیری رات

تشریح

رات اندھیری تھی۔ اندھیرے سے فائدہ اٹھا کر چور گھر میں گھس آئے اور جو کچھ گھر میں تھا سب سمیٹ کر لے گئے۔ مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ اٹھ کر چور کو پکڑ لیتا۔ میں صرف کھانستا رہا تاکہ چور سمجھیں کہ صاحبِ خانہ جاگ رہا ہے اور خود ہی ڈر کے مارے بھاگ جائیں۔

یہ شعر سیاسی پس منظر بھی رکھتا ہے۔ شبِ تاریک سے مراد وہ حالات ہیں جن سے یہ ملک انگریزوں کی آمد سے پہلے دوچار تھا۔ ہر طرف افراتفری تھی۔ سیاسی استحکام ناپید تھا۔ لوگوں کی جان و آبرو غیر محفوظ تھی۔ چوریاں، ڈاکے، قتل روزمرہ کا معمول تھے۔ چور یہ انگریز ہیں جو اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھا کر ملک میں گھس آئے۔ انہیں یہ ملک سونے کی چڑیا نظر آیا۔ اور انہوں نے یہاں لوٹ کھسوٹ مچا دی۔ جو چیز ہاتھ لگی اسے انگلستان لے گئے۔

ہم برصغیر میں رہنے والے ان کی کوئی مزاحمت نہ کر سکے۔ ان کے ہاتھ نہ روک سکے۔ کبھی کبھی کوئی چھوٹی موٹی تحریک شروع ہو جاتی تھی جس سے ہم صرف یہ ثابت کرتے تھے کہ ہم جاگ رہے ہیں اور ہم ساری صورتِ حال سے آگاہ ہیں۔

دل کو بھی ان کے ملنے سے بہتر ہے احتراز
ملتے نہیں جو رات کو اپنے مکان پر

مشکل الفاظ کے معانی

احتراز۔ گریز۔ پرہیز۔

تشریح

انگریز اپنے حکومتی افسروں کی تربیت اس طرح کرتے تھے کہ وہ عام لوگوں سے میل جول نہ رکھیں اور ان سے الگ تھلگ رہیں تاکہ ان کا رعب و دبدبہ قائم رہے۔ یہ افسران دن دفتروں میں گزارتے تھے اور راتوں کا زیادہ حصہ کلبوں میں

صرف کرتے تھے۔ اس لیے وہ رات کو گھر میں نہیں ہوتے تھے۔ کچھ لوگ جو اپنے آپ کو معززین میں شمار کرتے تھے وہ تحفے تحائف لے کر رات کو ان افسروں کے بنگلوں پر جاتے تھے۔ تاکہ لوگ سمجھیں کہ ان کا افسرانِ بالا سے رابطہ ہے اور اس طرح معاشرے میں ان کی عزت بڑھے۔ لیکن یہ افسران اول تو گھر پہ ہوتے ہی نہ تھے۔ اگر موجود بھی ہوتے تو ان لوگوں سے ملنے سے انکار کر دیتے۔ اگر رات کو افسرانِ بالا گھر پر نہ ملتے تو یہ لوگ صبح پھر ان کے بنگلوں پہ جا موجود ہوتے اکبر ایسے لوگوں پر طنز کر رہے ہیں کہ اگر تو صاحب لوگ رات آپ کو نہیں ملے تو ان کی ملاقات کا ارادہ ترک کر دو کیوں بار بار ان کے پاس جا کر ذلیل و خوار ہوتے ہو۔

نہیں کچھ اس کی پرسش الفت اللہ کتنی ہے
یہی سب پوچھتے ہیں آپ کی تنخواہ کتنی ہے

مشکل الفاظ کے معانی پُرسش۔ پوچھنا

تشریح انگریزی تہذیب نے لوگوں کو مادہ پرست بنا دیا ہے ہمارے ہاں کسی شخص کی شرافت اور بڑائی کا معیار یہ ہوتا تھا کہ وہ شخص کتنا دین دار ہے۔ مذہب کے ساتھ اس کی وابستگی کتنی ہے وہ کہاں تک احکامِ الٰہی اور سنتِ رسول کی پیروی کرتا ہے لیکن اب مادہ پرستی کے سبب یہ معیار تبدیل ہو گیا ہے اور اب وہ شخص معزز ہے جس کے وسائل زیادہ ہیں۔ جس کے پاس کاریں۔ بنگلے اور بنک بیلنس ہے۔ اب یہ کوئی نہیں پوچھتا کہ فلاں شخص کتنا پرہیز گار اور متقی ہے بلکہ یہ پوچھتے ہیں کہ اس کی آمدنی کے وسائل کتنے ہیں۔ اور ہر مہینے وہ کتنے روپے کما لیتا ہے۔

شوقِ لیلائے سول سروس نے مجھ مجنوں کو
اتنا دوڑایا لنگوٹی کر دیا پتلون کو

مشکل الفاظ کے معانی لیلائے سول سروس۔ سول سروس کو لیلیٰ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ مجنوں۔ وہ دیوانہ جو لیلیٰ کا عاشق تھا۔

لنگوٹی۔ کپڑے کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا جس سے ستر ڈھانپتے ہیں۔

تشریح انگریزوں نے برصغیر پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لئے ایک انتظامی

ڈھانچہ قائم کیا تھا جس کا نام انڈین سول سروس تھا۔ وہ لوگ جو اس سروس میں جاتے تھے۔ وہ صرف نام کے ہندوستانی ہوتے تھے۔ ورنہ ان کا رہن سہن، ان کا لباس، ان کی زبان، ان کے دیگر مشاغل سب انگریزوں کے سے تھے۔ اس دور میں پڑھے لکھے نوجوانوں کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ وہ کسی نہ طرح اس سروس میں چلے جائیں۔ اور ان مراعات سے فائدہ اٹھائیں جو اس سروس سے مخصوص تھیں۔

اس شعر میں اکبر کہتے ہیں کہ میری حیثیت مجنوں کی سی ہے جو لیلا کا دیوانہ تھا۔ میں سول سروس کی لیلیٰ کو حاصل کرنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ مگر جس طرح لیلیٰ مجنوں کے ہاتھ نہیں لگی تھی۔ اسی طرح میں سول سروس کو حاصل نہیں کر سکا۔ اس سلسلہ میں میں نے بڑی جدوجہد کی ہے۔ بڑی دوڑ بھاگ سے کام لیا ہے۔ میں نے انگریزی لباس پہنا۔ انگریزی انداز معاشرت اختیار کئے لیکن نتیجہ کچھ نہ نکلا اور آخر کار مجھے اپنے ہی غریبانہ طرز زندگی کی طرف لوٹنا پڑا۔

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے
اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

مشکل الفاظ کے معانی

اپنی گرہ سے ۔ اپنی طرف سے۔

تشریح

انگریز برصغیر میں آئے تو اپنے ساتھ مؤثر ذرائع ابلاغ بھی لائے۔ ان میں ایک ذریعہ اخبارات تھے۔ اخبارات جن لوگوں کی خبریں چھاپتے ان کو معاشرے میں معززین شمار کیا جاتا تھا۔ اور ان کی قدر و منزلت کی جاتی تھی۔ اس لئے ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی تھی کہ اس کا ذکر اخبارات میں ہو۔ اسکی کئی صورتیں ہو سکتی تھیں۔ کسی کے نام کا کوئی مضمون چھپ سکتا تھا۔ کسی کے بارے میں کوئی خبر شائع ہو سکتی تھی۔ کسی کا ذکر ادارتی نوٹ میں ہو سکتا تھا مقصد صرف نام کا شائع ہونا تھا۔ اس شعر میں نام و نمود کا ایک طالب اخبار کے ایڈیٹر سے گذارش کر رہا ہے کہ اگر آپ میرا نام اخبار میں چھاپ دیں تو اس پر آپ کا کچھ خرچ نہیں آئیگا۔ میرا کام بن جائے گا اور میرے گرد و پیش میں میری عزت بن جائیگی۔ اس لئے مجھ پر کرم کیجئے اور جس طرح ہو سکے میرا نام چھاپ دیجئے۔

کچھ دیکھتا نہیں میں دلِ زار کے لئے
جو کچھ یہ ہو رہا ہے سب اخبار کے لئے

مشکل الفاظ کے معانی

دلِ زار۔ دکھوں کا مارا ہوا دل۔

تشریح

اس شعر میں اکبر نے ان لوگوں پر طنز کیا ہے جو اپنی ذاتی نمود و نمائش کے لئے سماجی کارکنوں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ وہ اپنی ذاتی پریشانیوں اور مصیبتوں کو بالائے طاق رکھ کر دن رات فلاحی اور سماجی خدمت میں مصروف رہتے ہیں تاکہ ان کا نام اخبار میں چھپ جائے اور لوگوں کی نظروں میں وہ قابلِ احترام بن جائیں۔

اس شعر میں نام و نمود کی خواہش کا مارا ہوا ایک شخص کہہ رہا ہے کہ میرے اپنے بھی بہت سے مسائل ہیں لیکن میں ان کی پروا نہیں کرتا۔ میرا دل دکھوں اور پریشانیوں کا شکار ہے لیکن میں نے اس کو بھی نظر انداز کیا ہوا ہے اور مسلسل لوگوں کی خدمت میں مصروف ہوں۔ میں یہ سب کچھ اس لئے کر رہا ہوں تاکہ میرا نام اخبار میں چھپ جائے اور میں معززینِ شہر میں شمار ہونے لگوں۔

ہوئے اس قدر مہذب کبھی گھر کا منہ نہ دیکھا
کٹی عمر ہوٹلوں میں، مرے ہسپتال جا کر

تشریح

ہماری معاشرتی زندگی میں گھر کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ جب انسان دن کا تھکا ہارا گھر لوٹتا ہے تو ایک وفا شعار بیوی اس کا استقبال کرتی ہے۔ یہاں اس کے شفیق والدین ہیں اور پیارے بچے ہیں۔ کھانے کے وقت سب مل جل کر کھانا کھاتے ہیں۔ اگر کوئی بیمار پڑ جائے تو سارا گھر اس کی تیمارداری کے لئے حاضر ہوتا ہے۔ لیکن انگریزی تعلیم، تہذیب اور معاشرت نے ہمیں گھر سے لاتعلق کر دیا ہے۔ اور اس طرح ہماری معاشرتی زندگی کی بنیاد ہلا دی ہے۔ اب صورت یہ ہے کہ نئے تعلیم یافتہ اور تہذیب جدید کے دلدادہ کھانے کے وقت گھر میں کھانا کھانے کی بجائے ہوٹلوں کا رخ کرتے ہیں اور اگر بیمار پڑ جائیں تو ہسپتالوں کو جاتے ہیں اور اکثر وہیں دم توڑ دیتے ہیں۔

اکبر کی شاعری کا اکثر حصہ مغربی تہذیب و معاشرے اور اس کے اثرات پر بھرپور طنز ہے نصاب میں دیئے گئے، متفرق اشعار بھی اسی قبیل کے ہیں۔

یہ ان کا کورس کیا کم ہے کہ میں بھی کچھ کہوں ان سے
مری جانب سے بس کالج کے لڑکوں کو دعا کہیئے

مشکل الفاظ کے معانی | کورس ۔ تعلیمی نصاب

تشریح | اکبر مغربی تعلیم کے مخالف نہیں تھے۔ اس کے مضر اثرات کے مخالف تھے۔ ان لوگوں کو ناپسند کرتے تھے جو مغربی تعلیم حاصل کر کے اپنی ہر چیز کو حقیر اور گھٹیا تصور کرنے لگتے ہیں۔ اور اس کا سبب یہ تھا کہ کالج میں لڑکوں کو جو نصاب پڑھنے کے لیے دیا جاتا ہے وہ انہیں اپنی تہذیبی روایات سے متنفر کر دیتا ہے۔ اکبر نے اپنے کئی شعروں میں کالج کی تعلیم کو طنز کا نشانہ بنایا ہے۔ مثلاً وہ کہتے ہیں۔ ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

زیر نظر شعر میں وہ کہہ رہے ہیں کہ کالج کے لڑکے اپنے تعلیمی نصاب کی طرف توجہ کریں یا میری بات سنیں۔ ان کا نصاب ان کے لیے بڑا پرکشش ہے جب کہ میری باتیں ان کو پسند نہیں آتیں۔ میں پرانی قدروں کی بات کرتا ہوں۔ مذہبی روایات کا تذکرہ کرتا ہوں۔ مشرقی اخلاقیات کا درس دیتا ہوں۔ قدامت پرستی کی علامت سمجھا جاتا ہوں۔ جب کہ ان کا نصاب انہیں نام نہاد ترقی کا سبق دیتا ہے انہیں جدیدیت کی طرف لے جاتا ہے اور برطانوی راج میں ان کے لیے اعلیٰ ملازمتوں کے دروازے کھولتا ہے۔ میں ان سے مایوس ہو چکا ہوں اور اب صرف ان کے لیے دعائے خیر ہی کر سکتا ہوں ؎

مصیبت میں بھی اب یادِ خدا آتی نہیں ان کو
دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

مشکل الفاظ کے معانی | پاکٹ ۔ جیب ۔ عرضیاں ۔ درخواستیں

تشریح ایک زمانہ تھا کہ لوگ اپنی ہر مصیبت میں خدا کو یاد کرتے تھے۔ اسی کے سامنے سر جھکاتے تھے۔ اور اس سے امداد کے طالب ہوتے تھے۔ مغربی تہذیب نے لوگوں کو مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے۔ مذہبی روایات پامال ہو گئی ہیں اور مذہب کا نام لینا قدامت اور دقیانوسیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اب صورت حال یہ ہے کہ جب کوئی مصیبت آتی ہے تو لوگ عرضیاں لے کر حکام بالا کی طرف بھاگتے ہیں اور ان سے امداد کے طالب ہوتے ہیں۔ ہم نے خدا پر بھروسہ چھوڑ دیا ہے اور انگریز افسروں کو اپنا نجات دہندہ اور مشکل کشا تصور کر لیا ہے۔

ان کے گلشن میں دیا کرتا ہے اسپیچ وفا
زاغ ہو جائے گا اک دن آنریری عندلیب

مشکل الفاظ کے معانی گلشن - باغ - اسپیچ - تقریر
زاغ - کوّا - آنریری - اعزازی - عندلیب - بلبل

تشریح انگریزوں نے اپنی پسند کے لوگوں کی سرپرستی کے لئے کئی طریقے اختیار کر رکھے تھے۔ بعض لوگوں کو جاگیریں دے رکھی تھیں۔ بعض پر اعلا ملازمتوں کے دروازے کھول رکھے تھے۔ بعض کو یہ اعزاز حاصل تھا کہ کسی دفتر میں جائیں تو حاکم اعلیٰ انہیں کرسی پیش کرے۔ یہ لوگ ہمیشہ انگریزوں کے گن گاتے تھے اور ان کی وفاداری کا دم بھرتے تھے۔ اسی طرح انگریزوں نے بعض علاقوں میں آنریری مجسٹریٹ مقرر کر رکھے تھے۔ ان کو تنخواہ تو نہیں ملتی تھی۔ لیکن ان کے پاس مجسٹریٹ کے اختیارات ہوتے تھے۔ جن کی بدولت وہ اپنے علاقے کے لوگوں میں اپنا اثر و رسوخ اور رعب و دبدبہ قائم رکھتے تھے۔ یہ لوگ آنریری مجسٹریٹ اس لئے تھے کہ انگریزوں کے وفادار تھے۔ اکبر اس شعر میں ان لوگوں پر طنز کر رہے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ انگریزوں کے باغ میں کوّا وفاداری کے موضوع پر تقریر کرتا ہے۔ امید ہے کہ ایک دن اس کو اعزازی بلبل بنا دیا جائیگا، جس طرح انگریزوں نے اپنے وفاشعار لوگوں کو اعزازی مجسٹریٹ بنا رکھا ہے۔ طنز اس میں یہ ہے کہ یہ لوگ بڑے گھٹیا اور حقیر ہیں لیکن اپنی وفاداری کے صلے میں اعزازی مجسٹریٹ بنا دیئے گئے ہیں۔ یہ بات ایسے ہی ہے جیسے کسی کوّے کو وفاداری کے صلے میں آنریری بلبل بنا دیا جائے۔

ریزولیوشن کی شورش ہے مگر اس کا اثر غائب
پلیٹوں کی صدا سنتا ہوں اور کھانا نہیں آتا

مشکل الفاظ کے معانی

ریزولیوشن : قرارداد
شورش : شور

تشریح

انگریز اپنے ساتھ ایک نیا نظام حکومت بھی لائے تھے۔ اس نظام کی ایک اہم کڑی اسمبلیوں کا قیام تھا۔ جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ قراردادیں منظور کریں۔ اہم قومی مسائل پر تجاویز پیش کریں تاکہ حکومت ان پر عمل درآمد کرائے۔ لیکن ہوتا یہ تھا کہ ان اسمبلیوں کے اجلاس ہوتے تھے۔ بڑی گرماگرم بحثیں ہوتی تھیں۔ قراردادیں منظور ہوتی تھیں۔ مگر ان کا کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ ان پر حکومت عمل نہیں کرتی تھی۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص دعوت پر مہمانوں کو بلائے۔ وہ کھانے کے انتظار میں بیٹھے رہیں۔ پلیٹوں کے کھنکنے کی آواز بھی آتی رہے لیکن کھانا نہ آئے۔ یہ قراردادیں بھی پلیٹوں کی آوازوں کی طرح کھوکھلی آوازیں ہیں ان کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔

ظفر علی خان

(۱۸۷۳ء - ۱۹۵۶ء)

نعت

تعارف

مولانا ظفر علی خان پہلو دار شخصیت کے مالک تھے۔ وہ قادر الکلام شاعر تھے، بے باک صحافی تھے، شعلہ نوا مقرر تھے اور ایک کامیاب مترجم تھے۔ ایک شاعر کی حیثیت سے انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں بڑی کامیابی سے طبع آزمائی کی ہے لیکن ان کا خاص میدان نعت گوئی ہے۔ نعت، مذہبی شاعری کی ایک اہم صنف ہے۔ اس میں حضور ختمی مرتبت ؐ کے اوصافِ حمیدہ کا تذکرہ بڑے والہانہ اور عقیدت مندانہ انداز میں ہوتا ہے۔ مولانا ظفر علی خان نے اتنی عمدہ نعتیں لکھی ہیں کہ خواجہ حسن نظامی نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ وہ قیامت کے روز اپنی نعتوں کی وجہ سے بخشے جائیں گے۔ موجودہ نصاب میں ان کی ایک نعت شامل کی گئی ہے جس کے اشعار کی تشریح یہاں درج کی جاتی ہے

دل جس سے زندہ ہے وہ تمنا تمہی تو ہو
ہم جس میں بس رہے ہیں وہ دنیا تمہی تو ہو

تشریح

دل خواہشوں اور تمناؤں کا مرکز ہے۔ جس دل میں آرزوئیں اور خواہشیں جاگزیں ہوں، وہی دل، دلِ زندہ کہلانے کا مستحق ہے۔ اس شعر میں شاعر رسالت مآب ؐ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ ہمارے دل میں جو سب سے بڑی تمنا ہے اور جس سے ہمارا دل زندہ ہے وہ آپ ؐ کی تمنا ہے۔ آپ ؐ کی محبت ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ حضور ؐ کا فرمان بھی ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ اپنے والدین، اپنی اولاد اور تمام دوسرے لوگوں کی نسبت مجھ سے زیادہ محبت نہیں کرتا۔ گویا حبِ رسول ؐ ایمان کی بنیاد ہے۔ شاعر اس شعر میں اسی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہہ رہا ہے۔ کہ ہمارے دل کی تمنا بھی آپ ؐ ہیں اور جس ذاتِ گرامی کی بدولت ہماری دنیا آباد نظر آتی ہے۔ وہ بھی آپ ؐ ہی ہیں۔

دل انسان کی داخلی کیفیات کا ترجمان ہے۔ دُنیا انسان کے خارج سے عبارت ہے شعر کا مفہوم یہ بھی ہے کہ ہم اپنے اندر جھانک کر دیکھیں یا خارج میں دنیا کا مشاہدہ کریں، ہماری ساری کائنات آپؐ ہی کے دم قدم سے آباد ہے۔

پھُوٹا جو سینۂ شبِ تارِ الست سے
اُس نورِ اوّلیں کا اجالا تمہی تو ہو

مشکل الفاظ کے معانی

شبِ تار۔ تاریک رات۔ الست۔ اشارہ ہے قرآن مجید کی آیت کی طرف جس میں خدا نے اپنی مخلوقات سے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ (اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ) انہوں نے جواب دیا۔ ہاں (قالو بلا) الست سے مراد، روزِ ازل ہے نورِ اوّلیں۔ پہلا نور۔

تشریح

جب کچھ نہیں تھا تو صرف خدا کی ذات تھی۔ اس وقت ہر طرف تاریکی تھی۔ خدا تعالیٰ نے ایک نور کو تخلیق کیا۔ اور اس کے بعد فرشتے اور روحیں پیدا کیں۔ پھر ان سے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ انہوں نے کہا: ہاں
شاعر اس شعر میں کہہ رہا ہے کہ روزِ ازل جب ہر طرف تاریکی تھی تو اس تاریک رات کے سینے سے ایک نور پھُوٹا جس سے ساری کائنات منوّر ہو گئی۔ وہ نور حضور اکرمؐ کی ذاتِ اقدس تھی۔

سب کچھ تمہارے واسطے پیدا کیا گیا
سب غائتوں کی غایتِ اولیٰ تمہی تو ہو

مشکل الفاظ کے معانی

غائت — مقصد
اولیٰ — اوّلیں

تشریح

حدیثِ قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں کائنات کو پیدا نہ کرتا۔ دوسرے لفظوں میں آپؐ کی ذات باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔
شاعر نے اسی حدیثِ قدسی کو بنیاد بنا کر شعر کہا ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہے وہ سب آپؐ کی خاطر پیدا کیا گیا ہے۔ زمین و آسمان کو پیدا کرنے کا مقصد بھی حضورؐ کا ظہورِ قدسی تھا، اس لئے کہ آپ سب مقصدوں کے مقصدِ اوّلین اور سب غائتوں کی غایت اولیٰ ہیں۔

؎ جلتے ہیں جبرئیل کے پَر جس مقام پر
اس کی حقیقتوں کے شناسا تمہی تو ہو

مشکل الفاظ کے معانی جبرئیل - وہ فرشتہ جو خدا تعالیٰ کا پیغام پیغمبروں تک لاتا ہے۔ معراج کی رات وہ حضورؐ کے ہمراہ سدرۃ المنتہیٰ تک گیا تھا۔ شناسا - واقف - جاننے والے۔

تشریح معراج کی رات جب جبرئیل فرشتہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا تو اس نے آگے جانے سے معذرت چاہی اور کہا کہ اگر وہ ایک قدم بھی آگے گیا تو اس کے پَر جل جائیں گے۔ چنانچہ حضور اکرمؐ تنہا آگے تشریف لے گئے۔ یہ خدا تعالیٰ کی خصوصی تجلّیات کی وادی تھی۔ ان تجلّیات میں سے ایک کی جھلک حضرت موسیٰؑ نے کوہِ طور پر دیکھی تھی اور اس کی تاب نہ لا کر بے ہوش ہو گئے تھے۔ حضور اکرمؐ نے ان تجلّیات کو دیکھا اور انہیں برداشت بھی کیا۔ ایک شاعر نے اس صورتِ حال کو یوں بیان کیا ہے: ؎

کس کو دیکھا تھا موسیٰ سے پوچھے کوئی
آنکھ والوں کی ہمّت پہ لاکھوں سلام

مولانا ظفر علی خان نے اس شعر میں حضور اکرمؐ کی ایک ایسی صفت کا اظہار کیا ہے جو صرف آپؐ سے مخصوص ہے۔ آپ ہی اس جگہ تک پہنچے جہاں جبریل کبھی نہیں گیا تھا۔ آپ ہی نے حقیقتِ کبریٰ کا مشاہدہ کیا اور اس کی حقیقتوں سے آگاہ ہوئے۔ یہ شرف کسی اور انسان کا مقدّر نہیں بنا۔

گرتے ہوؤں کو تھام لیا جس کے ہاتھ نے
اے تاجدارِ یثرب و بطحا تمہی تو ہو

مشکل الفاظ کے معانی تاجدار - بادشاہ - یثرب: مدینہ
بطحا - مکّہ۔

تشریح مکّہ حضور ختمی مرتبتؐ کا اصل وطن تھا۔ آپؐ کی ولادت وہیں ہوئی اور آپؐ نے اعلانِ نبوت بھی وہیں فرمایا، لیکن جب کافروں نے آپؐ کو اذیت دینا شروع کی تو آپؐ نے مدینہ کی طرف ہجرت کی اور وہیں مقیم ہو گئے۔ اس طرح مکّہ

اور مدینہ دونوں سے آپؐ کا تعلق تھا۔ مدینہ میں آپؐ نے اپنا تبلیغی مشن جاری رکھا۔ لوگ جوق در جوق اسلام قبول کرتے رہے۔ کچھ عرصہ کے بعد مسلمانوں نے مکہؐ بھی فتح کر لیا۔ اس طرح دونوں شہر حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ چونکہ یہ دونوں آپؐ کے زیرِ اثر تھے، اس لیے شاعر نے آپؐ کو تاجدارِ یثرب و بطحا کہا ہے۔ اسلام سے قبل مکی اور مدنی معاشرہ انتہائی پستیوں میں گرا ہوا تھا۔ بنیادی انسانی اقدار پامال ہو رہی تھیں۔ انسان انسان کا دشمن تھا۔ حضورؐ کی تشریف آوری کے بعد انسان شرفِ انسانی سے آگاہ ہوا۔ سال ہا سال کی دشمنیاں ختم ہوئیں۔ محبت اور اخوت کے چشمے پھوٹ پڑے اور عربی معاشرہ ترقی کی راہ پر گامزن ہوا۔ اسی صورتِ حال کو شاعر نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ اے مدینہ اور مکہؐ کے والی! اگر کسی نے عربوں کے گرتے ہوئے معاشرے کو سنبھالا دیا ہے تو وہ آپ ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔

دنیا میں رحمتِ دو جہاں اور کون ہے
جس کی نہیں نظیر وہ تنہا تمہی تو ہو

مشکل الفاظ کے معانی

رحمتِ دو جہاں: دونوں جہانوں کے لیے باعثِ رحمت مراد آنحضرتؐ۔ نظیر: مثال۔

تشریح

خدا تعالیٰ نے حضورؐ کو مخاطب کر کے قرآن مجید میں کہا ہے کہ ہم نے آپؐ کو رحمۃ للعالمین بنا کر بھیجا ہے۔ یعنی آپؐ دونوں جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ حضورؐ نے اپنی ساری زندگی کبھی کسی کے لیے بددعا نہیں کی، بلکہ ہمیشہ لوگوں کی ہدایت کی دعا فرماتے رہے۔ مکہؐ کے لوگ آپؐ کو طرح طرح کی تکلیفیں دیتے رہے مگر آپ نے ان کے لیے بھی بددعا نہیں کی، بلکہ فتحِ مکہ کے موقع پر ان تمام لوگوں کو معاف کر دیا۔

شاعر کہہ رہا ہے کہ آپؐ دونوں جہانوں کے لیے باعثِ رحمت ہیں۔ آپؐ کے علاوہ کوئی ایسی ذات نہیں ہے جس کو رحمۃ للعالمین ہونے کا شرف حاصل ہو۔ اس لحاظ سے آپؐ کی ذات دنیا میں بے نظیر ہے۔ آپؐ کی کوئی مثال پیش نہیں کی جا سکتی۔

نظم کی تلخیص

شاعر نے حضور سرورِ کائناتؐ سے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار کرتے

ہوتے آپؐ کی چند صفات کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ہمارے دل کی سب سے بڑی تمنّا آپؐ ہیں۔ ہم جس دنیا میں رہتے ہیں وہ آپؐ ہی کے دم قدم سے آباد ہے۔ خدا تعالیٰ نے سب سے پہلے آپؐ کے نور کو پیدا کیا اور پھر آپؐ کی خاطر یہ کائنات تخلیق ہوئی۔ آپؐ اللہ تعالیٰ کی تجلیّات کے جاننے والے ہیں۔ آپؐ نے عرب کے گرے ہوئے معاشرے کو سنبھالا دیا اور عربوں کو اقوامِ عالم میں معزّز مقام دلایا۔ آپؐ دونوں جہانوں کے لئے باعثِ رحمت ہیں۔ آپؐ کی ذات بے مثال ہے، آپؐ کی کوئی نظیر نہیں ہے۔

مرکزی خیال

شاعر نے حضور اکرمؐ سے اپنی شیفتگی اور محبت کا اظہار کیا ہے اور آپؐ کی چند صفات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی یہ کہ آپؐ باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں اور آپ دو جہانوں کے لئے باعثِ رحمت ہیں۔ آپؐ نے عربوں کے زوال پذیر معاشرے کی اصلاح کر کے اسے بلند مقام پر فائز کر دیا۔

ظفر علی خاں

خونِ جگر کی چند بوندیں

تعارف کربلا وہ سرزمین ہے جہاں یزیدی فوجوں نے امام حسینؓ اور ان کے اہلِ بیت کو شہید کیا تھا۔ یہ واقعہ تاریخِ عالم کا ایک دردناک باب ہے، جس پر ہر حساس انسان اشک بار رہتا ہے۔ مولانا ظفر علی خاں نے اپنی موجودہ نظم "خونِ جگر کی چند بوندیں" میں اسی سانحہ کو اپنا موضوع بنایا ہے انہوں نے واقعۂ کربلا کا ذکر کرتے

ہوئے مسلمانوں کو یہ سبق دیا ہے کہ حضرت امام حسینؓ کی یاد تازہ رکھنے کا تقاضا یہ ہے کہ انہوں نے باطل کے سامنے سر جھکانے کی بجائے سر کٹانے کا جو ولولہ انگیز فیصلہ کیا تھا، اُسے زندگی بھر سامنے رکھا جائے اور ہمیشہ اس کی تقلید کی جائے۔ علامہ اقبال نے بھی کہا تھا کہ ؎

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم
نہایت اس کی حسینؓ، ابتدا ہے اسمٰعیلؑ

اشعار کی تشریح

اے کربلا کی خاک اس احسان کو نہ بھول
تڑپی ہے تجھ پہ نعشِ جگر گوشۂ بتولؓ

مشکل الفاظ کے معانی بتول۔ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ۔ نعش۔ مردہ جسم
جگر گوشۂ بتول۔ حضرت فاطمہ کے بیٹے یعنی امام حسینؓ

تشریح کربلا کے میدان میں امام حسینؓ اور ان کے ساتھیوں کو بھوکا پیاسا

شہید کر دیا گیا - امام حسینؓ، نواسۂ رسولؐ، گلشنِ علیؓ کے پھول اور جگر گوشۂ بتولؓ تھے۔ قرآن اور حدیث میں امام حسینؓ اور دیگر اہلِ بیت کی بڑی فضیلت بیان ہوئی ہے۔ چنانچہ ان کے مقام اور مرتبے کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ان کی شہادت کو شاعر نے کربلا کی خاک کے لئے بہت بڑی سعادت قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اے خاکِ کربلا، ! اگرچہ تو بڑی بے وقعت اور حقیر سی چیز تھی جسے تمام مخلوق پاؤں تلے روندتی تھی، لیکن خونِ حسینؓ نے تجھ بے حیثیت مٹی کو ارفع اور اعلیٰ مقام عطا کر دیا ہے۔ تجھے اس احسان کو یاد رکھنا چاہیئے کہ حضرت فاطمۃ الزہرہؓ کے بیٹے کی شہادت تیرے دامن میں ہوئی۔ ان کی نعش تجھ پر تڑپتی رہی۔ ان کی بدولت تجھے یہ حیثیت حاصل ہوئی کہ لوگ تجھے پاؤں تلے روندنے کی بجائے آنکھوں سے لگاتے ہیں اور تیری عزت کرتے ہیں۔ ؎

اسلام کے لہو سے تری پیاس بجھ گئی
سیراب کر گیا تجھے خونِ رگِ رسولؐ

مشکل الفاظ کے معانی

خونِ رگِ رسول - امام حسینؓ چونکہ حضور اکرمؐ کے نواسے تھے اور انہیں انتہائی عزیز تھے، اس لئے ان کے خون کو شاعر نے خونِ رگِ رسولؐ کہا ہے۔ اسلام کا لہو - امام حسینؓ کا لہو۔

تشریح

صحراؤں میں عام طور پر بارشیں نہیں ہوتیں اور یہاں کی زمین اکثر پانی کو ترستی ہے۔ شاعر خاکِ کربلا کو مخاطب کر کے کہہ رہا ہے کہ تو نہ جانے کب سے پیاسی تھی؟ لیکن امام حسینؓ نے عظمتِ اسلام کی خاطر جو شہادت قبول کی اور ان کا جو خون تجھ میں رچ بس گیا ہے، اس سے تیری پیاس یقیناً بجھ گئی ہوگی۔ تو خونِ رگِ رسول سے سیراب ہوئی ہے۔ اس مقدس خون کے بعد تجھے پانی کی پیاس نہیں رہی ہوگی۔ شعر کا مفہوم، خون کی اس فراوانی کی طرف اشارہ کر رہا ہے جو اہلِ بیت اور ان کے ساتھیوں کے جسم سے نکل کر کربلا کی سرزمین میں جذب ہو گیا۔

کرتی رہے گی پیش شہادت حسینؓ کی
آزادیٔ حیات کا یہ سرمدی اصول
چڑھ جائے کٹ کے سر ترا نیزے کی نوک پر
لیکن یزیدیوں کی اطاعت نہ کر قبول

ابدی اصول

سرمدی اصول - ابدی اصول - یزیدی - باطل قوتیں -

تشریح یزید فاسق و فاجر بادشاہ تھا - اس نے امام حسین رضؓ سے زبردستی بیعت لینا چاہی لیکن امام عالی مقام نے اس کی خلافت کو قبول نہ کرتے ہوئے بیعت سے انکار کر دیا - اسی صورت حال کو ایک شاعر نے یوں بیان کیا ہے :-

شاہ است حسین ، بادشاہ است حسین
دین است حسین ، دیں پناہ است حسین
سر داد ، نہ داد دست در دستِ یزید
حقا کہ بنائے لا الہٰ است حسین ،

امام حسین رضؓ نے سر دینا قبول کر لیا ، شہادت کو سینے سے لگا لیا ، لیکن باطل قوت کی اطاعت کو قبول نہ کیا - امام حسین رضؓ کی شہادت آزادی کا یہ ابدی اصول پیش کرتی ہے کہ بڑی سے بڑی قربانی دے دو ، موت کو سر کا تاج بنا لو ، لیکن باطل قوتوں کے سامنے گردن نہ جھکاؤ - ہمیشہ حق کی آواز بلند کرو کہ آخر کار حق کی ہی فتح ہوتی ہے -

تھی داستاں دراز بھی اور دل گداز بھی
لیکن کہاں ہے دل کہ دیا جائے اس کو طول

مشکل الفاظ کے معانی داستان - کہانی - دراز - طویل
دلگداز - دل کو پگھلا دینے والی -

تشریح کربلا کی کہانی بڑی طویل ہے اور اتنی الم ناک ہے کہ اسے سن کر پتھر دل بھی پگھل جاتا ہے - محرّم کے مہینے میں اس طویل داستان کو دہرایا جاتا ہے - علما و ذاکرین بڑی تفصیل کے ساتھ اس پر روشنی ڈالتے ہیں - خود بھی روتے ہیں ، سامعین کو بھی اشکبار کرتے ہیں - وہ لوگ بڑی ہمت اور حوصلے والے ہیں جو اس داستان کو بیان کرتے ہیں اور جو اس کو سنتے ہیں - شاعر کہتا ہے کہ میں اتنا حوصلہ نہیں رکھتا کہ پوری داستان بیان کر سکوں ، اسی لئے میں نے اشاروں میں بات کرنے کی کوشش کی ہے ، واقعات کی تفصیلات بیان نہیں کیں

نظم کی تلخیص

اس نظم میں شاعر خاکِ کربلا سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ تو حقیر سی مٹی تھی

لیکن امام حسین رضؓ نے شہادت قبول کر کے اور اپنا خون دے کر تجھ کو عزت بخشی ہے۔ تجھے اس احسان کو کبھی بھولنا نہیں چاہیئے۔ امام حسین رضؓ کی قربانی میں انسانوں کے لیے ایک سنہرا اصول پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ باطل قوتوں کی اطاعت کبھی قبول نہیں کرنی چاہیئے۔ سر نیزے پہ چڑھتا ہے تو چڑھ جائے لیکن حق کا عَلَم ہمیشہ بلند رہنا چاہیئے۔ آخری شعر میں ظفر علی خان کہتے ہیں کہ کربلا کا واقعہ طویل بھی ہے اور دلگداز بھی، اس لئے مَیں اس کو تفصیل کے ساتھ بیان کرنے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔

نظم کا مرکزی خیال

کربلا کی مٹی بڑی محترم ہے کہ اس پر امام حسین رضؓ کا خون بہا ہے۔ امام عالی مقام کی شہادت عام لوگوں کو یہ سبق دیتی ہے کہ باطل قوتوں کے سامنے کبھی سر نہ جھکاؤ اور اس کی خاطر اگر بڑی سے بڑی قربانی دینی پڑے تو گریز نہ کرو۔

علامہ اقبالؒ

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

"شکوہ" سے اقتباس

تعارف

"شکوہ" علامہ اقبال کی ایک اہم طویل نظم ہے۔ یہ انجمن حمایت اسلام لاہور کے ۲۶ ویں سالانہ جلسہ میں پڑھی گئی، جو اپریل ۱۹۱۱ء کو اسلامیہ کالج لاہور میں منعقد ہوا۔ اس وقت سیاسی صورت حال یہ تھی کہ ترکی کی سلطنت عثمانیہ کے بہت سے علاقے براہ راست انگریزی تسلّط میں تھے۔ ایران پر روسی، برطانوی اور کسی حد تک جرمن اثرات کی حکمرانی تھی۔ ادھر قوم پرستی کا جذبہ عربوں میں فروغ پا رہا تھا اور وہ ترکوں کے خلاف بغاوت پر آمادہ تھے۔ نوجوان ترک تحریک کے زیر اثر ترکی میں لادینی اور تورانی قوم پرست نظریات پھیل رہے تھے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا کہ ایک ہمہ جہت زوال نے مسلمانوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔

"شکوہ" اپنے موضوع کے اعتبار سے بارگاہ خداوندی میں ایک مسلمان کی فریاد ہے۔ کہ ہم تیرے نام لیوا اور امت احمد مرسل کے افراد ہونے کے باوجود دنیا میں ذلیل وخوار ہو رہے ہیں۔

اس نظم کو چھ حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ تمہید (۲) اُمت مُسلمہ کے کارنامے۔ (۳) مسلمانوں کا حالِ زبوں۔
(۴) حالِ زبوں کی وجہ (۵) کیفیتِ یاس وبیم (۶) دعائیہ اختتام۔

"شکوہ سے اقتباس" اس طویل نظم کے آخری دعائیہ حصّے سے لیا گیا ہے۔

اشعار کی تشریح

باده کش غیر ہیں گلشن میں لب جو بیٹھے　　سنتے ہیں جام بکف نغمۂ کوکو بیٹھے
اور ہنگامہ گلزار سے یک سو بیٹھے　　تیرے دیوانے بھی ہیں منتظرِ ہُو بیٹھے

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

مشکل الفاظ کے معانی ـ بادہ کش ۔ شراب پینے والے ۔ لب جو ۔ ندی کے کنارے ۔ جام بکف ۔ جام ہاتھ میں لئے نغمۂ کوکو ۔ کوئل کا نغمہ ۔ یک سو ۔ ایک طرف منتظرِ ہُو ۔ ایک نعرۂ یا ہُو کے انتظار میں ۔ خود افروزی ۔ اپنے آپ کو جلانا برقِ دیرینہ ۔ پرانی بجلی ۔ فرمان ۔ حکم ۔ جگر سوزی ۔ جگر جلانا یا جی جلانا

تشریح ـ شاعر خدا تعالیٰ سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ غیر مسلم ندی کے کنارے باغ میں بیٹھے ــ ــ شراب پی رہے ہیں ۔ انہوں نے ہاتھوں میں جام پکڑے ہوئے ہیں اور کوئل کے نغمے سن رہے ہیں ــ ــ ــ ــ ــ ــ باغ کی رونق اور گہما گہمی سے الگ ہو کر تیرے چاہنے والے بھی بیٹھے ہیں اور کسی نعرۂ مستانہ کے منتظر ہیں ۔ اے اللہ! یہ وہ لوگ ہیں جو تجھ پر پروانوں کی طرح جان قربان کرتے رہے ہیں ۔ انہیں اسی طرح کی قربانی دینے کا اور اپنے آپ کو جلانے کا ذوق عطا فرما ۔ پرانی بجلی کو حکم دے کہ وہ پھر ان کے جگر اور جان کو جلا دے ۔

مفہوم یہ ہے کہ غیر مسلم اقوام کو زندگی کی تمام سہولتیں میسر ہیں لیکن مسلمان جمود کا شکار ہیں ۔ وہ حرارت اور تحرک سے محروم ہیں ۔ وہ اس انتظار میں ہیں کہ کوئی آئے اور نعرۂ مستانہ لگا کر انہیں بیدار کرے ۔ اے اللہ تعالیٰ، تو انہیں اسلام کی خاطر قربانی دینے کا جذبہ عطا فرما اور ان کی رگوں میں وہی بجلیاں بھر دے جنہوں نے ان کے آباء و اجداد کو سرگرمِ عمل کر رکھا تھا ۔

مشکل الفاظ کے معانی

قومِ آوارہ۔ مراد ہے مسلمان قوم جو اپنی منزل سے ہٹی ہوئی ہے۔ عنان۔ لگام۔ مذاقِ پرواز۔ اُڑنے کا شوق۔ مضطرب ــــ بے چین۔ تشنہ۔ پیاسا۔ مضراب۔ ساز بجانے کا آلہ۔ مضطر۔ بے قرار۔

تشریح

مسلمان اپنی منزل کو بھولے ہوئے تھے۔ لیکن اب انہوں نے پھر اپنے گھوڑوں کے رُخ سرزمینِ حجاز کی طرف موڑ دیئے ہیں۔ یوں سمجھئے کہ ایک بُلبل ہے جس کے پَر نہیں ہیں لیکن اسے اُڑنے کا شوق اڑا رہا ہے یا ایک باغ ہے جس کا ہر غنچہ خوشبو سے بھرا ہوا ہے، جو بکھرنے کے لئے بے چین ہے، یا کوہِ طور ہے جو اسی پرانی آگ میں جلنے کے لئے بیقرار ہے۔

شاعر نے مختلف مثالوں سے یہ واضح کرنے کی کوشش کی ہے کہ مسلمان اب اس مقام پر پہنچ گئے ہیں جہاں انہیں سرگرمِ عمل ہونے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی — انہیں معمولی سی تحریک چاہیئے پھر دیکھیں کہ ان کی سوئی ہوئی صلاحیتیں کس طرح بیدار ہوتی ہیں اور وہ اپنی عظمتِ رفتہ کس طرح حاصل کرتے ہیں۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن، رازِ چمن — کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمّازِ چمن
عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن — اُڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پردازِ چمن
ایک بُلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک !
اس کے سینے میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

مشکل الفاظ کے معانی

بوئے گل۔ پھول کی خوشبو۔ غمّاز۔ چغلی کھانے والے۔ زمزمہ پردازِ چمن۔ چمن میں گیت گانے والے۔ تلاطم۔ طوفان۔

تشریح

پھول کی خوشبو باغ کے راز کو باغ سے باہر لے گئی پھولوں نے خود ہی باغ کی کیفیت اور حالت کا اعلان کر دیا ہے۔ موسم بہار ختم ہو گیا ہے۔ باغ کو اگر ایک ساز تصوّر کر لیں تو وہ ساز ٹوٹ چکا ہے۔ درختوں کی شاخوں پر جو پرندے گیت گا رہے تھے، اُڑ چکے ہیں۔

لیکن اس خزاں کے دَور میں بھی ایک بُلبل ایسا ہے

جو گیت گانے میں مصروف ہے اور جس کے سینے میں نغموں کا ایک طوفان چھپا ہوا ہے

یہاں بلبل سے مراد شاعر کی اپنی ذات ہے جو اس زوال کے دور میں بھی مسلمانوں کو آزادی کے گیت سنا رہا ہے۔

قمریاں شاخِ صنوبر سے گریزاں بھی ہوئیں ‏ ‏ پتیاں پھول کی جھڑ جھڑ کے پریشاں بھی ہوئیں

وہ پرانی روشیں باغ کی ویراں بھی ہوئیں ‏ ‏ ڈالیاں پیرہنِ برگ سے عریاں بھی ہوئیں

قیدِ موسم سے طبیعت رہی آزاد اس کی

کاش گلشن میں سمجھتا کوئی فریاد اس کی

مشکل الفاظ کے معانی
قمری - ایک پرندہ جو صنوبر کے درخت کا عاشق ہے
پریشان - منتشر۔ بکھرنا۔ روشیں - راستے - پیرہنِ برگ - پتوں کا لباس - قیدِ موسم - موسم کی پابندی - موسم کے مطابق -

تشریح
شاعر کہتا ہے کہ قمریاں صنوبر کی ڈالیوں کو چھوڑ کر جا چکی ہیں - پھولوں کی پتیاں خشک ہو کر بکھر چکی ہیں - باغ کی پھولوں سے لدی ہوئی روشیں ویران ہو گئی ہیں شاخوں کے پتے جھڑ گئے ہیں اور وہ ننگی ہو گئی ہیں - لیکن ایک بلبل ہے کہ جس پر خزاں کے اس موسم کا کوئی اثر نہیں ہوا - وہ نغمہ سرائی میں مصروف ہے، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس کی دکھ بھری آواز کو سمجھنے والا کوئی نہیں -

شاعر اس بات پر افسوس کر رہا ہے کہ جو باتیں وہ کہہ رہا ہے اور جن نظریات کی وہ تبلیغ کر رہا ہے اس کی قوم میں ان کو سمجھنے والا کوئی نہیں - ابھی ان میں وہ شعور بیدار نہیں ہوا جو قوموں کو ترقی کی راہ پر گامزن کرتا ہے۔

چاک اس بلبلِ تنہا کی نوا سے دل ہوں ‏ ‏ جاگنے والے اسی بانگِ درا سے دل ہوں

یعنی پھر زندہ نئے عہدِ وفا سے دل ہوں ‏ ‏ پھر اسی بادۂ دیرینہ کے پیاسے دل ہوں

عجمی خُم ہے تو کیا مے تو حجازی ہے مری

نغمہ ہندی ہے تو کیا لَے تو حجازی ہے مری

مشکل الفاظ کے معانی
چاک ہونا - پھٹ جانا - نوا - آواز - بانگِ درا - اونٹوں کے گلے میں پڑی ہوئی گھنٹی کی آواز

عہدِ وفا ۔ وفاداری کا پیمان ۔ بادۂ دیرینہ ۔ پرانی شراب ۔ عجمی ۔ غیر عرب سے تعلق رکھنے والا ۔ خم ۔ شراب کا مٹکا ۔ حجازی ۔ عرب سے تعلق رکھنے والا ۔ لے ۔ سُر ۔ لہجہ ۔

تشریح اس آخری بند میں شاعر نے نظم کے دعائیہ حصّے کو اختتام تک پہنچا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کرے کہ اس تنہا بُلبل کی آواز مردہ دلوں میں زندگی کے آثار پیدا کر دے۔ وہ اپنی آواز کو بانگِ درا سے تشبیہ دیتے ہوئے کہتا ہے کہ کاش سونے والے اسی آواز سے جاگ اٹھیں۔ یہی آواز ان کو اسلام کے ساتھ عہدِ وفا باندھنے پر آمادہ کر دے اور لوگ اسی پرانی شراب کی چاہت پھر کرنے لگیں۔ آخری شعر میں وہ کہتا ہے کہ اگرچہ میرا مٹکا عجمی ہے لیکن اس میں جو شراب ہے وہ حجاز کی کشید کی ہوئی ہے۔ میرا نغمہ ہندی ہے لیکن میری سُر اور میرا لہجہ سرزمینِ عرب سے تعلق رکھتا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ اگرچہ میں عربی میں بات نہیں کر رہا لیکن میرے پیغام کی روح اسلامی ہے۔ اور اگرچہ میں ہندوستان کی زبان میں گفتگو کر رہا ہوں لیکن اس کا جوہر خالص حجازی ہے۔ جو مسلمانوں کی فلاح و بہبود سے تعلق رکھتا ہے۔

نظم کی تلخیص

علامہ اقبال کی مشہور نظم "شکوہ" اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک مسلمان کی فریاد ہے اس کے چند بند نصاب میں شامل ہیں۔

شاعر کہتا ہے کہ دنیا کی دوسری قوموں کے افراد کو بیشمار نعمتیں میسّر ہیں۔ وہ باغ میں نہر کے کنارے بیٹھ کر شراب نوشی کر رہے ہیں اور کوئل کے رسیلے گیت سُن رہے ہیں۔ لیکن اللہ کے شیدائی باغ کی پُر کیف فضا سے دور کسی نعرۂ مستانہ کے منتظر ہیں۔ وہ اپنی منزل سے بھٹک چکے تھے لیکن وہ اپنا رخ پھر سیدھا کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کی طرف پھر راغب ہونے لگے ہیں۔ ان کی مثال ایک بے بال و پر بُلبل کی سی ہے جسے اُڑنے کا شوق، پرواز پر آمادہ کر دیتا ہے۔ اگرچہ ان پر سے بہار کا دور ختم ہو چکا ہے۔ لیکن ان کے باغ میں ایک ایسا بُلبل موجود ہے۔ جس کے سینے میں نغموں کا طوفان موجود ہے۔ یہ بُلبل موسم کی قید سے آزاد

گیت گانے میں مصروف ہے۔ شاعر اللہ تعالیٰ سے دعاگو ہے کہ اے اللہ اس تنہا بلبل کے گیتوں سے سونے والوں کو بیدار کر دے تاکہ وہ اس کی وجہ سے تیرے ساتھ وفا کا عہد از سرِ نو باندھ لیں۔

آخری بندوں میں شاعر نے جس بلبلِ تنہا کا ذکر کیا ہے وہ شاعر کی اپنی ذات ہے۔ وہ کہتا ہے کہ کاش اس کے اشعار مسلمانوں کے لئے حیاتِ نو کا پیغام بن سکیں اور وہ اقوامِ عالم میں اپنا کھویا ہوا مقام دوبارہ حاصل کر سکیں۔

مرکزی خیال

یہ بند "شکوہ" کے دعائیہ حصّے سے تعلق رکھتے ہیں۔ شاعر کہتا ہے کہ دنیا بھر کی نعمتیں غیر اقوام کے لئے ہیں لیکن مسلمان ان سے محروم ہیں اور اسکی وجہ یہ ہے کہ وہ جمود کا شکار ہیں۔ اے اللہ یہ تیرے پروانے ہیں۔ انہیں جلنے کا ذوق عطا فرما۔ مسلمانوں کے باغ پر خزاں کا دور دَورہ ہے لیکن پھر بھی ایک بلبل اس باغ میں ایسا ہے جو ان کی بیداری کے لئے گیت گا رہا ہے۔ یہاں شاعر نے اپنی ذات کی طرف اشارہ کیا ہے وہ دعاگو ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے اشعار میں وہ تاثیر پیدا کر دے جو مسلمانوں کی مردہ رگوں میں زندگی کا خون دوڑا دے۔

"جوابِ شکوہ" سے اقتباس

تعارف "شکوہ" انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی تو بعض لوگوں کا خیال تھا کہ اس نظم میں علّامہ اقبالؔ کا انداز اور لہجہ نامناسب ہے۔ چنانچہ اس کی تلافی کے لئے (اور ویسے بھی "شکوہ" ایک طرح کا سوال تھا جس کا جواب علّامہ مرحوم کے ذمّے تھا) انہوں نے ۱۹۱۳ء میں "جوابِ شکوہ" لکھی، جسے لاہور ہی کے ایک جلسۂ عام میں پڑھا گیا۔ اس نظم کو بھی بڑی مقبولیت حاصل ہوئی اور کئی زبانوں میں اس کے ترجمے بھی ہوئے۔

"شکوہ" میں مسلمانوں کا حالِ زبوں بیان کیا گیا تھا اور اسکی وجہ پوچھی گئی تھی۔ "جوابِ شکوہ" دراصل "شکوہ" میں اٹھائے گئے سوالات کا جواب ہے۔ مطالعہ میں سہولت کی غرض سے پوری نظم کو مندرجہ ذیل حصّوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱۔ "شکوہ" کی اثر انگیزی ۲۔ "جوابِ شکوہ" کی تمہید
۳۔ مسلمانوں کے حالِ زار کے اسباب ۴۔ اسلاف سے موازنہ
۵۔ پُرامید مستقبل ۶۔ اسلام کی طرف لوٹنے کی دعوت

"جوابِ شکوہ" کے جو بند شاملِ نصاب ہیں، اُن میں پُرامید مستقبل کی نوید کے ساتھ مسلمانوں کو دعوتِ عمل بھی دی گئی ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ اگر وہ سرورِ دو عالم ؐ کے پیغام پر عمل کریں تو دُنیا میں ان کو پھر سر بلندی اور سرفرازی عطا ہو سکتی ہے۔

جوابِ شکوہ کے اقتباس کی تشریح

تو نہ مٹ جائے گا ایران کے مٹ جانے سے
نشۂ مے کو تعلّق نہیں پیمانے سے

ہے عیاں یورشِ تاتار کے افسانے سے
پاسباں مل گئے کعبے کو صنم خانے سے

کشتیِ حق کا زمانے میں سہارا تُو ہے
عصرِ نو رات ہے دھندلا سا ستارا تُو ہے

مشکل الفاظ کے معانی

نشہ مے: شراب کا نشہ۔ پیمانہ۔ پیالہ۔ یورشِ تاتار۔ تاتاریوں کا حملہ۔ ہلاکو خان کی فوجوں نے سلطنتِ عباسی کے دارالخلافہ بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی تھی۔

عیاں۔ ظاہر۔ پاسبان۔ نگہبان۔ صنم خانہ۔ بُت خانہ

عصرِ نو: نیا زمانہ۔ حق:۔ مراد اسلام

تشریح

علامہ اقبال نے اپنی نظم "شکوہ" میں مسلمانوں کی بے چارگی کا ذکر کرتے ہوئے خدا سے پوچھا تھا کہ توحید کے نام لیواؤں پر پہلے جیسا لطف وکرم کیوں نہیں؟ اس کے ساتھ ہی شاعر نے یہ بھی کہا تھا کہ اگر یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو دنیا توحید پرستوں سے خالی ہو جائے گی۔ اس کے جواب میں اس بند میں غیبی آواز کہہ رہی ہے کہ اگر ایران میں مسلمان کمزور پڑ گئے ہیں تو یہ گھبرانے والی بات نہیں ہے۔ جس طرح پیالے سے شراب کے نشے کا اندازہ نہیں ہوتا اور پیالے کے چھوٹا یا بڑا ہونے سے نشے کی کیفیت کم یا زیادہ نہیں ہوتی، اسی طرح ایران پر مسلمانوں کی گرفت ڈھیلی پڑ رہی ہے تو اس سے توحید پرستوں کو کوئی خطرہ نہیں۔ تاتاریوں کے لشکر نے ایک زمانے میں سلطنتِ بغداد کو تباہ و برباد کر دیا تھا لیکن انہیں تاتاریوں کی اولاد نے مسلمان ہو کر دنیا میں عظیم الشان اسلامی ریاستیں قائم کی تھیں۔ اسی بات کو شاعر نے علامتی زبان میں یوں کہا ہے کہ گویا کعبے کو بُت خانے سے رکھوالے مل گئے تھے۔

آخری شعر میں شاعر کہتا ہے کہ اے مسلمان! اسلام ایک کشتی کی مانند ہے، جسے تو ہی سہارا دے سکتا ہے۔ یہ نیا دور رات کی طرح ہے۔ تیری حیثیت ایک دھندلے ستارے کی سی ہے، جو اس اندھیری رات کو روشن کر رہا ہے۔

جس دور میں یہ نظم لکھی گئی، اس میں برطانیہ اور روس نے ایک معاہدے کے تحت ایران میں اپنے حلقہ ہائے اثر متعین کر لئے تھے اور بلغاریہ نے ترکی پر حملہ کر دیا تھا، جس کے نتیجے میں مسلمانوں میں مایوسی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اقبال نے یہاں مسلمانوں کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا ہے کہ انہیں دل شکستہ نہیں ہونا چاہیئے کیونکہ قوموں کی تاریخ میں نشیب و فراز آتے ہی رہتے ہیں۔

ہے جو ہنگامہ بپا یورش بلغاری کا ۔۔۔ غافلوں کے لئے پیغام ہے بیداری کا
تو سمجھتا ہے یہ ساماں ہے دل آزاری کا ۔۔۔ امتحاں ہے ترے ایثار کا، خودداری کا

کیوں ہراساں ہے صہیل فرس اعدا سے
نور حق بجھ نہ سکے گا نفس اعدا سے

مشکل الفاظ کے معانی

یورش بلغاری۔ بلغاریہ نے ترکی پر حملہ کر دیا تھا یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ دل آزاری۔ دل کو تکلیف دینا۔ ایثار۔ قربانی۔ ہراساں۔ خوف زدہ۔ صہیل فرس اعداء۔ دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ۔ نور حق۔ اسلام کی روشنی۔ نفس اعداء۔ دشمنوں کی پھونک۔

تشریح

ایک غیبی آواز مسلمانوں سے مخاطب ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ بلغاریہ نے اگر ترکی پر حملہ کر دیا ہے اور ایک طوفان سا اٹھتا دکھائی دے رہا ہے تو یہ خواب غفلت میں پڑے ہوئے مسلمانوں کے لئے بیداری کا پیغام ہے، یعنی اس واقعہ سے مسلمانوں کو بیدار ہو جانا چاہیئے۔ تم سمجھتے ہو کہ یہ تمہارے دل کو تکلیف دینے والی بات ہے۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ تمہاری خودداری اور تمہارے جذبۂ قربانی کا امتحان ہے ــــ دشمنوں کے گھوڑوں کی ہنہناہٹ سے کیوں خوف زدہ ہوتے ہو؟ دشمنوں کی پھونکیں اسلام کی روشنی کو بجھا نہیں سکتیں۔

اس بند میں بھی شاعر نے مسلمانوں کو حوصلہ دیا ہے اور انہیں بتایا ہے کہ دشمن انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

مثل بو قید ہے غنچے میں، پریشاں ہو جا ۔۔۔ رخت بردوش ہوائے چمنستاں ہو جا
ہے تنک مایہ تو ذرے سے بیاباں ہو جا ۔۔۔ نغمۂ موج سے ہنگامۂ طوفاں ہو جا

قوت عشق سے ہر پست کو بالا کر دے
دہر میں اسم محمد سے اجالا کر دے

مشکل الفاظ کے معانی

مثل بو۔ خوشبو کی طرح۔ رخت بردوش ہونا۔ کندھے پر سامان اٹھانا۔ ہوائے چمنستان۔ باغ کی ہوا۔ تنک مایہ۔ کمزور۔ دہر۔ زمانہ۔

تشریح

اے مسلمانو! جس طرح غنچے میں خوشبو قید ہوتی ہے۔ اسی طرح حالات

کے ہاتھوں تم بھی قید ہو۔ جس طرح خوشبو غنچے سے نکل کر باغ کی ہوا کے کاندھوں پر سوار اطرافِ عالم میں پھیل جاتی ہے، اسی طرح تم بھی دُنیا میں پھیل جاؤ۔ تم کمزور ہو، تمہاری حیثیت ایک ذرے کی طرح ہے اپنے اندر اتنی وسعت پیدا کر لو کہ ذرے سے بیابان بن جاؤ۔ تم موجوں کا سُریلا گیت ہو لیکن اب ایسے کام نہیں چلے گا۔ اپنے اندر طوفانی قوت پیدا کر لو کہ وقت کا تقاضا یہی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ کیسے ہوگا؟ اس کا جواب شاعر نے آخری شعر میں دیا ہے ۔ وہ کہتا ہے کہ تمہاری قوت کا راز جذبۂ عشق میں پوشیدہ ہے۔ یہ عشق ہی ہے جو ہر پست کو بلند کر دیتا ہے۔ اس عشق کا سرچشمہ سرکارِ دو عالمؐ کی ذاتِ گرامی ہے۔ محمدؐ وہ نام ہے جس سے دنیا میں روشنی پھیلتی ہے اُٹھو اور اس روشنی کو پھیلاؤ۔ اس کے نور کو عام کر دو۔

ہو نہ یہ پھول تو بُلبل کا ترنُم بھی نہ ہو — چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسُم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو خم بھی نہ ہو — بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو

خیمہ افلاک کا استادہ اسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اسی نام سے ہے

مشکل الفاظ کے معانی

ترنم - سریلی آواز۔ دہر - زمانہ۔ خم - شراب کا مٹکا۔
افلاک - آسمان - استادہ - خیمے کا کھڑا ہونا۔
تپش آمادہ - حرارت رکھنے والی۔

تشریح

یہ اشعار شاعر نے حضور اکرمؐ کی شان میں لکھے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ حضورؐ کی ذاتِ گرامی ایک پھول کی طرح ہے، جس کے دم قدم سے بُلبلوں کے سُریلے گیت فضا میں بلند ہوتے ہیں۔ آپؐ ہی کے سبب زمانے کے باغ میں کلیاں کھلتی ہیں۔ آپؐ شرابِ معرفت پلانے والے ہیں۔ آپؐ نہ ہوتے تو نہ شرابِ معرفت ہوتی، نہ کہیں اس شراب کے مٹکے ہوتے، نہ دُنیا میں توحید کی محفل جمتی اور نہ مسلمانوں کا وجود ہوتا۔ یہ آسمان جو خیمے کی طرح ہمارے سر پہ کھڑا ہے، آپؐ ہی کی بدولت ہے اور زندگی کی نبضوں میں جو حرارت ہے وہ بھی آپؐ ہی کے طفیل ہے۔

ان اشعار میں اقبالؔ نے اس حقیقت پر زور دیا ہے کہ رسولِ کریمؐ کی ہستی ہی باعثِ تخلیقِ کائنات ہے۔ انہوں نے یہ مضمون اس حدیثِ قدسی سے لیا ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر آپؐ نہ ہوتے تو میں افلاک کی تخلیق نہ کرتا۔

بحر میں، موج کی آغوش میں، طوفان میں ہے — دشت میں، دامنِ کہسار میں میدان میں ہے
اور پوشیدہ مسلمان کے ایمان میں ہے — چین کے شہر، مراکش کے بیابان میں ہے

چشمِ اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعتِ شانِ رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ دیکھے

مشکل الفاظ کے معانی ابد۔ مراد ہے روزِ قیامت تک۔ رفعت۔ بلندی رَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۔ ہم نے آپ کے لئے آپ کا ذکر بلند کیا۔ قرآن مجید کی آیت ہے۔

تشریح وہ کونسی جگہ ہے جہاں حضور اکرمؐ کا نام نہیں لیا جاتا! صحراؤں میں، پہاڑوں کے دامن میں، میدانوں میں، سمندر میں، نرم موجوں کی آغوش میں چلنے والی کشتیوں میں، طوفانوں میں گھرے ہوئے جہازوں میں، چین کے پر رونق شہروں میں، مراکش کے بے آب وگیاہ بیابانوں میں، ہر جگہ حضورؐ کے نام لیوا موجود ہیں۔ آپ کا ذکر مبارک تو مسلمانوں کے ایمان کا مرکزی نقطہ ہے۔ دنیا کی قومیں قیامت تک یہ نظارہ دیکھیں گی اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہم نے آپؐ کے ذکر کو رفعت و بلندی عطا کی ہے۔

سرزمینِ چین سے لے کر مراکش کے علاقے تک کا وسیع وعریض خطہ مسلمانوں کے زیرِ نگین تھا جہاں عظیم الشان سلطنتیں قائم تھیں۔ ان میں صحرا بھی تھے، پہاڑ بھی تھے، میدانی علاقے بھی تھے، سمندر بھی تھے جو کبھی نرم سیر اور پُر سکون ہوتے تھے اور کبھی طوفانی بھی ہو جاتے تھے۔ حضورؐ کا اسم گرامی جگہ جگہ گونجتا تھا۔ خدا تعالیٰ نے سورۃ الم نشرح میں فرمایا ہے کہ ہم نے آپ کے ذکر کو آپ کے لئے بلند کیا ہے۔ دنیا کی تمام قومیں قیامت تک یہ نظارہ اپنی آنکھوں سے دیکھتی رہیں گی۔

وہ تمہارے شہدا پالنے والی دنیا — مردمِ چشمِ زمیں، یعنی وہ کالی دنیا
عشق والے جسے کہتے ہیں بلالی دنیا — گرمیِ مہر کی پروردہ، ہلالی دنیا

تپش اندوز ہے اس نام سے پارے کی طرح
غوطہ زن نور میں ہے آنکھ کے تارے کی طرح

مشکل الفاظ کے معانی مردمِ چشمِ زمیں۔ زمین کی آنکھ کی پتلی۔

گرمیٔ مہر ۔ سورج کی گرمی ۔ ہلالی دُنیا ۔ وہ دنیا جس پر مسلمانوں کا باریک چاند والا پرچم لہراتا ہے ۔ بلالی دُنیا ۔ وہ علاقہ جس میں حضرت بلالؓ رہتے تھے ۔ مراد افریقہ
تپش اندوز ۔ حرارت سے بھری ہوئی ۔

تشریح اس بند میں افریقی ممالک کی طرف اشارہ ہے، جہاں لوگ جوق در جوق اسلام کے دائرے میں شامل ہو رہے تھے ۔ اقبال کہتے ہیں ۔ کہ اس کالی دنیا کی طرف دیکھو ۔ اگر ہم زمین کو آنکھ تصوّر کر لیں تو یہ کالی دنیا آنکھ میں پتلی کی حیثیت رکھتی ہے ۔ اس سرزمین میں تمہارے شہیدوں نے پرورش پائی ہے ۔ یہاں سورج بڑی شدّت کے ساتھ چمکتا ہے ۔ یہاں اسلام کا سبز ہلالی پرچم لہرا رہا ہے ۔ جو لوگ زندگی میں عشق کی اہمیّت سمجھتے ہیں، وہ اس دنیا کو حضرت بلالؓ کے حوالے سے جانتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ موذنِ رسول، حضرت بلالؓ اس علاقے کے رہنے والے تھے حضور اکرمؐ کے اسمِ گرامی کا یہ کمال ہے کہ اس کی بدولت سیاہ فام اقوام کے یہ علاقے، جہاں زندگی جمود اور تعطّل کا شکار تھی، پارے کی طرح متحرک ہو گئے ہیں ۔ اور آنکھ کے تارے کی طرح نور میں ڈوب گئے ہیں ۔

افریقی ممالک میں بسنے والے لوگوں کا رنگ عام طور پر سیاہ ہوتا ہے، اس لئے اس علاقے کو کالی دُنیا کہا گیا ہے ۔

عقل ہے تیری سپر، عشق ہے شمشیر تری ۔۔۔ مرے درویش! خلافت ہے جہانگیر تری
ماسوا اللہ کے لئے آگ ہے تکبیر تری ۔۔۔ تُو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں

مشکل الفاظ کے معانی سپر ۔ ڈھال ۔ ماسوا اللہ ۔ اللہ تعالیٰ کے ماسوا جو کچھ ہے ۔

تشریح ان اشعار میں شاعر نے ان ہتھیاروں کی نشان دہی کی ہے جو راہِ حق کے مجاہدوں کے کام آتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ایک سچے مسلمان کو عقل اور عشق دونوں سے لیس ہونا چاہیئے ۔ عقل سپر کا کام کرتی ہے، جس سے وہ اپنا دفاع کرتا ہے ۔ عشق تلوار کا کام کرتا ہے ۔ یہ وہ جذبہ ہے جو اسے جدوجہد اور سعی و کوشش پر ابھارتا ہے ۔

اگر یہ دونوں چیزیں مسلمان کو میسّر ہوں تو وہ خلافتِ الٰہی کا صحیح حقدار بن جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ذات، کائنات کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے، وہ مسلمان کے نعرۂ تکبیر سے جل کر راکھ ہو جاتا ہے۔ اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائے تو جو کچھ وہ چاہتا ہے، وہ ہو جاتا ہے، یعنی اسکی تدبیر ہی اس کی تقدیر بن جاتی ہے۔ لیکن یہ سب کچھ اس وقت ممکن ہے جب وہ حضور اکرمؐ سے وفا کرے۔ ان کے اسوۂ حسنہ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنائے۔ جب ایسا ہوگا تو دنیا ہی نہیں پوری کائنات اس کے تصرف میں ہوگی۔

نظم کی تلخیص

علامہ اقبالؔ ان اشعار میں کہتے ہیں کہ اگر ایران پر یورپی اقوام مسلّط ہو رہی ہیں تو اس سے مسلمانوں کو خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ تاتاریوں کو دیکھو انہوں نے عباسی سلطنت کو تباہ و برباد کر دیا، مگر ان کی اولاد نے مسلمان ہو کر عظیم الشان اسلامی حکومتیں قائم کیں۔ اگر بلغاریہ نے ترکی پر حملہ کر دیا ہے تو اس سے دل گرفتہ کیوں ہوتے ہو؟ یہ تمہاری خودداری اور ایثار کا امتحان ہے۔ دشمنوں کی یلغار سے پریشان کیوں ہو رہے ہو؟ ان کی پھونکوں سے نورِ حق بجھ نہیں سکتا۔ تمہاری حالت ذرّے کی سی ہے۔ تم بڑھ کر بیابان بن سکتے ہو۔ تم موجِ سار سیلاگیت ہو۔ پھیل کر ہنگامہ خیز طوفان ہو سکتے ہو۔ لیکن یہ صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب تم حضور اکرمؐ کے ساتھ رشتۂ محبت استوار کرو اور ان کے اسوۂ حسنہ کی پیروی کرو۔ محمدؐ پھول ہیں۔ اگر یہ پھول نہ ہو تو دنیا میں کوئی بلبل گیت نہ گائے۔ اگر وہ ساقی نہ ہوں تو نہ کہیں شرابِ معرفتِ الٰہی ہو اور نہ توحید پرستوں کی کہیں محفل جمے۔ اسی نام کی بدولت آسمان کا خیمہ کھڑا ہے اور زندگی کی نبض چل رہی ہے۔ مسلمانوں کے ایمان کا تو یہ مرکزی نقطہ ہے۔ ذرا افریقہ کے برِاعظم کی طرف دیکھو۔ یہاں سیاہ فام لوگ آباد ہیں لیکن عشق والے اسے حضرت بلالؓ کے حوالے سے پہچانتے ہیں۔ اس علاقے میں اگر بیداری کے آثار پیدا ہو رہے ہیں تو یہ اسی نام کا کمال ہے۔ اگر مسلمان صحیح معنوں میں مسلمان بن جائیں۔ اور سرورِ کائناتؐ کے ساتھ عہدِ وفا استوار کر لیں تو یہ دنیا تو کیا ساری کائنات پر مسلمانوں کی حکمرانی

ہو سکتی ہے۔

نظم کا مرکزی خیال

حضورِ اکرمؐ باعثِ تخلیقِ کائنات ہیں۔ انہیں کے طفیل بلبلیں سُریلے گیت گاتی ہیں، چمنِ دہر میں کلیاں مسکراتی ہیں۔ توحید کی بزم قائم ہے اور آسمان کا خیمہ سروں پر تنا ہوا کھڑا ہے۔ دُنیا کے گوشے گوشے میں اُن کا نام گونجتا ہے اور مسلمانوں کے ایمان کا تو یہ مرکزی نقطہ ہے۔ اگر مسلمان دنیا میں کامیاب و کامران ہونا چاہتے ہیں تو انہیں حضورؐ کے اُسوۂ حسنہ کو اپنے لیے مشعلِ راہ بنانا چاہیئے۔ اگر ایسا ہو تو یہ خطۂ ارض تو کیا پُوری کائنات ان کے زیرِ نگیں ہو جائے۔

علامہ اقبال

شاعر

تعارف یہ نظم علامہ اقبال کے پہلے اردو مجموعہ کلام بانگِ درا میں سے لی گئی ہے اور یہ ۱۹۱۱ء اور ۱۹۱۲ء کے درمیانی عرصے میں لکھی گئی تھی۔ اس نظم میں علامہ اقبال نے شاعر کا ندی سے موازنہ کیا ہے اور شاعری کی اہمیت واضح کی ہے۔

پہلا بند

جوئے سرود آفریں آتی ہے کوہسار سے
پی کے شرابِ لالہ گوں میکدۂ بہار سے
مستِ مئے خرام کا سُن تو ذرا پیام تُو
زندہ وہی ہے، کام کچھ جس کو نہیں قرار سے
پھرتی ہے وادیوں میں کیا دخترِ خوش خرامِ ابر
کرتی ہے عشق بازیاں سبزۂ مرغزار سے
جامِ شراب کوہ کے خمکدے سے اڑاتی ہے
پست و بلند کر کے طے کھیتوں کو جا پلاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

جوئے سرود آفریں ـ گیت گاتی ہوئی ندی
کوہسار ـ پہاڑ ـ لالہ گوں ـ سرخ رنگ کا ـ
مستِ مئے خرام ـ اپنی چال کے نشے میں مست ـ دختر ـ بیٹی ـ خوش خرام ـ عمدہ چال والا ـ مرغزار ـ سبزہ زار ـ خمکدہ ـ مراد ہے شراب خانہ ـ

تشریح شاعر کہتا ہے کہ گیت گاتی ہوئی ندی پہاڑ سے آرہی ہے۔ اس نے بہار کے شراب خانے سے سرخ رنگ کی شراب پی رکھی ہے۔ وہ اپنی چال کے نشے میں مست ہے۔ ذرا سنو، وہ کچھ پیغام دے رہی ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ یہ ندی بادل کی خوش خرام بیٹی ہے، جو پہاڑوں سے اتر کر وادیوں میں پھر رہی ہے اور سبزہ زاروں میں اگے ہوئے سبزے سے اظہارِ محبت کر رہی ہے۔ یہ پہاڑ کے شرابِ خانے سے پیالہ بھر کے لاتی ہے

اور بلندیوں اور پستیوں سے گزر کر کھیتوں کو جاکر پلا دیتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ پہاڑی ندی جب پہاڑی علاقے سے اتر کر وادی میں آتی ہے تو اس کی رفتار بہت تیز ہوتی ہے۔ اس میں شور اور ہنگامہ ہوتا ہے۔ گویا وہ بھر پور انداز میں زندگی کا اظہار کرتی ہے۔ اس ندی میں انسانوں کے لیے ایک سبق ہے اور وہ یہ کہ زندگی حرکت کا نام ہے۔ یہ ندی کبھی ساکت اور خاموش نہیں رہتی۔ اس کا بہاؤ کبھی نہیں رکتا۔ اسکی حرکت ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ اس کے دم قدم سے سبزہ زاروں میں سبزہ اگتا ہے۔ اور کھیتوں میں فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔

دوسرا بند

شاعرِ دل نواز بھی بات اگر کہے کھری
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرعِ زندگی ہری
شانِ خلیل ہوتی ہے اس کے کلام سے عیاں
کرتی ہے اس کی قوم جب اپنا شعار آزری
اہلِ زمین کو نسخۂ زندگیٔ دوام ہے
خونِ جگر سے تربیت پاتی ہے جو سخنوری
گلشنِ دہر میں اگر جوئے مئے سخن نہ ہو
پھول نہ ہو، کلی نہ ہو، سبزہ نہ ہو، چمن نہ ہو

مشکل الفاظ کے معانی

دل نواز ۔ خوبصورت ۔ کھری ۔ سچی
مزرعِ زندگی ۔ زندگی کی کھیتی ۔ آزری ۔ بت تراشی
زندگیٔ دوام ۔ ہمیشہ کی زندگی ۔ سخنوری ۔ شاعری ۔ مئے سخن ۔ شاعری کی شراب

تشریح

علامہ اقبال نے پہلے بند میں ندی کا ذکر کیا ہے اور اس بند میں اس کے حوالے سے شاعر کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر ایک اچھا شاعر کھری اور صاف بات عمدگی سے کرتا ہے تو اس کے ذریعے سے زندگی کی کھیتی سرسبز ہوتی ہے۔ جب اس کی قوم بت بنا کر آزری اختیار کر لیتی ہے تو اس کے اشعار ان

بتوں کو توڑ کر حضرت ابراہیمؑ کا فریضہ سرانجام دیتے ہیں۔ وہ شاعری جس میں شاعر کا خونِ جگر شامل ہوتا ہے انسانوں کو مستقل زندگی پانے کا گر سکھاتی ہے۔ اگر دنیا کے باغ میں شاعری کی شراب کی ندی رواں نہ ہو تو نہ کہیں پھول ہو، نہ کلی ہو، نہ سبزہ ہو، نہ باغ ہو۔

مراد یہ ہے کہ زندگی کو آسودہ بنانے کے لیے شاعر اہم خدمت سرانجام دیتا ہے۔ اس کے اشعار انسان کے باطن کو چھوتے ہیں اور اسکی روح کے تاروں کو چھیڑتے ہیں۔ اس لئے وہ معاشرے میں بلند مقام رکھتا ہے۔ جب کوئی قوم گمراہ ہونے لگتی ہے تو وہ اپنے کلام کے زور سے اسے راہِ راست پر لاتا ہے۔ جس شاعری میں شاعر کا خونِ جگر شامل ہو وہ اپنے اندر بڑی تاثیر رکھتی ہے۔ اگر شاعر نہ ہو تو یہ دنیا ذوقِ حسن و جمال سے محروم ہو جائے۔

تلخیص

ایک ندی پہاڑ سے وادی کی طرف شور کرتی آرہی ہے۔ وہ انسانوں کو ایک پیغام دے رہی ہے۔ وہ پیغام یہ ہے کہ جو چیز حرکت میں ہے وہی زندہ ہے۔ سکون موت کا دوسرا نام ہے۔ اس ندی کے پانی کی بدولت مرغزاروں میں سبزہ پیدا ہوتا ہے اور کھیتوں میں فصلیں اُگتی ہیں۔ اسی طرح اگر شاعر سچائی اور صداقت کا دامن تھامے رکھتا ہے تو اس کے فیض سے زندگی کی کھیتی سرسبز ہوتی ہے۔ وہ قوم کو گمراہیوں سے بچاتا ہے۔ اگر شاعر نہ ہو تو دُنیا کبھی آسودہ خاطر نہ ہو۔

مرکزی خیال

اس نظم میں علامہ اقبال نے شاعر کی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ شاعری زندگی کی کھیتی کے لئے پانی کا کام دیتی ہے۔ اور جب قوم گمراہ ہو کر بُت تراشنے لگتی ہے تو شاعر سنّتِ ابراہیمی ادا کرتے ہوئے بت توڑتا ہے اور قوم کو سیدھی راہ پر لے آتا ہے۔ اگر شاعر نہ ہو تو دنیا کبھی آسودہ خاطر نہ ہو۔

علامہ اقبال:

"طلوعِ اسلام"

تعارف

یہ نظم علامہ اقبالؔ کے پہلے مجموعہ کلام "بانگِ درا" میں موجود ہے اور انہوں نے یہ انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے ۱۹۲۳ء کے سالانہ اجلاس میں پڑھی تھی۔

۱۹۲۳ء تک دُنیا کی سیاسی صورتِ حال مسلمانوں کے لیے حوصلہ افزا اور اطمینان بخش بن چکی تھی۔ ترکوں کو یونانیوں کے خلاف جوابی کارروائیوں میں خاصی کامیابی حاصل ہو رہی تھی، یہاں تک کہ ستمبر ۱۹۲۲ء میں انہوں نے عصمت پاشا کی زیرِ قیادت سمرنا پر قبضہ کر لیا۔ ایران بھی انقلابی تبدیلیوں کی طرف گامزن تھا۔ مصر سے برطانوی اثر و رسوخ ختم ہوا اور مصر نے آزادی کا اعلان کر دیا۔ مراکش میں ہسپانوی فوج کے مقابلے میں مجاہدِ ریف، عبدالکریم کا پلّہ بھاری تھا۔ ہندوستان میں تحریکِ ترکِ موالات زوروں پر تھی، جس میں زیادہ تر حصّہ مسلمانوں کا تھا۔ بیداری کی اس لہر نے ہندوستانی مسلمانوں کے جذبات میں ہلچل پیدا کر دی تھی۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ تمام مسلمان ممالک سامراجیوں کی غلامی کا جُوا اپنے کندھوں سے اتار پھینکنا چاہتے تھے۔

علامہ اقبال اس ساری صورتِ حال سے واقف تھے۔ "طلوعِ اسلام" اس کیفیت کا پُرجوش اور فنکارانہ اظہار ہے۔ اس نظم کے دو بند شاملِ نصاب ہیں۔

تشریح

طلوعِ اسلام

(۱)

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تُو ہے
حنا بندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تُو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہرِ مضمر کا گویا امتحاں تُو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

مشکل الفاظ کے معانی

لم یزل۔ جس کو زوال نہ ہو۔ دستِ قدرت۔ طاقت والا۔ یا غالب آنے والا ہاتھ۔ مغلوبِ گماں۔ بے یقینی کے ہاتھوں شکست کھایا ہوا۔ پرے۔ دُور۔ چرخ۔ آسمان۔ گردِ راہ۔ راستے کی دھول۔ کارواں۔ قافلہ نیلی فام۔ نیلے رنگ کا۔ مکاں فانی۔ دنیا فنا ہو جانے والی ہے۔ مکیں آنی۔ مکین بھی ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں۔ ازل۔ دنیا کا آغاز۔ ابد۔ دُنیا کا آخر یعنی قیامت۔ جاوداں۔ ہمیشہ رہنے والا۔ حنا بندی کرنا۔ مہندی لگانا۔ عروسِ لالہ۔ لالے کے پھول کو دلہن سے تشبیہ دی ہے۔ خونِ جگر۔ کلیجے کا خون، مراد ہے خلوص و محنت۔ جوہرِ مضمر۔ پوشیدہ خوبیاں۔ صداقت۔ سچائی۔ معمارِ جہاں۔ دُنیا بنانے والا۔ امین: امانت دار۔ ممکناتِ زندگانی۔ زندگی کے پوشیدہ امکانات۔ عدالت۔ عدل و انصاف۔ شجاعت۔ بہادری امامت۔ رہنمائی۔

تشریح اس بند میں شاعر مسلمانوں سے مخاطب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ خدا کی ذات وہ ذات ہے جسے کبھی زوال نہیں ہے۔ تم اس خدا کی قدرت کا ہاتھ ہو اور اس کی زبان ہو۔ مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ دنیا میں کوئی کام کرنا چاہتا ہے تو تمہارے ہاتھ سے کراتا ہے اور جب اہلِ دنیا کو کوئی پیغام دینا چاہتا ہے تو تمہاری زبان سے دلاتا ہے۔ اس سے اندازہ کرو کہ تم اس کائنات میں کتنی اہمیت رکھتے ہو۔ لیکن تم بے یقینی کے ہاتھوں شکست کھا چکے ہو۔ تمہیں اللہ کی ذات پر، رسالت کی صداقت پر، اسلام کے ابدی پیغام پر اور اپنی صلاحیتوں پر یقین اور بھروسہ نہیں ہے۔ اپنے اندر ایمان کی شمع روشن کرو اور اپنی صلاحیتوں پر اعتماد کرنا سیکھو، تاکہ دنیا میں سُرخرُو ہو سکو۔

تمہاری منزل نیلے رنگ کے آسمان سے بھی پرے ہے۔ تم وہ قافلہ ہو کہ ستارے جس کے راستے کی گرد ہیں۔ علامہ اقبال نے ایک اور جگہ کہا ہے۔

ع ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں

مراد یہ ہے کہ مسلمان کی جد و جہد اور تگ و تاز کی حد آسمان تک ختم نہیں ہو جاتی۔ اس نے تو اس آسمان سے اور ان ستاروں سے بھی آگے جانا ہے اور اس زمین کے علاوہ جو کچھ اس کائنات میں ہے اسکی بھی تسخیر کرنی ہے۔

کائنات کی ہر چیز فنا ہو جانے والی ہے۔ یہ دُنیا فانی ہے۔ اس میں بسنے والے لوگ ہمیشہ رہنے والے نہیں ہیں لیکن مسلمانوں کا دور ازل سے ابد تک پھیلا ہوا ہے، یعنی یہ کائنات کے روزِ اوّل سے ہیں اور روزِ آخرت تک رہیں گے۔ حضور سرورِ کائناتؐ آخری نبی ہیں اور ان کا پیغام دُنیا کے لئے خدا کا آخری پیغام ہے۔ تم اس پیغام کو ماننے والے اور اس کے پھیلانے والے ہو، اس لئے تم بھی ہمیشہ قائم رہو گے۔

تم نے اپنے خونِ جگر سے گُلِ لالہ کے ہاتھوں میں مہندی لگائی ہے۔ تم سُنّتِ ابراہیمی پر عمل کرنے والے ہو، اس لئے دنیا کے بنانے والے بھی تمہیں ہو۔ حضرت ابراہیمؑ نے اپنے ہاتھوں سے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔ تم چونکہ انہیں کی سُنّت کو ماننے والے ہو، اس لئے تم دنیا کی تعمیر کرو اور اپنی پوری قوتوں اور صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر اس دُنیا کی آرائش اور زیبائش کرو۔

دنیا میں جو کچھ ممکن ہو سکتا ہے وہ سب کچھ تمہاری ذات میں ودیعت کر دیا گیا ہے۔ گویا تم جہان کی چھپی ہوئی خوبیوں اور صلاحیتوں کا امتحان ہو۔ مراد یہ ہے کہ دنیا میں جو کام بھی ممکن ہے اسکو کرنے کی صلاحتیں تمہارے اندر موجود ہیں۔ اگر کوئی یہ دیکھنا چاہے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو سکتا ہے تو وہ تمہیں دیکھے۔ اِس سے دُنیا کے جوہرِ مضمر کا صحیح اندازہ ہو جائیگا۔

تم دنیا کے قائد اور رہنما بننے والے ہو۔ ایک قائد میں تین خوبیوں کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ وہ سچائی کا علم بردار ہو۔ عدل وانصاف کرنے والا ہو اور بہادر ہو۔ اپنے آپ میں یہ تینوں خوبیاں پیدا کرو۔ انہیں کی بدولت تمہارے آباء و اجداد سر بلند ہوئے اور انہیں کی وجہ سے تم سرفراز ہو سکتے ہو۔

(۲)

یہی مقصودِ فطرت ہے۔ یہی رمزِ مسلمانی
اخوّت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی
بُتانِ رنگ وخوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی، نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک
ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
گماں آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا؟ زورِ حیدر، فقرِ بوذر، صدقِ سلمانی
جب اس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ روح الامیں پیدا

مشکل الفاظ کے معانی

مقصود۔ ارادہ۔ رمز۔ اشارہ۔ جہانگیری دنیا پر قبضہ کرنا، حکمرانی۔ فراوانی: کثرت۔ زیادتی۔

تورانی۔ ترکستان کے رہنے والے۔ اخوت۔ بھائی چارہ۔ میانِ شاخساراں۔ شاخوں کے درمیان۔
صحبتِ مرغِ چمن: باغ کے پرندے کی ہم نشینی۔ شاہینِ قہستانی: پہاڑوں پر رہنے والا باز۔
گماں آباد: اوہام سے بھری ہوئی۔ خیالی۔ تصوراتی۔ ہستی: زندگی۔ بیابان: اجاڑ ویرانہ۔ قندیلِ رہبانی۔ کسی درویش کی کٹیا کا چراغ۔ قیصر و کسریٰ: قیصر، روم کے بادشاہوں کا لقب اور کسریٰ، ایران کے بادشاہوں کا لقب۔ یہاں مراد ہے ایران اور روم کے حکمران۔ استبداد: ظلم و تشدد۔ فقر۔ درویشی۔ صدق۔ سچائی۔

حیدر۔ خلیفہ چہارم حضرت علیؓ۔ ابوذر۔ مشہور صحابی حضرت ابوذر غفاریؓ

سلمان۔ مشہور صحابی حضرت سلمان فارسیؓ۔ روح الامین۔ جبرئیل فرشتہ۔

تشریح

شاعر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ فطرت کا ارادہ بھی یہی ہے اور تمہارا مسلمان ہونا بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ تم دنیا میں بھائی چارے کو پھیلاؤ اور محبت کو عام کرو۔ تم نے رنگ اور نسل کے جو بت بنا رکھے ہیں انہیں توڑ کر وحدتِ ملی میں گم ہو جاؤ اور ترکستانی، ایرانی اور افغانی کا امتیاز مٹا دو۔ تمہارے بازوؤں میں خدا تعالیٰ نے پہاڑی شہباز کی قوت رکھی ہے۔ اس سے کام لو۔ تم کب تک باغ کے پرندوں کی صحبت میں شاخوں کے درمیان بیٹھے رہو گے؟ یہ دنیا وہم و گمان اور بے یقینی کی بستی ہے۔ یہاں مسلمان کا ایمان اسی طرح ہے جس طرح بیابان کی ایک اندھیری رات میں کسی درویش کی کٹیا کا چراغ جل رہا ہو۔ جب مسلمانوں نے اپنے ابتدائی دور میں روم کے قیصر اور ایران کے کسریٰ کے ظلم و ستم ختم کئے تھے تو جانتے ہو ان کے پاس کون سی خاص طاقت تھی، جس کے بل بوتے پر انہوں نے یہ کارنامے سرانجام دیئے تھے؟ ان کے پاس حضرت علیؓ کی قوت تھی، حضرت ابوذر غفاریؓ کی درویشی اور بے نیازی تھی اور حضرت سلمانؓ فارسی کی سچائی اور صداقت تھی۔ اگر تم میں یہ خوبیاں پیدا ہو جائیں تو تم جو خاک کے پتلے ہو لیکن اپنے اندر حرارت اور گرمی بھی رکھتے ہو، تمہیں جبرئیل فرشتے جیسے بال و پر مل سکتے ہیں اور تمام دنیا تمہارے پروں کے نیچے ہو سکتی ہے۔

مفہوم یہ ہے کہ اگر تم رنگ اور نسل کی تفریق ختم کر دو۔ آپس میں بھائی چارے اور محبت کی فضا قائم کرو اور ان تمام صلاحیتوں سے کام لو جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا

کر رکھی ہیں، اپنے یقین اور ایمان کو پختہ کرو، حضرت علیؓ حضرت ابوذر غفاریؓ اور حضرت سلمان فارسیؓ کی صفات کو پیش نظر رکھو۔ تو تم تمام دنیا پر چھا سکتے ہو اور ہر جگہ تمہاری حاکمیت قائم ہو سکتی ہے۔

نظم کی تلخیص

شاعر مسلمانوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ اگر تم صحیح معنوں میں مسلمان بن جاؤ تو تمہارا ہاتھ خدا کا ہاتھ ہے اور تمہاری زبان خدا کی زبان ہے مگر تمہیں نہ خدا پر بھروسہ ہے نہ اپنی حیثیت اور مقام کو سمجھتے ہو، اس لئے بے یقینی کا شکار ہو۔ تم نے دنیا میں بہت کچھ کرنا ہے۔ اس پوری کائنات کی تسخیر تمہاری ذمہ داری ہے۔ اس دنیا میں جتنی خوبیاں کسی مخلوق میں ہو سکتی ہیں، وہ سب تم میں موجود ہیں، لیکن تم ان سے کام نہیں لیتے۔ تم دنیا کے رہنما بننے والے ہو اسلئے صداقت، عدل و انصاف اور شجاعت کا سبق سیکھو۔ تم رنگ اور نسل کے بت بنا کر ان کو پوج رہے ہو۔ اپنے آپ کو ترک، ایرانی اور افغانی کہلانا پسند کرتے ہو۔ ان بتوں کو توڑ دو۔ ان گروہ بندیوں کو ختم کرو اور ایک ملت میں ضم ہو جاؤ۔ اپنے دلوں میں یقین اور ایمان کی شمع روشن کرو۔ جب ایسا ہوگا تو جبریل فرشتے کی طرح تمہارے بھی بال و پر نکل آئیں گے اور تم بھی بلندیوں کی طرف پرواز کرنے لگو گے۔

نظم کا مرکزی خیال

مسلمان بہت بڑی قوت ہے۔ جو کچھ انسان اس کائنات میں کر سکتا ہے وہ سب کچھ اس کی فطرت میں ودیعت کر دیا گیا ہے مگر وہ مغلوب گماں ہے۔ وہ بے یقینی کا شکار ہے۔ اسے اپنے اوپر بھروسہ نہیں ہے۔ مسلمان کو چاہیئے کہ اپنے یقین اور ایمان کو مضبوط بنائے، تاکہ وہ دنیا میں سر بلند ہو اور کامیابی اس کے قدم چومے۔

"بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو"

تعارف بلوچستان رقبے کے اعتبار سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے لیکن آبادی کے اعتبار سے سب سے چھوٹا ہے۔ یہاں کے باشندے بلوچ کہلاتے ہیں۔ یہ بڑے بہادر، جری اور غیرت مند لوگ ہیں اور دین اسلام کے ساتھ بڑی محبت رکھتے ہیں۔ یہ پہاڑوں اور صحراؤں کی سرزمین ہے۔ آج کل تو یہ صوبہ ترقی کی راہ پر گامزن ہے۔ سوئی کے مقام سے قدرتی گیس نکلی ہے جو ہمارے ملک کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ تیل اور معدنیات نکلنے کے امکانات بھی موجود ہیں جن کے لئے مسلسل کوششیں کی جاری ہیں لیکن علامہ اقبال کے زمانے میں یہاں ترقی کے آثار نہیں تھے۔ یہ علاقہ پسماندہ علاقہ تھا، یہاں کا سب سے بڑا اثاثہ ملی غیرت تھا۔

"بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" کا اقتباس علامہ اقبال کی کتاب "ارمغانِ حجاز" سے لیا گیا ہے۔ یہ کتاب اردو اور فارسی دونوں زبانوں میں لکھی گئی ہے۔ اور علامہ اقبال کی وفات کے بعد ۱۹۳۸ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس وقت تک سیاسی اور مذہبی صورت حال یہ تھی کہ ایران میں جس کی سرحد بلوچستان سے ملتی ہے، رضا شاہ انگریزوں کے تعاون سے برسر اقتدار آچکا تھا اور ایرانیوں میں یورپی اثر تیزی کے ساتھ نفوذ کر رہا تھا۔ ترکی میں مصطفیٰ کمال پاشا کی زیرِ قیادت جو انقلاب آیا اس نے ترکوں کو مذہب سے بے گانہ کر دیا اور ملک بھر میں لادینیت کی فضا پیدا کر دی۔ مصر میں بھی مذہبی گرفت ڈھیلی پڑتی جارہی تھی۔ ان ملکوں میں اگرچہ مسلمانوں کا اقتدار بحال ہو گیا تھا جو ایک خوش آئند بات تھی اور علامہ اقبال اس صورتِ حال سے خوش بھی تھے لیکن مسلمانوں کی مذہب سے بیگانگی اور لادینیت کی طرف رجحان ان کو بے چین کر رہا تھا۔

زیرِ نظر نظم میں ایک بڈھا بلوچ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا ہے کہ مذہب سے بیگانگی اختیار کر کے جو آزادی حاصل کی جائے، وہ گھاٹے کا سودا ہے۔

—— (۱) ——

ہو تیرے بیاباں کی ہوا تجھ کو گوارا
اس دشت سے بہتر ہے نہ دلّی، نہ بخارا
جس سمت میں چاہے صفتِ سیلِ رواں چل
وادی یہ ہماری ہے، وہ صحرا بھی ہمارا
غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارا

مشکل الفاظ کے معانی

بیاباں ۔ ویرانہ ۔ اجاڑ جگہ ۔ دشت ۔ صحرا ۔ جنگل ۔
بخارا ۔ روسی ترکستان کا ایک مشہور شہر ۔
صفتِ سیلِ رواں ۔ بہتے ہوئے سیلاب کی طرح ۔ دارا ۔ ایران کا جلیل القدر بادشاہ ۔
مقدّر ۔ قسمت ۔ تگ و دو ۔ کوشش ۔

تشریح

بڈھا بلوچ اپنے بیٹے سے مخاطب ہو کر کہہ رہا ہے کہ خدا کرے تیرے بیابان کی آب و ہوا تجھ کو راس ہو۔ یاد رکھو کہ دلّی اور بخارا جیسے ترقی یافتہ شہر جو بادشاہوں کے دارالحکومت بھی رہے اور علوم و فنون کا مرکز بھی، اس بیابان سے بہتر نہیں ہیں۔ بڑے شہروں میں رہ کر انسان کو کچھ پابندیاں قبول کرنی پڑتی ہیں۔ لیکن یہاں تم بہتے ہوئے سیلاب کی طرح آزاد ہو۔ جس طرف جی چاہے نکل جاؤ۔ یہ وادیاں، یہ صحرا سب ہمارے ہیں۔ اس دنیا میں انسان کو وہ کچھ ملتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرتا ہے، یعنی یہ دُنیا جہانِ تگ و دو ہے۔ اس میں غیرت بہت بڑی چیز ہے۔ غیرت مند انسان غریب بھی ہو تو بھی بادشاہ ہے۔ وہ کسی کے سامنے جھکتا نہیں ہے۔ لوگ، اس کی عزت کرتے ہیں، احترام کرتے ہیں۔ قوم

کا ہر فرد اپنی جگہ بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اور قوم کی تعمیر میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔ یوں سمجھو کہ قوموں کی تقدیر افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے اور افرادِ ملّت کے مقدّر کے ستارے ہوتے ہیں۔

(۲)

دیں ہاتھ سے دے کر اگر آزاد ہو ملّت
ہے ایسی تجارت میں مسلماں کا خسارا
دُنیا کو ہے پھر معرکۂ رُوح و بدن پیش
تہذیب نے پھر اپنے درندوں کو ابھارا
اللہ کو پامردیٔ مومن پہ بھروسا
ابلیس کو یورپ کی مشینوں کا سہارا
اخلاصِ عمل مانگ نیا گانِ کہن سے
"شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را"

مشکل الفاظ کے معانی

دین۔ مذہبِ اسلام۔ ملّت۔ مسلمان قوم۔ معرکہ: لڑائی۔ تہذیب۔ مراد ہے مغربی تہذیب پامردی۔ ہمت اور حوصلہ۔ نیاگانِ کہن۔ پرانے بزرگ یا آباؤاجداد۔ نیاگان کے معنی ہیں باپ یا ماں کی طرف سے بزرگ، دادے، نانے وغیرہ۔

شاہاں چہ عجب...... بادشاہ اگر گداؤں کو نوازیں تو تعجب نہیں ہونا چاہیے۔

تشریح

بڈھا بلوچ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا ہے کہ اگر ہاتھ سے اپنا دین گنوا کر آزادی حاصل کی جائے تو یہ مسلمانوں کے لیے خسارے کا سودا ہے۔ مسلمانوں کو ہر حالت میں دین کو مقدم سمجھنا چاہیے۔ آج کے دور میں پھر مادہ پرستی اور روحانیت کے درمیان جنگ جاری ہے اور مغربی تہذیب اپنی پوری حشر سامانیوں کے ساتھ مذہبی اقدار کے خلاف برسرِ پیکار ہے۔ ایک طرف اللہ کے سپاہی ہیں تو دوسری طرف ابلیس کی فوج صف آرا ہے۔ اللہ کی فوج مسلمانوں کی ہمت اور حوصلے پر انحصار کر رہی ہے، جبکہ ابلیس کے سپاہی یورپ

کے جنگی سامان و سامان پر بھروسہ کر رہے ہیں۔

نظم کی تلخیص

بڈھا بلوچ اپنے بیٹے کو نصیحت کر رہا ہے کہ دِلّی اور بخارا بڑے شہر ہیں اور بادشاہوں کے دارالحکومت بھی رہے ہیں مگر تمہارا بیابان اس سے بہتر ہے۔ کیونکہ اس میں تم ہر طرح آزاد ہو۔ تم پر کوئی پابندی نہیں ہے۔ آزاد لوگ غیرت مند ہوتے ہیں۔ اور گدائی میں بھی بادشاہی کرتے ہیں۔ لیکن اگر آزادی دین کو گنوا کر حاصل ہو تو ایسی تجارت مسلمانوں کے لئے گھاٹے کا سودا ہے۔ آج کی دُنیا مادہ پرست ہو گئی ہے اور مذہب اور مادہ پرستی میں جنگ جاری ہے۔ خدائی قوتیں مسلمانوں کی حوصلہ مندی پر انحصار کر رہی ہیں جب کہ ابلیسی طاقتیں مغرب کی بنائی ہوئی مشینوں کا سہارا لے رہی ہیں۔

نظم کا مرکزی خیال

علامہ اقبال نے اس نظم میں یہ بات واضح کی ہے کہ غیرت ہو تو غربت کی زندگی بھی قابل قبول ہے۔ اس وقت دنیا میں خیر و شر کی کشمکش برپا ہے اور مسلمان دین پر دُنیا کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ مسلمان خدا پر بھروسہ کرتا ہے جبکہ مغربی تہذیب کے علم بردار ابلیس کی انگیخت پر ہلاکت آفریں ہتھیاروں پر تکیہ کرتے ہیں۔ قوموں کی قسمت افراد کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اگر قوم کے افراد سر بلند ہونے کا تہیہ کر لیں تو ان کی تقدیر سنور سکتی ہے۔ اور کوئی طاقت ان کے رستے میں حائل نہیں ہو سکتی۔

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء - ۱۹۸۲ء)

مزارِ قطب الدین ایبک

تعارف قطب الدین ایبک برصغیر پاک و ہند کا پہلا مسلمان بادشاہ تھا۔ اس سے قبل اگرچہ محمود غزنوی اور شہاب الدین محمد غوری ہندوستان کے کئی علاقے فتح کر چکے تھے۔ مگر وہ فتوحات کے بعد غزنی لوٹ جاتے تھے۔ ان کے ذہن میں برصغیر میں اسلامی مملکت کے قیام کا خیال کبھی نہیں آیا۔ قطب الدین ایبک نے جو شہاب الدین محمد غوری کا غلام تھا برصغیر کے بہت سے علاقے تسخیر کئے، کئی جنگیں لڑیں، اور اس قطعۂ ارض پر ایک اسلامی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ اس نے ہندوستان میں جس حکمران خاندان کی داغ بیل ڈالی وہ خاندانِ غلاماں کہلایا کیونکہ یہ حکمران یا تو خود کسی دور میں غلام رہ چکے تھے یا وہ غلاموں کی اولاد تھے۔ سلطان قطب الدین ایبک بڑا ذہین اور دور اندیش حکمران تھا۔ اس کا دورِ حکومت اگرچہ مختصر تھا، لیکن اس نے اپنی اعلیٰ انتظامی صلاحیتوں کی بدولت برصغیر کی تاریخ پر گہرے نقش چھوڑے ہیں اس کا مزار لاہور میں انار کلی بازار کے قریب ایک روڈ پر واقع ہے۔

ابوالاثر حفیظ جالندھری جنہیں پاکستان کے قومی ترانے کے خالق کی حیثیت سے خصوصی شہرت حاصل ہے۔ اردو کے ایک قادر الکلام شاعر ہیں۔ انہوں نے مختلف اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ غزلوں، نظموں اور گیتوں کے علاوہ انھوں نے تاریخِ اسلام کو بھی منظوم کیا ہے جو چار جلدوں میں ہے اور "شاہنامہ اسلام" کے نام سے مشہور ہے موجودہ نظم "شاہنامہ اسلام" میں سے لی گئی ہے۔ اور مثنوی کی ہیئت میں ہے۔ کیونکہ اس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں۔

اشعار کی تشریح

وہ قطب الدین وہ مردِ مجاہد جس کی ہیبت سے
یہ دنیا از سرِ نو جاگ اٹھی تھی خوابِ غفلت سے

وہ جس کی تیغِ ہیبت ناک سے سفاک ڈرتے تھے
وہ جس کے بازوؤں کی دھاک سے افلاک ڈرتے تھے

یہاں لاہور میں سوتا ہے اک گمنام کوچے میں
پڑی ہے یادگارِ دولتِ اسلام، کوچے میں
میں اکثر شہر کے پُرشور ہنگاموں سے اکتا کر
سکوں کی جستجو میں بیٹھ جاتا ہوں یہاں آکر

مشکل الفاظ کے معانی

مردِ مجاہد۔ خدا کی راہ میں جنگ لڑنے والا۔
ہیبت۔ خوف۔ از سرِ نو۔ نئے سرے سے۔
تیغ۔ تلوار۔ سفاک۔ ظالم۔ دھاک۔ رعب۔ افلاک: فلک کی جمع۔ آسمان
گمنام کوچہ۔ وہ گلی جسے کوئی نہیں جانتا۔ یادگار۔ نشانی۔ جستجو۔ تلاش۔

تشریح

شاعر کہتا ہے کہ قطب الدین ایبک وہ بہادر مرد تھا جس نے دین کی خاطر جنگیں لڑیں۔ وہ بڑے رعب اور دبدبے والا شخص تھا۔ اس نے دنیا کو از سرِ نو غفلت کی نیند سے بیدار کیا۔ اس کی خوفناک تلوار سے ظالم ڈرتے تھے اور اس کے بازوؤں میں وہ قوت تھی جس سے تمام دنیا خوف کھاتی تھی۔ یہ مردِ مجاہد جو اسلام کی دولت تھا، وہ لاہور کی ایک غیر معروف گلی میں سو رہا ہے یعنی اس کی قبر ایک ایسی گلی میں ہے جو زیادہ مشہور نہیں ہے۔ اکثر اوقات جب میں شہر کے ہنگاموں سے تنگ آ جاتا ہوں اور مجھے سکون کی تلاش ہوتی ہے تو میں اس کے مزار پر جا کر بیٹھ جاتا ہوں۔

تخیّل مجھ کو لے جاتا ہے اک پُرہَول میداں میں
جہاں باہم بپا ہوتی ہے جنگ انبوہِ انساں میں
نظر آتا ہے لہراتا ہوا اسلام کا جھنڈا
بہر سُو نور پھیلاتا ہوا اسلام کا جھنڈا
مقابل میں گھٹائیں دیکھتا ہوں فوجِ باطل کی
نظر آتی ہے فرعونی خدائی اوجِ باطل کی
صدائیں نعرہ ہائے جنگ کی آتی ہیں کانوں میں
بلند آہنگ تکبیریں سما جاتی ہیں کانوں میں

مشکل الفاظ کے معانی

تخیل - خیال - پُرہول - ڈرانے والا -
باہم - آپس میں - انبوہِ انساں - انسانوں کے ہجوم -
ہر سو - ہر طرف — فوجِ باطل — جھوٹ کی فوج مراد ہے کافروں کی فوج -
اوجِ باطل - کفر کی بلندی - فرعونی خدائی - خدا کے نافرمان حکمرانوں کی حکومت
بلند آہنگ - بلند آواز - تکبیریں - اللہ اکبر کے نعرے -

تشریح

شاعر کہتا ہے کہ جب میں قطب الدین ایبک کے مزار پر جاکر بیٹھتا ہوں تو میرے ذہن میں ان جنگوں کا منظر گھومنے لگتا ہے جو قطب الدین ایبک نے لڑی تھیں - میرے خیالات مجھے ایک ایسے خوفناک میدان میں لے جاتے ہیں جہاں انسانوں کے گروہ ایک دوسرے سے معروفِ جنگ ہیں - جہاں اسلام کی فتح ہوتی ہے - اس کا جھنڈا لہراتا ہے اور ہر طرف نور پھیلاتا ہے - کبھی مسلمانوں کے مقابلے میں کفر کی عظیم فوجیں دکھائی دیتی ہیں، جو گھٹاؤں کی طرح پھیلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں - یوں لگتا ہے جیسے کفر بلندیوں کی طرف بڑھ رہا ہے اور اس کی فرعونی خدائی قائم ہونے والی ہے - فرعون مصری بادشاہوں کا ایک خاندان تھا، جو بڑے ٹھاٹھ باٹھ سے حکومت کرتا تھا اور ہر بادشاہ کو خدا ہونے کا دعویٰ ہوتا تھا - انہیں میں سے ایک فرعون حضرت موسیٰ کے زمانے میں بھی تھا جو بنی اسرائیل کا تعاقب کرتے ہوئے دریائے نیل میں غرق ہو گیا تھا -

کبھی کبھی جنگی نعروں کی بلند آوازیں بھی کانوں میں آنے لگتی ہیں - ان میں نعرۂ تکبیر، اللہ اکبر کی آوازیں بھی شامل ہوتی ہیں -

نظر آتا ہے مجھ کو سُرخرو ہونا شہیدوں کا
وہ اطمینان، وہ ہنستا ہوا چہرہ امیدوں کا

عَلَم کے سائے میں سلطانِ غازی کا بڑھے جانا
سرِ دشمن پہ افواجِ حجازی کا چڑھے جانا

مجھے محسوس ہوتا ہے کہ غازی مرد ہوں میں بھی
پرانے لشکرِ اسلام کا اک فرد ہوں میں بھی

شہادت کے رَجز پڑھتا ہوں میدانِ شہادت میں
رَجز پڑھتا ہوا بڑھتا ہوں ارمانِ شہادت میں

مشکل الفاظ کے معانی

سرخرو ہونا - کامیاب ہونا۔ شہید - اللہ کی راہ میں جان دینے والا۔ علم - جھنڈا - سلطانِ غازی: اسلام کی کی خاطر لڑی جانے والی جنگ میں فتح حاصل کرنے والا بادشاہ۔ مراد سلطان قطب الدین ایبک۔ افواجِ حجازی - مسلمانوں کی فوجیں۔ رجز - وہ اشعار جو جنگ کے موقع پر پڑھے جاتے ہیں۔ ارمانِ شہادت - شہادت کی خواہش۔

تشریح

شاعر کی نگاہِ تخیل میدانِ جنگ کا نقشہ دیکھ رہی ہے۔ اُسے نظر آرہا ہے کہ بہت سے مجاہدوں نے اپنی جانیں قربان کر دی ہیں لیکن ان کے چہرے پر پھیلا ہوا خون ان کی کامیابی کی دلیل بن گیا ہے۔ انہوں نے بلند مقاصد کے لئے جان دی ہے، اس لئے ان کے چہروں پر اطمینان ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ سلطان قطب الدین ایبک جھنڈے کے سائے میں آگے بڑھ رہا ہے اور مسلمان فوجیں دشمنوں پر چڑھ دوڑی ہیں۔ شاعر محسوس کرتا ہے کہ وہ بھی لشکرِ اسلام کا ایک فرد ہے۔ اس جنگ میں حصّہ لے رہا ہے اور جنگی اشعار پڑھتا ہوا، شہادت کا شوق لئے، اس میدان کی طرف بڑھ رہا ہے جہاں فوجیں گھمسان کی جنگ میں مصروف ہیں۔

عظیم الشان ہوتا ہے یہ منظر پاکبازی کا
شہیدوں کی خموشی، غلغلہ مردانِ غازی کا

مرا جی چاہتا ہے اب نہ اپنے آپ میں آؤں
اسی آزاد دُنیا کی فضا میں جذب ہو جاؤں

مشکل الفاظ کے معانی

پاک بازی — نیکی۔ پاکیزگی
غلغلہ — شور

تشریح

عظیم اور نیک مقاصد کے لئے جان دینے کا یہ منظر بڑا پاکیزہ اور شاندار ہوتا ہے۔ یہاں شہیدوں کی لاشیں ہیں جو خاموش ہیں۔ یہاں فتح یاب ہونے والے وہ مردانِ غازی ہیں، جن کے نعروں سے میدان جنگ گونج رہا ہے۔ اس منظر اور ماحول میں شاعر اس طرح کھو جاتا ہے کہ وہ واپس اپنی دُنیا میں آنا نہیں چاہتا اور یہ فضا اس کو اتنی پسند آئی ہے کہ وہ اسی میں گم ہو جانا چاہتا ہے۔

نظم کی تلخیص

سلطان قطب الدین ایبک ہندوستان میں اسلامی سلطنت کا بانی تھا۔ شاعر لاہور کی ایک گم نام گلی میں اس کا مزار دیکھتا ہے تو اسے افسوس ہوتا ہے کہ اس مردِ مجاہد کی قبر پر کوئی فاتحہ پڑھنے کے لئے نہیں آتا۔ اسے سلطان کے جنگی کارنامے یاد آتے ہیں۔ وہ اپنی نگاہِ تصوّر سے ان جنگوں کا منظر دیکھتا ہے تو اسے محسوس ہوتا ہے کہ ہر طرف کفر کی فوجیں صف باندھے کھڑی ہیں۔ جنگی نعرے بلند ہو رہے ہیں۔ مجاہدین جانیں قربان کر رہے ہیں لیکن ان کے چہروں پر اطمینان کے گلاب کھلے ہوئے ہیں۔ سلطان کی فوج کفّار کے لشکروں کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ رہی ہے۔ سلطان خود بھی جھنڈے کے سائے میں پیش رفت کر رہا ہے۔ یہ منظر اتنا جاذبِ توجہ ہے کہ شاعر خود کو اسی منظر کا ایک حصّہ سمجھتا ہے۔ اسے محسوس ہوتا ہے کہ وہ لشکرِ اسلام کا ایک فرد ہے جو جنگی اشعار پڑھتے ہوئے دل میں شہادت کے ارمان لئے لشکر کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے۔ وہ اس منظر میں اتنا محو ہو جاتا ہے کہ واپس اپنی دنیا میں نہیں آنا چاہتا۔ وہ اسی پُر لطف اور پُر سکون ماحول میں ڈوبا رہنا چاہتا ہے۔

نظم کا مرکزی خیال

شاعر قطب الدین ایبک کے مزار پر جاتا ہے۔ اسے یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ سلطان ایک گم نام سی گلی میں دفن ہے اور یہاں فاتحہ خوانی کرنے والوں کا ہجوم نہیں ہے۔ اسے سلطان کے وہ کارنامے یاد آتے ہیں جو اس نے برِصغیر میں اسلامی سلطنت کے قیام کے سلسلہ میں سرانجام دیئے تھے۔

جلوۂ سحر

تعارف یہ نظم حفیظ جالندھری کے پہلے مجموعۂ کلام "نغمہ زار" میں سے لی گئی ہے جو ۱۹۲۵ء میں پہلی دفعہ شائع ہوا۔ منظر کشی اور موسیقیت حفیظ جالندھری کا خاص فن ہے۔ اس نظم میں صبح کے منظر کو نہایت عمدگی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اس میں موسیقیت اس طرح رچی بسی ہے کہ دل وجد کرنے لگتا ہے۔ جہاں تک نظم کی ہیئت کا تعلق ہے اس نظم میں شاعر نے ایک نیا ہیئتی نظام وضع کیا ہے۔ ہر بند سات سات اشعار پر مشتمل ہے۔ ہر بند کا پہلا

اور آخری شعر یکساں ہے اور اس کے دونوں مصرع ہم قافیہ ہیں۔ اس طرح دوسرے، پانچویں اور چھٹے شعر کے اپنے اپنے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہیں، البتہ تیسرے اور چوتھے شعر کے مصرع ہائے ثانی باہم ہم قافیہ ہیں جو ایک قطعہ سا بناتے رہے ہیں۔ پوری نظم میں ایک ہی بحر استعمال ہوئی ہے اور ہر بند گویا ایک دائرہ بناتا ہے کیونکہ جس شعر سے اس کا آغاز ہوتا ہے، اُسی شعر پر اس کا اختتام بھی ہوتا ہے۔ یوں حفیظ جالندھری نے پابند نظم کی حدود میں رہتے ہوئے بھی ایک نیا ہیئتی تجربہ کیا ہے جو نظم کی عنائیت میں اضافہ کرتا ہے۔

چلا ستارۂ سحر سُنا کے صُبح کی خبر
زمیں پہ نُور چھا گیا فلک پہ رنگ آگیا
تمام زادگانِ شب چمک چمک کے سو گئے
شرارِ آسمانِ شب دمک دمک کے سو گئے
ستارے زرد ہو چکے چراغ سرد ہو چکے
وہ ٹمٹما کے رہ گئے یہ جھلملا کے رہ گئے
چلا ستارۂ سحر
سُنا کے صبح کی خبر

مشکل الفاظ کے معانی

ستارۂ سحر۔ صبح کا تارہ۔ زادگانِ شب۔ رات کو پیدا ہونے والے، مراد ہے چاند ستارے وغیرہ۔
شرارِ آسمانِ شب۔ رات کے آسمان کی چنگاریاں، مراد ستارے۔ سرد ہونا۔ بجھ جانا۔ ٹمٹمانا۔ روشنی کم کم ہونا۔ جھلملانا۔ کم کم چمکنا۔

تشریح

صبح ہونے سے تھوڑی دیر قبل آسمان پر ایک بڑا اور چمکتا ہوا ستارہ دکھائی دیتا ہے۔ یہ اس بات کی علامت ہے کہ صبح ہونے والی ہے۔ اس تارے کو ستارۂ سحر یا صبح کا ستارہ کہا جاتا ہے۔

اس بند میں شاعر کہہ رہا ہے کہ صبح کا ستارہ صبح کی خبر سُنا کر غائب ہو گیا ہے۔ صبح طلوع ہو رہی ہے۔ زمین پر روشنی پھیل گئی ہے۔ آسمان جس پر رات بھر سیاہی چھائی رہی، اس پر صبح کی سفیدی اپنا رنگ جما رہی ہے۔ چاند اور ستارے جو رات بھر چمکتے رہے ہیں اور رات کی تاریکی کو کم کرنے کی کوشش میں مصروف رہے ہیں، وہ سو گئے ہیں یعنی ان

کی چمک ماند پڑ گئی ہے۔ مدھم ستارے جو رات کے وقت آسمان پر چنگاریوں کی طرح دکھائی دیتے تھے، ان کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہو کر بالکل ختم ہو گئی ہے۔ یوں سمجھنا چاہیے کہ ستارے پیلے پڑ گئے ہیں۔ ان پر موت کی زردی چھا گئی ہے اور وہ چراغ جو گھروں کو روشن کیے ہوئے تھے، بجھ گئے ہیں۔ اگلے شعر میں ستاروں کی نسبت سے "جھلملانا" اور چراغوں کی نسبت سے "ٹمٹمانا" کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ ستاروں کی روشنی آہستہ آہستہ کم ہوتی گئی یہاں تک کہ بالکل ختم ہو گئی اور چراغوں کی لو بھی کم ہوتے ہوتے بجھ گئی۔ آسمان پر چاند تاروں کا طلوع اور گھروں اور بستیوں میں چراغوں کا جلنا رات کی علامتیں ہیں۔ اب چونکہ صبح ہو رہی ہے اس لیے چاند ستارے بھی ماند پڑ گئے ہیں اور مکانوں اور آبادیوں کے چراغ بھی بجھ گئے ہیں۔

صبح کے ستارے نے صبح کے آنے کی اطلاع دی اور خود غائب ہو گیا۔

(۲)

یکایک ایک نور کا — غبار شرق سے اٹھا
جو رفتہ رفتہ بڑھ چلا — اور آسماں پہ چھا گیا
حسینۂ نمود نے — سیہ نقاب اٹھا دیا
فسوں گرِ شہود نے — طلسمِ شب مٹا دیا
یکایک ایک تازگی
یکایک ایک روشنی
نگاہِ جاں میں آ گئی — حیات میں سما گئی
یکایک ایک نور کا — غبار شرق سے اٹھا

مشکل الفاظ کے معانی

شرق۔ مشرق۔ حسینۂ نمود۔ کائنات کی حسینہ۔ کائنات کو حسینہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ نقاب۔ چہرے کا پردہ۔ فسوں گر۔ جادوگر۔ شہود۔ وہ اشیاء جن کا مشاہدہ کیا جا سکے۔ فسوں گرِ شہود۔ فطرت کا جادوگر۔ فطرت کو جادوگر سے تشبیہ دی گئی ہے۔ طلسمِ شب۔ رات کا جادو۔ حیات۔ زندگی۔ نگاہِ جاں۔ زندگی کی نظر۔

تشریح اس بند میں صبح کے طلوع کا منظر بیان ہوا ہے۔ صبح کا ستارہ تو آمدِ صبح کی خبر دے کر غائب ہو گیا۔ اب کائنات پر نظر ڈالیں تو محسوس ہوتا ہے کہ سارا منظر تبدیل ہو رہا ہے۔ رات کے وقت ہر طرف اندھیرا تھا۔ لیکن طلوعِ صبح کے ساتھ ہی مشرق کی طرف سے روشنی کا غبار اٹھا ہے جس نے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوئے تمام آسمان کو اپنے گھیرے میں لے لیا ہے۔ صبح کی روشنی کو غبار اس لئے کہا ہے کہ وہ دھندلی ہوتی ہے۔ اگلے شعر میں شاعر نے کائنات کو حسینہ سے تشبیہ دی ہے، ایسی حسینہ جس نے رات کو اپنے چہرے پر سیاہ پردہ ڈال رکھا تھا۔ اب اس نے وہ سیاہ پردہ اٹھا دیا ہے۔ "فسوں گرِ شہود" کی ترکیب میں بھی تشبیہ موجود ہے۔ یہاں فطرت کو ایک جادوگر کی مانند قرار دیا گیا ہے، جس نے رات کے جادو کو ختم کر دیا ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ رات کے وقت ہر طرف سیاہی پھیلی ہوئی تھی۔ صبح ہوئی ہے تو کائنات نے سیاہ نقاب اٹھا لیا ہے۔ رات کا جادو ٹوٹ چکا ہے اور ہر طرف روشنی پھیل گئی ہے۔ یہ روشنی اپنے ساتھ تازگی بھی لائی ہے، جو زندگی کے رگ و ریشے میں سما گئی ہے، یعنی صبح ہوئی ہے تو ہر چیز تازگی اور شگفتگی سے بھر گئی ہے۔

عبادتوں کے دَر کھلے سعادتوں کے گھر کھلے
درِ قبول وَا ہوا
دعا کا وقت آ گیا
اذان کی صدا اُٹھی جگا دیا نماز کو
چلی ہے اٹھ کے بندگی لئے ہوئے نیاز کو
صنم کدہ بھی کھُل گیا
اٹھا ہے شور سنکھ کا
چلو نمازیو چلو اُٹھو پجاریو اُٹھو
عباد تو ں کے دَر کھلے سعادتوں کے گھر کھلے

مشکل الفاظ کے معانی

در ۔ دروازے ۔ سعادت ۔ نیکی
وا ہونا ۔ کھُلنا بندگی ۔ عبادت

نیاز - عاجزی - انکساری - صنم کدہ - بت کدہ - سنکھ - ناقوس جو بت خانے میں پجاریوں کو بلانے کے لئے بجاتے ہیں۔

تشریح صبح کے وقت تمام مخلوقِ خدا کے سامنے عبادت کے لئے جھک جاتی ہے۔ چنانچہ حفیظ کہتے ہیں کہ صبح ہوئی تو عبادتوں کے دروازے کھل گئے، یعنی لوگ عبادت کی تیاری کرنے لگے۔ عبادت عین نیکی ہے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ ایک غیبی آواز لوگوں سے کہہ رہی ہے کہ آؤ عبادت کرو اور نیکی کے گھر میں داخل ہو جاؤ۔ قبولیت کا دروازہ کھل گیا ہے یعنی دعاؤں کے مقبول ہونے کا وقت ہے۔ اٹھو اور خدا تعالیٰ کے حضور دعا مانگو۔

مختلف مذاہب کے لوگ عام آدمیوں کو عبادت کی دعوت مختلف طریقوں سے دیتے ہیں۔ مسلمان مسجدوں میں اذان دیتے ہیں اور بت خانوں میں ناقوس کی آواز گونجتی ہے۔ دونوں کا مفہوم ایک ہے کہ لوگو آؤ مل جل کر خدا کی عبادت کریں۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ مسجد سے اذان کی آواز نے نمازیوں کو عبادت کے لئے پکارا ہے اور اللہ تعالیٰ کے نیک بندے بڑی عاجزی سے سر کو جھکائے ہوئے مسجد کی طرف روانہ ہو گئے ہیں۔ بت پرستوں کا بت کدہ بھی کھل گیا ہے اور ناقوس کی آواز بلند ہو رہی ہے اور بت پرستوں کو بت پرستی کی دعوت دے رہی ہے۔ خدا کے نمازی بھی اٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور بتوں کے پجاری بھی بت پرستی کے لئے تیار ہو گئے ہیں۔ صبح کے وقت نے مسلمانوں اور ہندوؤں کو اپنے اپنے انداز میں عبادت کے لئے دعوت دی ہے اور ان کے لئے سعادت اور نیکی کے گھر کھول دیئے ہیں۔

(۴)

کسان اُٹھ کھڑے ہوئے مویشیوں کو لے چلے
کہیں مزے میں آ گئے
تو کوئی تان اُڑا گئے
یہ سرد شبنمی ہوا یہ صحت آفریں سماں
یہ فرش سبز گھاس کا یہ دل فریب آسماں
بسے ہوئے ہیں پریت میں
ہیں محو اُن کے گیت میں

کہاں ہیں شہر کے مکیں — وہ بے نصیب اٹھے نہیں
کسان اٹھ کھڑے ہوئے — مویشیوں کو لے چلے

مشکل الفاظ کے معانی

مزے میں آنا ۔ خوشی میں آنا ۔ تان اڑانا ۔ گیت گانا ۔ صحت آفریں ۔ صحت بخش ۔ پریت ۔ محبت ۔ محو ۔ ڈوبے ہوئے ۔ مکیں ۔ رہنے والے ۔

تشریح

صبح نمودار ہوئی تو کسان بھی بیدار ہوئے اور اپنے مویشیوں کو لے کر کھیتوں کی طرف روانہ ہو گئے ۔ چلتے چلتے وہ کبھی خوشی میں آجاتے ہیں تو گیت گانے لگتے ہیں ۔ شبنم میں بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے ۔ یہ فضا انسان کی صحت کے لئے بڑی مفید ہے ۔ ہر طرف زمین پر سبزہ پھیلا ہوا ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ قدرت نے سبزے کا فرش بچھا دیا ہے ۔ آسمان کا رنگ نکھرا ہوا ہے اور بڑا دلکش معلوم ہو رہا ہے ۔ زمین سے لے کر آسمان تک کا سارا ماحول کسانوں کے گیتوں کی وجہ سے محبت میں ڈوبا ہوا نظر آتا ہے ۔ ہر چیز دلفریب اور پیاری لگ رہی ہے لیکن فطرت کی یہ حسن کاریاں اور دلفریبیاں صرف دیہات تک محدود ہیں ۔ صرف دیہاتی ہی ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ وہ صبح جلدی اٹھنے کے عادی ہوتے ہیں ۔ شہروں کے رہنے والے بدنصیب لوگ سو کر دیر سے اٹھتے ہیں ، اس لئے وہ ان مناظر کے حسن سے ناآشنا رہتے ہیں ، جب کہ کسان جلد اٹھ کر کھیتوں کو روانہ ہو جاتے ہیں ۔ ان کے ساتھ ان کے مویشی بھی ہوتے ہیں ۔ وہ خود بھی صبح کے مناظر سے لطف اندوز ہوتے ہیں اور ان کے گیتوں سے فضا بھی پرکیف ہو جاتی ہے ۔

(۵)

اُٹھی حسینۂ سحر — پہن کے سر پہ تاجِ زر
لباسِ نور زیبِ بر
چڑھی فرازِ کوہ پر
وہ خندۂ نگاہ سے — پہاڑ طُور بن گئے
وہ عکسِ جلوہ گاہ سے — سحاب نُور بن گئے

نوائے جوئبار اُٹھی
صدائے آبشار اُٹھی
ہواؤں کے رُباب اُٹھے خوش آمدید کے لئے
اُٹھی حسینۂ سحر پہن کے سر پہ تاجِ زر

مشکل الفاظ کے معانی

حسینۂ سحر۔ صبح کی حسینہ۔ صبح کو ایک حسینہ سے تشبیہ دی گئی ہے۔ تاجِ زر۔ سونے کا تاج۔
زیبِ بر۔ زیب تن۔ فرازِ کوہ۔ پہاڑ کی بلندی۔
خندۂ نگاہ۔ نگاہ کی مسکراہٹ۔ طور۔ کوہِ طور جس پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اپنا جلوہ دکھایا تھا۔ جلوہ گاہ: نظارے کی جگہ۔ مقامِ جلوہ۔
سحابِ نور۔ نور کے بادل۔ نوا۔ آواز۔ جوئبار۔ ندی۔ رباب۔ باجا۔

تشریح

سحر کو اس کے حسن و جمال کی وجہ سے حسینۂ سحر کہا گیا ہے۔ شاعر کہہ رہا ہے کہ صبح کی حسینہ سر پر سنہرا تاج پہن کر بیدار ہو گئی ہے اور جسم پر نور کا لباس سجائے پہاڑ کی بلندی پر چڑھ گئی ہے۔ اس کی آنکھوں کی مسکراہٹ سے پہاڑ، کوہِ طور کا منظر پیش کرنے لگے ہیں۔ وہ تمام جگہیں جہاں فطرت کا حسن بے نقاب ہو کر اپنا جلوہ دکھا رہا ہے ان کے عکس، نور کے بادلوں کی طرح دکھائی دے رہے ہیں۔ پہاڑی ندی کی آواز آ رہی ہے۔ آبشار کے گرنے کا شور سنائی دے رہا ہے۔ اور صبح کی حسینہ کے استقبال کے لئے ہواؤں نے رباب بجانا شروع کر دیئے ہیں

اس پورے بند میں بڑا دلکش منظر بیان ہوا ہے۔ طلوعِ آفتاب کے وقت افق پر زردی مائل رنگ پھیل جاتا ہے۔ اسے شاعر نے حسینۂ سحر کے سر کا سنہرا تاج کہا ہے۔ صبح کے وقت سب سے پہلے سورج کی کرنیں پہاڑوں کی چوٹیوں کو روشن کرتی ہیں۔ اس صورت حال کو شاعر نے یوں بیان کیا ہے کہ حسینۂ سحر، نور کا لباس زیب تن کر کے پہاڑ کی چوٹی پر چڑھ گئی ہے۔ پہاڑ اپنی چمک دمک کی وجہ سے کوہِ طور کا منظر پیش کر رہے ہیں، جہاں حضرت موسیٰ نے خدا تعالیٰ کا جلوہ دیکھا تھا۔ تیز رفتار پہاڑی ندیوں کی آواز آ رہی ہے۔ آبشار جو بلندی سے نشیب میں گر رہی ہے، اس کی مترنم آواز کانوں کو بھلی معلوم ہوتی ہے۔ ہوائیں جب درختوں کے جھنڈ میں سے گزرتی ہیں تو

پتّوں کی سرسراہٹ سے یہ گمان گزرتا ہے کہ ہوا باجا بجاکر حسینۂ سحر کا استقبال کر رہی ہے۔

نظم کی تلخیص

صبح کا ستارہ، صبح کی خبر دے کر غائب ہوگیا۔ آسمان پر ہر طرف نور پھیل گیا۔ آسمان کے ستارے رات بھر چمک چمک کر زرد پڑ گئے۔ گھروں اور بستیوں کے چراغ بجھ گئے۔ حسینۂ کائنات نے سیاہ نقاب اُلٹ دیا اور ہر طرف روشنی اور تازگی پھیل گئی۔ صبح کی آمد کے ساتھ ہی لوگ اپنے اپنے مسلک کے مطابق خدا تعالیٰ کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ مسجدوں میں اذانوں کی آواز بلند ہونے لگی۔ بت کدوں میں ناقوس بجنے لگے۔ کہ آؤ، خدا سے دعا مانگو۔ قبولیت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ کسان بھی نیند سے بیدار ہو گئے۔ انھوں نے اپنے مویشی کھولے اور کھیتوں کی راہ لی۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ فضا صحت بخش ہے منظر بڑا دلکش ہے۔ اس پر کیف ماحول میں کسان کبھی کبھی ترنگ میں آجاتے ہیں اور ان کے گیت فضا میں پھیل کر اُسے اور رنگین بنا دیتے ہیں۔ یہ خوشگوار موسم شہر والوں کو نصیب نہیں کیونکہ وہ تا دیر سونے کے عادی ہیں۔ صبح کی روشنی میں پہاڑ کوہ طور کا منظر پیش کر رہے ہیں۔ پہاڑی ندی گیت گا رہی ہے۔ آبشار کے گرنے کی آواز روح میں اُتری جا رہی ہے۔ صبح کے استقبال کے لئے ہوا نے رباب ہاتھ میں لے لیا ہے۔ یعنی ہوا کی سرسراہٹ سے رباب کے نغمے پھوٹتے ہوئے محسوس ہو رہے ہیں۔

نظم کا مرکزی خیال

اس نظم میں شاعر نے طلوعِ صبح کا منظر پیش کیا ہے۔ صبح ہوئی۔ لوگ اپنے اپنے طریقوں سے عبادت کے لئے گھروں سے نکلے۔ کسان مویشیوں کو لے کر کھیتوں کو روانہ ہوئے۔ ٹھنڈی ہوا چل رہی ہے۔ ہر طرف سبزہ پھیلا ہوا ہے۔ کسان ترنگ میں آکر گیت گا رہے ہیں صبح کی روشنی میں پہاڑ کوہِ طور کی طرح روشن اور منور دکھائی دے رہے ہیں۔ ہوا رباب بجاکر صبح کا استقبال کر رہی ہے۔

فیض احمد فیض (۱۹۱۰ء تا ۱۹۸۴ء)

تنہائی

تعارف یہ نظم فیض احمد فیض کے پہلے شعری مجموعے "نقشِ فریادی" میں شامل ہے اور فیض کے عمومی مزاج اور لب و لہجے سے مختلف ہے کیونکہ وہ ہر حال میں پُر اُمید رہتے ہیں لیکن اس نظم میں وہ رومانی افسردگی کا شکار ہیں۔ وہ جس عالم گیر تنہائی کو اپنا موضوع بناتے ہیں وہ آج کے انسان کا مقدر سہی لیکن یہ تنہائی ذاتی تجربہ بھی ہو سکتی ہے اور تقسیم ہند سے پہلے حصولِ آزادی کے لئے کی جانے والی سیاسی کوششوں کے بے ثمر ہونے کا نتیجہ بھی، جب غیر ملکی سامراج نے شاہراہِ آزادی پر ثبت وطن پرستوں کے قدموں کے نشانات مٹا دیئے تھے اور نگارِ وطن سے ہم کنار ہونے کی تمام اُمیدیں منقطع کر دی تھیں۔ تاہم غالب امکان یہی ہے کہ یہ نظم سیاسی نہیں بلکہ داخلی واردات کی ترجمان ہے۔

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں، کوئی نہیں
راہرو ہوگا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگذار
اجنبی خاک نے دھندلا دیئے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر لو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

مشکل الفاظ کے معانی

دلِ زار۔ دکھوں کا مارا ہوا دل۔
راہرو۔ مسافر۔ ایوان۔ محلات۔
خوابیدہ چراغ۔ بجھے ہوئے دیئے۔ راہگذار۔ راستہ۔ سراغ۔ نشان۔
گُل کرنا۔ بجھانا۔ مے۔ شراب۔ مینا۔ صراحی۔
ایاغ۔ پیالہ۔ مقفّل کرنا۔ تالا لگا دینا۔ بے خواب کواڑ۔ مراد ہے کھلے دروازے۔

تشریح یہ نظم شاعر کی داخلی واردات کی کہانی ہے آدھی سے زیادہ رات گزر چکی ہے۔ باہر دروازے کے قریب ہلکی سی آہٹ سنائی دیتی ہے تو شاعر چونک

اٹھتا ہے۔ اُسے خیال آتا ہے کہ شاید اس کا محبوب آیا ہے جس کا وہ دیر سے انتظار کر رہا تھا۔ "پھر" کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ یہ صورتِ حال پہلے بھی گزر چکی ہے لیکن جلد ہی اسکی امید، یاس میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ اپنے دکھوں کے مارے ہوئے دل سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ یہ وہ نہیں ہے جس کے تم منتظر تھے۔ یہ تو کوئی مسافر ہے جو کہیں اور جا رہا ہے۔ اب کئی چھوٹی چھوٹی تصویریں، اس کے ذہن کی سطح پر ابھرنے لگتی ہیں۔ رات ڈھل چکی ہے۔ تاروں کی روشنی مدھم پڑ چکی ہے۔ وہ چراغ جو رات بھر اونچی حویلیوں اور شاندار محلات کو روشن کرتے رہے، اب اُن کی لو بھی لرزنے لگی ہے اور وہ بجھنے والے ہیں۔ ہر راستہ محبوب کا انتظار کرتے کرتے تھک کر سو گیا ہے۔ ہوا اپنے ساتھ دور سے جو مٹی اڑا کے لائی تھی، اس نے آنے جانے والوں کے قدموں کے نشان بھی مٹا دیئے ہیں۔ اس افسردہ فضا میں شاعر بھی اداسی کا شکار ہو جاتا ہے اور اپنے دل سے کہتا ہے کہ ساری شمعیں بجھا دو۔ شراب نوشی کا شغل بند کرو۔ صراحی اور پیالہ اُٹھا دو اور وہ دروازے جو تم نے محبوب کے انتظار میں کھلے رکھے تھے ان کو تالا لگا دو کیونکہ اب یہاں کوئی نہیں آئے گا۔

کسی کے قدموں کی آہٹ سن کر شاعر کے دل میں جو شمعِ امید روشن ہوئی تھی وہ یکدم بجھ جاتی ہے اور وہ شدید مایوسی اور محرومی کا شکار ہو جاتا ہے۔ روحانی افسردگی کی حامل یہ نظم فیض کی خوبصورت نظموں میں سے ایک ہے۔ لفظی پیکر تراشی فیض کا خاص فن ہے۔ یہاں انہوں نے جو چھوٹی چھوٹی تصویریں بنائی ہیں، انہوں نے نظم کے مفہوم کو واضح کرنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

نظم کا مرکزی خیال

اس نظم کا مرکزی خیال تنہائی ہے۔ شاعر اکیلا بیٹھا محبوب کا انتظار کر رہا ہے کبھی کبھی کسی آہٹ پر وہ چونک بھی اٹھتا ہے۔ کہ شاید اس کا محبوب آ رہا ہے۔ مگر جلد ہی اس کی اُمید مایوسی میں ڈھل جاتی ہے۔ وہ ساری رات انتظار میں گزار دیتا ہے۔ صبح کے آثار دیکھتے ہی اسکی ساری امیدیں دم توڑ دیتی ہیں اور وہ شدید اُداسی اور بے چینی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مجید امجد (۱۹۱۴ء-۱۹۷۴ء)

"طلوعِ فرض"

تعارف

مجید امجد ہمارے دور کے اہم شاعر ہیں۔ انہوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں اور غزلیں بھی، لیکن ان کے شاعرانہ کمالات نظموں میں بھرپور انداز میں واضح ہوتے ہیں۔ ان کا اسلوب انہیں سے مخصوص ہے۔ ان کا ذخیرۂ الفاظ ان کا اپنا ہے، جو مشقِ سخن، لگن اور ذوقِ سلیم کا نتیجہ ہے۔ ان کے پاس نرم، کومل، اُجلے سچے اور پُر اثر الفاظ کا گرانقدر ذخیرہ ہے، جو ان کے کلام کو حسن اور تاثیر سے ہم کنار کرتا ہے۔ انہوں نے انسان کے ازلی اور آفاقی دکھوں کو اپنا موضوع بنایا ہے۔ ان کی شاعری ڈھلتی شاموں اور اداس رتوں کی شاعری ہے۔ ان کا احساسِ محرومی و شکستگی کبھی ان کی ذاتی محرومیوں اور ناکامیوں سے جنم لیتا ہے اور کبھی کائنات کی مجموعی بے ثباتی اور زندگی کی بے حاصلی کے تصور سے پیدا ہوتا ہے۔

"طلوعِ فرض" ان کی ایک اہم نظم ہے، جس کا موضوع عام روزمرہ چیزوں کے آئینے میں اپنی اداسیوں اور محرومیوں کا احساس ہے۔

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں، ہمرہِ صد کارواں ہوں

کوئی خاموش پنچھی اپنے دل میں
اُمیدوں کے سنہرے جال بُن کے
اُڑا جاتا ہے چگنے دانے دُنکے
فضائے زندگی کی آندھیوں سے
ہے ہر اک کو بہ چشمِ تر گزرنا
مجھے "چل" کر اسے "اُڑ" کر گزرنا

مشکل الفاظ کے معانی

سحر۔ صبح۔ رواں ہونا۔ چلنا۔
ہمرہِ صد کارواں۔ مراد ہے بہت سے لوگوں کے ہمراہ۔

پنچھی - پرندہ - بہ چشمِ تر - رونے والی آنکھ کے ساتھ۔

تشریح تمہیدی شعر میں شاعر کہتا ہے کہ صبح کے وقت ہر جاندار، رزق کی تلاش میں اپنے گھر سے نکلتا ہے۔ شاعر بھی نوکری کے لئے اپنے دفتر کی طرف جا رہا ہے۔ اس کے ہمراہ اور بھی بہت سے لوگ ہیں، جو اپنی اپنی منزل کی طرف رواں ہیں۔ اگلے بندوں میں شاعر نے اس صورتِ حال کو مختلف مثالوں سے واضح کیا ہے۔ پہلے بند میں اس نے ایک پرندے کا ذکر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خاموش پرندہ بڑی اُمیدوں کے ساتھ صبح کے وقت دانہ چگنے نکلتا ہے۔ زندگی ایک طوفان کی طرح ہے۔ یہاں ہر ایک کو اپنی منزل تک پہنچنے کے لئے ایسے کٹھن مرحلوں سے گزرنا پڑتا ہے کہ وہ اُسے رُلا رُلا دیتے ہیں۔ میں اور پرندہ، ایک ہی منزل کے راہی ہیں۔ ہم دونوں کو ایک جیسی مشکلات کا سامنا ہے۔ ہم دونوں رزق کی تلاش میں نکلے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ مَیں چل کر اپنی منزل کی طرف جاتا ہوں اور وہ اُڑ کر جاتا ہے۔

وہ اِک اندھی بھکارن لڑکھڑائی ۔

کہ چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لے   صدا سے راہ گیروں کو جکڑ لے

یہ پھیلا پھیلا، میلا میلا دامن،

یہ کاسہ، یہ گلوئے شور انگیز   مرا دفتر، مری مسلیں، مرا میز

مشکل الفاظ کے معانی بھکارن - بھیک مانگنے والی عورت - چوراہا - چوک، جہاں چار راستے آکر ملتے ہیں - راہ گیر - پیدل راستہ چلنے والے۔ کاسہ - بھیک مانگنے والا ٹھیکرا یا پیالہ - گلوئے شور انگیز - شور پیدا کرنے والا گلا - مسل - کاغذات۔

تشریح شاعر جو روزی کمانے کے لئے گھر سے نکلا ہے، ایک بھیک مانگنے والی اندھی عورت کو دیکھتا ہے تو اس کی ذات میں شاعر کو اپنا عکس دکھائی دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ عورت بھی میری طرح ہے۔ وہ چلتے چلتے لڑکھڑا جاتی ہے، چوراہے کے کھمبے کو پکڑ لیتی ہے۔ صدا لگا کر راہ چلتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس نے سب کے سامنے اپنا میلا سا دامن پھیلایا ہوا ہے۔ اس کے پاس بھیک مانگنے والا بڑا سا پیالہ ہے اور وہ بھیک کی خاطر آواز لگا رہی ہے۔ وہ

سڑک پر بیٹھ کر اپنا رزق کما رہی ہے۔ میں بھی روزی کی خاطر روزانہ اپنے دفتر جاتا ہوں، جہاں میز پر بیٹھ کر کاغذوں کے ساتھ مغز ماری کرتا ہوں اور مہینے کے بعد تنخواہ کا حق دار ٹھہرتا ہوں۔

چمکتی کار فرّاٹے سے گزری
غبارِ رہ نے کروٹ بدلی، جاگا　　اٹھا، اک دو قدم تک ساتھ بھاگا
پیاپے ٹھوکروں کا یہ تسلسل
یہی پرواز بھی، افتادگی بھی　　متاعِ زیست اس کی بھی، مری بھی

مشکل الفاظ کے معانی فرّاٹے سے گزری - تیزی سے گزری۔ پیاپے - مسلسل - اُفتادگی - عاجزی - خاکساری - متاعِ زیست - زندگی کا سرمایہ۔

تشریح شاعر کے پاس سے ایک کار تیزی کے ساتھ گزرتی ہے۔ راستے کا غبار اُڑتا ہے اور فضا میں بلند ہوتا ہے لیکن دو چار قدم پر جا کر بیٹھ جاتا ہے۔ مسلسل ٹھوکروں سے یہ غبار اسی طرح اُٹھتا ہے اور چند لمحوں کے بعد بڑی بے بسی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ اس صورتِ حال میں شاعر کو اپنی زندگی کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ وہ بھی ہمیشہ ٹھوکریں کھاتا ہے، بلند ہونے کی کوشش کرتا ہے، لیکن جلد ہی غبار کی طرح زمین پر آ رہتا ہے۔ اُڑنا اور پھر بے کسی کے ساتھ زمین پر گر پڑنا، شاعر کو اپنی زندگی اور غبارِ راہ میں یہ مشترک قدر دکھائی دیتی ہے۔

گلستاں میں کہیں بھونرے نے چوسا
گلوں کا رس، شرابوں سا نشیلا　　کہیں پر گھونٹ اک کڑوا کسیلا
کسی سڑتے ہوئے جوہڑ کے اندر
پڑا اک رینگتے کیڑے کو پینا　　مگر مقصد وہی دو سانس جینا

سحر کے وقت دفتر کو رواں ہوں
رواں ہوں ہمرہِ صد کارواں ہوں

مشکل الفاظ کے معانی گلستان۔ باغ۔ بھونرا۔ پھولوں پر منڈلانے والا پردار کیڑا۔ نشیلا۔ نشے والا۔ کسیلا۔ تلخ۔ کڑوا۔ سڑتا ہوا۔ بدبودار۔ رینگتا۔ آہستہ آہستہ گھسٹ کر چلنے والا۔

تشریح باغ میں بھونرا پھولوں پر بیٹھا اُن کا رس چوس رہا ہے۔ اس رس میں شراب کا سا نشہ ہے۔ تھوڑے فاصلے پر ایک گندے تالاب میں جس کا پانی سڑ رہا ہے، ایک رینگتا ہوا کیڑا پانی کا کڑوا کسیلا گھونٹ پی رہا ہے۔ بھونرے کی زندگی رس چوسنے میں ہے۔ کیڑے کی زندگی گندا پانی پینے میں ہے۔

زندگی ایسے ہی تضادات کا نام ہے۔ کہیں نشیب ہیں، کہیں فراز ہیں۔ کہیں روشنی ہے، کہیں تاریکی ہے۔ کہیں خیر ہے کہیں شر ہے۔

آخر میں شاعر ابتدائی شعر کو دہراتا ہے اور اس میں کہتا ہے کہ صبح کا وقت ہے۔ میں دفتر کو جا رہا ہوں اور میرے ساتھ اور بھی سینکڑوں لوگ اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔

مجید امجد اُردو کے نظم گو شاعروں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔ انہوں نے کائنات، اس کے مظاہر اور انسان کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا ہے اور ان میں پائی جانے والی مشترک قدروں کی بڑی عمدگی سے ترجمانی کی ہے۔

طلوعِ فرض کی تلخیص

صبح کا وقت ہے۔ شاعر اپنے دفتر کی طرف جا رہا ہے۔ اس کے ہمراہ اس کے بے شمار ساتھی اپنی اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہیں۔ شاعر کے ذہن میں ایک ایسے پرندے کا تصور اُبھرتا ہے، جو بڑی خاموشی کے ساتھ ارمان بھرا دل کے دانہ دُنکا چگنے نکلتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ وہ بھی اس پرندے کی طرح دکھوں اور مصیبتوں سے بھری زندگی میں رزق کی تلاش میں نکلا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پرندہ اُڑ کر اپنی منزل کی طرف جاتا ہے اور شاعر چل کر اپنے دفتر پہنچ رہا ہے۔

تھوڑی دیر کے بعد اس کے ذہن میں ایک دوسری تصویر آتی ہے۔ اسے

ایک اندھی بھکارن نظر آتی ہے، جس کے پاؤں لڑکھڑاتے ہیں تو وہ ایک کھمبے کا سہارا لے لیتی ہے۔ اس نے اپنا میلا سا دامن زمین پر پھیلا رکھا ہے۔ وہ اپنی درد بھری آواز سے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے اور بھیک کی طالب ہوتی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ میرا حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔ اس کے پاس بھیک مانگنے کے لئے کاسہ اور بلند آواز ہے اور میرے پاس دفتر ہے، میرے کاغذات ہیں اور میری میز ہے۔

شاعر نگاہِ تصوّر سے ایک تیز رفتار کار کو گزرتے ہوئے دیکھتا ہے جس کے چلنے سے غبار اُڑتا ہے لیکن جلد ہی بیٹھ جاتا ہے۔ یہ غبار ہمیشہ اسی طرح اُٹھتا ہے اور اسی طرح بے کسی کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے۔ اس صورت حال میں شاعر کو اپنی زندگی کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ شاعر بھی زمانے کی ٹھوکریں کھاتا ہے، اُوپر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جلد ہی اسکی اُڑان ختم ہو جاتی ہے اور وہ زمین پر آ رہتا ہے۔

چوتھی تصویر میں ایک بھنورا باغ میں خوبصورت پھولوں کا رس چوس رہا ہے۔ قریب ہی جوہڑ میں ایک غلیظ کیڑا رینگ رہا ہے جو وہاں کا کڑوا کسیلا پانی پینے پر مجبور ہے۔ ایک کی زندگی لذیذ رس پی کر گزرتی ہے اور دوسرے کے مقدر میں گندا پانی ہے۔

اس آخری بند میں شاعر نے پوری نظم کے مضمون کو بڑی عمدگی سے سمیٹ لیا ہے۔ بعض لوگوں کی زندگی محرومیوں اور ناکامیوں کی کہانی ہے اور بعض نے زندگی کی تمام آسائشوں سے اپنا دامن بھر رکھا ہے۔ یہ تضادات حسّاس انسان کا دامن انگاروں سے بھر دیتے ہیں اور اسے دُکھی کر دیتے ہیں۔

نظم کا مرکزی خیال

انسانی زندگی عجیب تضادات کا مجموعہ ہے۔ کچھ لوگ آرام و آسائش کی زندگی گزارتے ہیں اور کچھ محرومیوں کا شکار رہتے ہیں۔ یہ تضادات، حسّاس انسان کو پریشان کر دیتے ہیں۔ شاعر نے مشاہدہ میں آنے والی اشیاء کے آئینے میں اپنی ذاتی اداسیوں، دکھوں اور محرومیوں کا عکس دیکھا ہے۔

مجید امجد:

ایک کوہستانی سفر کے دوران میں

تنگ پگڈنڈی، سرِ کوہسار بل کھاتی ہوئی ‏— نیچے، دونوں سمت، گہرے غار منہ کھولے ہوئے
آگے، ڈھلوانوں کے پار، اک تیز موڑ اور اس جگہ ‏— اک فرشتے کی طرح نورانی پَر تولے ہوئے
جھک پڑا ہے آکے رستے پر کوئی نخلِ بلند ‏— تھام کر جس کو گزر جاتے ہیں آسانی کے ساتھ
موڑ پر سے ڈگمگاتے رہروؤں کے قافلے ‏— ایک بوسیدہ خمیدہ پیڑ کا کمزور ہاتھ
سینکڑوں گرتے ہوؤں کی دستگیری کا امیں ‏— آہ! اُن گردن فرازانِ جہاں کی زندگی
اک جھکی ٹہنی کا منصب بھی جنہیں حاصل نہیں

مشکل الفاظ کے معانی

پگڈنڈی ۔ چھوٹا راستہ ۔ سرِ کوہسار ۔ پہاڑ پر
نخلِ بلند ۔ اونچا درخت ۔ رہرو ۔ مسافر ۔
بوسیدہ ۔ پھٹا پرانا ۔ خمیدہ ۔ جُھکا ہوا ۔ دستگیری کرنا ۔ ہاتھ پکڑنا ۔
رہنمائی کرنا ۔ گردن فرازاں جہاں ۔ دُنیا کے اکڑی گردنوں والے لوگ، مراد ہے
مغرور لوگ ۔ منصب ۔ مقام ۔

تشریح

شاعر پہاڑ پر بل کھاتا ہوا چھوٹا سا راستہ دیکھتا ہے۔ اس پہاڑ کے دونوں طرف خوفناک گہرے غار ہیں۔ اس راستے پر ڈھلوانوں سے ذرا آگے ایک خطرناک موڑ ہے جس سے بہ حفاظت گزرنا بڑا مشکل ہے۔ اس جگہ ایک اُونچے درخت کی ٹہنیاں جھکی ہوئی ہیں، جنہیں پیدل چلنے والے مسافر پکڑ کر بڑی آسانی کے ساتھ موڑ سے گزر جاتے ہیں۔ ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے یہ درخت کوئی نورانی فرشتہ ہے جس نے اس جگہ اپنے پَر کھولے ہوتے ہیں اور جن کی بدولت مسافر یہاں سے گزرتے ہوئے اپنے آپ کو محفوظ خیال کرتے ہیں۔ ذرا خیال کرو کہ یہ ایک پرانا جھکا ہوا درخت ہے۔ جس کی ٹہنیاں بھی کمزور ہیں لیکن یہ سینکڑوں مسافروں کو جن کے پاؤں ڈگمگا رہے ہوتے ہیں، ہاتھ سے پکڑ کر موڑ پار کرا دیتا ہے۔ افسوس ہے ان اکڑی ہوئی گردن والے لوگوں پر جو عمر بھر کسی کا ہاتھ نہیں پکڑتے، کسی کی مدد نہیں کرتے۔ ان لوگوں کو زندگی میں وہ مقام بھی حاصل نہیں آتا جو اس بوڑھے درخت کی جھکی ہوئی ٹہنیوں کو حاصل ہے۔

شاعر نے پہاڑ پر ایک منظر دیکھا ہے۔ ایک تنگ راستے کے موڑ پر ایک پرانے درخت کی ٹہنیاں جھک گئی ہیں۔ آنے جانے والے مسافر انہیں پکڑ کر بڑی بے فکری سے یہ موڑ پار کر جاتے ہیں۔ شاعر کے ذہن میں ایک تضاد ابھرتا ہے۔ اسے وہ مغرور لوگ یاد آتے ہیں جو کبھی کسی کے کام نہیں آتے۔ کسی سے ہمدردی کا اظہار نہیں کرتے۔ شاعر نتیجہ یہ نکالتا ہے کہ یہ ٹہنی ان اکڑی گردن والوں سے بہت بہتر ہے کیونکہ اسکو پکڑ کر یا اس کا سہارا لے کر یہاں سے گزرنے والے اپنا کٹھن راستہ تو طے کر لیتے ہیں۔

یہ مجید امجد کا خاص فن ہے کہ وہ مظاہرِ قدرت کا مشاہدہ کرتے ہوئے انسانی زندگی کی طرف مڑ جاتے ہیں اور ان میں تضاد یا مشترک قدریں تلاش کرتے ہیں۔ ان کے نکالے ہوئے نتیجے اتنے زوردار ہوتے ہیں کہ ان کی گرفت سے نکلنا ممکن نہیں ہوتا اور وہ انسان کو سوچ بچار پہ مجبور کر دیتے ہیں۔

نظم کی تلخیص

ایک تنگ راستہ پہاڑ پر سے گزر رہا ہے اس کے دونوں طرف گہرے غار ہیں۔ ڈھلوانوں سے آگے ایک مشکل موڑ ہے۔ اس پر ایک اونچا درخت جھک گیا ہے۔ اسے تھام کر لوگ بڑی آسانی سے وہ موڑ پار کر لیتے ہیں۔ ایک پرانا جھکا ہوا درخت سینکڑوں گزرنے والوں کو سہارا دیتا ہے۔ اور انہیں خطرناک موڑ سے حفاظت کے ساتھ آگے لے جاتا ہے۔ افسوس ہے ان مغرور انسانوں پر جو کسی کے کام نہیں آتے۔ ان سے تو اس درخت کی جھکی ہوئی ٹہنیاں اچھی ہیں۔

نظم کا مرکزی خیال

دُنیا میں اچھا شخص وہ ہے جو دوسروں کے کام آتا ہے۔ وہ لوگ جو دوسروں سے ہمدردی نہیں کرتے، ان کا سہارا نہیں بنتے، ان سے وہ بے جان اشیاء اچھی ہیں، جن کے وسیلے سے انسان اپنی مشکلات پر قابو پا لیتے ہیں۔

احسان دانش (۱۹۱۴ء تا ۱۹۸۲ء)

قطعات

(۱)

پھر سنی کے کھیت پکے، ڈالیاں بجنے لگیں
چھڑ گئے گنوں کے کھیتوں میں ہواؤں کے ستار

ہائے کیا دن تھے کہ تھا وحشت کو سامانِ سرور
شام پڑتے نہر کے پُل پر کسی کا انتظار

مشکل الفاظ کے معانی | سنی ۔ پٹ سن ۔ ڈالیاں ۔ شاخیں ۔ سامانِ سرور ۔ خوشی کا سامان ۔ وحشت ۔ دیوانگی ۔ محبت ۔

تشریح | بھولی بسری یادیں انسانی زندگی کا بہت بڑا سرمایہ ہیں ۔ پہلے مصرع میں 'پھر' کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ شاعر یہ منظر پہلے بھی دیکھ چکا ہے اور دوبارہ یہ منظر اس کے سامنے ہے ۔ اس کے ساتھ شاعر کی جو یاد وابستہ ہے ۔ وہ اس کے ذہن میں تازہ ہو گئی ہے ۔ وہ ان گزرے دنوں کو یاد کرتا ہے جب ایسے ہی موسم میں اس نے محبت کے میدان میں قدم رکھا تھا اور وہ نہر کے پُل پر کھڑا ہو کر اپنی محبوبہ کا انتظار کیا کرتا تھا ۔

اس بند میں وہ کہہ رہا ہے کہ پٹ سن کے کھیت پھر پک گئے ہیں ۔ شاخیں جھولنے لگی ہیں ۔ گنوں کے کھیتوں سے جب ہوائیں سنسناتی ہوئی گزرتی ہیں تو ایسے لگتا ہے جیسے ستار بج رہا ہے ۔ وہ کیا عمدہ دن تھے جب محبت کی کلی نئی نئی کھلی تھی اور شام کے وقت نہر کے پُل پر کھڑے ہو کر کس کا انتظار کرنا انتہائی فرحت بخش اور مسرت آگیں لگتا تھا ۔

(۲)

لے گئے وہ ساتھ ساری زندگی کی رونقیں
گھر کا یہ عالم ہے اُن کے روٹھ کے جانے کے بعد

جس طرح دیہات کے اسٹیشنوں پر دن ڈھلے
اک سکوتِ مضمحل گاڑی گزر جانے کے بعد

مشکل الفاظ کے معانی | سکوت ۔ خاموشی ۔ مضمحل ۔ اداس ۔ سکوتِ مضمحل ۔ اداس کر دینے والی خاموشی ۔

تشریح گھر کی ساری رونق محبوب کے دم قدم سے تھی۔ وہ روٹھ کر چلا گیا ہے تو ساری رونقیں سمیٹ کر ساتھ لے گیا ہے۔ بقول فیض

؎ تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے

شاعر ایک خوبصورت تشبیہ کے ذریعے گھر کی صورتِ حال کو بیان کرتا ہے۔ دیہاتی اسٹیشن چھوٹے چھوٹے ہوتے ہیں۔ ان پر عام طور پر ویرانی طاری رہتی ہے۔ گاڑی آنے کے وقت وہاں دو چار مسافر اور دو چار چھوٹی چھوٹی چیزیں بیچنے والے آ نکلتے ہیں، ورنہ کوئی ذی روح وہاں نظر نہیں آتا۔ شاعر کہتا ہے کہ جس طرح دیہاتی اسٹیشن پر گاڑی گزر جانے کے بعد اداس خاموشی چھا جاتی ہے۔ اسی طرح میرے گھر کا حال ہے۔ میرا محبوب روٹھ کر چلا گیا ہے اور اپنے پیچھے اداس خاموشی چھوڑ گیا ہے۔

(٣)

پھاوڑا کندھے پہ رکھے آ رہا ہے اِک کسان
رنگ جس کے خون سے لیتے ہیں گلزاروں کے پھول
دل میں جینے کی تمنائیں، فضا ناسازگار
آنکھ میں سرخی، لبوں پر پپڑیاں، نتھنوں میں دھول

مشکل الفاظ کے معانی گلزار - باغ - ناسازگار - ناموافق -

تشریح احسان دانش نے اپنی شاعری میں دیہاتی زندگی کی بڑی خوبصورتی عکاسی کی ہے۔ انہوں نے دیہاتی کسان کے شب و روز سے متعلق خوبصورت شعر کہہ کسان کی بھرپور ترجمانی کی ہے۔ کسان کھیتوں میں کام کرتا ہے۔ گرمی و سردی سے بے نیاز ہو کر ہر وقت سرگرمِ عمل رہتا ہے لیکن اسے اس کی محنت کا پھل نہیں ملتا۔ دوسروں کی زندگی کو آسودہ بنانے والا خود پریشان حال رہتا ہے۔ زیرِ مطالعہ قطعہ کا مضمون بھی یہی ہے۔

احسان دانش کہتے ہیں کہ دیکھو ایک کسان کندھے پر پھاوڑا رکھے کھیتوں میں کام کر کے لوٹ رہا ہے۔ یہ وہ شخص ہے جس کی محنت سے باغ کے پھولوں میں سرخی اور تازگی آتی ہے۔ دنیا بھر کی رونقیں اسی کے دم قدم سے ہیں۔ یہ فصل پیدا کرتا ہے تو شہروں میں بسنے والوں کی بھوک مٹتی ہے۔ اس کی فصل بکتی ہے تو سرمایہ داروں کی تجوریاں

دولت سے بھر جاتی ہیں۔ اس کے دل میں زندہ رہنے کی شدید خواہش ہے، لیکن اُسے زندگی کی کوئی سہولت میسر نہیں ہے۔ اس کے لئے فضا انتہائی ناموافق ہے۔ اس کی حالت دیکھو۔ اس کی آنکھیں گرمی میں کام کرنے کے سبب سرخ ہو رہی ہیں۔ اس کے ہونٹ خشک ہیں اور ان پر پپڑیاں جمی ہوئی ہیں۔ اس کے ناک کے نتھنے مٹی سے اَٹے ہوئے ہیں۔ یہ دوسروں کے دامن میں پھول بھرتا ہے لیکن اس کا اپنا دامن زندگی کی آسائشوں سے خالی ہے۔

(۴)

لاکھ ناداری ہو، مَیں ہوں شاعرِ وحدت پرست — نقش جو بھی سامنے آیا وہی ردّ ہو گیا
جس سوا اس کے کسی کا دل میں گزرے گا خیال — مَیں تو اَے دانش یہ سمجھوں گا کہ مرتد ہو گیا

مشکل الفاظ کے معانی ناداری۔ غُربت۔ وحدت پرست۔ خدا کو ایک ماننے والا
نقش۔ تصویر۔ رَدّ ہونا۔ واپس پھرنا۔
مرتد۔ اسلام سے پھر جانے والا۔

تشریح شاعر کہتا ہے کہ مَیں توحید پرست ہوں۔ خدا کو ایک مانتا ہوں۔ اس کے ساتھ کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔ اسی سے مدد مانگتا ہوں اور اسی کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرتا ہوں۔ اس کے علاوہ جو شکل بھی میرے سامنے آتی ہے، میں اسے مسترد کر دیتا ہوں۔ کسی کو اس کے برابر ٹھہرانا تو دُور کی بات ہے میرے دل میں جس دن کسی اور کا خیال بھی آگیا تو میں سمجھوں گا کہ مَیں راہِ حق سے ہٹ گیا ہوں اور مرتد ہو گیا ہوں۔ شاعر کا مفہوم یہ ہے کہ میرے دل میں تو خدا کے ساتھ کسی اور کو شریک ٹھہرانے کا خیال بھی نہیں آسکتا۔

نذیر احمد شیخ (۱۹۱۱ء تا ۱۹۷۲ء)

منافع خوری

جہاں تک ان دکانوں پر نظر دوڑائی جاتی ہے
ضرورت کی ہر اک شے ان میں غائب پائی جاتی ہے

تشریح عام طور پر دکاندار اپنی دکانوں میں زیادہ سے زیادہ مال رکھتے ہیں تاکہ گاہک خالی ہاتھ نہ لوٹے لیکن آج کل تجارت کا انداز یہ ہو گیا ہے کہ اشیاء کی مصنوعی قلت پیدا کی جائے اور پھر منہ مانگے دام حاصل کئے جائیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے کہ جب کبھی میں بازار جاتا ہوں اور دکانوں کو دیکھتا ہوں تو ان میں ضرورت کی کوئی چیز نہیں ملتی۔

دساور سے یہاں تک جنس کو آتے تو دیکھا ہے
مگر آگے خدا جانے کہاں دفنائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

دساور ۔ غیر ممالک ۔ جنس ۔ اشیاء
دفنائی جاتی ہے ۔ غائب کر دی جاتی ہے ۔

تشریح جو اشیاء اپنے ملک میں نہیں ہوتیں ان کو غیر ممالک سے درآمد کیا جاتا ہے۔ حکومت ان کے لیے درآمدی لائسنس جاری کرتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی کرنے والے ان اشیاء کو بازار میں نہیں آنے دیتے اور آتے ہی انہیں اپنے گوداموں میں بھر لیتے ہیں اور بازار میں مصنوعی قلت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس لیے شاعر کہتا ہے کہ جنس باہر سے ملک میں آتی ہے۔ اس کے جہاز بندرگاہ پر لگتے ہیں، لیکن اس کے بعد کچھ پتہ نہیں چلتا کہ وہ کہاں جاتی ہے کیونکہ بازار میں وہ بدستور ناپید ہوتی ہے۔

دوا آب بقا ہے چشمۂ ظلمات میں پنہاں
جناب خضر آئیں تو بہم پہنچائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

آبِ بقا۔ آبِ حیات، وہ پانی جسے پینے سے ہمیشہ کی زندگی مل جاتی ہے۔ چشمۂ ظلمات۔ تاریک جگہ پر واقع چشمہ جہاں سے آبِ حیات ملا تھا۔ خضر۔ ایک خدا رسیدہ بزرگ جنہوں نے آبِ حیات پی کر ہمیشہ کی زندگی حاصل کی۔ بعضوں کے نزدیک وہ پیغمبر ہیں۔

تشریح

یہ تلمیحی شعر ہے۔ تلمیح اس میں یہ ہے، کہ سکندر بادشاہ آبِ حیات کی تلاش میں نکلا۔ راستے میں اس کی ملاقات حضرت خضر سے ہوئی جو بھولے بھٹکے لوگوں کو راہ دکھاتے ہیں۔ دونوں اپنی منزل کی طرف روانہ ہوئے۔ ایک جگہ پہنچ کر حضرت خضر نے سکندر سے کہا کہ تم یہاں رکو۔ آگے راستہ دشوار ہے۔ میں آبِ حیات کا پتہ کر کے آتا ہوں۔ چنانچہ خضر گئے۔ تاریکی میں ایک چشمہ تھا جس میں آبِ حیات تھا۔ خضر نے پانی پیا اور دائمی زندگی حاصل کر لی لیکن سکندر کو یہ پانی پینا نصیب نہ ہوا۔

اس شعر میں شاعر کہہ رہا ہے کہ دوائیں بازار میں نایاب ہو گئی ہیں جن دواؤں کی انسانی زندگی کو بچانے کے لئے انتہائی ضرورت ہے وہ نہیں مل رہیں۔ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ دوا آبِ حیات ہے جو چشمۂ ظلمات کی طرح کسی تاریک جگہ میں پوشیدہ ہے اور کوئی خضر میسّر ہو تو صرف اسی صورت میں اس تک رسائی ہو سکتی ہے۔ "چشمۂ ظلمات" میں ایک لطیف اشارہ بلیک مارکیٹ کی طرف ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ دوائیں بازار میں کھُلے بندوں نہیں ملتیں۔ یہ بلیک مارکیٹ میں ملتی ہیں اور وہ بھی اگر کوئی خضر مل جائے یا کوئی رہنمائی کرنے والا ہو تو اسی صورت میں دستیاب ہوتی ہیں۔

دکان داروں کے گھر پہ اب صدائیں دینی پڑتی ہیں
ہزاروں مرتبہ زنجیرِ در کھڑکائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

زنجیرِ در۔ دروازے کی زنجیر جو بادشاہ جہانگیر کے محل میں لگی تھی اور جسے کھڑکا کر حاجت مند لوگ بادشاہ کے سامنے اپنی حاجتیں پیش کرتے تھے۔

تشریح

یہ شعر بھی تلمیحی ہے۔ مشہور مغل بادشاہ جہانگیر نے اپنے محل کے دروازے پر ایک زنجیر لگا رکھی تھی۔ حاجت مند آتے، زنجیر ہلاتے اور بادشاہ

باہر آکر انکی فریاد سنتا اور ان کے مسئلے حل کرتا۔ شاعر اس شعر میں کہتا ہے کہ اب صورتِ حال یہ ہوگئی ہے کہ ضرورت کی چیزیں خریدنے کے لئے دکانداروں کے گھر پر جانا پڑتا ہے۔ وہاں آوازیں دینی پڑتی ہیں۔ گویا دکاندار بھی اب مغل بادشاہ جہانگیر بن گئے ہیں، جن کے دروازے کی زنجیر ہلاکر ان کے سامنے اپنی ضرورتیں رکھنی پڑتی ہیں، تب کہیں جاکر کوئی ضرورت کی چیز ملتی ہے۔

بڑی مشکل سے پہلے جنس گاہک کو دکھاتے ہیں
بتاکر نرخ بالا پھر قیامت ڈھائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی جنس۔ مال۔ نرخ بالا۔ زیادہ قیمت۔
قیامت ڈھانا۔ مشکل میں مبتلا کردینا۔

تشریح اس شعر کا تعلق اوپر والے شعر کے ساتھ ہے۔ دکاندار جب گھر پر ملتا ہے تو پہلے تو وہ اس بات سے انکار کرتا ہے کہ اس کے پاس مال ہے۔ جب گاہک مجبور کرتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ چیز مل تو جائیگی مگر اس کی قیمت ذرا زیادہ ہے کیونکہ میں نے خود یہ مال مہنگے داموں خریدا ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ میں منافع خور نہیں ہوں۔ صرف جائز منافع ہی لیتا ہوں۔ یہ چیز ویسے بھی بڑی نایاب ہے۔ میں نے بڑی مشکل سے اس کی تھوڑی سی مقدار بہم پہنچائی ہے۔ اس طرح کی باتیں کرکے وہ گاہک سے منہ مانگے دام وصول کرتا ہے۔ گاہک کی مجبوری ہے کہ اسے مطلوبہ چیز کی ضرورت ہے لہذا وہ ہر قیمت پر اسے خریدتا ہے، خواہ اس پر قیامت ہی کیوں نہ گزر جائے۔

ادھر لالچ کے پلڑے میں نکمّا مال ملتا ہے
ادھر گاہک کے رخ پر مُردنی سی چھائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی مُردنی چھانا۔ چہرے کا رنگ زرد ہونا۔

تشریح مال سپلائی کرنے والے بڑے لالچی لوگ ہیں۔ ایک تو وہ مال مہنگا بیچتے ہیں، دوسرے ان کا مال ناقص ہوتا ہے۔ گاہک کا ایک المیہ یہ بھی ہے کہ اسے مال پہلے دکھایا نہیں جاتا۔ جب مال تولنے کا مرحلہ آتا ہے تو اسے پتہ چلتا ہے کہ وہ خراب اور

ناقص ہے۔ یہ صورتِ حال دیکھ کر گاہک پریشان ہو جاتا ہے۔ اس کے چہرے کا رنگ اُڑ جاتا ہے۔ مگر اس کی مجبوری یہ ہے کہ مال کہیں اور سے نہیں ملتا۔ لہٰذا وہ یہی ناقص مال زیادہ نرخ پر خریدنے پر مجبور ہے۔

منافع خور راہِ نیک و بد کب دیکھ سکتا ہے
ملے دولت تو عقل و ہوش کی بلی نائی جاتی ہے

تشریح وہ شخص جو منافع خور ہے، جو دولت کے پیچھے بھاگتا ہے، وہ اچھائی اور برائی میں تمیز نہیں کر سکتا۔ دولت انسان کو اندھا کر دیتی ہے اور وہ نیکی اور بدی کی تمیز کھو بیٹھتا ہے۔ اسکی زندگی کا مقصد صرف مال و دولت اکٹھی کرنا رہ جاتا ہے۔ اسے احساس نہیں ہوتا کہ اس کی منافع خوری اور ذخیرہ اندوزی معاشرے میں کیسی کیسی برائیاں پیدا کر رہی ہے۔

اسی بازار میں اک اور بھی تصویر ملتی ہے
جہاں ہر جنس کی خالی شباہت پائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی شباہت ۔ شکل و صورت

تشریح اس شعر میں شاعر نے ملاوٹ اور کھوٹ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہماری دقت یہ ہے کہ ہمیں بازار میں جو چیز ملتی ہے، وہ بڑی مشکل سے دستیاب ہوتی ہے کیونکہ وہ ذخیرہ اندوزوں کے قبضے میں ہوتی ہے۔ دوسرے اس کے نرخ آسمان سے باتیں کرتے ہیں اور گاہک کو اپنی مجبوری کے تحت وہ خریدنی پڑتی ہیں۔ مہنگے داموں خریدنے کے باوجود چیز خالص نہیں ہوتی۔ وہ کسی چیز سے ملتی جلتی ضرور ہوتی ہے لیکن وہ اصل چیز نہیں ہوتی۔

یہ مرچیں ہیں جنہیں گیرو نے اپنا رنگ بخشا ہے
یہ ہلدی زرد مٹی ہے فقط پسوائی جاتی ہے
کہیں چاول کی کنکی پر چڑھائے قند کا شیرہ
یہ چینی ہے جو دنیا کے گلے چپکائی جاتی ہے
نہ چکنائی، نہ بالائی، یہ خالص دودھ ہے بھائی
کہ جس کو دیکھ کر اب بھینس بھی شرمائی جاتی ہے

برادے سے کرے ہے نانبائی استفادہ جب

تو کتوں پر نظر قصاب کی للچائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

گیرو - ایک قسم کی لال مٹی۔ کنکی - چاول کا چورہ

قند - چینی - برادہ - لکڑی یا دھات کا چورہ - استفادہ - فائدہ -

تشریح

بازار میں کوئی چیز خالص نہیں ملتی - مرچوں کے نام پر لال مٹی بک رہی ہے۔ زرد مٹی کو پیش کر اسے ہلدی کا نام دیا جا رہا ہے۔ چاولوں کے چورے پر چینی کا قوام چڑھا کر اسے چینی کہہ کر بیچا جا رہا ہے۔ بازار میں جو دودھ مل رہا ہے اور جسے خالص دودھ کہہ کر فروخت کیا جا رہا ہے اس میں نہ چکنائی ہے اور نہ اس پر بالائی آتی ہے۔ وہ محض سفید رنگ کا پانی ہے۔ یہ دودھ ایسا ہے کہ اگر بھینس کے سامنے رکھا جائے تو وہ بھی اسے اپنا دودھ تسلیم کرنے سے انکار کر دے اور شرمسار ہو جائے۔ نانبائی جو روٹی بیچ رہا ہے وہ آٹے کی بجائے لکڑی کے بُرادے سے بنی ہوئی ہے۔ اور اِدھر قصائی ہے کہ وہ کتوں کا گوشت بکرے کا گوشت کہہ کر بیچ رہا ہے۔

یہ صورتِ حال کہ ہر چیز مہنگی بھی ہے اور ناخالص بھی، کسی معاشرے کی انتہائی پستی کی دلیل ہے۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ ہمارا معاشرہ اخلاقی اعتبار سے بانجھ ہو چکا ہے اور ہماری روحانی اور مذہبی اقدار پامال ہو چکی ہیں۔ دولت کے نشے نے لوگوں کو بے حس کر دیا ہے اور وہ ہر قسم کی برائی کو جائز تصور کرنے لگے ہیں۔

کہیں آلو میں چربی کو رگڑ کر گھی بناتے ہیں
عجب حکمت سے روح کیمیا تڑپائی جاتی ہے
خس و خاشاک کی عطار پڑیا باندھ دیتا ہے
سڑک کی خاک بھی جس میں عطا فرمائی جاتی ہے
بھنے تیتر سرِ بازار بکتے ہوں تو یہ سمجھو
پسِ پردہ کہیں کوّوں کی شامت لائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

حکمت - دانائی - کیمیا - تانبے کو سونا بنانے کا عمل

خس و خاشاک۔ کوڑا کرکٹ۔ عطّار۔ پنساری۔ دوا فروش۔

تشریح

ملاوٹ کا یہ عالم ہے کہ کہیں آلوؤں میں چربی ملا کر نقلی اور مصنوعی گھی بنایا جا رہا ہے اور اس طرح ملاوٹ کرنے والے بزعم خود کیمیا گری کے فن کا مظاہرہ کر رہے ہیں اگر کسی دیسی دوا فروش کے پاس دوا لینے جائیں تو وہ کوڑے کرکٹ کی پڑیا باندھ دیتا ہے جس میں سڑک کی مٹی بھی شامل ہوتی ہے اور اگر بازار میں بکتے ہوئے تیتر تک رہے ہوں تو سمجھ لو کہ یہ تیتر نہیں ہیں، کوّے ہیں جنہیں تیتر کہہ کر فروخت کیا جا رہا ہے۔

غذا میں مِل رہا ہے بے محابا تیل مٹی کا
ہماری خشک آنتوں میں بھی چکنائی جاتی ہے
مشینوں کو یہی روحِ رواں حرکت میں لاتی ہے
بشر پی لے تو آخر کیا قیامت آئی جاتی ہے
اسی سے حضرتِ حجّام ریزر تیز کرتے ہیں
اسی سے گاہکوں کی کھوپڑی سہلائی جاتی ہے
اطبّا کا یہ کہنا ہے کہ ایسا تیل پینے سے
توانائی تو آتی ہے مگر دانائی جاتی ہے

مشکل الفاظ کے معانی

بے محابا۔ بے دھڑک۔ قیامت آنا۔ مصیبت آنا
ریزر۔ استرا۔ سہلانا۔ آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرنا۔ اطبّا۔ طبیب کی جمع۔ توانائی۔ قوّت۔

تشریح

انسانی جسم کو اپنی نشوونما کے لئے چکنائی کی ضرورت ہوتی ہے۔ ملاوٹ کرنے والوں نے خوراک سے چکنائی تو غائب کر دی ہے اور اس کی جگہ مٹی کا تیل ملا دیا جاتا ہے شاعر طنزاً کہہ رہا ہے کہ یہی چکنائی ہے جس سے ہم آنتوں کی خشکی کو دُور کرتے ہیں۔ یہی تیل مشینوں کے چلانے میں کام آتا ہے۔ گویا یہ مشینوں کے لئے روحِ رواں کا کام دیتا ہے۔ اسے اگر انسان پی لے تو کیا قیامت آ جائیگی! یہ جس طرح مشینوں کے لئے مفید ہے اسی طرح انسانوں کے لئے بھی کارآمد ہے۔ یہی تیل ہے جس سے حجّام اپنا استرا تیز کرتا ہے۔ اور یہی تیل ہے جو سرسوں کے تیل کی جگہ سر کی مالش کے کام آتا ہے۔ آخر میں شاعر کہتا ہے کہ اس تیل کے بارے میں طبیبوں کی رائے یہ ہے کہ یہ بڑا توانائی بخش ہے۔ ظاہر ہے

کہ جو بڑی بڑی مشینوں کو چلا سکتا ہے، اس کے توانائی بخش ہونے میں کیا شک ہے۔ مگر اس میں ایک نقصان بھی ہے اور وہ یہ اس کے کھانے سے انسان عقل سے عاری ہو جاتا ہے اور احمق نظر آنے لگتا ہے۔

یہ پوری نظم معاشرے کی پامال ہوتی ہوئی اخلاقی قدروں کے خلاف بھرپور احتجاج ہے۔ انسان اتنا مادہ پرست اور لالچی ہوگیا ہے۔ کہ وہ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ کر کے انسانی جانوں کے ساتھ کھیلنے سے بھی گریز نہیں کرتا۔

نظم کی تلخیص

اس نظم میں شاعر نے ذخیرہ اندوزی اور ملاوٹ کرنے والوں کو طنز کا نشانہ بنایا ہے وہ کہتا ہے کہ جو چیز اپنے ملک میں نہیں ملتی اس کے لئے حکومت درآمدی لائسنس جاری کرتی ہے۔ وہ چیز ملک میں آتے ہی ذخیرہ اندوزوں کے ہاتھ لگ جاتی ہے جو اسے منہ مانگے داموں پر بیچتے ہیں۔ بلکہ گاہک پر احسان بھی کرتے ہیں کہ انہوں نے مطلوبہ چیز اسے فراہم کر دی ہے۔ ملاوٹ کرنے والوں نے بھی ملک میں قیامت برپا کر رکھی ہے۔ لال مٹی کو مرچوں کے نام سے فروخت کرتے ہیں۔ زرد مٹی ہلدی کے نام پر بک رہی ہے۔ چاول کی کنکی پر چینی کا قوام چڑھا کر اسے چلغوزے کہہ رہے ہیں۔ دودھ ایسا پتلا کہ اس میں چکنائی ہوتی ہے نہ اس پر بالائی آتی ہے۔ آٹے کی بجائے برادے کی روٹی میسر آتی ہے اور قصاب کتوں کا گوشت بکرے کا گوشت کہہ کر فروخت کر رہے ہیں۔ اگر بازار میں بھنا ہوا تیتر بک رہا ہو تو سمجھ لو کہ یہ بھنا ہوا کوا ہے۔ غذا میں مٹی کا تیل ملایا جا رہا ہے۔ غرض کوئی چیز خالص نہیں مل رہی۔

مرکزی خیال

آج کل منافع خوری نے یہ حال کر دیا ہے کہ بازار میں جو بھی چیز ملتی ہے مہنگی اور ناخالص ملتی ہے۔ دکاندار ضرورت کا مال منگواتے ہی غائب کر دیتے ہیں اور پھر گاہکوں پر احسان جتا کر دیتے ہیں۔ ادویات ہوں یا غذائی اشیاء سب ملاوٹ کا شکار ہیں اور یہ انسانی صحت کے لئے زہر کا کام کر رہی ہیں۔

سیّد محمد جعفری (۱۹۱۱ء تا ۱۹۷۶ء)

ایبسٹریکٹ آرٹ

تعارف اس نظم میں تجریدی آرٹ کو طنز کا موضوع بنایا گیا ہے۔ اس آرٹ کا موجد پکاسو تھا اور اس میں آڑھی ترچھی لکیروں سے تصویریں بنائی جاتی ہیں۔ عام طور پر یہ آرٹ لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا اور وہ فیشن کے طور پر ایسی تصویروں کی تعریف کرتے ہیں۔

ایبسٹریکٹ آرٹ کی دیکھی تھی نمائش میں نے
کی تھی از راہِ مروّت بھی ستائش میں نے
آج تک دونوں گناہوں کی سزا پاتا ہوں
لوگ کہتے ہیں کہ کیا دیکھا، تو شرماتا ہوں

مشکل الفاظ کے معانی
ایبسٹریکٹ آرٹ۔ مجرّد مصوّری۔ تجریدی آرٹ۔
از راہِ مروّت۔ لحاظ کے طور پر۔ ستائش۔ تعریف۔

تشریح شاعر کہتا ہے کہ میں نے ایک دفعہ مجرّد مصوّری کی نمائش دیکھی اور میں نے از راہِ لحاظ نمائش میں پیش کی جانے والی تصویروں کی تعریف کی، لیکن میرا ضمیر آج تک مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں نے نمائش میں کیا دیکھا تھا اور کس چیز کی تعریف کی تھی۔ وہاں کوئی ایسی تصویر نہیں تھی جو کسی کی سمجھ میں آ سکتی اور جس کی تعریف کی جا سکتی۔ اسی وجہ سے بعض لوگوں کے نزدیک مجرّد تصویر کشی، مصوری کی کوئی قسم نہیں ہے بلکہ یہ لوگوں کو دھوکا دینے والی بات ہے۔ یہاں تک کہ مجرّد آرٹ کے موجد پکاسو نے مرنے سے پہلے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا تھا کہ اس نے مجرّد آرٹ کا راستہ دکھا کر لوگوں کو غلط راہ پر ڈالا اور فن مصوری کو نقصان پہنچایا، لیکن مجرّد آرٹ کے حامیوں نے کہا کہ پکاسو کی یہ باتیں بھی مجرّد آرٹ کا عمدہ نمونہ ہیں۔

ایک تصویر کو دیکھا جو کمالِ فن تھی،
بھینس کے جسم پہ اک اونٹ کی سی گردن تھی
ناک وہ ناک خطرناک جسے کہتے ہیں
ٹانگ کھینچی تھی کہ مسواک جسے کہتے ہیں

تشریح: ان اشعار میں شاعر نے نمائش میں پیش کی جانے والی تصویروں کا بے ہنگم پن ظاہر کیا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وہاں ایک تصویر تھی جسے تجریدی آرٹ کے مدّاح فن کا کمال کہتے تھے۔ یہ ایک بھینس کی تصویر تھی جس پر اونٹ کی گردن لگا دی گئی تھی۔ اس کی ناک کا یہ عالم تھا کہ اسے دیکھ کر خوف آتا تھا۔ ٹانگیں ایسی پتلی تھیں جیسے مسواک ہو۔ یہ بے تکی تصویر جس کی کوئی کل سیدھی نہیں تھی۔ تجریدی آرٹسٹوں کے نزدیک فن کا انتہائی عمدہ نمونہ تھی۔

تیسرے مصرعے میں 'ناک' کی تکرار سے شاعر نے مزاحیہ فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔

نقشِ محبوب مصوّر نے سجا رکھا تھا
مجھ سے پوچھو تو تپائی پہ گھڑا رکھا تھا
ایک تصویر کو دیکھا کہ یہ کیا رکھا ہے
ورقِ صاف پہ رنگوں کو گرا رکھا ہے
ٹیڑھی ترچھی سی لکیریں تھیں وہاں جلوہ فگن
جیسے ٹوٹے ہوئے آئینے پہ سورج کی کرن

مشکل الفاظ کے معانی: نقشِ محبوب۔ محبوب کی تصویر۔ مصوّر۔ تصویر بنانے والا۔ تپائی۔ تین ٹانگوں والی میز۔ جلوہ فگن۔ روشنی ڈالنے والی یا ظاہر ہونے والی۔

تشریح: میں نے ایک تصویر دیکھی جس میں مصوّر نے اپنی طرف سے ایک محبوبہ کا نقش بنا رکھا تھا، لیکن مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس نے تین ٹانگوں کی میز بنا کر اس پر گھڑا رکھا ہوا ہو۔ ایک اور تصویر کی تعریف ہو رہی تھی، حالانکہ وہاں کوئی تصویر نہیں تھی مصوّر نے ایک سادہ ورق پر مختلف قسم کے رنگ گرا دیے تھے

اور دیکھنے والوں کو بتایا جا رہا تھا کہ یہ بھی ایک تصویر ہے، حالانکہ وہاں صرف ٹیڑھی میڑھی لکیریں تھیں جیسے کسی ٹوٹے ہوئے آئینے پر سورج کی کرنیں پڑ رہی ہوں۔

ایک تصویر کو دیکھا تو یہ صورت نکلی
جس کو سمجھا تھا اناناس وہ عورت نکلی

اس نمائش میں جو اطفال چلے آتے تھے
ڈر کے ماؤں کے کلیجوں سے لپٹ جاتے تھے

مشکل الفاظ کے معانی

اناناس ۔ ایک پھل۔ اطفال۔ بچے

تشریح

ایک تصویر میں اناناس کی شکل بنی ہوئی تھی۔ جب میں نے منتظمین سے یہ بات کی تو وہ مسکرائے اور کہا کہ یہ تو ایک عورت کی تصویر ہے۔ جو بچے یہ نمائش دیکھنے کے لئے آتے تھے وہ ان آڑھی ترچھی لکیروں سے بنی ہوئی خوفناک شکلوں سے ڈر کر اپنی ماؤں سے لپٹ جاتے تھے اور ان کے دامن میں پناہ لیتے تھے۔

الغرض جائزہ لے کر یہ کیا ہے انصاف
آج تک کر نہ سکا اپنی خطا خود میں معاف

میں نے یہ کام کیا سخت سزا پانے کا
یہ نمائش نہ تھی اک خواب تھا دیوانے کا

تشریح

نمائش میں رکھی گئی عجیب وغریب تصویروں کو دیکھ کر شاعر اپنے آپ کو مجرم تصور کرتا ہے اور پھر ان کی ازراہِ مروت تعریف کر کے وہ اپنے آپ کو ایسا قصوروار سمجھتا ہے جس کا قصور ناقابلِ معافی ہو اور جسے وہ خود بھی معاف کرنے کے لیے تیار نہ ہو۔ وہ کہتا ہے کہ میں نے جو کام کیا ہے مجھے اس کی سزا ملنی چاہیئے یہ کوئی نمائش تھی؟ ۔ یہ تو ایک پاگل کا خواب تھا۔ بے تکا اور بے ہودہ، جس کی کوئی تعبیر نہ ہو، جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔

کیسی تصویر بنائی مرے بہکانے کو
اب تو دیوانے بھی آنے لگے سمجھانے کو

تشریح

تجریدی مصوّروں نے یہ تصویریں مجھے گمراہ کرنے کے لئے بنائی ہیں۔ یہ درحقیقت

تصویریں نہیں ہیں۔ کہیں دو چار اُلٹے سیدھے خط کھینچ دیئے گئے ہیں۔ کہیں رنگ گرا، دیئے گئے ہیں۔ کہیں کوئی پھل بنا دیا گیا ہے اور اس پر عورت کا عنوان چسپاں کر دیا گیا ہے۔ اب تو پاگل لوگ بھی مجھے سمجھانے آ رہے ہیں کہ جناب ایسی نمائشوں میں نہ جایا کیجیے۔ یہ تصویروں کی نمائش نہیں ہے، محض لوگوں کو بیوقوف بنانے کی ایک ترکیب ہے۔

نظم کی تلخیص

شاعر کہتا ہے کہ ایک دفعہ میں نے تجریدی آرٹ کی نمائش دیکھی اور از راہِ مروت تصویروں کی تعریف بھی کر دی۔ لیکن آج تک میرا ضمیر مجھے ملامت کر رہا ہے کہ میں نے کیا دیکھا اور کس چیز کی تعریف کی تھی؟ ایک تصویر میں بھینس کے جسم پر اونٹ کی گردن لگا دی گئی تھی۔ اس کی ناک ایسی تھی کہ دیکھ کر خوف آنے لگے۔ اور اس کی ٹانگیں مسواک کی طرح پتلی تھیں گویا چند آڑے ترچھے خط تھے جن کو تصویر کا نام دے دیا گیا تھا۔

ایک تصویر میں تپائی پر گھڑا رکھا تھا لیکن تجریدی آرٹسٹ اسے نقشِ محبوب کہہ رہا تھا۔ ایک اور تصویر میں مجھے انناس کا پھل دکھائی دیا لیکن منتظمین نے بتایا کہ وہ ایک عورت کی تصویر ہے۔ تصویروں کی نمائش دیکھ کر عام طور پر روح میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے لیکن یہ نمائش ایسی تھی کہ بچے خوف کے مارے ماؤں سے لپٹے جاتے تھے۔

مرکزی خیال

اس نظم میں تجریدی آرٹ کا مذاق اڑایا گیا ہے۔ تصویر کچھ ہوتی ہے لیکن آرٹسٹ اس کا مفہوم کچھ اور نکالتا ہے۔ تپائی پہ گھڑا رکھا ہو تو اسے نقشِ محبوب کہا جاتا ہے اور انناس کی تصویر کو عورت کی تصویر بتایا جاتا ہے۔ اس طرح کی نمائش لوگوں کی بے وقوف بنانے کے لیے منعقد کی جاتی ہے۔ لہٰذا اس سے گریز بہتر ہے۔

مرزا محمود سرحدی (۱۹۱۳ء تا ۱۹۶۸ء)

قطعات

①

بے خبر اب تو ہے دولت ہی شرافت کا نشان
لوگ پہلے کبھی تحویلِ نسب کرتے تھے
اب تو شاگردوں کا استاد ادب کرتے ہیں
سنتے ہیں ہم کبھی شاگرد ادب کرتے تھے

مشکل الفاظ کے معانی تحویلِ نسب ۔ نسب یا خاندان کا حوالہ دینا۔

تشریح اس قطعہ میں شاعر نے بدلی ہوئی معاشرتی اقدار پر بھرپور طنز کیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ لوگ اپنی شرافت اور اعلیٰ روایات کے اظہار کے لئے اپنے خاندان کا نام لیتے تھے۔ یہ خاندان ہی ان کی پہچان ہوتا تھا۔ ان کے عزیز رشتہ دار، ان کے کردار اور چال چلن کا ایک طرح کا سرٹیفکیٹ ہوتے تھے۔ لیکن اب زمانہ تبدیل ہوگیا ہے۔ اب لوگ اپنے خاندان کا نام نہیں لیتے، اپنی امارت کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں۔ میرے پاس کوٹھی ہے۔ میں کار کا مالک ہوں۔ میرا بہت بڑا بنک بیلنس ہے اور اس طرح اپنی دولت کا ذکر کر کے وہ معاشرے میں معزز اور قابلِ احترام ٹھہرتے ہیں اور معاشرہ ہے کہ ان کی اس حیثیت کو قبول کرتا ہے۔ ایک دور میں کہا جاتا تھا "شملہ بقدرِ علم" یعنی جس قدر کوئی شخص عالم ہوتا تھا اسی قدر وہ اپنی پگڑی کا شملہ اونچا رکھتا تھا۔ لیکن اب دور "شملہ بقدرِ زر" کا آگیا ہے۔ جس آدمی کے پاس جتنی زیادہ دولت ہے وہ اتنا ہی زیادہ اتراتا اور غرور کرتا ہے۔ اب خاندانی شرافت کسی کی پہچان نہیں رہی۔ بلکہ ذاتی مال و دولت اس کی شناخت بن گئی ہے اور یہ سب اس نئے زمانے کی دین ہے جس نے ہماری پرانی اخلاقی قدریں پامال کر دی

رہی۔ پہلے زمانے میں شاگرد اُستاد کا احترام کرتا تھا۔ اس کی جوتیاں سیدھی کرتا تھا۔ اب یہ دَور آگیا ہے کہ استاد، شاگردوں کا ادب کرنے لگے ہیں، تا کہ ایسا نہ ہو کہ شاگرد گستاخی پر اتر آئے۔ علامہ اقبال نے اس مضمون کو یوں بیان کیا ہے۔

تہذیب کے مریض کو گولی سے فائدہ — دفعِ مرض کے واسطے پِل پیش کیجئے
تھے وہ بھی دن کہ خدمتِ استاد کے عوض — جی چاہتا تھا ہدیہ دل پیش کیجئے
بدلا زمانہ ایسا کہ لڑکا پس از سبق — کہتا ہے ماسٹر سے کہ بِل پیش کیجئے

۲

تمام زر کے کرشمے ہیں آج دنیا میں
شریف کوئی نہیں ہے۔ رذیل کوئی نہیں
جو اپنی آپ کفالت نہ کر سکے محمود
تو جان لیجئے اس کا کفیل کوئی نہیں

مشکل الفاظ کے معانی زر۔ سونا۔ دولت۔ کرشمہ۔ کرامت
رذیل۔ گھٹیا۔ کفیل۔ کفالت کرنے والے۔ ذمہ داری اٹھانے والے

تشریح یہ دَور سرمایہ داری کا دَور ہے۔ اس میں کسی کی ذاتی شرافت اور کسی کے ذاتی گھٹیاپن کو کوئی نہیں دیکھتا۔ جس آدمی کے پاس دولت ہے، اسے معاشرے میں قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے، خواہ وہ کیسا ہی ذلیل کیوں نہ ہو۔ جو شخص کچھ نہیں رکھتا وہ کتنا ہی شریف اور اعلیٰ اخلاق کا مالک کیوں نہ ہو، اسکی کوئی عزت نہیں کرتا۔ اسے رذیل خیال کیا جاتا ہے۔ پہلے یہ ہوتا تھا کہ امیر لوگ، غریبوں کی کفالت کرتے تھے۔ انہیں بوقتِ ضرورت مالی امداد دیتے تھے، لیکن اب دولت گھٹیا لوگوں کے پاس چلی گئی ہے، جو کسی کو کچھ دینا گوارا نہیں کرتے۔ لہٰذا اب کسی غریب کا کوئی کفیل نہیں ہے۔ جو اپنی مدد آپ کر سکے صرف وہی کامیاب ہے

۳

نوکری کے لئے اخبار کے اعلان نہ پڑھ
جان پہچان کی باتیں ہیں، کہا مان، نہ پڑھ،

جن کو ملنی ہو انہیں پہلے ہی مل جاتی ہے،
بس دکھاوے ہی کے ہوتے ہیں یہ فرمان، نہ پڑھ

تشریح جن سرکاری محکموں کو ملازموں کی ضرورت ہوتی ہے، وہ اخبارات میں "ضرورت ہے" کے عنوان سے اشتہار دیتے ہیں۔ ضرورت مند ان محکموں کو درخواستیں بھجواتے ہیں اور اس اُمید پر بیٹھے رہتے ہیں کہ انہیں انٹرویو کا بلاوا آئے گا اور انہیں ملازمت مل جائیگی۔ ہوتا یہ ہے کہ انٹرویو کا بلاوا آتا ہے، انٹرویو ہوتا ہے لیکن امیدوار بے چارے کو نوکری نہیں ملتی۔ شاعر ان امیدواروں سے مخاطب ہوکر کہہ رہا ہے کہ نوکری کے اشتہارات نہ پڑھا کرو۔ یہ سب دھوکا ہیں۔ تمہاری آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف ہیں۔ ان محکموں نے جن لوگوں کو ملازم رکھنا ہوتا ہے، ان کو پہلے ہی رکھ لیتے ہیں اور اشتہار تو لوگوں کو مطمئن کرنے کے لئے چھپواتے ہیں کہ ہم تمام لوگوں کو ملازمتوں کے یکساں مواقع فراہم کرتے ہیں۔ کسی کی سفارش نہیں مانتے اور اُمیدواروں کی اہلیت کی بنیاد پر چنتے ہیں۔

(۴)

قائم کچھ ایسے لوگوں کا دُنیا میں ہے وقار
دُنیا کچھ ایسے لوگوں پہ کرتی ہے اعتبار
چوروں کو جو دکھائیں مقامِ نَقَب زَنی
اور مالکِ مکان سے کہ دیں کہ ہوشیار

مشکل الفاظ کے معانی مقامِ نقب زنی۔ چوری کرنے کی جگہ۔

تشریح یہ دنیا شریف انسانوں کی دنیا نہیں رہی۔ یہ مکّار اور عیّار لوگوں کی دنیا بن گئی ہے۔ شریف آدمی کی کوئی قدر نہیں کرتا۔ یہاں اس آدمی کا وقار ہے اور وہ آدمی با اعتبار ہے جو چوروں کو مشورہ دیتا ہے کہ فلاں گھر میں نقب لگاؤ اور گھر والوں کو بتاتا ہے کہ ہوشیار رہنا، تمہارے گھر چوری ہونے والی ہے۔ معاشرہ اتنا بگڑ چکا

ہوا ہے کہ ایسے منافق اور چال باز لوگ عزت اور وقار کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور مخلص اور دیانت دار لوگوں کو کوئی پوچھتا نہیں۔

۵

جس کا بس چلتا نہیں بیوی پہ گھر میں آج کل
باہر آکر کوستا ہے پہلے پاکستان کو
اس قدر ہو جائے جس کی پست ذہنیت تو پھر
فوقیت حاصل ہے اس انسان پر حیوان کو

تشریح

قیام پاکستان کے بعد چاہیئے تو یہ تھا کہ لوگ اس سرزمین کو لوٹ کر جاتے جس نے ان کو جان، مال اور عزت کا تحفظ دیا۔ جہاں انہیں روزگار کے اعلیٰ مواقع ملے اور معاشی استحکام نصیب ہوا۔ جہاں ان کے لیے تمام شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کے راستے کھلے اور زندگی کو آسودگی میسر آئی۔ لیکن بدقسمتی سے ایسا نہیں ہو سکا۔ بعض لوگ ایسے ہیں جو اپنی ذاتی حماقتوں کے لیے بھی پاکستان کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ وہ اگر گھر میں بیوی سے لڑ پڑتے ہیں تو الزام پاکستان کو دیتے ہیں۔ راہ چلتے پھسل جائیں تو پاکستان کو برا کہتے ہیں۔ بارش زیادہ ہو جائے تو پاکستان قصوروار، نہ ہو تو پاکستان مجرم۔ شاعر کہتا ہے وطن کو گالی دینا، پست ذہنیت کا اظہار ہے اور ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔

شرح

حصۂ غزلیات

از

پروفیسر ریاض مجید

خواجہ میر دردؔ

(۱۷۱۹ء — ۱۷۸۵ء)

غزل نمبر۱

شعر نمبر۱: باغِ جہاں کے گُل ہیں یا خار ہیں تو ہم ہیں
گر یار ہیں تو ہم ہیں اغیار ہیں تو ہم ہیں

مشکل الفاظ باغ جہاں: دنیا کا باغ ٭ گُل: پھُول ٭ خار: کانٹا ٭
اغیار: غیر کی جمع مراد اجنبی، دشمن ٭

تشریح خواجہ میر دردؔ صوفی شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں صوفیانہ خیالات جگہ جگہ ملتے ہیں۔ نہ صرف اس شعر بلکہ اس پوری غزل میں بہت سے ایسے مضامین ہیں جن کا تعلق صوفیا کے خاص عقائد و نظریات سے ہے۔

اس شعر کا مرکزی خیال دنیا میں انسان کے مقام اور اس کی اہمیت کی وضاحت ہے۔ میر دردؔ کہتے ہیں کہ دنیا کے باغ میں آدمی ہی پھُول ہے اور آدمی ہی کانٹا۔ جس طرح باغ میں پھُول اور کانٹے اچھائی اور برائی، خوبصورتی اور بدصورتی، آرام اور اذیت، راحت افزا اور تکلیف دِہ زندگی کے دونوں پہلوؤں کی ترجمانی کرتے ہیں، اسی طرح اس کائنات کے اندر آدمی کی حیثیت ہے۔ وہ اپنے اعمال کے سبب یہاں خیر کا نمائندہ بھی ہے اور شر کا بھی۔ یہاں کی اچھائی بھی اسی سے ہے اور برائی بھی اسی سے ہے۔ اسی طرح اس کا وجود آرام، سُکھ، آسائش، سکُون۔ ملائمت، نیکی، حسن اور خیر کا سرچشمہ بھی ہے اور دنیا میں آلام و مصائب، بربادی، بدہیئتی، انتشار اور شر بھی آدمی ہی کے باعث ہے، یوں خدا تعالیٰ کی لاکھوں تخلیقات میں سے وُہ تخلیق جو دنیا کی رونق اور یہاں کے ہر قسم کے ہنگاموں کا باعث ہے، وہ صرف انسان ہے۔ تخلیق کے پورے پھیلاؤ اور وسعت میں اہمیت صرف انسان کو حاصل ہے۔

اس شعر کے دوسرے مصرع میں میر دردؔ اسی خیال کو ایک اور حوالے سے پیش کرتے ہیں اور وہ ہے دوستی اور دشمنی کا، اپنائیت اور اجنبیت کا۔ یہ رویے بھی انسان کی ذات سے ظاہر ہوتے ہیں۔ کائنات کی باقی تمام چیزیں اپنی تخلیق کے طے شدہ اور مقررہ اصولوں کے مطابق قدرت کا منشا اور مقصد پورا کر رہی ہیں۔ صرف ایک تخلیق انسان ہے، جو اپنے مختلف اور متضاد رویّوں کے اظہار کی وجہ سے آپ اپنا یار بھی ہے، اور آپ اپنا دشمن بھی۔

اس شعر کا ظاہری مفہوم تو وہ ہے جس کا اوپر اظہار کیا گیا ہے اور جس میں انسان کے اچھے یا بُرے کاموں کی وجہ سے پھُول اور کانٹا اور یار یا اغیار کے حوالے سے انسان کی اچھائی یا برائی

کا ذکر کیا گیا ہے۔ مگر اس شعر کا ایک اور مفہوم جو میر درد جیسے صوفی شاعروں کے ہاں عام ملتا ہے، وہ خیر اور شر کے تصور سے ہٹ کر اس دنیا میں انسان کی اہمیت کا بیان ہے کہ دنیا میں ہمارا وجود ہی سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہاں کی ساری رونقیں اور سارے ہنگامے ہمارے ہی دم سے ہیں۔

شعر نمبر ۲:

وابستہ ہے ہمیں سے، گر جبر ہے، وگر قدر
مجبور ہیں تو ہم ہیں، مختار ہیں تو ہم ہیں!

مشکل الفاظ

وابستہ: متعلق، بندھا ہوا ٭ جبر: صوفیہ کا یہ عقیدہ کہ بندہ کو اپنے اعمال و افعال میں کوئی اختیار حاصل نہیں ٭ وگر: اور اگر ٭ قدر: صوفیہ کا یہ عقیدہ کہ انسان محض بے بس نہیں، قدرت نے اُسے کچھ اختیار دے رکھا ہے ٭ مجبور: بے کس، معذور ٭ مختار: اختیار والا ٭

تشریح

میر درد کہتے ہیں کہ جبر اور قدر ~~دونوں کیفیتیں اور~~ دونوں حالتیں انسان ہی سے متعلق ہیں۔ کائنات کے اندر اگر کوئی چیز مجبورِ محض ہے ~~یعنی اپنی طرف سے کچھ نہ کر سکنے پر مجبور ہے~~ تو وہ بھی انسان ہی ہے اور اگر کوئی چیز خدا کی تخلیقات میں سے ایسی ہے جو اپنی طرف سے کچھ کرنے کی قدرت رکھتی ہے، تو وہ بھی انسان ہی ہے۔

ہمارے صوفیا کی اکثریت جبر کے عقیدے پر یقین رکھتی ہے، اُن کے خیال کے مطابق انسان اس کائنات کے اندر قدرت کی طرف سے طے شدہ قسمت کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہے، وہ کوشش کے باوجود اپنی پیدائش موت اور زندگی کے بعض چھوٹے چھوٹے معاملات میں بھی اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتا۔ عمل تو دُور کی بات ہے۔ اُسے ارادے اور خواہش کی آزادی بھی حاصل نہیں۔ کوئی چیز سوچنا اور پھر اُس کے مطابق عمل کرنا بھی قدرت کی طرف سے ہے۔ اِس میں اُس کے ارادے کا کوئی دخل نہیں۔ ان صوفیوں کے انہی جبری خیالات اور رویّوں کو فلسفۂ جبر سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ وہ قیامت کے سلسلے میں سزا اور جزا کے تصوّر کو بھی اسی حوالے سے دیکھتے ہیں۔ اور اُن کا خیال ہے کہ آدمی سے اگر کوئی برائی بھی سرزد ہوتی ہے، تو وُہ اُس کا ذِمّہ دار نہیں، کیونکہ یہ سب کچھ قدرت کی طرف سے ہے، اس لئے آدمی کو سزا کیسی؟ بقولِ شاعر ؎

پتّہ بھی نہیں ہلتا بغیر اُس کی رضا کے ٭ انسان گناہگار ہے معلوم نہیں کیوں؟

البتہ صوفیا کی ایک مختصر تعداد فلسفہ جبر کے برعکس فلسفۂ قدر پر یقین رکھتی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ انسان کو اس کائنات کے اندر ارادے اور آزادانہ کام کرنے کی قدرت حاصل ہے۔ قدرت نے اسے خیر اور شر کے راستے سجھائے ہیں، نیکی اور بدی کا فرق اس پر ظاہر کیا ہے اور پیدائش سے موت تک کے درمیانی وقفہ میں اسے از خود قول و فعل کی آزادی دی ہے۔ اسے اپنے قول اور عمل کا مختار

بنایا ہے۔ لہٰذا اس کی سزا و جزا بھی اسے دیئے گئے اختیار کے حوالے سے ہے۔ اگر وہ اس دنیا میں اچھے کام کرتا ہے تو آگے آنے والی زندگی میں اُسے اس کا انعام ملے گا اور اگر وہ یہاں بُرے کام کرتا ہے تو اسے اس کی سزا بھگتنا ہوگی۔

جبر اور قدر کے یہ تصورات تصوّف کا ایک نہایت اہم باب ہیں اور مختلف صوفیوں نے اپنے اپنے طور پر ان تصوّرات کی باریکیوں پر بحث کی ہے۔ بعض صوفی دانشوروں نے انسان کو مجبورِ محس اور مختارِ مطلق کے درمیان بتایا ہے (”اَلْاَمَر بین الجبر والاختیار“ اور ”اَلْاِیمان بین الجبر والقدر“ کے مشہور صوفیانہ اقوال انسان کی اسی حالت کی نشاندہی کرتے ہیں) میر درؔد اگرچہ جبری خیالات رکھتے ہیں، مگر اس شعر میں وہ اپنے مخصوص صوفیانہ عقیدے کے برعکس جبر اور قدر دونوں حالتوں کو انسان سے وابستہ سمجھتے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ ہم یہاں مجبور بھی ہیں اور مختار بھی، جب کہ اللہ تعالیٰ کی دوسری تخلیقات مثلاً جمادات، نباتات، پہاڑ، سمندر، ہوا، زمین سب مجبورِ محض ہیں۔ قدرت نے انہیں جو خصوصیات عطا کی ہیں، وہ اسی کے مطابق زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔ نہ وہ اپنی مرضی سے کچھ سوچ سکتی ہیں اور نہ کچھ کر سکتی ہیں۔ انسان کے علاوہ دوسری تخلیقات کے لئے جبر و قدر اور مجبور و مختار کے تصورات غیر متعلقہ ہیں۔ اُن کے لئے ایک مستقل جبر کی حالت ہے، جس میں وہ قید ہیں اور وہ ہمیشہ کے لئے مجبوری کی کیفیت میں گرفتار ہیں۔ اس کے برعکس انسان ہزار جبر کی حالت میں ہو مگر وہ کچھ نہ کچھ سوچنے اور کرنے کی قدرت بھی رکھتا ہے۔ وہ لاکھ مجبور سہی مگر اپنے قول و فعل میں کچھ نہ کچھ مختار بھی ہے۔

شعر نمبر ۳

الفاظِ خلق ہم بن سب مہملات میں تھے
معنی کی طرح ربطِ گفتار ہیں تو ہم ہیں

مشکل الفاظ

الفاظ: لفظ کی جمع ✤ خلق: ہجوم، لوگ، خلقت، تخلیق ✤
مہملات: مہمل کی جمع مراد بے معنی ✤ ربط: تعلق ✤ گفتار: کلام، گفتگو۔

تشریح

میر درؔد اس شعر میں انسان کی عظمت، برتری اور اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ تمام تخلیقات مہمل چیزوں اور بے معنی لفظوں کی طرح تھیں۔ اگر کائنات میں بکھری ہوئی لاکھوں چیزوں کے اندر کوئی معنوی ربط ہے تو وہ انسان کی بدولت ہے۔ میر درؔد کا یہ شعر خدا تعالیٰ کی اَن گنت تخلیق کی ہوئی چیزوں کے درمیان انسان کے اَحسن، افضل اور اشرف المخلوقات ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ تخلیق کے بعد حضرت آدم علیہ السلام کو مختلف اشیاء کے اسماء (نام) سکھائے گئے اور پھر خدا تعالیٰ نے انہیں زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا۔ چیزوں کے اسماء کا علم جمادات، نباتات اور حیوانات کے مقابلہ میں صرف انسان کو عطا کیا گیا۔ وہ اس علم اور اپنے

شعور کی بناء پر کائنات کی مختلف چیزوں کو اپنے استعمال میں لا رہا ہے، اگر کائنات کی تمام تخلیقات کو الفاظ سے تشبیہ دی جائے تو اِن کے اندر معنوی ربط انسان کے ذریعے پیدا ہوتا ہے۔ اِسی کے سبب تمام اشیاء کی پہچان ہے اور اسی کی وجہ سے یہ تمام اشیاء با معنی ہیں۔ اگر دنیا میں انسان کا وجود نہ ہوتا تو یہ تمام تخلیقات بے ربط اور بے معنی لفظوں کی طرح ہوتیں بقول کے ؎

سلولائیڈ کا مدہم نقش ہیں دنیا کی سب چیزیں
جو چمکاتی ہے ان کو روشنی وہ میرے اندر ہے

دراصل باقی تخلیقات کی پیدائش ہی انسان کے لئے ہوئی ہے۔ انسان کی بیثیت، تخلیق کے اس پورے نظام میں، مرکزی ہے، جب کہ دوسری چیزوں کی حیثیت ثانوی اور طفیلی ہے۔ بقول احمد ندیم قاسمی ؎

آدمی شش جہات کا دولھا
وقت کی گردشیں براتی ہیں

اس آفاقی مفہوم سے ہٹ کر اس شعر کے کچھ محدود معانی بھی نکلتے ہیں جن کا تعلق شعراء۔ ادباء۔ دانشوروں اور فنکاروں کی ذات سے ہے۔ وہ مفہوم یہ ہے کہ شعراء، غور و فکر کرنے والے دانشور، حسّاس اذہان اور درد مند لوگ، حیوانی سطح پر زندگی گزارنے والے عوام النّاس کے اندر معنی اور ربط کی طرح ہیں، یہ منفرد سوچ رکھنے والے فن کار عوام کی بے وضع سوچوں کو مربوط کرتے ہیں، ان کے بے ہیئت خوابوں کو واضح شکلوں میں ڈھالتے ہیں۔ ان کے ذہن کے اندر پرورش پانے والے بے صورت خوابوں کے صورت گر ہیں۔ ان کے بے معنی لفظوں کو مربوط کرتے ہیں۔ ان کی لکنت اور بُڑبڑاہٹ کو زبان، معانی اور مفہوم عطا کرتے ہیں۔ اگر معاشرے میں یہ لوگ نہ ہوتے تو شائد پورا معاشرہ ہی مہمل اور بے معنی لفظوں کی طرح ہوتا۔ علامہ اقبال نے معاشرے میں شاعروں کے اسی منصب اور مرتبے کا کتنا خوبصورت اظہار کیا ہے:

؎ شاعر اندر سینۂ ملّت چُوں دِل
ملّت بے شاعرے انبارِ گِل

(یعنی شاعر قوم کے سینے میں دل کی طرح ہوتا ہے، وہ قوم جس کے اندر کوئی شاعر نہیں، مٹی کے ڈھیر کی طرح ہے)

اگر میر درؔد کے اس شعر میں "خَلق" کی جگہ "خُلق" پڑھا جائے تو اس کی ایک اور معنوی پَرت ہمارے سامنے آتی ہے۔ اگرچہ اس شعر میں وسیع تر مفہوم لفظ خَلق ہی سے بنتا ہے اور قرینِ قیاس یہی ہے کہ میر درؔد نے یہاں لفظ خَلق ہی باندھا ہے۔ لیکن ہماری توجہ خُلق کی طرف بھی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں میر درؔد کے شعر کا مفہوم یہ ہوگا کہ خُلق، ہمدردی، محبت

مروّت، بھائی چارہ، مواخات اور اس طرح کے تمام الفاظ ہماری وجہ سے اور ہمارے کریمانہ اور خلیق رویّوں کے سبب با معنی بنتے ہیں، اگر ہم نہ ہوتے تو خُلق و محبّت کے تمام الفاظ، کلمے اور فقرے بے معنی اور مہمل ہوتے۔

شعر نمبر ۱۴

تیرا ہی حُسن جگ میں ہر چند موجزن ہے
تِس پر بھی تشنہ کامِ دیدار ہیں تو ہم ہیں

مشکل الفاظ جگ: دنیا ٭ ہر چند: اگرچہ ٭ موجزن: موجیں مارنے والا، ٹھاٹھیں مارنے والا ٭ تِس پر: اس پر، اس کے باوجود ٭ تشنہ کام: تِشنہ کا مطلب پیاسا؛ کام کا مطلب حلق، یعنی وہ شخص جس کا حلق خشک ہو، مراد پیاسا، کام کا مطلب مراد اور مقصد بھی ہوتا ہے، یوں تشنہ کام سے مراد ہے ناکام ٭

تشریح میر درؔد نے اس شعر میں صوفیوں کے معروف خیال کی ترجمانی کی ہے۔ صوفیانہ خیالات رکھنے والوں کے ہاں یہ مضمون عام ملتا ہے کہ دنیا میں ہر طرف خدا تعالیٰ ہی کے جلوے نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

ے جگ میں آکر اِدھر اُدھر دیکھا ٭ تُو ہی آیا نظر جدھر دیکھا
نظر میرے دل کی پڑی درؔد کس پر ٭ جدھر دیکھتا ہوں وہی رُوبرو ہے

صوفیانہ نظر سے دُنیا کا مشاہدہ کرنے والے شعراء کہتے ہیں کہ سورج، چاند، ستاروں، درختوں، پرندوں، بہتے ہوئے جھرنوں، گرتے ہوئے آبشاروں، گلابی صبحوں اور نیلی شاموں، غرضیکہ کائنات کی تمام اشیاء میں خُدا کا حُسن نظر آتا ہے۔ تخلیقِ کائنات کے پھیلے ہوئے اس سلسلے کے پیچھے اس کے خالق کا حُسن ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ اگر انسان حقیقت کی آنکھوں سے ارد گرد دیکھے تو اُسے ہر چیز میں خالقِ حقیقی کے انوار نہ صرف دکھائی دیں گے، بلکہ اسے یوں محسوس ہوگا جیسے در و دیوار میں سے بھی خدا تعالیٰ کا حُسن اُبل رہا ہے۔

ے چشم بکُشا کہ جلوۂ دِلدار ٭ متجلّیٰ است از در و دیوار

(یعنی آنکھیں کھول کے دیکھ۔ در و دیوار میں سے محبوبِ حقیقی کے جلوے ضو ریز ہو رہے ہیں)

درؔد نے صوفیوں کے اس خیال سے جو نیا مضمون پیدا کیا ہے وہ یہ ہے کہ جلووں کی اس کثرت اور حُسن کے اس ہجوم کے باوجود ہمیں خدا تعالےٰ کے انوار کا مکمل دیدار نصیب نہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے خدا، ہمیں تسلیم کہ دنیا کی ہر چیز میں تیرا حُسن جلوے دکھا رہا ہے، لیکن اس کثرتِ انوار کے دیدار کے باوجود ہمارے دِل و جان کی سیرابی نہیں ہوئی، ابھی ہمارا جی نہیں بھرا۔ بقول مرزا غالب ے ہنوز محرمیٔ حُسن کو ترستا ہوں۔

پنجابی کے ایک معروف صوفی شاعر (سلطان باہو) بھی اپنے ابیات میں ایک جگہ ایسے ہی مضمون کو یوں پیش کرتے ہیں :

ایہہ تن میرا چشمہ ہووے دلبر دیکھ نہ رجّاں ہُو
لوُں لوُں دے مُڈھ لکھ لکھ چشماں اک کھولاں اِک کجّاں ہُو
اِیناں ڈٹھیاں صبر نہ آوے ہور کتے ول بھجّاں ہُو
مُرشد دا دیدار اے باہو لکھ کروڑاں حجّاں ہُو

اِن ابیات کا مفہوم یہ ہے کہ مُرشد کا کامل دیدار لاکھ کروڑ حجّوں کے برابر ہے۔ اگرچہ میرا تمام جسم آنکھ بنا ہوا ہے ۔ میرے روئیں روئیں میں لاکھوں آنکھیں ہیں۔ میں جلووں کی کثرت کے سبب بے تابانہ ایک آنکھ کھولتا ہوں، ایک بند کرتا ہوں، اتنا زیادہ دیکھنے کے باوجود میری سیری نہیں ہوتی۔ مجھے صبر نہیں آرہا۔ اَب میں کہاں جاؤں، یعنی وُہ آنکھ کہاں سے لاؤں، جس سے مُرشدِ حقیقی (خدا) کے سبھی انوار میری روح کو اس طرح سیراب کردیں کہ میری پیاس بجُھ جائے۔

میر دردؔ بھی حُسن کی فراوانی کے باوجود، اپنی آنکھ کی کوتاہ دامنی کے سبب، مکمل دیدار سے سیر نہیں ہورہے، لہٰذا وہ گلہ گزار ہیں کہ ہم محرومِ دیدار ہیں۔ ہماری پیاس نہیں بجُھ رہی۔ "سو ہم ہیں" کی ردیف نے اس صوفیانہ مضمون میں ایک اور لطیف مفہوم کو اُبھارا ہے کہ اے خدا، باقی تمام تخلیقات تو تیرے انوار سے سیراب ہورہی ہیں صرف ہمیں محرومِ دیدار کیوں ہیں ؟ حقیقت یہ ہے کہ دیدارِ الٰہی سے مشرف اور فیض یاب ہونا باقی مخلوقات کا تو مسئلہ ہی نہیں اور نہ ہم اُن کی کیفیات و واردات سے آشنائی حاصل کرسکتے ہیں۔ دیدار کا تعلق طلب اور ظرف سے ہے۔ چونکہ انسان کا طلب و ذوق دنیا کی دوسری تمام اشیاء اور کائنات کے دوسرے مظاہر سے کہیں زیادہ ہے، اس لئے اس کی پیاس بھی سب سے زیادہ ہے خصوصًا کائنات کے نظام پر غور و فکر کرنے والے اور گہری آنکھ سے کائنات کا مشاہدہ کرنے والے حسّاس انسان کی پیاس کبھی ختم نہیں ہوتی، وُہ جیسے جیسے جمالِ خداوندی سے لطف اندوز ہوتا ہے، ویسے ویسے اُسکی دید کی طلب اور بڑھتی ہے۔

شعر نمبر ۵

اَوروں سے تو گرانی یک لخت اُٹھ گئی تھی
اے دردؔ اپنے دل کے گر بار ہیں تو ہم ہیں

مشکل الفاظ

گرانی : بوجھ، ناگواری ⬥ یک لخت : ایک دم، فورًا ⬥
بار : بوجھ

تشریح

میر دردؔ غزل کے اس مقطع میں ان تکالیف اور پریشانیوں کا ذکر کرتے ہیں جو دل کو اپنی ذات اور ان کے دوسرے لوگوں کی طرف سے ملتی ہیں۔ انسان

کو کائنات میں طرح طرح کے حادثے پیش آتے ہیں جن کے سبب وہ مختلف الجھنوں اور مصیبتوں میں پھنس جاتا ہے۔ یہ اُلجھنیں اور مصیبتیں اس کے دل پر ایک گہرا اثر چھوڑ جاتی ہیں کبھی کبھار یہ اثرات دنیا کی دوسری دلچسپیوں کے سبب زائل بھی ہو جاتے ہیں، مگر بعض دُکھ اور غم کی لکیریں دل پر ایسی بھی پڑ جاتی ہیں، جنہیں آنے والے خوشی کے موسم بھی مٹا نہیں سکتے۔ میر درد کہتے ہیں کہ عام طور پر زیادہ تکلیف دہ باتیں ہماری اپنی ذات کی پیدا کردہ ہوتی ہیں۔ وُہ اس شعر میں کہتے ہیں کہ دنیا کے دوسرے لوگوں کی وجہ سے طبیعت پر جو بوجھ پڑا تھا، وہ تو سارے کا سارا ایک لمحے میں ختم ہو گیا۔ اب اگر دل پر کوئی بوجھ ہے تو وہ ہماری اپنی ذات کا ہے، یعنی ان محرومیوں کا ہے جو ہماری اپنی ذات کی پیدا کردہ ہیں۔۔۔ ان محرومیوں اور مصیبتوں کا بوجھ ختم ہونے میں نہیں آرہا۔

دراصل میر درد نے اس شعر میں ایک نفسیاتی حقیقت کا انکشاف کیا ہے۔ دنیا سے ملنے والے غموں پر تو آدمی اس لئے بھی صبر شکر کر لیتا ہے کہ ان پر اس کا اپنا کوئی بس نہیں چلتا۔ وہ آدمی کے اپنے اختیار سے باہر ہوتے ہیں۔ آدمی گِلہ شکوہ کر کے بھی اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیتا ہے لیکن جو تکلیف اسے اپنی ذات سے پہنچتی ہے، وہ اس کا گِلہ بھی کسی سے نہیں کر سکتا۔ اختیار رکھتے ہوئے دل کا کسی جذبے سے مجبور ہو کر کوئی ایسا کام کر بیٹھنا جو آدمی کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دے، اس کے بارے میں وہ کسی سے کیا شکایت کرے گا۔ اگر کسی کو وہ کوسے گا بھی تو اپنے آپ کو۔ یوں اس کی کوفت، غم اور طبیعت کے بوجھ میں اور اضافہ ہو گا۔ بقولِ شاعر

اوروں کے بخشے درد تو ہم نے بھلا دیئے
دل نے دیا جو درد بھلائیں وُہ کس طرح؟

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

نہ ہاتھ اُٹھائے فلک گو ہمارے کینے سے
کسے دماغ کہ ہو دُو بدُو کمینے سے

مشکل الفاظ

ہاتھ اٹھانا: باز آنا، رُک جانا ٭ کینہ: دشمنی، حسد، بغض ٭
دماغ ہونا: خیال آنا، ہوش آنا، توجہ کا کسی طرف مبذول ہونا ٭
دُو بدُو: رُوبرو، مقابل، آمنے سامنے ٭

تشریح

میر درد نے اس شعر میں فارسی اور اردو شاعری کے ایک کلاسیکی مضمون کو اپنے خاص انداز میں باندھا ہے۔ ہماری قدیم شاعری میں ایسے بہت سے مضامین مل جاتے ہیں جن میں شاعر آسمان کا گِلہ کرتے اور اسے اپنی خوشیوں کا حریف اور

حاسد سمجھتے نظر آتے ہیں۔ ایسے اشعار میں فلک، چرخ یا آسمان کو قسمت اور مقدّر کے مفہوم میں علامتی طور پر برتا جاتا ہے۔ آسمان کی گردش چونکہ وقت کے گزرنے کی نشانی ہے۔ نیز آسمان یعنی فطرت ہی سے انسان کی قسمت اور مقدّر وابستہ ہے، لہٰذا شاعر اپنی تکلیفوں، بدبختیوں اور زندگی کی تلخیوں کا سبب آسمان کی گردش یا خود آسمان کو گردانتے ہیں، اسے اپنا دشمن سمجھتے ہیں اور کوستے اور طعنہ و دُشنام دیتے نظر آتے ہیں۔

میر دردؔ آسمان کی کمینگی کی نشاندہی کرتے ہوئے انتہائی بیزاری کے ساتھ کہتے ہیں کہ بہادر انسان ہمیشہ اپنے حریفوں اور دشمنوں کے سامنے آکر مقابلہ کرتا ہے، لیکن آسمان ایسا بزدل، حاسد اور کمینہ دشمن ہے کہ ہمیں اس کے مقابل سرِ میدان اُترنا بھی اچھا نہیں لگتا یعنی کوئی بہادر حریف سامنے ہو تو مقابلے میں لطف آتا ہے۔ کمینے دشمن کی سزا یہی ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے، کہتے ہیں کہ اگرچہ آسمان ہماری مخالفت اور دشمنی میں مسلسل کمینگی سے کام لے رہا ہے، وہ اپنے حاسدانہ انداز ترک نہیں کرتا۔ تاہم، ہم اس کے مقابلے پر آنے کے لئے اپنے دل کو آمادہ نہیں پاتے۔ ایک بُزدِل، کم ہمّت اور کمینے دشمن سے لڑنا ہماری غیرت کو گوارا نہیں۔ دشمن برابر کا ہوتا تو ہمیں اس کا مقابلہ کرتے ہوئے خوشی بھی محسوس ہوتی۔ یہ دشمن تو بزدل ہے اور ہم پر چھُپ کر وار کرتا ہے۔ ہماری خوشی اس سے برداشت نہیں ہوتی۔ ہمارا ہنسنا اس سے دیکھا نہیں جاتا ہم ایسے کمینے کے مُنہ کیوں آئیں۔ بقول کسے

ے رنج دیں لاکھ حریفانِ کمینہ خصلت ❖ خود کو کیوں پست کریں ان کے مقابل ہو کے

شعر نمبر۲

ترقی اور تنزّل کو یاں کے کچھ عرصہ
مثالِ ماہ زیادہ نہیں مہینے سے

مشکل الفاظ

تنزّل: زوال ❖ عرصہ: مدّت، وقت ❖ مثال: مانند ❖ ماہ: چاند ❖

تشریح

میر دردؔ عروج و زوال کی اس دنیا کا جائزہ لیتے ہوئے حقیقت پسندانہ روّیے کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ دنیا میں ترقی اور زوال کی حالتیں وقتی اور عارضی ہوتی ہیں۔ انسان کی ترقی بھی ایک خاص سطح پر جا کر رُک جاتی ہے اور اس کے زوال کا وقت اور مدّت بھی متعیّن ہوتی ہے۔ نہ تو اس کی خوشی کے لمحات دائمی ہوتے ہیں اور نہ ہی اس کے دکھوں کی گھڑیاں ہمیشہ کے لیئے ہوتی ہیں۔ جس طرح رُتیں اور موسم بدلتے رہتے ہیں، اسی طرح قدرت بھی انسان کے ساتھ اپنا سلوک اور رویّہ بدلتی رہتی ہے۔ یہ عروج و زوال

دراصل انسان کی آزمائش کے لئے ہے۔ اسے خوشی اور ترقی کی حالت میں آپے سے باہر نہیں ہونا چاہیئے اور غم، ناکامی اور زوال کے وقت، مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ صبر اور برداشت سے کام لینا چاہیئے کیونکہ یہ حالتیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہوتیں۔ بلکہ ایک خاص مدت تک کے لئے ہوتی ہیں۔

میر دردؔ مقدر کے عروج و زوال، تقدیر کی بلندی و پستی، قسمت کے نشیب و فراز اور زندگی کے مسرت و غم کی اس بدلتی ہوئی صورت کو واضح کرنے کے لئے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی مثال دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ جس طرح چاند کی بدلتی ہوئی صورتیں ایک مہینے سے زیادہ کی نہیں ہوتیں۔ وہ پہلی تاریخ سے بڑھنا شروع ہوتا ہے اور چودہ تاریخ کو جا کر مکمل چاند بنتا ہے اسی طرح پھر وہ بتدریج گھٹنا شروع ہو جاتا ہے اور آخری تاریخوں تک پہنچتے پہنچتے بالکل غائب ہو جاتا ہے۔ اس کے عروج و زوال کا یہ سارا کھیل ایک ماہ تک رہتا ہے، اور اگلے ماہ سے پھر یہ کھیل شروع ہو جاتا ہے۔ اسی طرح انسان کی ترقی اور اس کے زوال کا عرصہ بھی دیر پا نہیں ہوتا۔ اس مضمون کے بیان اور تشبیہ سے شاعر کی مراد یہ ہے کہ انسان کو خوشی میں اترانا اور گھمنڈ نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ یہ حالت ہمیشہ نہیں رہتی، اسی طرح غم اور تکلیف میں اس توقع اور امید پر صبر شکر سے کام لینا چاہیئے کہ یہ بھی گزر جانے والی حالتیں ہیں۔ جس طرح خزاں ہمیشہ نہیں رہتی اور اس کے بعد بہار آتی ہے، اسی طرح غم کی گھڑیاں بھی دیر بدیر خوشیوں میں بدل جاتی ہیں، بقول کسے ؎

ذراسی دیر کی خوشیاں ذراسی دیر کا غم ؎ نہ یہ ہمیشہ رہیں اور نہ وُہ ہمیشہ رہے

شعر نمبر ۳

مجھے یہ ڈر ہے دلِ زندہ تُو نہ مر جائے
کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

مشکل الفاظ

دلِ زندہ : حسّاس، بیدار دل ؎ زندگانی : زندگی ؎
عبارت ہونا : مراد ہونا، مطلب ہونا ؎

تشریح

میر دردؔ کا یہ شعر نہ صرف اس غزل کا بہترین شعر ہے بلکہ اس کا شمار اُردو کے مشہور ترین شعروں میں ہوتا ہے۔ میر دردؔ اس شعر میں زندگی کی ایک بڑی سچائی کا اظہار کرتے ہیں۔ یوں کہنے کو تو دنیا میں لاکھوں لوگ زندہ ہوتے ہیں، وہ گوشت پوست کا جسم رکھتے ہیں۔ ایک مدت تک زندہ رہ کر مر بھی جاتے ہیں، مگر میر دردؔ کے خیال میں وہ چلتی پھرتی لاشیں ہوتے ہیں اور اس دنیا میں زندہ رہتے ہوئے بھی اُن کا وجود مُردوں

جیسا ہوتا ہے، اُن کا خیال ہے کہ صحیح زندگی ان لوگوں کی ہوتی ہے اور حقیقت میں وُہی لوگ زندہ کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں جو زندہ دل رکھتے ہیں۔

دلِ زندہ سے مراد حسّاس، بیدار اور درد مند دل ہے۔ میر درؔد کے بعض شارحین نے دلِ زندہ کو زندہ دلی یعنی شگفتگی اور خوش طبع کے معنوں میں لیا ہے۔ یوں ان کے نزدیک اس شعر میں میر درؔد نے زندہ دلی کو زندگی کی بنیاد قرار دیا ہے۔ لیکن اگر میر درد کے صوفیا مزاج اور اُن کی شاعری کی پوری فضا کو پیشِ نظر رکھا جائے تو زندہ دلی کے بجائے حسّاس اور بیدار دل والا مفہوم زیادہ قرینِ قیاس نظر آتا ہے۔

دل نہ صرف طبعی اور جسمانی طور پر منبعِ حیات ہے۔ بلکہ تصوف میں بھی اسے ایک خصوصی اہمیّت حاصل ہے۔ دل پر زنگ لگنے سے صوفیا غفلت کی زندگی مراد لیتے ہیں، جس میں انسان اللہ کی محبّت، یاد اور ذکر سے غافل ہو کر دنیا سے دل لگاتا ہے، اور دنیا کی محبّت میں گرفتار ہو کر روپے پیسے، مکان اور آرام و آسائش کی اشیا، جمع کرتا ہے۔ وہ اس چار روزہ عیش کوشی ہی کو زندگی کا حاصل سمجھ لیتا ہے۔ قرآن کریم کی تعلیمات کی روشنی میں اللہ کے ذکر اور موت کی یاد ہی سے ایسے غافل اور مردہ دلوں سے زنگ اترتا ہے۔ صوفیائے کرام کے ہاں قلب جاری ہونا بھی ایک خاص اصطلاح ہے، جس کا مفہوم اللہ کو کثرت اور تسلسل سے یاد کرنا ہے کہ سوتے جاگتے آدمی کے دل میں اللہ کے نام کا ورد اور ذکر جاری رہے۔ اس کے لئے صوفیائے کرام کے مختلف سلسلوں میں مراقبے اور وظیفے ہوتے ہیں، جن کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دل کو اللہ کی یاد کی کثرت سے زندہ رکھا جائے۔ علامہ اقبال بھی اپنے ایک شعر میں مسلمان کو تلقین کرتے ہیں کہ وہ اپنے مردہ دلوں کو زندہ کریں کہ اسی میں ان کے پرانے قومی مرض کا علاج ہے:

ے دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

میر درؔد نے بھی دل کی حرکت، حرارت، توانائی اور بیداری ہی کو حقیقی زندگی سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندگی میں لاکھ نشیب و فراز آئیں، خوشیاں ہوں، یا مصیبتیں، خدا کرے کہ دل ہر حال میں زندہ رہے۔ یہ نہ غفلت کا شکار ہو نہ مایوسی کا۔ اپنے دل کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اے میرے دلِ زندہ! میں کبھی کبھار یہ سوچ کر ڈر جاتا ہوں کہ تُو کہیں غفلت کا شکار نہ ہو جائے۔ دنیا کی محبّت کہیں تجھے خدا کی یاد سے غافل کر کے زنگ آلود نہ کر دے، کہیں ایسا نہ ہو کہ تُو کہنے کو زندہ رہے، مگر حقیقت میں مردہ ہو جائے۔ تیری بیداری

ہی سے تو زندگی ہے۔ تیری حرارت اور حرکت ہی سے تو وہ عبارت ہے۔ اگر تو بیدار ہے، خدا کی محبّت تیری دھڑکنوں میں رچی بسی ہے، تیرے اندر حسّاس پن اور دردمندی کا جذبہ ہے، تو دوسروں کے دُکھ درد کو محسوس کرتا ہے، تو تیری زندگی حقیقی معنوں میں زندگی ہے، اور اگر کسی سبب سے تُو اِن اچھے جذبوں اور صفتوں سے عاری ہو جاتا ہے، تو پھر تیری یہ زندگی بھی موت ہے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ دِل زندہ ہی حمیّت ہے، یہی غیرت ہے اور یہی ضمیر ہے۔ اگر یہ مردہ ہو جائے تو انسان کی تمام اعلیٰ صفات مر جاتی ہیں، وہ کہنے کو زندہ رہتا ہے، مگر اہلِ نظر کے نزدیک اس کی زندگی موت کے مترادف ہوتی ہے۔ بقول کسے ؎

ہے انحصار تجھی پر حیات کا اَے دِل!
جو تُو نہیں ہے تو مُردوں سے بھی مَیں بدتر ہوں

دِل کو زندہ رکھنے والا جذبہ صرف عشقِ الٰہی کا جذبہ ہے۔ جس انسان کے دِل میں اللہ تعالیٰ کی محبت اور عشق ہے، اس کا دل زندہ و بیدار ہے۔ اگر انسان کا دل عشقِ الٰہی کی دولت سے خالی ہے تو وہ مُردہ ہے۔ پنجابی کے کسی صوفی شاعر کا کیا خوبصورت قول ہے:

؎ عشق بنا دل مردہ غافل کس گنتی وِچ آوے

شعر نمبر ۱۴

مآلِ کار سمجھایا قبور نے ہم کو
یہ نقد مال لگا ہاتھ اس دفینے سے

مشکل الفاظ

مآلِ کار: انجام، نتیجہ ☆ قبور: قبر کی جمع ☆
دفینہ: دفن شدہ خزانہ ☆

تشریح رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی بہت سی احادیث میں موت کو اکثر یاد رکھنے اور کبھی کبھار نصیحت و عبرت حاصل کرنے کے لئے قبرستان جانے کی ضرورت و اہمیت کا بیان ملتا ہے۔ میر دردؔ کے اس شعر میں قبروں کو، جو بظاہر کسی کے فائدہ کی چیزیں نہیں، نصیحت و عبرت کے لئے خزانوں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ میر دردؔ کہتے ہیں کہ اس متحرک، دوڑتی بھاگتی زندگی کا انجام کیا ہے؟ اگر کسی نے ہمیں یہ حقیقت سمجھائی ہے تو وہ قبریں ہیں جنہیں دیکھ کر آنکھوں کے آگے سے غفلت کا پردہ ہٹ جاتا ہے، زندگی میں انسان زندہ رہنے کے لئے سو جتن کرتا ہے۔ جھوٹ فریب سے کام لیتا ہے۔ بہت کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اس کی حرص اور طمع ختم نہیں ہوتی۔ زندگی کی دوڑ میں شامل رہتے ہوئے بھی

وہ زندگی سے کچھ نہیں سیکھتا۔ مگر جب اس کی نظر قبروں پر پڑتی ہے تو اسے موت یاد آتی ہے، موت کی یاد، اسے دنیا کی محبت سے منہ موڑ کر اللہ تعالیٰ کی یاد اور آخرت کی فکر کی طرف راغب کرتی ہے۔ اس کے اندر یہ تبدیلی جو اسے عبرت اور نصیحت کی صورت میں ملتی ہے کسی خزانے سے کم نہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ ہمیں زندگی کا انجام قبروں نے یاد دلایا ہے۔ مرنے والے تو مر گئے مگر ان کی قبریں عبرت اور نصیحت کے دفینے بن گئی ہیں۔ اس شعر کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ دفینوں کی اہمیت کا اندازہ کھدائی کے بعد ہوتا ہے، جب مال و دولت کھل کر سامنے آجائے۔ مدفون صورت میں اس کی ماہیت اور اہمیت کے بارے میں قطعیت سے کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ مگر یہاں صورت حال مختلف ہے اور دفینہ کھدائی سے قبل ہی معلوم ہو گیا ہے۔ انسان کا انجام کیا ہے؟ یہ نکتہ ہی دراصل میر دردؔ کے لئے وہ نقد مال ہے جو دفینہ کی کھدائی سے قبل ہی انہیں مل گیا ہے۔ اگر لوگ دفینہ یعنی قبر کھود کر اندر سے انسان کا انجام جاننے کی کوشش کریں تو نصیحت اور عبرت کے جانے کیا کیا مرقعے انہیں ملیں۔ انسان کی گلی سڑی ہڈیاں اور مٹی ہو چکا وجود بلاشبہ حساس ذہنوں کے لئے عبرت کا ایک ایسا خزانہ ہوگا، جو اُن کی غفلت میں گزرتی ہوئی زندگیوں کا رُخ نیکی کی طرف موڑنے کے لئے کافی ہوگا۔

بقول کسے ؎

آخر تو نے بھی مرنا ہے، غفلت میں ڈوبے انساں
سوچ کبھی یہ ٹوٹی پھوٹی قبریں کیا کچھ کہتی ہیں

شعر نمبر ۵

بسا ہے کون ترے دل میں گُل بدن اے دردؔ
کہ بُو گلاب کی آئی ترے پسینے سے

مشکل الفاظ

گُل بدن : پھول جیسے بدن والا محبوب، گلاب کے پھول جیسا دوست ٭
بُو : بمعنی خوشبو ٭

تشریح

میر دردؔ کے اس شعر کا مرکزی خیال صرف اتنا ہے کہ کسی شخص، ذات یا چیز کو مسلسل یاد کرنے سے اس کی کچھ صفات، رنگ روپ اور بو باس یاد کرنے والے کی ذات میں بھی در آتی ہیں۔ مگر دردؔ نے اسے خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ گل بدن، بو معنی خوشبو اور گلاب کے الفاظ نے شعر کی معنوی فضا میں جمالیاتی تاثر کو اُبھار دیا ہے، خود کلامی کے اسلوب نے شعر کے لب و لہجہ کو سرگوشی کی سی لطافت بخش دی ہے، جب کہ شعر کی بحر کی موسیقی نے پورے شعری ماحول کو خوش آہنگ بنا دیا ہے۔

میر دردؔ اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ اے دردؔ ضرور کوئی پھول جیسی صفات رکھنے والا یعنی خوبصورت محبوب تیرے دل میں گھر کر چکا ہے۔ اس کی صورت، سیرت، ادائیں اور عادات سے وابستہ یادیں تیرے دل میں اس طرح رچ بس گئی ہیں کہ اب تیرے پسینے سے آس پاس کے لوگوں کو بھی گلاب کی مہک آتی محسوس ہوتی ہے۔

محاکاتی انداز کے اس شعر کے کئی اور لطیف پہلو ہیں۔ پہلا حسن، سوال اور استفسار کا ہے کہ اجنبی بن کر اپنے آپ سے سوال کیا جا رہا ہے کہ "بسا ہے کون؟" پھر کون کی تشریح کرتے ہوئے اس کے ساتھ گل بدن کی صفت وابستہ کر دی گئی ہے اور اس کا جواز یہ بتایا گیا ہے کہ چونکہ یاد کئے جانے والے کی بُو باس اور رنگ ڈھنگ یاد کرنے والے میں آجاتا ہے اور دردؔ کے پسینے سے گلاب کی مہک آرہی ہے۔ اس لئے ہو نہ ہو وہ محبوب جسے یاد کیا جا رہا ہے۔ ضرور گلاب جیسی صفات کا مالک ہے، یعنی نرمی، ملائمت، سرخی اور خوشبو کا حامل ہے۔ شیخ سعدی نے کہا ہے ؎ "جمالِ ہم نشیں درمن اثر کرد" کہ ساتھ بیٹھنے والے کے حسن نے مجھ پر اثر کر دیا ہے اور اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ مگر دردؔ کا کمال یہ ہے کہ وہ جمالِ ہم نشیں کی جگہ کسی دور جانے والے کے خیال اور دھیان سے اس درجہ متاثر ہو جاتے ہیں کہ اس کی یاد ہی سے ان کے اندر وہ صفات در آتی ہیں۔ محاکات اور قوتِ خیال کی یہ شدت حیرت انگیز حد تک متاثر کن ہے۔

صوفی شاعر شاہ حسین کے بقول ؎ "رانجھا رانجھا کر دی نی میں آپے رانجھا ہوئی"۔ یعنی ہیر کہتی ہے کہ میں رانجھے کے نام کا ورد کرتے کرتے آپ رانجھا ہو گئی ہوں، اور دردؔ کہتے ہیں کہ میں کسی گلاب جیسے کو یاد کرتے کرتے خود گلاب کی خوشبو اڑانے لگ گیا ہوں۔

صوفیانہ انداز سے اس شعر کی تشریح کی جائے تو عشقِ حقیقی کے کئی پہلو نظر کے سامنے آتے ہیں۔ اللہ سے محبت کرنے والے جب اللہ کے رنگ (جسے قرآن نے صبغۃ اللہ کے الفاظ سے یاد کیا ہے) میں رنگے جاتے ہیں تو اُن کے عادات و خصال اور گفتار و کردار میں بھی انوار و صفاتِ الٰہی کی جھلک نظر آتی ہے۔ اللہ کے نیک بندوں کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ انہیں دیکھ کر خدا یاد آجاتا ہے۔ مگر یہ مرتبہ اور درجہ اللہ کے ذکر کے تسلسل اور اللہ کی یاد کی کثرت کے بعد حاصل ہوتا ہے اور "بسا ہے" کے الفاظ استعمال کر کے میر دردؔ نے اسی تسلسل کی طرف اشارہ کیا ہے کہ میں نے محبوب کو اتنا یاد کیا ہے کہ اب اس کی یاد، دھیان اور جلوے میرے دل میں رچ بس گئے ہیں۔

بقول کسے ؎ ہوا ہے نقش ترا چہرہ دھیان میں ایسے
اب اپنے آپ پہ تیرا گماں گزرتا ہے

ایک اور شعر دیکھئے جس میں اسی طرح کا ایک مضمون ہے:۔

۵ اثر اس طرح کیا مجھ پہ تری یادوں نے
میرے شعروں میں مہک آئی تری باتوں کی

غزل نمبر ۳

شعر نمبر ۱

کام مردوں کے جو ہیں سو وہی کر جاتے ہیں
جان سے اپنی جو کوئی کہ گزر جاتے ہیں

مشکل الفاظ جان سے گزر جانا : جان قربان کر دینا ؎

تشریح میر درد نے اس شعر میں جوان ہمت، جاں نثار اور ایثار پیشہ لوگوں کی تعریف کرتے ہوئے کہا ہے کہ جواں مردوں کے کام جوان مرد ہی کرتے ہیں اور جوان مرد وہ ہوتے ہیں جو نیکی کے راستے میں اپنی جان تک کی پروا نہیں کرتے اور اللہ کے راستے میں جان تک قربان کر دیتے ہیں۔

دراصل اس شعر میں درد یہ بتانا چاہتے ہیں کہ کسی بھی مقصد کو حاصل کرنے کے لئے سب سے بڑی قربانی اپنی جان کی قربانی ہوتی ہے۔ دنیا میں طرح طرح کے لوگ ہیں، بعض لوگ ایسے ہیں جو ملک و قوم یا دین و مذہب کے راستے میں وقت لگاتے ہیں، بعض محنت سے کام کرنے ہی کو بہت کچھ سمجھتے ہیں، بعض روپیہ پیسہ کا عطیہ دے کر مطمئن ہو جاتے ہیں۔ بعض خیر اور نیکی کے لئے اپنے آپ کو گفتار اور تحریر تک ہی محدود رکھتے ہیں۔ بلاشبہ ان سب کی نیت، ارادہ اور عمل اپنی جگہ قابلِ ستائش ہے۔ لیکن ان میں سب سے بڑا جواں مرد اور قابلِ تعریف وہ سرفروش اور جاں نثار ہے۔ جو اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے اپنی جان کے ایثار سے بھی دریغ نہیں کرتا۔ جان اللہ تعالیٰ کا بڑا عطیہ ہے اور انسان کے پاس جان سے بڑھ کر اور کون سی دولت ہو سکتی ہے؟ اپنی اس اعلیٰ ترین دولت کی قربانی دے کر ہی وہ شہادت کے بلند مرتبہ پر فائز ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جان کی قربانی کے سامنے دوسری تمام قربانیاں خواہ وہ مال کی ہوں یا دولت کی، ہیچ ہیں۔

میر درد کہتے ہیں کہ یہ قربانی ہر کوئی نہیں دے سکتا؛

بقولِ شاعر ؎
یہ رتبۂ بلند ملا، جس کو مل گیا
ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں

میر درد کہتے ہیں کہ قربانی و شہادت جیسے کارنامے ہر آدمی کے بس کی بات نہیں۔ یہ انہی مرد لوگوں کا کام ہے، جو یہ کام کر جاتے ہیں، اور جان سے گزر جانے کا یہ کام معمولی آدمیوں کا کام

نہیں۔ یہاں یہ لطیف طنز بھی پیشِ نظر ہے جو شعر کے باطن سے جھلکتی ہے اور جو قول وفعل کے تضاد سے متعلق ہے۔ میر درد کہتے ہیں کہ یہ ان لوگوں کا کام نہیں جو بڑے بڑے دعوے تو کرتے ہیں مگر عملی طور پر کچھ نہیں کرتے۔ یہ ان جوانمردوں کے کام ہیں جو اپنی جان کی قربانی دے کر تاریخ میں اپنا نام زندۂ جاوید کر جاتے ہیں۔ بقولِ شاعر:

جان کا نذرانہ دینے ہی سے ملتی ہے مراد
کچھ نہیں ہاتھ آتا خاک و خون میں لتھڑے بغیر

شعر نمبر ۲

موت کیا آ کے فقیروں سے تجھے لینا ہے!
مرنے سے پہلے ہی یہ لوگ تو مر جاتے ہیں

مشکل الفاظ

فقیر: غریب، مفلس، مانگنے والا۔ یہاں فقیر سے مراد صوفی اور درویش ہے۔

تشریح

میر درد اس شعر میں فقیروں کی ایک صفت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ صحیح معنوں میں فقیر وہ ہوتا ہے، جو زندگی ہی میں اپنے آپ کو فنا کرے یعنی اپنا من مارے اور اردگرد پھیلی ہوئی زندگی میں جتنی بھی اشیاء لذتیں اور مسرتیں ہیں اُن سے ہاتھ کھینچ کر زندگی میں اتنے کم وسائل پر گزارہ کرے، جس سے اس کے سانس اور جان کا رشتہ برقرار رہ سکے۔ ترک کا یہ مقام صوفیوں اور فقیروں کی زندگی میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اُن کا معروف قول "مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا" (موت آنے سے پہلے مر جاؤ) اُن کی زندگی کے اسی پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

دنیا کی طلب نہ کرنا، لباس، خوراک اور رہائش کے مسئلوں میں آسانیاں اور آسائشیں نہ ڈھونڈھنا، رتبہ، مال و دولت، جاہ و منصب کی تمنا نہ کرنا، کسی کے لئے باعثِ آزار نہ ہونا، اپنے قول اور فعل سے کسی کو تکلیف نہ پہنچانا، صوفیوں اور فقیروں کے اوصاف ہیں اور یہ سب کچھ اسی صورت میں ممکن ہے، جب وہ اپنے نفس کو کچل لیں اور اپنی تمام دنیاوی خواہشات اس طرح ترک کر لیں کہ دنیا سے اُن کا کوئی تعلق اور اس میں اُن کے لئے کوئی کشش نہ رہے۔ گویا جیتے جی بھی وہ مرے ہوئے لوگوں جیسے ہیں۔

میر درد کہتے ہیں کہ جب ایسے لوگوں کی طبعی موت آتی ہے تو وہ اُن سے کوئی چیز بھی چھین نہیں سکتی، اور کوئی قیمتی چیز یا مال و دولت تو اُن کے پاس ہوتا ہی نہیں۔ رہی زندگی تو وہ پہلے ہی اس سے ہاتھ اُٹھا کر فنا کے تجربے سے آشنا ہو چکے ہوتے ہیں۔ صرف ایک سانس اور جان کا ظاہری تعلق ہوتا ہے۔ موت آ کے صرف اُسے قطع کر دیتی ہے۔ سو میر درد موت کو مخاطب

کر کے کہتے ہیں کہ اے موت فقیروں کے لیے تیرا آنا یا نہ آنا برابر ہے۔ تجھے فقیروں سے کیا لینا ہے۔ زندگی، جس کی تجھے تلاش ہے، ان کے پاس تو وہ بھی نہیں۔ یہ صوفی، فقیر اور درویش لوگ زندگی ہی میں مرے ہوؤں کے مصداق ہوتے ہیں۔

بقولِ کسے ؎

پاس ہم خستہ تنوں کے نہیں اب زندگی بھی
موت آئے گی تو ناکام پلٹ جائے گی

شعر نمبر ۳

ہم کسی راہ سے واقف نہیں جوں نورِ نظر
رہنما تو ہی تو ہوتا ہے جدھر جاتے ہیں

مشکل الفاظ

واقف : آشنا، جاننے والا ٭ نورِ نظر : آنکھ کی روشنی، بینائی ٭
رہنما : راستہ دکھانے والا رہبر ٭

تشریح

میر دردؔ ایک صوفی شاعر تھے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے اس شعر میں صوفیائے کرام کے معروف مسئلۂ جبر و قدر کے حوالے سے اس کائنات میں انسان کی مجبوری، بے چارگی اور بے کسی کا ذکر کیا ہے۔

نورِ بصارت اور بینائی کی تشبیہ نے میر دردؔ کے مفہوم کو پُر معنی بنا دیا ہے۔ آنکھ کا نور یا انسان کی بینائی دنیا کی باقی تمام چیزوں کو دیکھ سکتی ہے مگر اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ وہ دوسرے کا مشاہدہ کر کے ان کے بارے میں بہت سی معلومات دیتی ہے۔ مگر اپنے آپ سے واقفیت حاصل نہیں کر سکتی اور اپنی اصلیت اور ماہیئت کا علم جاننے کے لئے بھی اپنے آپ کو نہیں دیکھ سکتی۔ اس کی مجبوری اور بے کسی ہے کہ اپنے مشاہدہ کے بجائے اس کے سامنے جو چیز آتی ہے وہ اسے ہی دیکھنے پر مجبور ہے۔

میر دردؔ کہتے ہیں ہم اپنی بینائی کی طرح کسی راستے سے واقف نہیں، ہمیں علم نہیں، کہ کون سا راستہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں کہ کون سے راستے پر چلنے کا نتیجہ کیا نکلے گا۔ اے خدا تو ہی ہمارا رہنما ہے۔ ہم جدھر بھی جاتے ہیں۔ نورِ نظر کی طرح تیری ذات ہی ہماری رہبری کرتی ہے۔ میر درد کا یہ شعر ان کے نظریۂ جبر کی عکاسی کرتا ہے۔

اگرچہ دنیا میں انسان کو کچھ اختیارات بھی حاصل ہیں۔ مگر صوفی اپنے کو مجبورِ محض خیال کرتے ہیں۔ بقول میر تقی میرؔ ؎

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے مختاری کی
چاہے ہیں سو آپ کریں ہیں ہم کو عبث بدنام کیا

یا میر تقی میر ہی کے بقول ؎

منہ نہ ہم جبریوں کا کھلواؤ ٭ کہنے کو اختیار سا ہے کچھ

یعنی یہ تھوڑا سا اختیار بھی صرف کہنے کے لئے ہے، اس کی تفصیل ہم سے نہ پوچھو۔

میر درد کے شعر میں نظر نہ آنے والے نورِ نظر کو اپنا رہنما کہا گیا ہے۔ خدا چونکہ مادی وجود میں انسان کو نظر نہیں آتا اس لئے اس کے لئے نورِ نظر کی تشبیہ شعر کو اور لطیف اور مؤثر بنا دیتی ہے۔ میر درد اپنے تمام افعال کی ذمہ داری خدا پر ڈالتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس طرح بینائی اور آنکھ کے نور کے علاوہ ہم دنیا کی کسی چیز کو دیکھنے کی قدرت نہیں رکھتے، اسی طرح اے خدا تیری مرضی اور منشا کے بغیر ہم بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس کوئی اختیار نہیں۔ یہ تیری ہی رہبری ہے جو ہمیں جگہ جگہ لئے جا رہی ہے۔ ہم اتنے مجبور اور لاچار ہیں کہ اپنی مرضی سے تو ایک قدم بھی نہیں اُٹھا سکتے۔

میر درد نے ایک اور جگہ اسی مفہوم کو یوں پیش کیا ہے۔

جوں نورِ نظر ترا تصور
تھا پیشِ نظر جدھر گئے ہم

شعر نمبر ۴

آہ معلوم نہیں، ساتھ سے اپنے شب و روز
لوگ جاتے ہیں چلے سو یہ کدھر جاتے ہیں

مشکل الفاظ ساتھ سے اپنے کا مطلب اپنے ساتھ سے، اپنے نزدیک یا پاس سے ہے۔ اپنے اور شب و روز میں وقفہ ہے۔ شب و روز کا تعلق دراصل دوسرے مصرع کے ساتھ ہے، اپنے کے لفظ سے نہیں۔

تشریح میر درد نے اس شعر میں ایک مابعد الطبیعاتی سوال پوچھا ہے۔ ہر دور کے دانشور، صوفی، مفکر اور سوچ بچار کرنے والے لوگوں کے ذہنوں میں یہ سوال اُبھرتا ہے۔ اگرچہ مذہبی صحیفوں میں اس سوال کا جواب موجود ہے۔ مگر پھر بھی شاعرانہ طبیعتوں میں اس طرح کے سوال پیدا ہوتے ہی رہتے ہیں۔

میر درد کہتے ہیں کہ بیسیوں لوگ جو ہمارے پاس رہتے ہیں، اچانک ہمارا ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، سینکڑوں اور ہزاروں، ہم شہر، ہم علاقہ، ایسے آدمی ہوتے ہیں، جو ایک خاص مدت ہمارے ساتھ گزارنے کے بعد مر جاتے ہیں۔ ہم صبح و شام کھلی آنکھوں سے جنازے اُٹھتے دیکھتے ہیں اور موت کا یہ کھیل وقت کے کسی ایک خاص پہلو سے متعلق نہیں، رات دن، مسلسل یہیں ہو

رہا ہے۔ میر درد کہتے ہیں کہ یہ ہمارے پاس سے چلے تو جاتے ہیں، مگر جانے کدھر جاتے ہیں۔

علامہ اقبال کی ایک نظم "خفتگانِ خاک سے استفسار" بھی اسی انداز کے مضمون پر مشتمل ہے۔ وہ دوسری دنیا کیا ہے؟ موت کا تجربہ کیسا ہوتا ہے؟ اگلی دنیا کے شب و روز کیسے ہیں۔ الہامی کتابوں میں ملنے والے اشاروں کے باوجود انسان کا ذہن تشنہ ہے اور وہ موت کے بعد کی زندگی کے بارے میں بہت کچھ جاننے کی شدید آرزو رکھتا ہے۔

میر درد اپنی ایک اور غزل کے مقطع میں اسی مضمون کو یوں باندھتے ہیں۔

درد کچھ معلوم ہے یہ لوگ سب
کس طرف سے آئے تھے کیدھر چلے

اس شعر میں انہوں نے موت کے بعد کے سفر کی بات تو کی ہے، مگر ساتھ ہی زندگی کے سفر سے پہلی منزل کے بارے میں بھی سوال اُٹھایا ہے۔

بقولِ کسے ؎ جانے کن منزلوں کی دھول ہوئے
وہ فنا کے سفر پہ نکلے ہوئے

شعر نمبر ۵

تا قیامت نہیں مٹنے کا دلِ عالم سے
درد ہم اپنے عوض چھوڑے اثر جاتے ہیں

مشکل الفاظ تا قیامت: قیامت تک ٭ عالم: دنیا ٭ عوض: بدلہ ٭

تشریح شعر و شاعری، خطابت اور دوسرے تمام فنونِ لطیفہ کا بڑا مقصد ایک ایسی تاثیر کی تخلیق ہوتا ہے، جو دیکھنے سننے اور پڑھنے والوں کو ایک لطیف مسرت اور ترفع بخش سکے۔ انسان کو زندگی کے ایک بہتر، اعلیٰ اور برتر مفہوم سے روشناس کرا سکے۔ یہ تاثیر جتنی دیرپا ہوگی، فن پارہ اتنا ہی عظیم ہوگا۔

میر درد نے اس شعر میں اپنے کلام کی شیرینی، دردمندی، نفاست، بلاغت اور دوسری شاعرانہ خوبیوں سے پیدا ہونے والی تاثیر کی نشاندہی کرتے ہوئے کہا ہے کہ ہم تو ایک دن مر جائیں گے اور یہ دنیا چھوڑ جائیں گے لیکن ہم اپنے بدلے میں ایک ایسا اثر، ایک ایسی تاثیر چھوڑ جائیں گے جس کا نقش قیامت تک لوگوں کے دلوں میں رہے گا۔ دنیا میں رہنے والے حشر تک ہمارے کلام کی رعنائیوں سے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔ آنے والے زمانوں کی تبدیلیوں، انقلابات اور ردّ و بدل کے باوجود دنیا کے دل سے ہمارے کلام کا اثر نہیں مٹے گا۔

اعلیٰ اور ارفع ادب کی ایک بڑی خوبی یہی تاثیر اور اثر ہے ادب نہ صرف اپنے زمانے کے پڑھنے والوں کو متاثر کرتا ہے، بلکہ آنے والے زمانے میں بھی اسکی تاثیر اپنا جادو جگاتی رہتی ہے۔ دنیا بھر کے ادب میں ایسے مشہور فنکاروں کی ان گنت تخلیقات ہیں، جن کی تاثیر وقت گزرنے کے ساتھ کم نہیں ہوئی بلکہ اور بڑھی ہے۔ معروف اہل قلم شیکسپیئر، مولانا روم، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، میر تقی میر، غالب، میر انیس، اقبال اور سینکڑوں ایسی شخصیات ہیں جن کی تحریریں زمانے کی دست بُرد اور وقت کی تبدیلیوں کے باوجود آج بھی انتہائی عقیدت و احترام سے پڑھی جاتی ہیں۔

خود میر درد کا کلام اُن کی پیشینگوئی کی تصدیق کرتا ہے کہ کم و بیش پونے دو سو سال گزرنے کے باوجود اُن کے شعروں کی تاثیر آج بھی پڑھنے والوں میں جذب و سوز پیدا کر رہی ہے۔

میر درد کے زیر بحث شعر میں عوض اور اثر کے الفاظ معنی خیز ہیں۔ عوض کا لفظ اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ ہم دنیا سے چلے جائیں گے مگر ہم اپنے عوض اپنا کلام چھوڑ جائیں گے کہ دراصل یہی ہمارا متبادل ہے، حشر تک یہی ہماری نمائندگی کرے گا۔ ہماری دن رات کی فکر سخن، مشق و مہارت، تجربات و مشاہدات، سب کا خلاصہ ہماری شاعری ہی ہے۔ زندگی میں ہم سے ملنے والے اور مستفید ہونے والے، ہمارے بعد ہمارے کلام سے فیض اُٹھائیں گے۔

اثر کا لفظ شاعری کے فن کی جملہ خصوصیات کا نچوڑ، خلاصہ اور نتیجہ ہے۔ میر درد نے کلام کی جزئیات کی بات کرنے کی بجائے ایک مناسب لفظ میں اس نتیجہ اور حاصل کا نام لیا ہے جو ہر فنکار کا منتہائے مقصود ہوتا ہے۔ اثر کا لفظ اگرچہ شاعر کو اس غزل کے قوافی نظر، کدھر وغیرہ نے سمجھایا مگر درد نے اپنے تخلص کی مناسبت سے اس کے استعمال میں مہارت کا ثبوت دیا ہے۔

بقول ایک پنجابی شاعر کے شاعر مر جاتا ہے مگر اس کے درد نامے فنا نہیں ہوتے۔

ہتھ تے مٹی ہو جانے نیں لکھدے لکھدے شعر مگر
کاغذ اُتے رہ جانا ایں درداں بھریاں لیکاں نیں

(یعنی میرے ہاتھ تو شعر لکھتے لکھتے (ایک دن) مٹی ہو جائیں گے لیکن کاغذ کے اوپر میں جو درد بھری لکیریں (مراد شعر) کھینچ جاؤں گا وہ زندہ رہیں گی)

اسی مضمون کا ایک اور شعر دیکھئے:

مرتا ہے فنکار پر اس کا فن تو کبھی نہیں مرتا
اس کے گیت ہوا کی بہتی لہروں پر رہ جاتے ہیں

میر تقی میرؔ

(۱۷۲۳ء - ۱۸۱۰ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱

غافل ہیں ایسے، سوتے ہیں گویا جہاں کے لوگ
حالانکہ رفتنی ہیں سب اس کارواں کے لوگ

مشکل الفاظ رفتنی: جانے والے، مراد مسافر ٭ کارواں: قافلہ ٭

تشریح میر تقی میرؔ نے اس شعر میں لوگوں کی غفلت اور انسانی زندگی کی ناپائداری کا ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ دنیا کے لوگ آخرت کی فکر اور موت کے خوف سے ایسے غافل ہیں جیسے یہ سو رہے ہوں، حالانکہ انسانوں کے اس قافلے کے تمام لوگوں کو ایک نہ ایک دن یہ دنیا چھوڑ کر دوسری دنیا میں جانا ہے۔

میرؔ کہنا یہ چاہتے ہیں کہ جس طرح قافلے کے مسافروں کو کوچ سے پہلے تیاری لازم ہے اس طرح ہمیں بھی یہ چاہیئے کہ ہم غفلت ترک کریں، کاہلی، سستی اور بے حسی چھوڑ کر اگلی دنیا کی فکر کریں۔ موت اور موت کے بعد پیش آنے والے مرحلوں کے لئے خود کو تیار کریں، آخر ایک نہ ایک دن سب نے ہی یہاں سے چلے جانا ہے۔ ہر ایک شخص مسافر ہے۔ بظاہر وہ یہاں مطمئن ہے اور اس کے پاس مال و دولت اور قیام کا دوسرا تمام ضروری سامان موجود ہے' اس کے باوجود اسے ایک دن اچانک بلاوا آئے گا اور وہ اس دنیا سے اگلے جہان کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ جب یہ صورت حال ہو تو انسان کو غفلت چھوڑ کر اپنا ایک ایک لمحہ سفرِ آخرت کی تیاری کے لئے وقف کرنا چاہیئے اور اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیئے۔

بقول کسے ؎

ہُشیار مُسافر، کی صدا آتی ہے پل پل
تُم دِل کے دھڑکنے کی صداؤں پہ کرو غور

شعر نمبر ۲

فردوس کو بھی آنکھ اُٹھا دیکھتے نہیں
کس درجہ سیر چشم ہیں کوئے بُتاں کے لوگ

مشکل الفاظ فردوس: جنّت، بہشت ٭ سیر چشم: قانع ٭ کوئے بُتاں: محبوب کا کوچہ ٭

تشریح | میر تقی میرؔ اس شعر میں محبوب کے کوچے کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ محبوب کی گلی میں اطمینان، سکون، قرار، خوشی اور مسرت کے ایسے ایسے سامان ہیں، کہ ان سے جو لوگ آشنا ہو جاتے ہیں، وہ بہشت جیسی نعمت کی طرف بھی آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ محبوب کے کوچے سے حاصل ہونے والی لذتوں اور مسرتوں نے عاشقوں کو اس طرح سرشار کر دیا ہے کہ اب انہیں مزید کسی لذت کی تمنا نہیں رہی۔ انہیں محبوب کی گلی مل گئی ہے، وہ اپنی قسمت پر نازاں ہیں اور اب اُن کی نظر کو کسی دوسری چیز کو دیکھنے کی طلب یا تمنا نہیں۔ (سیر چشم کے الفاظ ایک مطمئن کیفیتِ نظر کا مفہوم پیش کرتے ہیں یعنی کسی ایسے مکمل اور اعلیٰ نظارے سے سرشار و سیراب ہونے والی آنکھ جس میں اب کوئی انتشار یا اضطراب نہ ہو) یہی وجہ ہے کہ محبوب کے کوچے کے نظاروں سے لطف اندوز ہونے والوں کے لئے اب فردوس میں بھی کوئی کشش نہیں۔ اگر ان کے لئے جنت میں کوئی رغبت یا کشش ہوتی، تو وہ اس کی طرف آنکھ اُٹھا کر تو ضرور دیکھتے۔ بقول کسے ؎

در تمہارا مل گیا جنت کی کیا پروا کریں
اب کسی جانب نگاہِ مطمئن اُٹھتی نہیں

عشقِ حقیقی کی نظر سے اس شعر کو دیکھیں تو کوئے بُتاں کا استعارہ مرشد، کسی دوسری روحانی شخصیت، مذہبی پیشوا کی درگاہ نیز رسولِ پاکؐ کی جلوہ گاہ بن جاتا ہے جو عاشقانِ صادق اور طالبانِ حقیقت کے لئے فردوس سے بڑھ کر ہے۔

شعر نمبر۳

مرتے ہیں اس کے واسطے یوں تو بہت وَلے
کم آشنا ہیں طَور سے اس کامِ جاں کے لوگ

مشکل الفاظ | وَلے: لیکن ✣ آشنا: واقف ✣ طَور: ڈھنگ، انداز، سلیقہ ✣ کامِ جاں: جان کا، مقصد، آرزو، مراد محبوب ✣

تشریح | میر تقی میرؔ اس شعر میں کہتے ہیں کہ یوں تو محبوب پر بہت سے لوگ جان فدا کرتے ہیں۔ اس کے حسن اور ناز و ادا پر ایک دنیا فریفتہ ہے لیکن اس محبوب کے طور طریقوں، ڈھب اور انداز سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ در اصل اس شعر میں میرؔ نے فریفتگی اور آشنائی کے لطیف سے فرق کی نشاندہی کی ہے، جان دینے والے اور جان نثار کرنے کے دعوے کرنے والے تو بہت ہوتے ہیں مگر ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں، جو آشنائی اور جاں سپاری کے سلیقہ اور مفہوم سے پوری طرح واقف ہوں۔ محبت میں صحیح کامیابی، اپنے محبوب کے مزاج اور اس کے زندگی گزارنے کے ڈھنگ اور اسلوب کی واقفیت سے محبوب کے مزاج، اس کے ذہن اور اس

ذہن کے طور طریق سے پوری طرح آگاہ ہونا ہی محبت میں کامیابی کی دلیل ہے۔ محبوب کی خواہش شائد یہی ہو کہ مجھ پر فدا ہونے کے بجائے میرے مزاج، اور طور کو سمجھا جائے۔ میر کہتے ہیں کہ افسوس ہے، ایسے لوگ کم ہیں اور اکثریت، بے سوچے سمجھے جاں سپاری کے دعوے کرنے والوں کی ہے۔

بقول کسے ؎

جان اپنی فدا کرنے والے بھرے شہر میں کس قدر ہیں
سبھی اُس کی آنکھوں کے مفہوم سے بے خبر ہیں

شعر نمبر ۴

مجنوں و کوہ کن نہ تلف عشق میں ہوئے
مرنے پہ جی ہی دیتے ہیں اس خانداں کے لوگ

مشکل الفاظ

مجنوں و کوہ کن : دو معروف عاشق، جن کا ذکر لیلےٰ مجنوں اور شیریں فرہاد کی داستانوں میں ملتا ہے۔ کوہ کن پہاڑ کھودنے والے کو کہتے ہیں، فرہاد نے چونکہ شیریں کی خواہش پر بے ستوں پہاڑ پر دودھ کی نہر کی کھدائی کی تھی، اس نسبت سے اسے کوہ کن کہتے ہیں۔ ٭ تلف : ضائع ٭

تشریح

میر اس شعر میں کہتے ہیں کہ عشق و عاشقی سے تعلق رکھنے والے تمام لوگ آخر کار جان ہی سے گزر جاتے ہیں۔ عشق کی منزل سے کون سلامت گیا ہے۔ سر کی بازی دے کر ہی یہاں کامیاب اور سُرخرو ہُوا جا سکتا ہے۔ اگرچہ مجنوں اور کوہ کن نے بھی عشق کے کھیل میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا۔ مگر عشق میں جان سے جانے والے صرف یہی لوگ نہیں تھے، عشق و عاشقی کا قبیلہ اور خاندان ہی ایسا ہے کہ اس سے متعلق تمام افراد کو آخر کار جی سے جانا پڑتا ہے۔

پہلے مصرع میں "نہ" سے مراد "صرف یہی نہیں" ہے اور دوسرے میں "مرنے" سے مراد عاشق ہونا فریفتہ ہونا اور شیدا ہونا ہے۔ میر کے اس شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اس خاندان کے لوگوں کا سب سے بڑا وصف ہی یہی ہے کہ وہ عاشق ہوتے ہی، عشق کا اظہار کرتے ہی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرتے ہیں۔

بقول کسے ؎

شروعِ عشق ہی میں زندگی کا باغ اجڑتا ہے
یہاں تو پہلی ہی منزل پہ جاں سے جانا پڑتا ہے

میر بھی ایک جگہ کہتے ہیں ؎

قدم دشتِ محبّت میں نہ رکھ میر
کہ سر جاتا ہے گامِ اوّلیں پر

شعر نمبر ۵

کیا سہل جی سے ہاتھ اُٹھا بیٹھتے ہیں ہائے
یہ عشق پیشگاں ہیں الٰہی کہاں کے لوگ

مشکل الفاظ

سہل: آسان + جی سے ہاتھ اُٹھانا: جان قربان کرنا +
عشق پیشگاں: عشق کے پیشے سے تعلق رکھنے والے مراد عاشق +

تشریح

میر کہتے ہیں کہ عشق و عاشقی سے تعلق رکھنے والے لوگوں کا حوصلہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے، دنیا میں رہنے والے ذرا ذرا سی چیز کی قربانی دینے سے کتراتے ہیں مگر یہ عاشق لوگ محبوب کے رتبہ اور اس کی خواہش کے سامنے زندگی جیسی چیز کو بھی حقیر سمجھتے ہیں اور جان جیسی نعمت کو بھی آسانی کے ساتھ محبوب کی رضا کے لئے قربان کر دیتے ہیں۔ آسانی سے میر کی مراد یہ ہے کہ انہیں اتنی بڑی قربانی پیش کرنے میں ذرا سا بھی تردد نہیں ہوتا۔ گویا زندگی ان کی نظر میں ایک معمولی اور حقیر سی چیز ہے اور اصل چیز عشق میں کامیاب ہونا ہے۔

میر حیرت کے ساتھ خدا سے پوچھتے ہیں کہ الٰہی یہ عاشق لوگ کس بستی کے، کس دنیا کے رہنے والے ہوتے ہیں، جو جان تک کی قربانی دینے میں ذرا دیر نہیں لگاتے۔ ایسے ایثار پیشہ، جاں نثار اور سر فروش زندگی کے دوسرے شعبوں سے تعلق رکھنے والوں میں عموماً نہیں ہوتے، ایسے حوصلہ اور قربانی والے لوگ صرف عشق کے میدان ہی میں نظر آتے ہیں۔

بقول کسے ؎

کتنا آسان لگے جان سے گزرنا یارو
وہ ذرا اپنی نگاہوں کا اشارہ تو کرے

شعر نمبر ۶

بُت چیز کیا کہ جس کو خدا مانتے ہیں سب
خوش اعتقاد کتنے ہیں ہندوستاں کے لوگ

مشکل الفاظ

خوش اعتقاد: خوش عقیدہ، اپنے عقیدے کے بارے میں خوش فہمی میں مبتلا +

تشریح

میر تقی میر نے اس شعر میں بُت پرستی، جو ہندوستان کے ہاں عام ہے، پر طنز کیا ہے۔ میر کہتے ہیں کہ بُت جو مٹی یا پتھر کا بنا ہوا مجسمہ ہوتا ہے اور جس کی تخلیق بھی انسان اپنے ہی ہاتھ سے کرتا ہے، وہ خدا کیسے ہو سکتا ہے۔ ہندوستان کے رہنے والے لوگ (مراد ہندو) بھی کتنے خوش عقیدہ ہیں کہ وہ بُتوں کو اپنا خدا سمجھے ہوئے ہیں اور ان سے کیا کیا توقعات وابستہ کئے ہوئے ہیں یہ ضعیف الاعتقادی کی انتہا ہے کہ آدمی اپنی ہی بنائی ہوئی چیز کو خدا سمجھ کر اس کی عبادت کرے، اسے سجدے کرے اور اس سے مرادیں مانگے۔

بُت کا ایک مطلب محبوب بھی ہے۔ ہندو کا لفظ بھی فارسی زبان میں دل رُبا محبوب کے

لئے استعمال ہُوا ہے۔ یوں ہندوستان سے مراد محبوب لوگوں کا علاقہ یا ملک بھی ہو سکتا ہے۔ یہ مفہوم صرف بُت اور ہندو کے تلازمہ اور رعائت لفظی سے ذہن میں آتا ہے۔ یوں شعر کے مفہوم کی ایک اور پرت سامنے آتی ہے کہ خوبصورت اور حسین لوگوں کے علاقوں میں رہنے والے لوگ بھی کتنے سادہ دل اور خوش عقیدہ ہوتے ہیں کہ وہ محبوب کو خدا سمجھ لیتے ہیں۔ یہ ان کی سادگی اور بھولپن کی انتہا ہے کہ وہ محبت میں اتنا آگے بڑھ جاتے ہیں کہ اسے پرستش کا رنگ دے دیتے ہیں اور محبوب کو خدا تصور کر لیتے ہیں۔ ہماری شاعری میں اس مفہوم کے سینکڑوں شعر ہیں جہاں محبوب کو خدا کہا گیا ہے۔ بقول کسے ؎

خوش فہمیوں کی لہر میں یوں بہہ گیا ہوں مَیں
کس بھولپن میں اس کو خدا کہہ گیا ہوں مَیں

شعر نمبر ۷

مُنہ تکتے ہی رہے ہیں سدا مجلسوں کے بیچ
گویا کہ مَیر محو ہیں میری زباں کے لوگ

مشکل الفاظ

مُنہ تکنا : حیرت سے دیکھنا ❖ مجلس : محفل ❖
محو : گم، فنا، فریفتہ، عاشق ❖

تشریح

میر تقی میر اپنی غزل کے اس مقطع میں اپنی خوش بیانی کی تعریف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ قدرت نے میری زبان (مراد میرے کلام) کو جذب اور تاثیر کی ایسی خوبی سے نوازا ہے کہ میں جب کبھی کسی مجلس میں اپنا کلام سناتا ہوں تو سننے والے حیرت سے میرا منہ دیکھنے لگتے ہیں، اور حیران ہوتے ہیں کہ ایسے عمدہ پُرتاثیر اور خوبصورت شعر کہنے والا یہ شاعر کون ہے؟ اس لمحے یہ محسوس ہوتا ہے کہ لوگ ہمہ تن گوش ہو کر میرے شعر سننے میں مصروف ہیں اور میری زبان (مراد کلام ہے) پر فریفتہ ہو گئے ہیں۔

اگر مِیر کے نیچے زیر لگا کر دوسرے مصرع میں "میرِ محو" پڑھا جائے تو (اگرچہ اس کی گنجائش کم ہے) اس کا مفہوم یوں ہوگا۔ کہ میر کے شعر سُن کر اہلِ مجلس از خود رفتہ اور حیران ہو کر ایک دوسرے کا منہ دیکھتے ہیں، جیسے وہ وجد و جذب میں ڈوبے ہوئے میر ہوں۔ گویا اہلِ مجلس کے ہر فرد پر میر جیسی بیخودی و مستی چھا جاتی ہے، وہ ایک ایسے انہماک میں ڈوب جاتا ہے کہ اس پر میرِ بے خود کا گمان گزرتا ہے۔

بقول کسے ؎

ہوئے جاتے ہیں مجھ سے شعر سُن سارے مجھ ایسے
سرائت کر گئی مستی مری ہر اہلِ محفل میں

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

جنوں میں اب کے کام آئی نہ کچھ تدبیر بھی آخر
گئی کل ٹوٹ میرے پاؤں کی زنجیر بھی آخر

مشکل الفاظ جنوں : دیوانگی، وحشت ۔

تشریح ہماری شعری روایت میں ایسے مضامین عام مل جاتے ہیں جن میں وحشت زدہ عاشقوں کے جنون کو کم کرنے کے لئے ناصح اور معاشرے کے دیگر خیر خواہ لوگوں کی طرف سے کچھ تدبیر کرنے اور انہیں زنجیر کرنے کا نیماں پایا جاتا ہے۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ ایسے شعر بھی سینکڑوں کی تعداد میں ملتے ہیں۔ جس میں اس طرح کی وحشت کو کم کرنے کی سب تدبیریں بے کار ہوتی نظر آتی ہیں۔

بقول ایک شاعر کے ۔

دیکھنا توڑ کے وحشت میں نکل جاؤں گا ۔ مجھ کو زنجیر پہ زنجیر نہ پہناؤ عبث

میر تقی میر بھی اس شعر میں دیوانگی کی ایسی ہی شدت کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ پہلے جنون اور وحشت کا یہ عالم نہیں تھا جو اب ہے۔ پہلے لوگ ہمیں دیوانہ اور پاگل سمجھ کر زنجیر پہنا دیتے تھے، تو ہماری شدتِ جنوں میں کچھ کمی آجاتی تھی اور رفتہ رفتہ ہم پُر سکون حالت میں آجاتے تھے مگر اب کے ہماری دیوانگی کا وہ عالم ہے کہ اسے کم کرنے کی جتنی تدبیریں بھی کی جائیں، وہ بے اثر اور رائیگاں ثابت ہوتی ہیں۔ اب کے کوئی ایسا طریقہ اور حربہ نظر نہیں آتا، جو کارگر اور مؤثر ثابت ہو اور جس سے ہماری بے چینی، اضطراب، وحشت اور جنون کے اثرات زائل ہو جائیں۔ لوگوں نے ہماری وحشت کو کم کرنے کے لئے ہمیں جو زنجیر پہنائی تھی، وہ بھی (ہماری شدتِ جنوں سے) ٹوٹ گئی ہے۔

بقول کسے ۔

چارہ کرو کچھ اور جنوں کا مرے لوگو
زنجیر و سلاسل تو مداوا نہیں اس کا

شعر نمبر ۲

اگر ساکت ہیں ہم حیرت سے، پر ہیں دیکھنے قابل
کہ اک عالم رکھے ہے عالمِ تصویر بھی آخر

مشکل الفاظ ساکت : بے حس و حرکت، ٹھہرا ہوا ۔ حیرت : حیرانی، تصوف کی راہ میں ایک ایسا مقام آتا ہے، جہاں سالک حقیقت کے ادراک اور انوارِ الٰہی کے جلووں کی کثرت سے حیران اور مبہوت ہو جاتا ہے ۔ دیکھنے قابل : دیکھنے کے قابل،

بہت خوبصورت، قابلِ دید ٭

تشریح میرؔ کے اس شعر کے پس منظر کی وضاحت کے لئے میرؔ ہی کے یہ تین شعر دیکھئے:

؎ اپنی تو جہاں آنکھ لڑی پھر وہیں دیکھو ٭ آئینہ کو لپکا ہے پریشاں نظری کا

؎ ہم بے خودانِ محفلِ تصویر اب گئے ٭ آئندہ ہم سے آپ میں آیا نہ جائے گا

؎ رات مجلس میں تری ہم بھی کھڑے تھے چپکے ٭ جیسے تصویر لگا دے کوئی دیوار کے ساتھ

ان شعروں میں حیرت زدگی کی مختلف صورتیں ملتی ہیں۔ پہلے شعر کے پہلے مصرع میں محبوب کو مسلسل دیکھتے رہنے کا عمل اور اپنے مبہوت ہونے کی کیفیت کا بیان ہے، دوسرے شعر میں اپنی بے حرکتی کو محفلِ تصویر کے بے خودوں سے تشبیہ دی ہے یعنی ایسے بے حس و حرکت جیسے کسی محفل کی تصویر لی جائے تو اس میں بیٹھے ہوئے لوگ جس بھی انداز اور عالم میں ہوں گے اب ہمیشہ کے لئے تصویر میں اسی انداز اور عالم میں رہیں گے۔ وہ اس عالمِ بے خودی سے اب کبھی نکل نہیں سکیں گے اور تیسرے شعر میں محبوب کی محفل میں اپنی خاموشی کو دیوار سے لگی تصویر کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔

میرؔ کے ہاں اس طرح کے سینکڑوں اشعار اور بھی مل جاتے ہیں، جن میں وہ اپنی حیرت کو تصویر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ زیرِ بحث شعر کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی نظارے کے سبب، کسی بہت حسین چیز یا محبوب کو دیکھنے کے بعد یا کسی چیز، جذبہ یا تجربے کی حقیقت کو پا کر بے حس و حرکت اور حیران ہو گئے ہیں تو پھر کیا ہوا، ہماری موجودہ حیرت سے پُر حالت بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ لوگ تصویروں سے بھی تو لطف اندوز ہوتے ہیں اور تصویروں کی حالت اور کیفیت بھی تو اپنے اندر ایک عالم رکھتی ہے، تم ہمیں بے حرکت اور مبہوت سمجھ کر نظر انداز نہ کرو۔ ہم بے خودی اور حیرت کے اس عالم میں بھی دیکھنے کے قابل ہیں۔

بقول کسے ؎ نہ جانے کیا دیکھا ہے کہ تصویر بن گئے ہیں
ہماری حیرانی بھی تو ہے دیکھنے کے قابل

شعر نمبر ۳

نہ دیکھی ایک وا شد اپنے دل کی اس گلستاں میں
کھلے پائے ہزاروں غنچۂ دلگیر بھی آخر

مشکل الفاظ واشد: واشدن سے ہے، مراد کھلا ہوا، واشد کا مطلب دل گرفتگی کا دُور ہونا اور طبیعت کا کھل جانا بھی ہے ٭ گلستاں: باغ، چمن مراد دنیا ٭ دلگیر: اُداس، غمگین، مغموم ٭

تشریح غنچہ، مُنہ بند کلی کو کہتے ہیں۔ میرؔ اپنے دل کو ایک ایسے غُنچہ سے تشبیہ دیتے ہیں، جو ہمیشہ کھِلنے سے محروم رہا، اپنی ازلی اُداسی اور دائمی غم کی حالت کو بیان کرنے کیلئے وہ باغ کے مناسبات اور تلازمات استعمال کرتے ہیں۔ واشد، گلستان کِھلے، غنچہ کے لفظ شعر میں اسی سلسلۂ تلازمات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ میرؔ کہتے ہیں کہ اس باغ میں ہزاروں کلیاں ایسی ہوتی ہیں (جو جلد یا دیر سے) کبھی نہ کبھی کھل کر آخر کار پھُول بن جاتی ہیں۔ مگر ایک ہمارے اُداس دل کی کلی ہے جو ایک بار بھی کِھلنے اور پھولنے پھلنے کے عمل سے آشنا نہیں ہوئی۔

داغؔ کا یہ شعر دیکھئے ؎

دل کی کلی کبھی بھی نہ بادِ صبا کِھلی
غُنچہ کِھلا، گلاب کِھلا، موتیا کِھلی (موتیا مؤنث ہے)

اس شعر سے میرؔ کی مراد یہ ہے کہ دنیا میں ہزاروں طرح کے مغموم اور اُداس لوگ ہوتے ہیں، لیکن وقت کے ساتھ کبھی نہ کبھی اُن کا غم اور اُداسی ضرور خوشی میں بدل جاتے ہیں، ہم ایسے بدبخت اور بدقسمت ہیں کہ ہمارا غم کبھی خوشی میں نہیں ڈھلتا۔ ہمارے اندر پھولنے پھلنے کا عمل رُک گیا معلوم ہوتا ہے، موسم بدلتے ہیں، رُتیں تبدیل ہوتی ہیں، مگر ان بدلتے ہوئے موسموں اور تبدیل ہوتی ہوئی رُتوں میں بھی ہمارے دِل کی اُداسی وہی ہے۔ ہمارے اندر کا غم وُہی ہے۔ ہماری دِل گرفتگی کا عالم اسی طرح کا ہے۔

بقول کسے ؎

ہے دِل کا غنچہ عجب پھُولتا ہے نہ پھلتا ہے
رُتیں بدلتی ہیں پر دل نہیں بدلتا ہے

شعر نمبر۴

سروکار، آہ کب تک خامہ و کاغذ سے یوں رکھیئے
رکھے ہے انتہا احوال کی تحریر بھی آخر

مشکل الفاظ سروکار: واسطہ، تعلق ✤ خامہ: قلم ✤ احوال: حالات ✤

تشریح میرؔ کا یہ شعر محبّت کے احوال اور کیفیات کی اُس شدید حالت کا ترجمان ہے، جو تحریر کی گرفت میں نہیں آتی۔ میرؔ کہتے ہیں کہ محبوب کی جدائی میں یا زمانے کی طرف سے ملنے والے دکھوں کے سبب ہماری جو حالت ہوگئی ہے، وہ اب بیان سے باہر ہے۔ آہ کا لفظ ان کے غم کی انتہائی کیفیت کا عکاس ہے۔ کہتے ہیں، افسوس ہم کب تک کاغذ اور قلم کے کام (مراد تحریر اور تخلیق سے) وابستہ رہیں۔ خط و کتابت میں بھی ایک خاص وقت تک کیفیات رقم ہوسکتی ہیں اور شعر و غزل میں بھی ایک خاص حد تک جذبے تحریر ہو سکتے ہیں، اپنے احوال اور کیفیات کا اظہار بھی ایک خاص وقت تک ممکن ہے۔ ایک لمحہ ایسا بھی آتا ہے جب

کاغذ و قلم کا ساتھ بھی چھوٹ جاتا ہے اور لکھنے لکھانے کا عمل بھی مضطرب طبیعت کو بوجھ لگنے لگتا ہے۔ ایسے عالم میں جب الفاظ جذبات کے اظہار سے عاجز آجائیں، اندر کی اُداسی اور ذات کا دُکھ تحریر یا شعروں میں نہیں ڈھل سکتا۔

بقول کسے ؎ واردات دل ہوں گی کب تلک رقم آخر؟
چھوڑ دیں گے ساتھ اک دن کاغذ و قلم اپنا

شعر نمبر ۵

یکایک یوں نہیں ہوتے ہیں پیارے جان کے لاگو
کبھو آدم ہی سے ہو جاتی ہے تقصیر بھی آخر

مشکل الفاظ یکایک: ایک دم، اچانک ٭ جان کا لاگو ہونا: جان کے درپے ہونا، جان کا دشمن ہونا ٭ کبھو: یہ لفظ پہلے کبھی کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اب یہ متروک ہے ٭ تقصیر: غلطی، خطا ٭

تشریح اس شعر سے معلوم ہوتا ہے کہ محبوب عاشق کی کسی غلطی کے سبب اُس سے بہت خفا اور ناراض ہے، اس ناراضی کی وجہ سے وہ عاشق کی جان کا دشمن بنا ہوا ہے اور اسے مسلسل تنگ کر رہا ہے، گویا اس کا غصہ عاشق کی جان لے کر ہی ٹھنڈا ہوگا۔

میر محبوب کو کہتے ہیں کہ آدمی سے کبھی کوئی غلطی ہو ہی جاتی ہے۔ اگر ہم سے محبت کے راستے میں کوئی بھول یا خطا ہوگئی ہے، تو تم ایک دم ہماری جان کے دشمن ہی کیوں بن گئے ہو؟ تمہیں چاہیئے کہ تم درگزر سے کام لو اور ہمیں معاف کر دو، کیوں کہ ہم سے جو خطا سرزد ہوئی ہے، وہ جان بوجھ کر نہیں ہوئی، یعنی محبت میں غلطی کرنا یا محبوب کے بارے میں کسی گستاخی کا ہو جانا۔ ہماری مستقل عادت نہیں، یہ غلطی ایک بار (سہواً) نادانی میں ہوگئی ہے۔

اس شعر کے دونوں مصرعوں کے شروع میں "یکایک" اور "کبھو" کے الفاظ میر کی فنی مہارت کا ثبوت ہیں۔ "یکایک" محبوب کے لئے ایک دم بے سوچے سمجھے، فوراً غصہ ہونے کے لیے اور "کبھو" اپنے لئے جس میں کبھی کبھار (زندگی میں ایک دو بار) کا مفہوم پوشیدہ ہے، اپنے اور محبوب کے عمل، عادات اور رویّوں کے تضاد کو واضح کرنے میں دونوں لفظوں کا استعمال نہایت مناسب ہے۔ اس شعر کے پس منظر میں آدم اور تقصیر کے الفاظ نے ایک اور تلازمہ ابھارا ہے چونکہ آدم علیہ السلام سے اللہ کی تنبیہ کے باوجود جنت میں گندم کا دانہ کھانے کی تقصیر (شیطان کے بہکانے سے) سرزد ہوئی تھی، اس لئے یہ کہا جاتا ہے کہ خطا کرنا اور بھول چوک سے کسی غلطی کا سرزد ہو جانا انسان کے خمیر میں ہے۔ انسان خطا کا پُتلا ہے اور اس طرح کے دوسرے

کئی اقوال انسان کے اندر کی اس خاصیت اور عادت کی نشاندہی کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ وہ بار بار غلطی کر کے بھی معافی کا خواستگار ہوتا ہے۔ بقول نوحؔ ناروی :

؎ ایک دو تین چار پانچ نہیں ÷ میری ساری خطائیں معاف کرو

اور بقول کسے ؎ ذرا سی بات پر تم تیغ کھینچتے ہو کیوں؟
خطا معاف میں انسان ہوں فرشتہ نہیں!

شعر نمبر ۶

کلیجہ چھن گیا، پر جان، سختی کش بدن میں ہے
ہوئے اس شوخ کے ترکش کے سارے تیر بھی آخر

مُشکل الفاظ

چھن جانا: چھید ہونا ÷ سختی کش: سختیاں برداشت کرنے والا ÷ ترکش: وہ تھیلا یا خول جس میں تیر رکھے جاتے ہیں اور جسے شکاری کاندھے پر لٹکا لیتے ہیں ÷ شوخ: محبوب ÷ تیر آخر ہوئے: تیر ختم ہوئے (دوسرے مصرع کے شروع میں ہوئے کا لفظ آخر کے ساتھ مل کر مفہوم دیتا ہے)

تشریح

میر تقی میر اس شعر میں عشاق کی ہمت، برداشت اور حوصلے کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارا شوخ محبوب تیر پر تیر چلائے جا رہا ہے، ایک ایک کر کے اس کے ترکش کے سبھی تیر ختم ہو گئے ہیں۔ اب اس کے پاس ہمیں مارنے کو اور کوئی تیر باقی نہیں بچا، اس کی طرف سے پے در پے برسائے جانے والے تیروں سے اگرچہ ہمارا کلیجہ چھلنی ہو گیا ہے (ہمارے بدن کو چیر کر اس کے تیر ہمارے کلیجے تک کو زخمی کر گئے ہیں) لیکن اب بھی ہمارے سختی اور مشقت برداشت کرنے والے جسم میں جان باقی ہے۔

اس شعر سے مراد یہ ہے کہ محبوب اگرچہ حیلوں بہانوں سے ہمیں آزما رہا ہے اور ہماری وفا، صبر اور برداشت کا امتحان لے رہا ہے، مگر ہم زخم زخم ہونے کے باوجود اُس کی آزمائشوں پر پورا اتر رہے ہیں، اس کے ظلم اور جبر کے باوجود ابھی ہمارے جسم میں جان باقی ہے۔

بقول کسے ؎ زخم کھا کر بھی رہیں گے عشق میں ثابت قدم
وہ ہی تھک جائے گا آخر امتحاں لیتے ہوئے

شعر نمبر ۷

پھرے ہے باؤلا سا پیچھے ان شہری غزالوں کے
بیاباں مرگ ہوگا اس چلن سے میرؔ بھی آخر

مشکل الفاظ

باؤلا: پاگل، سودائی، وحشی ÷ غزال: ہرن، مراد خوبصورت محبوب ÷

بیاباں : صحرا، دشت (یہ لفظ بے آباں سے ہے، وہ جگہ جہاں پانی نہ ہو) ⁂ مرگ : موت ⁂
بیاباں مرگ ہونا : صحرا میں موت آنا ⁂ چلن : رویّہ، طور طریق، طرز عمل ⁂

تشریح میرؔ اس شعر میں شہری غزالوں کے حوالے سے شہر کے رہنے والے حسینوں سے محبت کرنے کے انجام کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ میرؔ کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ شہری غزالوں کے پیچھے پاگلوں اور سودائیوں کی طرح پھرتا ہے۔ شہر کے حسینوں کے پیچھے دیوانہ وار پھرنے کا چلن اور عادت اس کے حق میں اچھی نہیں۔ شہری محبوبوں میں وفا اور ایثار کی کمی کے سبب میرؔ کو محبت میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس کا باؤلا پن اور وحشی پن اپنے اس اندازِ محبت کے ہاتھوں (جو شہری محبوبوں سے متعلق ہے) ایک روز اسے صحراؤں کی طرف لے جائے گا اور بالآخر وہ صحرا کی خاک چھانتا چھانتا مر جائے گا۔

اس شعر سے میرؔ کی مراد شہری لوگوں کی بے مروّت خصلتوں اور بے مہر رویّوں کا اظہار ہے۔ انسانی فطرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ شہری لوگ عام طور پر دیہاتوں اور پہاڑوں پر رہنے والوں کے مقابلے میں چالاک اور ہشیار ہوتے ہیں، وہ دوستی کے رویّوں میں اتنے سچّے اور خالص نہیں ہوتے جتنے دیہات میں رہنے والے۔ شہروں کی منافقانہ فضا اور صنعتی ماحول کے مشینی رویّوں کے سبب ان کے طرزِ عمل میں مصلحت پسندی، موقع شناسی اور کاروباریت سی آجاتی ہے، وہ بھرپور محبتوں کا جواب محبت سے دینے کی بجائے تصنّع اور بناوٹ سے کام لیتے ہیں۔

میرؔ نے اس شعر میں شہری غزال کہہ کے شہر کے ایسے ہی محبوبوں اور حسینوں کی سنگدلی کا ذکر کرنا چاہا ہے، جو سادہ دل جاں نثاروں کے پیار کی شدّت کا اندازہ نہیں لگا سکتے اور اپنے بے مہر رویّوں اور مسلسل جور و جفا کے سبب انجام کار انہیں صحراؤں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیتے ہیں۔ بقول کسے ؎

شہر کے دوستوں سے ملا کر نظر
خاک صحراؤں کی چھاننا پڑ گئی

غزل نمبر ۳

شعر نمبر ۱

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاجوری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

مشکل الفاظ تاجوری : تاج پہننا، بادشاہ بننا ⁂ نوحہ گری : ماتم کرنا

تشریح میرؔ اس شعر میں گردشِ وقت سے پیدا ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بے ثبات دنیا میں رتبہ، عہدہ، ترقی اور بلندی کا درجہ ہمیشہ برقرار

نہیں رہتا۔ یہ سب عارضی اور ناپائدار چیزیں ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ہر چیز زوال آمادہ ہو جاتی ہے اور انسان کی حیثیت میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو بادشاہت کے نشہ میں سرشار رہتے ہیں، اپنے جاہ و جلال پر گھمنڈ اور غرور کرتے ہیں اور جب تک ان کے سر پر تاج رہتا ہے وہ حکمرانی کے تکبر میں مبتلا رہتے ہیں، مگر وہ بھول جاتے ہیں کہ وقت اور موت بھی کوئی چیز ہے جو انسان کو آخر کار زوال اور فنا کی طرف لے جاتی ہے، یہی دنیا جو آج ان کی شہرت کے قصے کہتی ہے، ایک وقت آئے گا جب یہیں اس کے زوال اور موت کا ماتم کیا جائے گا۔ کیونکہ موت سے بادشاہوں کو بھی مفر نہیں اور عیش و عشرت کی محفلوں سے آباد محل بھی موت کے نوحوں اور گریہ و ماتم کی آواز سے محفوظ نہیں۔

بقول کسے ؎

چھین لے گا کل خدا کا ہاتھ اُن کے تاج و تخت
آج جو جشنِ شہنشاہی کے نغموں میں ہیں گم

شعر نمبر ۲

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

مشکل الفاظ آفاق : افق کی جمع مراد دنیا + اسباب: سامان + یاں: یہاں + سفری: مسافر +

تشریح میر کا یہ شعر بھی معنوی طور پر پہلے شعر سے مربوط ہے۔ میر دنیا کی بے ثباتی کا نقشہ کھینچتے ہوئے کہتے ہیں کہ دنیا ایک ایسی جگہ، ایک ایسا مقام ہے جہاں سے بچ کر کوئی نہیں جاتا، اس منزل پر جو کوئی بھی آتا ہے، وہ اپنا تمام سامان لٹوا کر خالی ہاتھ ہی یہاں سے جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ جو مال و دولت اس نے جمع کر رکھی ہے، وہ اسے ساتھ لے کر صحیح سلامت اگلی منزل کی طرف روانہ ہو سکتا ہے تو یہ اس کی بھول ہے، جو کوئی مسافر زندگی کی گزرگاہ پر چلتا ہے۔ جلد یا بدیر موت اسے آکر لوٹ لیتی ہے، دنیا کی منزل ہی ایسی ہے کہ یہاں پر جمع کیا ہوا سامان اور مال یہیں رہ جاتے ہیں، اگلی منزل پر صرف انسان کے نیک اعمال پہنچتے ہیں۔

بقول کسے ؎

ساتھ جائے گا ترے، اک نورِ نیک اعمال کا
جمع جو کچھ بھی کیا تُو نے یہیں رہ جائے گا

شعر نمبر ۳

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی!
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

مشکل الفاظ زنداں : قید خانہ ✦ شورش : ہنگامہ آرائی، دنگا فساد ✦ جنوں : وحشت دیوانگی ✦
مداوا : علاج ✦ آشفتہ سری : وحشت، دیوانگی ✦

تشریح میر تقی میر محبت سے پیدا ہونے والی دیوانگی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ ختم ہو جانے والی حالت یا کیفیت نہیں۔ اس پر کسی کا اختیار نہیں۔ حتیٰ کہ جو آدمی دیوانگی میں گرفتار ہے وہ خود بھی اس سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتا۔ وہ اپنی وحشت میں مجبور ہے۔

میرؔ کہتے ہیں کہ لوگوں نے ہماری دیوانگی اور وحشت سے تنگ آکر ہماری اصلاح کے لئے ہمیں قید خانے میں ڈال دیا ہے، لیکن ہمیں قید کرنے سے بھی ہمارے جوشِ جنوں کی ہنگامہ آرائی ختم نہیں ہوئی۔ پہلے اگر ہم لوگوں سے دست و گریباں ہوتے تھے یا شہر بھر میں ہنگامے اور شورشیں کرتے پھرتے تھے، اور لوگ ہمیں پتھر مارتے تھے تو اب ہمیں قید خانے کے در و دیوار ٹکرانے کے لئے مل گئے ہیں۔ ہم نے ان سے اپنا سر پھوڑنا شروع کر دیا ہے۔ اور یہی پتھر (کی دیواریں) اب ہماری وحشت کا علاج ہو گئی ہیں، بقول غالب : ؎

گر کیا ناصح نے ہم کو قید، اچھا یوں سہی ✦ یہ جنونِ عشق کے انداز چھٹ جائیں گے کیا

قید کرنے سے بھی محبت کا جنون ختم نہیں ہوتا اور میرؔ کے لفظوں میں دیوانہ دیوارِ زنداں سے سر پھوڑ پھوڑ کر مر جاتا ہے۔ بقول کسے ؎

کسی بھی حال میں اس شوخ کی چاہت نہ کم ہو گی
ہمیں زنجیر کرنے سے بھی یہ وحشت نہ کم ہو گی

شعر نمبر ۱۴

ہر زخم جگر، داورِ محشر سے ہمارا
انصاف طلب ہے تری بیدادگری کا

مشکل الفاظ داورِ محشر : قیامت میں انصاف کرنے والا مراد خدا ✦
انصاف طلب : انصاف چاہنے والا ✦ بے دادگری : ظلم، جور ✦

تشریح میرؔ کہتے ہیں کہ اے محبوب تُو نے ہم پر بہت ظلم کئے ہیں، ہمیشہ ہماری محبتوں کا بدلہ ستم و جور سے دیا ہے، تمہاری بیداد اور ظلم کے لگائے ہوئے زخموں سے جگر بھرا پڑا ہے۔ ہم خود تو تجھے تیرے ظلموں کی سزا نہیں دے سکتے لیکن قیامت کے روز ہمارے جگر کا ایک ایک زخم اللہ تعالےٰ سے تیرے ظلم و ستم کی شکایت کر کے انصاف چاہے گا۔

اس شعر کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ شاعر قیامت کے روز اپنی زبان سے محبوب کا شکوہ نہیں کرے۔ ہاں وہ آپ چپ ہے مگر اس کے جسم پر محبوب کے ہاتھوں سے لگائے گئے

زخم، محبوب کی زیادتیوں اور نا انصافیوں کے داغ اور بے مہریوں کے نشان خدا تعالیٰ کے حضور ماتم کر رہے ہیں کہ اُن کا انصاف کیا جائے اور محبوب کو اس بے مروّتی اور بیداد کی سزا دی جائے جو اس نے دنیا میں اپنے عاشقِ صادق کے ساتھ روا رکھی۔

بقول کسے ؎

کریں گے زخم مرے ظلم و جور کی فریاد!
ہم آپ چپ بھی رہے گر بروزِ حشر اے دوست

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہہِ شیشہ گری کا

شعر نمبر ۵

مشکل الفاظ

آفاق: افق کی جمع مراد دنیا ٭ کارگہہ: کارخانہ ٭
شیشہ گری: شیشہ سازی، شیشہ بنانے کا کام ٭

تشریح

میر تقی میر اس شعر میں دنیا کو شیشے کے کارخانے سے تشبیہ دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ فطرت کا یہ سارا کارخانہ اتنا نازک ہے کہ انسان کی ذرا سی بے احتیاطی سے ٹوٹ سکتا ہے، انسان کو چاہیئے کہ وہ اپنے اعمال اور افعال کے ذریعے کوئی ناشائستہ اور بے ہودہ حرکت نہ کرے تاکہ کائنات کی ملائمت، نزاکت اور خوبصورتی زائل نہ ہو، اس پر کوئی داغ دھبہ نہ پڑے یہاں انسان کو سانس بھی آہستگی سے لینا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس کے زور سے سانس لینے ہی سے یہ شیش محل دھڑام سے گر جائے۔ میرزا بیدل نے فارسی میں ایک اور انداز سے اسی طرح کے مضمون کو کس خوبصورتی سے باندھا ہے، کہتے ہیں:

؎ نزاکت ہاست در آغوشِ میناخانۂ حیرت ٭ مژہ برہم مزن تا نشکنی رنگِ تماشا را

حیرت کے میناخانہ (شیش محل) کی آغوش میں نزاکتوں کی کثرت ہے، اپنی پلک بھی نہ جھپک، پلک جھپکنے سے کہیں تو نظارگی کا رنگ نہ توڑ دے۔

کائنات کی نزاکت دراصل یہاں رہنے والوں کی طبیعتوں کی نزاکت ہے جو ذرا سی بے احتیاطی بھی برداشت نہیں کر سکتیں، جس طرح عبدالحمید عدم مرحوم کا شعر ہے:

؎ سانس لینے سے ٹوٹ جاتے ہیں ٭ دل کے رشتے عجیب رشتے ہیں

دلوں کی کائنات کا نظام بھی ذرا سی بدگمانی اور شک سے درہم برہم ہو جاتا ہے، اسلیئے احتیاط ہی لازم ہے۔ ؎

ہوتے ہیں بال سے باریک دلوں کے رشتے
تُو نے کچھ کہتے ہوئے اتنا تو سوچا ہوتا

شعر نمبر ۶

ٹک میرِ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسہ ہے چراغِ سحری کا

مشکل الفاظ

ٹک: ذرا ٭ جگر سوختہ: جس کا جگر جل گیا ہو، مراد بہت دکھی، رنجیدہ غمگین ٭ چراغِ سحری: صبح کا چراغ جو بجھنے کے قریب ہوتا ہے۔ مراد ایک ایسا شخص جو مرنے کے قریب ہو ٭

تشریح

میر نے غزل کے مقطع میں محبوب کی غفلت اور بے پروائی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ زندگی بھر تُو نے ہم سے بے توجہی برتی، ہمیں اپنی بے رخی اور بے مروتی سے اتنا ستایا اور ہمیں ایسی اذیت اور تکلیف میں مبتلا رکھا کہ ہمارا جگر تک جلا ڈالا، اب جب کہ ہم مرنے کے قریب ہیں اور ہماری حالت صبح کے وقت کے چراغ جیسی ہے جو کسی وقت بھی بجھ سکتا ہے، تُم اب تو ہماری خبر لو۔ بقول داغ دہلوی ؎

نہ جانا کہ جاتا ہے دنیا سے کوئی ٭ بڑی دیر کی مہرباں آتے آتے

میر کہنا یہ چاہتے ہیں کہ کسی کو موت کے قریب دیکھ کر بڑے بڑے پتھر جیسے دل والے موم ہو جاتے ہیں اور پرانی دُشمنی اور عداوت بھول کر مرنے والے کی عیادت کرنے، اسے دیکھنے اور اس کا حال پوچھنے آجاتے ہیں۔ محبوب کو بھی چاہیئے کہ وہ اپنی روایتی غفلت ترک کر دے، بے پروائی چھوڑ دے اور جتنی جلدی ہو سکے میر کی عیادت اور خبر گیری کے لئے آئے، پھر بعد میں آنے کا کیا فائدہ؟ بقول کسے ؎

عزیز از جان۔ کیا اس وقت بھی ملنے نہ آؤ گے
زوالِ عمر کا پل ہے، غروبِ جاں کی منزل ہے

غزل نمبر ۴

شعر نمبر ۱

تھا عشق مجھے طالبِ دیدار ہوا مَیں
سو آئینہ سا صورتِ دیوار ہوا مَیں

مشکل الفاظ

طالبِ دیدار: دید کا طالب ٭ آئینہ سا: آئینے جیسا ٭ صورتِ دیوار: دیوار کی مانند، دیوار پر بنی ہوئی تصویر کی طرح ٭

تشریح

میر کہتے ہیں کہ مستقل دیدار کا طالب وہی ہوتا ہے جو سچا عاشق ہو۔ گاہ گہے کی تاک جھانک تو ہر دل پھینک کر لیتا ہے، مجھے چونکہ اپنے محبوب سے سچی محبت ہے، اس لئے میں اسے دیکھنے کا تمنائی اور طالب ہُوا، اپنی اس خواہش کو پورا کرنے کے لئے میں دیوار کی

مانند یا دیوار پر بنی ہوئی کسی صورت کی مانند ہو گیا ہوں، محبوب کو دیکھنے کے شوق نے مجھے سراپا آئینہ کر دیا ہے، مجھے شوق کی وارفتگی اور شدت نے آئینے کی طرح کر دیا ہے، آئینہ پلک جھپکے بغیر ہر وقت کھلی آنکھ سے اپنے سامنے سے گزرنے والے کو دیکھنے کا منتظر رہتا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ شدتِ شوقِ دید نے میری حالت بھی آئینے جیسی کر دی ہے۔ علامہ اقبال کا یہ شعر دیکھئے:

؎ نظارے پر یہ جنبشِ مژگاں بھی بار ہے ✤ نرگس کی آنکھ سے تجھے دیکھا کرے کوئی

میرؔ جب اپنے آپ کو آئینہ سے تشبیہ دیتے ہیں تو در اصل اقبال کے مذکورہ بالا شعر کے پہلے مصرع کے پس منظر ہی میں دیتے ہیں کیونکہ نرگس کی طرح آئینہ کا آنکھ نہ جھپکنا بھی انتہائے حسن کو دیکھنے سے پیدا ہونے والی حیرت یا کسی انتہائی حسن کو دیکھنے کے شوق سے پیدا ہونے والی حیرت کے سبب ہے۔

میرؔ نے دوسری تشبیہ دیوار سے یا صورتِ تصویر سے دی ہے اس سے بھی شوق کی ایسی انتہا ظاہر ہوتی ہے، جس میں انسان کمال حیرت سے ٹھٹک کر یا مبہوت ہو کر رہ جائے۔ میرؔ اپنے محبوب کو دیکھنے کے شوق کی انتہا میں آئینے اور صورتِ دیوار کی مانند ٹھٹک کر رہ گئے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی اور چیز یا نظارہ انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ وہ سراپا انتظار ہیں اور اُس لمحہ مسرت کے منتظر ہیں جب انہیں اپنے محبوب کا دیدار ہو اور وہ پلک جھپکے بغیر مسلسل اسے دیکھے جائیں۔

بقول کسے ؎

کیا علم کب وہ ادھر سے گزرے
دیوار کی طرح چپ کھڑے ہیں
کیا آئینے ہیں جو دیکھنے کو
دیوارِ وجود میں جڑے ہیں
دیکھوں میں اُسے تو کس نظر سے
دیدار کے مرحلے کڑے ہیں

شعر نمبر ۲

جب دُور گیا قافلہ تب چشم ہوئی باز
کیا پوچھتے ہو دیر خبردار ہوا میں

مشکل الفاظ چشم باز ہونا: آنکھ کھلنا، جاگنا ✤ دیر خبردار: دیر سے ہوشیار ہونے والا، وقت گزر جانے کے بعد ہوش میں آنے والا ✤

تشریح میرؔ نے اس شعر میں ایک ایسے غافل انسان کا نقشہ پیش کیا ہے، جس کے ساتھی آگے نکل جائیں، مگر وہ اپنی سُستی اور غفلت کے سبب پیچھے سوتا رہ جائے۔ میرؔ کہتے ہیں افسوس ہے میری آنکھ اس وقت کھلی اور میں نیند سے اس لمحے بیدار ہوا جب قافلہ بہت دُور

نکل گیا تھا۔ قافلے والے ساتھیوں نے جاتے وقت مجھے آواز دی ہوگی مگر میری غفلت نے مجھے جاگنے نہ دیا۔ میں قافلے کے کوچ سے بے خبر سوتا رہا اب میں تمہیں اپنی پس ماندگی اور پیچھے رہ جانے کی وجہ کیا بتاؤں؟

اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ انسان وقت کی قدر نہیں کرتا اور زندگی جیسی نعمت کو فضول اور بے کار کاموں میں صرف کر دیتا ہے، اس کی غفلت اسے اپنی تخلیق کے مقصد سے آگاہ نہیں ہونے دیتی، جوانی کے شب و روز وہ خواہشوں کے خمار میں گزار دیتا ہے۔ جب موت کے قریب بڑھاپے میں اُسے اپنی عاقبت سنوارنے کا خیال آتا ہے تو عمر کا حصہ بہت کم رہ گیا ہوتا ہے۔ اس کے سنگی ساتھی آگے نکل گئے ہوتے ہیں اور اس کے پاس صرف پچھتاوے اور حسرتیں رہ جاتی ہیں۔

بقول کسے ؎

آخری منزل پہ پہنچے قافلے والے تمام
پہلی منزل پر ہمیں سوتے رہے افسوس ہے

شعر نمبر ۳

کیا چیتنے کا فائدہ جب شیب میں چیتا
سونے کا سماں آیا تو بیدار ہوا میں

مشکل الفاظ

چیتنا: خبردار ہونا، جاگنا، چوکس ہونا ٭ شیب: بڑھاپا ٭
چیتا: جاگا ٭

تشریح

میر کا یہ شعر بھی معنوی طور پر اوپر والے شعر سے مربوط نظر آتا ہے۔ میر کہتے ہیں، ہشیار ہونے کی ایک عمر اور زندگی میں فعال اور متحرک ہونے کا ایک وقت ہوتا ہے، عام طور پر انسان نوجوانی کے عالم میں اپنے مقاصد کے حصول کے لئے دن رات دوڑ دھوپ کرتا ہے اور اپنے ایک ایک پل کا بھرپور استعمال کرتا ہے، جوانی کو اس درجہ کامیابی سے گزارتا ہے کہ اسے بڑھاپے میں گزرے وقت کے بارے میں کوئی پچھتاوا نہیں ہوتا اور وہ اطمینان سے اپنے بڑھاپے کے دن گزارتا ہے۔

میر کہتے ہیں افسوس میری جوانی کے دن تو رائیگاں اور فضول کاموں میں گئے۔ اب بڑھاپے میں مجھے ہوش آئی ہے تو اس کا کیا فائدہ، یہ تو ایسے ہی ہے جیسے انسان دن تو سو کر گزار دے اور جب رات کا وقت آئے (جو کہ اصل میں سونے کا وقت ہے) تو بیدار ہو جائے ٭

بقول کسے ؎

جو عمر کام کی تھی وہ غفلت میں کٹ گئی
اب احتیاط کیسی کہ جب عمر گھٹ گئی

شعر نمبر ۴

اب پست و بلند ایک ہیں، جوں نقشِ قدم یاں
پامال ہوئے خوب تو ہموار ہوا میں

مشکل الفاظ پست و بلند: نیچا اونچا ٭ جوں نقشِ قدم: پاؤں کے نشان کی طرح ٭ پامال: پاؤں سے مسلنا، روندنا ٭

تشریح اس شعر میں میر نے زندگی کے بارے میں ایک نفسیاتی حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ میر کہتے ہیں کہ زمانے کے انقلابات اور اتفاقات نے مجھے اس طرح مسل دیا ہے کہ میری نظر میں زندگی کی اونچ نیچ، نشیب و فراز، دُکھ سُکھ اور خوشی و غم ایک جیسے ہو گئے ہیں۔ میرے مزاج میں جو کجی اور ناہمواری تھی وہ زمانے کی مصیبتوں اور دکھوں کی کثرت کے سبب دُور ہو گئی ہے، جیسے غالب نے کہا تھا ؎ رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

میر نے اپنے وجود کو نقشِ قدم سے تشبیہ دی ہے، وہ کہتے ہیں مجھے دنیا نے اتنا پامال کیا ہے، جیسے ایک نقشِ قدم کو ہزاروں لاکھوں لوگ پامال کرتے ہیں اور کچھ عرصہ بعد نقشِ قدم مٹ کر راستے ہی کا حصہ بن جاتا ہے، اس کے خدوخال ایک ہموارپن میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ میرے لئے اب دنیا کے سبھی رنگ، ذائقے، تجربے ایک جیسے ہیں۔
بقول کسے ؎ مٹا کے خود کو حقیقت کی آنکھ سے دیکھو
بلند و پست تمہیں آئیں گے نظر یکساں

شعر نمبر ۵

بازارِ وفا میں سر و سودا تھا سبھوں کو
پر بیچ کے جی ایک خبردار ہوا میں

مشکل الفاظ سر و سودا ہونا: سر ہونا اور اس میں کسی چیز کا سودا ہونا ٭

تشریح میر نے اس شعر میں اہل دنیا کا اپنے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وفا کے بازار میں سبھی لوگوں کے سروں میں کسی نہ کسی کی دُھن، کوئی نہ کوئی سودا سمایا ہوا تھا۔ محبت میں سبھی لوگ بڑے بڑے دعوے کرتے تھے لیکن جان کی بازی لگانے سے ہر ایک نے پہلو تہی کی۔ اُن کا خیال تھا کہ جی کا زیاں زندگی کا نقصان ہے۔ حالاں کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ محبت میں تو وہی کامیاب ہوتا ہے، جو محبوب کی رضا حاصل کرنے کے لئے اپنی جان تک کی پروا نہ کرے۔ میں محبت کی اس رمز سے واقف تھا۔ لہٰذا میں نے وفا کے بازار میں اپنی جان تک بیچ دی۔ میں نے آپ تک کے محبوب کی رضا حاصل کر لی۔ عام طور پر لوگ اس کو ہشیار

اور خبردار کہتے ہیں، جو عشق و عاشقی میں اپنی جان بچا لائے۔ مگر میرؔ کے خیال میں محبت کے بازار میں اپنی جان کی بولی دے کر ہی آدمی خبردار ہو سکتا ہے۔ فیض احمد فیضؔ کا یہ شعر دیکھئے:

؎ اتنے ناداں تو نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو، پند گرو راہگزر تو دیکھو

بقول کسے ؎ جو لائے جان بچا کے وہ سخت ناداں تھے
ہیں کامیابِ محبت، جو جان وار آئے

شعر نمبر ۶

ہشیار تھے سب دام میں آئے نہ ہم آواز
تھی رفتگی سی مجھ کو گرفتار ہُوا مَیں

مشکل الفاظ

دام: جال ٭ ہم آواز: ایک جیسی آواز والے، ہم زبان مراد ساتھی ٭
رفتگی: بے خودی، از خود رفتہ ہونا، اپنے آپ میں نہ ہونا ٭

تشریح

میر تقی میرؔ نے اس شعر میں اپنے ساتھیوں سے اپنا مقابلہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ میرے ساتھ کے تمام لوگ مجھ سے کہیں زیادہ ہشیار اور چالاک تھے، وہ میرے ساتھ رہتے تھے اور میری آواز سے اپنی آواز ملا کر میرے ہم زبان ہونے کا ثبوت بھی دیتے تھے مگر اُن کی حالت اور کیفیت میرے جیسی نہیں تھی۔ میں محبت کے جذبوں سے مغلوب ایک ایسی بے خودی میں مبتلا تھا کہ جب شکاری نے پرندوں کو پکڑنے کے لئے جال لگایا تو اس میں ایک میں ہی گرفتار ہُوا۔ میرے باقی ساتھی جو ہشیار تھے جال میں نہ پھنسے۔ وہ اپنی چالاکی اور احتیاط کے سبب بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئے۔ شکاریوں کے پرندے پکڑنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ وہ کسی ایک پرندے کو پکڑ کر اس کے پر کاٹ دیتے ہیں یا اس کے پاؤں کے ساتھ ڈوری باندھ کر اسے کسی باغ میں چھوڑ دیتے ہیں اور اس کے قریب جال لگا دیتے ہیں۔ جب وہ گرفتار پرندہ آواز لگاتا ہے تو اس کے ہم جنس اُس کی آواز سن کر اُس کے قریب اُترتے ہیں اور اُترتے ہی جال میں پھنس جاتے ہیں، بعض اوقات چالاک شکاری بھی پرندوں کی آواز نکال کر انہیں اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ میرے ہم آواز چالاک تھے۔ وہ تو کسی مجبور اور گرفتار پرندے کی دُکھ بھری آواز پر متوجہ نہ ہوئے مگر میں اپنے حال میں بے خود اپنی سادہ لوحی سے گرفتار ہو گیا۔

بقول کسے ؎ جاں کو بچا کے لے گئے چالاک ہم سفر
ہم سادہ دل ہی راہِ طلب میں فنا ہوئے

شعر نمبر ۷

رہتا ہوں سدا مرنے کے نزدیک ہی اب میرؔ
اُس جان کے دشمن سے بھلا یار ہؤا میں

مشکل الفاظ بھلا : خوب، اچھا (یہاں یہ لفظ طنزاً استعمال ہوُا ہے)

تشریح میرؔ نے اس شعر میں محبت کے اس پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے جو ایسے ایسے لوگوں سے دوستی کرنے پر بھی انسان کو مجبور کر دیتا ہے جن کی دوستی بالآخر جان لے کر ہی ٹلتی ہے۔ میرؔ کہتے ہیں کہ میں نے اس جان کے دشمن سے (مراد محبوب سے) اچھی دوستی کی ہے، کہ میں قبر کے کنارے آگیا ہوں، جب سے میں نے اسے اپنا دوست بنایا ہے اس وقت سے ایسی ایسی مصیبتوں، پریشانیوں اور دکھوں میں گھر گیا ہوں کہ اب میں ہمیشہ موت کو اپنے قریب پاتا ہوں۔ مجھے محبوب کے وصل یا فراق کسی حالت میں سکون نصیب نہیں ہوتا۔ یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے زندگی موت ہو گئی ہے اُس کی دوستی اور محبت کا کوئی پل ایسا نہیں جو موت کے خطرے سے آزاد ہو۔ غالبؔ کے لفظوں میں :۔

بلائے جاں ہے غالبؔ اس کی ہر بات
عبارت کیا اشارت کیا ادا کیا؟

یعنی محبوب کے تمام پہلو ہمارے لئے بلائے جان بن گئے ہیں وہ اچھا ہمارا یار بنا ہے جس نے ہمیں اس حال تک پہنچا دیا ہے۔

خواجہ حیدر علی آتش

(۱۷۶۴ء — ۱۸۴۸ء)

غزل نمبر ا

شعر نمبر ا

صدمے پہنچے ہیں ہمارے بازوؤں پر سینکڑوں
گم ہوئے ہیں اپنے یوسف سے برادر سینکڑوں

مشکل الفاظ

صدمہ: دُکھ، رنج ✤ برادر: بھائی ✤

تشریح

آتش اس شعر میں اپنی زندگی کے حادثات کی کثرت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم نے زندگی میں اپنے بازوؤں پر بہت سے صدمے اور جبر کے برداشت کئے ہیں۔ بہت سے بھائیوں اور دوستوں کی جدائی کی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ اس دنیا کے ہجوم میں ہمارے بہت سے ایسے بھائی گم ہوگئے ہیں جو ہمیں یوسفؑ کی طرح عزیز اور پیارے تھے۔

آتش نے بھائیوں کو یوسفؑ سے تشبیہ دی ہے بعض لوگوں کو یہ شعر پڑھتے ہوئے مغالطہ ہو سکتا ہے کہ آتش کی یہ نسبت درست نہیں، کیونکہ حضرت یوسفؑ کے بھائی اُن کے دوست نہ تھے بلکہ اُن کے لئے اپنے دل میں کینہ اور حسد رکھتے تھے، اسی طرح وہ یہ خیال کر سکتے ہیں کہ حضرت یوسفؑ کی گمشدگی کا دُکھ تو اُن کے باپ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہوا تھا، اُن کے بھائی تو اُن کی گمشدگی سے خوش تھے بلکہ انہیں گم کرانے والوں میں تھے۔ مگر یہاں صورتِ حال ایسی نہیں۔ شاعر بعض اوقات تلمیح کا استعمال اپنے روائتی سباق میں کرتا ہے اور تمام پرانے مناسبات اور تلازمات کو پیش نظر رکھتا ہے لیکن بعض اوقات وہ کسی تلمیح کو صرف ایک حوالہ کے طور پر لیتا ہے اور اسے اپنا علیحدہ سیاق وسباق عطا کرتا ہے۔ یہاں بھی آتش نے ایسے ہی کیا ہے۔ گمشدگی، یوسفؑ اور برادر کے لفظ ضرور استعمال کئے ہیں مگر انہیں تلمیحی پس منظر سے ہٹ کر اپنے احوال کے اظہار میں برتا ہے۔

یہ ایک عام بات ہے کہ بھائی بازوؤں کی طرح ہوتے ہیں کیونکہ وہ زندگی میں سہارا اور ساتھ دینے والے ہوتے ہیں۔ آتش کہتے ہیں کہ ہمارے بہت سے بچھڑنے والے بھائیوں کے دُکھوں اور زخموں نے ہمارے بازو کاٹ کے رکھ دیئے ہیں۔ ہم نے ان پر اتنے صدمے برداشت کئے ہیں جو بیان سے باہر ہیں۔ ایک بھائی بچھڑ جائے تو اس کا غم بازو توڑ کے رکھ دیتا ہے۔ ہمارے تو سینکڑوں بھائی بچھڑے ہیں، اور وہ بھی یوسف جیسے (یہاں یوسف کا لفظ عزیز، پیارے اور پُرجمال بھائی کے لیے ہے) بقول شخصے ؎ روئیے کس کس کو اور کس کس کا ماتم کیجیے۔

آتش کے اس شعر میں برادر کا لفظ وسیع تر مفہوم میں برتا گیا ہے۔ جس میں وہ بھائی، دوست، ساتھی، رفیق اور ہمنشیں سبھی آجاتے ہیں جو مر گئے، تلاشِ رزق میں نقل مکانی کر گئے، بچھڑ گئے، یا حادثاتِ زمانہ میں کہیں لاپتہ ہو گئے۔ اب ان کی گمشدگی کا جان لیوا صدمہ ہے، جو آتش برداشت کر رہے ہیں۔ بقول کسے۔

حادثاتِ دہر کتنے ساتھیوں کو کھا گئے؟
دوست کوئی ایک بچھڑا ہو تو اُس کا ذکر ہو

شعر نمبر ۲

یہ سعادت لکھی ہے قسمت میں کس کی دیکھیے
خوں گرفتہ ایک میں ہوں اور خنجر سینکڑوں

مشکل الفاظ

سعادت: خوش قسمتی ✤ خوں گرفتہ: اجل رسیدہ، مرنے کے قریب، جسے موت نے پکڑ رکھا ہو ✤

تشریح

آتش کہتے ہیں کہ ایک زمانہ میرے قتل کے درپے ہے۔ میرے لئے سینکڑوں خنجر کھلے ہوئے ہیں، میں اُن کی زد میں ہوں اور کسی وقت بھی قتل ہو سکتا ہوں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ ان سینکڑوں خنجروں میں وہ خوش قسمت خنجر کون ہے جو میرے گلے تک پہنچے گا۔

آتش صورتِ حال سے خوفزدہ ہیں، بلکہ خود کو ایک ایسی مطمئن کیفیت اور حالت میں محسوس کرتے ہیں جو بدی اور شرک کے ماحول میں کسی حق گو، سرفروش اور بے باک مجاھد کو حاصل ہوتی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ خنجر خوش قسمت ہو گا، جو میری گردن تک پہنچے گا اور مجھے شہادت کے مرتبے سے سرفراز کرے گا۔

بقول کسے۔

اک مرے قتل کے درپے ہیں ہزاروں خنجر
کیا خبر کون سا خوش بخت گلے میں اُترے

شعر نمبر ۳

فقر کے کوچے میں قدرِ دولتِ دنیا نہیں
ٹھوکریں کھاتے ہیں یاں پارس سے پتھر سینکڑوں

مشکل الفاظ

فقر: فقیری، درویشی ✤ قدر: اہمیت ✤ پارس: ایک پتھر جس کے متعلق مشہور ہے کہ اگر اسے لوہے سے مس کیا جائے تو سونا بنا دیتا ہے۔

تشریح

آتش کہتے ہیں کہ دنیا کے مال و دولت کی قدر دنیا والوں کے نزدیک ضرور ہوتی ہے فقیروں کے نزدیک نہیں، فقیروں کی نظر میں یہاں کا مال و دولت، جاہ و منصب، روپیہ پیسہ، سونا چاندی سب حقیر چیزیں ہیں، فقیری اور درویشی کے کوچے میں پارس جیسے سینکڑوں پتھر بھی رُلتے اور

ٹھوکریں کھاتے نظر آتے ہیں۔ دنیادار جب پارس کے لئے خود دربدر ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں کہ کاش کہیں سے پارس اُن کے ہاتھ لگ جائے اور سے لوہے سے چھو کر اس کا سونا بنا نے جائیں، ایسے بہت سے پتھر فقیروں کو گلیوں میں جا بجا گرے پڑے نظر آتے ہیں اور وُہ لوگ کبھی اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔

آتش کے اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ فقیروں کے پاس دولتِ دنیا کمانے کے بہت سے نسخے اور طریقے ہوتے ہیں، اگر وہ چاہیں تو وہ بھی دولت اکٹھی کر سکتے ہیں لیکن انہیں دنیاوی چیزوں سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔ فقیری اور درویشی کی پہلی صفت ہی یہ ہے کہ وہ دنیا کی طمع نہ کرے۔ اپنا دل ہر طرح کے لالچ سے صاف رکھے، جب وہ فقر کے درجے پر پہنچ جاتے ہیں تو دنیادار خود حیلوں بہانوں سے انہیں روپیہ پیسہ دینے کی کوشش کرتے ہیں لیکن وہ انہیں قبول نہیں کرتے۔ تاریخ میں بہت سے ایسے سچے صوفیا کرام اور درویشوں کے واقعات مل جاتے ہیں۔ جنہیں شاہانِ وقت نے مال و دولت سے نوازنا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔

بقول کسے ؎

فقیر ہوں زر و دولت سے کیا غرض مجھ کو
مری نگاہ میں پارس بھی ایک پتھر ہے!

شعر نمبر ۱۴

روندتا ہوں سبزۂ رہ کی طرح وُہ بُوٹیاں
ڈھونڈتے پھرتے ہیں جن کو کیمیاگر سینکڑوں

مشکل الفاظ سبزۂ رہ: راستے پر اُگی ہوئی گھاس ٭ بُوٹیاں: بوٹی کی جمع مراد جڑی بوٹی، بہت چھوٹے چھوٹے جڑوں جیسے بُوٹے جو عام طور پر خود رَو ہوتے ہیں اور دوائیوں اور نسخوں میں استعمال ہوتے ہیں ٭ کیمیاگر: سونا بنانے والا

تشریح سونا بنانے کے بہت سے طریقوں میں جن کا ذکر روائتی کہانیوں میں ملتا ہے، ایک طریقہ کیمیائی بھی ہے، جس میں کیمیاگر مختلف جڑی بوٹیوں کی آمیزش سے سونا بنانے کی کوشش کرتا ہے۔ جن لوگوں کو سونا بنانے کا شوق ہوتا ہے وہ جہاں وِرد وظیفہ اور دھاتوں پر مختلف عمل کے ذریعے اپنے اس شوق میں لگے رہتے ہیں اس طرح وہ بعض نایاب جڑی بوٹیوں کی تلاش میں بھی جنگل جنگل اور پہاڑ پہاڑ چھانتے ہیں۔ جہاں سے انہیں کسی بُوٹی کے بارے میں اطلاع ملتی ہے، اُدھر بھاگ جاتے ہیں، ان کا یہ شوق انہیں گھر ٹک کر بیٹھنے نہیں دیتا۔

آتش کہتے ہیں کہ میں ان بوٹیوں کو اپنے پاؤں سے ایسے روندتا رہتا ہوں جیسے وہ میرے راستے پر بچھا ہوا سبزہ ہوں۔ راہ چلتے ہوئے آدمی عام طور پر اس گھاس کی طرف متوجہ بھی نہیں ہوتا جو اس کے پاؤں میں بچھی ہوئی ہے۔ آتش کہتے ہیں کہ میرا رویہ بھی ان بوٹیوں کے بارے میں بے نیازانہ

ہے۔ سونا بنانے والے کیمیاگروں کے نزدیک ان کی حیثیت سونے چاندی جیسی ہوگی۔ مگر مجھے اُن سے کوئی غرض نہیں۔

آتش کا یہ شعر بھی سابقہ شعر سے معنوی طور پر مربوط ہے۔ اس کا مرکزی خیال بھی یہی ہے کہ فقیر منش لوگ دنیا کی دولت اور دولت پیدا کرنے والے ذرائع سے بے نیاز ہوتے ہیں، وہ انہیں حاصل کرنے کی قدرت رکھتے ہوئے بھی ان کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہیں دیکھتے۔

بقول کسے ؎ کئی خزانوں کے اسرار جانتا ہوں مگر
میں خالی ہاتھ ہواؤں کی طرح رہتا ہوں

شعر نمبر ۵

چشمِ معنی آشنا میں ہے مقام اُن کا وُہی
سہوِ کاتب سے مقدم ہوں مؤخر سینکڑوں

مشکل الفاظ چشمِ معنی آشنا: حقیقت جاننے والے لوگوں کی نظر میں، حقیقت شناسوں کے نزدیک؛ مقام: مرتبہ، اہمیت ٭ سہوِ کاتب: کاتب کی غلطی ٭ مقدم: پہلے، اعلیٰ ٭ مؤخر: پچھلا، بعد میں آنے والا ٭

تشریح آتش کہتے ہیں کہ حقیقت شناس لوگوں کے نزدیک اعلیٰ اور ادنیٰ، پہلے درجہ اور بعد والے درجہ کا فرق کبھی گڈمڈ نہیں ہوتا۔ اگر اتفاقیہ طور پر اس درجہ بندی میں فرق بھی پڑ جائے تو بھی ان کی حقیقت جاننے والی نظر اس فرق کو پہچان لیتی ہے۔ آتش نے سہوِ کتابت کے حوالے سے اپنی بات کی وضاحت کی ہے۔

جب کاتب حضرات کتابت کرتے ہیں تو کبھی کبھار ان سے بے سوچے سمجھے کوئی لفظ غلط لکھا جاتا ہے یا لکھنے میں لفظ آگے پیچھے لکھے جاتے ہیں۔ ہر تحریر میں ایسی چند غلطیاں کتابت کے معمول کا حصہ ہیں، بعد میں چھپائی سے قبل جب کتابت کو پڑھا جاتا ہے (جسے اصطلاح میں پروف ریڈنگ کہتے ہیں) تو عام طور پر ایسی غلطیوں کی نشاندہی کر کے انہیں درست کر دیا جاتا ہے۔ کاتب کی ایسی غلطی کو جو اتفاقیہ ہو جائے سہوِ کتابت یا سہوِ کاتب کہتے ہیں۔

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ پروف پڑھنے کے باوجود ایک آدھ غلطی رہ جاتی ہے اور وہ چھپائی میں بھی آجاتی ہے۔ آتش کہتے ہیں کہ حقیقت کی سمجھ رکھنے والی آنکھ (مراد عالم لوگ اور بصیرت والے حضرات) کتاب پڑھتے ہوئے اپنے طور پر اس غلطی کو بھانپ لیتی ہے اور سہوِ کاتب سمجھتے ہوئے نظر انداز کر دیتی ہے، لیکن بات کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ لیتی ہے۔ اگر کسی کتاب میں لکھا ہوا ہو کہ گدھا شیر سے بہادر جانور ہوتا ہے، تو سمجھ دار لوگ اپنے طور پر سمجھ جائیں گے کہ یہاں

سہوِ کتابت سے ایسا لکھا گیا ہے۔ اصل میں گدھا کے لفظ کی جگہ شیر لکھا جانا تھا اور شیر کی جگہ گدھا۔ مگر نادانستہ طور پر کاتب سے غلطی ہو گئی ہے۔ حقیقت شناس اور عالم لوگوں کی توجہ اس غلطی کی طرف نہ بھی دلائی جائے تو وہ عبارت کے مفہوم کے مطابق از خود اس غلطی کی درستی کر لیں گے، اور صحیح مفہوم تک پہنچ جائیں گے۔

آتش کہتے ہیں کہ اگر کتابت کی غلطی کی وجہ سے کوئی اعلیٰ چیز اور پہلے درجے کی چیز، آخری درجہ کی جگہ پر لکھی جائے، تو اس سے ان چیزوں یا اشخاص کے مقام و مرتبہ میں کوئی تبدیلی نہیں آ جاتی۔ صحیح تبدیلی تو اس وقت ہو گی جب ان اشیاء یا اشخاص کی خاصیتیں بدل جائیں، اعلیٰ ادنیٰ ہو جائے اور ادنیٰ اعلیٰ۔ صرف لکھنے سے چیزوں کا مقام و مرتبہ نہیں بدلتا۔ حقیقت شناس لوگ صرف لکھے ہوئے کا اعتبار نہیں کرتے، اُن کا ذاتی تجربہ لکھے ہوئے کی تصدیق یا تردید از خود کر جاتا ہے۔

اس شعر میں ایک لطیف سا طنز بھی ہے۔ بعض لوگ فنکاروں یا مشاعروں کے بارے میں لکھتے ہوئے کسی حسد اور تعصب یا حرص اور لالچ کے سبب انصاف سے کام نہیں لیتے اور اُن کی درجہ بندی کرتے ہوئے مقدم کو مؤخر اور مؤخر کو مقدم لکھ دیتے ہیں یعنی جس چیز کو پہلے لکھنا چاہیئے اس کا ذکر بعد میں کرتے ہیں، اور جس کا ذکر بعد میں کرنا چاہیئے اس کا ذکر پہلے کر دیتے ہیں۔ یہاں اگر یہ سہوِ کاتب نہیں، مصنف، مؤرخ، ناقد یا تذکرہ نگار کی علمی و فکری بد دیانتی کارفرما ہوتی ہے، مگر آتش کہتے ہیں کہ اہل علم اور اہل بصیرت مقام و مرتبہ کی اس تبدیلی کو از خود (سہوِ کاتب کی طرح محسوس کر کے) عبارت درست کر لیتے ہیں۔

آتش کے اس شعر کا مرکزی خیال یہ ہے کہ کم لکھے پڑھے قاری ممکن ہے سہوِ کاتب سے دھوکا کھا جائیں، حقیقت شناس غلط لکھے جانے کے باوجود مقدم اور مؤخر کے فرق اور مقام کو سمجھ جاتے ہیں۔

بقول کسے ؎ ظلمت کو سورج کہنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا
ظلمت ظلمت رہتی ہے اور سورج سورج رہتا ہے
رات اور دن میں فرق ہے کتنا جاننے والے جانتے ہیں
جھوٹا ہے جو کالی رات کو اِک اُجلا دن کہتا ہے

شعر نمبر ۲

جلوہ گر ہے حسن ہر جا عاشقوں کے واسطے
خوب صورت رکھتے ہیں یہ ہفت کشور سینکڑوں

مشکل الفاظ

جلوہ گر: جلوہ دکھانے والا ٭ ہفت کشور: سات سلطنتیں، مراد پوری دنیا

تشریح

آتش کہتے ہیں کہ حسن پرست اور جمال پسند عاشقوں کے نزدیک حسن و جمال کسی ایک

شخص، چہرے یا جگہ پر محدود نہیں ہوتا، خدائے حقیقی کے عاشق اس کے پرستار جگہ جگہ انوارِ الٰہی اور جمالِ خداوندی کی جھلک دیکھتے ہیں۔ بقول شخصے ؎ "جس جگہ بیٹھ گیا ہوں دیکھ لیتا ہوں" کہ ان لوگوں کے لئے مشاہدہ کی کوئی مخصوص جگہ اور وقت نہیں ہوتا۔ ان کے دل سے لے کر اردگرد کی پھیلی ہوئی دنیا تک ان کے نزدیک ہر چیز خدا کے حسن کا مظہر ہے اور ہر جگہ پر اُس کے نور کے جلوے لاکھوں کی تعداد میں پھیلے ہوئے ہیں۔

آتشؔ کہتے ہیں کہ اُن عاشقوں کی اپنی ایک علیحدہ دنیا ہے جو بہت خوبصورت ہے جہاں روشنی ہی روشنی ہے، نور ہی نور، رنگ ہی رنگ، حسن ہی حسن، جمال ہی جمال۔ یہ دنیا اس کرۂ ارض پر پھیلی ہوئی سلطنتوں سے کہیں زیادہ خوبصورت اور وسیع ہے۔

بقول کسے ؎

میری آنکھ میں ہے ایک حسن و خیر کی دنیا
دل کے صحن سے لیکر دہر کے کناروں تک

شعر نمبر ۷

دل دیا چاہے تو آتشؔ دلربا موجود ہیں
خوب تر سے خوب تر بہتر سے بہتر سینکڑوں

مشکل الفاظ

دلرُبا: دل لے جانے والا مراد خوبصورت ٭ خوب تر: بہتر، خوبصورت ٭

تشریح: اس شعر کو آتشؔ ہی کے حوالے سے دیکھتے ہیں۔ آتشؔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

؎ کسی کا ہو رہے آتشؔ کسی کو کر رکھے
دو روزہ زیست کو انساں نہ رائیگاں کاٹے

آتشؔ نے اس شعر میں انسانی زندگی میں محبت اور دوستی کی ضرورت و اہمیت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ زندگی میں کسی مسرت رعنائی اور سہارے کے لئے کسی کا ہو جانا یا کسی کو اپنا بنا لینا چاہیئے۔ زیرِ بحث غزل کے اس شعر میں آتشؔ نے اسی سے ملتی جلتی بات کہی ہے، وہ کہتے ہیں کہ آتشؔ اگر تم کسی کو دل دینا چاہو، مراد یہ کہ تم کسی سے محبت کرنا چاہو تو کر لو اس دنیا میں خوبصورت سے خوبصورت اور بہتر سے بہتر سینکڑوں دلربا اور خوبصورت لوگ موجود ہیں۔

آتشؔ کی مراد یہ ہے کہ دنیا حسن و خیر اور نور و نیکی سے بھری پڑی ہے۔ ہر طرح کی صفات اور خوبیاں رکھنے والے لوگ موجود ہیں۔ ظاہری طور پر اچھے لگنے والے اور اپنی سیرت و کردار کے حوالے سے بھی اعلیٰ اور خوبصورت لوگ۔ انسان اس وسیع دنیا اور اتنے لاکھوں لوگوں میں رہ کر یہ گلہ نہیں کر سکتا کہ اسے اپنی پسند کا کوئی دوست نہیں ملا۔ آتشؔ کہتے ہیں کہ ہر طرح کے لوگ موجود ہیں۔ شرط صرف یہ ہے کہ کوئی کسی کو چاہے، کسی کو دوست بنانے کی آرزو کرے۔

بقول کسے ؎
ہر ایک طرح کے اس کارواں میں رہرو ہیں
کسی کا ہاتھ پکڑ کر چلو، چلو تو سہی!

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

ہوائے دَورِ مئے خوشگوار راہ میں ہے
خزاں چمن سے ہے جاتی بہار راہ میں ہے

مشکل الفاظ
دَورِ مئے خوشگوار: خوش ذائقہ شراب کا دَور، مراد خوشی و مسرت کے لمحے +
راہ میں ہونا: قریب پہنچنے والا، آمد آمد ہونا +

تشریح
آتش کی یہ غزل نہ صرف ان کے کلام میں ایک منفرد لب و لہجہ رکھتی ہے بلکہ اردو کی معروف رجائی شاعری میں اس کا شمار ہوتا ہے۔ رجائی کا مطلب امید ہوتا ہے۔ یہ غزل ایک خوشگوار تاثر رکھتی ہے۔ پڑھنے والے کو امید اور حوصلہ دیتی ہے (جب کہ اردو شاعری کا بڑا حصہ غم اور مایوسی کے مضامین پر مشتمل ہے) یہی امید افزا لب و لہجہ اس غزل کی خوبی ہے۔

آتش کہتے ہیں خزاں کے دن رخصت ہو رہے ہیں بہار کی آمد آمد ہے۔ پت جھڑ کا موسم جا رہا ہے اور پھول رتوں کے قافلے باغ کے آس پاس پہنچ چکے ہیں اور کچھ ہی دنوں بعد ہم تک پہنچ جائیں گے۔ ہوا کی مہک بتا رہی ہے کہ کوئی بہت ہی خوشگوار دور آ رہا ہے۔ اچھے دنوں کے خمار سے لدی ہوا ابھی راستے میں ہے مگر اس کی مہک ہمیں ابھی سے محسوس ہو رہی ہے۔ مراد یہ کہ غم کی گھڑیاں کٹنے والی ہیں اور خوشی کی ساعتیں آنے والی ہیں۔

شعر نمبر ۲

عدم کے کوچ کی لازم ہے فکر ہستی میں
نہ کوئی شہر نہ کوئی دیار راہ میں ہے

مشکل الفاظ
عدم: زندگی کے بعد کی دنیا، فنا کا مقام + کوچ: روانگی +
ہستی: زندگی + دیار: شہر، علاقہ +

تشریح
آتش اس شعر میں بے ثباتیِ دنیا اور فکرِ آخرت کا مضمون بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان کو چاہیئے کہ وہ زندگی ہی میں آخرت کی فکر کرے۔ یہ دنیا حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث کے مطابق آخرت کی کھیتی ہے، یہاں انسان عملوں کی جیسی فصل بوئے گا آخرت میں اسی کے مطابق اجر کی کھیتی کاٹے گا۔ آتش کہتے ہیں یہاں انسان کو غفلت کے ساتھ زندگی نہیں گزارنا چاہیئے، اسے ہر پل کسی نہ کسی نیکی کے کام میں مصروف رہنا چاہیئے، تاکہ وہ

آخرت کے راستے کے لئے سامان جمع کر سکے۔ آخرت کا راستہ اور موت کا سفر ایک ایسا سفر ہے جس میں کہیں کوئی شہر یا آبادی نہیں آتی، زندگی سے موت کا مرحلہ ایک آن میں طے ہو جاتا ہے اور اس جانکنی کے عالم میں انسان کے پاس اتنی مہلت بھی نہیں ہوتی کہ وہ کوئی نیکی کا عمل کر سکے۔

دنیا کے سفروں میں تو انسان بسا اوقات گھر سے پورا سامان لے کر نہیں چلتا اور سوچتا ہے کہ میں یہ سامان راستے کی کسی آبادی یا شہر سے لے لوں گا لیکن فنا کی منزل کا سفر ایسا سفر ہے کہ اس کے راستے میں اور کوئی پڑاؤ نہیں آتا جہاں آدمی رک کر تازہ دم ہولے اور از سرِ نو اپنا سامانِ سفر درست کر لے، لہٰذا آدمی کو چاہیئے کہ زندگی ہی میں عدم کے سفر کی تیاری کرے اور اس تیاری سے غافل نہ رہے۔

بقولِ کسے ؎ گھر سے دہلیزِ فنا تک اک پڑاؤ بھی کہاں؟
یہ سفر وہ ہے کہ رستے میں کہیں رکنا نہیں

شعر نمبر ۳

نہ بدرقہ ہے نہ کوئی رفیق ساتھ اپنے
فقط عنایتِ پروردگار راہ میں ہے

مشکل الفاظ

بدرقہ: سواری یا قافلے کا نگہبان، محافظ، رہبر ✤ رفیق: ساتھی، ہمسفر ✤ عنایتِ پروردگار: خدا کا کرم ✤

تشریح

آتش پہلے شعر کے ساتھ ہی اپنا سلسلۂ مضمون جوڑتے ہوئے کہتے ہیں کہ فنا کے اس سفر میں اور موت کے اس راستے میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دیتا، ہر انسان کو یہ سفر تنہا ہی طے کرنا پڑتا ہے۔ دنیا کے سارے مادی سلسلے اور رابطے اس مسافت میں ساتھ چھوڑ جاتے ہیں، نہ کوئی سواری ہی انسان کے کام آتی ہے، نہ کوئی نگہبان اور محافظ۔ کسی کی رہبری کے بغیر انسان موت کے راستے پر نکلتا ہے۔ ہمارے پاس بھی سفر کے ساتھی اور محافظ نہیں، ایک خدا تعالیٰ کی عنایت اور مہربانی ہے جو اس سفر میں ہمارے شاملِ حال ہے۔ ہمارا یہ سفر صرف خدا کے بھروسے پر ہے، اسی کا کرم اور نوازش ہے جو راستے میں ہماری نگہبان اور محافظ ہے، ورنہ دنیا کے ساتھی تو پیچھے رہ گئے ہیں۔ بقول کسے ؎

ساتھی نہ کوئی رہبر اس راہ میں ساتھ اپنے ✤ اللہ کا سہارا ہے جس پر چلا جاتا ہوں

شعر نمبر ۴

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزار ہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہے

مشکل الفاظ مسافر نواز: مسافروں پر کرم والے لوگ۔ ان کی خبرگیری و ران کے راستے میں سہولتیں پیدا کرنے والے، سفر کے دوران میں ان کا خیال کرنے والے مقامی لوگ، ٭ بہتیرے: بہت سے ٭

تشریح دوسرے اور تیسرے شعر کے بعد آتش کے سلسلۂ خیال کا رُخ پھر امید افزا اور رجائی شاعری کی طرف مُڑتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو اس خیال سے سفر ترک نہیں کرنا چاہیئے کہ وہ اکیلا ہے اور راستے میں اُسے کسی تکلیف یا مصیبت کا سامنا نہ کرنا پڑے، وہ کہتے ہیں کہ آدمی کو خدا کے آسرے پر گھر سے نکل کھڑا ہونا چاہیئے، وہ اللہ کا نام لے کر ایک بار سفر پر روانہ ہو جائے اس کے بعد قدرت خود بخود مختلف مقامات پر اس کے لئے آسانیوں اور آسائشوں کے اسباب پیدا کرتی جاتی ہے۔ آدمی مسافر ہو جائے تو راستے میں مسافر نواز بہت سے مل جاتے ہیں جو مسافروں کی دیکھ بھال اور خبر گیری کرتے ہیں اور انسانی ہمدردی کے ناتے اُن سے محبت کرتے ہیں، اُن کی ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔

ایسے مسافر نواز لوگوں کو آتش سایہ دار درختوں سے تشبیہ دیتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ راستے میں ایسے ہزاروں سایہ دار درخت مل جاتے ہیں، جو دھوپ کے موسموں میں مسافروں پر چھاؤں چھڑکتے ہیں اور انہیں سکون اور آسائش فراہم کرتے ہیں۔

بقول کسے ؎

ہزاروں راحتیں رستے پہ تیری منتظر ہوں گی
نکل کر دیکھ گھر سے صرف اللہ کے سہارے پر

شعر نمبر ۵

مقام تک بھی ہم اپنے پہنچ ہی جائیں گے
خدا تو دوست ہے دشمن ہزار راہ میں ہے

مشکل الفاظ مقام: منزل ٭

تشریح آتش کہتے ہیں کہ اگر راستے میں ہزاروں دشمن بھی ہوں پھر بھی انسان کو اپنا سفر ترک نہیں کرنا چاہیئے، اس کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیئے کہ مہربان اور رحیم خدا ہر جگہ اور ہر راستے پر موجود ہے، صرف اس کی رحمت کا آسرا طلب کرنا چاہیئے، اگر وہ مہربان اور دوست ہے تو ہزاروں دشمن بھی انسان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں۔

آتش کہتے ہیں کہ اگرچہ راستہ دشمنوں سے بھرا پڑا ہے، مگر خدا تو ہمارے ساتھ ہے۔ اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ہم اپنی منزل تک نہ پہنچیں، مراد یہ ہے کہ اگر دنیا کے لوگ ہمارے مقاصد اور عزائم کے راستے میں رکاوٹ بھی ڈالنا چاہیں تو وہ ایسا نہیں کر سکیں گے، خدا کی مہربانی سے ہم اپنے

ارادوں میں ضرور کامیاب ہوں گے اور اپنی منزلِ مقصود حاصل کر کے رہیں گے۔

بقول کسے ؎

ہو بھرا شہر بھی دشمن تو مجھے کیا غم ہے
چاہیئے ساتھ مرے صرف خدا کی رحمت

شعر نمبر۶

تھکیں جو پاؤں تو چل، سر کے بل، نہ ٹھہر آتش
گُلِ مراد ہے منزل میں، خار راہ میں ہے

مشکل الفاظ گُلِ مراد: تمنا کے پھول ۰

تشریح یہ شعر آتش کے رجائی خیالات کا نقطۂ عروج ہے، چَل اور بَل کی صوت نے پہلے مصرع کو خوش آہنگ بنا دیا ہے، جو سننے والے پر ایک خوشگوار تاثر چھوڑتا ہے۔
آتش کہتے ہیں کہ سفر کو کسی جسمانی تھکن یا تکلیف کی وجہ سے بھی ترک نہیں کرنا چاہیئے، اے آتش اگر تیرے پاؤں چلتے چلتے تھک جائیں اُن پر آبلے پڑ جائیں اور وہ آگے نہ چل سکیں، پھر بھی نہیں رکنا چاہیئے، سر کے بل چلنا پڑے سفر مسلسل جاری رکھنا ہے۔ یہ سوچ کہ یہ راستہ کبھی تو ختم ہوگا۔ اگر راستے میں کانٹے ہی کانٹے ہیں تو کیا، منزل پر تو تمناؤں کے شگوفے چٹک رہے ہیں، خواہش کے پھول کھل رہے ہیں، مسرت بھری آرزوؤں سے لدی بہاریں انتظار کر رہی ہیں، جب راستے کے کانٹے تجھے تکلیف دیں تو منزل پر منتظر پھولوں کا سوچ کر ان کانٹوں کی چبھن نظر انداز کر دینا۔ اصل چیز منزل کا سُکھ ہے، راستے کا دُکھ نہیں، اختتام اچھا ہو تو آغاز کی تکلیفوں اور رکاوٹوں کا سوچ کر دل میلا نہیں کرتے۔

یہ شعر حوصلہ مندی کے انتہائی جذبوں کا عکاس ہے اور پڑھنے والوں کو ایک تازہ ولولہ سے آشنا کرتا ہے کہ نیکی اور خیر کی منزلوں کے راستے میں درپیش مسائل اور مصائب پر اپنی کوششوں اور سفر کو روکتے نہیں بلکہ روشن مستقبل کی امید پر تاریکیوں میں بھی سفر جاری رکھتے ہیں۔

بقول کسے ؎

مجھے خبر ہے کہ اک صبح منتظر ہے مری
ڈروں میں کس لئے اس رات کے اندھیرے سے

غزل نمبر۳

شعر نمبر۱

جگر کو داغ میں مانندِ لالہ کیا کرتا
لبالب اپنے لہو کا پیالہ کیا کرتا

مشکل نمبر۲ داغ کرنا: نشان لگانا، داغدار کرنا ۰ مانندِ لالہ: لالہ کے پھول کی مانند۰

لبالب : کناروں تک بھرا ہوا، لبریز ؎

تشریح آتش کہتے ہیں کہ اپنے لہو کے پیالے کو بھرنے سے مجھے کیا حاصل ہوتا تھا. بجز اس کے کہ لالہ کے پھول کی طرح میرے جگر پر بھی سیاہ نشان پڑ جاتے۔ اسی لئے میں نے اپنے لہو کے پیالہ کو ادھورا رکھا اور اسے لبریز نہ ہونے دیا ؎

آتش کے اس شعر سے مراد یہ ہے کہ اپنی خواہشوں اور تمناؤں کا اظہار انسان کے لئے نقصان دہ ہوتا ہے، اس لئے اسے کوشش کرنی چاہیئے کہ اپنی محبت اور عشق کی نمائش سے پرہیز کرے۔ لہو تمناؤں، خواہشوں اور امنگوں کی موجودگی کا عکاس ہے۔ لہو کا پیالہ جتنا بھرتا ہے، یہ آدمی کے اندر خون کے جوش مارنے اور اس کی اٹھان، حرارت، حرکت اور اس سے پیدا ہونے والے اثرات کی نشاندہی کرتا ہے۔ آتش لالہ کے پھول کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ وہ سارے کا سارا سرخ ہوتا ہے۔ جیسے خون سے بھرا ہوا یا لتھڑا ہوا ہو۔ اسی سبب اس کے اندر کہیں کہیں سیاہ رنگ کے چھوٹے چھوٹے نشان اور دھبے بھی ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ لالہ کے پھول کی تخلیق کے وقت سے ہوتے ہیں، مگر آتش حسن تعلیل سے کام لیتے ہوئے اس کا سبب لالہ کے لہو رنگ ہونے یعنی محبت میں شہید ہونے اور اس شہادت کی نمائش کو سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں اگر لالہ اپنے خون میں نہ نہاتا تو اس پر یہ سیاہ نشان بھی نہ پڑتے جو محبت میں محرومیوں، جدائیوں، پچھتاووں اور دکھوں کے سبب لگتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے لالہ کے پھول کا انجام دیکھتے ہوئے اپنی محبت کی نمود و نمائش اور اظہار سے پرہیز کیا اور اپنے جگر کو داغ دار ہونے سے بچا لیا۔ مجھے محبت کا نتیجہ سوائے اس کے کچھ نظر نہ آتا تھا کہ اگر میں نے اپنے لہو کے پیالہ کو پورا بھر لیا (مراد یہ کہ اپنی تمناؤں اور خواہشوں کی حرارت اور حرکت کو پوری طرح اظہار پذیر اور صورت پذیر ہونے دیا) تو میرے جگر کا حال بھی لالہ کے پھول کی طرح ہو گا۔

بقول کسے ؎

سوائے داغِ ندامت انہیں ملا ہی کیا
نہا گئے جو طلب کے لہو کے دریا میں

شعر نمبر ۲

ملا نہ سرو کو کچھ اپنی راستی میں پھل
کلاہ کج جو نہ کرتا تو لالہ کیا کرتا

مشکل الفاظ راستی: سیدھ، ٹیڑھے پن کے بغیر ؎ کلاہ: ٹوپی ؎ کج کرنا: ٹیڑھی کرنا، الٹانا ؎

تشریح اس شعر میں شاعر نے صنعتِ حسنِ تعلیل سے کام لیا ہے۔ حسنِ تعلیل کا مطلب کسی چیز کی کوئی ایسی شاعرانہ توجیہ، غرض یا سبب بیان کرنا ہے، جو اس کا حقیقی سبب تو نہ ہو

مگر شاعر بات میں حسن پیدا کرنے کے لئے یا اظہار کو خوبصورت بنانے کے لئے بیان کرے۔ سرو اور لالہ کی مثالیں دیتے ہوئے آتش کہتے ہیں کہ سرو کو اس دنیا میں راستی کا کیا پھل ملتا ہے؟ سرو چونکہ فطری طور پر سیدھا ہوتا ہے اور اٹھان میں دوسرے پودوں کی طرح سمتوں میں پھیلنے کی بجائے سیدھا اوپر کی طرف بڑھتا ہے۔ آتش اس کو راست روی سے تعبیر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ سرو کو اس کا پھل کیا ملتا ہے؟ سرو پر چونکہ کوئی پھل نہیں لگتا، آتش حسن تعلیل سے کام لیتے ہوئے سرو کے بے بار ہونے کی وجہ اس کی راستی (سیدھ میں چلنا یا بڑھنا) قرار دیتے ہیں۔ آتش کی مراد یہ ہے کہ اس دنیا میں راستی، سچائی اور نیکی کا کوئی پھل نہیں ملتا۔ سچ بولنے والے ہمیشہ تہی دست رہتے ہیں۔ سرو کے انجام کو دیکھ کر لالہ کے پھول نے اپنی ٹوپی کو اُلٹا دیا ہے۔ لالہ کا پھول ٹوپی کی مانند ہوتا ہے (لال رنگ کی مناسبت سے اس میں ترکی ٹوپی کا تلازمہ بھی شامل ہے) کلاہ کج کرنا نخوت اور تکبر کے مفہوم میں آتا ہے۔ بقول مصحفی ؎

نخوت سے جو کوئی پیش آیا ٭ کج اپنی کلاہ ہم نے کرلی

لالہ کے پھول کا رُخ فطرتاً نیچے کی طرف ہوتا ہے (زمیں کی طرف جھکے ہوئے لاؤڈ سپیکر یا گرجے کی گھنٹی کی طرح) آتش لالہ کے اس عمل کو بے نیازانہ کج کلاہی سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے غرور نخوت اور بانکپن سے کوئی اپنی کلاہ ٹیڑھی کرے۔ لالے کے پھول کا زمین کی طرف جھکی ہوئی ٹوپی کی طرح الٹے پیالہ کی مانند ہونا بے نیازانہ رویّہ کی علامت ہے۔ اور ظاہر کرتا ہے کہ وہ کچھ طلب کرنے کی بجائے جو کچھ اس کے پاس ہے اسے بھی زمین پر انڈیل رہا ہے۔

اس شعر پر اب تک کی گئی گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ سرو کی راست روی کے بے ثمر نتیجہ کو دیکھ کر لالہ کے پھول نے بھی بے نیازی سے اپنی کلاہ کج کرلی ہے کہ لالہ کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔

بقول کسے ؎

اب تک تو تہی دست رکھا راست روی نے
سوچا ہے اس عادت کو بدل کے ذرا دیکھیں
باقی کی سب اقدار تو افلاس زدہ تھیں
انداز اب آتے ہوئے کل کے ذرا دیکھیں

شعر نمبر ۳

نہ کرتی عقل اگر ہفت آسمان کی سیر
کوئی یہ سات ورق کا رسالہ کیا کرتا

مشکل الفاظ

ہفت آسمان: ساتوں آسمان مراد کل کائنات ٭

تشریح آتش نے آسمانوں کو اوراق سے تشبیہ دیتے ہوئے کائنات کو سات ورق کا رسالہ کہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ کائنات کا یہ رسالہ کسی قابل نہ ہوتا، اگر انسان کی عقل سات آسمان کی سیر نہ کرتی۔ عقلِ انسانی نے زمین، آسمان، خلا اور فطرت کی مختلف چیزوں کا مطالعہ اور مشاہدہ کیا ہے۔ جبھی کائنات کی اہمیت ظاہر ہوئی ہے۔ اگر انسانی تجسس کائنات کے اسرار کا کھوج نہ لگاتا، دلِ ذرّہ چیرنے سے لے کر ماہ و نجوم تک کو تسخیر نہ کرتا۔ تو کون اس کائنات کی گواہی دیتا؟

آتش کہتے ہیں کہ یہ انسانی بصیرت ہی کا کمال ہے کہ اس نے سات ورق کے رسالہ کی اہمیت کو اپنے مسلسل مطالعہ اور مشاہدہ سے ثابت کیا۔

بقول کسے ؎ کر ہی لی تسخیر میری وسعتِ پرواز نے

دیکھنے میں منزلِ ہفت آسماں اک خواب تھی

شعر نمبر ۴ کسی نے مول نہ پوچھا دلِ شکستہ کا

کوئی خرید کے ٹوٹا پیالہ کیا کرتا

مشکل الفاظ مول: قیمت ÷ دِل شکستہ: ٹوٹا ہوا دل مراد درد بھرا غم زدہ دِل ÷

تشریح میر کے رنگ کا یہ شعر آتش کی زیرِ بحث غزل کا سب سے اچھا شعر ہے۔ دردمندی، دلسوزی، جلنا کڑھنا، دوسروں کے دکھ درد بانٹنے کی شدید تڑپ اپنے اندر رکھنا، دوسروں کو مصیبت میں دیکھ کر بے چین اور بے قرار ہو جانا، محرومیوں اور پچھتاووں پر ملول رہنا۔ سب دلِ شکستہ کی خصوصیات ہیں۔ آتش کہتے ہیں کہ اب زمانے میں ایسے دل کی کوئی قیمت نہیں لگتی۔ اس کی ناقدری اور بے وقعتی کا یہ عالم ہے کہ اگر ایسے دلِ شکستہ کو بیچنے جائیں تو کوئی اس کا مول نہیں پوچھتا۔

دوسرے مصرع میں آتش ایسے دل کو ٹوٹے پیالے سے تشبیہ دے کر کہتے ہیں کہ جس طرح ٹوٹے ہوئے برتن کوئی نہیں خریدتا اسی طرح یہ ٹوٹا ہوا پیالہ بھی کسی کام کا نہیں۔ کوئی اس کو خرید کے کیا کرے گا۔

بقول میر تقی میر ؎ قدر رکھتی نہ تھی متاعِ دل

سارے عالم میں میں دکھا لایا

آتش کی اس شعر سے مراد یہ ہے کہ عجیب زمانہ آگیا ہے کہ دل کی شکستگی اور خستگی کبھی دل کی خوبی شمار ہوتی تھی، اب اس کی بے وقعتی کا سبب ہو گئی ہے۔

بقول کسے ؎ رنگ کے جھمیلوں میں کون اس کو دیکھے گا
درد مند دل لے کر کس جگہ پہ جاؤ گے؟

شعر نمبر ۵

جریدہ میں رہِ پُر خونِ عشق سے گزرا
جرس سے، قافلے میں بحث، نالہ کیا کرتا

مشکل الفاظ
جریدہ: مجرّد، اکیلا تنہا ٭ رہِ پُر خون: خون آلود ٭ جرس: گھنٹی ٭
قافلہ: کارواں ٭ نالہ: فریاد کی آواز ٭

تشریح
اس شعر کے دوسرے مصرع میں بحث اور نالہ میں وقفہ ہے۔ اس کی نثر یوں ہے کہ میرا نالہ قافلے میں جرس سے بحث کیا کرتا۔ (اس وضاحت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ طلبا اسے بحثِ نالہ نہ پڑھیں اور پھر اسی حوالے سے اس شعر کی تفہیم میں کوئی الجھن پیدا نہ ہو)

جرس اور نالہ میں فرق یہ ہے کہ جرس گھنٹی کی اس آواز کو کہتے ہیں جو قافلے کے کوچ اور روانگی کا اعلان ہے اور جب تک اس کی آواز آتی رہتی ہے، یہ قافلے کے چلتے رہنے کی علامت ہے۔ اس کے ساتھ کسی تنہا مسافر کے چلنے کا تصور ہی نہیں۔ یہ قافلے یا بہت سے لوگوں کے مل کر چلنے کے لئے استعمال ہوتی ہے۔ جب کہ اس کے برعکس نالہ، فریاد یا ماتم تنہا آدمی کی درد مندی اور دکھ کا اظہار ہے۔ بلند آوازیں دونوں کی ہیں، جرس کی بھی اور شاعر کے نالہ و فریاد کی بھی، مگر ان میں بڑا فرق ہے۔

آتش کہتے ہیں کہ قافلے والوں کی ہمراہی مجھے راس نہ آئی۔ ان کے قیام اور کوچ، اُن کی مصلحتوں کے سبب تھے۔ میرا نالہ میرے درد بھرے رویوں کی انفرادیت کے حوالے سے قافلے میں جرس کے ساتھ کیا بحث کرتا۔ جرس کو تو تمام راہیوں کو اپنے ساتھ لے کے آگے بڑھنا تھا۔ مگر میری بے صبری اور ماتم و فریاد کی شدت مجھے جلد از جلد سفرِ عشق طے کرنے پر زور دے رہی تھی۔ عشق و محبت کے جو خون آلود راستے سامنے تھے آخر کار میں تنہا ہی وہاں سے گزرا۔ میں جرس کی اہمیت کی بحث میں پڑا ہی نہیں۔ مجھے میرا نالہ ہی جرس تھا اور میری فریاد ہی جگر خون کر دینے والے سفرِ عشق میں میری ہم سفر تھی۔

شعر نمبر ۵

مہِ دو ہفتہ بھی ہوتا تو لطف تھا آتش
اکیلے پی کے شرابِ دو سالہ کیا کرتا

مشکل الفاظ مہ دو ہفتہ : دو ہفتوں کا چاند، مکمل چاند، چودھویں رات کا چاند، مراد محبوب ✤ شرابِ دو سالہ : دو سال کی رکھی ہوئی شراب، مراد پرانی شراب جسے نشہ کے اعتبار سے زیادہ مؤثر سمجھا جاتا ہے ✤

تشریح نشہ کا لطف، اسی وقت دو بالا ہوتا ہے، جب آدمی کے ساتھ کوئی پینے والا ہو۔ ساتھ اس کا کوئی ہم پیالہ و ہم نوالہ، ہم ذوق اور ہم مزاج ہو اور اگر کوئی خوبصورت محبوب ساتھ ہو تو میخواری کا لطف اور بھی بڑھ جاتا ہے۔ آتش کہتے ہیں کہ میں اکیلا مے نوشی کر سکتا تھا۔ مگر میں نے اس لئے نہیں کی کہ میرا چودھویں رات جیسا خوبصورت محبوب میرے ساتھ نہ تھا اگر وہ ساتھ ہوتا تو مے نوشی کا لطف بھی آتا۔

آتش کی مراد یہ ہے کہ عیش و عشرت اور خوشی و مسرّت کی محفلوں کا لطف بھی جبھی آتا ہے جب اچھے دوست ساتھ ہوں، اکیلے خوشی کی گھڑیاں بھی اُداس لگتی ہیں۔

بقول کسے ؎ وہ اگر ہمراہ ہوتا، سہل ہوتے راستے
طے نہیں ہوتا اکیلے زیست کا لمبا سفر

غزل نمبر ۴

شعر نمبر ۱

یہ آرزو تھی تجھے گُل کے رُوبرو کرتے
ہم اور بلبلِ بے تاب گفتگو کرتے

مشکل الفاظ گُل : پھُول ✤ رُوبرُو : سامنے، مقابل ✤ بے تاب : بے چین، بے قرار ✤

تشریح یہ آتش کی بڑی مشہور غزل ہے۔ آتش نے پہلے شعر میں ایک بڑا منفرد اور خوبصورت منظر پیش کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ عاشق محبوب کے ہاتھوں ہمیشہ دُکھی اور افسردہ رہتے ہیں۔ محبوب بے پروائی سے کام لیتے ہیں اور اپنے چاہنے والوں کے جذبات اور احساسات کی ذرا بھی پروا نہیں کرتے۔ کاش ایسا ہو سکتا کہ محبوب کو پھُول کے سامنے لے جاکے ہم اور بے قرار بلبل محبت کے راستے میں پیش آنے والے معاملات پر گفتگو کرتے۔

آتش محبوب کا عاشقِ زار ہے اور بلبل پھول پر فدا ہے۔ باہم مل کر بیٹھنے سے کچھ صورتِ حال کی وضاحت ہوگی۔ کچھ دل کا بوجھ ہلکا ہو گا کہ جہاں بھی محبت ہو معاملہ تو ایک جیسا ہی ہوتا ہے۔ عاشق بھی محبوب کے رویّے سے نالاں ہے اور اُس کی مستقل بے مہری اور دُوری سے افسردہ ہے اور بلبل بھی پھُول کی جدائی میں غمگین۔ شیخ سعدی کا ایک شعر ہے :

؎ بلبل تو اگر نالے من با تو ہم آوازم ✤ تو عشقِ گلے داری مَن عشقِ گُل اندامے

(بلبل تو اگر رو رہا ہے تو میں بھی تیرے ساتھ ہم آواز ہوں (ہمارا درد مشترک ہے) تو پھول سے عشق کرتا ہے اور میں پھول جیسے سے۔) (مراد کسی خوبصورت شخص سے ہے) اردو کا ایک مشہور شعر کچھ اسی مضمون کا ہے:

؎ آ عندلیب مل کے کریں آہ و زاریاں ٭ تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

یہاں محبوب کی بجائے دل کو محبت کی خانہ خرابی اور ساری مصیبتوں کا سبب قرار دیا گیا ہے، کہ نہ یہ محبوب کو پسند کرتا نہ ہم محبت کی ان اذیتوں اور رسوائیوں سے گزرتے۔ لہٰذا دِل کو کوسا جا رہا ہے اور اس پر ماتم کیا جا رہا ہے۔

اس شعر کا لطیف پہلو ہم تجربہ افراد کو اکٹھے کر کے درپیش مسائل و معاملات پر گفتگو کی تمنا ہے۔ ایسا ہو نہیں رہا اور نہ ہی شاید ممکن ہو لیکن آتش کی ایک خواہش ہے، جس کا اظہار انہوں نے اس شعر میں کیا ہے۔ اردو شاعری میں شائد یہ بات پہلی بار کی جا رہی ہے، یہی وجہ ہے کہ اس کے اندر ایک منفرد خیال اور تازہ احساس پایا جاتا ہے۔

اس شعر کے دوسرے معنی، اپنے محبوب کے حسن و جمال کی برتری ثابت کرنا ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ بلبل پھول کو حسین سمجھتا ہے اور ہم اپنے محبوب کو، اپنے اپنے طور پر دونوں دلائل دے رہے ہیں اور اپنے اپنے محبوب کے حسن و جمال کے قصیدے پڑھ رہے ہیں۔ اس طرح گفتگو کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہی اور کوئی دوسرے کی بات نہیں مان رہا۔ اب یہی صورت ہے کہ دونوں کو کسی جگہ اکٹھا کیا جائے۔ پھر میں بلبل سے پوچھوں کہ میرا محبوب خوبصورت ہے یا تمہارا؟

اردو شاعری میں اس انداز کے دو اور شعر یہاں درج کئے جاتے ہیں، جہاں مقابلۂ حسن اور اظہارِ برتریِ حسن محبوب، کی ایسی ہی حالت کا بیان ہے:

؎ فلک ہے تو ہی بتا دے کہ حسن و خوبی میں ٭ زیادہ تر ہے ترا چاند یا ہمارا چاند

دوسرا شعر داغ کا ہے۔ محبوب از خود اپنے حسن کی برتری ثابت کر کے گھمنڈ میں مصروف ہے۔

؎ رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں ٭ اُدھر جاتا ہے یا دیکھیں اِدھر پروانہ آتا ہے

خلاصہ یہ ہے کہ مصائب کی ہم رنگی کا بیان ہو یا محبوب کے جمال کی برتری کا اظہار، فیصلہ سرِ میدان اور مقابلے ہی سے ہوتا ہے۔ بقول کسے:

؎ خورشید کہ مہتاب کہ گل کون ہے اس سا ٭ جو اس سے حسیں ہے سرِ میدان نکل آئے

شعر نمبر ۲

پیام بر نہ میسّر ہوُا تو خوب ہوُا
زبانِ غیر سے کیا شرح آرزو کرتے

مشکل الفاظ پیام بر: قاصد، پیغام لے جانے والا ÷ زبانِ غیر: کسی اور کی زبان سے ÷ شرحِ آرزو: تمنائی تفصیل اور وضاحت ÷

تشریح آتشؔ کہتے ہیں کہ محبت کے پیغام انسان اپنی زبان سے ہی محبوب تک پہنچائے تو اچھا ہے۔ کوئی دوسرا شخص صحیح طور پر کسی عاشق کی تمنا کی وضاحت نہیں کر سکتا اور نہ اس کے جذبات و احساسات کی ترجمانی کا فریضہ سرانجام دے سکتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ عام لوگ اس بات پر افسردہ ہوتے ہیں کہ انہیں کوئی ایسا شخص نہیں ملتا، جو ان کا پیغام محبوب تک لے جائے۔ مگر ہم اس صورت حال سے مطمئن ہیں کہ ہمیں کوئی قاصد یا پیغام لے جانے والا نہیں ملا۔ جب کوئی صحیح طور پر ہماری خواہشات، احساسات، اور ان کی پوری تفصیلات ہی نہیں بتا سکتا تو پھر کسی پیغام بر کا کیا فائدہ؟ اور دوسری بات یہ کہ محبت میں بہت سے جذبات و خیالات ہوتے ہیں جو بہت ہی نازک نوعیت اور بہت ہی نجی اور ذاتی سطح کے ہوتے ہیں، آدمی آپ تو محبوب سے اُن کا اظہار کر سکتا ہے کسی اجنبی یا غیر کی زبان سے محبوب تک ان باتوں کو پہنچانا محبت کی حرمت، رازداری، شرم اور وضع کے خلاف ہے، لہٰذا یہ اچھا ہی ہوا کہ ہمیں کوئی شخص ایسا نہ مل سکا جو محبوب تک نامہ و پیام لے جا سکتا۔ بقول کسے ؎

کہیں وہ آپ مل جاتا تو اس سے اپنا دُکھ کہتے
کہا جاتا نہیں ہے حالِ دل خط کی زبانی بھی

شعر نمبر ۳

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی یہ بھی ہیں جستجو کرتے

مشکل الفاظ حبیب: ساتھی، محبوب ÷ مہ و مہر: چاند سورج ÷ جستجو: تلاش ÷

تشریح آتشؔ کہتے ہیں کہ آوارگی اور دربدری محبت کا ضروری حصہ ہے، جب انسان کے اندر عشق کا جذبہ بیدار ہوتا ہے تو وہ کسی محبوب کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتا ہے اور جب وہ اسے نظر آجاتا ہے تو پھر اس کو حاصل کرنے کے لئے دربدر پھرتا ہے۔ وہ چاند اور سورج کی مسلسل گردشوں کو دیکھ کر خیال کرتا ہے کہ یہ جو رات دن میری ہی طرح چکر اور گردش میں رہتے ہیں یہ بھی ضرور اپنے کسی بچھڑے ہوئے دوست اور ساتھی کو تلاش کر رہے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو یہ شبانہ روز آوارگی پہ کیوں مائل ہوتے، کسی شاعر کا شعر ہے: ؎

یہ بے جواز نہیں مہر و ماہ کی گردش
کسی کی چاہ انہیں در بدر پھراتی ہے

شعر نمبر ۴

ہمیشہ میں نے گریباں کو چاک چاک کیا
تمام عمر رفوگر رہے رفو کرتے

مشکل الفاظ

چاک کرنا : پھاڑنا ÷ رفو کرنا : ادھڑے اور پھٹے ہوئے کپڑوں کی مرمت کرنا ÷
رفوگر : رفو کا کام کرنے والا ÷

تشریح

اردو کی کلاسیکی شاعری میں اس انداز کے سینکڑوں شعر مل جائیں گے جن میں شاعروں اور عاشقوں کے گریبان چاک کرنے کا ذکر ملتا ہے۔ محبّت کی شدّت میں جب جنون اور دیوانگی کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو عام طور پر عاشق اپنا گریبان چاک کر کے جنگلوں کی طرف نکل جاتا ہے۔

آتش کہتے ہیں کہ ہم ایک بار اپنا گریبان چاک کرتے تو سینے والے اُسے سی کر رفو کے کام سے فارغ ہو جاتے۔ ہم نے تو عمر بھر اپنے گریبان کو چاک کیا۔ یوں رفوگروں کی جان بھی نہ چھوٹی۔ ہم جب جب گریبان چاک کرتے وہ اسے رفو کرتے رہتے۔ مصحفی کا ایک شعر ہے۔

ے مصحفی ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ہوگا کوئی زخم ÷ تیرے دل میں تو بہت کام رفو کا نکلا

مصحفی نے جو بات اپنے زخموں کے بارے میں کہی ہے، وہی بات آتش اپنے چاک گریبان کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

شعر نمبر ۵

جو دیکھتے تری زنجیرِ زلف کا عالم
اسیر ہونے کی آزاد آرزو کرتے

مشکل الفاظ

عالم : حال ÷ اسیر ہونا : قید ہونا ÷ آزاد : جو قید نہ ہو، مراد آزاد لوگ ÷

تشریح

آتش محبوب کے گھنگھریالے بالوں کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے کہ تیری زنجیر کی طرح خم دار زلفوں کا عالم اتنا خوبصورت تھا کہ وہ لوگ بھی جو تیری محبت میں گرفتار نہ تھے انہیں دیکھ کر تمہارے حسن کے قیدی بننے کی تمنا کرتے۔

آتش کہتے ہیں کہ اے محبوب، ہم تو تیری محبت میں گرفتار ہیں، وہ لوگ جو عشق و عاشقی سے آزاد ہیں اور اب تک کسی محبوب کی الفت میں اسیر نہیں ہوئے اگر وہ بھی تمہیں دیکھتے تو دل و جان سے یہ خواہش اور کوشش کرتے کہ کسی حیلے بہانے تمہارے حُسن کے غلام بن جائیں۔ فیض احمد فیض نے محبوب کے جمال کے بارے میں اس سے بھی آگے کی بات کی ہے؛ کہتے ہیں :-

ؔ وُہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی اُلفت مجھ سے
اک نظر تم مرا محبوب نظر تو دیکھو

آتش کے شعر کی مراد بھی اپنے محبوب کی خوبصورتی (خصوصاً زلفوں کی) کا اظہار ہے کہ اسے دیکھنے والا محبوب کے حسن کا قائل اور اس کی چاہت میں گرفتار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

بقول کسے ؔ ہر اک کے واسطے اس میں عجیب کشش سی تھی
جو دیکھتا اُسے اس کا اسیر ہو جاتا

شعر نمبر ۶

نہ پوچھ عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

مشکل الفاظ عالم: کیفیت، حالت، حال ٭ برگشتہ طالعی: قسمت کا اُلٹا ہونا۔ طالع کا مطلب مقدر ہوتا ہے اور برگشتہ کا مطلب الٹا مراد بدبختی، بدقسمتی ٭

باراں: بارش ٭

تشریح ہماری شاعری میں اکثر شعروں میں شاعر اپنی بدقسمتی کا رونا روتے نظر آتے ہیں وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ان سے زیادہ بدقسمت انسان دنیا میں کوئی نہیں۔ زندگی بھر تو قسمت انہیں ستاتی رہی ہے، مرنے کے بعد بھی مقدر کی سختی اُن کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ بقول ایک شاعر کے:

ؔ مقدر میں جو سختی تھی وہ مر کر بھی نہیں نکلی
لحد کھودی گئی میری تو پتھریلی زمیں نکلی

آتش بھی اپنی قسمت کا رونا روتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اپنے مقدر کے بارے میں کیا کہوں۔ ہمارا مقدر ہی اُلٹا ہے۔ یعنی ہر عمل ہماری خواہش اور آرزو کے خلاف اور برعکس ہوتا ہے۔ ہم سکھ چاہتے ہیں مگر ہمیں دُکھ ملتے ہیں۔ آرام طلب کرتے ہیں تو بے چینی ہمارا مقدر بن جاتی ہے۔ اگر کبھی گرمی کی شدت سے گھبرا کر بارش کی دعا یا آرزو کرتے ہیں تو آسماں سے پانی کی جگہ آگ برسنے لگتی ہے۔ اپنے مقدر کی اس اُلٹی کیفیت اور حالت کا ذکر کس سے کریں؟ سب کچھ ہماری آرزوؤں کے برعکس ہو رہا ہے۔

محمد ابراہیم ذوقؔ

(۱۷۸۹ء — ۱۸۵۴ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱:

موت ہی سے اب علاجِ دردِ فرقت ہو تو ہو
غسلِ میت ہی ہمارا غسلِ صحت ہو تو ہو

مشکل الفاظ فرقت۔ جدائی، ہجر۔ غسلِ میت۔ دفن کرنے سے پہلے مُردہ کو جو غسل دیا جاتا ہے اسے غسلِ میت کہتے ہیں۔ غسلِ صحت۔ بیمار تندرست ہونے پر جو غسل کرتا ہے اسے غسلِ صحت کہا جاتا ہے۔ عام طور پر بعض بیماریوں خصوصاً بخار وغیرہ میں بیمار کا نہانا خطرناک ہو سکتا ہے اس لئے بیمار معمول کا غسل ترک کر دیتا ہے اور مکمل طور پر صحتیاب ہونے پر ہی نہاتا ہے، اسے غسلِ صحت کہتے ہیں اور اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اب مریض بیماری کی حالت سے نکل کر معمول کے فرائض سرانجام دینے کے قابل ہو گیا ہے۔

تشریح ذوقؔ کا یہ شعر محبت کی راہ میں ملنے والی مصیبتوں اور غموں سے پیدا ہونے والی مایوسی کی انتہائی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے۔ محبوب سے مسلسل دوری کے سبب عاشق ایک جان لیوا درد میں مبتلا ہے۔ دنیا بھر کے علاج اس کے درد کو دُور کرنے سے قاصر ہیں۔ ہجر اور فراق کے ماروں کا علاج محبوب کے دیدار اور وصال کے علاوہ اور کسی چیز سے بھی کیا سکتا ہے۔ بقول شاعر؎

از سرِ بالینِ من برخیز اے ناداں طبیب
دردمندے عشق را دارو بجز دیدار نیست

(اے ناداں طبیب، میرے سرہانے سے اُٹھ جا عشق کے دردمند کا علاج دیدار کے سوا کچھ نہیں) اور یہاں صورت حال یہ نظر آتی ہے کہ محبوب کے ملنے کی دُور دُور تک کوئی توقع نہیں۔ طویل فراق اور مسلسل دوری کی اذیت بڑھتی جا رہی ہے۔ شاعر کہتا ہے کہ اب یہ اذیت ناقابل برداشت ہو گئی ہے۔ جدائی کے اس درد اور ہجر کی اذیت کا علاج اب موت سے ہی ممکن ہے۔ ذوقؔ کہتے ہیں کہ موت ہی اس بے قراری اور اضطراب کو سکون دے گی۔ یوں یہ جو عرصے سے توقع تھی کہ محبوب کے آنے پر ہمارے دُکھ اور درد ختم ہوں گے، اسکے آنے سے جدائی کی جان لیوا اذیت کا خاتمہ ہو جائے گا اور ہماری گرتی ہوئی حالت سنبھلے گی اور ہم اس بیماری کی حالت اور مریضانہ کیفیت سے باہر آجائیں گے۔ یعنی اپنی صحت کا غسل کریں گے، اب یہ سب کچھ ممکن نظر نہیں آتا۔ مایوسی اس قدر بڑھ گئی ہے کہ اب غسل محبت کا دن آتا نظر نہیں آتا۔

جب جدائی اپنا آخری وار کرکے عنقریب ہمیں موت کے گھاٹ اتار دے گی تو لوگ ہماری میّت کو دفن کرنے سے پہلے غسل دیں گے۔ یہ آخری غسل ہی ہمارا غسلِ صحت ہوگا یعنی ہماری تقدیر میں صحت و تندرستی تو نہیں، موت ہی رہ گئی ہے اور اسکی وجہ محبوب کی طویل جدائی ہے۔ بقول کسے

علیل تھا میں جدائی کے زرد موسم کا
وہ مل گیا تو شفا مل گئی، نہیں تو نہیں

شعر نمبر ۲

ہو تو ہو آباد دیکھوں کہ یہ خراب آبادِ دل
عشقِ غارت گر اگر دنیا سے رخصت ہو تو ہو

مشکل الفاظ

خراب آباد۔ خرابی سے آباد، خرابی سے پُر، تباہ شدہ گھر، کھنڈر۔ خرابہ
غارت گر: تباہ کرنے والا، غارت کرنے والا۔

تشریح

ذوقؔ کہتے ہیں کہ یہ عاشق لوگ دنیا کی تباہی کا باعث ہیں۔ ان کی موجودگی میں فتنہ و فساد برپا ہوتا ہے۔ معاشرے میں خرابی اور بگاڑ کی صورت پیدا ہوتی ہے۔ حُسن کو دیکھ کر عاشقانہ طبیعتیں مچلتی ہیں۔ ان کے جذبات مشتعل ہوتے ہیں اور وہ ماحول میں تباہی کا باعث بنتے ہیں۔ ذوقؔ کہتے ہیں کہ اس تباہی اور بربادی کو روکنے کا ایک ہی طریقہ ہے اور وہ یہ کہ اس برباد کرنے والے عشق کو ہی تباہ کر دیا جائے۔ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، یعنی نہ یہ فسادی جذبہ ہوگا، نہ ہی دنیا میں خرابی کے امکانات باقی رہیں گے ورنہ اس کی موجودگی میں دل کا خرابہ کبھی آباد نہ ہو سکے گا۔ دل میں ہمیشہ محرومیوں کی دھول اڑے گی مصیبتوں کے بادل چھائے رہیں گے، دکھوں اور غموں کے سبب ہمیشہ خستگی اور شکستگی کی حالت رہے گی دل کے کھنڈر کو آباد کرنے کے لئے عشقِ غارت گر کو غارت کرنا بہت ضروری ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرعے کا آغاز اور دوسرے کا اختتام ایک ہی طرح سے یعنی "ہو تو ہو" کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ اسی طرح پہلے مصرعے میں "آباد" کا لفظ اور دوسرے مصرعے میں "غارت" کا لفظ دو بار استعمال ہوا ہے۔ اس استعمال سے ذوقؔ کی صناعی کا اظہار تو ہوتا ہے مگر شعر تاثیر سے عاری ہو گیا ہے۔ ذوقؔ کا مطلب صرف یہ ہے کہ عشق یا دل کے ہوتے، سکون، چین اور امن نہیں۔ یہ نہ ہو ہر طرح عافیت ہے۔

بقول کسے

عذاب سب دلِ وحشی کی نسبتوں سے تھے
نہ ہوتا یہ تو ہر اک طرح عافیت ہوتی

شعر: ۳

دستِ بخشش سے ہے بالا آدمی کا مرتبہ
پست ہمت یہ نہ ہووے پست قامت ہو تو ہو

مشکل الفاظ دستِ بخشش - بخشنے والا ہاتھ، سخاوت کرنیوالا ہاتھ - بالا - بلند اعلیٰ - پست ہمت کم ہمت - تنگ دل - کم حوصلہ - پست قامت - چھوٹے قد والا

تشریح ذوقؔ اس شعر میں ایک حکیمانہ بات کہتے ہیں کہ سخاوت سے آدمی کا مرتبہ بلند ہوتا ہے اسکے قد سے نہیں - وہ جتنا کھلے ہاتھ کا ہوگا، غریبوں اور مستحق لوگوں کی مدد اپنے مال سے کرے گا، اللہ کی راہ میں اپنی دولت خرچ کرے گا، وہ اللہ کی نظر میں اور اللہ کی مخلوق کی نظر میں اتنا ہی زیادہ بلند مرتبہ اور محبوب ہوگا - اس کا قد یعنی اس کی ظاہری شکل خواہ کیسی ہی ہو، آدمیت کا اصل جوہر اور انسان کی صحیح شان، اس کی سخاوت کی عادت میں ہے - چھوٹے قد والا آدمی جو کھلے دل سے اللہ کی راہ میں سخاوت کرتا ہے، اس لمبے قد والے آدمی سے بہتر ہے جو کم حوصلہ اور تنگ دل ہے - ذوقؔ کہتے ہیں کہ آدمی چاہے پست قامت ہو مگر اسے پست ہمت یعنی کم حوصلہ (مراد کنجوس) اور تنگ دل نہیں ہونا چاہیئے - بقول کسے ؎

ہمیشہ دوسروں کے کام آنے کا ارادہ کر
بڑا بننا ہے تو دستِ سخا اپنا کشادہ کر

شعر نمبر ۴

اب زباں پر بھی نہیں آتا کہیں اُلفت کا نام
اگلے مکتوبوں میں کچھ اس سے کتابت ہو تو ہو

مشکل الفاظ الفت - محبت - مکتوبوں - مکتوب کی جمع، امراد خط، تحریر - کتابت - تحریر، لکھائی

تشریح ذوقؔ اس شعر میں کچھ ایسی ہی بات کہتے ہیں جو میر تقی میرؔ نے ایک جگہ کہی ہے ؎

اس عہد میں الٰہی محبت کو کیا ہوا
چھوڑا وفا کو ان نے مروّت کو کیا ہوا

یعنی آجکل دنیا سے محبت اٹھ گئی ہے اور تو اور انہوں (محبوب) نے مروّت تک کو چھوڑ دیا ہے - اب منہ دیکھنے کی محبت بھی نہیں رہی - ذوقؔ کہتے ہیں کہ ہم مہر و محبت کا لفظ تو سنتے آئے ہیں پرانی تحریروں، قصہ کہانیوں میں کہیں اس کا ذکر ہو تو ہو، آجکل تو کہیں الفت کا نام تک نہیں ملتا - یہ کیفیت بھی مسلسل وفا کرنے کے جواب میں محبوب کی بے وفائی اور بے ادائی سے پیدا ہوئی ہے - ہر وہ شخص جو کسی سے ٹوٹ کر محبت کرتا ہے، جواب میں بھی محبت کے جذبات چاہتا ہے، لیکن اگر ایک آدمی زندگی بھر کسی کو پیار کرے، اسے عقیدت و احترام کے ساتھ ملے مگر اس کے جواب میں اس کا مذاق اڑایا جائے، اس کے جذبات کا خیال نہ رکھا جائے تو وہ دنیا بھر کے بارے میں مایوسانہ رویہ اختیار کر لیتا ہے - ذوقؔ بھی اس شعر میں ایسی ہی کیفیت بیان کر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ زمانہ وفا اور محبت سے خالی ہو گیا ہے - اب اس دنیا میں کہیں وفا کا نام تک نہیں

ملتا ۔ لوگوں کے رویوں سے مروت و شفقت کا اظہار کیا ہوتا تھا، ان کے ہونٹوں سے کبھی الفت کا ذکر نہیں سنا ۔ یوں لگتا ہے وہ اس کے نام سے بھی آشنا نہیں رہے ۔ ہاں کہیں پرانے نوشتوں، قصہ کہانیوں، تحریروں، داستانوں میں یہ لفظ آیا ہو تو ہو ۔ مرادیہ کہ اچھے رویوں، قدروں (مہر، محبت، الفت، وفا وغیرہ) کے لفظ پرانی لغتوں ہی میں ہیں ۔ عام بول چال، تعلقات اور معاملات میں ان کی جھلک نہیں ملتی ۔

شعر نمبر ۵

آگ میں جل مرتا ہے پروانہ سا کرمِ ضعیف
آدمی سے کیا نہ ہو لیکن محبت ہو تو ہو

مشکل الفاظ

پروانہ ۔ پتنگا ۔ کرمِ ضعیف ۔ کمزور اور حقیر کیڑا ۔

تشریح

ذوقؔ محبت کی کرشمہ سازیوں اور عشق کی قوت و طاقت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر کسی چیز میں محبت کا جذبہ پیدا ہو جائے تو وہ حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے دیتا ہے ۔ انہوں نے پروانے کی مثال دیتے ہوئے کہا ہے وہ بظاہر ایک حقیر سا کیڑا ہے اس کا پورا وجود اور متاعِ حیات ایک چٹکی سے بھی کم ہے، اس کے باوجود شمع کی محبت میں وہ اپنی جان قربان کر دیتا ہے ۔ اس قربانی میں اس پر کوئی خارجی دباؤ نہیں ۔ شمع حسن رکھتے ہوئے بھی ساکت و جامد ہے اور پروانے کو جان وارنے پر مجبور نہیں کر سکتی ۔ پروانہ از خود اپنی محبت کے زیرِ اثر شمع کے حضور نذرانہ پیش کرتا ہے اور آگ میں جل مرتا ہے ۔ ذوقؔ کے خیال میں یہ ایثار، قربانی اور جان نذر کرنے کا سلیقہ محبت ہی کی عطا ہے، عشق ہی کے سبب ممکن ہے ۔

اس مثال کے بعد دوسرے مصرع میں اسی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ عشق و محبت کا یہ جذبہ آدمی کے اندر پیدا ہو جائے تو وہ جانے کیا کیا کر ڈالے ۔ کیا کیا کی تفصیل علامہ اقبال کے کلام میں آسانی کے ساتھ دیکھی جا سکتی ہے جنہوں نے اس موضوع پر بہت کچھ کہا ہے ۔ حضرت علامہ کہتے ہیں کہ عشق ایک ایسی قوت ہے جس سے انسان پوری کائنات کو تسخیر کر سکتا ہے ۔ یہ شعر دیکھئے

عشق کی اک جست نے طے کر دیا قصہ تمام
اس زمین و آسماں کو بے کراں سمجھا تھا میں

وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بے خطر آتشِ نمرود میں کود جانے کو بھی عشق ہی کا ایک مظہر سمجھتے ہیں اور بدر و حنین کے معرکے اور امام حسین رضؓ کے صبر اور بے مثال قربانی کو بھی عشق کا ہی نتیجہ سمجھتے ہیں ۔ ذوقؔ کے اس شعر میں آدمی کے معرکوں اور کارناموں کے لئے عشق کی قوت اور اہمیت پر زور دیا گیا ہے ۔ "محبت ہو تو ہو" کو اگر ان معنوں میں لیا جائے کہ دوسرے میں محبت تو ہو، کسی دوسرے کو بھی تو محبت ہو! تو اس شعر کا مفہوم قدرے مختلف ہو جاتا ہے اور وہ یوں

کہ شمع اور پروانے میں تو محبت ہے کہ پروانے کے جل جانے کے بعد شمع خود بھی پگھل کر ختم ہو جاتی ہے۔ اگر پروانے جیسا حقیر کیڑا شمع کی محبت کے جواب میں اپنی جان تک دے سکتا ہے تو آدمی کیا کچھ نہیں کر سکتا۔ ہم اس صورت میں بھی تم سے اتنی محبت کرتے ہیں لیکن اگر تمہارے اندر بھی ہمارے لئے محبت پیدا ہو جائے تو جانے ہم کیا کچھ کر گزریں۔

شعر نمبر ۶

تلخ کامی میں ہی گزری زندگانی عمر بھر
جانِ شیریں کے دیے سے کچھ حلاوت ہو تو ہو

مشکل الفاظ تلخ کامی۔ حلق کا تلخ ہونا مراد کڑواہٹ۔ زندگانی۔ زندگی۔ جانِ شیریں عزیز اور پیاری زندگی جسے شیریں یعنی میٹھا کہا جاتا ہے۔ حلاوت۔ مٹھاس، شیرینی

تشریح ذوقؔ اس شعر میں عمر بھر کی ناکامیوں، محرومیوں اور محبت کے تجربوں سے پیدا ہونیوالی مایوسیوں اور تلخیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہماری زندگی تو تلخ گزری، ہمیں کوئی خوشی، مسرت اور لذت نہ ملی، عمر بھر ہم دکھوں اور مصیبتوں میں گھرے رہے، رنج و غم کے ذائقے نے ہمارے حلق کڑوے کر دیئے، زندگی کے تجربات نے کوئی خوش ذائقہ اور خوشگوار تاثر نہ دیا۔ اب جب کہ زندگی کا سفر ختم ہونے کے قریب ہے، اب شاید اپنی عزیز اور پیاری جان دینے سے ہی ہماری ذات اور ہمارا وجود کسی مٹھاس سے آشنا ہو۔

ذوقؔ کی مراد یہ ہے کہ زندگی بھر تو بے چین اور بے قرار رہے، اب مرنے پر شاید چین اور تسکین و راحت کی کوئی شکل پیدا ہو۔ ذوقؔ کا زمانہ چونکہ شعری صنعتوں اور لفظی رعایتوں کے ذریعے بات کرنے (مراد شعر کہنے) کا تھا اس لئے وہ بھی بہت سے دوسرے شاعروں کی طرح اپنے اکثر شعروں میں ان صنعتوں سے ضرور کام لیتے ہیں۔ یہاں بھی تلخ کامی اور جانِ شیریں کی رعایت لفظی سے اپنا مفہوم واضح کیا ہے اور مفہوم صرف یہ ہے کہ عمر بھر سب کچھ قربان کرنے کے بعد بھی کلفت اور تلخ کامی ہی ملی۔ اب ایک جانِ شیریں پاس رہ گئی ہے۔ اسے بھی محبوب کی رضا کے لئے یا زمانے کے حضور پیش کر دیتے ہیں، شائد جان دینے کے اس عمل ہی میں تسکین و راحت کا کوئی پہلو نکل آئے بقول کسے ؎

یوں جیتے رہے تو نہ کلی سکھ کی کھلے گی
اب جاں سے گزرنے ہی میں تسکین ملے گی

شعر نمبر ۷

رات اک بگڑی ہوئی تھی میکدے میں رہنِ مے
ذوقؔ یہ تیری ہی دستارِ فضیلت ہو تو ہو

مشکل الفاظ مے کدہ۔ شراب خانہ۔ رہن۔ گروی۔ رہنِ مے۔ کوئی چیز ضمانت کے

طور پر رکھ کر شراب پینا (اس سے نشہ کی شدید طلب ظاہر ہوتی ہے کہ روپے پیسے ختم ہونے کے بعد بھی آدمی مزید شراب کی طلب میں اس درجہ یا انتہا پر پہنچ جائے کہ اپنی کوئی چیز مے خانے کے مالک کے پاس ضمانتاً رکھوا کر اپنے نشے کی بڑھی ہوئی ضرورت کو پورا کرے)

دستارِ فضیلت ۔ عالم ہونے پر جو پگڑی باقاعدہ کسی استاد، مدرسے یا ادارے کی طرف سے پہنائی جاتی ہے، اسے دستارِ فضیلت کہتے ہیں ۔ یہ ایک طرح سے فارغ التحصیل (تعلیم کے بخیر و خوبی مکمل) ہونے کی علامت ہے ۔ اسے آجکل کی تعلیمی ڈگریوں کے حوالے سے سمجھا جا سکتا ہے جو کسی خاص کورس یا جماعت پاس کرنے کے بعد تعلیمی بورڈ یا یونیورسٹی کی طرف سے طالبعلم کو ملتی ہیں

تشریح

شراب و مے خانہ کے مضامین ہماری شاعری میں عام ملتے ہیں ۔ ان اشیاء کا زیادہ تر استعمال علامت کے طور پر ہوتا تھا اور شراب، مے خانہ، رند، جام، مینا، پیرِ مغاں، ساقی وغیرہ کے الفاظ باقاعدہ علامتوں اور استعاروں کے طور پر رواج پذیر تھے ۔ ذوقؔ کا یہ شعر بھی اسی شعری روایت کا پیدا کردہ ہے ۔ اس میں جہاں ایک طرف شراب کی شدید طلب اور ضرورت کا ذکر ہے ۔ وہاں دوسری طرف علم و زہد کا مذاق اڑایا گیا ہے اور دستارِ فضیلت کو گروی (اور وہ بھی مے کے لئے) رکھ کر ان کا ذکر حقارت سے کیا گیا ہے ۔

ذوقؔ کہتے ہیں کہ رات جہاں نشے سے ٹوٹے ہوئے شرابیوں نے اور بہت کچھ گروی رکھ کر مے خانے میں اپنا شوقِ شراب نوشی پورا کیا وہاں رہن شدہ چیزوں میں کوئی مے خوار اپنی دستارِ فضیلت ہی دے گیا ہے ۔ اے ذوقؔ اور ایسا رند کون ہے جو یہ گستاخی کرنا اور علم و فضل کی علامت کو شراب جیسی چیز کے لئے گروی رکھنا ۔ یہ تیری ہی حرکت لگتی ہے ۔ تو شراب کی طلب میں یہاں تک چلا گیا ہوگا کہ تو نے اپنی علمی حیثیت اور مرتبہ و فضل کا خیال بھی نہ کیا ۔

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

ہفتاد و دو فریق، حسد کے عدد سے ہیں
اپنا ہے یہ طریق کہ باہر حسد سے ہیں

مشکل الفاظ

ہفتاد و دو فریق ۔ بہتر فرقے ۔ ہفتاد کا مطلب ستّر ہے، ہفتاد و دو کا مطلب ستر اور دو یعنی بہتر ۔ فریق سے مراد فرقے، علیحدہ مسلک رکھنے والے ۔ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک نشانی یہ بتائی جاتی ہے کہ مسلمان جنہیں ایک ملتِ واحدہ میں متفق اور متحد ہو کر رہنا چاہیئے، وہ مختلف ضمنی اعتقادات اور فروعی مسئلوں کے سبب بہتر فرقوں میں بٹ جائیں گے ۔ ان فرقوں کے الگ وجود میں آنے کی کوئی وجہ نہیں ہوگی ۔ ذرا ذرا سے اختلاف اور آپس کی ضد بازی اور نمائش

انہیں فرقہ در فرقہ کر دینگی اور ان فرقوں میں سے صرف ایک سیدھے راستے پر ہوگا باقی غلط اور گمراہ ہونگے - طرق ، اصول ، راستہ -

تشریح

ذوقؔ کا یہ شعر بھی ان کی صنعت گری کا نتیجہ ہے - اس میں انہوں نے علمِ اعداد کے حوالے سے بات کی ہے - عددوں کا علم ہماری شعری روایات میں شروع ہی سے معروف و مروّج رہا ہے - اس میں حرفوں کی الگ الگ عددی حیثیتوں کو جمع کر کے کسی واقعہ کی تاریخ نکالی جاتی ہے - اس میں الف کے لئے ایک ، ب کے لئے دو ، ج کے لئے تین اور د کے لئے چار عدد لئے جاتے ہیں - اس طرح ا سے ی تک پورے حروف تہجی کے اعداد ہوتے ہیں - ان کی عددی قیمت ا سے ی تک ترتیب وار بڑھتی نہیں بلکہ اس کے لئے حروف تہجی کو ایک اور اعتبار سے ترتیب دیا جاتا ہے جسے 'ابجد' کہتے ہیں - اس اعتبار سے ح کے ۸ س کے ٦۰ اور د کے ۴ عدد ہوتے ہیں یوں لفظ حسد کے عدد بہتر بنتے ہیں - بہتر ہی فرقے ہیں اور حسد کے عدد بھی بہتر ہیں ذوقؔ اس سے یہ نکتہ نکالتے ہیں کہ مسلمانوں میں یہ جو بہتر فرقے ہیں یہ سارے حسد کے عدد کی وجہ سے ہیں - گویا ان میں سے ہر ایک کا الگ وجود دوسرے سے حسد کی بنا پر ہے ، اس کی کوئی اصل حقیقت نہیں - ان فرقوں کی کثرت خواہ کتنی ہو ہم چونکہ حسد نہیں کرتے اس لئے ہم ان فرقوں سے باہر ہیں - ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں ، ہمارا طریقہ ، اصول اور روشِ محبت ، بھائی چارہ ، وسیع المشربی (ہر مسلک کے آدمی سے محبت کرنا) انسانیت نوازی اور انسان دوستی ہے - لہٰذا ہم اپنا ایک جداگانہ مسلک اور عقیدہ رکھتے ہیں - یہ جو حسد اور نفرت کی بنیاد پر لڑنے جھگڑنے والے فرقے ہیں ہمارا ان سے کوئی تعلق نہیں -

---

شعر نمبر ۲

خورشید وار دیکھتے ہیں سب کو ایک آنکھ
روشن ضمیر ملتے ہر اک نیک و بد سے ہیں

مشکل الفاظ

خورشید وار - سورج کی طرح - ایک آنکھ سے دیکھنا - عدل و انصاف برابری ، سب کو ایک جیسا سمجھنا -

تشریح

ذوقؔ نے اس شعر میں نیک طینت لوگوں کی ایک خوبی کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ اچھے بُرے سبھی لوگوں کو ایک انداز سے ملتے ہیں - کسی بُرے سے اس لئے نفرت نہیں کرتے کہ وہ گناہ گار ہے بلکہ اس سے بھی شفقت سے پیش آتے ہیں - ذوقؔ ان لوگوں کی مثال سورج سے دیتے ہیں کہ جس طرح سورج اپنی روشنی کی تقسیم میں اونچ نیچ ، نیکی بدی یا اچھائی برائی کے فرق کو ملحوظ نہیں رکھتا - اس کی روشنی ، گرمی اور کرنیں سب لوگوں کے لئے ہیں - وہ غریب کی جھونپڑی پر بھی ویسے ہی چمکتا ہے جیسے امیروں کے محلوں پر - سورج ہی کی طرح روشن طبیعت والے نیک لوگ کسی بُرے سے بھی نفرت نہیں کرتے - انہیں بھی اچھوں کی طرح ملتے ہیں

ان کا مزاج ہوا کی طرح عام ہوتا ہے اور بہتے پانی کی طرح محبت و شفقت کی سطح ہموار رکھتا ہے۔

شعر نمبر ۳

جان دادگانِ عشق سے پوچھو فنا کی راہ
اس میں جناب خضر ابھی نابلد سے ہیں

مشکل الفاظ جاں دادگانِ عشق: عشق میں جان قربان کرنے والے۔ محبت کے شہید۔ فنا: موت عدم۔ خضر۔ حضرت خضر علیہ السلام جن کے بارے میں روایت ہے کہ انہیں ہمیشہ کی زندگی حاصل ہے اور وہ بھولے بھٹکے لوگوں کی رہنمائی پر مامور ہیں۔ نابلد: ناواقف ناآشنا

تشریح ذوق کہتے ہیں کہ فنا کی منزل کا راستہ اگر پوچھنا چاہتے ہو تو ان لوگوں سے پوچھو جنہوں نے عشق کے راستے میں جانیں قربان کر دی ہیں، اس لئے کہ عشق اور فنا کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ عشق اختیار کرنا ایک اعتبار سے موت کو گلے لگانا ہے بقول میر ؎

قدم دشتِ محبت میں نہ رکھ میر
کہ سر جاتا ہے گامِ اولیں پر

یعنی اس راستے میں پہلے قدم پر ہی جان کا نذرانہ دینا پڑتا ہے۔

دوسرے مصرع میں جناب خضر علیہ السلام کے بارے میں طنز سے کہتے ہیں کہ اس راستے سے (مراد فنا کی منزل کے راستے سے) وہ بھی ناواقف ہیں۔ طنز میں لطیف پہلو یہ ہے کہ خضر علیہ السلام چونکہ حیاتِ جاوداں رکھتے ہیں۔ لہٰذا انہیں فنا کے ذائقہ اور لذت کا کیا پتہ؟ جس کسی کا واسطہ موت یا فنا سے پڑا ہی نہ ہو وہ کسی اور کو موت کے بارے میں کیا بتا سکتا ہے لہٰذا خضر علیہ السلام سے فنا کی راہ کا معلوم کرنا بے کار ہے۔ کیونکہ وہ اس حالت، کیفیت مرحلے اور منزل سے ناآشنا ہیں۔

طنز کا دوسرا لطیف رخ یہ ہے کہ خضر جو جہاں بھر میں بھولے بھٹکوں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ ایک راستہ ایسا بھی ہے جس سے وہ ناواقف ہیں۔ خضر کا کسی بھی راہ سے ناواقف ہونا، کسی منزل کی طرف رہنمائی نہ کر سکنا یہ خضر کے منصب و مرتبہ کا مذاق اڑانے کے مترادف ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ فنا کی راہ، موت کے بھید، کسی پر جان نثار کرنے کی لذت، شہادت کا ذائقہ۔ یہ سب ایسی حالتیں اور کیفیتیں ہیں کہ وہی ان سے باخبر ہیں جو ان حالتوں اور کیفیتوں سے کبھی گزرے ہیں۔ بقول کسے ؎

عجب سرور تھا اس جذبۂ شہادت کا
انہی کو علم ہے جو اس سے سرفراز ہوئے
ملی نہ خضر کو بھی کیفِ جاں وہی کی خبر
فنا ناآشنا کب آشنائے راز ہوئے

شعر نمبر ۴

جا ان لباسیوں کے نہ ظاہر لباس پر
عاری عبائے ہوش و قبائے خرد سے ہیں

مشکل الفاظ

لباسیوں۔ لباسی کی جمع، لباس پہننے والا۔ عاری۔ خالی، عریاں، محروم
عبائے ہوش۔ ہوش کا چوغہ۔ عقل کی پوشاک۔ قبائے خرد۔ عقل کی قبا

تشریح

عدم کا ایک شعر ہے۔ ؎

دیکھنے والے ہوش میں رہنا سب دھوکا ہی دھوکا ہے
جسم بڑے بدصورت ہیں ملبوس بڑے بھڑکیلے ہیں

ذوق نے بھی کچھ ایسی ہی بات کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے ظاہری لباس پر نہیں جانا چاہیئے، نہ ہی اس سے ان کی فضیلت اور رتبہ اور علمی مرتبہ کا اندازہ لگانا چاہیئے یہ ظاہر داری کرنے والے لوگ جو دیکھنے میں بڑے خوش لباس نظر آرہے ہیں ان کے اندر اتنے خوبصورت نہیں۔ وہ ہوش کی پوشاک اور عقل کی قبا سے محروم ہیں۔ ظاہری طور پر تو شان و شوکت والا لباس پہنتے ہیں لیکن دراصل ننگے ہیں۔ ان کے پاس وہ جذبۂ انسانیت اور شائستگی نہیں جو زندگی کے لئے ضروری ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ کہ انسان اپنے ظاہری لباس سے نہیں اپنی عقل سے اہم گردانا جاتا ہے۔ اگر وہ خوبصورت لباس پہن بھی لے مگر وہ عقل سے کورا ہو تو اہلِ نظر کی آنکھوں میں وہ بے لباس ہی رہے گا۔ انسان کا اصل لباس اس کی ہوشمندی اور عقل ہے۔ اگر کسی میں یہ صفات ہیں تو وہ قابلِ احترام ہے بصورتِ دیگر اس کی ظاہری پوشاک اور ٹیپ ٹاپ بے کار ہے۔ بقول کسے ؎

وہ جن کو بات بھی کرنے کا کچھ شعور نہیں
لباس میں بھی ہمیں بے لباس لگتے ہیں

شعر نمبر ۵

دل کے ورق پہ ثبت ہیں صد مہرِ داغِ عشق
ہم کرتے ذوقؔ عشق کا دعویٰ سند سے ہیں

مشکل الفاظ

ثبت ہونا۔ لکھا ہونا، نشان زد ہونا، مہر لگنا۔ سند۔ ثبوت، خاص کر تحریری۔

تشریح

ذوقؔ کہتے ہیں کہ کسی سند اور ثبوت کے بغیر دعویٰ بے کار ہوتا ہے۔ ہم جو عشق کا دعویٰ کرتے ہیں اور اس میدان میں اپنی کارگزاری اور جاں سپاری کا ذکر کرتے ہیں تو یہ یوں ہی بغیر کسی دعویٰ کے نہیں کرتے۔ ہماری لوحِ دل پر محبتوں میں ناکامیوں کے داغوں کی سینکڑوں مہریں لگی ہوئی ہیں۔ یہ داغ اور نشانات اس بات کا ثبوت ہیں کہ ہم نے محبتوں میں ناکامیوں کے

صدمے اٹھائے ہیں۔ دوسرے لوگ تو صرف دعویٰ ہی کرتے ہیں کہ ہمیں محبوب سے بڑی محبت ہے۔ یہ ہمیں ہیں جو زبانی اظہار کی بجائے اپنے وفاپیشہ کردار اور جاں نثارانہ رویوں سے عملی طور پر محبوب کی محبت کا اقرار کرتے ہیں۔ ہمارا اقرار، ثبوت اور سند یہی محبت کے داغ ہیں جو دل کے ورق پر سینکڑوں کی تعداد میں ہیں۔ بقول کسے ؎

داغ ہائے سینہ ہیں تیری محبت کے گواہ
گرچہ تیرے پیار پر اپنا کوئی دعوے نہیں

غزل نمبر ۳

شعر نمبر ۱

لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے
اپنی خوشی نہ آئے نہ اپنی خوشی چلے

مشکل الفاظ

حیات - زندگی - قضا - موت

تشریح

ذوقؔ اپنے اس معروف شعر میں صوفیوں کے جبری عقیدے اور خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ انسان دنیا میں مجبورِ محض ہے اس کا اپنی زندگی اور موت پر کوئی اختیار نہیں۔ نہ ہی وہ اپنی مرضی اور اختیار و ارادہ سے پیدا ہو سکتا ہے اور نہ ہی مر سکتا ہے۔ قدرت کی طرف سے انسان ان معاملات میں بے بس ہے۔ زندگی اسے اس کائنات میں لاتی ہے، وہ آجاتا ہے اور جب اسے اپنے ساتھ چلنے کا حکم دیتی ہے تو وہ خاموشی کے ساتھ اسکا حکم مانتے ہوئے اس کے ساتھ چلا جاتا ہے۔ وہ اس دنیا میں نہ اپنی خوشی کے ساتھ آتا ہے اور نہ ہی اپنی خوشی کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہوتا ہے۔

ذوقؔ کا یہ شعر ان کے بڑے معروف شعروں میں سے ہے۔ ان کی شعری صنعتوں اور لفظی رعایتوں سے بھرے کلام میں ایسے شعر بہت کم ہیں جو اپنی حقیقت پسندی اور سادہ طرزِ بیان کے سبب مؤثر ہوں۔ یہ شعر بھی ایسے متاثر کرنے والے شعروں میں سے ہے، اگرچہ اس میں بھی آنا اور چلنا (مراد جانا)، حیات اور قضا کے الفاظ نے صنعتِ تضاد کی سی فضا پیدا کر دی ہے مگر یہ عمل شعر کی تخلیق میں اس بے نام اور غیر محسوس طریقے سے ہوا ہے۔ کہ قاری کی فوری توجہ ادھر نہیں جاتی اور صنعتوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ ان کا استعمال ایسے فطری انداز میں ہو کہ تصنع اور بناوٹ کا شائبہ تک نہ گزرے۔

شعر کا دوسرا حُسن یہ ہے کہ یہ بھاری الفاظ و تراکیب سے بوجھل نہیں۔ مکالمے کے انداز میں

"لائی حیات، آئے، قضا لے چلی، چلے" اور "اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے" کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں مفہوم کو ایک دلنشیں ادائیگی سے پیش کیا ہے کہ انسان اپنی حیات وممات میں بے بس ہے بقول کسے ؎

اڑتے لمحات ہی اپنے نہ زمانہ اپنا
اپنی مرضی سے یہاں آنا نہ جانا اپنا

شعر نمبر ۲

کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے بدقمار
جو چال ہم چلے وہ نہایت بُری چلے

مشکل الفاظ

بساط - چوسر یا شطرنج کھیلنے کا تختہ یا کپڑا - بدقمار - ہارنے والا جواری
چال چلنا: اپنی باری پر مہرہ آگے بڑھانا -

تشریح

زندگی کی بازی میں انسان کو بہت سے مواقع ملتے ہیں کہ وہ اپنے کسی طرزِ عمل سے وقت کا فائدہ اٹھائے اور کوئی ایسا عمل کر گزرے جو اس کو اس کی موجودہ حالت سے نکال کر نسبتاً بہتر حالت میں لے جائے - یوں زندگی کے شطرنج (کھیل) میں وہ خانہ خانہ اپنی پوزیشن مستحکم بنا سکتا ہے مگر انسان کی حالت اس کے برعکس ہے - انفرادی طور پر بعض انسان پہلے سے بہتر ضرور ہوتے ہیں اور اپنے عمل سے، اپنی گفتار سے انسانی معاشرے کو ترقی اور فلاح کی طرف لے جانے کی کوشش بھی کرتے ہیں - مگر عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ انسانوں کی کثرت وقت کا صحیح فائدہ نہیں اٹھاتی اور اس کی ہر حرکت اُسے اس کی موجودہ حالت سے بھی پیچھے لے جاتی ہے - یوں بحیثیت مجموعی انسان کائنات کی اس بساط پر اپنی غلط پالیسیوں کے سبب مسلسل خسارے میں جا رہا ہے -

ذوق اس شعر میں اپنی کیفیت اور حالت بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اس بساط پر ہم جیسے غلط چالیں چل کر اپنا سب کچھ ہارنے والے جواری بہت کم ہوں گے - ہم ایسے غلط انداز اور بدقسمت ہیں کہ جب بھی کوئی چال چلتے ہیں ہمارا قدم غلط سمت ہی میں اٹھتا ہے یا اس کا نتیجہ ہماری خواہش کے برعکس ہوتا ہے - یوں زندگی کی اس بساط پر ہم اپنی عادات و حرکات کی وجہ سے مسلسل نقصان میں جا رہے ہیں - بقول کسے ؎

زندگی کی بازی میں مستقل خسارے ہیں
ہم نے ایک اک کر کے اپنے سانس ہارے ہیں

شعر نمبر ۳

ہو عمرِ خضر بھی تو کہیں گے بوقتِ مرگ
ہم کیا رہے یہاں، ابھی آئے ابھی چلے

مشکل الفاظ عمرِ خضر۔ حضرت خضر علیہ السلام کی حیاتِ جاوداں کی طرف اشارہ ہے مراد لمبی عمر، بہت طویل عمر۔

تشریح اس شعر میں بھی ذوقؔ نے انسانی نفسیات کی ایک سچی تصویر کھینچی ہے۔ انسان کی عمر چاہے جتنی طویل ہو جائے اس کا یہاں سے جانے کو دل نہیں کرتا۔ زندگی کی لذتیں اسے اپنی طرف کھینچتی ہیں اور وہ سوچتا ہے کہ میں ابھی پوری طرح ان سے لطف اندوز نہیں ہوا۔ اسی طرح اور بہت سے پچھتاوے اور حسرتیں اس کی توجہ اپنی طرف کھینچ لیتی ہیں۔ کئی ادھورے کام نامکمل منصوبے۔ غرضیکہ اسے جتنی عمر ملتی ہے وہ بہت کچھ کرنے کے بعد بھی کسی محرومی اور تشنگی کے سبب افسردہ رہتا ہے اور یہ محرومی دور کرنے کے لئے خدا سے مزید مہلت مانگتا ہے۔

ذوقؔ کہتے ہیں کہ زندگی چیز ہی ایسی ہے کہ اگر ہمیں خضر علیہ السلام کی طرح ہزاروں سالوں کی عمر بھی مل جائے، پھر بھی یہاں سے جاتے ہوئے ہمیں یہی محسوس ہو گا جیسے ہم ابھی آئے تھے اور ابھی یہاں سے جا رہے ہیں۔ بقول کسے ؎

بدی کے واسطے بھی، خیر کے لئے بھی یہ عمر
ہزار سال کی ہو پھر بھی کم۔ بہت ہی کم
طلب کے سلسلے، پھیلاؤ آرزوؤں کے
سمیٹنے کے لئے اک جنم۔ بہت ہی کم

شعر نمبر ۳

بہتر تو ہے یہی کہ نہ دنیا سے دل لگے
پر کیا کریں جو کام نہ بے دل لگی لگے

مشکل الفاظ دل لگنا۔ محبت ہونا۔ پر۔ لیکن۔ دل لگی۔ محبت۔

تشریح اس شعر میں ذوقؔ نے "دل لگے" اور "دل لگی" کی لفظی رعایتوں سے مفہوم پیدا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زندہ رہنے کی سب سے اچھی اور بہتر شکل تو یہی ہے کہ انسان دنیا سے دل نہ لگائے۔ یہاں رہے ضرور مگر دنیا کی کوئی چیز اسے اپنی محبت میں جکڑ نہ لے۔ وہ یہاں کی چیزوں کو استعمال میں لائے مگر ان کا غلام ہو کر نہ رہ جائے۔ ہمیشہ یہ ذہن میں رکھے کہ میری منزل اگلی دنیا ہے اور جلد یا بدیر مجھے یہاں سے وہاں جانا ہے۔ اگر وہ اس مادی دنیا میں اور اس کے تقاضوں میں الجھ کر رہ جائے گا تو آخرت کی منزل اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے گی اور یہ خسارے کا کام ہے۔ اس لئے انسان کے لئے یہی بہتر ہے کہ وہ دنیا کے دھندوں، کاموں، لذتوں، آسائشوں، یہاں کی محبتوں، مجلسوں اور کاروبار

میں دل نہ لگائے، ان میں زیادہ مصروف ہونے سے پرہیز کرے۔

دوسرے مصرع میں ذوقؔ انتہائی افسردہ اور غمگین لہجے میں کہتے ہیں لیکن ایسا ہو نہیں سکتا یہاں رہتے ہوئے یہاں کے معاملات، مسائل، تعلقات، گھربار، کاروبار، یہاں کے دھندے دوستیاں، محبتیں کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی دلچسپی انسان کو اپنی طرف کھینچ ہی لیتی ہے۔ کوئی نہ کوئی کام ایسا نکل ہی آتا ہے جو اسے مصروف کر لیتا ہے۔ توجہ دیئے بغیر زندگی بھی نہیں گزرتی اور دلچسپی لئے بغیر یہاں رہا بھی نہیں جا سکتا۔

دراصل یہ شعر اس نفسیاتی سچائی کا حامل ہے کہ آدمی دنیا سے لاکھ دامن چھڑائے دنیا اسے کسی نہ کسی طرح اپنے آپ میں مشغول کر ہی لیتی ہے اور اس کے بغیر زندگی کا کام نہیں چلتا بقول کسے ؎

اگرچہ دل کے لگانے میں ہے خسارہ بھی
بغیر دل کے لگائے نہیں گزارا بھی

شعر نمبر ۵

دنیا نے کس کا راہِ فنا میں دیا ہے ساتھ
تم بھی چلے چلو یونہی جب تک چلی چلے

مشکل الفاظ

راہِ فنا۔ فنا کا راستہ، موت۔ چلے چلو، ساتھ دیئے جاؤ مراد نباہ کئے جاؤ۔

تشریح

ذوقؔ نے یہاں بھی "چلے چلو" اور "چلی چلے" کی لفظی رعایتوں سے ایک خوبصورت مفہوم پیدا کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ دنیا فنا کا مقام ہے۔ جب آدمی یہاں سے رخصت ہوتا ہے اور موت کے سفر پر نکلتا ہے تو کوئی اس کا ہمسفر نہیں بنتا۔ محبتوں کے دعوے اور ساتھ نباہنے کے قول و قرار کرنے والے بڑے بڑے جگری دوست اور رشتہ دار یہیں رہ جاتے ہیں اور مرنے والے کے ساتھ کوئی نہیں جاتا۔ اسے فنا کے راستہ کو تنِ تنہا ہی طے کرنا پڑتا ہے۔

ذوقؔ کہتے ہیں اس صورت حال کو قبول کرتے ہوئے اب تم بھی جب تک اس طرح کی دنیا اور اس طرح کے لوگوں سے نباہ کر سکتے ہو۔ کئے جاؤ۔ ذوقؔ کا مطلب یہ ہے کہ آخر کار تنہائی تمہارا مقدر ہے۔ موت تک یہ سب رشتے ناطے ہیں۔ موت کا لمحہ آیا تو ہر چیز آدمی کا ساتھ چھوڑ جاتی ہے اور وہ فنا کی مسافتوں کے لئے اکیلا ہی رہ جاتا ہے یہ ایک حقیقت ہے اور اس سے مفر نہیں، لہذا جب تک نباہ ہو سکے تم بھی یہ حقیقت ذہن میں رکھ کر زندگی گزارے جاؤ، لوگوں سے زیادہ توقعات نہ رکھو، نہ انہیں اپنے بارے میں زیادہ توقعات رکھنے دو۔ یہی دنیا کا دستور ہے اور سب کو ایسے ہی کرنا ہے۔

شعر نمبر ۶

جاتے ہوائے شوق میں ہیں اس چمن سے ذوقؔ
اپنی بلا سے بادِ صبا اب کبھی چلے

مشکل الفاظ
ہوا - تمنا، حرص، لگن - اپنی بلا سے - ہمیں کیا غرض - اب اپنا اس سے کیا واسطہ -

تشریح
کسی شاعر کا بڑا معروف شعر ہے ؎

بلبل نے آشیانہ چمن سے اٹھا لیا
اُس کی بلا سے بوم بسے یا ہُما رہے

(یعنی بلبل نے باغ چھوڑ دیا اب اسے اس سے کوئی غرض نہیں کہ یہاں اس کے بعد الو بسیرا کریں یا ہما آن بسے)

ذوقؔ نے اس سے ملتے جلتے مضمون کا شعر کہا ہے - وہ کہتے ہیں کہ جب تک ہم اس میں (مراد اس دنیا میں) تھے ہم اس باغ کی چیزوں سے وابستہ رہے - یہاں کی بہار اور خزاں، دکھ اور سکھ، حبس اور ہوا ہر چیز کا ہمارے ساتھ ایک تعلق رہا کسی نہ کسی طرح ہم یہاں کے ماحول سے متاثر ہوتے رہے - اب جبکہ ان دیکھی منزلوں کا شوق ہمیں یہاں سے کہیں دور لئے جا رہا ہے ہمارا چمن کی فضا سے رشتہ ٹوٹ گیا ہے - اب ہمارے بعد یہاں کبھی ہوا چلے یا نہ چلے، پھول کھلیں یا نہ کھلیں - خوشی کا دور دورہ ہو یا نہ ہو ہمیں اس سے غرض نہیں -

بادِ صبا، چمن کی زندگی کی علامت ہے کیونکہ اسی سے پھولوں پتوں اور درختوں کی نشوونما ہوتی ہے جبکہ حبس تکلیف، دکھ اور ویرانی کا موجب ہے - ذوقؔ کہتے ہیں جب تک ہم چمن میں رہے حبس کا موسم رہا - ہم اس توقع پر پت جھڑ سے بھی نباہ کرتے رہے کہ کبھی بادِ صبا پھول رُت کے آنے کا پیغام لائے گی - مگر ایسا نہ ہو سکا اور اچھے دنوں کے انتظار میں ہماری عمر گزرتی رہی اب جب کہ ہم یہ باغ چھوڑ رہے ہیں ہمیں اس سے کیا غرض کہ کبھی بادِ بہار کا ادھر بھی گزر ہو گا اور چمن میں بہار بھی آئے گی ہمیں تو سیاحتوں کا شوق، آرزو کی موج، یہاں سے دور کہیں اور بہائے لئے جا رہی ہے - بقول کسے ؎

ہم کو کیا اب باغ کے اندر پت جھڑ ہو یا پھول رُتیں
چھوڑ کے ہم ماحول یہاں کا اور کہیں پر جاتے ہیں

مرزا اسد اللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء — ۱۸۶۹ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱

وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہ ہو
کیجئے ہمارے ساتھ عداوت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ

وارستہ - بے نیاز، آزاد، فارغ البال - عداوت - دشمنی

تشریح

مرزا غالب کا طرزِ بیان دوسرے شاعروں سے مختلف ہے - انکے اپنے بقول ؎

کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیان اور

اور وہ اندازِ بیان یہی ہے کہ نئے نئے مضامین نئے نئے طریقوں سے بیان کرتے ہیں - یہی شعر دیکھئے - انہوں نے اُردو شاعری کی عام روش سے ہٹ کر بات کی ہے - عاشق عام طور پر محبوب کی محبت کے خواہشمند ہوتے ہیں اور اپنی وفا کے جواب میں محبوب سے وفا چاہتے ہیں مگر غالب محبوب سے صرف ایک نسبت اور تعلق کے آرزومند ہیں اگرچہ وہ تعلق محبت ہی کا ہے لیکن وہ کہتے ہیں کہ اگر محبوب ہم سے محبت نہیں کرنا چاہتا تو ہمیں یہ بھی منظور ہے - وہ چاہے ہمارے ساتھ دشمنی ہی کرے لیکن ہمارے ساتھ کوئی نہ کوئی تعلق ضرور رکھے یعنی ہمارے جذبات و احساسات سے وہ بالکل ہی لاپروا اور بے نیاز نہ ہو جائے -

لطف کی بات یہ ہے کہ غالب خود بے نیاز ہیں، محبوب سے نہیں، محبوب کے رویے کی نوعیت سے وہ یہ چاہتے ہیں کہ دوستی کا وگرنہ دشمنی کا محبوب سے کوئی تعلق ضرور رہے غالب نے ایک اور جگہ اسی مضمون کو یوں باندھا ہے ؎

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

غالب کے زیرِبحث شعر کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ غالب اتنے حاسد ہیں کہ وہ یہ بھی نہیں چاہتے کہ محبوب دشمنی بھی کسی اور سے کرے، لہٰذا وہ محبوب سے کہتے ہیں آپ اپنی توجہ صرف ہم پر مبذول کریں - اگر آپ ہم سے محبت نہیں کر سکتے - تو نہ سہی عداوت ہی کیجئے - تعلق، نسبت اور ربط کی دو ہی صورتیں ہیں دوستی یا دشمنی، آپ دونوں کے لئے صرف غالب ہی کو منتخب کریں -

بقول کسے ؎ چاہتے نہیں کچھ اور، اور کچھ نہیں کہتے
دشمنی بھی کرنی ہے تو ہمیں سے کر پیارے

شعر نمبر ۲
ہے مجھ کو تجھ سے تذکرۂ غیر کا گلہ
ہر چند بر سبیلِ شکایت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ
تذکرہ - ذکر - غیر - عدو، دشمن - بر سبیلِ شکایت - گلے شکوے کے طور پر، شکایت کے طور پر -

تشریح
غیر (رقیب) کے بارے میں رشک وحسد کے خیالات کا اظہار غالب کی شاعری میں کئی جگہ ملتا ہے اس شعر میں غالب کہتے ہیں کہ اے محبوب مجھے اس بات کا گلہ ہے کہ تو میرے سامنے غیر کا ذکر کرتا ہے - تیرے ہونٹوں پر مجھے کسی اجنبی یا نا آشنا کی گفتگو بالکل اچھی نہیں لگتی اگرچہ تو یہ گفتگو اس کی شکایت کے طور پر ہی کر رہا ہو -

صورت حال کچھ ایسی ہے کہ محبوب غالب کے سامنے غیر کے کسی رویے کی شکایت کر رہا ہے - اگرچہ بات گلے کی ہے اور غیر کے خلاف ہو رہی ہے اور اس گفتگو سے غیر کے بارے میں محبت کا نہیں بلکہ شکوے کا اظہار ہو رہا ہے لیکن غالب محبت کے معاملات میں اتنے حساس ہیں کہ وہ اس کی زبان سے کسی غیر کا ذکر سن ہی نہیں سکتے اور کہتے ہیں کہ تو اگرچہ شکایت کے طور پر غیر کا ذکر کر رہا ہے مگر مجھے تیرے اس رویے سے گلہ پیدا ہو گیا ہے - تجھے میرے سامنے کسی کا ذکر کرنے میں احتیاط برتنی چاہیئے - کیونکہ مجھ سے یہ برداشت نہیں ہوتا -

بقول کسے ؎ تم تو غیروں کے گلے کرتے ہو لیکن، دل پر
جانے کیوں ایک قیامت سی گزر جاتی ہے

شعر نمبر ۳
پیدا ہوئی ہے، کہتے ہیں، ہر درد کی دوا
یوں ہو تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ
چارہ - علاج
غمِ الفت - عشق کا دکھ

تشریح
غالب نے اس شعر میں اس معروف مقولے کی تردید کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ ہر غم کا علاج دنیا میں موجود ہے - غالب کہتے ہیں کہ دنیا میں یہ بات مشہور ہے کہ ہر درد کی دوا اور ہر دکھ کا علاج ہے اگر آدمی کوشش کرے تو جلد یا بدیر وہ اپنی بیماری کا حل تلاش کر سکتا ہے - غالب دوسرے مصرع میں اس قول کو رد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ بات

غلط ہے۔ اگر ہر غم کا علاج ہوتا تو غمِ الفت یعنی عشق کے دکھوں کا بھی کوئی علاج ہوتا لیکن عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ عشق والے عمر بھر روگی رہتے ہیں اور عشق کے غم کا کوئی مداوا نہیں، اس لئے عشق کو "دردِ لا دوا" (ایک ایسا درد جس کی کوئی دوا نہ ہو) کہا گیا ہے۔ بعض صورتوں میں تو عشق کا دکھ اس سطح پر پہنچ جاتا ہے جہاں محبوب کے ملنے سے بھی اس کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ بقول کسے ؎

تری دوری ہمیں ایسے مقامِ درد پر لائی
اگر تو مل بھی جائے تو نہیں حالت سنبھلنے کی

شعر نمبر ۴

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کہیں
عمرِ عزیز صَرفِ عبادت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ

فوت - موت - فرصتِ ہستی - زندگی کا وقت، مدت - عمرِ عزیز پیاری اور قیمتی عمر - صَرفِ عبادت - عبادت میں گزرنے والی

تشریح

عام طور پر صرف اس وقت کے گزرنے کا ماتم کیا جاتا ہے جو بے کار اور فضول کاموں میں گزرا ہو یا غفلت کی نذر ہوا ہو اور گزری ہوئی زندگی کا وہ عرصہ جو نیک اور اچھے کاموں میں یا عبادت میں صرف ہوا ہو، اس پر اطمینان کا اظہار کیا جاتا ہے مگر غالب نے گزری ہوئی زندگی کو ایک اور ہی اچھوتے انداز سے دیکھا ہے وہ کہتے ہیں کہ زندگی جیسی نعمت ہر حال میں یاد آتی ہے۔ خواہ وہ کیسے کاموں میں گزرے۔ گزر چکنے کے بعد اس بات کا دکھ ہمیشہ رہتا ہے کہ یہ گزر کیوں گئی۔ وہ بڑی افسردگی سے کہتے ہیں کہ زندگی کے وقت، عرصہ اور مدت کے گزر جانے کا غم دل سے کب جاتا ہے۔ اگرچہ عمر نیکی ہی میں بسر کیوں نہ ہوئی ہو۔ پھر شاید یہ دکھ ہو کہ اس گزر جانے والی مختصر عمر میں اور زیادہ عبادت کیوں نہ کی، نیکی کے زیادہ کام کیوں نہ کر لئے۔

دراصل غالب کے اس شعر کی تہہ میں انسان کے ذوق و شوق کی کیفیات کا نفسیاتی انداز میں تجزیہ کیا گیا ہے۔ انسان کے اندر کسی بھی طرح کے کام کرنے کی لامحدود صلاحیتیں ہیں اور ان کے مقابلے میں انسان کی زندگی بہت مختصر ہے۔ اس مختصر عرصے میں اس کا کسی بھی کام سے پوری طرح جی نہیں بھرتا اور جب وقت گزر جاتا ہے تو عدمِ اطمینان کی ایک کیفیت ہر صورت میں اسے اداس کرتی رہتی ہے۔ زندگی چونکہ واپس بھی نہیں آ سکتی اس لئے یہ اداسی ہمیشہ کا پچھتاوا اور غم بن جاتی ہے۔ بقول کسے ؎

تلخ دنوں کی یاد تو وجہِ فسردگی ہی تھی
اچھے دنوں کی یاد نے اور اداس کر دیا

شعر نمبر ۵

ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال
ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ

بجائے خود، اپنی جگہ - محشرِ خیال، خیالات کا محشر - ہنگامہ، کثرت و ہجوم
انجمن، محفل - خلوت، تنہائی

تشریح

غالب نے اس شعر میں غور و فکر کرنے والے ذہنوں کے ایک خاص وصف کا اظہار کرتے ہوئے کیا سچی بات کہی ہے - وہ کہتے ہیں کہ آدمی کے ذہن میں سوچوں کی کثرت و ہجوم کے سبب ایک محشر کی سی حالت رہتی ہے - سوچوں کا یہ ہنگامہ اسے تنہائی میں بھی تنہا نہیں ہونے دیتا - اگر وہ دنیا کی محفلوں سے کنارہ کش ہو کر تنہائی میں جا بیٹھے تو خیالوں اور سوچوں کی یہ انجمن اس کے ساتھ رہتی ہے اس شعر کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ تنہائی اور خلوت میں خیالات کے ہنگامے کا احساس زیادہ شدید ہو جاتا ہے - یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ آدمی جب تک ہجوم میں رہے - خارجی مصروفیات کے سبب اس کی بہت سی سوچیں، خدشے، توقعات، گمان اور اندیشے وغیرہ (جو نت نئے خیالات کو جنم دیتے ہیں) دبے رہتے ہیں اور جونہی آدمی ہجوم سے کٹ کر تنہائی میں آتا ہے تفکرات اور خیالات کے لشکر اسے گھیر لیتے ہیں - غالب نے اس شعر میں سوچ اور فکر کے اس گھیراؤ اور یلغار ہی کو محشرِ خیال کہا ہے - وہ کہتے ہیں کہ ہم تنہا ہو کر بھی تنہا نہیں ہوتے - خلوت میں بھی ہماری حالت ایسی ہوتی ہے گویا ہم انجمن میں بیٹھے ہیں - بقول کسے ؎

کارواں در کارواں افکار کا اک سلسلہ
حالتِ تنہائی میں بھی ساتھ رہتا ہے مرے

شعر نمبر ۶

ڈالا نہ بے کسی نے کسی سے معاملہ
اپنے سے کھینچتا ہوں خجالت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ

بے کسی، بے بسی
خجالت، ندامت، شرمندگی

تشریح

عام طور پر دنیا کے اچھے انسان دوسروں کا احسان اٹھانے سے بچتے ہیں - ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ دوسروں کے لئے کچھ کر سکیں تو کر دیں لیکن اپنے کاموں کے لئے دوسروں کو تکلیف نہ دیں - غالب اپنی بے بسی کو اپنی طبیعت اور مزاج کے لئے نعمت سمجھتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ میری طبیعت اور مزاج ایسا ہے کہ کسی کا احسان نہیں اٹھا سکتا، سو میری

کوئی معاملہ، کاروبار یا سروکار نہیں رکھ سکتا تھا۔ اگر میں بے بس نہ ہوتا اور کچھ کرنے کے اہل ہوتا تو دنیا کے معاملات میں ضرور پڑتا۔ یوں لوگوں کے ساتھ لین دین اور دوسرے تعلقات کے سبب کبھی نہ کبھی مجھے بھی کسی کا احسان ضرور اٹھانا پڑتا۔ کیونکہ آدمی دنیا میں رہتے ہوئے ایکدوسرے کے معمولی احسانات اٹھانے پر ضرور مجبور ہوجاتا ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں کسی کا منت کش ضرور ہوجاتا ہے غالب کہتے ہیں کہ شکر ہے میں اتنا بے بس ہوں کہ کسی کو مجھ سے کوئی سروکار ہی نہیں۔ مجھ سے کسی اور کا کوئی تعلق تو جب ہو جب میری کوئی حیثیت ہو، میرے پاس کچھ ہو۔ جب میں ہوں ہی بے نوا، تہی دست، مجبور، معذور اور بے کس تو اب کسی کے ساتھ میرا کیا معاملہ ہوسکتا ہے؟

دوسری بات۔ میری خودداری طبیعت کسی کا احسان نہیں اٹھا سکتی اور تو اور میں شرمندگی اور ندامت کے لئے بھی کسی کا محتاج نہیں ہونا چاہتا۔ میں یہ چیزیں بھی اپنے آپ سے حاصل کرتا ہوں شعر کا خلاصہ یہ ہوا کہ غالب غیر کے احسان سے گریز کرتے ہیں اور اپنی بے کسی کے ممنون ہیں جس نے انہیں دوسرے کے احسان اٹھانے سے بچالیا۔ اب اگر انہیں شرمندگی بھی ہے تو اپنے آپ سے، کسی دوسرے سے نہیں ہے۔ بقول کسے ؎

ہمارے حق میں تو بے پرو بالی بھی تھی نعمت
ہوا کے احسان بھی نہ ہم نے کبھی اٹھائے

شعر نمبر ۷

اس فتنہ خو کے در سے اب اٹھتے نہیں اسد
اس میں ہمارے سر پہ قیامت ہی کیوں نہ ہو

مشکل الفاظ

فتنہ خو، شرارتی، جھگڑنے والا، فتنہ کی عادت والا مراد محبوب
در، دروازہ، دہلیز

تشریح غالب کہتے ہیں کہ ہم نے محبوب کی چوکھٹ پہ اس طرح ڈیرا ڈالا ہوا ہے کہ اب کوئی بڑے سے بڑا ہنگامہ بھی ہمیں یہاں سے اٹھا نہیں سکتا۔ ہمارے سر سے قیامت کا ہنگامہ بھی گزر جائے تو ہم یہاں سے نہ اٹھیں گے۔ اس شعر کا ایک لطیف پہلو یہ ہے کہ قیامت کے دن مردے تک اٹھ کھڑے ہوں گے۔ حالات و واقعات کے انتشار نے کسی چیز کو اس کی موجودہ صورت میں برقرار نہیں رہنے دیا۔ مگر غالب کہتے ہیں کہ وہ ہنگامہ بھی ہمیں محبوب کی دہلیز سے دور نہیں کرسکتا۔ مراد یہ ہے کہ اگرچہ اس جھگڑنے والے تند اور فتنہ خو محبوب سے وابستہ ہونے میں طرح طرح کی مصیبتوں اور مشکلوں کا سامنا ہے مگر ہمیں اس شوخ کی محبت میں سب کچھ گوارا ہے۔ اب کوئی بڑے سے بڑا حادثہ یا مصیبت بھی ہمیں اس کی محبت سے

باز نہیں رکھ سکتی۔ بقول کسے ؎

ہو حشر بھی برپا تو نہ اٹھیں گے یہاں سے
وابستہ ترے در سے کچھ اس طور ہوئے ہیں

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

ہے بس کہ ہر اک ان کے اشارے میں نشاں اور
کرتے ہیں محبت تو گزرتا ہے گماں اور

مشکل الفاظ

بس کہ ، بہت — نشان ، پتہ ، علامت
گماں — شک ، احتمال ، شبہ

تشریح

مرزا غالب کہتے ہیں کہ محبوب کے اشاروں کا مطلب وہ نہیں جو محسوس ہو رہا ہے۔ اس کے ایک ایک اشارے میں بہت سی کیفیتوں ، حالتوں اور جذبوں کا مطلب نکلتا ہے بعض اوقات وہ محبت کا اظہار بھی کرتا ہے تو یوں معلوم ہوتا ہے جیسے یہ محبت نہیں کسی اور رویے کا اظہار کر رہا ہے۔

دراصل غالب اس شعر میں یہ کہنا چاہتے ہیں کہ محبوب اور حسین لوگ اپنے رویوں کے اظہار میں کسی واضح اور حتمی صورت کا پتہ نہیں چلنے دیتے۔ ان کے انکار میں بعض اوقات اقرار کا بھی مفہوم پوشیدہ ہوتا ہے اور اسی طرح کبھی کسی اقرار میں طرز انکار اپناتے ہیں کہ بڑا سمجھدار عاشق بھی انکے رویوں کی تہہ کو نہیں پا سکتا اور کسی واضح نتیجہ پر پہنچنے کی بجائے محبوب کے بارے میں ہمیشہ ایک شک اور گمان میں گرفتار رہتا ہے حقیقت میں تو شاید یہ صورتِ حال نہ ہو مگر عام طور پر کہا گیا ہے کہ چاہنے والا چاہے جانیوالی ذات کی حرکات و سکنات کے بارے میں زیادہ ہی حساس ہوتا ہے دوسرے فرد کو چاہے چاہنے والے کی چاہت کا علم بھی نہ ہو۔ مگر وہ اس کی باتوں کے از خود کئی کئی مفہوم نکال لیتا ہے بقول ساحر لدھیانوی ؎

میں جسے پیار کا انداز سمجھ بیٹھا ہوں
وہ تبسم وہ تکلم تری عادت ہی نہ ہو

اسی طرح بقول ایم ڈی تاثیر ؎

یہ دلیلِ خوش دلی ہے مرے واسطے نہیں ہے
وہ دہن کہ ہے شگفتہ وہ جبیں کہ ہے کشادہ

اس حقیقت کو سمجھنے کی لوگ بہت کم کوشش کرتے ہیں کہ محبوب کی ملنساری کا عمومی رویہ

ان سے کسی خصوصی محبت کا اظہار نہیں ہے جب آہستہ آہستہ صورتِ حال کی وضاحت ہوتی ہے تو حساس عاشق محبوب کو اپنی طرف راغب نہ دیکھ کر اسے کوستا ہے اور ظالم اور سنگدل کے الفاظ سے یاد کرتا ہے بعض صورتوں میں محبوب اور حسین لوگ بھی اپنے طرزِ عمل کی وضاحت نہ کر کے غلط فہمیوں کو پروان چڑھنے کا موقعہ دیتے ہیں۔ ہماری فارسی اور اردو شاعری میں ان دونوں صورتوں سے پیدا ہونے والے معاملات واحساسات اور جذبات وتجربات کی مختلف کیفیات کے بارے میں ہزاروں اشعار پائے جاتے ہیں غالبؔ کے زیرِ بحث شعر میں ایک ایسی صورتِ حال کا ذکر ہے جس میں عاشق محبوب کے اشاروں کو پوری طرح سمجھنے سے قاصر ہے اور اسے محبوب کی محبت بھی کئی طرح کے گمانوں میں مبتلا کر دیتی ہے۔

بقول کسے ؎

کوئی بتائے کہ مفہوم اس کا کیا سمجھوں
گلہ بھی کرتا ہے وہ ہم سے مسکراتے ہوئے

شعر نمبر ۲

لوگوں کو ہے خورشیدِ جہاں تاب کا دھوکا
ہر روز دکھاتا ہوں میں اک داغِ نہاں اور

مشکل الفاظ

خورشیدِ جہاں تاب، دنیا کو چمکانے والا سورج ۔ داغ، دھبہ سیاہ نشان ۔ عام طور پر کسی زخم کے بھر جانے کے بعد جسم پر باقی رہ جانے والا نشان ۔ نہاں، پوشیدہ، مخفی ۔ چھپا ہوا

تشریح

مرزا غالبؔ اس شعر میں اپنے جگر کے زخموں کی تابانی کا بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب میں اپنے چھپے ہوئے داغوں، مراد دل یا جگر کے داغوں سے پردہ اٹھاتا ہوں تو دنیا والوں کی آنکھیں انہیں دیکھ کر حیران ہوتی ہیں میرے داغ اتنے روشن ہیں کہ ایک ایک داغ پر انہیں چمکتے ہوئے سورج کا گمان گزرتا ہے۔

ایک انداز سے اس شعر میں اپنے داغوں کا سورج کی روشنی وتمازت کے ساتھ مقابلہ کیا ہے۔

سورج بھی چونکہ روز طلوع ہوتا ہے اور دنیا کو چمکاتا ہے اس کی مناسبت سے یہ کہا کہ میں بھی روزانہ ایک داغِ جگر دکھاتا ہوں۔ جس پر لوگوں کو چمکتے ہوئے خورشید کا دھوکہ ہوتا ہے۔ ’اور‘ کی ردیف نے شعر کے مفہوم کو وسیع کر دیا ہے۔ یعنی سورج تو ایک ہی ہے جو ہر روز طلوع ہوتا ہے مگر میرے جگر میں اتنے داغ ہیں کہ میں ہر روز اک نیا داغ جگر دکھاتا ہوں۔ بقول کسے ؎

ہزاروں زخمِ جاں، ہیں کہکشاں کی طرح تابندہ
مرے دل کا جہاں ہے آسماں کی طرح تابندہ

شعر نمبر ۳

یا رب نہ وہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

تشریح

غالبؔ کہتے ہیں کہ میں بہت کوشش کرتا ہوں کہ محبوب میرا مدعا سمجھ جائے مگر میری بار بار کوشش کے باوجود وہ میری بات نہیں سمجھتا۔ اب اس کا ایک ہی حل ہے کہ یا محبوب کو سمجھانے کے لئے مجھے کوئی اور زبان مل جائے یا پھر محبوب کا دل ہی بدل جائے۔

یہاں زبان سے مراد اردو فارسی یا کوئی اور زبان نہیں بلکہ وہ دلی مقصد ہے جو غالبؔ محبوب کو سمجھانا چاہتے ہیں اور محبوب یا تو جان بوجھ کر وہ بات نہیں سمجھ رہا یا پھر غالبؔ کے اظہار ہی میں کوئی کمی ہے اور محبوب کے سامنے اس سے پوری بات ہی نہیں ہوتی بقول سرمد صہبائی ؎

میں آج بھی نہ تم سے کوئی بات کر سکا
لفظوں کے پتھروں میں تمنا دبی رہی

اب اس صورت میں جب کثرتِ خواہش کی روداد محبوب نہیں سمجھتا اور بار بار طرز و اسلوب بدل کر بھی غالبؔ نے کوشش کر کے دیکھ لیا کہ محبوب اس کی زبان سمجھنے سے معذوری کا اظہار کرتا ہے تو مسئلہ کے حل کی دو صورتیں نظر آتی ہیں ایک تو یہ کہ غالبؔ بار بار کی کوشش کے رائیگاں جانے کے بعد خاموش ہی ہو جائیں۔ بقول کسے ؎

کہاں تلک میں سہوں لفظ ڈھونڈنے کا عذاب
کہے بغیر مری بات کیوں سمجھتے نہیں

یعنی صورت حال سے سمجھوتہ کر لیں۔ دوسرے یہ کہ خدا سے دعا کریں کہ خدا محبوب کا دل ہی بدل دے اور وہ غالبؔ کی بات کو سُنی اَن سُنی کر کے اور بے توجہی برتنے کی بجائے اس پر کان دھرے اور اس کی بات سمجھنے کی کوشش کرے۔ سو غالبؔ یہی دعا کرتے ہیں کہ اے خدا مجھے اور زبان نہ دے محبوب کو دل ہی اور دے دے۔

مولانا حالیؔ نے اس شعر کی وضاحت میں لکھا ہے کہ یہ شعر بظاہر معشوق کے حق میں معلوم ہوتا ہے (جیسا کہ اوپر بیان ہوا ہے) مگر اس میں در پردہ ان لوگوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو مرزا غالبؔ کے کلام کو بے معنی یا بعید الفہم (سمجھ سے باہر) کہتے تھے۔ مولانا حالیؔ کے خیال کی روشنی میں مرزا غالبؔ کے زیرِ بحث شعر کا مطلب یہ ہوا کہ اے خدا میرا کلام پڑھنے والے اسے مشکل سمجھتے ہیں اب شعر گوئی کے لئے اپنا لب و لہجہ، اسلوب یا زبان کیا بدلوں، تو ان کے دل ہی بدل دے کہ یہ میرے اسلوبِ نگارش سے واقف ہو جائیں۔ بقول کسے ؎

میں نے ہر لہجہ میں کی بات مگر بے مصرف
اب تو یہ ہے کہ کسی طور تری خو بدلے

شعر نمبر ۴

ہر چند سُبک دست ہوئے بُت شکنی میں
ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہے سنگِ گراں اور

مشکل الفاظ

ہر چند ۔ اگرچہ ۔ سُبک دست ۔ چالاک ، تیز ، ماہر
بت شکنی ۔ بت توڑنا ۔ سنگِ گراں ۔ بھاری پتھر

تشریح

مرزا غالب کہتے ہیں کہ اگرچہ ہم بتوں کو توڑنے میں ماہر اور چالاک ہو گئے ہیں ۔ بت توڑتے توڑتے ہمیں اس کام میں مہارت ہو گئی ہے لیکن اس کے باوجود بت ختم نہیں ہوتے ۔ نت نئے بت روز بنائے جاتے ہیں ۔ جب تک ہم ہیں یہ بھاری اور مضبوط پتھر (جن سے بت تراشے جاتے ہیں) ختم ہوتے نظر نہیں آتے ۔

بت اگرچہ مٹی یا پتھر کا بنا ہوا مجسمہ ہے جس کی ہندو لوگ پوجا کرتے ہیں ۔ مگر علامتی طور پر بت ہر اس رویہ ، قدر ، جنس اور چیز کو کہتے ہیں جسے پرستش اور عبادت کی حد تک چاہا جائے ۔ یوں دنیا میں جگہ جگہ انسان نے اپنی جسمانی و روحانی ترقی کے باوجود بعض چیزوں کو معبود کا درجہ دے رکھا ہے کہیں دولت کو خدا سمجھا جاتا ہے کہیں رنگ ، نسل ، ذات اور زبان کو اتنا اہم سمجھ لیا گیا ہے کہ ان کے سامنے تمام اچھی قدریں اور روحانی معیار ثانوی حیثیت اختیار کر گئے ہیں ۔ مختلف فرقوں اور گروہوں میں بٹے ہوئے انسانوں نے اپنی ذاتی بہبود او رفائدے کے لئے اپنی "ضد" اور "انا" کو بھی بت بنا کر پوجنا شروع کر دیا ہے ۔ اسی طرح کئی غلط قسم کی روایتیں ، اصول اور رسمیں معاشرے میں اس درجہ رواج پا گئی ہیں کہ گویا ان کی حیثیت مذہبی عقائد کی سی ہو گئی ہے ۔ معاشرے کی ان غلط رسموں اور رواجوں کے خلاف کبھی کبھار دانشور ، علمائے کرام اور شاعر ادیب اپنی بساط کے مطابق آواز بلند کرتے رہتے ہیں مگر اس کے باوجود پھیلتی ہوئی بدی سے بھرے معاشرے سے یہ غلط روایتیں مکمل طور پر ختم نہیں ہوتیں ۔

مرزا غالب نے مثبت رویے رکھنے والے لوگوں ، دانشوروں اور رہبروں کی کوششوں کے باوجود ان غلط روایتوں کے پوری طرح ختم نہ ہونے کے اس المیہ کو اپنے شعر میں نہایت خوبصورتی اور موثر طریقے سے قلمبند کیا ہے ۔ غالب کہتے ہیں کہ ہم معاشرے کی غلط روایات اور منفی رسموں کے خلاف مسلسل بر سرِ پیکار ہیں ۔ ہم ان سے سمجھوتہ کرنے کے بجائے ان سے لڑ رہے ہیں اور ایک ایک کر کے ان غلط روایات کے بت توڑ رہے ہیں ۔ مگر ہماری تیز رفتاری ، مہارت ، تیزی سے کام کرنے کی قوت (مراد بت شکنی میں تیزی) کے باوجود ان بتوں کا مکمل طور پر خاتمہ نہیں ہو رہا ۔ بت شکنی کے ساتھ ساتھ بت سازی کا کام اتنی ہی تیزی سے ہو رہا ہے ۔ ابھی اور بہت سے سنگِ گراں (غلط رویات اور منفی رسم و رواج) ہیں جن سے ہمارا مقابلہ ہو گا اور جو زندگی بھر ہمارے مقابل رہیں گے ۔

شعر نمبر ۵

پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رُکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

مشکل الفاظ

نالے ، ندی — طبع ، طبیعت
رواں ، چلنا

تشریح

مرزا غالب کہتے ہیں کہ جن دنوں میری طبیعت میں کچھ ٹھہراؤ سا محسوس ہوتا ہے ان ہی دنوں میرے اندر تموج ، روانی اور بہاؤ زیادہ آجاتا ہے ۔ اس کیفیت کو واضح کرنے کے لئے وہ ندی نالوں کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب پانی کو آگے بہنے کا راستہ نہ ملے تو ندیوں کا پانی اوپر کی طرف شروع ہوجاتا ہے اور ندی نالوں میں طغیانی کی سی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے ۔

غالب کی یہ تشبیہ حقیقی اور فطری ہے ۔ بہتے ہوئے پانی کے آگے رکاوٹ کھڑی کرنے سے پانی کا سفر رک نہیں جاتا ۔ بظاہر پانی رُکا نظر آتا ہے مگر وہ دراصل اوپر کو چڑھ رہا ہوتا ہے ۔ حتیٰ کہ وہ اس رکاوٹ سے اچھل کر آگے بڑھ جاتا ہے ۔ غالب نے اپنی طبیعت کا ذکر کرتے ہوئے اسے بھی ندی نالوں سے مثال دی ہے ۔ شاعری کے حوالے سے طبیعت کا رکنا اس کیفیت کو کہتے ہیں جب کسی بیزاری ، مصروفیت ، پریشانی یا ذہنی انتشار کے سبب وہ شعر کہنے پر مائل نہ ہورہی ہو اور یوں محسوس ہو رہا ہو جیسے شعر کہنے کے عمل میں اک رکاوٹ پیدا ہوگئی ہے ۔ اس کے برعکس طبعِ رواں کا مطلب ایسی طبیعت جو ہر وقت شعر کہنے پر قادر ہو اور جسے شعر کہتے ہوئے کوئی رکاوٹ محسوس نہ ہو بلکہ ایک روانی اور بہاؤ کا احساس ہو مراد آسانی ، فرحت ، کشادگی و سرمستی کا احساس ہو ۔

غالب کہتے ہیں کہ جن دنوں میں میری طبیعت بظاہر شعر گوئی کی طرف مائل نہیں ہورہی ہوتی حقیقت میں زیادہ رواں ہونے کے لئے تیار ہورہی ہوتی ہے یعنی یہ تعطل اور رکاوٹ میری شعر گوئی کے عمل میں بہت مختصر ہوتا ہے اور پھر کچھ ہی دیر کے بعد تعطل کے طور پر میری طبیعت اور زیادہ رواں ہوجاتی ہے اور میں بکثرت شعر کہہ لیتا ہوں ۔ پاتے نہیں جب راہ میں ایک علامتی مفہوم زبان بندی ، جبر اور حبس کے اس موسم کا بھی پایا جاتا ہے جب کسی خارجی دباؤ یا سیاسی جبر کے سبب اظہار و بیان پر پابندی لگادی جاتی ہے ۔ ایسے عالم میں بھی اہلِ حق ذہنی طور پر ایک شدید ردِ عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں ۔ وہ اگرچہ بظاہر کچھ نہ کہہ سکیں اور انہیں اظہار کا کوئی راستہ نظر نہ آئے مگر اندر ہی اندر اس رکاوٹ اور جبر کے خلاف ایک تیز و تند لہر چلتی رہتی ہے اور ذرا سا موقع ملتے ہی اظہار کے رُکے ہوئے سیلاب بپھر کر سڑکوں پر آجاتے ہیں ۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ طبیعت کچھ کہنے سے رکی ہوئی ہو یا اسے کچھ کہنے سے روک دیا

جائے ۔ دونوں صورتوں میں ردِ عمل شدید ہوتا ہے اور وقتی رکاوٹ یا عارضی جبر کے بعد طبیعت بیس اظہار کی روانی اور بیان میں جولانی آجاتی ہے ۔ بقول کسے ؎

جبر کے موسم میں لے کچھ اور ہو جاتی ہے تیز
روکنے سے کب رکا بپھری صداؤں کا سفر

تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم، جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

تشریح

ہماری روایتِ شعری میں محبوب کے ظلم و ستم کا بیان عام ہے اور اس ضمن میں مبالغہ آمیز مضامین کی کوئی کمی نہیں ۔ پرانے شاعروں کے ہاں ہر غزل میں ایک دو شعر ضرور مل جاتے ہیں ۔ جن میں محبوب کی سنگ دلی اور قتل و غارت گری کا بیان ہوتا ہے ۔ غالب نے اس شعر میں محبوب کے ظلم و ستم کے نتیجہ سے پیدا ہونے والی ایک ایسی ہی مبالغہ آمیز صورت کا اظہار کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ اگرچہ تمہاری وجہ سے ہمیں دل و جان کا خطرہ ہے اور کسی وقت بھی ہمیں دل و جان سے ہاتھ دھونا پڑ سکتا ہے لیکن اس میں اطمینان کا پہلو یہ بھی ہے کہ تمہارے ہونے سے شہر میں دل و جان جیسی نایاب چیزیں بھی عام اور ارزاں ہو گئی ہیں اے محبوب جب تک تم شہر میں ہو تمہاری قتل و غارت گری کے سبب سینکڑوں ہزاروں عاشق سرِ بازار دل و جان بیچتے نظر آئیں گے اور ہم اپنے دل و جان کے ضائع یا گم ہونے کے بعد بازار سے دل و جان خرید لائیں گے ۔

غالب کے زیرِ بحث شعر کا مطلب یہ ہے کہ محبوب کے ظلم کے ہاتھوں شہر میں زندگی ارزاں ہو گئی ہے اور دل و جان کی کوئی قیمت نہیں رہی ۔

بقول کسے ؎

اے ستم کیش تیرے ہاتھوں سے
زیست کی آرزو حرام ہوئی
ہو گیا اہلِ دل کا خون ارزاں
زندگی جیسی چیز عام ہوئی

شعر نمبر ۲

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھے
کہتے ہیں کہ غالب کا ہے اندازِ بیاں اور

مشکل الفاظ

سخنور ، شاعر
اندازِ بیان ، طرزِ اظہار ، لکھنے کا طریقہ، اسلوب

تشریح غالب زیر بحث غزل کے مقطع میں کہتے ہیں کہ یوں تو دنیا میں بہت اچھے سخن ور موجود ہیں ۔ اچھے شاعروں کی یہاں کوئی کمی نہیں ۔ ایک سے ایک بڑھ کر شعر کہنے والا مل جاتا ہے لیکن غالب کے شعر کہنے کا انداز سب سے مختلف ہے ۔

غالب نے اس شعر میں اپنی انفرادیت کی نشاندہی کرتے ہوئے اپنی شاعری کے خصوصی وصف کا ذکر کیا ہے اور یہ بات اگرچہ شاعرانہ انداز میں کہی گئی ہے لیکن ایک حقیقت ہے کہ غالب اردو شاعری میں اپنے طرز بیان کی بنیاد پر سب سے منفرد نظر آتے ہیں ۔ غالب کے طرز بیان میں جدت سب سے نمایاں خوبی نظر آتی ہے ۔ ان کی تراکیب ، بحریں ، تشبیہیں ، استعارے مضامین کی ندرت ، یہ سب خوبیاں مل کر ان کی غزل گوئی کو ایک ایسی جدت عطا کرتی ہیں جو ان کے بعد بھی اردو غزل گو شعرا کے ہاں نظر نہیں آتی ۔ ان کی بلند پروازئ خیال کی تعریف کرتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے کیا خوب کہا ہے ؎

نطقِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پرِ مرغِ تخیّل کی رسائی تا کجا

اس شعر کا خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ غالب جہاں اپنے اندازِ بیان کی تعریف کرتے ہیں وہاں دوسرے اچھے شعرا کی موجودگی کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ عام طور پر شاعر اپنی تعریف کرتے ہوئے اپنے آپ کو سب سے بلند و برتر خیال کرتے ہیں اور دوسروں کے مقام و مرتبہ کی پروا نہ کرتے ہوئے انہیں بالکل مسترد یا نظر انداز کر جاتے ہیں ، یہاں غالب دوسروں کی موجودگی اور اچھائی کا ذکر کرنے کے بعد اپنے رنگِ سخن کے منفرد پہلو کا ذکر کرتے ہیں ؎

شعر تو اور بھی اچھے ہیں ہزاروں لیکن
اپنے اشعار جدا سب سے نظر آتے ہیں
دل کی گہرائی سے ہم کرتے ہیں افکار رقم
جذبہ و سوز جبھی لے کے اثر آتے ہیں

غزل نمبر ۳

ہر ایک بات پہ کہتے ہو تم کہ تو کیا ہے
تمہیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

مشکل الفاظ اندازِ گفتگو ، طرز کلام ، بات کرنے کا طریقہ

تشریح غالب محبوب کے توہین آمیز رویہ کے بارے میں کہتے ہیں کہ تمہیں اپنے چاہنے والوں کے ساتھ نرم و ملائم لب و لہجہ میں بات کرنی چاہیئے۔ جب بھی تم سے بات کرتے ہیں تم ہماری ہر بات کو توہین اور حقارت سے ٹھکراتے ہو، ہمیں بات بات پہ جھڑکتے اور ڈانٹتے ہوئے کہتے ہو کہ تو کیا ہے؟ مراد تیری وقعت اور حیثیت ہی کیا ہے؟ غالب کہتے ہیں کہ آدمی ایسا بھی کیا ہو کہ جسے بات کرنے کا سلیقہ بھی نہ آئے اور جو بھی اس سے بات کرے اسے محبوب کے اس لب و لہجہ کی شکایت پیدا ہو جائے۔ بقول غالب کے ہی ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اس قدر
کی جس سے بات، اس نے شکایت ضرور کی

کہ مانا کہ تمہارے کلام میں (موضوع کی مناسبت یا فطری لب و لہجہ کے سبب) گرمی یا تلخی ہوتی ہے لیکن یہ بھی کیا کہ تم جس سے بات کرو وہ اس ضمن میں تمہاری شکایت ضرور کرے۔ دوسرے مصرع میں غالب کہتے ہیں کہ تم آپ ہی انصاف کرو۔ آپ ہی سوچ سمجھ کر اپنے لب و لہجہ کا جائزہ لو کہ کیا بات کرنے کا یہی انداز ہونا چاہیئے یا اگر تم سے کوئی اس انداز میں کلام کرے تو کیا تمہیں بُرا محسوس نہ ہوگا۔ بقول کسے ؎

چاہیئے شائستگی گفتار کے انداز میں
کر گلے کی بات پر لہجہ نہ اپنا سخت کر

شعر نمبر ۲

چپک رہا ہے بدن پر لہو سے پیراہن
ہماری جیب کو اب حاجتِ رفو کیا ہے؟

مشکل الفاظ

پیراہن، لباس
حاجتِ رفو، رفو کی حاجت، سلائی کی ضرورت

تشریح مرزا غالب کہتے ہیں کہ ہمارے پھٹے لباس کو اس لئے رفو کی ضرورت نہیں کہ وہ ہمارے جسم سے بہنے والے خون کے ساتھ ہمارے بدن کے ساتھ چپکا ہوا ہے۔ اس شعر میں غالب نے اپنی ندرتِ خیال کی صلاحیت کی بدولت کئی لطیف پہلو پیدا کئے ہیں۔ ایک پہلو تو یہ ہے وحشت و دیوانگی کے اثرات صرف لباس تک محدود نہیں رہے اس سے آگے بڑھ کر سینے کے چاک تک پہنچ گئے ہیں (میر تقی میر کے لفظوں میں ؎

اب کے جنوں میں فاصلہ شاید نہ کچھ رہے
دامن کے چاک اور گریباں کے چاک میں

سے بھی آگے) کہ بقول کسے ؎

کیا چاکِ لباس دیکھتے ہو سینہ بھی پھٹا ہوا ہے دیکھو

دیوانگی میں ہم نے اپنا لباس چاک کر لیا اور لوگوں نے پتھر مار مار کے ہمارا سینہ لہولہان کر دیا سو صورت یہ ہو گئی کہ اب لباس بھی تار تار ہے اور سینہ بھی زخم زخم۔ اس حالت میں لباس کو رفو کرنے کا کیا فائدہ ؟ بقول ایک شاعر کے ؎

بنے تو یہ دلِ صد چاک دے سلا مجھ کو

کہ اگر کسی رفوگر یا چارہ گر سے ہو سکے پھر مزہ تو جب ہے کہ وہ میرے زخم زخم جسم کو سلا دے نہیں تو لباس کے چاک سینے سے کچھ نہیں ہوگا۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ جب جسم لہولہان ہو تو لباس اس کے ساتھ چپک جاتا ہے ایسی حالت میں نہ تو لباس رفو ہو سکتا ہے اور نہ ہی لباس رفو کرنے کی ضرورت باقی رہتی ہے۔

سو مرزا غالب رفوگر کا احسان اٹھانے کی بجائے اپنے بدن پر چمٹے ہوئے لباس کی نشاندہی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خون میں لتھڑے ہوئے بدن نے ہمارے پھٹے ہوئے لباس کو رفوگر سے بے نیاز کر دیا ہے۔ بقول کسے ؎

چاک دامن کا تو چھتا ہے تمہاری آنکھ میں
دل کے زخموں تک تمہاری آنکھ کیوں جاتی نہیں

شعر نمبر ۳

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ جستجو کیا ہے

مشکل الفاظ

جستجو، تلاش

تشریح

یہ شعر ایک معنوی پس منظر کو ظاہر کرتا ہے کہ جیسے محبوب نے ظلم کی انتہا کے سبب عاشق کو آگ میں جھونک دیا ہے یا محبوب کی دوری کے سبب آگ، تپش اور جلن کی وجہ سے عاشق جل کر راکھ ہو گیا ہے اور اب محبوب اس کی راکھ کو کرید رہا ہے اور اس میں عاشق کا دل تلاش کر رہا ہے۔ غالباً محبوب کو اب یہ پچھتاوا ہے کہ یہ دل کا اچھا تھا اور اس جیسے اچھے دل والا عاشق شاید دوبارہ نہ ملے چلو اس کے جلتے ہوئے جسم کی راکھ سے اس کا دل تلاش کرتے ہیں۔

اب اس پس منظر سے غالب کا شعر اپنا مفہوم یوں پیش کرتا ہے کہ اے محبوب تم اب جو راکھ کرید رہے ہو اس کا کیا فائدہ ! جہاں پورا جسم جلا ہوگا وہاں دل بھی جل گیا ہوگا جب باقی جسم راکھ بن گیا تو دل کیسے بچتا۔ اس شعر کا علامتی مفہوم یہ ہوگا کہ اگر کوئی غارت گر کسی شئے، مدنیے، قدریا پورے معاشرے کو برباد کر دے مگر اس کے کسی ایک جز کے صحیح

بچ جانے کی توقع کرے تو یہ بے کار ہوگا۔ کوئی گل جل کر خاکستر بن جائے تو اسکا کوئی ایک جزو کیسے صحیح وسلامت رہ سکتا ہے۔ خصوصاً نامیاتی اور زندہ چیزیں برباد و غارت ہوتی ہیں تو اپنا کوئی حصہ ثابت و لائقِ استعمال نہیں چھوڑتیں۔ ایک لطیف طنز کا پہلو بھی اس شعر میں ملتا ہے اور وہ بعد از وقت محبوب کے پچھتاوے کا ہے۔ بقول کسے ؎

کر کے برباد سبھی جذبے ، مرے غارت گر
اب تو کس جذبے کی خواہش میں چلا آیا ہے

شعر نمبر ۴

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قائل
جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

مشکل الفاظ

قائل نہ ہونا ، تسلیم نہ کرنا ، کسی چیز کو نہ ماننا

تشریح

غالب کا یہ شعر بہت خوبصورت ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ خون رگوں میں تو سب کے دوڑتا ہے لیکن ہم ایسی گردش خون کے قائل نہیں۔ خون کی صحیح گردش تو یہ ہے کہ وہ آنکھ کے ذریعے ٹپکے۔ اگر خون آنکھ کے ذریعے ٹپکتا نہیں (مراد یہ کہ خون لوگوں کو نظر نہیں آتا) تو اس کی گردش بیکار ہے، اسکا رگوں میں دوڑنا نہ دوڑنا برابر ہے خون رونا یا لہو رونا سوز و غم اور دردمندی کا نتیجہ ہے۔ غالب کہتے ہیں کہ خون جو زندگی کی علامت ہے کسی دوسرے کے غم و درد میں ٹپک کر ہی باوقار ہوتا ہے۔ ویسے تو خون سب زندہ لوگوں کی رگوں میں دوڑتا ہے مگر ایسے لوگ کتنے ہیں جو کسی کی آتشِ طلب غمِ فراق یا قوم کے درد میں مبتلا ہو کر روتے ہیں۔ غالب کے بقول دراصل وہی چند لوگ زندہ کہلانے کے مستحق ہیں جن کا دامن دوسرے کے غم و فکر میں آنسوؤں سے تر رہتا ہے۔ دوسرے لوگوں کا وجود و عدم برابر ہے۔ خون ان کی رگوں میں ہوتا ہے اور وہ گردش بھی کرتا ہے مگر محض اس وجہ سے ہم انہیں نہیں مان سکتے۔ انسانیت کے مقام پر صحیح معنوں میں وہی شخص فائز ہے جو دوسرے کے غم و درد میں جلتا اور کڑھتا رہتا ہے اور خون کے آنسو روتا ہے۔ عاشقی کی معراج بھی یہی ہے کہ دل میں سوز و گداز کی ایسی کیفیت پیدا ہو جائے کہ عاشق کا خون آنسو بنکر آنکھوں سے بہہ جائے۔ علامتی طور پر اس شعر کے مفہوم کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ انسان کے سبھی خواب، ارادے، تمنائیں کسی شکل میں ڈھل کر ہی دوسرے لوگوں تک پہنچتی ہیں۔ صرف ان کا ہونا ضروری نہیں ان کی نمائش، اور اظہار بھی ضروری ہے۔ یہاں نمائش کو جدید

زمانے کی پبلسٹی یا تشہیر وغیرہ کے معنوں میں نہ لیا جائے بلکہ اس کا مطلب عملی اظہار میں ڈھلنا یا صورت پذیر ہوتا ہے۔

شعر نمبر ۵

یہ رشک ہے کہ وہ ہوتا ہے ہم سخن تم سے
وگرنہ خوفِ بد آموزیٔ عدو کیا ہے

مشکل الفاظ ہم سخن ، ہم کلام ، محو گفتگو ۔ وگرنہ ، ورنہ ۔ بد آموزی ، بُری بات ورغلانا ، بہکانا ۔ عدو ، دشمن ، حریف ۔

تشریح غالب کا یہ شعر رشک سے متعلق ہے۔ ان کی پہلی غزل میں بھی دو تین ایسے شعر گزر چکے ہیں۔ غالب محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں ہمیں اپنے بارے میں تمہاری محبت پر اعتماد ہے اور ہم تمہاری محبت پر یقین رکھتے ہیں اور اس بارے میں کسی شک شبہ میں مبتلا نہیں لہٰذا تم جہاں مرضی جاؤ جس سے ملو اور تو اور تم چاہو رقیب سے بھی گفتگو کرو۔ ہاں ایک بات ایسی ہے کہ وہ ہم سے کسی صورت برداشت نہیں ہوتی اور وہ ہے رشک کا جذبہ۔ جب کبھی تم (محبت میں ہمارے حریف اور مقابل مراد) غیر کے ساتھ گفتگو کرتے ہو یا وہ کبھی تمہارے ساتھ بولتا ہے تو ہمیں یہ خوف نہیں ہوتا کہ وہ تمہیں ہمارے بارے میں کچھ جھوٹ سچ کہہ کر بہکا دے گا ، ہم سے متنفر اور بدظن کر دے گا یا تمہیں کوئی غلط بات سکھا کر ہم سے دُور ہونے کو کہے گا ، ہمیں ان تمام خدشات کا کوئی ڈر اور خوف نہیں۔ ہمیں صرف اس بات پر رشک ہوتا ہے اور ہمارا جی اس بات پر جل جاتا ہے کہ رقیب تم سے ہمکلام ہو گیا ہے۔

غالب کے نزدیک کسی اور کا محبوب سے ہمکلام ہونا رشک کا باعث ہے ورنہ اسے اور کوئی ڈر یا محبوب کی محبت کے بارے میں شک و شبہ نہیں۔

اس شعر کا دوسرا اور قدرے مختلف مفہوم جو اردو غزل کی روایات کے زیادہ قریب ہے وہ یہ ہے کہ تم غیر سے ہمکلام ہو کر اسے شرفِ ہمکلامی سے نوازتے ہو مگر ہم سے کبھی بات بھی نہیں کرتے اور تم نے ہمیں اس مسرت اور سعادت سے محروم رکھا ہوا ہے۔ تمہارے اس رویہ کی وجہ سے ہم رشک میں مبتلا ہیں۔ چاہے غیر تمہیں ہمارے بارے میں کچھ غلط سلط بنا کر ہم سے بدظن کر رہا ہو۔ ہمیں اس بات کی کوئی پروا نہیں اور نہ ہی اس کی گفتگو کے موضوع اور اس کے اثرات کا ڈر ہے کہ وہ ہمارے لئے کتنی خطرناک اور تکلیف دہ ثابت ہو سکتی ہے۔

غالب کی مراد یہ ہے کہ محبوب پہلے ہی مجھ پر کب مہربان ہے جو اب رقیب کے ورغلانے سے ہو جائے گا۔ لہٰذا اس ورغلانے یا بہکانے کا اسے کوئی خوف نہیں۔ فی الحال تو اسے اس بات

کی شدید تکلیف ہے کہ غیر محبوب سے ہمکلام کیوں ہو رہا ہے اسے یہی شک کھائے جا رہا ہے لہٰذا وہ چاہتا ہے کہ کسی طرح محبوب غیر سے ہمکلام نہ ہوا کرے۔

شعر نمبر ۶

رہی نہ طاقتِ گفتار اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہئے کہ آرزو کیا ہے

مشکل الفاظ

طاقتِ گفتار، بولنے کی طاقت
آرزو، مراد تمنا

تشریح

مرزا غالب کہتے ہیں کہ اوّل تو جدائیوں کے مارے ہوئے جسم میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ وہ کوئی بات کر سکے محبت کے شدید مصائب اور تکالیف کے سبب ہمیں بولنے کا یارا نہیں۔ اگر کسی نہ کسی طرح ہم بولنے کے قابل بھی ہو جائیں تو ہم کس توقع پر اپنی زبان کھولیں اور کسی کو کیا بتائیں کہ ہماری تمنا کیا ہے؟ اس سے غالب کی مراد یہ ہے کہ اکثر اوقات ناامیدی اور مایوسی بھی آدمی کے ہونٹوں پر خاموشی کے تالے ڈال دیتی ہے اور وہ چاہتے ہوئے بھی اس لئے اپنی تمنا کا اظہار نہیں کر سکتا کہ اسے پتہ ہوتا ہے کہ یہ کبھی پوری نہیں ہوگی اور اسکی کہیں پذیرائی نہیں ہوگی اس لئے وہ خاموشی ہی اختیار کر لیتا ہے۔

شعر نمبر ۷

ہوا ہے شہ کا مصاحب، پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

مشکل الفاظ

شہ، بادشاہ، مراد بہادر شاہ ظفر، غالب ان کے استاد بھی تھے۔
مصاحب، ساتھی، دوست، درباری۔ اترانا، غرور کرنا۔

تشریح

مرزا غالب مغلوں کے آخری تاجدار بہادر شاہ ظفر کے نہ صرف ہم عصر تھے بلکہ دربار میں خاندانِ تیموری کی تاریخ لکھنے پر مامور تھے۔ سو وہ اکثر قلعہ میں جاتے اور بہادر شاہ ظفر کے ساتھ ان کی گفتگو بھی رہتی۔ اس مقطع میں اپنے بارے میں آپ ہی کہہ رہے ہیں کہ پوری دلی میں غالب کی آبرو کا سبب اگر کچھ ہے تو یہی شاہ کی مصاحبت یا اس کا درباری ہونا ہے۔ ممکن ہے یہ شعر مرزا غالب نے بہادر شاہ ظفر کو خوش کرنے کے لئے لکھا ہو وگرنہ مرزا غالب اپنے زمانے میں کافی معروف ہو گئے تھے اور ان کی شاعری ان کی وجۂ شہرت بن چکی تھی۔ مرزا غالب کے اس شعر میں زبان کا لطف تو ہے ہی مگر اس میں طنزیہ رنگ کی جھلک بھی ملتی ہے۔ کہتے ہیں کہ غالب کی شہر میں کوئی عزت نہیں ہے مگر جب سے وہ بادشاہ کا مصاحب بنا ہے اسوقت

سے اتراتا پھرتا ہے یعنی اس کو جو عزت حاصل ہے وہ مصاحب ہونے کے سبب ہے ورنہ اس کے اندر اپنی کوئی خوبی نہیں ۔

اس شعر میں مرزا غالب نے اپنے فکر وفن کے بارے میں انکسار سے کام لیا ہے۔ کہ ان کی اپنی کوئی حیثیت نہیں اور یہ سب کچھ بادشاہ کی دوستی اور اسکا درباری ہونیکی وجہ سے ہے۔

الطاف حسین حالی

(۱۸۳۷ء — ۱۹۱۴ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱

کرتے ہیں سو سو طرح سے جلوہ گر
ایک ہوتا ہے اگر ہم میں ہنر

مشکل الفاظ

جلوہ گر کرنا : جلوہ دکھانا، مراد نمائش کرنا ✤ ہُنر : خوبی، وصف ✤

تشریح

مولانا حالی کی یہ پوری غزل مقصدیت سے بھری پڑی ہے۔ حالی نے غزل سے جو اصلاحی مقاصد وابستہ کئے تھے، سادہ مضامین اور سلیس انداز سے لیس، یہ غزل ان کی ترجمان ہے۔ اس شعر میں ہماری معاشرتی خرابیوں کی نشاندہی کرتے ہوئے حالی کہتے ہیں کہ ہم لوگ کام کرنے کے بجائے معروف ہونا زیادہ پسند کرنے لگے ہیں۔ اوّل تو ہمارے اندر کوئی ایسی صلاحیت اور خوبی ہی نہیں جس پر ہم فخر کر سکیں اور اگر ہم میں سے کسی ایک کے اندر کوئی خوبی پیدا ہو ہی جاتی ہے، تو بجائے اس کے کہ وہ خاموشی سے اس کے ذریعے معاشرہ کو فائدہ پہنچائے، وہ اس کی تشہیر میں لگ جاتا ہے، سَو سَو طرح سے اُس کی نمائش کرتا پھرتا ہے اور سارا زور ظاہری شہرت پر صرف کر دیتا ہے۔ یہاں حالی نے "سو سو طرح" اور "ایک" سے شہرت طلبی اور موجود صلاحیّت کے تضاد اور فرق کو ابھارا ہے۔

حالی کا اس سے مطلب یہ ہے کہ ہمیں اپنی خوبیوں کی نمائش نہیں کرنی چاہئے کیونکہ تشہیر کرنے سے ان کا حُسن اور برکت ضائع ہو جاتی ہے۔ اس شعر میں ان افراد کی سچی تصویر پیش کی گئی ہے جو اپنے آپ کو سماجی کارکن اور عوام کے خدمت گزار کہلاتے ہیں اور معاشرے کے لئے ذرا سا کام کر کے اخبارات میں خبریں اور تصاویر چھپواتے ہیں۔

بقول کسے ؎

ہر ایک شخص کو جا جا کے خود بتاتے ہیں
نہ جانے کون سا ہم نے ہے معرکہ مارا

شعر نمبر ۲

جانتے ہیں آپ کو پرہیزگار
عیب کوئی کر نہیں سکتے اگر

مشکل الفاظ

پرہیزگار : نیک ✤ عیب : خامی، برائی ✤

تشریح مولانا حالی کہتے ہیں کہ عیب نہ کر سکنا اور پرہیزگاری دو مختلف چیزیں ہیں۔ صحیح پرہیزگار وہ ہے جسے عیب، گناہ اور برائی کرنے کا موقع بھی ملے، وہ اسے کرنے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو، مگر اس کا خیال بھی اُدھر نہ جائے۔ وہ گناہ کے کاموں سے پرہیز کرے اور برائی سے بچ کر رہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں عام طور پر پرہیزگار وہ بن جاتا ہے جو گناہ کرنے کی ہمت ہی نہ رکھتا ہو اور کسی ڈر یا بزدلی کے سبب برائی نہ کر سکنے پر اپنے اوپر پرہیزگاری کا لبادہ اوڑھ لے حالانکہ اس کے دل میں بُرائی کے لئے لپک اور طلب موجود ہو۔ حالی ایسی ظاہری پرہیزگاری کی مخالفت کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ آدمی کی فطرت میں پرہیزگاری پیدا ہونی چاہیئے کہ اسے سرے سے گناہ سے کوئی رغبت ہی نہ رہے۔

بقول کسے ؎

ہم کو مجبوریاں لے آئیں سرِ منزلِ خیر
کر نہ سکتے تھے بدی اس لئے ہم نیک بنے

شعر نمبر ۳

کرنی پڑتی ہے کسی کی مدح جب
کرتے ہیں تقریر اکثر مختصر

مشکل الفاظ مدح : تعریف، خوبی کا بیان ✦

تشریح مولانا حالی کہتے ہیں کہ ہماری طبیعتوں میں حسد آگیا ہے۔ ہم دوسروں کی خوبیوں سے جلتے ہیں اور عام طور پر ان کی تعریف اور حوصلہ افزائی میں کنجوسی سے کام لیتے ہیں۔ اگر ہمیں کسی آدمی کی، اس کی کسی خوبی کے سبب تعریف کرنا پڑ ہی جائے تو ہم دل کھول کر اس کی تعریف نہیں کرتے بلکہ اکثر اختصار سے کام لیتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اس کے بارے میں کم بات کرتے ہیں۔ حالی اس شعر سے بھی معاشرتی اصلاح کا کام لینا چاہتے ہیں اور ان کی مراد یہ ہے کہ ہم کو دوسروں کے اوصاف، کارکردگی اور خوبی کی پوری پوری تعریف کرنی چاہیئے تاکہ معاشرے میں ان لوگوں کی حوصلہ افزائی ہو اور خوبیاں پھیلیں۔

بقول کسے ؎

نہ کہے حوصلہ افزائی کے دو فقرے بھی
میرے احباب حسد کرتے تھے مجھ سے کتنا

شعر نمبر ۴

گر کسی کا عیب سُن پاتے ہیں ہم
کرتے ہیں رُسوا اُسے دِل کھول کر

مشکل الفاظ عیب : خامی، نقص ✦ رُسوا کرنا : بدنام کرنا ✦

تشریح حالی کا یہ شعر گزشتہ شعر ہی سے مربوط ہے جس میں وہ کہتے ہیں کہ ہم دوسرے کی خوبی کی تعریف کرنے میں بُخل سے کام لیتے ہیں اور اس شعر میں اس کے برعکس دوسری صورت حال کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر ہمیں کسی کے عیب کا علم ہوتا ہے تو جگہ جگہ ہم جی بھر کر اس کا ذکر کرتے ہیں اور یوں اس شخص کو بدنام و رسوا کر دیتے ہیں۔ اس شعر میں "سُن پاتے" نے ایک اور باریکی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بجائے اس کے ہم کسی کا عیب اپنی آنکھوں سے دیکھیں، اگر اُڑتی اُڑتی ہوئی ایسی خبر ہم تک پہنچ جائے تو بغیر سوچے سمجھے ہم آگے بیان کر دیتے ہیں۔ حالی کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں اچھے لوگوں کی طرح دوسروں کے معمولی معمولی عیبوں کو اُچھالنے کی بجائے عیب پوشی اور پردہ پوشی کرنا چاہیئے۔

بقول کسے ؎

کوئی خامی بھی اگر ہم نے کسی میں دیکھی
سرِ بازار اسے رسوا کیا ہے ہم نے

شعر نمبر ۵

کی نہیں جس سے کبھی کوئی بدی
شکر کے ہیں اس سے خواہاں عمر بھر

مشکل الفاظ بدی: برائی ❖ خواہاں: امیدوار، خواہشمند، طالب ❖

تشریح مولانا حالی کہتے ہیں کہ معاشرے میں اتنا بگاڑ پیدا ہو گیا ہے کہ اب ہم لوگوں سے برائی نہ کرنے کا معاوضہ لیتے ہیں اور وہ اس صورت میں کہ وہ ہماری تعریف کریں ہمیں نیک سمجھیں اور اس پر عمر بھر ہمارا شکریہ ادا کریں اور ہمارے بارے میں چلتے پھرتے تشکر اور احسان مندی کے جذبات رکھیں۔

مولانا حالی کہتے ہیں کہ اگر ہم کسی وجہ سے (یا موقعہ نہ مل سکنے کے سبب) کسی کے ساتھ کوئی برائی نہیں کر سکے تو اب ہم اپنے اس رویّے کی بناء پر عمر بھر اس سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ہمارا شکر گزار رہے حالانکہ برائی نہ کرنا اور کسی کو تکلیف نہ دینا انسانیت کے بنیادی تقاضوں میں سے ہے اور ہر انسان کو چاہیئے کہ وہ معاشرے میں خیر اور نیکی کو فروغ دینے کے لئے کسی کے ساتھ برائی کے ساتھ نہ پیش آئے اور سب کو شائستگی سے ملے۔ افسوس ہے کہ اب ہم اس بنیادی انسانی رویّے اور فرض کا صلہ بھی چاہنے لگ گئے ہیں۔

بقول کسے ؎

چاہتا ہے کہ ہمیشہ مَیں رہوں شکر گزار
مجھ سے وہ تنگ نہ کرنے کا صلہ مانگتا ہے

شعر نمبر ۶

ایک رنجش میں بھلا دیتے ہیں سب
ہوں کسی کے ہم پہ لاکھ احساں اگر

مشکل الفاظ رنجش : ناراضی، غصّہ ٭

تشریح حالی کہتے ہیں کہ ہم میں درگزر کا مادہ ہی ختم ہو گیا ہے۔ ہم پر کسی نے ہزاروں احسان بھی کئے ہوں لیکن اگر غلطی سے اُس سے کوئی ایسی بات ہو جائے جو ہماری ناراضی کا سبب ہو تو ہم اس ایک بات پر اس کے تمام احسان بھلا دیتے ہیں۔

حالی کی مراد یہ ہے کہ ہمیں کسی سے ناراض ہونے میں کچھ تو سوچ سمجھ سے کام لینا چاہیئے۔ کیسا وقت آگیا ہے کہ اب معمولی معمولی باتوں پر عمروں کے تعلقات توڑ لئے جاتے ہیں، خصوصاً والدین کی کسی ایک بات پر جو ناپسند ہو، بچے غصّے کے ایسے رویّوں کا اظہار کرتے ہیں، جیسے وہ ان کے کچھ نہ لگتے ہوں اور جیسے انہوں نے ان کے ساتھ احسان کی کوئی بات نہ کی ہو۔ انسان کو غصّہ و ناراضی کے وقت بھی عقل و ہوش میں رہنا چاہیئے اور یہ سوچنا چاہیئے کہ ان ہزاروں احسان کرنے والوں سے اگر اتفاقاً کوئی ایسی رنجش کی بات ہو گئی ہے تو کیا ہوا، ممکن ہے، ہمارے فائدہ ہی کے لئے ہو۔ آخر انہوں نے ہم پر بے شمار احسانات بھی تو کئے ہیں۔ مگر افسوس ہے ہم ایسا نہیں کرتے اور اپنی ناراضی کے اظہار میں جلد بازی سے کام لیتے ہیں اور درگزر اور معاف کرنے کی عادت کو بھول ہی گئے ہیں۔

بقول کسے ؎
بھول بیٹھا تو ہزاروں احساں ٭ ہو گیا ہم سے غلط کیا اب کچھ
اے ہمیں کچھ نہ سمجھنے والے ٭ کبھی ہم لگتے تھے تیرے سب کچھ

شعر نمبر ۷

خیر کا ہوتا ہے ظن غالب جہاں
کھینچ کر لاتے ہیں اس کو سُوئے شر

مشکل الفاظ خیر : بھلائی، نیکی ٭ ظن : اندازہ، احسان ٭ غالب : زیادہ، حاوی ٭ سُوئے شر : بُرائی کی جانب

تشریح مولانا حالی ہماری بگڑی ہوئی اخلاقی حالت کا رونا روتے ہوئے اس غزل میں اُن رویّوں کی نشاندہی کرتے چلے جاتے ہیں، جو اس زوال کے ذمّہ دار ہیں۔ اس شعر میں حالی ہماری نکتہ چینی اور خواہ مخواہ شک و شبہ کے اظہار کی عادت کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم دوسروں کے بعض ایسے کاموں کا جو خیر کے پہلو اپنے اندر رکھتے ہیں، بھی غلط اندازہ لگاتے ہیں، ان پر شک

کرتے ہیں اور اسے شر، فساد اور برائی کی طرف لے آتے ہیں۔ مراد یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی نیک نیتی سے کوئی کام کرتا ہے اور اس میں بھلائی کا پہلو واضح اور نمایاں نظر بھی آتا ہے، پھر بھی ہم اخلاقی بد دیانتی سے کام لیتے ہوئے اس کی نیت میں سَو سَو کیڑے نکالتے ہیں، شک و شبہ سے کام لیتے ہوئے اس کی غلط تعبیر کرتے ہیں اور اس میں خواہ مخواہ شر کا پہلو تلاش کرتے ہیں۔ حالاں کہ یہ نہ صرف پورے معاشرے میں نیک نیتی سے کام کرنے والوں کی حوصلہ شکنی کے مترادف ہے بلکہ گناہ بھی ہے۔ یہاں ہمیں ارشاداتِ خداوندی اور احادیثِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے والی ان تعلیمات کو پیشِ نظر رکھنا چاہیئے، جن میں مسلمانوں کو بد گمانیوں سے بچنے اور اپنے دوسرے مسلمان بھائیوں کے بارے میں حسنِ ظن سے کام لینے کے بارے میں کہا گیا ہے۔ مگر افسوس ہے ہمارا رویّہ بالکل برعکس ہو گیا ہے۔

بقول کسے ؎

بدگمانی کا اُڑاتا ہے غبار
جس بھی رستے سے گزرنا چاہوں
تجھ کو آتا ہے نظر شرؔ اس میں
مَیں کوئی خیر جو کرنا چاہوں

شعر نمبر ۸

بنتے ہیں یاروں کے ناصح تاکہ ہو
عیب اُن کا ظاہر اور اپنا ہُنر

مشکل الفاظ ناصح: نصیحت کرنے والا ❖ عیب: برائی ❖ ہُنر: خوبی ❖

تشریح اس شعر میں حالی کہتے ہیں کہ ہم اپنے یار دوستوں کے کاموں کے بارے میں اکثر انہیں نصیحت کرتے رہتے ہیں۔ روک ٹوک سے کام لیتے ہیں اور ناصحوں کی طرح جا بجا انہیں مشورے دیتے اور نصیحتیں کرتے ہیں۔ یوں اپنی نکتہ چینی سے ہم اُن کے عیب اور اُن کے گفتار و کردار کی خامیوں کو نمایاں کرتے رہتے ہیں۔ اس ناصحانہ کردار سے ہمیں اپنی برتری ثابت کرنا مقصود ہے تاکہ دیکھنے سننے والوں پر دوسروں کے عیب اور اپنے ہنر ظاہر ہوں، حالاں کہ نکتہ چینی، لعن طعن اور وعظ و نصیحت کا یہ انداز (جس میں کرنے والے کی بدنیتی شامل ہو) مناسب نہیں۔

بقول کسے ؎ نکتہ چینی کیلئے بھی اک سلیقہ چاہیئے ❖ ہو نہیں سکتے بڑے تم میرے پاؤں کاٹ کر

شعر نمبر ۹

دوست اِک عالم کے پر مطلب کے دوست
ایسے یاروں سے حَذَر یارو حَذَر

مشکل لفاظ دوست اک عالم کے : مراد وہ لوگ جو دنیا بھر کے دوست بنے ہوئے ہیں، اپنے آپکو سب کے دوست بتاتے ہیں ٭ مطلب کے دوست : مطلبی، خود غرض، اپنا مطلب نکالنے والا دوست ٭ حذر کرنا : بچنا، پرہیز کرنا، دُور رہنا ٭

تشریح حالی نے مقطع میں ایسے تمام لوگوں سے بچنے کی تاکید کی ہے جو دنیا بھر سے دوستی کا دم بھرتے ہیں، مگر ان کی دوستی کسی غرض اور مطلب پر قائم ہوتی ہے۔ اسی لئے وہ حقیقت میں کسی ایک کے دوست بھی نہیں ہوتے۔ حالی کہتے ہیں کہ اس طرح کے تمام لوگوں سے دُور رہنا چاہیئے کیونکہ ان کی قربت کسی وقت بھی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے اور وہ اپنا مطلب نکال لینے کے بعد دھوکا دے سکتے ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ اے دوستو، اس طرح کے مطلبی دوستوں سے ہوشیار رہو۔

اس شعر کا لطیف پہلو یہ ہے کہ حالی یاروں کی بات یاروں ہی سے کر رہے ہیں، اسی طرح شعر میں دوست، یار اور حذر کے لفظوں کی تکرار لفظی رعائتوں کو بھی جنم دے رہی ہے۔ حالی اگرچہ شاعری میں لفظی رعائتوں اور صنعتوں کے خوگر نہیں تھے، مگر یہ چیزیں چونکہ اس معاشرتی، ثقافتی اور ادبی فضا میں عام تھیں، اس لئے حالی کے ہاں بھی کہیں کہیں نظر آتی ہیں۔ اس شعر میں بھی اور اس غزل کے کئی دوسرے شعروں میں بھی غیر محسوس طریقے سے شعری صنعتوں مثلاً صنعتِ تضاد وغیرہ اور لفظی رعائتوں کے اثرات ملتے ہیں۔

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

درد اور درد کی ہے سب کے دوا ایک ہی شخص
یاں ہے جلّاد و مسیحا بخدا ایک ہی شخص

مشکل الفاظ جلّاد : مارنے والا، قتل کرنے والا ٭ مسیحا : چارہ گر، علاج کرنے والا، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نسبت سے شفا دینے والا یا مُردوں کو زندہ کرنے والا ٭ بخدا : خدا کی قسم ٭

تشریح مولانا حالی نے محبوب کی متضاد خصوصیتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا ہے، وہ ایک ایسی عجیب و غریب شخصیت کا مالک ہے کہ ہمیں ملنے والے تمام دکھوں اور غموں کا سبب بھی وہی ہے اور ان تمام تکالیف کا علاج بھی وہی ہے۔ بقول مولانا رومؒ : ؎

شاد باش اے عشقِ خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ عِلّت ہائے ما

(اے ہمارے خوش سودا عشق (اچھی اور طرفہ دیوانگی کے حامل عشق) خوش رہ کہ تُو ہی ہمارے

جملہ امراض اور بیماریوں کا طبیب ہے، یعنی تو ایک ایسی دیوانگی اور سودا ہے کہ تجھ ہی سے باقی تمام دُکھوں دردوں کا علاج بھی ہے) حالی کے شعر میں دُکھوں اور اُن کی دوا کو ایک ہی ذات سے منسوب کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عاشق کو سب سے بڑا غم محبوب کی دُوری کا یا اپنی محبت کے جواب میں ویسی محبت نہ مل سکنے کا ہوتا ہے۔ اسی کو ہماری شاعری میں دردِ عشق کہا جاتا ہے، اور محبوب کے کسی نہ کسی رویّے سے پہنچنے والی ہر تکلیف، دُکھ اور اذیت اِسی دردِ عشق یا غمِ عشق کے نام سے یاد کی جاتی ہے، چونکہ یہ درد و غم محبوب کے بے مہر رویّوں کی وجہ سے ہے۔ لہٰذا اس کا علاج بھی محبوب کے مہر و محبت بھرے جذبوں کے اظہار میں ہے، روزگار یا زمانہ کے غم ہوں تو ان کا علاج روپیہ پیسہ یا کسی دوسری چیز سے ہو جاتا ہے کسی انسان کی بے مہری اور بے رُخی کا مداوا تو اس کی اُلفت اور توجہ ہی سے ہو سکتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ہماری شاعری میں دردِ عشق یا غمِ عشق کا علاج بھی محبوب کی ذات کو بنایا گیا ہے۔

دوسرے مصرع میں "درد" اور "دوا" کے مفہوم کو زیادہ واضح کرنے کے لئے جلّاد اور مسیحا کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں، یوں درد اور دوا کی انتہائی صفات کے حامل لوگوں کی مثال سے حالی نے اپنے جذبات و احساسات کے بیان میں شدّت اختیار کی ہے۔ جلّاد قتل کرنے والا اور مارنے والا شخص ہے، جب کہ مسیحا شفا دینے والا، چارہ گر اور زندہ کرنے والا شخص ہے۔ حالی کہتے ہیں کہ ایک ہی شخص کے اندر دونوں خوبیاں جمع ہو گئی ہیں۔ وہ اگر ہم سے جُدا رہ کر ہمیں درد و غم میں مبتلا رکھے تو وہ جلّاد ہے اور اگر کبھی وہ ہمیں محبت سے مل کر ہمارے دکھوں دردوں کا مداوا بنے تو وہی ہمارا مسیحا ہے۔

اس شعر کے پہلے مصرع میں "سب کے" اور دوسرے مصرع میں "یاں" کے الفاظ شعر کے مفہوم کو ایک اور رُخ سے دیکھنے اور سمجھنے کی دعوت بھی دیتے ہیں۔ "سب کے" سے مراد یہ ہے کہ صرف ہم ہی اس طرح کی متضاد صفات رکھنے والے شخص کی بات نہیں کر رہے، یہاں سب لوگ اس سے اس طرح متاثر ہیں گویا وہ محبوب یا شخص ایک ایسی ذات ہے، جو بہت سے لوگوں یا بھرے شہر کے درد کا باعث اور علاج ہے۔ "یاں" کا لفظ کسی خاص جگہ، علاقہ یا شہر کی نشاندہی کرتا ہے۔ مراد یہ ہے کہ ممکن ہے دوسرے شہروں میں یا اور کہیں ایسا نہ ہو لیکن یہ عجیب واقعہ ہمارے شہر میں ہی رونما ہوُا ہے کہ یہاں جلّاد اور مسیحا ایک ہی شخص ہے۔

حالی کے اس شعر کو اگر وسیع تر حوالے سے دیکھا جائے تو علامتی انداز میں یہ اظہار اُن سیاسی رہنماؤں، اداروں، جماعتوں اور ملکوں کے متضاد رویّوں کی عکاسی کرتا ہے، جو پہلے لوگوں کو مختلف مسائل میں اُلجھا دیتے ہیں اور پھر خود ہی ان کے علاج کی کوششیں کرتے ہیں، جو ایٹم بم بھی

بناتے ہیں اور دنیا میں امن بھی بانٹتے ہیں۔

بقولِ کسے ؎
درد کی دوا ہم کو ایسے چارہ گر دے گا
زخم خود لگائے گا خود علاج کر دے گا

شعر نمبر ۲

قافلے گزریں وہاں کیوں کہ سلامت واعظ
ہو جہاں راہزن و راہنما ایک ہی شخص

مشکل الفاظ سلامت گزرنا: امن سے سلامتی سے گزرنا ٭ راہزن: لٹیرا، راستے میں لوٹنے والا ٭ راہنما: راستے میں لوٹنے والا ٭

تشریح حالی کے اس شعر میں بدلتے ہوئے اُن ذہنی رویّوں کی جھلک ملتی ہے جن کے سبب وہ قدیم غزل گوئی ترک کر کے جدید غزل کی طرف آئے۔ واعظ کا کردار اگرچہ غزل کا روایتی کردار ہے، مگر یہاں ایک الگ پس منظر رکھتا ہے۔ انگریز جو ہندوستان کی سیاسی، ثقافتی، سماجی اور معاشرتی قدروں کو پامال کرنے والا تھا اپنی نت نئی پالیسیوں اور منصوبہ بندیوں سے حالات کو سدھارنے اور یہاں کے لوگوں کو تعلیم و انصاف اور ملازمتیں دے کر خوشحال بنانے کا دعویدار بھی تھا وہ پورے ہندوستان کو محکوم بنا کر فرد کی آزادیٔ رائے کی بات کر کے اپنے طور پر گنوار اور وحشی لوگوں کو تہذیب و تمدن سے روشناس بھی کرا رہا تھا، پوری آبادی اور ملک پر غاصبانہ قبضہ کرنے والا عدل و انصاف قائم کرنے کے لئے علالتی نظام بھی جاری کر رہا تھا۔ اس صورتِ حال میں حالی کے اس شعر کا جائزہ (شائد زیادہ) غیر متعلقہ نہیں۔

یوں حالی واعظ پر طنز کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ اے نصیحت کرنے والے شخص، تو آپ ہی بتا اگر رہزنی اور رہنمائی کی صفات ایک ہی شخص میں جمع ہو جائیں تو قافلے سلامتی سے کیسے گزر سکتے ہیں۔ اگر راستہ دکھانے والا بھی وہی ہے، جو در اصل راستے میں لوٹنے والا ہے تو قافلے والوں کے امن و سلامتی کی ضمانت کیسے دی جا سکتی ہے؟

واعظ کے لفظ کو اگر غزل کے روائتی مفہوم میں دیکھا جائے تو وعظ و نصیحت کرنے والے کی منافقت پر ایک لطیف سا طنز محسوس ہوتا ہے کہ تم جو بظاہر لوگوں کی اخلاقی اصلاح کی رہنمائی کا فریضہ سر انجام دے رہے ہو، در پردہ اپنی غلط عادات کے سبب معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا سبب بن رہے ہو، اگر تمہارے طور اور اطوار یہی رہے، تو لوگوں کی (جو تمہارا وعظ و نصیحت سنتے ہیں) اصلاح کیسے ہو گی؟۔ بقول کسے ؎

اگر ہو راہنما، راہزن حقیقت میں ٭ تو اہلِ قافلہ امن و اماں میں کیسے رہیں

شعر نمبر ۳

قیس سا پھر نہ اُٹھا کوئی بنی عامر میں
فخر ہوتا ہے گھرانے کا سدا ہی ایک ہی شخص

مشکل الفاظ

قیس : مجنوں، مشہور عاشق ❖ بنی عامر : قیس کے قبیلہ کا نام ❖
فخر : عزت، وقار ❖ گھرانہ : گھر، خاندان ❖

تشریح

حالی کہتے ہیں کہ کبھی کبھار کسی خاندان یا قبیلہ میں ایک ایسا شخص پیدا ہوتا ہے جو پورے خاندان یا قبیلہ کے لئے شہرت کا سبب بن جاتا ہے۔ وہ مشہور عاشق قیس (جسے مجنوں بھی کہتے ہیں اور جو لیلیٰ کا عاشق تھا) کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ قبیلہ بنی عامر میں پیدا ہوا اور اس نے عاشقی میں اتنی شہرت حاصل کی کہ اب عشق و محبت کی داستانوں میں اس کا نام ہمیشہ کے لئے رقم ہو گیا، جہاں آنے والی ہر نسل اس کے بارے میں پڑھے گی۔ وہاں اس کے قبیلہ کا نام بھی زندہ رہے گا۔ مگر بنی عامر میں اس جیسا کوئی دوسرا آدمی پیدا نہ ہو سکا۔

حالی کی مراد یہ ہے کہ کبھی اپنی نسل میں کوئی ایک شخص اتنی شہرت حاصل کر لیتا ہے کہ اس نسل یا قبیلے میں اس طرح کا دوسرا مشہور آدمی پیدا ہونا مشکل ہو جاتا ہے، قیس بھی ایسا ہی شخص تھا اس کے بعد بنی عامر کے قبیلے میں کوئی مشہور آدمی پیدا نہیں ہوا جس پر وہ قبیلہ فخر کر سکے۔

بقولِ کسے ؎

وہ اہلِ عشق میں تھا کامران مرد ایسا
بھرا قبیلہ کرے ناز جس پہ فرد ایسا

شعر نمبر ۴

جمگھٹے دیکھے ہیں جن لوگوں کے ان آنکھوں نے
آج ویسا کوئی دے ہم کو دکھا ایک ہی شخص

مشکل الفاظ

جمگھٹا : لوگوں کی کثرت، ہجوم، مجمع ❖

تشریح

مولانا حالی زمانے کی ناپائیداری، زندگی کی بے ثباتی اور وقت کے گزر جانے کے بارے میں بہت سی باتیں اس شعر میں کہہ گئے ہیں۔ اس شعر کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بھی دن تھے کہ انتہائی باکمال لوگوں کی معیت ہمیں میسر تھی، محبت و شفقت والے دوست اور شعر و ادب سے وابستہ شخصیات ـــ! میری آنکھوں نے کن کن باکمالوں کے مجمع دیکھے ہیں، کیسے کیسے نامور اور معروف لوگ کتنی بڑی تعداد میں میرے آس پاس تھے، ان کی محفلیں برپا ہوتی تھیں اور لوگ اُن سے فیض یاب ہوتے تھے۔ افسوس ہے زمانہ کیسے کیسے لوگوں کو میری آنکھوں سے اوجھل کر گیا ہے۔ اب دُور دُور تک ان جیسا ایک بھی باکمال نظر نہیں آتا۔

مولانا حالی نے اپنی ایک غزل جس کا مطلع ہے :

تذکرہ دہلیٔ مرحوم کا اے دوست نہ چھیڑ
نہ سنا جائے گا ہم سے یہ فسانہ ہرگز

میں بھی ۱۸۵۷ء کے حادثے کے بعد کے ادبی و ثقافتی ماحول میں پیدا ہونے والے خلا کا انتہائی دلسوزی سے ذکر کیا ہے۔ حالی کا زیرِ بحث شعر بھی باکمال لوگوں کی محفلیں اجڑنے کے دکھ سے عبارت ہے۔ معاشرے میں کوئی بہت بڑا حادثہ رونما نہ بھی ہو، تو ایک ایک کر کے بزرگوں کو بہر حال موت کا ذائقہ چکھنا ہی ہوتا ہے، پھر جب چھوٹی نسل بزرگ ہوتی ہے تو وہ نئے آنے والوں کے لئے دنیا چھوڑ دیتی ہے، یوں قحط الرجال (بڑے اور عظیم لوگوں کا قحط) زمانے میں ہمیشہ رہتا ہے، کبھی کبھار یوں بھی ہوتا ہے کہ بہت سے باکمال اکٹھے ہی رخصت ہو جاتے ہیں۔ حالی کا یہ شعر ایسی ہی صورتِ حال کے بارے میں ہے کہ ہماری محفلیں جن لوگوں سے بھری پڑی تھیں اب ان جیسا شخص دُور دُور نظر نہیں آتا۔

بقولِ کسے

میسّر تھی ہمیں صحبت کبھی جن باکمالوں کی
نہیں ہے آج اک انسان بھی اُن سا زمانے میں

شعر نمبر ۵

گھر میں برکت ہے مگر فیض ہے جاری شب و روز
کچھ نہیں شیخ مگر ہے بخدا ایک ہی شخص

مشکل الفاظ

گھر میں برکت ہونا: اللہ کا کرم ہونا، یہاں مراد ہے کہ جب کوئی ظاہری مال و دولت یا روپیہ پیسہ گھر میں موجود نہ ہو، صرف اللہ کا نام رہ جائے، عام طور پر عورتیں کسی فقیر یا سائل کو رد کرنے کے لئے بولتی ہیں کہ گھر میں اب صرف برکت ہی رہ گئی ہے، مراد کچھ نہ ہونا۔

فیض جاری ہونا: عام لوگوں کیلئے فائدہ اور بہتری کی صورت جو مستقل رہے۔

بخدا : خدا کی قسم۔

تشریح

شیخ، واعظ، ناصح اور زاہد ہماری شعری روایت کے وہ کردار ہیں جن کے ظاہر اور باطن میں تضاد ہو، وہ کہیں کچھ اور کریں کچھ، قول و فعل کی دوئی اور گفتار و کردار کے منافقانہ رویوں کے سبب ہر دور کے فارسی اور اردو شاعروں نے اُن کی مذمت کی ہے اُن پر پھبتیاں کسی ہیں اور طنزیہ انداز میں اُن کا مذاق اڑایا ہے۔

حالی اس شعر میں اسی روایت کے زیرِ اثر شیخ کا مذاق اُڑاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ شیخ کے اپنے پاس تو کچھ نہیں جو دوسرے کو دے سکے، مگر اس کے گھر کے بارے میں یہ بات مشہور ہے

کہ اس کا فیض شب و روز جاری رہتا ہے اور جو کوئی اس کی چوکھٹ پر آتا ہے، وہ خالی ہاتھ نہیں لوٹتا، محروم شخص کسی کو کیسے نواز سکتا ہے، اس طرح کا انوکھا اور عجیب آدمی دنیا میں ایک ہی ہے، مراد یہ کہ اپنی خصوصیت کے سبب شیخ جہان بھر میں منفرد کردار کا مالک ہے۔

اس شعر میں لطیف طنز یہ ہے کہ ظاہری طور پر تو عموماً زاہد و شیخ کے گھر مفلسی ہوتی ہی ہے، مگر اپنے منافقانہ طرزِ عمل کی وجہ سے اُس کے اخلاق کا بھی دیوالیہ نکل چکا ہے، دنیا داری نے اس سے مذہبی و اخلاقی دولت بھی چھین لی ہے۔ اب جب کہ وہ آپ تہی دست ہے، وہ کسی کی جھولی کیسے بھر سکتا ہے مگر اس حقیقت حال کے باوجود چونکہ وہ لوگوں کو استفادے کی دعوت دے رہا ہے اُن کی مرادیں پوری کرنے کے دعوے کر رہا ہے، یہی اس کی وہ خصوصیت ہے جو اسے دنیا کے دوسرے لوگوں سے منفرد ٹھہراتی ہے۔

بقولِ کسے ؎ کیسے اخلاق سکھائے گا کوئی، کوئی بے اخلاق
جو تہی دست ہے کیا اور کو دے سکتا ہے

شعر نمبر ۶
اعتراضوں کا زمانے کے ہے حالی یہ نچوڑ
شاعر اب ساری خدائی میں ہے کیا ایک ہی شخص؟

مشکل الفاظ نچوڑ: خلاصہ ✧ خدائی: دنیا ✧

تشریح مولانا حالی کی اصلاحی تحریک کے سبب شاعروں کی ایک بڑی تعداد اُن کے خلاف ہو گئی تھی۔ مولانا حالی نے جب مسدس (اپنی معروف کتاب جو مسدس حالی کے نام سے مشہور ہے) لکھی تو اس مسدس کے خلاف بیسیوں مسدسیں لکھی گئیں اور ان میں حالی کی طرز اور بحر میں ان پر پھبتیاں کسی گئیں اور اُن کا مذاق اڑایا گیا۔ حالی کی شعری اصلاحی تحریک کا خلاصہ صرف یہ تھا کہ شاعروں کو مبالغہ، جھوٹ اور تصنع چھوڑ کر سیدھے سادے انداز میں شاعری میں زندگی کے حقائق اور درپیش مسائل بیان کرنے چاہئیں تاکہ شعر و سخن سے اصلاح کا کام لے کر معاشرہ کو اخلاقی و ذہنی اور مذہبی و دینی زوال سے نکالا جائے یعنی محض تفریح کے لئے شعر نہ کہے جائیں، بلکہ شعر کہنے میں ایک مقصدیت جھلکنی چاہیئے۔ اس دور کے مبالغہ اور تصنع پسند شاعروں کو شعری روایات سے حالی کا یہ اجتہاد بُرا لگا اور ان کی اکثریت حالی کے خلاف ہو گئی اور حالی پر طرح طرح کے اعتراض کرنے لگی۔

حالی اس شعر میں کہتے ہیں کہ حالی یہ جو زمانے بھر کے شاعر تمہاری شاعری پر طرح طرح کے اعتراضات کر رہے ہیں کہ تمہارے شعروں میں خشکی اور بے کیفی ہے، مقصدیت کا غلبہ ہے اور دلچسپی نام کو نہیں

تم نے شاعری کی سابقہ روائیتوں کے خلاف لکھ کر پرانی شعری قدروں کا مذاق اڑایا ہے اور اس طرح کے جو اور بیسیوں اعتراضات ہیں، اُن کا خلاصہ یہ ہے۔ "کیا اب دنیا میں حالی ہی ایک شاعر رہ گیا ہے؟"

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صرف حالی کو شاعر مان کر حالی کی تقلید کیوں کریں، دنیا میں اور ہزاروں شاعر بھی تو ہیں، جب وہ اس روایت میں شعر کہہ رہے ہیں اور دنیا انہیں شاعر تسلیم کر رہی ہے، تو حالی کی بات کیوں مانی جائے۔ عام طور پر ایسا ہر اصلاح پسند کے ساتھ ہوتا ہے اور اس کے "اجتہاد" کا شروع شروع میں یہی نتیجہ نکلتا ہے کہ لوگ خود اس کی حیثیت ہی مشکوک بنا دیتے ہیں۔ حالی بھی اعتراضات کی زد میں ہیں اور ان کی اپنی شعری حیثیت تسلیم نہیں کی جا رہی۔

بقولِ کسے ؎

دھواں اُگلتے ستارے مجھی پہ ٹوٹ پڑے
دیا جو طعنہ انہیں میں نے شب پرستی کا

غزل نمبر۳

شعر نمبر۱

اُن کے جاتے ہی یہ کیا ہو گئی گھر کی صُورت
نہ وُہ دیوار کی صُورت ہے نہ دَر کی صُورت

مشکل الفاظ وُہ سے مراد 'پہلے جیسی' پہلے طرح کی ہے ٭ دَر: دروازہ، چوکھٹ ٭

تشریح حالی نے اس شعر میں محبوب کے گھر سے چلے جانے کے بعد کی اُداسی کا ذکر کیا ہے، وہ کہتے ہیں۔ محبوب کے رُخصت ہونے کے بعد میرے گھر کا نقشہ ہی اور ہو گیا تھا۔ ماحول یوں بدل گیا تھا کہ مجھے اپنے ہی گھر کے در و دیوار اجنبی محسوس ہو رہے تھے، نہ دیواریں ہی پہلے جیسی دکھائی دیتیں تھیں، اور نہ دروازہ پہلے کی طرح لگ رہا تھا۔

ایسے شعروں کو کیفیات کے شعر کہتے ہیں جن میں کسی ذاتی تجربے یا واردات سے پیدا ہوئی کیفیت کا ذکر کیا جائے، یہ کیفیت محبوب کی رُخصتی سے پیدا ہوئی ہے کہ حالی اپنے گھر کو پہلے سے مختلف محسوس کر رہے ہیں۔ یہ دراصل ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جب انسان اندر سے بدل جائے تو اسے اپنا خارج بھی بدلا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ شاعر محبوب کے جانے کے بعد اُداس اور افسردہ ہے، اسی اُداسی اور افسردگی کی حالت میں اسے در و دیوار بھی اُداسی میں ڈوبے ہوئے نظر آتے ہیں۔

بقولِ ناصر کاظمی ؎

دل تو میرا اُداس ہے ناصر
شہر کیوں سائیں سائیں کرتا ہے

یہاں بھی شاعر اپنی داخلی کیفیت کے زیرِ اثر اپنے گھر کی فضا کو پہلے سے مختلف محسوس کر رہا ہے۔

بقولِ کسے ؎ اسے جب در پہ رخصت کر کے بوجھل دل سے گھر لوٹے
در و دیوار بھی افسردہ لگے مجھ کو

شعر نمبر ۲
کس سے پیمانِ وفا باندھ رہی ہے بُلبُل
کل نہ پہچان سکے گی گُلِ تر کی صُورت

مشکل الفاظ
پیمانِ وفا : دوستی نبھانے کا وعدہ، محبّت کا عہد۔
گُلِ تر : کھلا ہُوا پھُول، شاداب و تازہ پھُول۔

تشریح
حالی بلبل کو مخاطب کر کے اسے محبّت کے انجام سے باخبر کر رہے ہیں کہ تو آج کس شوق سے پھُول کے ساتھ دوستی نبھانے کا وعدہ کر رہا ہے (بُلبل مذکر بھی ہے اور مؤنث بھی) آج تجھے یہ شاداب مہکتا ہوُا تازہ پھُول کتنا خوبصورت لگ رہا ہے تو اس کی خوبصورتی سے متاثر ہو کر نہ صرف اسے دِل دے بیٹھا ہے بلکہ اب اس کے ساتھ عمر بھر کا ساتھ نبھانے کے قول و قرار کر رہا ہے، تم محبت کا عہد کرتے ہوئے اپنے محبوب کے بارے میں پوری طرح باخبر تو ہو جاؤ، کیوں کہ اس کے حسن و جمال کی حالت ہمیشہ یہ نہیں رہے گی یہ 'گُلِ تر' کبھی پژمردہ ہو جائے گا۔ یہ شاداب اور تازہ پھُول کل جب مُرجھا جائے گا، تو تجھ سے اس کی صُورت بھی نہیں پہچانی جائے گی۔

حالی کا مطلب یہ ہے کہ عارضی حسین اور وقتی طور پر اچھی لگنے والی چیزوں سے محبّت نہیں کرنا چاہیئے، کیونکہ ان کا حسن اور تاثر ہمیشہ برقرار نہیں رہتا۔ اس شعر میں بُلبل اور گُل عاشق اور محبوب کی علامتیں ہیں۔ حالی کہتے ہیں کہ محبت کرنے والے کو فانی چیزوں کے ساتھ دل نہیں لگانا چاہیئے! کیا حرج ہے اگر حالی کی اصلاح پسندانہ طبیعت کے پیشِ نظر ان علامتوں کو ایک اور وسیع تر حوالے سے دیکھیں، کہ بلبل آدمی ہے اور گُلِ تر دنیا کی لذّتیں، مسرّتیں اور خوشیاں۔ تو پھر اس کے مفہوم کا ایک اور رُخ یُوں نظر آئے گا کہ دنیا، اس کا حُسن اور اس کی لذّتیں فانی ہیں۔ یہ وقتی طور پر حسین اور دلکش ضرور لگتی ہیں مگر ہمیشہ کے لئے انسان کو سکون اور اطمینان نہیں بخشتیں تو پھر ایسی حالت میں اس دنیا سے دل کیوں لگایا جائے اور اس سے الفت و محبّت کے پیمان کیوں باندھے جائیں۔

بقولِ کسے ؎ پگھلی جاتی برف کے اوپر لکھیں کیا اپنا نام
اِس زوال آمادہ دنیا سے کہاں کی دوستی؟

شعر نمبر ۳

دیکھئے شیخ مصوّر سے کھنچے یا نہ کھنچے
صورت اور آپ سے بے عیب بشر کی صورت

مشکل الفاظ

مصوّر : تصویر بنانے والا ٭ بے عیب بشر: ایسا آدمی جس میں کوئی عیب نہ ہو ٭

تشریح

جیسا کہ پہلے کسی اور شعر کے حوالے سے اس شعری روایت کی نشاندہی کی جا چکی ہے جس کے زیر اثر شاعر لوگ زاہد، شیخ، واعظ اور ناصح کے منافقانہ رویّوں کی وجہ سے اُن کا مذاق اُڑاتے تھے اور اُن پر پھبتیاں کستے تھے، حالی نے بھی اس روایت کے زیر اثر (جو فارسی شاعروں سے چلی اور اُردو میں عام ہوئی) بہت سے شعر کہے، اس میں شیخ پر طنز کیا گیا ہے کہ وہ بے عیب ہے اور اس کے کردار میں کوئی خرابی نہیں وہ کبھی کسی گناہ کا مرتکب نہیں ہوا۔ شعر کے پس منظر میں یہ بات ہے کہ شیخ عام لوگوں کو ان کی غلطیوں اور خامیوں کے سبب ٹوکتا ہے، انہیں بہت سے کاموں سے منع کرتا ہے، بات بات پر نصیحت، تنبیہ، عذابِ دوزخ سے ڈرانے، دھمکانے کے سبب اور لوگوں کے گناہوں پر سرزنش کے سبب شاعر کے اندر ایک ردِّ عمل کی صورت پیدا ہو گئی ہے اور وہ طنزاً کہتا ہے کہ باقی تمام لوگ تو گناہوں سے بھرے پڑے ہیں اگر کوئی بے عیب ہے تو وہ شیخ ہی کی ذات ہے۔ حالانکہ بے عیب صرف خدا کی ذات اور پیغمبروں کی شخصیت و کردار ہوتے ہیں، عام لوگوں سے زندگی میں دانستہ یا نادانستہ کوئی چھوٹی بڑی غلطی سرزد ہو ہی جاتی ہے۔

حالی کہتے ہیں کہ شیخ نے دوسروں کے عیبوں کا تذکرہ اتنی کثرت سے کیا ہے کہ اب معاشرے میں صرف وہی ایک بے عیب آدمی رہ گیا ہے، اب اس پس منظر سے اُن کے ذہن میں ایک خیال پیدا ہوتا ہے، اور وہ ہے شیخ کی تصویر کھینچنے کا (تصویر کھینچنا تصویر بنانے کو کہتے ہیں، اگرچہ یہ لفظ آج کل میکانکی طریقوں یعنی کیمرہ وغیرہ سے تصویر بنانے کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے، مگر جن دنوں ہاتھوں سے تصویر بناتے تھے، ان دنوں یہ لفظ (کھینچنا) بنانے ہی کے لفظوں میں مروج تھا، جیسے لکیر کھینچنا، خط کھینچنا وغیرہ استعمال ہوتا ہے۔

حالی کہتے ہیں، تصویر بنانے والا شیخ کی تصویر بنانا چاہتا ہے مگر دیکھیں وہ اس میں کامیاب ہوتا بھی ہے یا نہیں۔ ان جیسے بے عیب آدمی کی صورت بھلا ہو بہو کیسے بن سکتی ہے؟ (یہاں "آپ سے" کے لفظوں سے مراد اُن جیسے یعنی شیخ جیسے ہے۔ قاری کو یہ احتمال نہیں ہونا چاہیئے کہ شاعر اس شعر میں شیخ سے مخاطب ہے شیخ مخاطب نہیں مگر "آپ سے"، کا اشارہ اسی کی طرف ہے اور اس کی وضاحت پہلے مصرع کی ساخت اور لفظی حوالہ خصوصاً دیکھئے سے ہو جاتی ہے)

شعر کا مفہوم صرف یہ ہے کہ تصویر بنانے والا ہو بہو کسی کی تصویر تو بنا ہی نہیں سکتا،

کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی خامی کا رہ جانا فطری امر ہے، بے عیب شخص کی تصویر بھی بے نقص ہونی چاہیئے۔ گویا مصوّر کو ایک چیلنج کا سامنا ہے اور اس شعر کا لطیف پہلو یہ ہے کہ شیخ اتنا پاکباز، بے نقص اور بے عیب ہے (چاہے اس نے اس کا ڈھنڈورا ہی پیٹا ہو) کہ اسے اپنی تصویر میں بھی کسی عیب یا نقص کا پایا جانا گوارا نہیں۔

بقول کسے ؎
نقص اک آدھ مصوّر سے بھی رہ جاتا ہے
ہُو بہُو کون بنا سکتا ہے تصویر تری

شعر نمبر ۴

واعظو آتشِ دوزخ سے جہاں کو تم نے
یہ ڈرایا ہے کہ خود بن گئے ڈر کی صُورت

مُشکل الفاظ

واعظ: وعظ کرنے والا ٭ جہاں: دنیا، مراد اہلِ جہاں، لوگ ٭

تشریح

حالیؔ کہتے ہیں کہ واعظ جب موت کے بعد کی زندگی کا ذکر کرتا ہے تو بہشت و فردوس کی نعمتوں کی بجائے وعظ سننے والوں کو جہنم کی آگ اور وہاں کی اذیتوں اور تکلیفوں کے بارے میں اتنی تفصیل سے بتاتا ہے کہ سننے والے وعظ و نصیحت سُن کر ڈر جاتے ہیں۔ واعظ کی مراد تو دوزخ کے عذاب کا ذکر کر کے لوگوں کو نیک اعمال کی طرف راغب کرنا ہوتا ہے کہ لوگ آنے والی زندگی کا سوچ کر اور وہاں گناہوں کے بدلے میں ملنے والی سزا کا سُن کر گناہوں سے تائب ہو جائیں اور نیکی کی روش اختیار کریں۔ لیکن واعظ کا انداز کلام ایسا ہے کہ سننے والوں پر خوف زیادہ طاری ہوتا ہے۔ حالیؔ کہتے ہیں کہ خوف اور ڈر کی باتوں کی کثرت اور تکرار سے خود واعظ کے چہرے پر بھی درشتی، سختی اور خوف کے آثار پیدا ہو گئے ہیں، اس کے وعظ اور کلام سے پیدا ہونے والا ڈر تو بعد کی بات ہے، اب لوگ اسے دیکھتے ہی خوف زدہ ہو جاتے ہیں اور انہیں اس کے چہرے سے بھی ڈر آتا ہے اور وہ اُن سے دور بھاگتے ہیں۔

بقولِ کسے ؎
ڈرانے والے یہ طرزِ خطاب کیسا ہے؟
عذاب آنے سے پہلے عذاب کیسا ہے؟

شعر نمبر ۵

میں بچا تیرِ حوادث سے نشانہ بن کر
آڑے آئی مرے تسلیم سپر کی صورت

مشکل الفاظ

حوادث: حادثہ کی جمع مراد مصیبتیں ٭ آڑے آنا: مدد کرنا ٭ تسلیم: پیش آنے والی ہر صورت کو برضا و رغبت قبول کر لینا، اپنے آپ کو خدا کے حوالے کرنا اور اسی کی

رضا پر راضی رہنا ✦ سپر: ڈھال

تشریح زندگی میں پیش آنے والی مصیبتوں کے بارے میں دو طرح کا ردِ عمل ہو سکتا ہے، ایک یہ کہ آدمی ان پر جلتا کڑھتا رہے، اور گلہ گزار رہے، جگہ جگہ تقدیر کا شکوہ کرے اور اپنے مزاج کو چڑچڑا، جھگڑالو اور شکائتی بنالے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ آدمی انہیں اپنی قسمت کا لازمی حصہ سمجھ کر قبول کرلے، اور اپنی تقدیر پر ہر حال میں راضی رہے، یوں صبر و رضا، ہمت اور برداشت کا مادہ اس کے اندر پیدا ہوگا اور یہ داخلی طور پر اسے توانائی، برداشت اور ہمت عطا کرے گا۔

مولانا حالی کہتے ہیں کہ میں جو مختلف حادثوں اور مصیبتوں کے تیروں کا نشانہ بن گیا ہوں یعنی مجھ پر مصیبتیں کثرت سے نازل ہوئی ہیں یہ ایک طرح سے میری موت کا سامان ہیں، لیکن تسلیم و رضا کی جو خصوصیت مجھے قدرت نے دی ہے، یہ ان مصیبتوں کے مقابلے میں میری ڈھال بنی ہوئی ہے، جس طرح ڈھال اپنی طرف آنے والے تیروں کو روک لیتی ہے، اسی طرح تسلیم و رضا کی عادت کے سامنے بڑی بڑی مصیبتیں بھی بے اثر ثابت ہوتی ہیں۔

بقولِ کسے ؎

رضا کی خو تھی محافظ مری سرِ میداں
میں پہلے حملے میں ورنہ بکھر گیا ہوتا

شعر نمبر ۶

حملہ اپنے پہ بھی اب بعدِ ہزیمت ہے ضرور
رہ گئی ہے یہی اک فتح و ظفر کی صورت

مشکل الفاظ ہزیمت: شکست ✦ فتح و ظفر: جیت، فتح ✦

تشریح مولانا حالی کا یہ شعر جدید اندازِ نظر کا حامل ہے اور بہت متاثر کرنے والا ہے، مفہوم یہ ہے، کہ انسان کی حقیقی شکست خارجی محاذوں پر نہیں اس کی اندر کی بے حسی سے ہوتی ہے، اگر وہ شکست کے احساس کو اپنے اندر زندہ رکھے اور اس احساس کی روشنی میں اپنی شکست کے اسباب کا جائزہ لے کر مستقبل کے معرکوں کے لئے از سرِ نو تیاری کرے تو اس کا یہ احساس، عمل اور تیاری بھی فتح ہی کی مختلف صورتیں ہیں۔

حالی کہتے ہیں ہر معرکے اور جنگ کے بعد اپنا محاسبہ بھی ضروری ہے۔ "اپنے پہ حملہ" کا مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کی طرح اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کا بھی جائزہ لینا چاہیئے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب انسان کسی خوش فہمی میں مبتلا رہنے کی بجائے حقیقت پسندی سے اپنے ذہن، مسائل اور حکمتِ عملی اور اس کے نتائج کا جائزہ لیں، بقول ایک فارسی شاعر

کے یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب تم حریفوں کی طرح اپنا جائزہ لو۔

ع یک دم منافقانہ نشیں در کمینِ خویش ٭ تاجملہ عیب ہائے تو روشن شود ترا

(کبھی ایک لمحے کیلئے اپنی گھات میں منافقوں (حریفوں) کی طرح بھی بیٹھو تاکہ تمہارے عیب تم پر واضح اور ظاہر ہو سکیں)

مولانا حالی کا یہ شعر شکست کے بعد کی صورت میں ایک حوصلہ مندی عطا کرتا ہے، پسپائی کے بعد کا یہ جائزہ اور اس کا احساس اگر باقی ہے تو یہ بھی ایک فتح مندانہ احساس ہے اور مستقبل کی فتوحات کی ایک نوید ہے۔ خدانخواستہ اگر یہ جائزہ اور اس کا احساس بھی نہ رہے، تو یہ حقیقی شکست ہے۔

بقولِ کسے ع سببِ شکست کا کیا تھا یہ فیصلہ بھی کرو
ملے جو وقت تو اپنا محاسبہ بھی کرو

شعر نمبر ۷

یوں تو آیا ہے تباہی میں یہ بیڑا سو بار
پر ڈراتی ہے بہت آج بھنور کی صورت

مشکل الفاظ بیڑا : کشتی ٭ بھنور : گرداب ٭

تشریح حالی کا یہ شعر علامتی مفہوم میں مسلمانوں کو درپیش مسائل و مصائب کا ترجمان ہے۔ یہاں بیڑا سے مراد اُمتِ مسلمہ اور بھنور سے مراد وہ مصیبتیں اور امتحانات ہیں جن سے وہ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے بعد دوچار تھی (اور آج بھی ہے) اور جس میں مسلمانوں کو اپنی بربادی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا تھا۔

مولانا حالی کہتے ہیں کہ ہماری کشتی پہلے بھی سو بار تباہی سے دوچار ہوئی ہے۔ ہم پر بڑی بڑی مصیبتیں ٹوٹی ہیں اور ہم نے بڑی بڑی مشکلات سہی ہیں، لیکن ہر بار کسی نہ کسی طرح ہماری کشتی صحیح سلامت کنارے تک پہنچ ہی گئی ہے، مگر اب جو حالات درپیش ہیں وہ ایک گرداب کی صورت مُنہ کھولے کھڑے ہیں اور ان میں سے کشتی کا بچ نکلنا معجزہ ہی ہوگا۔ خوف اور ڈر کی جس حالت میں ہم آج ہیں، اس سے پہلے کبھی نہیں تھے، اب تو بھنور کو دیکھ کر ہی بہت ڈر آرہا ہے۔

حالی کا یہ شعر ان کی مقصدیت پسندی اور اصلاحِ احوال کے جذبہ کی نشاندہی کرتا ہے، ایسے شعروں سے اُن کی مراد صحیح صورتِ حال کا جائزہ اور اس کے مقابلے کے لئے مسلمانوں کو تیار رہنے کی تلقین ہے کہ اس طرح کے بھنور جب بھی ملّتِ اسلامیہ کی کشتی کے راستے میں آئے ہیں، اتحاد و اتفاق اور جرأت و ہمّت ہی سے انہیں عبور کیا جاتا رہا ہے۔

سود رپردہ مفہوم میں بھی حالی حالات کی نزاکت اور اس کی شدت کا احساس دلا کر ان سے نمٹنے کے لئے تیار رہنے کی طرف توجہ مبذول کرا رہے ہیں۔

بقولِ کسے ؎
در پیش ہے اس بار سفر اور طرح کا
چمٹا ہے مری روح سے ڈر اور طرح کا
دل شدتِ آلام کا خوگر ہی نہیں ہے
میں اور طرح کا ہوں بھنور اور طرح کا

شعر نمبر ۸

اُن کو حالی بھی بلاتے ہیں گھر اپنے مہماں
دیکھنا آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت

تشریح یہاں شعر کا سارا لطف پہلے مصرع میں "بھی" کے لفظ سے ہے، شعر کا مفہوم واضح ہے کہ محبوب کو دوسرے جاہ و مرتبہ والے، مال و دولت والے، حسن و خوبی والے باکمال لوگ تو اپنے گھر آنے کی دعوت دیں، حیرت کی بات ہے کہ حالی بھی انہیں یہ دعوت دے رہے ہیں، اُن کو یہ کیا سوجھی؟

دوسرے مصرع میں پھبتی اور مذاق کے انداز میں کہا ہے 'آپ کی اور آپ کے گھر کی صورت تو دیکھو، مراد یہ ہے کہ نہ حالی اس لائق نظر آتے ہیں اور نہ اُن کا گھر محبوب کی تشریف آوری کے قابل دکھائی دیتا ہے۔

حالی کا یہ شعر محبوب کے رتبہ و خوبی کے مقابلے میں عاشق کی عاجزی و انکساری کی عکاسی کرتا ہے مصیبتیں سہہ سہہ کر اور جدائی کے غم برداشت کر کر کے اس کی جو حالت ہو گئی ہے وہ بھی خستہ و ماندہ ہے۔ بے توجہی اور غربت کے سبب گھر کے در و دیوار کا نقشہ بھی صحیح نہیں رہا۔ ایسے میں محبوب کو گھر آنے کی دعوت دینا اپنی حیثیت (اور اوقات) سے بڑی بات لگتی ہے اور یہی طنز اور پھبتی کا سبب بنی ہے۔ غالب کا بھی ایک شعر ہے:

؎ وہ آئیں گھر میں ہمارے خدا کی قدرت ہے
کبھی ہم اُن کو کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

مگر یہ شعر محبوب کے اچانک گھر آجانے سے پیدا ہونے والی حیرت کا اظہار کرتا ہے۔

حالی کے شعر میں مذاق اور پھبتی والی بات خود بلانے اور دعوت دینے سے پیدا ہوئی ہے۔

بقولِ کسے ؎
چاند تاریکیوں کے شہر میں اُترے کیوں کر
اُن کو کس مُنہ سے بلائیں؟ وہ یہاں کیوں آئیں؟

حسرت موہانی

(۱۸۷۵ء - ۱۹۵۱ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱

رسمِ جفا کامیاب دیکھئے کب تک رہے
حُبِّ وطن مستِ خواب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ

رسم، رواج - جفا، ظلم، جور - حبِ وطن، وطن کی محبت
مستِ خواب، نیند میں ڈوبی ہوئی، مدہوش

تشریح

حسرت موہانی اردو کے ان شاعروں میں سے ہیں جنہوں نے انگریزوں کے خلاف مسلمانانِ ہند کی طرف سے آزادی کی جدوجہد میں بھرپور حصہ لیا اور اس کے لئے قید و بند کی مصیبتیں بھی برداشت کیں - ان کی غزلوں کی بیشتر فضا رومانی اور غزل کے معروف مضامین سے عبارت ہے پھر بھی کہیں کہیں ایسے شعر مل جاتے ہیں جن میں سیاسی حالات اور قومی مسائل جھلکتے ہیں - حسرت کا یہ شعر اسی انداز کا ہے -

وہ اپنے ہم وطنوں کی بے حسی اور انگریزوں کے ظلم کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جفا کی رسم جانے کب تک کامیاب رہے (رسم کا لفظ یہاں جفا کے تسلسل کی نشاندہی کرتا ہے) مراد یہ ہے کہ جفا اب گاہ گاہے کی حدوں سے پھیل کر رواج یعنی ایک مستقل رسم بن گئی ہے - اور ہم اسے برداشت کئے جا رہے ہیں، اس کے عادی ہو گئے ہیں - یہ انگریزی حکومت کی کامیابی ہے کہ ہم اس کے ظلم اور ستم کے خلاف مزاحمت نہیں کرتے، اس کے خلاف متحد ہو کر لڑتے نہیں -

دوسرے مصرع میں ہم وطنوں کی قومی بے حسی کا رونا روتے ہوئے حسرت کہتے ہیں کہ وطن سے جو محبت انسان کو ہونی چاہیئے وہ ہم میں نہیں اور اگر کہیں ہے بھی تو وہ نیند میں مدہوش ہے - اہل وطن بھی بے حس ہیں اور ان کے دلوں کی گہرائی میں کہیں حبِ وطن کا جذبہ بھی محوِ خواب ہے -

"کب تک رہے" کی ردیف ایک خاص تاثر کی حامل ہے - حسرت کہتے ہیں کہ یہ صورتحال ہمیشہ تو نہیں رہنے کی لیکن اس کے بارے میں بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ کتنی دیر تک اور رہے گی یعنی انگریزی حکومت کب تک کمزور عوام پر ظلم ڈھاتی رہے گی اور جذبہ

حُبِ وطن سے عاری ہم وطن کب تک محوِ خواب رہیں گے۔ بقول کسے ؎

خارج سے منہ موڑ کے مست رہینگے اپنی جانوں میں
جانے کب تک قید رہینگے لوگ اپنے زندانوں میں

شعر نمبر ۲

دل پہ رہا مدتوں غلبۂ یاس و ہراس
قبضۂ حزم و حجاب دیکھیئے کب تک رہے

مشکل الفاظ

غلبۂ یاس، ناامیدی کا غلبہ، مایوسی کی شدید کیفیت۔ ہراس۔ ڈر، خوف
حزم، احتیاط۔ حجاب، شرم، حیا، جھجک۔

تشریح

یہ شعر بھی پہلے شعر کے ساتھ مربوط ہے اور اس میں بھی قومی مسائل و حالات ہی کا ذکر ہے۔ حسرت کہتے ہیں کہ ہمارے دلوں پر ایک مدت سے مایوسی اور ڈر کا غلبہ ہے

ہماری سیاسی محکومی ماضیٔ قریب کی بات نہیں، صدیوں کی غلامی کے سبب ہمارا رویہ آزاد قوموں والا نہیں رہا۔ ہمارے مزاج میں مایوسی اس درجہ رچ بس گئی ہے کہ اب ہمیں فوری طور پر کوئی توقع یا امید کی کوئی کرن نظر آنا مشکل ہے۔ مستقل ناامیدی اور دیرینہ مایوسی نے ہمیں ڈرپوک اور بزدل بنا دیا ہے۔

ہمارے جسم اور دماغ جھجک اور شرم کی احتیاط کے قبضہ میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ابھی ہمارے اندر بغاوت، جسارت حوصلہ و عزم کا پیدا ہونا مشکل ہے۔ دیکھیں کب وہ وقت آئے جب ہم اس مصنوعی شرم کا خول اتار پھینکیں اور انگریز کے روبرو صف آرا ہوں۔

حسرت کہتے ہیں کہ صدیوں کی مایوسی اور خوف کے سبب ہمیں اپنا حق مانگتے شرم سی محسوس ہو رہی ہے اور اپنے حق کی بات کرتے ہوئے ایک جھجک سی محسوس ہو رہی ہے لیکن یہ کیفیت آخر کب تک رہے گی۔ آخر ایک دن تو یہ جمود ٹوٹنا ہے! بقول کسے ؎

فضائے امن میں کب چہچہائیں گے پنچھی
چمن سے کب یہ ہوائے ہراس جائے گی

شعر نمبر ۳

تا بہ کجا ہوں دراز سلسلہ ہائے فریب
ضبط کی لوگوں میں تاب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ

تا بہ کجا، کہاں تک۔ دراز، طویل۔ سلسلہ ہائے فریب، دھوکے کے سلسلے
ضبط، برداشت۔ تاب، ہمت

تشریح
حسرتؔ کہتے ہیں کہ ریاکاری اور فریب ہمیشہ رہنے کی چیزیں نہیں، آخرکار سچائی اور حقیقت ظاہر ہوکر رہتی ہے۔ اپنے بعد کی سیاسی پالیسیاں اور نت نئی منصوبہ بندیاں جو انگریزی حکومت عوام کو بہلانے کے لئے کر رہی تھی انہیں حسرتؔ نے فریب کے سلسلوں سے تعبیر کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دھوکا اور فریب کی یہ کیفیت جانے ابھی اور کب تک رہے، ابھی تک لوگوں میں دھوکا اور فریب سہنے کی تاب ہے۔ ایک دن آئے گا جب ضبط اور برداشت کے سبھی بند ٹوٹ جائیں گے۔ اور وہ اس فریب کے پردے کو چاک کر دیں گے۔

اگر متحدہ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے دور کا بغور جائزہ لیا جائے تو اس کی بہت سی ایسی پالیسیاں نظر آتی ہیں جن کا مقصد عوام کو صرف اپنے مقصد کے لئے استعمال کرنا تھا۔ ان خودغرضانہ پالیسیوں سے وہ یہاں کے عوام کو ایک فریب اور دھوکا دے رہا تھا۔ ان کا مال و دولت لوٹ کر اپنے خزانے بھر رہا تھا اور تو اور یہاں کے لوگوں کو اپنی جنگ کی آگ میں جھونک رہا تھا اور انہیں حکومتِ برطانیہ کے وقار کے تحفظ کے لئے قربان کر رہا تھا۔ یہاں کے بے شعور، محکوم اور غریب عوام پندرہ بیس روپے ماہوار پر بھرتی ہوکر اس کے لئے دُور دیسوں کے اَن دیکھے محاذوں پر، اَن دیکھے آقاؤں کے لئے اپنی زندگی کی بازی داؤ پر لگا رہے تھے حسرتؔ موہانی جیسے باشعور دانشور اس ساری صورتِ حال کا دردمندی سے جائزہ لے رہے تھے۔ انہیں یقین تھا کہ فریب وظلم کے یہ سلسلے زیادہ دیر تک رہنے کے نہیں کبھی تو لوگوں کو حقیقتِ حال کا شعور ہوگا۔ ان کی قوتِ برداشت جواب دے گی۔ صبر اور ضبط کے پیمانے لبریز ہو جائیں گے اور وہ ظلم وفریب کے پھیلتے ہوئے سلسلوں کا جال توڑ کر آزادی کی جدوجہد کو اور تیز کر دیں گے۔ بقول کسے ؎

طلوع ہوگی حقیقت شبِ فریب کے بعد
نہیں سدا کے لئے یہ سراب رہنے کا

شعر نمبر ۴
پردۂ اصلاح میں کوششِ تخریب کا
خلقِ خدا پر عذاب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ
پردۂ اصلاح، اصلاح کے پردے ہیں، بہتری کے نام پر۔ کوششِ تخریب، خراب کرنے، برباد کرنے کی کوشش۔ خلقِ خدا، خدا کے بندے عوام الناس، لوگ۔

تشریح گزشتہ شعر کی تشریح میں جو بات کہی گئی، یہ شعر بھی اسی صورتِ حال کی نشان دہی کرتا ہے۔ انگریز اپنے طور پر یہاں کے لوگوں کی بہتری اور اصلاح کے منصوبوں کا اعلان کر رہا تھا مگر درپردہ ان کی سماجی، معاشرتی، اخلاقی، مذہبی اور ثقافتی قدروں کی تباہی کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ لوگوں کو تعلیم دے رہا تھا مگر ایک خاص نصاب کے مطابق جس کا مقصد صرف کلرک تیار کرنا تھا تاکہ اسے انگلینڈ سے مہنگی تنخواہوں پر ملازم منگوانے کی بجائے یہیں سے سستے داموں مقامی لوگ دستیاب ہو جائیں۔ ریلوے لائن بچھا رہا تھا مگر صرف ان علاقوں میں جہاں سے وہ خام مال انگلینڈ لے جانے کے لئے بندرگاہوں تک لے جا سکے اور بوقتِ ضرورت بغاوت وغیرہ کی صورت میں اپنی فوج اور جنگی سامان کی نقل و حرکت کر سکے۔ مقامی زبانوں کا علمی رتبہ پامال کر کے انگریزی زبان کو رواج دے رہا تھا۔ مولانا حالی اور اکبر الٰہ آبادی کی شاعری میں سینکڑوں مثالیں مل جائیں گی۔ جن میں انہوں نے انگریز کی ایسی ہی متضاد پالیسیوں کی نشاندہی کی ہے جنہیں عوام کی اصلاح کے نام پر جاری کیا گیا مگر جن سے مراد ان کی اخلاقی و مذہبی اور ثقافتی و اقتصادی بربادی تھی۔ حسرت کہتے ہیں کہ انگریز کے قول و فعل کی دوئی کا یہ عذاب دیکھیں اور کب تک رہتا ہے، بقول کسے ؎

باغباں سینچتا ہے اپنے لئے پیڑوں کو
آخرِ کار انہیں ڈھیر کرے گا اک دن

شعر نمبر ۵

نام سے قانون کے ہوتے ہیں کیا کیا ستم
جبر بہ زیرِ نقاب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ

ستم، ظلم

جبر بہ زیرِ نقاب، درپردہ ظلم۔ نقاب یا پردے میں ظلم۔

تشریح یہ غزل مسلسل مختلف حوالوں سے حسرت کے عہد کی سیاسی صورتِ حال کو واضح کر رہی ہے۔ حسرت کہتے ہیں کہ ایسے ایسے قانون بنائے جا رہے ہیں جن کا مطلب صرف رعایا پر ظلم و ستم ہے۔ حکومت نقضِ امن کے اندیشہ کے قانون کے تحت آزادی کے مجاہدوں کو گرفتار کر رہی ہے۔ سچی بات کہنے اور انگریز کے ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں کو باغی کہہ کے گرفتار کیا جاتا ہے۔ کسی کو پھانسی کی سزا دی جا رہی ہے۔ کسی کو کالا پانی بھیجا جا رہا ہے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی سے لے کر جلیانوالہ باغ کے حادثے تک اور مسجد کانپور سے لیکر مسجد شہید گنج کے سانحے تک قانون برقرار رکھنے اور امن و امان قائم کرنے کے لئے نہتے لوگوں

پر گولیاں چلائی گئیں اور انہیں موت کے گھاٹ اتارا گیا۔ اس سے بڑھ کر ظلم کیا ہوگا کہ بہادر شاہ ظفر آخری مغل فرمانروا کو جو "الزام نامہ" دیا گیا اس میں یہ کہا گیا کہ اس نے کمپنی کے خلاف رعایا کو بھڑکایا ہے اور باغیوں کی مدد کی ہے۔ اور یوں مجاہدین آزادی باغی قرار دیئے گئے اور تحریک آزادی کو غدر کا نام دیا گیا۔ حسرت اس سارے پس منظر سے بخوبی آگاہ تھے اور انہیں علم تھا کہ پردے کے پیچھے ظلم و ستم مسلسل ہو رہا ہے۔ بظاہر یہ نظر نہیں آتا مگر حقیقت اہل فکر سے مخفی نہیں۔

اس شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ دیکھیں در پردہ ظلم کی یہ فضا کب تک قائم رہتی ہے۔ اور امن و امان کے نام پر کب تک جبر کو رواج دیا جاتا رہے گا۔ بقول کسے ؎

عجب ضیا ہے اندھیرے اگلتے سورج کی
سحر کے نام پہ شب کا نفاذ کرتی ہے

شعر نمبر ۶

دولتِ ہندوستان قبضۂ اغیار میں
بے عدد و بے حساب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ

دولت، سونا چاندی، مال، خزانہ، دولت مملکت اور حکومت کو بھی کہتے ہیں۔ قبضۂ اغیار، غیر کے قبضہ میں، باہر سے آنے والے لوگوں یعنی انگریز کے قبضہ میں۔ بے عدد و بے حساب، بغیر کسی گنتی اور حساب کے، مراد بے حد۔

تشریح

مولانا حسرت موہانی نے اس شعر میں وہ بات وضاحت سے کر دی ہے جو وہ پہلے شعروں میں دبے دبے لفظوں میں اور اشاروں میں کرتے رہے ہیں۔ دولت ہندوستان سے مراد ہندوستانی حکومت اور اس کے وہ تمام وسائل ہیں جن پر ان دنوں انگریز کا قبضہ تھا اور قبضہ بھی ایسا کہ کوئی اسے پوچھنے والا بھی نہیں تھا۔ ہندوستان جسے سونے کی چڑیا کہا جاتا تھا انگریز کے پنجۂ حرص و اقتدار میں تھی اور انگریز اس کے وسائل کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہا تھا۔ غیر ملکی آقاؤں کو خوش کرنے کے لئے مقامی آبادی کے بہت سے لوگ بھی اس لوٹ کھسوٹ میں ان کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔ خام اجناس، سونا چاندی اور زر و جواہرات سے لے کر یہاں کے ثقافتی شہ پارے، کتابیں اور تاریخی نوادرات تک شہر شہر سے اکٹھے کئے جاتے۔ انگریز کے کارندے انگریز کو خوش کرنے کے لئے یہ تمام سرمایہ اور اثاثہ از خود اس کے قدموں پر ڈھیر کرتے اور یوں بغیر کسی حساب و کتاب کے ہندوستان کی ہر طرح کی دولت انگلستان پہنچ جاتی۔ اس صورت حال کے بارے میں مصحفی کا یہ شعر بھی دیکھئے۔

ہندوستاں کی دولت و حکمت جو کچھ کہ تھی
کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

حسرت کہتے ہیں کہ ہندوستان کی حکومت اور مال و دولت پر سمندر پار سے آئے ہوئے غیروں کا قبضہ جانے اور کتنی دیر رہے گا؟ وہ یہاں کی بے حد و بے حساب دولت کو جانے کب تک لوٹتے رہیں گے۔ بقول کسے ؎

شاخ ہر نخل ہے حیران و تہی دست کھڑی
باغ کو لوٹ گئے سیر کو آنے والے
کون تھے، آئے کدھر سے تھے، صبا جانتی ہے
لالہ و گل کی مہک تک کو چرانے والے

شعر نمبر ۷

ہے تو کچھ اکھڑا ہوا بزم حریفاں کا رنگ
اب یہ شراب و کباب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ

بزم حریفاں، دشمنوں کی محفل۔ رنگ اکھڑنا، بے رونقی ہونا، رنگ منتشر ہونا
شراب و کباب، عیش و عشرت۔

تشریح

اس شعر میں حسرت اپنے عہد کی بدلتی ہوئی صورتِ حال کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ حسرت کے دور کی فضا ۱۸۵۷ء کے فوراً بعد والی فضا سے مختلف تھی۔ لوگوں کا سیاسی شعور بیدار ہو رہا تھا۔ ان میں آزادی کے لئے تڑپ پیدا ہو چکی تھی۔ سیاسی جماعتیں بن رہی تھیں اور ان کے پلیٹ فارموں سے "ہندوستان چھوڑ دو" کے نعرے لگ رہے تھے جن سے انگریز بوکھلایا ہوا تھا۔ حسرت اس بدلی ہوئی فضا کو دیکھ رہے تھے۔ ان کا یہ شعر بتاتا ہے کہ دشمن کی محفل کا رنگ اکھڑنے والا ہے اور کچھ دیر میں یہ محفل اجڑ جائے گی۔ اس کی عیش و عشرت کا یہ انداز شراب و کباب کی یہ رغبت اور نادٔ و نوش کا یہ شوق بس اور کچھ دیر کا ہے۔

بعد میں حسرت موہانی نے یہ بات حقیقت بنتی ہوئی اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔ انگریز کو یہ ملک چھوڑنا پڑا اور بالآخر یہاں کے عوام کی جدوجہدِ آزادی کامیاب ہو کے رہی حسرت کا یہ شعر انگریزی حکومت کے دورِ زوال کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ بقول کسے ؎

میں یوں ڈٹا رہا اپنے محاذِ موقف پر
غنیم ہو گیا ہتھیار پھینکنے والا

شعر نمبر ۸

حسرتؔ آزاد پر جورِ غلامانِ وقت
از رہِ بغض و عتاب دیکھئے کب تک رہے

مشکل الفاظ حسرتؔ آزاد، آزاد حسرتؔ، آزادی پسند، آزاد رہنے والا حسرتؔ، جور، ظلم و ستم - غلامانِ وقت، وقت کے غلام، وقت کے ساتھ چلنے والے، مراد ابن الوقت - از رہِ بغض، بغض اور کینہ کے طور پر - عتاب، ظلم -

تشریح اس شعر میں حسرتؔ نے اپنی آزادی پسند طبیعت اور وقت کے ساتھ چلنے والے زمانہ سازوں اور ابن الوقت قسم کے لوگوں کے رویوں کا ذکر کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ میں آزادی کا دلدادہ ہوں، آزادی کا طلب گار ہوں، اور اپنے موقف (رائے) کے اظہار میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتا، نہ قید و بند کی صعوبتوں سے ڈرتا ہوں (یہ سارے رویے حسرتِ آزاد کی ترکیب سے جھلکتے ہیں یعنی اپنی طبیعت، مزاج اور سرشت کے لحاظ سے آزاد رہنے والا شخص جو فطرتاً کسی کی غلامی اور محکومی برداشت نہ کر سکے -

میرے برعکس وہ لوگ بھی ہیں جو زمانہ ساز ہیں، جو وقت کے ساتھ ٹکرانے کی بجائے اس سے مفاہمت اور مصالحت اختیار کرتے ہیں - یہ ابن الوقت قسم کے لوگ جو خود وقت کے غلام ہیں، میری آزاد طبیعت پر ظلم و ستم کرتے رہتے ہیں - مجھ پر ان کی یہ زیادتی صرف بغض و کینہ کی وجہ سے ہے - انہیں چونکہ خود آزادی کا جذبہ پسند نہیں اور یہ غلام رہنے میں خوش ہیں اس لئے یہ میری آزادیٔ افکار اور جذبۂ حریت کو بھی پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھتے، اس سے خائف ہیں اور یوں میرے خلاف اپنے بغض اور ظلم و جور کا اظہار کرتے رہتے ہیں لیکن اب وقت بدل رہا ہے - دیکھیں میری طبعِ آزاد پر ان کا یہ ظلم کب تک رہتا ہے - بقول کسے ؎

سارے ابن الوقت، زمانہ ساز مخالف ہیں میرے
ایک دیئے پر جھپٹ رہی ہے ظلمت چاروں جانب سے
روشنی پُر امید ہے آخر جیت اُسی کی ہونی ہے
چڑھتے دن نے کیا گھبرانا، ڈھلتی صبحِ کاذب سے

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

نگاہِ ناز جسے آشنائے راز کرے
وہ اپنی خوبیٔ قسمت پہ کیوں نہ ناز کرے

مشکل الفاظ نگاہ ناز، محبوب کی نازو ادا سے بھری آنکھ، مراد محبوب کی ناز والی نظر۔ آشنائے راز کرنا، راز سے واقف کرنا، خوبیٔ قسمت، خوش قسمتی۔

تشریح اس غزل کا مزاج حسرتؔ کی پہلی غزل کے برعکس رومانی ہے۔ اس کے اشعار میں عشق و عاشقی کے مضامین اور خالص تغزل کا وہ رنگ نظر آتا ہے جو حسرتؔ کے کلام کی خصوصیت ہے۔ ہماری پرانی غزل میں عام طور پر شاعر محبوب کے بے مہر رویوں کا گلہ گزار رہتا ہے اور قدم قدم پر اس کی بے مہری اور کج ادائی کا شکوہ کرتا نظر آتا ہے۔ محبوب اپنے آشنا کی طرف دیکھتا ہی نہیں چہ جائیکہ وہ اسے اپنا واقفِ راز کرے۔ اگر کبھی محبوب کا رویہ اپنا شفیقانہ ہو جائے کہ محبوب اپنے چاہنے والے کو اپنے دل کا محرم بنا لے تو چاہنے والے کی اس سے بڑی خوش قسمتی اور کیا ہو سکتی ہے۔

حسرتؔ کا یہ شعر اس مضمون کا اظہار کرتا ہے۔ محبوب کی بجائے نگاہِ ناز کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں جو شعر کو ایک لطیف پیرایۂ اظہار عطا کرتے ہیں۔ محبوب کا نازو ادا سے بھری آنکھوں (مراد خوبصورت آنکھوں) کے ذریعے چاہنے والے کو اپنے رازوں کا آشنا بنا لینا اس کے لئے مسرت اور خوش قسمتی کا باعث ہے۔ حسرتؔ کہتے ہیں کہ اگر محبوب اپنی حسین آنکھوں سے کسی کو اپنی محبت اور زندگی کے دوسرے اہم رازوں کا محرم بنا لے تو وہ شخص اپنی خوش قسمتی پر جتنا بھی خوش ہو، جتنا بھی ناز اور فخر کرے، بجا ہے۔ آشنائے راز کرنا گہری دوستی کا ثبوت ہے۔ جن لوگوں کو محبوب کی اتنی گہری دوستی میسّر ہو وہ اپنی خوش قسمتی پر کیوں نہ ناز کریں اور کیوں نہ اتراتے پھریں۔ بقول سعیدہ رشم ؎

جنہاں دا ہتھ یار دے موڈھے
ترکھے ترکھے ٹھلدے نیں

(جن لوگوں کا ہاتھ محبوب کے کاندھے پر ہوتا ہے وہ اس غرورِ مقدر، وفورِ مسرت اور سرورِ محبت کے سبب اٹھلا اٹھلا کے چلتے ہیں، بقول کسے ؎

اوہ مدھ بھریاں اکھیاں جینوں راز عشق سمجھائے
اپنی بھاگ بھری سدھر تے کیوں نہ اوہ اترائے

شعر نمبر ۲

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد
ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے

مشکل الفاظ فکرِ دو عالم، دونوں جہانوں کا فکر، دنیا اور آخرت کے بارے میں آدمی کی سوچ بچار کہ یہاں کے مسائل کیا ہیں، ان سے کیسے نمٹا جائے نیز یہ کہ اگلی

دنیا میں انسان کے ساتھ جو ہوگا اس کے بارے میں فکر، خوف اور اندیشے ۔ آزاد، فارغ جنوں، وحشت، دیوانگی خصوصاً محبت سے پیدا ہونے والی سلسلہ دراز کرے، یہ دعائیہ جملہ ہے جیسے کہتے ہیں انسان کی عمر دراز ہو۔ جنوں کے حوالے سے کہا گیا ہے کہ خدا اس کا سلسلہ دراز کرے مراد جنوں مؤثر ہو، دیرپا ہو اور اس کا قبضہ و غلبہ دُور دُور تک ہو۔

تشریح حسرت کہتے ہیں کہ ہمیں کئی طرح کے فکر اور اندیشے تھے، دنیا کے بہت سے مسئلے تھے اور ان کے بارے میں طرح طرح کے اندیشے دن رات تنگ کرتے تھے۔ اسی طرح آخرت کے بارے میں بھی فکر تھی کہ زندگی تو بے کار کٹی اور کوئی نیک کام نہ کیا، وہاں کس منہ سے جائیں گے اور وہاں ہمارے ساتھ کیا سلوک ہوگا؛ ان سب باتوں، مسئلوں اور معاملات کے بارے میں ہر وقت سوچ بچار اور فکر و اندیشہ جان کو کھائے جارہا تھا مگر یہ سب کچھ تمہاری محبت سے پہلے کی بات ہے۔ جب ہم تم سے آشنا نہیں تھے اور تمہاری محبت نے بڑھ کر جنون کا رنگ اختیار نہیں کیا تھا۔ اب تمہاری محبت کے بخشے ہوئے جنون نے ہمیں ایک ایسی کیفیت میں مبتلا کردیا ہے کہ نہ تو ہمیں دنیا کے بارے میں کوئی فکر ہے اور نہ ہی آخرت کے بارے میں کوئی خوف ہے ہمارے سوچنے سمجھنے کی سب صلاحیتوں پر تمہاری محبت کا ایسا غلبہ اور قبضہ ہے کہ ہمارے ذہن میں تمہارے علاوہ کوئی اور بات آتی ہی نہیں۔

حسرت نے اس شعر میں ایک نفسیاتی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جب آدمی کسی جذبہ، لگن یا محبت کی حد سے بڑھی ہوئی حالت یا کیفیت کے زیرِ اثر ہو تو گرد و پیش کے باقی مسئلے، چیزیں اور معاملے سب پس منظر میں چلے جاتے ہیں۔

دوسرے مصرع میں حسرت کہتے ہیں کہ تمہاری محبت کا بخشا ہوا جنوں ہمارے حق میں کتنی بڑی نعمت ثابت ہوا کہ ہم ایسے ایسے غم بھول گئے جو اور کسی طرح بھولتے ہی نہیں تھے اور ہمیں رات دن فکر و اندیشہ میں مبتلا رکھتے تھے۔ اب ہم سرمستی، وجد، فراغت اور بے فکری کی حالت میں مزے کر رہے ہیں خدا تمہاری محبت کے بخشے ہوئے جنون کی گرفت اور مضبوط کرے۔ اسکے اثرات دُور دُور تک اور دیر تک رہیں۔ خدا اس سلسلہ کو اور وسیع اور اس کیفیت کو اور مؤثر کرے۔ بقول کسے ؎

گئے کیسے کیسے جان لیوا دکھ ہم کو گھیرے رہتے تھے
تیرے پیار کا صدقہ ہے جو ہم ہر فکر سے دُور ہوئے

شعر نمبر ۳

خرد کا نام جنوں پڑ گیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

مشکل الفاظ خرد، شعور، عقل - جنون، دیوانگی، وحشت - کرشمہ ساز، کرشمہ کسی عجیب اور انوکھی بات کو کہتے ہیں - کرشمہ ساز کا مطلب ہے عجیب و غریب کرشمے یا شعبدے دکھانے والا -

تشریح مولانا حسرت کا یہ شعر بہت مشہور ہے معاشرتی و سیاسی صورتِ حال میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے حوالے سے یہ شعر اکثر حکام اور سیاست دانوں کے ضمن میں استعمال ہوتا رہتا ہے - حسرت محبوب سے مخاطب ہو کر کہتے ہیں کہ تمہارا حُسن نت نئے شعبدے دکھاتا ہے یہ ایک ایسا شعبدہ گر یا کرشمہ ساز ہے جو اپنی مختلف حرکات سے نئے نئے کام کرتا رہتا ہے اور تو اور اس کی وجہ سے اب لوگ خرد کو جنون کہہ دیتے ہیں اور جنون کو خرد - تمہارے حُسن کے کرشموں نے ان الفاظ کا مفہوم ہی بدل دیا ہے - عدیم ہاشمی کا یہ شعر دیکھئے ؎

اب خرد مندوں کی پہچان کا معیار ہے تو
اب خرد مند ہے وہ جو ترا دیوانہ ہے

حسرت نے اس شعر میں کہا ہے کہ وہ لوگ زندگی میں کامیاب اور سرخرو ہیں - جو سب کچھ چھوڑ کے تیرے دیوانے بن گئے - اب لوگ لاکھ انہیں بے وقوف اور دیوانے کہیں وہ تو سب سے سیانے نکلے کہ انہوں نے ظاہری فائدوں اور دنیاوی جاہ و منصب اور ترقی کے بجائے تیری محبت میں بے خود و مست رہنا قبول کیا اور وہ لوگ جو سمجھتے تھے کہ حسن سے متاثر ہونے اور محبوب سے وابستہ ہونے میں نقصان اور خسارہ ہے اور وہ اس سبب محبوب کے حسن سے متاثر ہونے کی بجائے اس سے کنارہ کش ہو گئے انہوں نے اپنی دانست میں تو عقل کا کام کیا مگر دراصل یہ ان کی بے وقوفی اور پاگل پن تھا حسرت کی مراد یہ ہے کہ محبت میں محو ہو کر دنیا سے کٹ جانا ہی سب سے بڑی کامیابی ہے اور محبت سے دُور رہ کر کوئی دنیاوی ترقی حاصل کرنا سب سے بڑا خسارہ ہے - گویا عشق و حسن سے وابستگی میں اہمیت ان سے دوری میں نہیں - چونکہ یہ بات دنیا والوں کے خیالات کے برعکس ہیں اس لئے حسرت کہتے ہیں کہ تمہارے حسن کی کرشمہ سازیوں کی وجہ سے خرد اور جنون کے تصورات کے مفہوم ہی بدل گئے ہیں -

یہ شعر ایک لطیف طنز کا حامل بھی ہے - معاشرے میں اپنے عمومی استعمال میں یہ شعر اسی لطیف طنزیہ مفہوم میں استعمال ہوتا ہے خصوصاً ایسی صورتِ حال میں جب کوئی شخص کوئی غلط بات کہے مگر اپنی دانست میں اسے مفید اور کار آمد سمجھ رہا ہو یا اصلاح کے نام پر معاشرے میں کسی خرابی کو رواج دے رہا ہو بقول کسے ؎

عشق کی دنیا عجیب ہے اسکی مرگ و زندگی نفع و ضرر سب ہی جدا
اس کی لغت میں ہر کسی جذبے کا، ہر اک لفظ کا مفہوم و مطلب ہی جدا

شعر نمبر ۴

ترے ستم سے مَیں خوش ہوں کہ غالباً یوں بھی
مجھے وہ شاملِ اربابِ امتیاز کرے

مشکل الفاظ

ستم، ظلم ۔ غالباً، یقیناً، ضرور ۔
شامل اربابِ امتیاز کرنا، ممتاز لوگوں میں شامل کرنا ۔

تشریح

عام طور پر لوگ ظلم و ستم کو بُرا سمجھتے ہیں اور اس کے بارے میں شکوہ شکایت سے کام لیتے ہیں ۔ مگر حسرتؔ کہتے ہیں کہ محبوب کا ظلم و ستم تکالیف کا باعث نہیں بنتا بلکہ تسکین اور خوشی کا موجب ہوتا ہے ۔ عاشق اس پر گلہ گزار ہونے کی بجائے اس پر اطمینان کا اظہار کرتا ہے اور اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہے ۔

حسرتؔ کہتے ہیں کہ محبوب ہر ایک پر ظلم و ستم بھی نہیں کرتا خاص خاص لوگ ہیں جو محبوب کے ظلم سہنے کی سعادت کے اہل ہوتے ہیں ۔ مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ محبوب نے مجھے اس قابل سمجھا اور مجھے اپنے خاص نیازمندوں میں شامل کیا جو اس مرتبہ اور سعادت کے اہل ہیں ۔

اس شعر میں "ترے" اور "وہ" کے الفاظ مفہوم کے سمجھنے میں ایک رکاوٹ کا سبب بنتے ہیں ۔ اگر "ترے" کا لفظ محبوب کیلئے ہے تو "وہ" کا لفظ عاشق اور محبوب کے علاوہ کسی تیسری ذات یا زمانہ کے لئے ہے ۔ اس طرح شعر کا مفہوم یہ ہو گا کہ اے محبوب ترے ستم کے سبب وہ (دنیا والے، زمانہ یا دوسرا کوئی شخص رقیب وغیرہ) مجھے خوش قسمت لوگوں میں شمار کرے گا اور مجھے اس لئے لوگوں سے مختلف خیال کرے گا کہ تجھ جیسے عظیم و حسین نے مجھے (ظلم ہی کے سہی) کسی قابل سمجھا ۔ اور اگر "وہ" کا لفظ محبوب کے لئے ہے تو پہلے مصرع میں ترے کا لفظ لازماً کسی اور کے لئے ہے، زمانہ، قسمت وغیرہ کے مفہوم میں ۔ پھر اس شعر کا مطلب یہ ہو گا کہ میرے محبوب کو خستہ و ماندہ دکھی اور مظلوم لوگ زیادہ پسند ہیں اس لئے اے زمانے اگر تُو مجھے کوئی تکلیف پہنچائے تو مجھے اسکی بھی خوشی ہو گی یوں مظلوم ہونے سے میں محبوب کے نزدیک لائقِ توجہ اور قابلِ رحم لوگوں میں شامل ہو جاؤں گا ۔ غزل کی مجموعی روایت کی روشنی میں پہلے والا مفہوم زیادہ قرینِ قیاس نظر آتا ہے کہ محبوب کے ظلم و ستم بھی ہر ایک کے مقدر میں نہیں ہوتے ۔ بقول کسے ؎

جفائے یار جو سہتے ہیں بخت والے ہیں
یہ مرتبہ بھی تو ہر ایک کو نہیں ملتا

شعر نمبر ۵

امید وار ہیں ہر سمت عاشقوں کے گروہ
تری نگاہ کو اللہ دل نواز کرے

مشکل الفاظ

دلنواز، دل پر کرم کرنے والا، دل کو اچھا لگنے والا

تشریح

حسرت کہتے ہیں کہ اے محبوب تمہارے کرم و لطف کے امیدوار بہت ہیں۔ مگر تمہارے رویّے اس نسبت سے مہر و محبت والے نہیں ہیں۔ خدا تمہاری نگاہ کو بھی نوازش و لطف کی نعمت سے نوازے۔

حسرت اس شعر میں محبوب کے بڑھتے ہوئے عاشقوں کی مناسبت سے اس کے رویوں میں لطف و کرم کے اضافہ کے لئے دعا گو ہیں۔ ہماری قدیم شاعری کی عام روایت ہے کہ اپنے عاشق صادق کیلئے عام طور پر پیار اور محبت کے دو لفظ بھی نہیں ہوتے۔ وہ تمام عمر محبوب کے التفات کا امیدوار رہتا ہے مگر اس کی امید کبھی پوری نہیں ہوتی اور آخر کار وہ نامراد و ناکام مر جاتا ہے۔

اس شعر میں حسرت کہتے ہیں کہ یہاں ایک دو چاہنے والوں کی بات نہیں یہاں تو ہر سمت چاہنے والوں کا ہجوم ہے۔ ایسی صورت میں کس کس کی امید پوری ہوگی اور محبوب کس کس کو لطف کی نظر سے دیکھے گا۔ وہ اسے دعا دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ جس نسبت سے تمہارے چاہنے والے ہیں خدا اس نسبت سے تمہاری نگاہ کو بھی مہر و محبت اور دلنوازی عطا کرے تاکہ تم اپنے عاشقوں اور امیدواروں کی توقعات پر پورا اترو۔ بقول کسے ؎

توقعات یہ کس کس کی پورا اترے گا؟
ہ ایک شخص بھرا شہر جس کا شیدا ہے

شعر نمبر ۶

ترے کرم کا سزاوار تو نہیں حسرت
اب آگے تیری خوشی ہے جو سرفراز کرے

مشکل الفاظ

کرم، مہربانی۔ سزاوار، قابل، مستحق۔
سرفراز کرنا، عزت بخشنا، سربلند کرنا، مشہور اور ممتاز کرنا۔

تشریح

یہ شعر اگرچہ مجازی محبت کا حوالہ بھی رکھتا ہے لیکن اگر اسے حقیقی محبت کے پس منظر میں دیکھیں تو شعر کا لطف اور بڑھ جاتا ہے شعر کا مطلب تو یہ ہے کہ اے محبوب (یا اے خدا) حسرت اس قابل نہیں کہ تو اس پر کرم اور مہربانی کرے، اس کی عادات، گفتار و کردار، تجھ سے اسکی وفا کا دعویٰ، کوئی چیز بھی نہیں جو اسے تیرے کرم کے قابل بنائے۔ وہ حقیر اور مفلس، فقیر اور بے نوا تجھ سے محبت کا دعویدار تو ہے مگر اس کے اندر کوئی ایسی خوبی اور اس کی محبت کے اعمالنامہ میں کوئی ایسا ثواب نہیں جس کی بنا پر وہ اپنے آپ کو تیری محبت کا اہل سمجھے۔ اب بھی اگر

تُو اسے کرم سے نوازے تو یہ تیری مرضی ہے۔

یہاں "تیری خوشی ہے" "تیری مرضی ہے" کے مفہوم میں ہے مراد یہ کہ تیرے کرم پر میرا کوئی حق نہیں نہ یہ میرے عمل کا بدلہ ہے (کیونکہ میں تو بے عمل اور گنہگار ہوں) یہ صرف تیری نوازش اور کرم کی بات ہوگی اگر مجھے اس حالت میں بھی کسی رتبے، نعمت، عزت یا بخشش سے سرفراز فرمائے۔

بقول کسے ؎ یہ اس کا خاص کرم ہے وگرنہ اہلِ طلب!
کرم وہ نہ بھی کرے تو گلہ نہیں بنتا!

غزل نمبر ۳

شعر نمبر ۱

تاثیرِ برقِ حُسن جو ان کے سخن میں تھی
اک لرزشِ خفی مرے سارے بدن میں تھی

مشکل الفاظ

تاثیر، اثر - برقِ حسن - حُسن کی بجلی - سخن، کلام، گفتگو، آواز - لرزشِ خفی، پوشیدہ کپکپی جو بظاہر نظر نہ آئے مگر انسان کے اندر محسوس ہو - تھرتھراہٹ

تشریح

یہ شعر محبوب کی آواز کے حسن کے بارے میں ہے اور نہ صرف حسرت بلکہ پوری اردو کی حسیاتی شاعری میں ایک منفرد حیثیت کا مالک ہے۔ دنیا بھر کے شاعر جہاں محبوب کے زلف و لب، قد و قامت اور چشم و رخسار کی تعریف کرتے آئے ہیں وہاں محبوب کے دوسرے اوصاف چال اور آواز کا حسن بھی بیان کرتے چلے آئے ہیں اور مسلسل کر رہے ہیں مثلاً مومن نے محبوب کی آواز کے بارے میں لکھا ؎

اس غیرتِ ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

اس شعر میں محبوب کی آواز کو ہوا میں شعلہ سا لپک جانے سے تعبیر کیا ہے۔ اور نظر نہ آنے والی آواز کو نظر آنے والے شعلے سے تشبیہ دی ہے۔ حسرت کے شعر کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے محبوب کی آواز کے اثراتِ حسن کا تجربہ حسیات (احساس) کی سطح پر کیا ہے۔ حسرت کہتے ہیں کہ محبوب کی گفتگو میں حسن کی عجیب بجلیاں سی تھیں۔ جب وہ بات کرتا تھا تو میرے پورے جسم کے اندر ایک تھرتھراہٹ اور کپکپی سی محسوس ہوتی تھی۔

حسرت کے اس شعر کی معنوی تفصیلات میں جائیں تو حسرت کے اس حسیاتی تجربے کی انفرادیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ آدمی دن بھر سینکڑوں لوگوں سے گفتگو کرتا ہے۔ ان میں حسین آواز والے لوگ

بھی ہوتے ہیں مگر کسی کی آواز کے حسن سے ایسا کم ہی ہوا ہے کہ انسان کے پورے وجود میں ایک نامعلوم سا ارتعاش پیدا ہو جائے۔ حسرتؔ کہتے ہیں کہ یہ صرف ہمارے محبوب ہی کی آواز کا حسن ہے۔ جو اپنے اندر بجلی کی سی تاثیر رکھتا ہے اور جس طرح بجلی کی ہلکی سی رو پورے انسانی وجود کو لرزا دیتی ہے، اسی طرح محبوب کی آواز میں پوشیدہ بجلی کے سبب مجھے اپنے بدن کے روئیں روئیں میں تھرتھراہٹ سی دوڑتی محسوس ہوتی تھی۔ بقول کسے ؎

بجلیاں کوندتی ہیں اس کے لب ولہجہ میں
کبھی محسوس کیا اس کی صدا کا جادو

شعر نمبر ۲

واں سے نکل کے پھر نہ فراغت ہوئی نصیب
آسودگی کی جان تری انجمن میں تھی

مشکل الفاظ

واں، وہاں ‏ فراغت، فرصت، دلجمعی، اطمینان راحت۔
آسودگی، تسلّی ‏ جان، اصل، روح، خلاصہ

تشریح

حسرتؔ ان اچھے لمحوں کو یاد کرتے ہیں جو محبوب کی محبت میں بسر ہوئے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہم جن دنوں تیری محفل میں جایا کرتے تھے ہمیں کتنی فرصت اور اطمینان نصیب تھا محبت کے ان زمانوں میں ہمیں کوئی کام نہ تھا یوں لگتا تھا کہ سکون و آرام کے سوا زندگی میں اور کچھ نہیں۔ ہماری راحت اور آسودگی کی جان تمہاری محفل میں نظر آتی تھی مگر جب سے ہم اس انجمن سے اُٹھ آئے ہیں ہمیں ذرا بھی فراغت نصیب نہیں ہوئی۔ اب اپنی مختلف الجھنیں اور مسئلے ہمیں گھیرے ہوئے ہیں کہ ہمیں آرام و سکون کا ایک پل بھی نصیب ہو رہا۔ جیسے جان کے بغیر بدن خاک کا ڈھیر لگتا ہے اسی طرح تمہاری انجمن کے بغیر آرام و سکون کا تصور بھی محال ہے۔ جمیل الدین عالی کا یہ شعر دیکھئے ؎

کچھ نہ تھا یاد بجز کارِ محبت اک عمر
تو جو بچھڑا ہے تو اب کام کئی یاد آئے

(یعنی محبت کے دنوں میں محبت کے کاموں کے لئے فراغت ہی فراغت تھی اور اب محبوب سے دور ہو کر نت نئے مسئلے نت نئے تفکرات ہمارے سامنے آن کھڑے ہوئے ہیں)

دراصل محبوب کی محفل سے نکلنا یا محبوب کے در سے اٹھنا ہی شاعر کی زندگی میں مصیبتوں کی ابتداء ہے۔ محبت اور خوش فہمیوں کا غبار جب چھٹتا ہے تو زندگی کے تلخ مسائل و حقائق شاعر کی زندگی اجیرن کر دیتے ہیں۔ بقول کسے ؎

کتنی آسودگی تھی تیری رفاقت میں پر اب
کتنے غم ہیں جو مری سمت بڑھے آتے ہیں

شعر نمبر ۳

اک رنگِ التفات بھی اس بے رخی میں تھا
اک سادگی بھی اس نگہِ سحر فن میں تھی

مشکل الفاظ

رنگِ التفات ، توجہ ومحبت کی جھلک ، بے رخی - بے توجہی ، کج رخی -
نگہ سحر فن ، جادوگر آنکھ ، سحر وجادو کی طرح اثر کرنے والی نظر

تشریح

حسرت نے اس شعر میں غزل کے ایک معروف مضمون کو بیان کیا ہے - وہ کہتے ہیں کہ محبوب اگرچہ ہم سے بے توجہی برتتا تھا ، ہمارے اشتیاق اور شوق کو پوری طرح محسوس کرنے کی بجائے بے مہری اور بے مروتی کا اظہار کرتا تھا لیکن اس بے مہری اور بے توجہی کے اندر بھی ہمیں کہیں کہیں محبت وتوجہ کا رنگ جھلکتا محسوس ہوتا تھا یعنی محبوب کے غیر پن اور بے رخی کے اندر بھی ایک محبت آمیز اشارہ نظر آتا تھا - آتش کا یہ شعر دیکھئے ؎

محفلِ غیر میں ہر چند وہ بیگانہ رہے ہاتھ آہستہ مرا پھر بھی دبا کر چھوڑا

دوسرے مصرع میں بھی محبوب کے اس رویہ کا اظہار سادگی اور نگہِ سحر فن کے لفظوں میں کیا ہے - حسرت کہتے ہیں کہ اگرچہ محبوب کی آنکھیں چاہنے والے پر جادو کرتی ہیں - ان کے اندر شوخی اور افسوں کی ایک ایسی کیفیت ہے جو دیکھنے والوں کے لئے تباہی وبربادی کا سبب ہے مگر اس کے باوجود کبھی کبھار ان آنکھوں میں سادگی کی جھلک بھی مل جاتی ہے جو اپنائیت کی نشانی ہے - وہ یوں کہ نگہ سحر فن ، جادو میں ڈوبی وہ فن کارانہ نگاہیں ہیں جن سے کسی رحم اور خیر کی توقع نہیں جبکہ سادگی ، بناوٹ ، تصنع اور اجنبیت کے برعکس سکون نوازی اور دلنوازی کا ثبوت ہے - محبوب کی یہ سادہ نگاہی دراصل شاعر کے لئے اس بے مہری کی فضا میں لطف وکرم کا رنگ لئے ہوئے ہے -

بقول کسے ؎

مری نظر کے تقاضوں کو جانتا بھی تھا
وہ لاکھ غیر سہی ، میرا آشنا بھی تھا
جھٹک کے ہاتھ مرا وہ گیا تھا غصے سے
مگر وہ راہ میں مڑ مڑ کے دیکھتا بھی تھا

شعر نمبر ۴

کچھ دل ہی بجھ گیا ہے مرا ورنہ آج کل
کیفیتِ بہار کی شدت چمن میں تھی

مشکل الفاظ

دل بجھنا ، اداس ہونا ، جی کا فسردہ ہونا - کیفیتِ بہار ، بہار کی حالت
شدت ، زور -

تشریح

ہماری شاعری میں بہار جنون ووحشت کے ابھرنے اور بڑھنے کی علامت ہے -

بقول میر تقی میر ؎ کچھ کرو فکر اس دوانے کی
دھوم ہے پھر بہار آنے کی

اور بقول مومن ؎ ہے جانے بات کیا ابھی ہے فصلِ گل تو دُور
اور شورِ دشت بھاگتے ہیں کچھ ابھی سے ہم

اس انداز کے ہزاروں شعروں میں بہار کے اثرات شاعروں اور عاشقوں پر وحشت و دیوانگی کی صورت میں نظر آتے ہیں اور وہ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر شہر چھوڑ کر جنگلوں کو نکل جاتے ہیں۔ لیکن حسرت نے آمدِ بہار پر اپنی کیفیات و جذبات کا نقشہ مختلف کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ باغوں کے اندر بہار آگئی ہے اور اس کی کیفیت بھی اپنے پورے عروج پر ہے لیکن جانے کیا بات ہے ہمارے دل پر غم و درد کی شدت کے سبب ایک ایسی افسردگی اور اداسی کا غلبہ ہے کہ ہمارا کچھ کرنے کو جی نہیں کرتا گریبان پھاڑ کر جنگلوں کی طرف نکلنا تو بہت دُور کی بات ہے۔

حسرت کہتے ہیں کہ اگر ان دنوں ہمارا دل بجھا نہ ہوتا تو ہم بھی سیرِ چمن کو نکلتے، باغ میں بہار کی شدت دیکھ کر شاید ہمارے اندر بھی کئی جذبے پیدا ہوتے لیکن اب تو دل اتنا ملول اور غمزدہ ہے کہ آس پاس کی ساری رونقیں اور ماحول کے سارے ہنگامے ذرا اچھے نہیں لگتے۔ بقول غالب ؎

غمِ فراق میں تکلیفِ سیرِ باغ نہ دو
مجھے دماغ نہیں خندہ ہائے بے جا کا

یعنی جدائی کے مارے ہوئے افسردہ شخص کے لئے باغ میں کھلتے ہوئے پھولوں کی ہنسی سوئے درد جگانے کا باعث بن جاتی ہے۔ اس لئے مجھے باغ کی سیر کی دعوت نہ دو۔ بقول کسے ؎

جاتی نہیں فسردگی اے جاں تری کبھی
تیرے لئے چمن میں بلا سے بہار آئے

شعر نمبر ۵

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

مشکل الفاظ

غربت، پردیس۔ سواد، آس پاس، نواح، حدود، علاقہ (سواد کا مطلب سیاہی بھی ہوتا ہے)

تشریح

حسرت موہانی کا یہ شعر وطن کی محبت کے بارے میں ہے۔ دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں ایسے ہزاروں شعر مل جائیں گے جن میں شاعروں نے اپنے وطن کے کانٹوں اور پتھروں کو بھی پردیس کے پھولوں اور ہیروں سے حسین و دلکش قرار دیا ہے۔ حسرت بھی اس شعر میں

ن کے بارے میں ایسی ہی محبت کا اظہار کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ وطن سے دور پردیس میں طلوع ہونے والی صبح میں بھی وہ روشنی نہیں ہوتی جو وطن کی شام میں ہوتی ہے۔

شام، دن اور رات کے اس مختصر سے درمیانی وقفہ کو کہتے ہیں جب دن کا اجالا ختم ہو چکا ہوتا ہے لیکن ابھی رات کی سیاہی پوری طرح چھائی نہیں ہوتی۔ شام کو جو جھٹپٹے کی کیفیت ہوتی ہے اس دھندلکے کی تعریف کرتے ہوئے حسرت کہتے ہیں کہ وطن کی سرزمین کا وہ دھندلکا جو شام کو ظاہر ہوتا ہے پردیس کی صبح سے زیادہ اجلا اور روشن محسوس ہوتا ہے۔

یہ احساس بھی ایک نفسیاتی پس منظر لئے ہوئے ہے وطن سے دور غربت میں جہاں کوئی ہمدرد و غمخوار نہ ہو، جہاں عزیز و اقارب نہ ہوں، وہاں آدمی مناظر فطرت سے بھی لطف اندوز نہیں ہو سکتا۔ وطن کی دوریوں کے دکھ اداس اور افسردہ رکھتے ہیں اور دوری میں وطن کی ہر چیز شدت سے یاد آتی ہے بعض غیر اہم چیزیں بھی اہم محسوس ہوتی ہیں جب کہ پردیس کی رونقیں بھی تکلیف دہ محسوس ہوتی ہیں اور خوشیاں بھی غم کا سامان ثابت ہوتی ہیں۔ حسرت نے ایسی ہی کیفیات بیان کی ہیں کہ وطن کا دھندلکا بھی پردیس کی صبح سے اجلا اور حسین ہے۔ بقول کسے ؎

سحر پردیس میں سامانِ ماتم لے کے آتی ہے
مسرت بھے کے اپنے شہر میں سائے اترتے تھے

شعر نمبر ۸

اچھا ہوا کہ خاطرِ حسرت سے مٹ گئی
ہیبت سی اک جو خطرۂ دار و رسن میں تھی

مشکل الفاظ

خاطر، دل ۔طبیعت ۔ہیبت، ڈر، خوف ۔ دار و رسن، پھانسی ۔ دار کا مطلب وہ لکڑی یا ٹکٹکی جس پر مجرم کو پھانسی دینے سے پہلے باندھتے ہیں اور رسن کا مطلب وہ رسی ہوتا ہے جس سے پھانسی کے وقت مجرم کے گلے میں پھندہ ڈالتے ہیں۔

تشریح

حسرت کہتے ہیں کہ شروع شروع میں ہمیں پھانسی سے خوف آتا تھا مگر رفتہ رفتہ جیلوں میں جانے سے ہمارے دل سے پھانسی کی ہیبت اور ڈر ختم ہو گیا۔ اب وہ دن گئے جب ہم حق کہتے ہوئے ڈرتے تھے اور ہمیں پھانسی کا دھڑکا لگا رہتا تھا سیاست سے دلچسپی کے بعد اب قید و بند کی صعوبتیں اور رسن و دار کی سزائیں ہمارے لئے اجنبی نہیں رہیں۔ ہمارے لئے احساس کی یہ تبدیلی بہت اچھی ثابت ہوئی اور اس سے ہمیں بہت فائدہ ہوا۔ اب ہم زیادہ بے باکی اور جسارت کے ساتھ انگریز کے مقابلہ کے لئے آواز بلند کر سکتے ہیں اور بغیر کسی خوف کے آزادی حاصل کرنے کے لئے مل کر جدوجہد کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں کوئی ڈر، خوف یا جھجک مانع نہیں۔ بقول کسے ؎

کبھی ڈرتے تھے کمرے میں بھی سچی بات کرنے سے
جو کہنا ہے سرِ بازار بھی اب کھل کے کہتے ہیں

علامہ محمد اقبال

(۱۸۷۷ء - ۱۹۳۸ء)

غزل نمبر۱

شعر نمبر۱

کریں گے اہلِ نظر تازہ بستیاں آباد
مری نگاہ نہیں سوئے کوفہ و بغداد

مشکل الفاظ

اہلِ نظر: دیدہ وَر، حقیقت شناس، واقف، باخبر ٭
کوفہ و بغداد: عراق کے مشہور شہر ٭

تشریح

علامہ اقبال کے کلام میں نئی نسل سے بہت سی توقعات ملتی ہیں۔ خوب سے خوب تر کی تلاش کا صحت مند جذبہ ہر قوم اور فرد کے اندر موجود ہوتا ہے۔ فرد اپنے طور پر اور قومیں مل کر اپنے آپ کو علمی و فنی، تہذیبی و ثقافتی اور جسمانی و روحانی غرضیکہ زندگی کی ہر سطح اور ہر شعبہ میں بہتر سے اور بہتر کی تلاش کا سفر جاری رکھتی ہیں۔

کوفہ و بغداد کے الفاظ کا مطلب اسلامی دنیا کے دو معروف شہر (کوفہ و بغداد) ہی نہیں، بلکہ اقبال نے اپنے اس شعر میں مثال کے طور پر دو شہروں کا ذکر کیا ہے۔ اُن کی مراد وہ تمام معروف شہر ہیں جو اپنے علمی اور تہذیبی ماحول یا کسی دوسری نمایاں خوبی کے سبب شہرت رکھتے ہیں۔ علامہ اقبال نے رجائی انداز میں اپنی قوم کے حق شناس دیدہ وروں سے بہت سی توقعات باندھی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ مسلمان قوم بجا طور پر کوفہ و بغداد (اور اپنے دوسرے معروف شہروں) پر فخر کر سکتی ہے، مگر میری نظر صرف ان دو شہروں کی طرف نہیں ہے۔ اسلامی ممالک میں جو شہر کسی سبب معروف و مشہور ہیں، ان کی حیثیت اپنے طور پر مسلّم ہے، مگر میں مستقبل میں دنیا بھر کو متاثر کرنے اور دنیا بھر کی رہنمائی کرنے والی تہذیبوں اور علم و ہنر سے آباد شہروں کی تعمیر بھی دیکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ ہمارے اہلِ نظر، عالم، سائنسدان، کائنات کی حقیقتوں سے باخبر ہماری نئی نسل اپنی تخلیقی قوتوں کو بروئے کار لائے گی اور ایسے نئے نئے شہر آباد کرے گی، جو دنیا کے لئے باعثِ رشک ہوں گے، اور جن کا شمار دنیا کے اہم علمی و تہذیبی مراکز میں ہو گا۔

بقولِ کسے ؎

ہزار کرنے ہیں تعمیر شہرِ نَو، اور پھر
ہر ایک شہر کو جنت مثال کرنا ہے

شعر نمبر ۲

یہ مدرسہ، یہ جواں، یہ سرور و رعنائی
انہیں کے دم سے ہے مے خانۂ فرنگ آباد

مشکل الفاظ سرور: خوشی۔ نشہ۔ مستی۔ لطف ❖ رعنائی: رنگینی، حسن، خوبصورتی ❖
مے خانہ: شراب خانہ ❖ فرنگ: انگریز ❖

تشریح مے کا لفظ ہماری شاعری میں زیادہ تر علامتی مفہوم میں استعمال ہوا ہے۔ معروف کلاسیکی فارسی اور اُردو شاعروں کے ہاں یہ لفظ علمِ حقیقت، عرفان، معرفت کے معنوں میں ملتا ہے، اس سے وابستہ دوسرے الفاظ و تلازمات پیالہ، مے خانہ، ساقی، بادہ، جام و مینا وغیرہ بھی "مشاہدۂ حق" کے تجربات کے ضمن میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں صرف دو شعر دیئے جاتے ہیں۔ حافظ شیرازی کہتے ہیں:

؎ ما در پیالہ عکسِ رُخِ یار دیدہ ایم ❖ اے بے خبر ز لذتِ شربِ مدامِ ما
(اے ہمارے شوق کی دائمی لذت سے بے خبر، ہمیں تو پیالے میں محبوب (محبوبِ حقیقی) کا عکس نظر آتا ہے)

غالبؔ کا شعر ہے ؎

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو ❖ بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

کہ حقیقتِ مطلق کے مشاہدہ کا اظہار بھی 'بادہ و ساغر' کی علامتوں کے بغیر مزہ نہیں دیتا۔ یوں میخانہ علامتی طور پر وہ جگہ ہے جہاں حقیقت کے متلاشی اپنی پیاس بجھائیں۔ عہدِ حاضر میں اس سے مراد دانش کدے، تہذیب گاہیں، کالج اور یونیورسٹیاں ہیں۔

علامہ اقبال کے زیرِ نظر شعر میں میخانۂ فرنگ سے مراد انگریز کی دانش گاہیں یا انگریزی تہذیب و تمدن اور علم و دانش کی تدریس کے ادارے ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ یورپ نے جس علم و عقل کے بل بوتے پر ترقی کی ہے وہ بھی زوال پذیر ہے۔ اب وہاں کی دانش گاہیں تہذیب و تمدن کا گہوارہ نہیں رہیں، نہ ہی وہاں ذوقِ تجسس کی تسکین ہوتی ہے۔ مادی آسائشوں اور لذتوں کے حصول نے وہاں کے جوانوں کو نغمہ و موسیقی کا دلدادہ بنا دیا ہے، وہاں کی جوان نسل روحانیت کی طرف توجہ دینے کی بجائے رقص و نغمہ اور دیگر جسمانی لذتوں کی رسیا ہو گئی ہے۔ اب وہاں کی یونیورسٹیاں اور مدارس علم و عقل کی بجائے موسیقی اور عیش و طرب کے متلاشی ہیں۔

در پردہ اقبالؔ اپنے نوجوانوں کو تلقین کر رہے ہیں کہ تم جن فرنگی زادوں کی تقلید کر رہے ہو اور علم و ہنر کے حصول میں جن کی طرف دیکھتے ہو اب وہ بھی علم و عقل کی ان اعلیٰ قدروں سے محروم ہیں۔ ان کا سارا زور بدن کی آسائش اور مادی ترقی کی طرف ہے جب کہ حقیقی ترقی اخلاقیات

اور روحانی علوم کی ترقی ہے، موجودہ نظامِ تعلیم اور درسگاہیں جو انگریزی تہذیب و حکومت ہی کے طور طریقے اپنائے ہوئے ہیں۔ طالب علموں کی صحیح روحانی تربیت کی بجائے انہیں جسمانی آسائشوں کے حصول کی طرف لگا رہی ہیں۔

بقولِ کسے ؎

جو منزل ہے ہوئی جاتی ہے ہر اک آنکھ سے اوجھل
بچھی ہیں چاروں جانب راہ میں آسائشیں ایسی

شعر نمبر ۳

نہ فلسفی سے نہ مُلّا سے ہے غرض مجھ کو
یہ دل کی موت، وہ اندیشہ و نظر کا فساد

مُشکل الفاظ

فلسفی : فلاسفر، حکیم، عقل اور دماغ سے زندگی کے معاملات اور مسئلوں پر سوچنے والا ✦ مُلّا : مولوی، علامہ اقبالؔ کے ہاں یہ لفظ عموماً دین کے ظاہری پہلو کو برقرار رکھنے والے اس مولوی کے لئے استعمال ہوتا ہے جس میں اجتہاد اور بصیرت کی کمی ہو ✦ اندیشہ : غور، فکر ✦ نظر : مراد بصارت ✦ فساد : تباہی، خرابی، فتنہ ✦

تشریح

فلسفی اور مُلّا، علامہ اقبالؔ کے اس شعر ہی میں نہیں پورے کلام میں دو مختلف طرح کی خصوصیات رکھنے والی شخصیتیں ہیں فلسفی ہر مسئلہ کو عقل کی بنیاد پر حل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ جب کہ زندگی کے سبھی مسئلے عقل سے حل نہیں ہوتے زندگی میں بہت سے مسئلے ایسے بھی ہیں، جنہیں نہ تو غور و فکر سے سمجھا جاسکتا ہے اور نہ ہی عقلی حوالے سے اُن کی وضاحت کی جاسکتی ہے۔ ایسے مسئلوں کو سمجھنے اور انہیں حل کرنے کے لئے جہاں عقل ساتھ چھوڑ جاتی ہے، وہاں جذبہ، عشق اور وجدان انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ مگر فلسفی کے پاس جذبہ و وجدان نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ دوسری طرف مُلّا کا کردار ہے جو گھسی پٹی روش پر چلا جاتا ہے۔ بدلتے ہوئے وقت کے تقاضوں کے ساتھ دینی و مذہبی مسئلوں کی از سرِ نو تعبیر نہیں کرتا۔ جذبۂ جہاد کا مظاہرہ نہیں کرتا بلکہ مذہبی معاملات و مسائل میں اجتہاد سے کام لینے والوں پر بھی طعنہ زنی کرتا ہے اور اِن کے خلاف طرح طرح کے فتوے صادر کرتا ہے۔

فلسفی اگر جدید دور اور جدید تعلیمی اداروں، کالج، یونیورسٹی وغیرہ کا نمائندہ ہے، تو مُلّا پُرانی نسل اور مسجد کے معلّم کی علامت ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ فلسفی اور مُلّا دونوں ہی معاشرے کے لئے مضر ہیں فلسفی کی تقلید سے دِل مُردہ ہو جاتا ہے اور آدمی کسی چیز کی حقیقت کو سمجھنے اور اس سے حظ اٹھانے کی بجائے الفاظ و خیالات کے دھندلکوں میں اُلجھا رہتا ہے، شکوک و شبہات کے اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا رہتا ہے اور دلیلوں کی تلاش میں سر کھپاتا رہتا ہے۔ جب کہ

ملاّ فروعی اور غیر ضروری مسئلوں کو ہوا دے کر غور و فکر کے راستے مسدود کر دیتا ہے، یوں ماضی کے ساتھ چمٹے رہنے اور جدید دور کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیت نہ ہونے کے باعث وہ تنگ نظری اور بدگمانی کا شکار ہے اور چیزوں، مسئلوں اور مشاہدوں کے صحیح تجزیہ سے قاصر ہے۔ اس کی عادات، اس کی فکر اور بصارت میں تباہی و خرابی کا باعث بنتی ہیں۔

غرضیکہ بقول اقبال کالج اور مدرسہ دونوں جگہوں پر فلسفی اور مُلاّ کے جامد رویّوں کے ذریعے فیضان کا سلسلہ رُکا ہوا ہے، ایک کی تقلید سے دل، جذبہ، حرارت، حرکت اور اندرونی توانائی ضائع ہو جاتی ہے اور دوسرے کی پیروی سے آدمی کے مشاہدہ اور فکر کی قوت منتشر ہو جاتی ہے اور معاشرے میں بگاڑ کا باعث بنتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ مجھے دونوں سے غرض نہیں یعنی میرا ان میں سے کسی کے ساتھ تعلق نہیں۔ نہ میں فلسفی کے حق میں ہوں نہ مُلاّ کے۔

بقولِ کسے ؎

کوئی بدن کا پجاری کوئی فرار طلب
جو چاہیئے وہ توازن نظر نہیں آتا

شعر نمبر۱۳

فقیہِ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

مشکل الفاظ فقیہ: فقہ کے علم کا ماہر مراد مُلاّ، زاہد وغیرہ ✦ تحقیر: بے قدری، بے وقعتی، حقارت ✦ مجال: ہمت، جرأت، حوصلہ ✦ کشاد: وسعت ✦

تشریح علامہ اقبال نے اس شعر میں بڑے لطیف پیرایہ میں فقیہ پر طنز کیا ہے! فقہ کے اندر وقت کی تبدیلیوں کے ساتھ بعض معاشرتی معاملات اور مسائل کے حل کے لئے از سرِ نو نظر ڈالنے کی جو گنجائش موجود ہے، ہمارے علماءِ کرام عام طور پر اس سے کتراتے ہیں اُن کی اکثریت کا رویّہ یہ ہوتا ہے کہ کسی نئی چیز یا رائے کو قبول کرنے سے پرہیز کیا جائے اور معاشرے کے بدلنے کے ساتھ اپنے خیالات و نظریات نہ بدلے جائیں۔ دینِ اسلام کے ارکان اور اسلامی شعائر (طور طریقوں) کی روح تو نہ بدلی جا سکتی ہے اور نہ ہی اسے بدلنے کی کوشش کسی صورت قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ مگر کبھی کبھار معاشرتی معاملات اور رہن سہن کی تبدیلیوں کے ساتھ بعض ایسے مسئلے اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں، جن کے بارے میں دین کی روح اور اصل کو چھوئے بغیر ظاہری رویّوں میں تبدیلی لانا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ اسلامی فقہ میں اس کی گنجائش موجود ہے اور خلفائے راشدین سے لے کے آج تک مومنانہ فراست رکھنے والے علماء اخلاص نیّت سے بعض نئے مسائل کے

بارے میں اپنی رائے دیتے اور اجتہاد کرتے آئے ہیں۔ مگر علماء اور فقیہ صاحبان کی اکثریت ہمیشہ دینی مسائل کی نئی تشریح اور تعبیر کی مخالفت کرتی آئی ہے۔ مسلسل مخالفت ایک طرح سے تنگ نظری کی علامت ہے۔ علامہ اقبال اس شعر میں فقیہ شہر کی طرف ایک لطیف اشارہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں اُس کی تحقیر نہیں کرتا مگر میں دلوں کی گھٹن ختم کر کے انہیں وسیع اور کشادہ کرنا چاہتا ہوں اور وہ فقیہ شہر کی موجودگی میں ناممکن ہے کیونکہ وہ قدیم روایات اور فرسودہ طور طریقوں سے اس طرح چمٹا ہوا ہے کہ اس میں ذرا سی بھی تبدیلی گوارا نہیں کرتا۔

اس بات کو مثالوں سے سمجھنے کے لئے اگر گزشتہ پچاس سال کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو اسلامی معاشروں خصوصاً برصغیر پاک و ہند میں نئی سائنسی ایجادات و تجربات کی روشنی میں کئی تبدیلیاں رونما ہوئیں، جن کے بارے میں علماء کی اکثریت کا رویّہ تنگ نظری کا حامل رہا مثلاً لاؤڈ سپیکر کا استعمال، فوٹو گرافی، کسی مریض کو خون دینے کا مسئلہ، اعضاء کی پیوند کاری کا مسئلہ وغیرہ۔ اس طرح کے سینکڑوں مسائل تھے اور ہیں، جن کے بارے میں فقیہ، عالم اور مولوی صاحبان نے تنگ نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ رفتہ رفتہ وقت گزرنے کے ساتھ معاشرے میں رونما ہونے والی نئی صورتِ حال کو قبول کر لیں مگر شروع شروع میں کسی نئی ایجاد اور سائنسی تجربے کے نتائج کو تسلیم کرنے اور معاشرے میں اسے رواج دینے کے بارے میں ہمیشہ اجتناب کیا گیا ہے۔

علامہ اقبال فقہ کو جامد بنانے کے سخت خلاف تھے، اسلام چونکہ دینِ فطرت ہے اور اسے ہر جگہ اور زمانے کے تقاضوں کے مطابق بنایا گیا ہے، لہٰذا علامہ دینِ اسلام کے عالم اور فقہ کے ماہروں سے یہ توقع کرتے ہیں کہ وہ غور و فکر اور فراست و تدبر سے اجتہاد کے کام کو جاری رکھیں گے اور اس تنگدلی اور کوتاہ نظری سے دامن بچائیں گے جو ماضی پرست فقیہ حضرات کی وجہ سے معاشرے میں عام ہو گئی ہے کیونکہ دلوں کی کشاد اور طبیعتوں میں فراخی جبھی ممکن ہے کہ سوچ، غور و فکر، اجتہاد اور اخلاص نیت سے آزادئ رائے، بحث و مباحثہ اور مکالمہ و اظہار کے عمل کو جاری رکھا جائے۔ وہ کہتے ہیں کہ جب میں دلوں کی وسعت کی بات کرتا ہوں تو اس سے کسی کی تحقیر مراد نہیں، میری کیا مجال کہ میں شہر کے کسی فقیہ یا سب سے بڑے دینی عالم کی توہین کروں، میں تو تنگ نظری ختم کر کے طبیعتوں میں کشادگی پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ بقولِ کسے ؎

شہرِ کم حوصلہ ناراض ہے مجھ سے ہی کہ مَیں ٭ وسعتِ فکر و وسیع النظری چاہتا ہوں

شعر نمبر ۵

کئے ہیں فاش رموزِ قلندری مَیں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد

مشکل الفاظ | فاش کرنا: کھولنا، ظاہر کرنا ٭ رموز: رمز کی جمع، بھید، اسرار ٭ قلندری: فقیری۔ قلندر کا لفظ علامہ اقبال کے ہاں ایک ایسے درویش صفت مردِ مسلمان کے لئے آیا ہے جو قناعت، حق گوئی، بے باکی، بے خوفی اور دوسری اعلیٰ اخلاقی خصوصیات رکھتا ہو ٭ فکرِ مدرسہ: مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں دی جانے والی تعلیم، خیالات اور نظریات ٭ فکرِ خانقاہ: صوفیوں کے حلقوں میں دی جانے والی تعلیم و تربیت ٭

تشریح | مدرسہ جدید تعلیم دینے والا ایک ادارہ ہے، وہ تعلیم جسے حاصل کرنے کے بعد انسان جسمانی اور مادی طور پر ترقی پاتا ہے، جب کہ خانقاہ روحانی تربیت اور ترقی کی درس گاہ ہے جہاں انسان کے خیالات اور عقائد کو پاک صاف کرکے باطن کی صفائی (اور تزکیہ) کا کام کیا جاتا ہے۔

علامہ اقبال مادی اور روحانی ان دونوں طرح کے اداروں کی کارکردگی سے مایوس تھے۔ اُن کے کلام میں جگہ جگہ ایسے اشعار ملتے ہیں جہاں ان درسگاہوں اور اداروں کے زوال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، ایسا ہی شعر دیکھئے: ؎

نہ مدرسہ میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے
جو بات مردِ قلندر کی بارگاہ میں ہے

علامہ محسوس کرتے تھے کہ اب سکولوں اور کالجوں میں بھی صحیح تعلیم نہیں دی جا رہی۔ وہاں سے فارغ ہونے والوں کا مقصد صرف روزی کمانا اور نوکری تلاش کرنا رہ گیا ہے۔ صرف علم حاصل کرنے کے لئے کوئی ان اداروں میں نہیں جاتا اور نہ ہی وہاں کے تعلیمی نصاب ایسے ہیں جنہیں پڑھ کر انسان کے اندر تحقیق اور تجسّس کا وہ مادہ ہی پیدا ہو سکے کہ وہ کائنات کو تسخیر کر سکیں، دوسری طرف خانقاہیں جو دنیا سے بے زاری اور فرار کے اڈّے بن گئی ہیں، باپ کی وفات کے بعد بیٹے کے گدی سنبھالنے کے رواج نے خانقاہی نظام کو بھی موروثی بادشاہتوں جیسا بنا دیا ہے، وہاں سے اخلاص غائب ہو گیا ہے اور مادہ پرستی اور ظاہر داری زیادہ آگئی ہے۔ لہٰذا اب خانقاہوں سے بھی کوئی ایسا مردِ درویش نہیں اُٹھتا جس کی فراست اور تیز نگاہی اپنے پیروکاروں اور مریدوں کے اندر دین و دنیا کے معاملات اور مسائل کا صحیح شعور پیدا کر سکے۔

علامہ اقبال صورتِ حال کی وضاحت (اور تجزیہ) کے بعد اپنے کلام کے ذریعے لوگوں کو دین اور دنیا، روحانی و جسمانی، دونوں علوم کی حقیقت، ان کے ادراک اور حصول کے لئے جا بجا تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری میں نہ صرف جدید تعلیم کی ضرورت پر زور دیا ہے بلکہ باطنی اور روحانی تربیت کی اہمیت بھی واضح کی ہے۔ ان کے کلام میں مردِ مومن کا تصور ایک

ایسی ہی متوازن شخصیت ہے وُہ دونوں طرح کے تعلیمی نظاموں سے فیض حاصل کر کے دنیا کو بھی تسخیر کرتا ہے اور روحانی بلندیاں بھی حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبال اپنے کلام میں پیش کیے جانے والے ایسے ہی تصورات اور خیالات کو قلندرانہ رموز سے تعبیر کرتے ہیں۔ زیرِ بحث شعر سے ان کی شاعری کے اس عظیم پہلو کی نشاندہی ہوتی ہے جو مقصدیت سے بھرپور ہے۔ علامہ کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے رازوں سے پردہ اُٹھایا ہے اور حقیقت کو اس لئے بیباکی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ مدرسہ اور خانقاہ سے وابستہ خیالات و افکار اپنے مخصوص منفی رویّوں سے آزاد ہو جائیں یعنی اہلِ مدرسہ مادہ پرستی ترک کر دیں اور اہلِ خانقاہ رہبانیت (دنیا سے فرار) اور ظاہرداری چھوڑ دیں۔

بقولِ کسے ؎

چھپائے ہیں جو زمانے نے تیری آنکھوں سے
مرے کلام میں ڈھونڈ ان نکات کی تفسیل

شعر نمبر ۶

رشی کے فاقوں سے ٹوٹا نہ برہمن کا طلسم
عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کارِ بے بنیاد

مُشکل الفاظ

رشی: سادھو، عابد، خدا پرست ٭ برہمن: ہندوؤں کی اعلیٰ و مقدس ذات ٭ طلسم: جادو ٭ عصا: ڈنڈا، مراد طاقت ٭ کلیمی: حضرت موسیٰ علیہ السلام کا کام، منصب (علامہ اقبال نے "ی" کی آمیزش سے بہت سی ترکیبیں بنائی ہیں جو متعلقہ شخصیت کی صفات اور کارکردگی کی طرف اشارہ کرتی ہیں مثلاً حیدری، سکندری، قیصری اور آزری وغیرہ) ٭ بے بنیاد: فضول، ناپائدار ٭

تشریح

علامہ اقبال نے اس شعر میں بتایا ہے کہ صرف گفتار اور نعرہ بازی سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا، جب تک کہ آدمی اس کے حصول کے لئے قوت بھی صرف نہ کرے۔ زہد اور پرہیزگاری کی حقیقت اپنی جگہ مسلّم، مگر جب تک آدمی جھوٹی رسموں اور باطل قوتوں کو ختم کرنے کے لئے میدانِ عمل میں نہ اُترے، تب تک حالات صحیح نہیں ہو سکتے اور نہ ہی اصلاح کا مقصد پورا ہو سکتا ہے۔

علامہ ان خیالات کو "رشی کے فاقوں" اور "برہمن کے طلسم" سے واضح کرتے ہیں۔ ہندو معاشرے میں برہمن کو اعلیٰ مقام حاصل ہے۔ پیدائش سے موت تک ہر اہم مرحلہ پر برہمن کی شمولیت ناگزیر ہے، زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی کام اس کے بغیر مکمل نہیں، یوں سمجھنا چاہیئے کہ برہمن کے جادو نے پورے ہندو معاشرے کو اپنی حیلہ گری اور مکر و فریب میں جکڑا ہوا ہے۔ اب اس جادو

سے نکلنے کے لئے اگر کوئی سادھو فقیر بہت عبادت کرے، برت (روزہ) رکھے، فاقے کرے، عبادات اور دعاؤں کی انتہا کر دے تو اس طرح تو یہ جادو نہیں ٹوٹے گا۔ اس جادو سے نکلنے کے لئے اسے اپنی قوت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ طاقت سے کام لینا ہوگا۔

دوسرے مصرع میں وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی مثال دیتے ہیں کہ قدرت نے انہیں ایک منصب عطا کیا تھا کہ وہ خدا کے پیغام کو لوگوں میں پھیلائیں اور فرعون کی باطل قوت کو شکست دے کر لوگوں کو اس کے ظلم سے رہائی دیں۔ تو یہ کام صرف پرہیز گاری، گفتار اور کلام سے نہیں نکلا۔ عصا قوت کی علامت ہے، جدوجہد اور معرکہ آرائی کا نشان ہے، سو وہ اسی قوت کے سبب فرعون کا جادو توڑ سکے۔ یہاں خیال قرآن کریم کے اس واقعہ کی طرف جاتا ہے، جب فرعون کے جادوگروں نے رسیوں کے سانپ بنائے اور یوں محسوس ہوا جیسے زمین پر سانپ لہرا رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کا جادو باطل کرنے کے لئے اپنے عصا کو زمین پر گرایا جو خود ایک بڑے سانپ کی صورت اختیار کر گیا اور اس نے ان جادوئی سانپوں کو نگل لیا۔

اس واقعہ سے علامہ ایک خوبصورت بات پیدا کرتے ہیں کہ عصا کے بغیر کلیمی کا بھی کوئی فائدہ نہیں، یعنی دنیا میں بڑے بڑے مقاصد حاصل کرنے اور باطل قوتوں کا سر کچلنے کے لئے صرف زہد و تقویٰ اور کلام و گفتار سے کام نہیں چلتا، اس کے لئے قوت کا مظاہرہ بھی ضروری ہے۔

بقولِ کسے ؎

تھام شمشیر بھی ہاتھوں میں، نہ یوں نعرے لگا\
سرِ میداں بھی نکل صرف دعائیں ہی نہ کر

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

ہزار خوف ہو لیکن زباں ہو دل کی رفیق\
یہی رہا ہے ازل سے قلندروں کا طریق

مشکل الفاظ

رفیق : ساتھی ☆ ازل سے : ہمیشہ سے، شروع دن سے ☆ قلندر : درویش، فقیر جو اقبال کے ہاں حق گوئی، جسارت، بے باکی کا نمائندہ ہے ☆ طریق : شیوہ، طریقہ، طور ☆

تشریح

علامہ اقبال کا یہ معروف شعر ہے جس میں انہوں نے قلندروں کے شیوۂ حق گوئی کا ذکر کیا ہے۔ قلندر علامہ اقبال کی شاعری کا اہم کردار ہے جو "مسٹر" اور "مُلّا" دونوں کے برعکس اخلاقیات کی اعلیٰ قدروں کا حامل ہے، وہ زمین اور زمانے کو تسخیر کرتا ہے اور تسخیر کے اس کام میں کسی سستی، ظاہر داری، مصلحت، موقعہ شناسی اور زمانہ سازی سے کام نہیں

لیتا، اس کے آس پاس خوف کے پہرے ہوں، قید و بند کا ڈر ہو، لیکن وہ کسی کی پروا نہیں کرتا۔ اس کی زبان ہمیشہ اُس کے دل کی رفیق رہتی ہے، یعنی جو اس کے دل میں ہوتا ہے، وہی اُس کے ہونٹوں پر رہتا ہے، جس طرح باوفا اور اچھے رفیق ڈر اور خوف میں بھی اپنے دوست کا ساتھ نہیں چھوڑتے، اسی طرح خوف کی فضا میں بھی اُس کی زبان، دل کی سچائی اور صداقت کا اظہار کرتی ہے، موقف کے اظہار میں کسی لکنت کا شکار نہیں ہوتی، بلکہ بے باکی اور بے خوفی سے ظالموں اور جابروں کے سامنے اپنے محسوسات اور خیالات کا بے لاگ اظہار کر دیتی ہے۔

اقبال کہتے ہیں کہ خوف کے نرغے میں گِھر کر بھی سچائی کا اظہار کوئی ایسی خوبی نہیں جو کسی ایک زمانے سے متعلق ہو، قلندرانہ طور طریقوں والے شروع دن ہی سے حق گوئی کی اس بیباکانہ روایت کو نبھاتے آ رہے ہیں۔ انسانیت کی تاریخ اور درویشوں کے تذکرے ایسی ہزاروں مثالوں سے بھرے پڑے ہیں، جن میں جان کی قربانی دے کر بھی حق گوئی کا عَلَم بلند کرنے والے ایسے بے باک مجاھد، درویش، شہید، دانشور اور اولیائے کرام مل جاتے ہیں، جو حق اور سچائی کا اسی طرح بیان کرتے رہے ہیں، جیسے انہوں نے اپنے دل میں محسوس کیا اور اس اظہار میں انہوں نے کبھی کسی قید، ڈر، سزا یا خوف کی پروا نہیں کی۔

بقولِ کسے ؎

زنجیریں کیا قید کریں گی سچائی کا نور
تلواریں کب روک سکیں گی اہلِ حق کی راہ

شعر نمبر ۲

علاجِ ضعفِ یقیں اُن سے ہو نہیں سکتا
غریب اگرچہ ہیں رازی کے نکتہ ہائے دقیق

مشکل الفاظ

ضعف: کمزوری ✤ غریب: انوکھے، نرالے ✤ رازی: امام فخرالدین رازی، چھٹی صدی ہجری کے معروف فلاسفر اور مفسّرِ قرآن ✤ نکتہ: کوئی انوکھی اور باریک بات ✤ دقیق: مشکل ✤

تشریح

علامہ اقبال کے کلام میں "یقین" کے تصوّر کو ایک خاص اہمیّت حاصل ہے۔ اُن کے بقول ؎ "قومے بمیرد از بے یقینی" (مایوسی اور بے یقینی قوموں کو تباہ و برباد کر دیتی ہے) اقبال اپنے زمانے میں ملّتِ اسلامیہ کو مایوسی اور نا امیدی کا شکار ہوتے دیکھ رہے تھے: اکثر مسلمان ممالک انگریزوں اور دوسری یورپی اقوام کے غلام تھے، سالہا سال کی غلامی نے اُن سے یقین و اعتماد کا وہ سرمایہ چھین لیا تھا جو قوموں کی زندگی کی علامت ہوا کرتا ہے۔

علّامہ اقبالؔ اس شعر میں کہتے ہیں کہ رازیؔ جیسے مفکّروں اور مفسّروں کی موشگافیاں، ملّتِ اسلامیہ کو لاحق بے یقینی اور اعتماد کی کمزوری کا علاج نہیں کر سکتیں۔ اقبالؔ کے کلام میں عقل و خرد کی بجائے جوش و جذبہ اور عشق و وجدان کو نمایاں حیثیت حاصل ہے، یہی وجہ ہے کہ اپنے کلام میں عقل و عشق کی آویزش اور کشمکش کو وہ رازیؔ اور رومیؔ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں، اُن کے ہاں رازیؔ ان مفکروں کا نمائندہ ہے جو معاملات و مسائل کا باریک بینی سے مشاہدہ کرتے ہیں، مگر ایک سطح تک پہنچنے کے بعد بھی کُلّی ادراک سے محروم رہتے ہیں، اس کے برعکس مولانا روم جیسے اہلِ دل اور اہلِ عشق اپنی جذب و مستی کے سبب بہت سی پیچیدہ گتھیوں کو سلجھا لیتے ہیں۔ ان کے بقول رازیؔ نے اگرچہ اپنی عقل کی بنیاد پر نئی نئی باتیں کیں، بہت سے مشکل نکات اور آسانی سے سمجھ نہ آنے والے معاملات و مسائل سلجھائے اس کے باوجود وہ یقین و جذبہ کی دولت عطا کرنے سے قاصر ہیں۔ مسلمانوں کو اپنے مرض کے علاج کے لئے رازیؔ ایسے علم الکلام کے ماہروں اور مفکّروں کی بجائے رومیؔ ایسے جذب و مستی سے سرشار اہلِ دل اور صاحبانِ یقین کی تقلید کرنی چاہیئے۔

بقولِ کسے ؎

پیروی عقل کی رکھے گی مجھے رستے میں
منزلِ صدق و یقیں پیرویٔ عشق میں ہے

شعر نمبر ۳

اُسی طلسمِ کہن میں اسیر ہے آدم
بغل میں اُس کی ہیں اب تک بُتانِ عہدِ عتیق

مشکل الفاظ

طلسم: جادو ٭ کہن: قدیم، پُرانا ٭ اسیر: قید، غلام ٭ آدم: بنی نوع انسان ٭ بُتان: بُت کی جمع ٭ عہدِ عتیق: پُرانا زمانہ، قدیم دور ٭

تشریح

اس شعر میں "بُتانِ عہدِ عتیق" ایک کلیدی ترکیب ہے، جس کا لفظی مطلب تو پرانے زمانے کے بُت ہیں، مگر جو ان اشیاء اور تصوّرات کی طرف اشارہ ہے، جو بُتوں اور خداؤں کی طرح قابلِ پرستش رہے ہیں، ان میں رنگ، نسل، زبان، قبیلہ، ملک، دولت، رتبہ، رشتہ داریاں اور دوسری بہت سی اشیاء اور تعلقات ہیں جو آدمی کے نزدیک عبادت کا درجہ اختیار کر گئی ہیں، آدمی نے اب تک یہ بُت اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے ہیں اور ان منفی قدروں کو سینے سے لگا رکھا ہے۔ ان اشیاء، تصورات کو کسی زمانے میں "معبود" کا درجہ حاصل ہو تو ہو، اسلام نے ان پر بڑی کاری ضرب لگائی اور انسانیت کے زمانۂ جاہلیت کی ان منفی قدروں کے بُتوں کو پاش پاش کر دیا۔

چاہیئے تو یہ تھا کہ اسلام کی آمد، قرآن کی تعلیمات اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات خصوصاً خطبہ حجۃ الوداع کے واضح احکامات کے بعد رنگ، نسل، خون، قبیلہ اور زبان کی پرستش نہ کی جاتی اور ان پر فخر کرنے کی بجائے صرف "تقویٰ" کو برتری کا معیار بنایا جاتا مگر افسوس کہ اسلام کی روشنی اور واضح تعلیم کے باوجود انسان نے ابھی تک رنگ اور نسل کو برتری اور فخر کا معیار بنایا ہوا ہے۔ جنوبی افریقہ اور خود امریکہ میں جسے مہذب ملکوں میں سرفہرست ہونے کا 'اعزاز' حاصل ہے، کالے اور گورے کی شرمناک تفریق روا رکھی جاتی ہے۔ درس گاہوں، ہوٹلوں، کلبوں اور ہسپتالوں سے لے کر پبلک پارک تک میں آج بھی (WHITES ONLY) "صرف سفید فام لوگوں کے لئے" کے بورڈ آویزاں نظر آتے ہیں۔

اقبال کہتے ہیں کہ یہ تفریق تو پرانے زمانے میں جاہلیت اور لاعلمی کے سبب تھی، مگر افسوس ہے آج ترقی یافتہ کہلانے کے باوجود آدمی اسی پرانے جادو میں قید ہے۔ طلسم سے مراد ہے کہ اس تفریق کی اصل میں کوئی حقیقت نہیں، نہ ہی اس کا کوئی سچا جواز ہے۔ یہ ایک باطل جادو کی صورت ہے۔

'بغل میں' کے الفاظ انسان کی منافقت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ قبولِ اسلام کے اوّلین دور میں بعض منافق ہونٹوں سے تو توحید کا اظہار کرتے تھے مگر درپردہ اپنے زمانۂ جاہلیت کے خداؤں کو عزیز جاں رکھے ہوئے تھے۔ بعض اوقات ایسے منافق ان خداؤں کے چھوٹے چھوٹے بتوں کو اپنی بغل میں دابے رکھتے تاکہ وہ نظر بھی نہ آئیں اور ان سے وابستگی اور ربط بھی برقرار رہے۔

اقبال اس سے عصرِ حاضر کے جدید اور مہذب انسان کی منافقت کا اظہار کرتے ہیں جو اقوام متحدہ جیسے اداروں اور اپنے ملکی قوانین و آئین میں رنگ، نسل، مذہب اور علاقہ کی بنیاد پر کسی تفریق کا قائل نہیں، مگر اپنے عمل میں اس تفریق کو صرف روا ہی نہیں رکھتا، بلکہ اس کا پرستش کی حد تک احترام کرتا ہے۔ ہندوستان کا آئین اس کی شرمناک مثال ہے، جو سیکولر ہونے کے ناطے ہندو اور مسلمان دونوں کے ساتھ یکساں سلوک کا دعوے دار ہے مگر وہاں آئے دن رونما ہونے والے فسادات اور مسلم کُشی کی گھناؤنی واردات اس کی منافقت کا کھلا ثبوت ہیں۔

بقولِ کسے ؎

مختلف درجوں میں بانٹا ہے ہمیں اس عہد نے
ایک جیسے ہو کے بھی ہم سب نہیں ہیں ایک سے

شعر نمبر

مرے لئے تو ہے اِقرار باللّسان بھی بہت
ہزار شکر کہ ملّا ہے صاحبِ تصدیق

مشکل الفاظ اقرار باللّسان: زبان سے اقرار یا عہد کرنا ٭ صاحبِ تصدیق: وہ شخص جس کا دل، روح یعنی پورا وجود، کسی بات کی تصدیق کرے اسکو سچ مانے۔

تشریح "اِقْرَارٌ بِاللِّسَانِ وَتَصْدِيْقٌ بِالْقَلْبِ" ایمان کے عہد کے ضمن میں بڑا معروف فقرہ ہے، جس کا مطلب زبان سے اقرار کرنا اور دل سے اس اقرار کی تصدیق کرنا ہے۔ عام طور پر آدمی زبان سے کسی حقیقت کا اعتراف و اقرار کرتا ہے مگر اسے اُس وقت تک مکمل نہیں کہا جاتا جب تک اِقرار کرنے والے کا دل اس کہی ہوئی بات کی تصدیق نہ کرے۔ مطلب یہ کہ خدا پر ایمان لانے کی اعلیٰ صورت یہ ہے کہ آدمی صرف زبان سے خدا کے وجود، توحید اور اس کی حاکمیت کا اعتراف و اقرار نہ کرے بلکہ اپنے دل سے بھی اسے تسلیم کرے یعنی اس کا پورا وجود اس بلند و برتر اور ارفع و اعلیٰ ذات کو تسلیم کرے۔ مگر عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ آدمی زبان سے خدا کے وجود کا اعتراف کرتا ہے مگر اُس کے افعال اور زندگی کے دوسرے مشاغل اس اعتراف کی تصدیق کرتے نظر نہیں آتے بلکہ معنوی پس منظر بتاتا ہے کہ ملاّ نے اقبال کو طعنہ دیا ہے کہ اُس کے قول و فعل میں تضاد ہے۔ وہ زبانی تو خدا کی حاکمیت کا اعتراف کرتا ہے مگر اس کا دل اس اقرار کی تصدیق کرتا نظر نہیں آتا کیونکہ اس کے اعمال میں غیر اسلامی رنگ جھلکتا ہے۔

علامہ اقبال جواب میں (ملاّ کو) طنزاً کہتے ہیں کہ میرے لئے تو یہ زبانی اعتراف اور اقرار بھی بہت ہے، مَیں اسی پر مطمئن اور راضی ہوں۔ اگر میرا دل میرے اقرار کی تصدیق نہیں کرتا تو کوئی بات نہیں، وہ کبھی نہ کبھی کر دے گا۔ مگر اللہ کا شکر ہے کہ ملاّ کا دل تو اس کے زبانی قول، قرار اور عہد کی تصدیق کرتا ہے۔ اسے میرے زبانی عہد کی فکر نہیں کرنی چاہیئے" اپنی دلی تصدیق پر خوش رہنا چاہیئے۔

یہاں اقبال ملاّ کے اس روائتی کردار پر طنز کرتے ہیں، جو کہتا کچھ ہے مگر کرتا کچھ ہے اور جس کے اپنے قول و فعل میں دوئی ہے۔ جو زبانی تو اسلامی تعلیمات کا درس دیتا ہے مگر اس کے اپنے اعمال میں غیر اسلامی طور طریقے نظر آتے ہیں۔

بقولِ کسے ؎
امیرِ شہر تضادات کا ہے مجموعہ
جو لگ رہا ہے وہ ایسا نظر نہیں آتا

شعر نمبر ۵

اگر ہو عشق تو ہے کفر بھی مسلمانی
نہ ہو تو مردِ مسلماں بھی کافر و زندیق

مشکل الفاظ

زندیق : بے دین، ملحد، کافر ۔

تشریح

علامہ اقبال نے اس شعر میں جذبۂ عشق کی اہمیت کو واضح کیا ہے، اقبال کے اس شعر کو ان کے ایک شعر کی روشنی میں دیکھتے ہیں:

ے
عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق
عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

یعنی عقل کا معاملہ ہو، دل کا یا نظر کا، عشق کو ان کے اوّلین مرشد کی حیثیت حاصل ہے۔ اگر عشق کا جذبہ نہ ہو تو شریعت اور دین، تصوّرات کا بتخانہ بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہ تصورات، عقیدہ کے درجہ پر اس وقت پہنچتے ہیں جب انہیں عشق کے نور کی روشنی میں دیکھا جائے اور محبت کے جذبہ کے حوالے سے انہیں محسوس کیا جائے۔

اقبال کہتے ہیں کہ عشق کا جذبہ، کفر کو مسلمانی میں بدل دیتا ہے اور اگر کسی مسلمان کے اندر عشق کا جذبہ نہ ہو تو وہ نام کا مسلمان ہو گا۔ حقیقت میں وہ کافر اور ملحد ہو گا۔ اقبال کے ہاں عشق اللہ تعالیٰ سے محبّت اور اللہ کے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت اور ان احکامات سے محبت کا نام ہے جو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہم تک پہنچے۔ اگر ہم عقائدِ اسلام کو تو مانتے ہیں اور شریعتِ اسلامی کے مطابق عمل بھی کرتے ہیں، مگر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہمارا تعلق، نسبت اور عشق دنیا بھر کی تمام چیزوں، رشتوں اور محبتوں سے زیادہ نہیں تو ہماری مسلمانی نہ صرف مشکوک ہے، بلکہ اقبال کے لفظوں میں وہ کفر سے زیادہ بدتر ہے۔

بقولِ کسے ے
جذبۂ عشق سلامت ہے مرا تو اے دوست
ہوں مسلمان بھی اور صاحبِ ایمان بھی مَیں

غزل نمبر ۳

شعر نمبر ۱

دلِ بیدار فاروقیؓ، دلِ بیدار کراریؓ
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

مشکل الفاظ دلِ بیدار: دل کا زندہ و بیدار رہنا۔ (میر درد کے اشعار کی تشریح میں اس لفظ پر تفصیل سے بحث ہو چکی ہے) ٭ فاروقی: حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اوصاف اور خوبیوں والا ٭ کراری: حضرت علی حیدر کرار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اوصاف اور خوبیوں والا (ان دونوں لفظوں میں بھی 'فاروق اور کرار' کے ساتھ "ی" کا حرف ملا کر علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں ترکیب بنائی ہے ٭ مس: تانبا ٭ آدم: آدمی، انسان ٭ کیمیا: وہ علم جس سے سونا بنایا جاتا ہے، سونا بنانے والے کو کیمیا گر کہتے ہیں۔ ٭

تشریح علامہ اقبال نے اس شعر میں انسانی وجود کے اندر دل کی بیداری کی اہمیت واضح کی ہے۔ دل نہ صرف زندگی کا منبع ہے بلکہ زندگی میں حرارت، حرکت، توانائی، شادابی، رونق اور تمام کیفیات کی جان ہے۔ اگر یہ زندہ ہے تو انسان زندہ ہے اور اگر یہ بیدار ہے، ہمہ وقت اپنے خالق کی یاد سے معمور ہے تو گویا اس کے اندر حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے اوصاف کی جھلک پائی جاتی ہے۔

جیسے کیمیا تانبے کو سونا بنا دیتی ہے، اسی طرح دل کی بیداری آدمی کو صحیح معنی میں اشرف المخلوق بناتی ہے اور اس کی مٹی کو سونے میں بدل دیتی ہے۔

اقبال نے دوسرے مصرع میں ایک تشبیہ کے ذریعے دل کی بیداری کو واضح کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگر آدم کو تانبا فرض کر لیا جائے تو دل کی بیداری اس کے لئے کیمیا کی مانند ہے۔ دلِ بیدار کے سبب اس کے وجود میں برگزیدہ ترین مسلمانوں کی صفات کی جھلک پیدا ہو جائے گی۔

بقولِ کسے ؎ یاد سے اُس کی کبھی غافل نہ ہو
اپنے دل کو ہر گھڑی بیدار رکھ

شعر نمبر ۲

دلِ بیدار پیدا کر، کہ دل خوابیدہ ہے جب تک
نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری

مشکل الفاظ دلِ بیدار: زندہ دل ٭ خوابیدہ: سویا ہوا ٭ ضرب: وار ٭ کاری: گہری

تشریح علامہ اقبال پہلے شعر کے مضمون کو آگے بڑھاتے ہیں۔ پہلے شعر میں انہوں نے دلِ بیدار کی اہمیت واضح کی تھی، اس شعر میں وہ اپنے قارئین اور ہم وطنوں سے مخاطب ہیں کہ ہمیں اپنی ضرب کو مؤثر بنانے کے لئے خواب کے دھندلکوں سے نکلنا ہو گا، جب تک دل سویا ہوا ہے۔ ہمارا کوئی فعل، جد و جہد، کوشش اور محنت بار ور نہیں ہو گی۔ ہماری جد و جہد اس وقت

ہی رنگ لائے گی جب اس کے پس منظر میں حرارت، حرکت اور توانائی سے بھرپور کوئی زندہ دل دھڑک رہا ہو گا۔

علامہ اقبال کے اس شعر کا مقصد یہ ہے کہ سستی اور غفلت ترک کر کے ہمیں اپنے آپ کو جھنجوڑنا اور اپنے دِل کو خواب غفلت سے جگانا ہو گا۔ دل کی غفلت اور نیند زندگی کی موت ہے، جو مایوسی اور نا امیدی کو جنم دیتی ہے۔ اگر قوم کے اکثر لوگ اس مایوسی اور غفلت کے عادی ہو جائیں تو یہ قوم موت کے مترادف ہے۔ لہٰذا بقول اقبال ہمیں ہر حال میں غفلت و بے عملی کو جھٹک کر اپنے دِل کو بیدار رکھنا ہو گا۔

بقول کسے ؎

اس بے دِلی سے بڑھ کے نہیں کوئی بھی شکست
زندہ ہے جس کا قلب وہی کامران ہے

شعر نمبر ۳

مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشان اس کا
ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

مشکل الفاظ

مشام: سونگھنے کی حس، حسِ شامہ ❖ صحرا: دشت، بیاباں ❖ نشاں: سراغ ❖ ظن و تخمین: اندازہ، قیاس ❖ آہو: ہرن ❖ تاتاری: تاتار سے متعلق، تاتار وسط ایشیا کا وہ علاقہ ہے، جو ختن کے نام سے بھی معروف ہے۔ اس علاقے کے ہرن نافہ کے سبب دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ نافہ اس قیمتی خوشبو کو کہتے ہیں جو فطری طور پر ہرن کی ناف میں پیدا ہوتی ہے۔

تشریح

علامہ اقبال نے اس شعر میں ظن و تخمین پر مشامِ تیز کی برتری ثابت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تاتاری ہرن کو پکڑنا ہو جو صحرا کے اندر کہیں چھپا ہوا ہو اور کہیں نظر نہ آ رہا ہو تو صرف قیاس اور اندازے سے (کہ وہ فلاں ٹیلے کے پیچھے چھپا ہوا ہو گا یا فلاں جھاڑی میں ہو گا) ہاتھ نہیں آتا۔ اسے پکڑنے کے لئے سونگھنے کی تیز حس کا ہونا ضروری ہے۔

آہوئے تاتاری جو اپنے خوشبودار نافہ کے سبب بہت مشہور ہے جہاں سے گزرتا ہے خوشبو پھیلاتا جاتا ہے۔ اس کی خوشبو ہی صحرا میں اس کے راستے کی نشاندہی کرتی ہے۔ اگر کسی شکاری کی حسِ شامہ (سونگھنے کی حس تیز نہیں ہے (یا سرے سے نہیں) تو وہ اسے کیسے تلاش کر سکتا ہے؟ محض اندازے اور ٹامک ٹوئیاں مارنے سے تو اُس کا نشان نہیں ملتا۔

آہوئے تاتاری کے الفاظ یہاں مقصد اور اعلیٰ نصب العین یا خواہش کی علامت ہیں اور مشامِ تیز انسان کی بصیرت اور وہ باطنی قوت ہے جسے جذبۂ عشق بھی کہہ سکتے ہیں اور جو انسانی زندگی کی جد وجہد اور تگ و دَو میں قیاس اور اندازہ سے زیادہ مؤثر، کارآمد اور توانا ہے۔ علامہ

اقبالؔ کی مراد یہ ہے کہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد کے حصول کے لئے قیاس سے قیام لینے کی بجائے اندرونی توانائی، جذبہ اور بصیرت سے کام لینا چاہئے۔

بقولِ کسے ؎
سوئے فرات تیز نگاہی ہو راہبر
مشکیزۂ مراد بھرا کب قیاس سے

شعر نمبر ۴
خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

مُشکل الفاظ
خداوندا: اے خدا ✦ درویشی: فقیری ✦ عیاری: مکر، فریب، ریا، دھوکا ✦ سلطانی: بادشاہت ✦

تشریح
علامہ اقبالؔ کہتے ہیں کہ عصرِ حاضر میں سلطانی تو عیاری تھی ہی، افسوس ہے، درویشی بھی مکر و فریب کا دوسرا نام ہو گئی ہے۔ بادشاہ اپنی بادشاہت قائم کرنے کے لئے سو سو طرح کے حیلے بہانے کرتے ہیں۔ صرف اپنے اقتدار کو طول دینے کے لئے رعایا کو دھوکا دیتے ہیں، جنگیں لڑتے ہیں، سازشیں کرتے ہیں غرضیکہ بادشاہت میں مکر و فریب، ہر چیز کو گوارا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے برعکس درویشی و فقیری جو کبھی بے ریا اور مخلص لوگوں کا کام تھی اب زمانے کے بدلنے کے ساتھ ساتھ اپنی حقیقی شکل کھو بیٹھی ہے، اس میں سے اخلاص، سادگی قناعت، صبر، حق گوئی اور دوسری اعلیٰ صفات ختم ہو گئی ہیں اور اب درویشوں اور فقیروں کے اندر بھی دنیا داروں والی سب خامیاں نظر آتی ہیں، ریا، مصلحت پسندی، مال و دولت کی حرص، تکبّر اور کئی دوسری اخلاقی برائیوں نے انہیں گھیر لیا ہے۔ اے خدا اب تو ہی بتا کہ تیرے وہ سادہ دل بندے جو درباروں کے مصنوعی ماحول اور جھوٹی شان و شوکت سے اکتا کر سکون کی تلاش میں فقیروں کی خانقاہوں کی طرف آتے تھے وہ اب کہاں جائیں؟ اب تو خانقاہیں بھی درباروں کی طرح ہو گئی ہیں اور درویشوں کے اندر بھی بادشاہوں جیسا کرّ و فر، رکھ رکھاؤ، تصنّع اور کبر و نخوت پیدا ہو گیا ہے۔ دونوں طرف ایک مصنوعی ماحول ہے اور تصنّع ہی تصنّع ہے۔ وہ لوگ جو سادہ لوح ہیں، سادگی پسند اور سادہ طبیعت والے ہیں، انہیں دربار اور خانقاہیں دونوں میں سادگی نہیں ملتی، وہ اب کہاں جائیں؟ مراد یہ ہے کہ وہ جدھر بھی جاتے ہیں، انہیں شان و شوکت اور تصنّع اور بناوٹ نظر آتی ہے۔

بقولِ کسے ؎
ہر اک جانب دھوکا، اور ظاہر داری ہے
کس کا دامن پکڑیں کس کے ساتھ چلیں ہم

شعر نمبر ۵

مجھے تہذیبِ حاضر نے عطا کی ہے وہ آزادی
کہ ظاہر میں تو آزادی ہے باطن میں گرفتاری

مشکل الفاظ

تہذیب حاضر: موجودہ زمانے کی تہذیب، رہن سہن کے جدید طریقے، نیا زمانہ۔
باطن: درپردہ، اندرونی طور پر، حقیقت میں۔

تشریح

علامہ اقبالؔ نے اس شعر میں جدید زمانے کی تہذیب پر طنز کیا ہے۔ آجکل جو آزادی کے نعرے لگ رہے ہیں، یہ بے لگام آزادی کسی اعلیٰ مقصد پر ختم نہیں ہوتی، بلکہ ایسے انتشار، معاشرتی بگاڑ اور فساد کا سبب بنتی ہے جو پورے معاشرے کو ایک تباہی کے دہانے پر لا کھڑا کرتی ہے۔

انسان جس چیز سے مرضی آزاد ہو جائے اپنی فطرت سے اور فطری تقاضوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ خدا کا اقرار اس کی فطرت کا ایک ناگزیر حصہ ہے، اس کی بندگی اور اطاعت اس کے خمیر میں رچی ہوئی ہے۔ وہ لاکھ زبان سے اس کا انکار کرے، اس کا پورا وجود کسی ایسی اعلیٰ و برتر ذات کا قائل ہے، جو اسے پیدا کرنے والی ہے اور اس کے گرد پھیلی ہوئی کائنات کو پیدا کرنے والی ہے۔ اقبالؔ کہتے ہیں کہ کہنے کو تو عصر حاضر کے لوگوں کو آزادی میسّر ہے۔ مگر یہ مادر پدر آزادی دراصل انسان کی گرفتاری ہے۔ انسان نے معاشرے میں تمام اخلاقی اور روایتی پابندیوں کو توڑ کر مذہب و اخلاق کو بالائے طاق رکھ کر آزاد ہونے کا نعرہ لگایا ہے، مگر کیا وہ حقیقتاً آزاد ہو گیا ہے؟ اب وہ اپنے نفس کا غلام ہے، اپنی جبلتوں کا قیدی ہے، اپنی خواہشوں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ گیا ہے۔

عصرِ حاضر میں ہر پرانی قدر کی توڑ پھوڑ، اخلاقی ضابطوں کو تسلیم کرنے سے انکار، شادی بیاہ اور گھر گرہستی کی اہمیت و ضرورت سے انکار، مرد اور عورت کا اپنی فطری جبلتوں سے گریز، ان سب آزادیوں نے آج کے انسان کو درحقیقت ایک اندرونی اور باطنی مصیبت، انتشار اور فساد میں مبتلا کر دیا ہے۔ ہمارے جسم آزاد ہوں تو ہوں ہماری روحیں غلام اور قید ہیں۔ ذہن و روح کی یہ اسیری جسمانی غلامی سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہے۔

بقولِ کسے ؎
دیکھنے میں تو میں آزاد ہوں لیکن دراصل
میری سوچوں پہ ہے غیروں کا ابھی تک قبضہ

شعر نمبر ۶

تُو اے مولائے یثرب آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایماں ہے زُنّاری

مشکل الفاظ مولائے یثرب : یثرب کے والی، مدینہ کے آقا، حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ٭ چارہ سازی: علاج ٭ دانش : فکر، عقل، خیالات ٭ افرنگی : افرنگ (انگریز) سے متعلق ٭ زنّاری: زُنّار وہ دھاگا ہوتا ہے جو ہندو گلے میں ڈالتے ہیں ٭

تشریح بقولِ کسے ؎ جانبِ خیر، سوئے خیر بشر اُٹھتی ہے
کوئی مشکل ہو، مدینے کو نظر اُٹھتی ہے

علامہ اقبال سوچ اور فکر کی گمراہی سے پیدا ہونے والی جن مصیبتوں کا ذکر اوپر والے شعر میں کر آئے ہیں، اُن سے نجات حاصل کرنے کے لئے سرکارِ مدینہ ؐ سے مخاطب ہیں کہ اے یثرب (مدینہ) کے والی! میرے افکار و خیالات پر مغرب کی چھاپ ہے، انگریزی تعلیم کے اثرات نے میرے عقل و شعور کو اپنے رنگ میں رنگ لیا ہے اور میرے ایمان پر ہندوآنہ رسم و رواج کی گرفت ہے۔ دانش اور ایمان، میری کوئی چیز اپنی حقیقی صورت میں محفوظ نہیں رہی۔

علامہ اقبال نے اپنی ذات کے حوالے سے پوری ملّتِ اسلامیہ (خصوصاً برّصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں) کی دینی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افسوس ہے ہمارے اندر جذبۂ دین خالص نہیں رہا۔ ہماری سوچوں پر انگریزی خیالات و افکار کا اثر ہے اور ہمارے مذہبی شعائر اور طور طریقوں میں ہندوآنہ اور مشرکانہ رسمیں اور رواج شامل ہو گئے ہیں۔ وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے التجا کرتے ہیں کہ اس پریشانی اور مصیبت میں آپؐ ہی ہماری مدد فرمائیں کہ ہماری سوچیں اور ہمارا ایمان ہر طرح کے غیر اسلامی اثرات سے پاک و صاف ہو جائے اور ہم پرانے مسلمانوں کی طرح اپنے افکار و اعمال میں سچے اور خالص مسلمان ہو جائیں، انگریز اور ہندوؤں کے طور طریقے چھوڑ دیں اور صحیح اسلامی فکر اور طرزِ حیات کو اپنائیں۔

بقولِ کسے ؎ سلف کا سوز عطا ہو، یہی دعا ہے مری
ہوا ہے شیوۂ اغیار کا یہ ذہن قتیل

حفیظ جالندھری

(۱۹۰۰ء - ۱۹۸۲ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱

جس کو مجھ میں بھی کوئی بات نظر آتی ہے
اے خدا ! ایک تری ذات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ

کوئی بات نظر آنا ، کوئی خوبی دکھائی دینا

تشریح

اللہ اپنے بندے سے جتنی محبت کرتا ہے ، اتنی اس کے عزیز و اقارب بھی نہیں کرتے ۔ حفیظ جالندھری نے اس شعر میں اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ میں گناہ گار ہوں ۔ مجھ میں عیب ہی عیب ہیں ۔ دوست یار سبھی اس حالت میں مجھ سے منہ پھیر رہے ہیں ۔ اب میرے ہونے یا نہ ہونے کی ان سب کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ۔ مگر اے خدا ایک تیری ذات ایسی ہے جو اب بھی مجھ سے مایوس نہیں ہوئی ۔ جس نے اب بھی مجھ سے منہ نہیں پھیرا ، جو میری پرورش کر رہی ہے ، میرا رزق مجھ تک پہنچا رہی ہے اور مجھے زندہ رکھے ہوئے ہے ۔ یقیناً میرے اندر اب بھی کوئی نہ کوئی بات ، خوبی یا صفت ایسی ہے جو تیری رحمت اور کرم کا سبب بنی ہوئی ہے ۔

انسان اس کائنات میں خدا کا نائب ہے ، اشرف المخلوقات ہے ۔ ساری دنیا اسے نظر انداز کر دے مگر خدا اپنے بندے کو کبھی نظر انداز نہیں کرتا ۔ اُسے اپنے بندے سے اس کی سرکشی اور حکم عدولی کے باوجود محبت رہتی ہے ۔ حفیظ کہتے ہیں کہ تمام اہلِ دنیا تو مجھے بھول گئے صرف خدا کی ذات رہ گئی ہے جو اب بھی میرا خیال کر رہی ہے ۔ بقول کسے ؎

اہلِ جہان تو مجھے بھول گئے ہیں تمام
ایک تری ذات ہے ، جس کا کرم اب بھی ہے

شعر نمبر ۲

نظر آتی ہی نہیں صورتِ حالات کوئی
اب یہی صورتِ حالات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ

صورتِ حالات ، حالات و واقعات کی شکل ، چہرہ

تشریح حفیظ کا یہ شعر زبان کا شعر ہے (زبان کا شعر اسے کہتے ہیں جس میں الفاظ کے استعمال میں خاص سلیقہ برتا جائے، ایک جیسے الفاظ کی تکرار یا محاورہ سے بات پیدا کی جائے) وہ کہتے ہیں کہ موجودہ صورتِ حالات کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا۔ شعر کا پس منظر بتاتا ہے کہ حالات بہت خراب ہیں، دکھ اور مصیبتوں میں زندگی گھر گئی ہے اور اب ان مشکلوں الجھنوں، دکھوں اور مصیبتوں سے نکلنے کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا۔

دوسرے مصرع میں کہتے ہیں کہ اگر کوئی صورتِ حالات ہے تو یہی ہے جو درپیش ہے شاعر کی مراد یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال سے نباہ کئے بغیر اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ زندگی جیسی بھی ہے ہمارا ماحول جس انداز کا بھی ہے اس میں کوئی تبدیلی یا ردّوبدل ناممکن ہے۔ زندہ رہنے کی اب ایک یہی صورت رہ گئی ہے۔ اسے اس حالت میں قبول کیا جائے اور اس کے ساتھ سمجھوتہ کیا جائے کیونکہ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں۔ بقول کسے ؎

رفتارِ وقت ہی نہیں جب اختیار میں
جیسی بھی زندگی ہے گزارا کئے چلو

شعر نمبر ۳

یہ عجب مرحلہ عمر ہے یارب کہ مجھے
ہر بری بات بری بات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ مرحلہ، مقام مراد وقت

تشریح زندگی بھر آدمی سوچ اور فکر کی ایک منزل پر نہیں رہتا۔ ہر عمر کے اپنے جذبے اور اپنی سوچیں ہوتی ہیں جو چیزوں کو پسندیدہ یا غیر پسندیدہ اور اچھا یا برا سمجھتی ہیں۔ اور جوانی میں آدمی اکثر اوقات چھوٹے چھوٹے گناہ کے کاموں کا ارتکاب بھی کرتا رہتا ہے اور اس پر پچھتاتا نہیں، نہ ہی اُسے بُرا سمجھتا ہے، جیسے بچپن کی شرارتیں، کسی کو تنگ کر کے خوش ہونا، کوئی جھوٹ بول کر یا بہانہ بنا کر والدین سے کچھ پیسے لینا، ہمسایہ کے درخت سے چوری چھپے پھل اتار کر کھانا۔ غرضیکہ ایسی سینکڑوں حرکتیں ہوتی ہیں جو اخلاقی طور پر تو بری ہوتی ہیں مگر بچپنے کی معصومیت اور بھولپن اسے برا نہیں سمجھتی۔ دیکھنے اور سننے والے بھی عموماً اسے نظر انداز کر دیتے ہیں اسی طرح جوانی کا زمانہ ہوتا ہے، یاروں کے ساتھ خوش گپیاں، غیبتیں، وقت کا ضائع کرنا، تاک جھانک بہت سی ایسی خرابیاں ہیں جو آدمی کرتا رہتا ہے مگر اسے ان خرابیوں کا احساس نہیں ہوتا لیکن جب انسان بڑی عمر کو پہنچتا ہے تو ذرا ذرا سی برائی بھی ایک بڑا گناہ بن کر اسکے

سامنے آکھڑی ہوتی ہے اور وہ اسکا سوچتے ہی لرز جاتا ہے - یہ وہ زمانہ ہے جب آدمی کے لئے گناہ کی بات کو نظر انداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے - وہ عام طور پر اپنے رویوں میں محتاط ہو جاتا ہے، وعدے کا پاس کرتا ہے، لین دین میں بے ایمانی سے کام نہیں لیتا۔

حفیظ اس شعر میں عمر کی ایسی ہی منزل کی نشاندہی کرتے ہیں کہ یارب یہ عجب مقام ہے کہ اب ہر بُری بات بُری ہی لگتی ہے اور اس سے نباہ یا سمجھوتہ نہیں ہوتا -

بقول کسے ؎

اب بوجھ ہے دل پہ مرے احساسِ گنہ بھی
تھا کارِ گنہ بھی کبھی راحت دل و جان کی

شعر نمبر ۴

چلتے پھرتے ہوئے مُردوں سے ملاقاتیں ہیں
زندگی کشف و کرامات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ

کشف، کھولنا، ظاہر کرنا، مراد غیب کی باتوں کا اظہار، انکشاف
کرامات، کرامت کی جمع، کوئی حیرت انگیز بات جو کسی ولی سے ظاہر ہو، معمول سے ہٹ کر کوئی انوکھی چیز -

تشریح

حفیظ اس مشینی زندگی میں انسانوں کی بے حسی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہمارے زمانے میں زندہ حسیں رکھنے والے جیتے جاگتے انسانوں کا قحط پڑ گیا ہے - گلیوں میں سڑکوں پر ہجوم تو بڑھ گیا ہے مگر ان کے اندر صحیح زندگی رکھنے والے انسان نہ ہونے کے برابر ہیں - دولت کی دوڑ اور شہرت کی ہوس نے انسانوں کے اندر سے صحیح زندگی کا شعور ہی چھین لیا ہے - کہنے کو تو لوگ زندہ ہیں مگر حقیقت میں مردہ ہیں - یوں لگتا ہے جیسے سڑکوں پر انسان نہیں قبروں کے کتبے ہیں - کہتے ہیں کہ اب انسانوں کی بجائے ان کی لاشوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں - مُردوں سے ملاقات چونکہ عام عادت کے خلاف واقعہ ہے اس لئے حفیظ نے اسے کشف و کرامات کہا ہے -

وہ کہتے ہیں کہ اپنی زندگی اولیائے کرام کی کرامتوں کی طرح نظر آتی ہے - اولیائے کرام کے واقعات میں 'کشفِ قبور' کے تجربے ملتے ہیں جن میں وہ مر چکے لوگوں کے احوال و کیفیات کا اندازہ لگاتے اور ان سے ہمکلام ہوتے ہیں - حفیظ کہتے ہیں کہ ہمیں لوگوں کی موت سے قبل ہی ان سے ملاقاتیں کشف و کرامات نظر آتی ہیں - شعر کا مطلب یہی ہے کہ لوگ کہنے کو زندہ ہیں مگر حقیقت میں مردہ ہیں - بقول میاں محمد صاحب کے ؎

عشق بنا دل مردہ غافل کس گنتی وچ آوے

کہ جذبۂ عشق الٰہی کے بغیر دل مردہ ہو جاتا ہے اور اس کے ہونے نہ ہونے کی کوئی حقیقت نہیں ہوتی - ایسے لوگوں کا زندہ لوگوں میں شمار نہیں ہوتا - بقول کسے

شہر کی سڑکوں پہ چلتے پھرتے مُردے رہ گئے
جسم قبریں بن گئے اور چہرے کتبے رہ گئے

شعر نمبر ۵

جلوۂ صبح کا اندھوں میں تو ہے جوش و خروش
آنکھ والوں کو وہی رات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ

جلوۂ صبح ، صبح کا نظارہ ، منظر - جوش و خروش ، ہنگامہ چہل پہل ، رونق

تشریح

حفیظ جالندھری نے دوسرے مصرع میں آنکھ والے اور پہلے مصرع میں اندھے کے لفظ علامتی انداز میں استعمال کئے ہیں - پہلے مصرع میں اندھے کا مطلب بظاہر اندھے ہیں مگر باطنی طور پر بصیرت ، فہم اور شعور رکھنے والے لوگ ہیں دوسرے مصرع میں آنکھ والوں سے مراد وہ لوگ ہیں جو ظاہری طور پر آنکھیں رکھتے ہیں مگر حقیقت میں فہم و فراست اور عقل و شعور سے محروم ہیں -

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ظاہری خامی انسان کی اندرونی حسوں کو اور تیز کر دیتی ہے اور ظاہری خوبی انسان کی غفلت ، لاپرواہی اور بے نیازانہ ردِ عمل کے سبب بے وقعتی اور نا قدری کا شکار ہو جاتی ہے - ہم لوگ آنکھیں رکھتے ہیں مگر پوری طرح بصیرت کی اہمیت کا شعور نہیں رکھتے اور ظاہری بصارت کی موجودگی ہی کو سب کچھ سمجھ لیتے ہیں - اس کے برعکس بصارت سے محروم شخص اپنی اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اندرونی حسّوں اور بصیرت کو تیز کرنے اور تیز رکھنے کے لئے ہر وقت فکر مند رہتے ہیں - انہیں مختلف اشیاء ، چہروں ، جگہوں کی واقفیت اور شعور کو اپنے ذہن میں پختہ اور راسخ کرنے کے لئے چوکس اور مستعد رہنا پڑتا ہے - اس شعر میں حفیظ وقت کی تبدیلی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ رات جا چکی ہے - تعجب اس بات پر ہے کہ جو لوگ آنکھیں رکھتے ہیں اور بظاہر دانا اور بینا ہیں انہیں وقت کی یہ تبدیلی نظر نہیں آتی وہ صبح کا جلوہ دیکھنے سے قاصر ہیں اور انہیں ہر طرف رات کی تاریکیاں نظر آ رہی ہیں ، جبکہ اندھے بظاہر بے شعور لوگ نہ صرف صبح کی روشنی محسوس کر رہے ہیں بلکہ صبح کی آمد پر خوشی سے پھولے نہیں سماتے ہے اور جوش و خروش سے اسی خوشی کا اظہار کر رہے ہیں -

اگر "اندھوں" کو لاعلم اور سادہ لوح عوام کے علامتی معنوں میں اور "آنکھ والوں" کو مہذب

تعلیم یافتہ طبقہ اور دانشوروں کے مفہوم میں دیکھا جائے تو اس شعر کی معنویت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ عموماً دانشور اور مہذب لوگ سماجی، معاشی اور سیاسی تبدیلیوں کے بارے میں شک و شبہ کا اظہار کرتے ہیں اور انہیں صبحِ آزادی کا نور بھی "داغ داغ اجالے" کی صورت میں دکھائی دیتا ہے جبکہ سادہ لوح عوام اس طرح کی تبدیلیوں پر نہ صرف یہ کہ فوری طور پر یقین کر لیتے ہیں بلکہ انہیں قبول کر کے اس پر خوشی و مسرت کا والہانہ اظہار کرتے ہیں۔ بقول کسے ؎

اہلِ عقل کو گو اس بارے سو سو وہم و گمان رہے
ہم سادہ دل دیکھ رہے تھے وقت بدلنے والا ہے

شعر نمبر ۶

زندگی میں تو کوئی چیز انوکھی نہ رہی
موت ہی ایک نئی بات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ

انوکھی، نرالی

تشریح

یہ شعر دیکھئے ؎

ذائقہ کھو دے گی ہر اک شے تمہارے واسطے
تجربوں سے تم سمندر کی طرح بھر جاؤ گے

حفیظؔ زندگی کے مختلف تجربوں سے آشنا ہیں۔ اب ان کے لئے زندگی میں کوئی چیز ایسی نہیں رہی جو انوکھی ہو اور جس کے لئے وہ کوئی کشش محسوس کریں۔ وسیع تر دنیا میں گزاری ہوئی عمر نے انہیں خوشی غم، جیت ہار، وصال اور فراق طرح طرح کی کیفیات سے بار بار روشناس کیا ہے۔ حفیظؔ کہتے ہیں کہ ہماری تجسس پسند اور جدت پسند طبیعت کے لئے اس دنیا اور زندگی میں کوئی چیز تازہ اور ان دیکھی نہیں البتہ دوسری دنیا اور موت ایسے تجربے ہیں جن کے بارے میں سنا بہت کچھ ہے مگر جن کو ابھی تک دیکھا اور محسوس نہیں کیا۔ نئے پن کا شوق زندگی سے اُکتا کر موت کی آشنائی کا سوچ رہا ہے۔ اب موت کا تجربہ اور دوسری دنیا کو دیکھنے کا شوق ہمارے اندر مچل رہا ہے اور جی چاہتا ہے اس زندگی کو چھوڑ کر موت کے ان چکھے ذائقے محسوس کریں۔ بقول کسے ؎

مجھ کو ان دیکھی زمینیں دیکھنے کا شوق ہے
میں ہواؤں کی امانت ہوں بکھرنے دے مجھے

شعر نمبر ۷

تیرے اُترے ہوئے چہرے پہ بھی یاروں کو حفیظ
سرخیٔ حرف و حکایات نظر آتی ہے

مشکل الفاظ

اترا ہوا چہرہ ، افسردہ چہرہ ، ملول ، مغموم ، بے رونق چہرہ
حرف و حکایات ، بات چیت ، قصہ کہانی ، شعر و افسانہ

تشریح

حفیظ اس غزل کے مقطع (آخری شعر جس میں شاعر اپنا تخلص استعمال کرتا ہے) میں دوستوں کی ستم ظریفی کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہم اداس اور ملول ہیں لیکن یار لوگوں کو ہمارے چہرے پر خوشی و مسرت کی لہر نظر آتی ہے۔

سرخیٔ حرف و حکایات کے الفاظ طبیعت کی اس رونق ، شگفتگی کو ظاہر کرتے ہیں جو ادب دوست لوگوں کی محفلوں میں شعر و افسانہ کی گفتگو یا مختلف ادبی و افسانوی موضوعات پر گپ شپ سے حاصل ہوتی ہے اور جو زندہ دلی ، بذلہ سنجی اور مزاح و شگفتگی کی دین ہوتی ہے۔ حفیظ کہتے ہیں کہ ہمارا چہرہ تو اندرونی کرب (دکھ) یا کسی تکلیف کی وجہ سے ملال اور افسردہ ہے ، اس پر اداسی اور غم کے تاثرات نمایاں ہیں - مگر افسوس ہے کہ ہمارے یاروں کو ہماری یہ کیفیات بھی دکھائی نہیں دیتیں ، انہیں ہمارے اترے ہوئے چہرے پر ادبی محفلوں میں کی جانے والی گپ شپ ، شعر و افسانہ اور قصہ کہانیوں سے پیدا ہونے والی شگفتگی اور سرخی نظر آتی ہے حفیظ کی مراد دراصل فارغ البالی اور بے فکری کا احساس ہے۔ دوستوں کی اس سے بڑی ستم ظریفی کیا ہو گی کہ حفیظ کی اداسی اور فسردگی انہیں بے فکری اور فارغ البالی دکھائی دے رہی ہے بقول کسے ؎

ستم ظریفیٔ احباب اور کیا ہو گی ؟
ہمارے درد کو وجۂ طرب سمجھتے ہیں

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

او دل توڑ کے جانیوالے ، دل کی بات بتاتا جا
اب میں دل کو کیا سمجھاؤں مجھ کو بھی سمجھاتا جا

مشکل الفاظ

او ، اے

تشریح

حفیظ کی یہ معروف غزل گیت ایسا لب و لہجہ رکھتی ہے - اس میں الفاظ کی سادگی ، اور بحر کی موسیقیت بہت دلکش ہے - حفیظ نے اس شعر میں محبوب

کو کہا ہے کہ تُو نے میرے جذبات اور احساسات کی پروا نہیں کی، تیری بے رخی اور بے توجہی کے سبب میرا دل ٹوٹ گیا۔ تیری محبت کا جو شوق میرے دل میں تھا وہی مرجھا گیا، تُو نے میرا دل توڑ دیا، اس کی وجہ کیا تھی! تیرے دل میں کیا تھا؟ مجھے اس کا کچھ علم نہیں، تُو نے میرا دل توڑتے وقت مجھے اپنے جذبات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا، تو نے اگر مجھ سے جدا ہونا ہی ہے تو جدا ہو جا، میں تجھ جاتے ہوئے کو روک تو نہیں سکتا مگر تو مجھے اپنے دل کی کیفیت اور حالت سے تو آگاہ کرتا جا کہ تیرے دل میں کیا ہے؟

میں تو شاید تمہاری بے رخی اور بے مہری برداشت کر لوں مگر میرے اندر دل بھی ہے جو آسانی سے اس صورتِ حال سے سمجھوتہ نہیں کر سکے گا۔ یہ دلِ وحشی میری بات نہیں مانے گا اسے سمجھانے کے لئے مجھے کوئی خاص حیلہ بہانہ کرنا ہوگا۔ تو مجھے سمجھا تا کہ میں اُسطرح اپنے دل کو سمجھاؤں اور اسے قرار آئے۔ بقول کسے ؎

کچھ کیا ہے ساتھ میرے، جانے تُو نے کیا کیا
دل پہ جانے سحر تیری گفتگو نے کیا کیا
تُو ہی خود کہہ دے مجھے تو کچھ سمجھ آتا نہیں
توڑ کر دل میرا، میرے ساتھ تُو نے کیا کیا

شعر نمبر ۲

ہاں میرے مجروح تبسم خشک لبوں تک آتا جا
پھول کی ہست و بود ہی ہے کھلتا جا مرجھاتا جا

مشکل الفاظ

مجروح، زخمی ۔ تبسّم، ہنسی ۔ ہستِ و بُود، مراد زندگی ۔ ہست کا مطلب ہے، ہوتا ہے، بود کا تھا۔ یعنی موجودہ اور گزرا ہوا زمانہ، انسان کی حیات

تشریح

اس شعر میں حفیظ نے اپنے مجروح تبسّم کو پھول کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ مجروح تبسّم وہ زخمی ہنسی ہے جو شاعر غم کی اور درد کی انتہائی حالت میں بھی ہنسنے پر مجبور ہے۔ وہ ایک ایسے ماحول میں ہے جہاں اُسے چار و ناچار دنیا والوں کے ساتھ مسکراہٹ میں شامل ہونا پڑتا ہے۔ اس کے خشک اور سوکھے ہونٹ (جو پیاس کی شدت کی علامت ہیں) اس پھول کی مانند ہیں جو بظاہر پتّی پتّی ہوتا ہے مگر اس کی بکھری ہوئی پتیاں مگر شگفتگی اور ہنسی کا تصور پیش کرتی ہیں۔ خشک ہونٹ جن پر پیڑیاں جمی ہوں۔ پھٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ پھول بھی جب منہ بند کلی سے کھل کر مکمل ہوتا ہے۔ تو اس کی بیسیوں پتیاں ہو جاتی ہیں جو کچھ عرصہ شاخ پر بہار دکھانے کے بعد بکھر کر نیچے زمین پر گر جاتی ہیں اور مٹی کا جزو بن جاتی ہیں۔ یہی

کھلنا اور مرجھانا اس کی زندگی ہے۔

حفیظ اپنی درد بھری زخمی مسکراہٹ سے مخاطب ہیں کہ میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں پر آنے سے نہ ہچکچاؤ۔ تم تو کھلے ہوئے پھول کی ہنسی کی طرح ہو جس کی زندگی یہی ہے کہ وہ کھلتا جائے اور کھلنے کے ساتھ ہی مرجھا جائے۔ اسکی یہی ہنسی دراصل اس کی فنا اور موت ہے۔

بقول کسے ؎ غنچہ چٹک کے پھول بنا اور بکھر گیا
تکمیلِ ذات کیا ہے بجز نقطۂ زوال

شعر نمبر ۳

یہ دکھ درد کی برکھا بندے، دین ہے تیرے داتا کی
شکرِ نعمت بھی کرتا جا، دامن بھی پھیلاتا جا

مشکل الفاظ برکھا، برسات۔ بندے، اے آدمی (جو حفیظ کے مخاطب ہیں مراد تمام آدمی۔ دین، عطا۔ داتا، مالک۔ شکر نعمت کرنا، اللہ کی دی ہوئی نعمتوں (صحت، عمر، دولت، رتبہ وغیرہ) پر شکر کا اظہار کرنا۔

تشریح دکھ درد اور مصیبتیں بظاہر آدمی کے لئے تکلیف دہ ہوتی ہیں لیکن اگر غور کیا جائے تو انہیں سے انسان انسان بنتا ہے۔ صبر، برداشت، ہمت، استقامت اور بہت سی خوبیاں انسان میں دکھ جھیلنے ہی سے پیدا ہوتی ہیں جس طرح سونا آگ میں پگھل کر خالص ہوتا ہے اسی طرح انسان دکھوں اور دردوں، مصیبتوں اور تکلیفوں کو برداشت کرنے کے بعد ہی انسان کہلانے کا مستحق بنتا ہے۔

علامہ اقبال ایک جگہ غم کی انسانی زندگی میں اہمیت واضح کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

؎ ایک بھی پتی اگر کم ہو تو وہ گل ہی نہیں
جو خزاں نادیدہ بلبل ہو وہ بلبل ہی نہیں

بلبل کے لئے موسم بہار میں رہنا مناسب نہیں، اسے خزاں کی ویرانی، پھول رت کی جدائی اور اپنے پسندیدہ محبوب پھولوں سے دوری ہی صحیح معنوں میں بلبل بناتی ہے اسی طرح انسان اگر ہمیشہ آرام و آسائش اور خوشی و مسرت کی فضا میں رہے اور اسے کوئی غم چھو کر نہ گزرے تو اس کے اندر اکثر خوبیاں کبھی پیدا نہیں ہو سکتیں، صبر، برداشت، ہمت، حوصلہ، کوشش و محنت، یہ سبھی باتیں مصیبتوں اور مشکلوں میں گھر کر زندگی کرنے والوں ہی کو نصیب ہوتی ہیں۔

حفیظ کہتے ہیں کہ اے انسان یہ دکھ اور درد کی بارش (مراد مسلسل بوچھاڑ کی طرح آنے والی تکلیفیں) تو تیرے داتا کی عطا ہیں۔ یہ ایسی چیزیں نہیں جن سے تو گھبرائے یا ان سے

بھاگے ۔ انہیں نہ صرف خوش دلی سے قبول کر بلکہ اس پر اپنے مالک کا شکر بھی ادا کر کہ اس نے تجھے تیری تربیت، استقامت، پختگیٔ کردار اور تجھ میں دوسرے اوصاف پیدا کرنے کے لئے دکھ درد کی نعمتوں سے نوازا ہے ۔ جذبۂ شکر کے ساتھ ساتھ ان کی طلب میں اپنے دامن کو پھیلاتا جا ۔ یعنی دکھ درد سے بھاگنے کی بجائے آگے بڑھ کر انہیں گلے لگا، ان کا استقبال کر انہیں اپنے دامن میں جگہ دے کیونکہ دکھ اور درد کی یہ سوغات بھی قدرت ہر ایک کو نہیں دیتی، بقول کسے ؎

دکھ اور درد کی سوغاتیں بھی کب ہر ایک کو ملتی ہیں
تم تو خوش قسمت ہو تم کو اس نے ہجر کی دولت دی

شعر نمبر ۴

جینے کا ارمان کروں یا مرنے کا ساماں کروں
عشق میں کیا ہوتا ہے ناصح عقل کی بات سمجھاتا جا

مشکل الفاظ

ارمان ، آرزو ، تمنا ۔ ناصح ، نصیحت کرنے والا مراد ، کوئی مشفق خیر خواہ شخص ۔

تشریح

عشق کے معاملات ہی نرالے ہیں ، زندگی کے عام اصولوں کی روشنی میں عشق و محبت کی کیفیات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا ۔ عام زندگی میں تو انسان مختلف کام کرتے ہوئے نفع پیش نظر رکھتا ہے ، زندگی کی کسی بھی مصیبت میں گرفتار ہو جینے کی کوشش کرتا ہے اور زندگی کو موت پر ترجیح دیتا ہے مگر عشق و عاشقی میں ایسا نہیں ہوتا ۔

حفیظ اپنے خیر خواہ سے مخاطب ہیں کہ اے نصیحت کرنے والے شخص تُو تو عقل مند ہے اور عقل و دانش کی دولت رکھتا ہے مگر میں عشق والا اس دولت سے محروم ہوں ، تو مجھے یہ بتا کہ میں جو کسی کی محبت میں گرفتار ہوں میں جینے کی آرزو کروں یا اپنے آپ کو موت کے حوالے کر دینے کی کوشش کروں ؟ دراصل حفیظ محبت میں محبوب کے مختلف اور متضاد رویوں سے پیدا ہونے والی بے یقینی کا شکار ہیں ۔ انہیں کچھ خبر نہیں کہ ان کی محبت انہیں موت کی طرف لے جائے گی یا انہیں زندہ رہنے پر آمادہ رکھے گی ۔ شاعر کے نزدیک جینے کا ارمان غالباً محبت کو ترک کرنے اور محبوب کے خیال کو دل سے نکال دینا ہے ۔ اور مرنے کا سامان محبوب کے خیال میں اور دور تک چلے جانا ہے (لیکن یہ جینے اور مرنے کا دنیاوی تصور ہے کہ بقول غالب ؎

محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

اس زیر بحث شعر میں جینے اور مرنے اور عشق اور عقل کے لفظوں نے صنعتِ تضاد کو جنم دیا

ہے اور "ارمان کروں" اور "سامان کروں" نے موسیقیت کے تاثر کو ابھارا ہے اس شعر کا لطیف پہلو یہ ہے کہ ناصح سے آپ نصیحت طلب کر رہے ہیں کہ میں کیا کروں ۔ حالانکہ عشق و محبت والے نہ مشورہ طلب کرتے ہیں اور نہ ہی وہ ان پر عمل کر سکتے ہیں یہاں شاعر ناصح سے مشورہ (نصیحت / عقل کی بات) مانگ رہا ہے کہ درپیش صورتِ حال میں زندہ رہنے کی کوشش کروں یا مرنے کی؟ بقول کسے ؎

کب کے اس بچھڑے نے آنا کہ نہیں آنا اب
ہم رہیں زندہ کہ مرجائیں بتائے کوئی

شعر نمبر ۵

دونوں سنگِ راہِ طلب ہیں ۔ راہنما بھی منزل بھی
ذوقِ طلب ، ہر ایک قدم پر دونوں کو ٹھکراتا جا

مشکل الفاظ

سنگِ راہِ طلب ، طلب کے راستے کے پتھر مراد رکاوٹیں ۔ راہنما ، راستہ دکھانے والا ۔ ذوقِ طلب ، خواہش اور مقصد کا حاصل کرنے کا جذبہ

تشریح

حفیظ کہتے ہیں کہ زندگی کے راستے میں جب انسان اپنے مقصد کے حصول کیلئے جدوجہد کرتا ہے یا اپنی کسی خواہش کو پورا کرنے کے لئے سرگرمِ سفر ہوتا ہے تو رہنما اور منزل اس کے راستے کی بہت بڑی رکاوٹیں بن جاتی ہیں ۔ راہنما اس [illegible] وہ اسے آزادانہ سفر نہیں کرنے دیتا اور ہر موڑ پر اپنے مشوروں اور ہدایات کی وجہ سے سفر میں دشواریاں پیدا کرنے کا سبب بنتا ہے ، مثلاً اس کے احکامات کہ یہاں رکنا ہے یہاں نہیں رکنا یا یہ کہ اس وقت کوچ کرنا ہے اور اس وقت کوچ نہیں کرنا ، غرضیکہ راہ میں طرح طرح کے مشوروں اور فیصلوں سے آزاد فطرت لوگ راہنما کے وجود کو بھی بار اور ناگوار محسوس کرتے ہیں ، اسی طرح منزل کا وجود انسان کے سفر کے خاتمہ کا سبب بنتا ہے اور اس پر پہنچ کر آدمی کی خواہش ختم ہو جاتی ہے اور اس کے پاس مزید سفر کا بہانہ نہیں رہتا ۔

حفیظ اپنے لامحدود اور بے پایاں (کبھی ختم نہ ہونے والے) ذوقِ طلب کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اگر تجھے حقیقی سفر کرنا ہے ، واقعی کسی کھوج اور جستجو کی لگن میں گھر سے نکلنا ہے تو راہنما اور منزل دونوں کے تصورات کو پاؤں سے ٹھکرا دے ۔ نہ کسی منزل کا سوچ کر گھر سے چل اور نہ راہنمائی کے لئے کسی دوسرے شخص کو ساتھ لے ۔ خواہش اور مقصد کے حصول کا سچا جذبہ اور حقیقی طلب نہ کبھی ختم ہونے والی چیزیں ہوتے ہیں ۔ اگر تو ان دونوں کو پیشِ نظر رکھے گا تو ہمیشہ رکاوٹوں (مراد نا اطمینانی ، عدمِ تکمیل ، ادھورے پن) میں گھرا رہے گا ۔ جیسے راستے کے پتھر

ہوتے ہیں کہ آدمی سفر سے لطف اندوز ہونے کی بجائے اور طلب کی تسکین حاصل کرنے کی بجائے انہیں ہی راستے سے ہٹاتا رہے اور اس کا سارا ذوق و شوق انہیں راستے کی رکاوٹوں سے نمٹنے اور انہیں دور کرنے میں ختم ہو جائے ۔ بقول کسے ؎

سدا ہوا کی طرح گر سفر میں رہنا ہے
تلاشِ راہنما اور نہ فکرِ منزل کر

شعر نمبر ۶

نغمے سے جب پھول کھلیں گے چُننے والے چُن لیں گے
سُننے والے سن لیں گے، تو اپنی دھن میں گاتا جا

مشکل الفاظ

نغمہ، گیت مراد، غزل ۔ دھن میں گانا، اپنی مستی میں گانا، ڈوب کر گانا ۔

تشریح

حفیظ کہتے ہیں کہ شعر و سخن اور نغمہ و موسیقی کا اپنا حُسن سننے والوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتا ہے ۔ گانے والے کو سامعین کے ردِ عمل کی بجائے اپنی مستی اور وجد میں گاتے رہنا چاہیے ۔

حفیظ نے اس شعر میں تخلیق فن کے ایک اہم پہلو کی طرف غیر محسوس طریقے سے توجہ دلائی ہے اور وہ پہلو یہ ہے کہ کیا فنکار اپنی طبیعت کے کسی ذوق، جذبہ یا کیفیت کی شدت سے مغلوب ہو کر گاتا ہے یا سننے والوں کے شوق اور پسند و ناپسند کے حوالے سے گاتا ہے ؟ حفیظ سچے فنکاروں کی بات کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک حقیقی فنکار اس سے بے نیاز ہے کہ کوئی اسے دیکھنے یا سننے والا داد دیتا ہے یا نہیں ۔ اگر فن اور نغمہ اس کے اندر کی واردات ہے تو وہ لوگوں کے ردِ عمل کی پروا کئے بغیر اپنے فن کے اظہار میں مصروف رہے گا ۔ اگر اس کے نغمہ میں کوئی اثر ہوگا تو سننے والے خود ہی اس سے سرور حاصل کرنے کے لئے اسکی طرف متوجہ ہوں گے ۔

نغمہ سے پھول کھلنا سے مراد جب نغمہ اپنے عروج پر اپنے تاثر کی تکمیل پر پہنچ جائے یعنی جب اس کے اندر جذبہ و مستی اور پختگی آجائے اور یہ مقام نغمہ کے آغاز یا فنکار کی بالکل ابتدائی زندگی ہی میں نصیب نہیں ہوتا لہذا اپنے فن کی پختگی کے زمانے میں اسے داد و تعریف کا زیادہ طالب بھی نہیں ہونا چاہئے ۔ اگر کوئی اسکی تعریف نہیں کرتا تو اسے مایوس ہو کر اپنی لے کاری گیت گانا ترک بھی نہیں کرنا چاہیئے ۔ جب نغمہ منہ بند کلی کے پھول بننے کی طرح اپنے جوبن، پختگی اور تکمیل کو پہنچ گا تو اسکے شائق بھی آجائینگے ۔ اسے اپنی ذات میں ڈوب کر جذبہ و مستی کیساتھ گاتے رہنا چاہیئے ۔

اس شعر میں "چننے والے چن لیں گے"، اور "سننے والے سن لیں گے" کے ٹکڑے نہ صرف معنوی طور پر بلکہ صوتی اعتبار سے بھی حفیظ کی فنی مہارت کی دلیل ہیں ۔

ناصر کاظمی

(۱۹۲۵ء-۱۹۷۵ء)

غزل نمبر ۱

شعر نمبر ۱

کارواں سست راہبر خاموش
کیسے گزرے گا یہ سفر خاموش

مشکل الفاظ

کارواں ، قافلہ
راہبر ، راستہ دکھانے والا ، رہنما

تشریح

ناصر کاظمی کی یہ غزل خاموشی کے ایک گہرے تاثر کو پیش کرتی ہے۔ مطلع میں کارواں کا مطلب قوم اور راہبر کا مطلب قائد اور قومی لیڈر ہیں۔ ناصر کاظمی کہتے ہیں ہماری قومی، معاشرتی، سماجی اور سیاسی زندگی میں جو ٹھہراؤ آچکا ہے، اسکی ذمہ داری کسی ایک طبقے پر نہیں ڈالی جاسکتی۔ ہمارے عوام سست، غافل، تساہل پسند اور آرام طلب ہیں اور وہ قائد جن کے ذمہ قوم کو جگانے اور بیدار رکھنے کا فرض عائد ہوتا ہے، وہ گہری چپ اختیار کئے ہوئے ہیں۔ یہ گہری چپ اور خاموشی دراصل لاتعلقی ہے۔ اگر وہ نعرہ زن رہتے، قوم کو جگانے کے لئے اپنی آواز بلند کرتے رہتے تو شاید قافلہ اپنے جمود اور ٹھہراؤ کا شکار نہ ہوتا۔

ناصر کہتے ہیں کہ اگر دونوں طرف سے یہی بے حسی رہی تو یہ سفر کیسے طے ہوگا؟ اگر قافلے والوں نے غفلت نہ چھوڑی یا راہبروں نے اپنی بے حسی، لاتعلقی اور خاموشی ترک نہ کی تو خاموشی کے ساتھ اتنا لمبا سفر کیسے گزرے گا؟ سفر سے مراد قومی ترقی کی منزلیں ہیں جو عوام اور قائد مل کر طے کرتے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی ہماری قومی سطح پر روا رکھی جانے والی بے حسی کا اظہار کیا ہے کہتے ہیں۔ ؎

میرِ سپاہ ناسزا ، لشکریاں شکستہ صف
آہ وہ تیرِ نیم کش جس کا نہ ہو کوئی ہدف

ناصر کاظمی بھی قافلہ والوں اور راہنما دونوں کی غفلت کا رونا روتے ہوئے مستقبل کا سوچ کر پریشان ہیں کہ ایسے یہ سفر چپ چاپ، بے حسی، غفلت اور جمود میں کیسے طے ہوگا؟
بقول کسے ؎

ہر فردِ قافلہ پہ ہے اک بے حسی محیط
ڈرتا ہوں قافلے کا میں انجام سوچ کر

شعر نمبر ۲

تجھے کہنا ہے کچھ مگر خاموش
دیکھ اور دیکھ کر گزر خاموش

تشریح

احمد ندیم قاسمی کی ایک نظم کا ایک شعر ہے

یوں مُڑ جیسے پھول کی پتی، یوں چل جیسے سرگوشی
وقت کے اس لمحے کا تقاضا خاموشی ہے خاموشی

بعض اوقات فرد اور قوم دونوں کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب خموشی کی زبان میں گفت گو ہوتی ہے اور نعرہ بازی کی جگہ اشاروں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ شعر خود کلامی کا انداز بھی رکھتا ہے۔ ناصر اپنے آپ سے مخاطب ہیں کہ اے ناصر تجھے جو کچھ کہنا ہے، بے صوت صدا کہنا ہے، سرگوشی کے انداز میں، خاموشی کے لہجے میں۔ اب وہ وقت نہیں کہ تو بلند آواز سے بات کرے، جو کچھ تری آنکھوں کے سامنے ہو رہا ہے اسے خاموشی سے چپ چاپ دیکھتے جاؤ اور آگے گزرتے جاؤ۔ مراد یہ کہ رک کر کسی خرابی کی نشاندہی نہ کرو اور نہ ہی چیخ چیخ کر اس کے بارے میں لوگوں کو بتاؤ۔

دوسرے مصرع کے پس منظر میں یہ مفہوم ابھرتا ہے کہ ناصر کوئی ایسی چیز، خرابی، تباہی دیکھ رہے ہیں جو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے اور اس کے بارے میں لوگوں کو بتانا، آگاہ کرنا اور متنبہ و ہوشیار کرنا بہت ضروری ہے مگر وہ اس پس منظر کو نظر انداز کر کے اپنے آپ کو اس بات کی تلقین کرتے ہیں کہ گلہ گزاری اور شکوہ و شکایت کرنے کی بجائے سب کچھ دیکھ کے خاموشی سے آگے گزرتے جاؤ۔

خود کلامی کے علاوہ وسیع تر مفہوم میں یہ خطاب اپنے تمام رفیقوں اور ہمسفروں سے ہے کہ اگر انہیں کچھ کہنا بھی ہے تو خاموشی سے نشاندہی اور اشارہ کرنے پر ہی اکتفا کریں۔ بولنے سے حتی الامکان پرہیز کریں۔

یہ شعر بلکہ پوری غزل ایک گھرے جبر کے ماحول کی پیداوار نظر آتی ہے جس میں حقیقتِ احوال کا اظہار کرنے والوں کو قید و بند کی مصیبتوں سے گزرنا پڑتا ہے اور سچائی کا بیان خوف اور خطرے سے خالی نہیں ہوتا۔ بقول ایک انگریز مفکر کے:

(WISE MEN ARE SILENT WHEN TIME IS BAD)

جب برا وقت ہو تو چپ رہنا ہی دانائی ہے۔ ناصر کاظمی بھی اپنے آپ کو اور اپنے ساتھیوں کو حالات کے سامنے خاموش سمجھوتہ کی تلقین کرتے نظر آتے ہیں۔ بقول کسے

جبرِ ماحول دیکھ، چپ ہو جا بولنے والے، سر نہ جائے کہیں

شعر نمبر ۳

یوں ترے راستے میں بیٹھا ہوں
جیسے اک شمع رہگزر خاموش

مشکل الفاظ رہگزر ، راستہ

تشریح ناصر کاظمی نے اپنے انتظار کی کیفیت کو راستے پر جلنے والی شمع کے ساتھ تشبیہ دی ہے - رہگزر کا چراغ جہاں ایک طرف رہنمائی کی علامت ہے وہاں دوسری طرف بے بسی اور بے وقعتی کی شدید کیفیت کو ظاہر کرتا ہے - ایک وہ شمع ہوتی ہے جو محفلوں میں روشن ہوتی ہے اور ہر ایک کی توجہ کا مرکز ہوتی ہے - اس کے مقابلے میں راستے میں جلنے والی شمع کی کیا حیثیت ہے - اگر کوئی اسے دیکھے بھی تو اس کی روشنی میں راستہ دیکھ کر آگے بڑھ جائے اور اسے پیچھے تنہا جلنے پگھلنے کے لئے چھوڑ جائے - وہ ہواؤں کی زد میں رہے اور بالآخر ختم ہو جائے -

ناصر نے اپنے آپ کو بھی راستے پر جلنے والی شمع سے تشبیہہ دی ہے محبوب سے مخاطب ہیں کہ میں تیرے راستے میں شمع کی طرح روشن ہوں ، کوئی شکوہ کئے بغیر، اس انتظار میں کہ تو کبھی ادھر سے گزرے اور میرے جلتے پگھلتے وجود کی روشنی ترے راستے کو منور کر سکے -

بقول کسے ؎

تیری راہوں کو جگمگاتے روشنی میرے پیکر کی
شمع کی صورت جلتا جاؤں جدھر جدھر سے تو گزرے

شعر نمبر ۴

اُٹھ گئے کیسے کیسے پیارے لوگ
ہو گئے کیسے کیسے گھر خاموش

مشکل الفاظ اُٹھ جانا ، مر جانا

تشریح ناصر نے رفتگاں کے بعد کی ویرانی اور اداسی کا بڑا دلدوز نقشہ کھینچا ہے - کہتے ہیں کہ کیسے کیسے پیارے لوگ تھے جو اس دنیا کو چھوڑ گئے ان لوگوں کے دم سے گلی محلوں میں چہل پہل اور رونق تھی مگر ان کے جانے کے بعد کیسے کیسے ہنستے بستے گھر خاموش اور چپ چاپ ہو گئے ہیں - بقول میر انیس ؎

یہ بے سبب نہیں سُونے گھروں کے سناٹے
مکان یاد کیا کرتے ہیں مکینوں کو

کہ سُونے گھروں میں جانے والوں کے بعد سنّاٹے رہ گئے ہیں جو اپنے مر چکے یا ہجرت کر چکے مکینوں کو یاد کرتے ہیں۔

کیسے کیسے کے الفاظ دونوں مصرعوں میں نہ صرف حُسنِ تکرار پیش کرتے ہیں بلکہ ہر طرح کی خوبی، دلکشی اور لطف کا مفہوم دیتے ہیں ناصر کاظمی نے لوگوں اور گھروں کے اوصاف ظاہر کرنے کی بجائے کیسے کیسے کے الفاظ سے لوگوں اور گھروں میں خوبی و عمدگی کے سینکڑوں امکانات کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی بہت اچھے، پیارے، خوبصورت، باوفا، حوصلہ مند لوگ اور اور کیسے کیسے رونق، چہل پہل، خوشی، مسرت اور حُسن سے بھرپور گھر جنہیں وقت کی ظالم آندھی اور موت کے سرد پنجوں نے دبوچ لیا ہے، اب وہ پیارے چہرے بھی نظر نہیں آتے اور ان ہنستے بستے گھروں پر بھی ویرانی، خاموشی اور سنّاٹوں کا قبضہ ہے۔ بقول کسے ؎

وقت کی آندھی نے گہنائے کیسے کیسے چاند
کیسے کیسے ہنستے بستے شہر ہوئے ویران

شعر نمبر ۵

یہ زمیں کس کے انتظار میں ہے
کیا خبر کیوں ہے یہ نگر خاموش

مشکل الفاظ نگر، آبادی، محلہ، شہر، بستی

تشریح ناصر کاظمی نے اپنے ماحول کی گہری خاموشی کو کسی بہت بڑی تبدیلی کی علامت بتایا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بستی کے اندر یہ جو خاموشی مسلّط ہے، گلیاں چپ چاپ ہیں، محلے بے آواز ہیں اور کسی طرف سے کوئی صدا نہیں آتی، یوں محسوس ہوتا ہے کہ کسی گہرے ڈر کی ڈوری نے سب کو باندھ رکھا ہے اور کسی شدید خوف نے سب کے ہونٹوں پر تالے لگا رکھے ہیں۔ بے بسی اور جبر کے خاموش ماحول میں سب لوگ سہمے بیٹھے ہیں۔ یقیناً کچھ ہونے والا ہے۔ کوئی ایسا فرد یا انقلاب آنے والا ہے جس کے آنے کے سبھی منتظر ہیں اور جس کے آنے پر صورتِ حال میں کوئی تبدیلی متوقع ہے۔

بقول کسے ؎

سہمے بیٹھے ہیں سب اپنی اپنی قبرِ ذات میں
جانے کس آشوب کا کوہِ گراں گرنے کو ہے

شعر نمبر ۶

شہر سوتا ہے رات جاگتی ہے
کوئی طوفاں ہے پردہ در خاموش

مشکل الفاظ طوفان، ہنگامہ۔ پردہ در، پردہ پھاڑنے والا، نقاب اتارنے والا
کسی چھپے ہوئے راز سے پردہ اٹھانے والا۔

تشریح ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ رات کا وقت ہے۔ شہر کے لوگ سو رہے ہیں مگر رات جاگ رہی ہے۔ یوں لگ رہا ہے کہ کوئی طوفان چپ چاپ پردہ دری کے عمل میں مصروف ہے ناصر کاظمی کے شعر میں شہر سے مراد شہر کے لوگ اور رات سے مراد وقت ہے۔ دنیا والے سو بھی جائیں تو وقت کی گردش ان کے ساتھ نہ سوتی ہے نہ رکتی ہے بلکہ وقت مسلسل حرکت میں رہتا ہے۔ شہر کے محوِ خواب ہونے مگر رات کے جاگتے رہنے کے پیچھے ناصر کاظمی کو کوئی خاص بات نظر آتی ہے۔ اسے رات ایک ایسے بھیدی کی طرح محسوس ہوتی ہے جو خاموشی سے ایک ایک گھر میں داخل ہو رہی ہے اور گھر کے اندر سوئے مکینوں کے راز سے واقف ہو رہی ہے۔ رات کا یہ عمل ناصر کو ایک ایسے طوفان اور ہنگامے کی مانند معلوم ہوتا ہے جو چپ چاپ خوابِ خرگوش میں مدہوش لوگوں کے راز افشا کرنے والا ہے۔

ناصر کاظمی جدید شاعروں میں سرِ فہرست ہیں۔ جدید غزل کے قارئین کے ذہن میں یہ بات رہنی چاہیئے کہ یہاں شہر، رات، ہوا، درخت، دریچہ اور دوسری اشیاء وغیرہ کا ذکر لغوی کی بجائے علامتی مفہوم میں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نئے شاعروں کی غزلوں میں اظہار کی سادگی کے باوجود مفاہیم و معانی کی کئی پرتیں نظر آتی ہیں۔ ناصر کاظمی کی زیرِ نظر غزل بھی سادہ الفاظ اور سلیس اندازِ بیان کے باوجود معنی کے کئی پہلو ظاہر کرتی ہے۔ مثلاً اگر اسی زیرِ بحث شعر میں شہر کے سونے کو اپنی قوم، اپنے وطن اور اپنے ملکی باشندوں کی غفلت اور بے حسی سے تعبیر کیا جائے تو رات کا تصور ایک ایسے پراسرار دشمن کے طور پر ابھرتا ہے جو چوکس ہے اور چپ چاپ شہریوں کی بربادی اور تباہی کیلئے مصروفِ سازش ہے۔

شعر کو اس طرح دیکھنے سے ہمیں شعر کے لفظوں کے سبھی تلازمات نظر آئیں گے۔ یوں ناصر کاظمی ایک ایسے پاسبانِ شب کے طور پر دکھائی دیتے ہیں جو غافل شہریوں کو (غیر محسوس طریقے سے) جگانے اور دشمن سے خبردار رکھنے کے عمل میں مصروف ہیں۔ بقول زاہد فخری ؎

ہر بار نئے لشکری تیار کرے گا — وہ ایک نہیں ہم پہ کئی وار کرے گا
بپھرے ہوئے دریا سے بھی بہرے نہ اٹھانا — وہ لمحۂ غفلت میں اسے پار کرے گا

سو ناصر کاظمی بھی اس پردہ در طوفان کو، اس پُراسرار دشمنِ عافیت و خواب کو چپ چاپ مصروفِ عمل دیکھ رہے ہیں۔ شہر سو رہا ہے، رات (منفی قوتوں کی علامت) جاگ رہی ہے اور شاعر یہ سب کچھ محسوس کر رہا ہے اور اس سے پیدا ہونے والے نتیجہ کو کھلی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

بقول کسے ؎

ساحلوں کی خموشی کہتی ہے
کوئی طوفان آنے والا ہے

شعر نمبر ۷

ابھی وہ قافلے نہیں آئے
ابھی بیٹھیں نہ ہمسفر خاموش

مشکل الفاظ

قافلہ، کارواں
ہمسفر، سفر کے ساتھی، دوست

تشریح

ناصر کاظمی اپنے دوستوں سے مخاطب ہیں کہ ابھی آپ اپنی جد وجہد، انتظار اور کوششیں ترک نہ کریں، ہم سب مل کر جن قافلوں کا انتظار کر رہے ہیں وہ ابھی تک ہمارے پاس نہیں پہنچے۔ شعر کا معنوی پس منظر بتاتا ہے کہ جیسے مسرت و شادمانی، خوشحالی و آزادی کے چلے ہوئے قافلوں کا انتظار ہو رہا ہے۔ کبھی کے چلے ہوئے قافلے جانے کس وجہ سے ابھی تک اس موڑ، راستے اور منزل پر نہیں پہنچے جہاں ان کا ایک عرصے سے انتظار ہو رہا ہے۔ اس تاخیر کے سبب بہت سے ہمسفر ناامید اور مایوس ہو کر بے دلی کا شکار ہو رہے ہیں شاعر انہیں کہہ رہا ہے کہ ہمیں امید کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیئے نہ ہمیں صورتِ حال سے سمجھوتہ کر کے خاموش ہو کے بیٹھ جانا چاہیئے۔ جب تک وہ قافلے نہیں آتے ہمیں قافلہ سالاروں سے نہ صرف انکی بخیر و عافیت یہاں تک پہنچانے کی توقع رکھنی چاہیئے بلکہ مسلسل زور دیتے رہنا چاہیئے کہ وہ اس بارے میں غفلت نہ برتیں، اس ضمن میں ہمسفروں کو تگ و دو جاری رکھنی چاہیئے۔

ناصر کاظمی کی شاعری میں تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان (۱۹۴۷ء) کے واقعاتِ ہجرت اور تبادلۂ آبادی سے پیدا ہونے والے احساسات و خیالات کی جھلک نمایاں ہے۔ کیا حسرت ہے اگر شعر میں قافلوں سے آزادی و خوشحالی، فلاح و بہبود اور مسرت و شادمانی کے وہ قافلے مراد لئے جائیں جن کو بڑے بلند بانگ دعووں کے ساتھ منزلوں کی طرف روانہ کیا گیا تھا مگر جن کا آج بھی بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا ہے۔ بقول کسے ؎

غبار آنکھوں کی وحشتوں پر وہ خواب دن کب طلوع ہوگا
وہ دَور جس کی بشارتیں آج مل رہی ہیں
وہ درحقیقت کس آتی رُت میں شروع ہوگا
ہماری آزادی و مسرت کی صبح کے قافلے پہ شب خون مارنے والے رہبرو
کب ہماری جانب رجوع ہوگا۔

غزل نمبر ۲

شعر نمبر ۱

وہ ساحلوں پہ گانے والے کیا ہوئے
وہ کشتیاں چلانے والے کیا ہوئے

مشکل الفاظ

ساحل، دریا یا سمندر کا کنارا

تشریح

جس طرح صحرا میں چلتے ہوئے سار بان حُدی خوانی کرتے ہیں اور اپنے آپ کو مصروفِ سفر رکھنے کے لئے کوئی نغمہ گاتے ہیں، اسی طرح دریاؤں میں کشتیاں چلانے والے بھی چپوؤں کی حرکات کے ساتھ گیت گاتے ہیں۔ ان کے یہ سادہ و پُرسوز گیت جہاں ایک طرف انہیں مصروفِ کار رکھتے ہیں وہاں دوسری طرف ان کے سفر کو بھی خوشگوار بناتے ہیں اور انہیں تھکن کا احساس نہیں ہونے دیتے۔ ان مانجھیوں اور ملاحوں ہی سے دریاؤں کی رونق ہوتی ہے اور یہی ساحلوں کی رونق ہوتے ہیں۔

ناصر کاظمی نے اس شعر میں بے آواز ساحلوں اور بے آباد دریاؤں کی ویرانی کا نقشہ کھینچا ہے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا طوفان معصوم اور محنتی مانجھیوں کو اپنی لپیٹ میں بہا کر لے گیا ہے۔ اب ہر طرف ویرانی اور بے رونقی ہے اور طوفان کے گزر چکنے کے بعد کا پُرہول سناٹا ہے۔ کسی طرف سے نہ چپوؤں کے چلنے کی آواز آتی ہے نہ گانے کی صدا بلند ہوتی ہے

مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد کی ویرانی اور پُرہول خاموشی اس شعر کے معنوی پس منظر میں جھلکتی ہے۔ وہاں کی کثیر آبادی نہ صرف یہ کہ کشتی رانی کے پیشہ سے وابستہ ہے بلکہ وہاں لوگ کشتیوں ہی میں رہتے ہیں۔ ان کی مکان نما کشتیاں ہی ان کی رہائش گاہیں ہیں جو دریاؤں میں ایک جگہ سے دوسری جگہ بھی منتقل ہوتی رہتی ہیں اور ساحلوں کی آبادی اور رونق کا باعث بھی ہوتی ہیں۔ ساحلوں کی چہل پہل اور رونق میں ان کشتیوں اور مکینوں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔

مشرقی پاکستان کے سانحے کے بعد یہاں کے لوگوں پر کیا گزری اور ان کی زندگی کے معمولات کس طرح متاثر ہوئے؟ وہ ساحلوں پر گانے والے اور کشتیاں چلانے والے کہاں چلے گئے؟ ساحلوں کی رونق کو کون کھا گیا؟ دھوئیں اور بارود کی بُو نے امن وسکون کی اس فضا کو کیوں دھندلا دیا اور دریاؤں کا پانی ان کے مکینوں کے خون سے کیوں رنگدار ہو گیا؟ اس طرح کے بہت سے تلازمات ناصر کے اس مختصر اور سادہ سے شعر سے پیدا ہوتے ہیں

اور ذہن میں سقوطِ مشرقی پاکستان کا پورا نقشہ کھنچ جاتا ہے ۔ بقول کسے ؎

شکستہ کشتیوں کے تیرتے ہوئے تختے
بتاتے ہیں کوئی طوفاں اِدھر سے گزرا ہے

شعر نمبر ۲

وہ صبح آتے آتے رہ گئی کہاں
جو قافلے تھے آنے والے کیا ہوئے

مشکل الفاظ

قافلہ ، کارواں

تشریح

ناصر کاظمی اس شعر میں مصیبت اور غم کی ایک طویل رات کی نشاندہی کرتے ہیں جو ختم ہونے میں نہیں آرہی ۔ کہتے ہیں کہ توقع تھی کہ اب غم و درد کی گھڑیاں گزر جائیں گی ۔ یہ رات جو ہمارے آس پاس مسلّط ہے اور جس نے پورے ماحول کو اپنی تاریکیوں میں چھپا رکھا ہے ، کٹ جائے گی اور روشن صبح نمودار ہوگی ۔ لیکن جانے کیا ہوا نہ رات گزر رہی ہے اور نہ صبح طلوع ہو رہی ہے ۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ صبح کہیں راستے میں ہی رہ گئی ہے یا اسے کہیں راہ ہی میں روک دیا گیا ہے ۔

یہ صبح ، آزادی خوشحالی ، اطمینان ، مسرت ، شادمانی ، امید اور دوسرے تمام مثبت تصورات کی علامت ہے ۔ صبح کے ساتھ ان تمام خوشیوں اور آزادیوں کے قافلے وابستہ ہیں ۔ اگر وہ صبح آجاتی تو یہ تمام نعمتیں (جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے) ، ہم تک پہنچ جائیں مگر افسوس ہے ایسا نہیں ہوا ۔ ناصر کے ذہن میں اس صورتِ حال سے سوال پیدا ہوتے ہیں کہ آتے آتے وہ صبح کہاں پر ٹھہر گئی ہے ؟ خوشحالی اور آزادی کے قافلوں کا راستہ کس نے روک لیا ہے یا انکا رُخ کس نے کسی اور طرف موڑ دیا ہے ؟ بقول کسے ؎

صبا کا ہاتھ روتی آنکھ کے نم تک نہیں پہنچا
چلا تھا قافلہ خوشیوں کا پر ہم تک نہیں پہنچا

شعر نمبر ۳

میں اُن کی راہ دیکھتا ہُوں رات بھر
وہ روشنی دکھانے والے کیا ہُوئے

مشکل الفاظ

روشنی دکھانے والا ، مراد رہنما ، قائد

تشریح

غم ویاس کی وہ کیفیت جن کا ذکر پہلے شعروں میں ہوا ہے شدید ہوتی جارہی ہے۔ ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ وہ رہنما اور قائد جو تاریک راتوں میں روشنی کے میناروں کی طرح راستہ دکھانے والے ہوتے ہیں، غم ویاس کی تاریکیوں میں امید کے سورج بن کر چمکتے ہیں، وہ کہاں چلے گئے؟

میں رات رات بھر ان کی راہ دیکھتا ہوں، مجھے مصیبت کی ہر تاریک گھڑی میں اُن کا انتظار رہتا ہے مگر افسوس ہے دُور دُور تک اُن کا کوئی سراغ نہیں مل رہا۔ راتوں کو منور کرنے والوں اور تاریکیوں میں روشنی دکھانے والوں کو کیا ہوا؟ انہیں کس کی نظر لگ گئی؟ یا ان کی اپنی نیتیں بدل گئیں؟ انہیں راستے ہی میں کسی مصلحت نے روک لیا یا بے عملی اور غفلت کی سیاہیوں نے ان کی شخصیت اور کردار کو گہنا دیا۔

ناصر سیاست دانوں کی طرح واقعات کا تجزیہ نہیں کرتے بلکہ ماحول کو درپیش صورتِ حال کے بارے میں شاعرانہ انداز میں اپنے تاثرات پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عوام جن رہنماؤں کی راہ دیکھ رہے ہیں وہ نایاب ہوگئے ہیں۔ یہاں بھی روشنی دکھانے والے، سے مراد کوئی خاص طبقہ نہیں۔ اچھی صفت کے حامل سبھی لوگ، علامتی مفہوم میں سب اچھے خواب، خیال، یادیں دوست، ماضی کے ساتھی جو شاعر کی تنہائیوں اور زندگی میں روشنی کی کرنیں بکھیر سکتے ہیں اس میں شامل ہیں۔ بقول کسے ؎

کبھی چمکتی تھی جو درد کے اندھیروں میں
کہاں پہ چھپ گئی وہ روشنی سیاروں کی

شعر نمبر ۴

یہ کون لوگ ہیں مرے اِدھر اُدھر
وہ دوستی نبھانے والے کیا ہوئے

تشریح

ناصر کاظمی کے اس شعر کا دوسرا مصرع بتاتا ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے، پرانے باوفا ساتھی کہیں غائب ہو گئے ہیں اور اب انکی جگہ ان لوگوں نے لے لی ہے جو مختلف عادات رکھتے ہیں۔

"یہ کون لوگ ہیں" سے ناصر کی مراد یہی مختلف عادات والے لوگ ہیں جو ناصر کے لئے اپنے رویوں کی وجہ سے مختلف ہیں۔ پہلے ساتھ نبھانے والے دوست ہوتے تھے۔ اب ان کی جگہ خود غرض لوگوں اور مصلحت پسندوں نے لے لی ہے۔ پہلے جانثار، باوفا اور ہمدرد ساتھیوں کی قربت میسّر تھی، اب ان کی جگہ ظاہر دار اور منافقانہ طور طریقوں والے لوگ آ گئے ہیں۔ "کون لوگ" کے لفظوں میں اجنبیت اور غریبت کا احساس جھلکتا ہے۔ ناصر کہتے ہیں کہ یہ میرے آس پاس موجود تو ہیں مگر میرے جیسے نہیں، مجھ سے مختلف ہیں جو میرے ساتھی تھے جن کی دوستی پر میں فخر کر

سکتا تھا انہیں حادثاتِ زمانہ نے کھا لیا اور اب ان کی جگہ جانے یہ غیر اور مختلف سے لوگ کہاں سے آگئے جو میرے ماحول میں اِدھر اُدھر پھیلے ہوئے ہیں، مطلب یہ ہے کہ جو مجھے ہر راہِ زندگی پر نظر آتے ہیں، یہ اجنبی، لالچی، کینہ پرور، حاسد، موقع پسند، ظاہردار، مادہ پرست اور خود غرض لوگ ہیں - بقول کسے ؎

نہیں یہ ہو نہیں سکتے کبھی مرے ہمزاد
یہ کیا بلائیں ہیں جن میں گھِرا ہوا ہوں میں

شعر نمبر ۵

عمارتیں تو جل کے راکھ ہو گئیں
عمارتیں بنانے والے کیا ہوئے

تشریح

عمارتیں بنانا ناصر کاظمی کے شعر میں تعمیر کی علامت ہے اور انہیں جلانا تخریب کاری کی - عمارتیں بنانے والے وہ تمام لوگ ہیں جو معاشرے میں خیر اور بھلائی کے رویوں کو فروغ دیتے ہیں - نیکی کی قدروں کو عام کرتے ہیں، جو ہر لمحہ معاشرے اور خلقِ خدا کی فلاح اور بہبود کے لئے کام کرتے رہتے ہیں اور عمارتیں جلانے والے وہ سماج دشمن لوگ ہوتے ہیں جو خیر اور نیکی کی قدروں کو پامال کرتے ہیں اور معاشرے میں فساد اور بگاڑ کا باعث بنتے ہیں -

ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ بُرے لوگوں نے اچھے لوگوں کی جگہ لے لی ہے، وہ لوگ جو زمین پر خیر اور نیکی کے تاج محل تعمیر کرتے تھے آج نہ جانے کہاں چلے گئے ہیں - اب تو انہیں آگ لگانے والے اور ان کا حسن تباہ و برباد کرنے والے لوگ رہ گئے ہیں -

ناصر کو معاشرے کی (اس عام ہوتی) بے اخلاقی کا بڑا دکھ ہے - وہ محسوس کرتے ہیں کہ تعمیر و ترقی کے پرانے نشان تو مٹ رہے ہیں مگر ان کی جگہ کوئی نئی مثبت تعمیری سوچ، منصوبہ سامنے نہیں آرہا ہے - یا تو یہ ہوتا کہ عمارتیں جلانے والے بعد میں نئی عمارتیں تعمیر کرتے مگر ایسا نہیں ہو رہا، پرانی اچھی قدروں کے غارت گروں نے معاشرے کو تباہی کے گڑھے کے کنارے لا کے چھوڑ دیا ہے - بقول کسے ؎

ہر طرف غول ہیں سیاہی کے
چھُپ گئے ہیں کہاں چراغ مرے

شعر نمبر ۶

یہ آپ ہم تو بوجھ ہیں زمین کا
زمیں کا بوجھ اُٹھانے والے کیا ہوئے

تشریح اس شعر میں شاعر نے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر سے کام لیتے ہوئے اپنی اور اپنے ساتھیوں کی کوتاہیوں اور غفلتوں کے ذکر کے ساتھ اپنے سے پہلی نسل کی محنت وہمت کی داد دی ہے۔

ناصر کہتے ہیں کہ ہم سے پہلی نسل بہت باہمت اور حوصلہ مند تھی۔ ان کی محنت ومشقت اور کوشش نے شہر آباد کئے، معاشرے میں بھائی چارے اور راخوت کی قدروں کو فروغ دیا وہ مہرو محبت والے لوگ اپنے پرائے کا غم کھاتے اور ہر آشنا نا آشنا کے کام آتے تھے۔ دوسرے کے دکھوں کو اپنا دکھ سمجھ کر انہیں دور کرنے میں جان مارتے تھے۔ یوں لگتا تھا انہوں نے پورے معاشرے کے دکھوں اور دردوں کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا رکھا ہے، مگر ایک ہم ہیں کہ ان سے بالکل مختلف اور متضاد عادتوں کے مالک ہیں سستی اور غفلت نے ہمارے اندر کام کرنے کی لگن اور شوق کو ختم کر دیا ہے۔ بھکاریوں، محتاجوں اور معذوروں کی طرح ہم دوسروں سے کام کرانے کے عادی ہو گئے ہیں۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بغیر کام کرنے کے نفع حاصل کرنے کے آرزومند ہیں۔ روزگار میں ایسے کاموں کو پسند کرتے ہیں جہاں کچھ نہ کر کے یا بہت کم محنت سے زیادہ سے زیادہ مال بنا سکیں۔ بیرونی قرضوں کی بہتات اور ان پر انحصار نے ہمیں زمین کا بوجھ بنا دیا ہے۔ ہم زندہ انسان نہیں مردہ جسموں کے مالک ہیں بلکہ بعض معاملات میں ان سے بھی بدتر۔ اور مردے زمین کا بوجھ ہوتے ہیں۔ ان کی صحیح جگہ زمین کے اوپر نہیں زمین کے نیچے ہوتی ہے۔

(ناصر کے ہاں زمین کا بوجھ اٹھانا سے مراد خلقِ خدا کی خدمت کا جذبہ اور زمین کا بوجھ بننا بے عملی، بے حوصلگی، غفلت، احتیاج اور دوسروں پر انحصار کرنے کی عادت ہے۔)

بقول کسے ؎ وہ نخل کٹ گئے سایہ تھا جن کا شہروں پر
رہے ہیں باقی، سو ہم جھاڑیوں کو کیا کرنا

غزل نمبر ۳

شعر نمبر ۱

دل میں اک لہر سی اُٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

مشکل الفاظ لہر اُٹھنا، جمود میں کسی حرکت کی علامت ہے۔

تشریح

ناصر کہتے ہیں کہ دل جو ایک عرصے سے ساکن سمندر وں کی طرح جمود اور بے حرکتی کی کیفیت میں تھا، اس میں ابھی کسی نئی اُٹھنے والی لہر کی وجہ سے حرکت پیدا ہوئی ہے۔

یہ لہر کسی نئی خواہش اور شوق کی لہر ہے جس نے ابھی ابھی جنم لیا ہے یا کوئی پرانی طلب اور دیرینہ آرزو جو مدتوں کی سو رہی تھی انگڑائی لے کر دوبارہ بیدار ہوئی ہے۔ ہم اس کا ارتعاش (حرکت) محسوس کر رہے ہیں۔ اس نئی اٹھنے والی لہر نے ہمارے پُرسکون دل کے اندر ہلچل سی مچا دی ہے ہماری ذات، وجود، جان جو ایک مدت سے ماحول کی یکسانیت سے تنگ آ گئی تھی اس کے اندر تازہ ہوا کا جھونکا محسوس ہوا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے اندر کا حبس ختم ہو رہا ہے دل کی پرانی کیفیت اور حالت ختم ہو رہی ہے۔ کوئی نئی رونق، ہلچل اور تجربہ ہمارے دل کی گہری چُپ اور ہماری تنہائیوں کے سناٹوں میں چھناکے کی طرح وارد ہوا ہے۔ بقول کسے ؎

پھر اپنے ویرانۂ جاں میں جلے چراغ تمنّا کے
برسوں بعد اُس کا خط آ کر دل کا کھنڈر اُجال گیا
ایک گلاب سے لمحے نے دروازۂ دل پہ دستک دی
حبس کا موسم ختم ہوا وہ ایسی مہک اچھال گیا

شعر نمبر ۲

شور برپا ہے خانۂ دل میں
کوئی دیوار سی گری ہے ابھی

مشکل الفاظ

شور برپا ہونا، آوازوں کا آنا، غل مچنا
خانۂ دل، دل کا مکان

تشریح

شاعر کہتا ہے کہ دل کے اندر سے چیخ و پکار اور شور و غل کی آوازیں آ رہی ہیں۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی دیوار سی گری ہے۔ ابھی کا لفظ ظاہر کرتا ہے کہ پہلے یہ حالت نہیں تھی، ابھی ابھی کوئی ایسا واقعہ، تجربہ یا حادثہ پیش آیا ہے جس کی وجہ سے دل کی پُرسکون فضا اور ماحول نہ صرف یہ کہ متاثر ہوا ہے بلکہ پوری ذات اور وجود کو ہلا گیا ہے۔

دوسرے مصرع میں "سی" کا لفظ جو بظاہر حرفِ تشبیہ ہے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کے اس پہلو کی طرف اشارہ کرتا ہے جس کی نوعیت اور حقیقت سے شاعر خود ہی بے خبر ہے۔ اسے محسوس تو ہوتا ہے کہ اس کے اندر کچھ ہوا ہے اور جو کچھ ہوا ہے اس کا تعلق خرابی اور بربادی سے ہے مگر وہ اس خرابی اور بربادی کی نوعیت سے بے خبر ہے، جیسے انسان باہر گلی سے کسی مکان کے اندر کسی چیز کو دھڑام سے گرتے سُنے مگر یقین سے نہ کہہ سکے کہ یہ چھت گری ہے یا دیوار یا کوئی

اور چیز۔ اسی طرح ناصر نے حادثہ کی نوعیت کے بارے میں لاعلمی کے اظہار سے شعر کی معنوی جہتوں (معنوں) میں وسعت پیدا کردی ہے۔ یہ حادثہ ذاتی نوعیت کا بھی ہوسکتا ہے۔ کسی تمنا یا خواہش کے ختم ہونے سے بھی ظہور پذیر ہوسکتا ہے (میر کا یہ شعر دیکھئے) ؎

دل سے رخصت ہوئی کوئی خواہش
گریہ کچھ بے سبب نہیں آتا

اور قومی و آفاقی حالات و واقعات سے بھی جنم لے سکتا ہے۔ بہر حال یہ ایسے سانحے کا بیان ہے جس نے شاعر کے پورے وجود کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا ہے۔ اس کے خارج پر اسکے جو بھی اثرات مرتب ہوئے ہوں اس کے اندر سکون و اطمینان کی کیفیت بھی غارت ہوگئی ہے۔ خواہشوں اور مسرتوں کے کچلے جانے پر دل سے گریہ وزاری اور ماتم و فریاد کی آوازیں آرہی ہیں۔ جانے شاعر کے کون سے خواب ٹوٹ گئے ہیں اور اسکے دل پر کیا قیامت ڈھ گئی ہے۔

بقول ایک پنجابی شاعر ؎

بیٹھے بیٹھے دل دے اندر کیہڑی آفت آئی
کناں تائیں پاڑ گیا اندر دا رولا گولا

شعر نمبر ۳

بھری دنیا میں جی نہیں لگتا
جانے کس چیز کی کمی ہے ابھی

تشریح

ناصر کاظمی کا یہ شعر اس غزل کا ہی نہیں بلکہ ناصر کاظمی کے بہترین شعروں میں شمار ہوتا ہے اس میں ایک ایسی حقیقت کا اظہار ہے جسے اہل فکر لوگوں نے ہمیشہ محسوس کیا ہے۔ یہ دنیا اپنی پوری خوبصورتی کے باوجود اور ہر طرح کی اشیاء کی کثرت کے باوجود جانے کبھی کبھی ادھوری اور نامکمل کیوں لگتی ہے؟ اطمینان کی ہر حالت اور خوشی کی ہر کیفیت کے بعد کوئی نہ کوئی ناآسودگی اور محرومی ایسی رہ جاتی ہے جس کا مداوا اور حل نظر نہیں آتا۔

ناصر کہتے ہیں دنیا خوبصورت ہے۔ رنگین ہے، لوگوں کی، اشیا کی، نظاروں کی، ہر طرف کثرت ہے۔ اس رونق اور چہل پہل کے باوجود اندر کی اداسی ختم نہیں ہوتی۔ جانے ابھی کس چیز کی کمی ہے؟ کون سی ایسی چیز ہے جس کی ضرورت ہے مگر جس کا علم نہیں۔

اس شعر کا ایک خوبصورت پہلو یہ ہے کہ "جس چیز" کی کمی ہے اس کا شاعر کو بھی علم نہیں۔ روایتی غزل کے پس منظر میں تو عام طور پر محبوب کا فراق اور دوری شاعر کو اداس کرتی ہے مگر یہاں یہ بات نہیں۔ محبوب کی قربت کے باوجود کوئی کمی ہے۔ مرزا بیدل کا شعر ہے ؎

ہمہ عمر با تو قدح زدیم و فرقتِ رنج خمارِ ما
چہ قیامتی کہ نمی رسی ز کنارِ ما بکنارِ ما

تمام عمر تری محبت میں مے نوشی کے بعد بھی ہمارا رنج خمار نہ گیا کیا قیامت ہے کہ تو ہمارے ایک پہلو سے دوسرے پہلو تک نہیں پہنچتا - مراد یہ کہ تری قربت میں بھی اتنے فاصلے ہیں کہ وہ ہیں کہ وہ سمٹتے نہیں اور ہماری ناآسودگی وہی رہتی ہے - بھری دنیا میں دل نہ لگنا کسی ایسی ہی کمی کے سبب ہے مگر کس کمی کا ؟ یہ شاعر بھی نہیں جانتا - بقول کسے ؎

نہ جانے کس کمی کا رنج پل پل ساتھ رہتا ہے
اداسی ہے کوئی جو تجھ سے مل کر بھی نہیں جاتی

ناصر کے اس شعر کا ایک اور معنوی پہلو یہ ہے کہ اہلِ فکر کے نزدیک اشیاء کی موجودگی اور کثرت ہی سب کچھ نہیں ، انسان کا ازلی و ابدی سکھ ان اشیاء کے استعمال کے قرینے و اثرات سے وابستہ ہے - اگر اس قرینہ میں کوئی کمی ہے اور اگر ان اثرات کا نتیجہ انسانی دکھ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے تو یہ اشیاء شاعر اور دوسرے اہلِ فکر کے لئے اذیت دہ ہیں -

اب اس شعر کو موجودہ دنیا کے وسائل اور ان کے استعمال کے تناظر میں دیکھئے افریقہ کے کروڑوں عوام شدید قحط کا شکار ہیں مگر دنیا کی بڑی طاقتوں کا کھربوں روپیہ اسلحہ سازی کے جنون میں اور خلا کی تسخیر پر خرچ ہو رہا ہے - اگر وہ زہرہ و ماہتاب پر جانے سے قبل یہی مال و دولت پسماندہ ملکوں میں انسان کی فلاح کے لئے استعمال کریں تو قحط ، بیماری ، غربت اور جہالت کے روگ کٹ سکتے ہیں اور انسانیت سکھی ہو سکتی ہے - وسائل کی کثرت کے باوجود ان کے استعمال میں عدمِ توازن ، اپنے بارے میں خود غرضی اور دوسروں کے متعلق بے حسی کے یہ رویّے بھی اسی دکھ کی طرف اشارہ کرتے ہیں جس کا ذکر ناصر "کمی" کے حوالے سے کرتے ہیں -

بقول کسے ؎ کوئی شے ہو ، آ ہی جاتی ہے نظر کوئی کمی
بس کہیں جاؤں ، یونہی جلتا رہوں کڑھتا رہوں

شعر نمبر ۲

تُو شریکِ سخن نہیں ہے تو کیا
ہم سخن تیری خامشی ہے ابھی

مشکل الفاظ

شریکِ سخن ، گفتگو میں شامل ، ہم کلام
ہم سخن ، ہم کلام ، گفتگو کا ساتھی -

تشریح ناصر کہتے ہیں کہ گفتگو صرف لفظوں کے ذریعے نہیں ہوتی بعض اوقات آدمی چپ

رہ کر بھی اپنا اظہار کرتا ہے، اس کی خاموشی ان کیفیات کو بیان کر دیتی ہے جو وہ گفتگو کے ذریعے ادا کرنا چاہتا ہے بلکہ بقول ایک فارسی شاعر ؎

خموشی معنی دارد کہ در گفتن نمی آید

کہ خموشی سے اس مفہوم کا بھی اظہار ہو جاتا ہے جو کہنے بولنے سے ادا نہیں ہو سکتا۔ خموشی گفتگو سے زیادہ پُر معنی ہے۔

ناصر کہتے ہیں کہ اگرچہ تُو مجلس میں موجود ہوتے ہوئے گفتگو میں شریک نہیں اور خاموشی اختیار کئے ہوئے ہے۔ لیکن پھر بھی ہمارے ساتھ ہمکلام ہے، باتیں کر رہا ہے مگر اب تیری باتیں زبان سے نہیں خاموشی کے ذریعے ہو رہی ہیں۔

اس شعر میں یہ لطیف سا فرق پیش نظر رہنا چاہیئے کہ دوسرے مصرع کا لفظ "ابھی" اگرچہ "اب" کے مفہوم میں ہے مگر اس کا قرینہ مختلف ہے۔ یہاں شاعر کی مراد تسلسلِ کلام سے ہے کہ تُو اگرچہ گفتگو کرتے کرتے چپ ہو گیا ہے اور اب تُو ہم سے ہمکلام نہیں لیکن تیرے چپ ہو جانے کے باوجود تیرے کلام کا سلسلہ نہیں ٹوٹا۔ تُو اب بھی یعنی (ابھی تک) ہم سے محوِ گفتگو ہے مگر اب یہ گفتگو تیری خاموشی کر رہی ہے اور ہم تیری اس چپ سے تیرے اندر کی کیفیات کا اندازہ لگا رہے ہیں۔

بقول کسے ؎ سو طرح کی باتیں ہیں، تیری آنکھ جو ہم سے، خامشی میں کہتی ہے

تُو جو چپ بھی ہو جائے، تیری خامشی ہم سے، ہمکلام رہتی ہے

ہنستی بولتی ندی، گاتی گنگناتی لہر، تیری چشم پُر اسرار

بے صدا و صوت ایسے بے زبان ہوتے بھی لاکھ بات کہتی ہے

شعر نمبر ۵

سو گئے لوگ اس حویلی کے

ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی

تشریح

ناصر کہتے ہیں، رات ہو چکی ہے اور رات کے ساتھ ہی ایک ایک کر کے اس گھر کے افراد سو گئے ہیں۔ دیوار و بام ساکت اور خاموش ہیں، گھر کی کھڑکیاں اور دروازے بند ہو چکے ہیں لیکن اس گھر کی ایک کھڑکی ابھی تک کھلی ہے۔ یہ کھلی کھڑکی دراصل اس سوچکے گھر میں کسی ایک فرد کے ابھی تک جاگتے رہنے کی علامت ہے۔ یہ فرد کون ہے اور یہ ابھی تک کیوں جاگ رہا ہے؟ یہ سوالات ہی شعر کے قاری کے دل میں ایک پُر معنی دلچسپی اور بھید بھری کشش پیدا کرتے ہیں اور یہی اس شعر کا حسن ہے۔

اگر یہ کلاسیکی غزل کا شعر ہوتا تو ان سوالات کا جواب اور طرح سے تلاش کیا جاتا مگر حسرت موہانی

اور اس کے بعد کے شاعروں کے ہاں محبوب کا تصور ستم گر اور ظالم وغیرہ کے بجائے اسے معاشرہ کے ایک جیتے جاگتے زندہ حسّیں رکھنے والے شفیق اور ہمدرد فرد میں تبدیل ہو رہا تھا۔ پرانی غزل میں محبوب کے تصور میں یہ تاثر نہیں ملتا کہ وہ بھی کسی کے لئے اداس ہو سکتا ہے اور کسی کی یاد میں رات رات بھر جاگ سکتا ہے۔

عہدِ حاضر کے شاعروں میں البتہ چاہے جانے والے فرد کے بارے میں ایسی محبت بھری اداسی اور چاہنے والے ہی کی طرح دکھ کا اظہار مل جاتا ہے ناصر کاظمی کے ہاں یہ اظہار عام ہے خصوصاً اپنے شعری مجموعہ "پہلی بارش" میں وہ ان گیلی آنکھوں کا ذکر کرتے ہیں جو اُن (یعنی ناصر) کے لئے روتی ہیں اور رات رات بھر ان کی یاد میں جاگتی ہیں۔

سو یہ حویلی محبوب کی ہوئی اور یہ ابھی تک کھلی کھڑکی والا کمرہ محبوب کا ہوا اور یہ کھلی کھڑکی کسی دکھ اور یاد کے سبب رات گئے تک محبوب کے جاگنے (نیند نہ آسکنے) کی علامت ٹھہری۔ اس شعر میں حویلی اور کھڑکی کے الفاظ ایک خوبصورت امیج (تصویر) پیش کرتے ہیں۔ حویلی کا لفظ ایک ایسے کشادہ مکان کے لئے (عموماً) استعمال ہوتا ہے جس کے ہر طرف وسعت اور کشادگی کا تصوّر ابھرتا ہے۔ شہر کی گلیوں کے جڑے ہوئے مکانوں کے برعکس حویلی کے در و دیوار کسی دوسری تعمیر سے منسلک نہیں۔ حویلی کے در و دیوار کے باہر کی کشادہ فضا دیکھنے والے اور کھلی کھڑکی کے درمیان نظارے کی گنجائش ہی فراہم نہیں کرتی بلکہ منظر کے تاثر کو بھی ابھارتی ہے۔ نیز حویلی کا لفظ شہر کی تنگ و تاریک گلیوں کے برعکس بیرونِ شہر کے کھلے ماحول اور مضافاتی تاثرات کی بھی عکاسی کرتا ہے (شاعر اگر حویلی کی بجائے گھر کا لفظ استعمال کرتا یا مکان کا لفظ برتتا تو یہ تاثرات کبھی بیدار نہ ہوتے)۔ رات کی تاریکی میں کھلی کھڑکی کی وضاحت کمرے کے اندر جلتی ہوئی اس روشنی سے ہوتی ہے جس کا شاعر نے کہیں ذکر نہیں کیا مگر جو شعر کے پس منظر میں اسی طرح موجود ہے جس طرح شاعر شعر کے امیج (تصویر) کے پیش منظر میں نظر آرہا ہے۔ حویلی سے کچھ فاصلے پر جو کھلی کھڑکی سے نکلتی ہوئی روشنی دیکھ رہا ہے وہ شاعر ہی ہے۔ یوں روشنی اس کھلی کھڑکی اور شاعر کی آنکھوں کے درمیان ایک ایسا پل بنی ہوئی ہے جو ایک غیر محسوس طریقے سے دونوں کے تعلق کی وضاحت کرتا ہے۔ بقول احمد راہی ؎

دُور رہ کر بھی اک تعلق ہے
اس کنارے کا اس کنارے سے

یعنی دونوں فرد جاگ رہے ہیں۔ ایک حویلی کے اندر اور ایک حویلی سے فاصلے پر جبکہ سارے لوگ سو رہے ہیں۔ بیداری اور رت جگے کی یہی کیفیت، دُکھ اور جلن، دونوں کے درمیانی

تعلق، قدرِ مشترک اور محبت کی علامت ہے۔ بقول کسے ؎

کیہڑا روگ سی جیہڑا اوہنوں ساری رات جگاوندا سی
ایڈے کھلّے کھاندے گھر وچ اوہنوں کیہڑیاں تنگیاں سن

(اس شعر کے دوسرے مصرع میں ممکن ہے بعض قارئین کا ذہن لفظ "ابھی" سے ابھی ابھی کے مفہوم کی طرف جائے ؎ ایک کھڑکی مگر کھلی ہے ابھی۔ یعنی ابھی ابھی کچھ دیر پہلے کھڑکی کھلی ہے مگر یہاں ابھی کا لفظ "ابھی تک" کے تاثر کو ابھارتا ہے کیونکہ پہلے مصرع میں "سو گئے" کے الفاظ ہیں "سوئے ہوئے" کے نہیں)

شعر نمبر ۶

تم تو یارو ابھی سے اُٹھ بیٹھے
شہر میں رات جاگتی ہے ابھی

تشریح

ناصر کاظمی کہتے ہیں کہ یار دوست اس امید پر بیدار بھی ہو گئے ہیں کہ شاید صبح ہو چکی ہے یا ہونے ہی والی ہے حالانکہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ یہ صرف ان کا طرزِ احساس ہے جو انہیں رات کے جانے اور صبح کے طلوع ہونے کی خبر دے رہا ہے۔

ناصر کہتے ہیں کہ ابھی تک پورا شہر سویا ہوا ہے، لوگ اپنے اپنے گھروں میں خواب کے مزے لے رہے ہیں، گلیاں، بازار خاموش ہیں اور وہ چہل پہل اور رونق جو صبح کے وقت نظر آتی ہے وہ نظر نہیں آ رہی یہ صرف دوستوں کی خوش فہمی ہے کہ وہ صبح کی توقع اور امید پر اُٹھ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس شعر میں رات کا جاگنا شہر کے سونے کا خوبصورت شعری اظہار ہے۔ 'یارو' کے لفظ سے خود کلامی کا تاثر بھی اُبھرتا ہے کہ جیسے ناصر اپنے آپ ہی سے مخاطب ہو کر ابھی یہ اٹھنے کا وقت نہیں، ہر طرف پھیلی ہوئی رات میں ابھی تو زندگی اور اس کے کاروبار معطّل ہیں۔

علامتی مفہوم میں رات کا لفظ جبر اور خوف کے تاثرات کو ابھارتا ہے اور رات کے جاگنے کے الفاظ اس کی شدت اور گرفت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اس علامتی حوالے سے شعر کا مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ابھی تو جبر اور خوف کا آسیب شہر کی گلیوں، محلوں میں دندناتا پھر رہا ہے، ابھی امن اور سکون کی صبح جس کا تمہیں انتظار ہے بہت دُور ہے، ابھی حقیقی آزادی کا سورج طلوع نہیں ہوا، تم ابھی سے اس کی آمد کی چاپ سُن رہے ہو تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔

بقول کسے ؎

ابھی تو پہرہ ہے رستوں پہ ظلمتِ شب کا
ابھی طلوعِ سحر کی گھڑی نہیں آئی

شعر نمبر ۷

وقت اچھا بھی آئے گا ناصرؔ
غم نہ کر زندگی پڑی ہے ابھی

تشریح

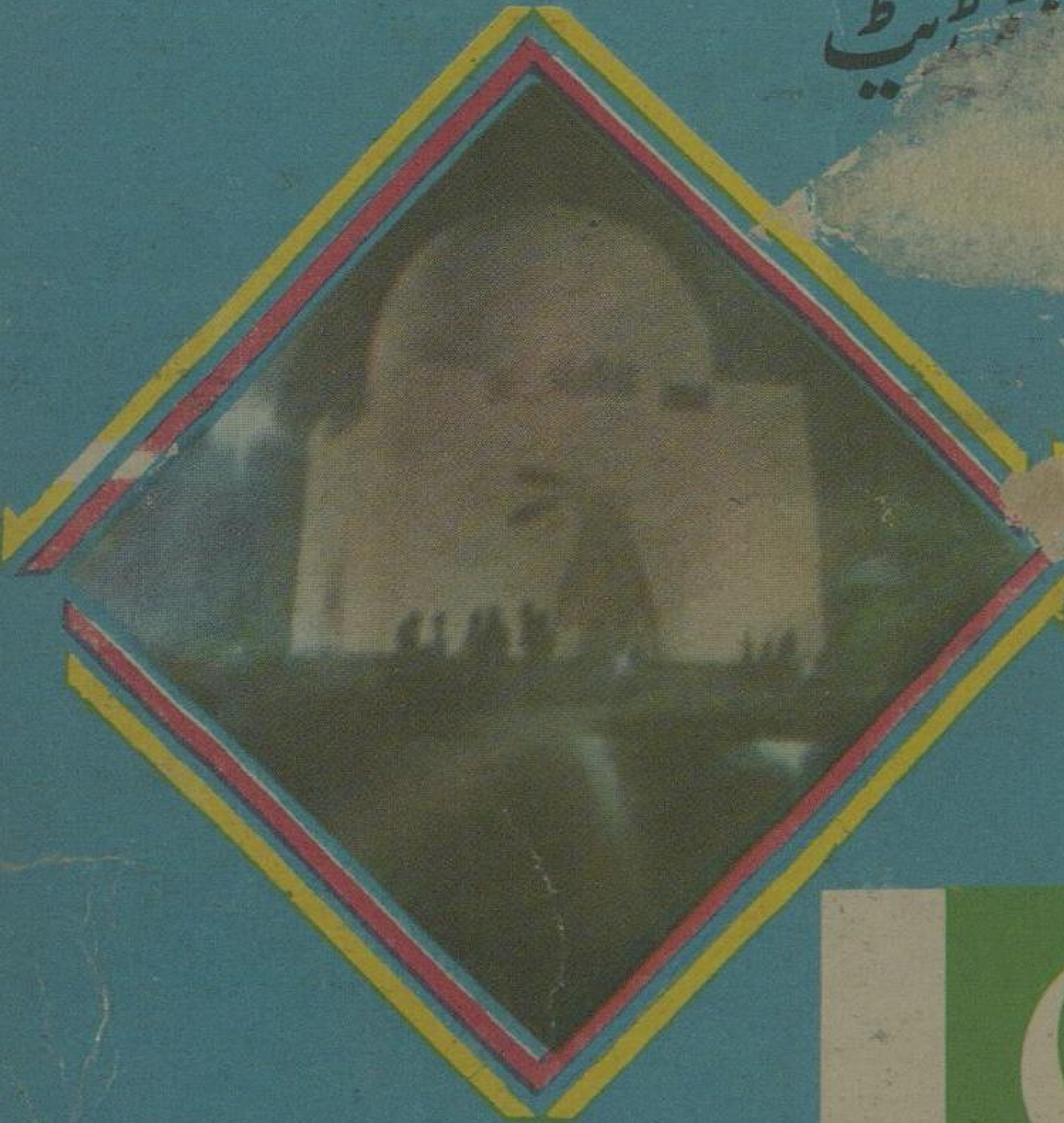
جہاں سے پچھلے شعر کی تشریح ختم کی گئی ہے اسی طرح کے احساسات و خیالات سے یہ شعر جنم لیتا ہے۔ اس غزل کے تخلیقی عمل کے دوران میں مایوسی، ناامیدی اور دُکھ درد کے احساس ہی سے زیرِ نظر شعر کا مضمون پیدا ہوا ہے۔

ناصرؔ کہتے ہیں کہ وقت اور مقدر سے انسان کو کبھی بھی مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ اگر آج دُکھ درد کے اندھیرے ہیں تو کیا ہوا ہمیں موجودہ حالات کی تلخیوں سے گھبرانا نہیں چاہیئے بلکہ آنے والے اچھے وقت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ کبھی خوش حالی، امن، عافیت اور حقیقی آزادی کا وہ سورج ضرور طلوع ہوگا جس کے خواب ہر انسان دیکھتا ہے۔ ابھی کتنی زندگی پڑی ہے! ابھی غم اور مایوسی کے خیالات کیسے؟ ناصرؔ، مجھے یقین اور امید ہے کہ کبھی اچھا وقت ضرور آئے گا۔

دنیا بھر کی شاعری میں اس انداز کے شعر مل جاتے ہیں جن کا لب و لہجہ رجائی (امید افزا) ہوتا ہے اور جو مایوسی کے اندھیرے میں روشن موسموں کی آمد کی نوید سناتا ہے اور اپنے سننے والوں کے دلوں میں صبر و برداشت سے دُکھ کی گھڑیاں گزارنے کی تلقین کے ساتھ انہیں ایک خوشحال اور روشن مستقبل کے خواب دکھاتا ہے۔ ناصرؔ کا یہ شعر بھی اسی انداز کا رجائی شعر ہے۔ یہاں "زندگی" سے مراد ناصرؔ یعنی ایک فرد کی زندگی نہیں، قوم کی زندگی ہے اور قوم کی زندگی سالوں نہیں صدیوں کے پیمانے سے ناپی جاتی ہے۔

ع پاکستان (لازمی)

ب ا ا ٹ ڈیٹ







پروفیسر مس رقیہ چوہدری ایم اے
گورنمنٹ کالج برائے خواتین فیصل آباد

سرگودھا

پروفیسر افتخار احمد ایم۔ اے
اسلامیہ کالج فیصل آباد





ڈپو ○ اردو بازار۔ لاہور